بہار ۱۹۹۱

آج

خصوصی شمارہ

گابرئیل گارسیا مارکیز

مرتب

اجمل کمال

ترجمہ

فاروق حسن

افضال احمد سید

راشد مفتی

آصف فرخی

عطا صدیقی

زینت حسام

اجمل کمال

آج کی کتابیں

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

اس کتاب کی سافٹ کاپی ہماری مادرِ علمی

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

کے نام

استادِ محترم جناب ڈاکٹر طاہر نواز صاحب کی خصوصی فرمائش پر

''آج'' کا شمارہ خصوصی: گابریئل گارسیا مارکیز نمبر

Gabriel Garcia Marquez

آج — مارچ اپریل ۱۹۹۱

مینیجنگ ایڈیٹر، پبلشر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۲ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ناؤن شپ کراچی

کمپوزنگ

پبلشورز یونائیٹڈ

۸۴ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت

ابن حسن پرنٹنگ پریس

باکس اسٹیڈیم کراچی

ترجمے :

فاروق حسن

افضال احمد سید

راشد مفتی

آصف فرخی

عطا صدیقی

زینت حسام

اجمل کمال

جواز

مارکیز کیوں؟

اس سوال کا سب سے سادہ اور براہِ راست جواب تو یہ ہے کہ دنیا کی اور زبانوں کی طرح اردو زبان کے پڑھنے والے بھی یقیناً اس کے حقدار ہیں کہ اس زمانے کے ایک عظیم ترین قصہ گو ادیب کی تحریروں سے آشنائی حاصل کریں۔

لیکن اس کے اور جواب بھی ممکن ہیں۔

محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ ہر دور کے پڑھنے والوں کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم عصر ادیبوں سے سخت مطالبات کرتے رہیں۔ پڑھنے کا یہ عمل، بلاشبہ، صرف پڑھنے تک محدود نہیں؛ دنیا جہان کے ادیبوں کی تحریروں سے آشنا ہونا، اس آشنائی کے لطف میں اوروں کو شریک کرنا، ان کا ترجمہ کرنا، ان تحریروں سے حاصل کردہ روشنی میں اپنے زمانے، اپنے خطے اور اپنی زبان کے ادب کو پرکھنا اور اس کے مقام اور اس کی سمت کا کھوج لگانے کی جستجو کرنا، یہ سب پڑھنے کے اس عمل کا حصہ ہیں، اور اسی کے باعث لکھنے والے نئے نئے مطالبات کا سامنا کرتے ہیں۔

مارکیز **ایک مشکل** ادیب ہے اور اس انتخاب کے ترجمہ کاروں نے اس کے اسلوب کے حسن کو حتی الامکان اردو میں قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس قصہ گو کے سحرانگیز فن سے مسرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آپ اس انکشاف سے بھی گزریں گے کہ یہ تحریریں جس دنیا کو بیان کرتی ہیں وہ خود ہمارے خطے کی حقیقت سے کس ناقابلِ یقین درجے تک مماثل ہے۔ گو کہ مارکیز کے بیشتر فکشن میں واقعات ایک فرضی قصبے میں پیش آتے ہیں جسے اس نے ماکوندو کا نام دیا ہے، لیکن یہ بات کسی شبے سے بالاتر ہے کہ اس کی بنیاد اس نے اپنے اردگرد کی دنیا کی حقیقی تفصیلات کے حد درجہ شعور پر رکھی ہے۔

مارکیز کے اسلوب کو بیان کرنے کے لیے مغربی دانش وروں نے "طلسمی حقیقت نگاری" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ مارکیز کو اس سے قطعاً اتفاق نہیں؛ وہ اپنے اسلوب کو محض حقیقت نگاری کہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تخلیق کا سرچشمہ، آخری تجزیے میں، حقیقت ہی ہے اور وہ اپنی تحریروں میں مبالغے کی کارفرمائی کم ہی دیکھتا ہے۔ لیکن بلاشبہ اس کی حقیقت نگاری اس سہل انگار اسلوب سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی جو حقیقت کو یک رخا دیکھنے کی عادی ہے، اور جس کا ہمارے ہاں بھی بہت چلن رہ چکا ہے۔ دوسری جانب، اس کا حقیقت نگاری کے اس بےبنیاد رد سے بھی کوئی واسطہ نہیں، ہمارا آج کل کا بیشتر فکشن جس کا شکار ہے۔ "آپ عقلیت کا برگ انجیر اسی وقت اتار کر پھینک سکتے ہیں،" مارکیز کہتا ہے، "جب آپ مکمل انتشار اور لغویت اور مہملیت کی دلدل میں دھنس جانے کے خطرے سے آزاد ہوں۔" اپنی حقیقت کو دریافت کرنے کے علاوہ، لکھنے کے عمل کا نوے فیصد حصہ پڑھنے کے کام پر مشتمل ہے، جس پر اس کے خیال میں لکھنے والے کو پوری طرح حاوی ہونا چاہیے۔

لاطینی امریکہ کے ایک دورافتادہ ملک کولمبیا کی تاریخ نوآبادیت، آمریت، بےپناہ تشدد، خانہ جنگی، سیاسی بلوہ گردی اور بڑی طاقتوں کے استحصال کی وہی کہانی ہے جو، برائے نام فرق کے ساتھ، اس سیارے کے اس بڑے حصے پر دہرائی جاتی رہی ہے جسے کچھ دنوں پہلے تک تیسری دنیا کہا جاتا تھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک غم انگیز کہانی ہے، اور اس میں امید کے پہلو بہت کم ہیں۔ لیکن لاطینی امریکہ کے ادیبوں نے اس ناامیدی کا مقابلہ ایک بےمحابا ادبی فراوانی سے کیا ہے۔ "ایک غیرحقیقی اور مطلق انسانی تاریخ" کے مقابل، مائیکل وڈ کے الفاظ میں، "یہ ادبی فراوانی — بیانیہ تکنیکوں کا یہ بلندبست مظاہرہ — ایک آزادی کی خواہش کا حتمی بیان کی لیے ہے، جو اخلاقی بھی ہے، سیاسی بھی اور تخلیقی بھی۔"

حقیقت کو پوری طرح اپنے شعور اور بیان کی گرفت میں لے آنا اسے تسخیر کرنے ہی کی ایک شکل ہے۔ مارکیز کی تحریروں میں بھی آپ یہی سحر دیکھیں گے اور اس کی حیرت اور مسرت سے گزر جانے کے بعد شاید یہ سوال باقی رہ جائے کہ آخر کیوں ہماری حقیقت ہمارے ادیبوں کی تحریروں میں اپنا مکمل اظہار پانے سے محروم ہے۔

اجمل کمال

ترتیب

مضمون

پلینیو اپولینو مینڈوزا

۹
گابریئل

ناولٹ اور کہانیاں

گابریئل گارسیا مارکیز

۳۵
معصوم ارینڈرا

۴۳
محبّت کے اُس پار منتظر موت

۸۱
گم گشتہ وقت کا سمندر

۹۷
بڑے بڑے پروں والا ایک بوڑھا پھوس

۱۰۴
دنیا بھر کا حسین ترین ڈوب مرنے والا

کہانیاں

گابریئل گارسیا مارکیز

۱۱۳
منگل کے دن کا قیلولہ

۱۲۰
ایک نہ ایک دن

۱۲۴
اِس قصبے میں کوئی چور نہیں

۱۴۹
بالتازار کی حیرت انگیز سہ پہر

۱۵۶
مونتیئل کی بیوہ

۱۶۲
سنیچر کے بعد کے دن

۱۸۱
کاغذی گلاب

۱۸۷
بڑی ماما کا جنازہ

ناول

گابریئل گارسیا مارکیز

۲۰۳
کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

ناول

گابریئل گارسیا مارکیز

۲۵۵
ایک پیش گفتہ موت کی روداد

rekhta
rekhta

ناولوں کے ابواب

گابرئیل گارسیا مارکیز

۳۲۳ تنہائی کے سو سال

۳۶۷ وبا کے دنوں میں محبت

تقریر اور مضمون

گابرئیل گارسیا مارکیز

۴۱۵ لاطینی امریکا کی تنہائی

۴۲۰ کولومبیا کا مستقبل

مضامین

ولیم رو

۴۳۱ گابرئیل گارسیا مارکیز

مائیکل وڈ

۴۴۲ تنہائی کے سو سال

گفتگو

گابرئیل گارسیا مارکیز

۴۵۷ امرود کی مہک

۴۹۷ ضمیمہ – ۱ واقعات کی سن وار ترتیب

۵۰۱ ضمیمہ – ۲ کتابیات

گابریئل گارسیا مارکیز کے ہم وطن ادیب پلینیو اپولیئو مینڈوزا (Plinio Apuleyo Mendoza) نے مارکیز کی زندگی، فن اور خیالات کے بارے میں ایک طویل دوستانہ گفتگو کو "امرود کی مہک" (Fragrance of Guava) نامی کتاب کی شکل میں مرتب کیا، جس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۲ میں شائع ہوا۔

مینڈوزا ۱۹۳۲ میں پیدا ہوئے، اور ناول نگار اور مدیر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا ناول The Deserter ۱۹۷۴ میں شائع ہوا اور دوسرا Years of Flight ۱۹۷۹ میں۔ آخرالذکر ناول کو بہترین کولمبین ناول کا انعام بھی ملا۔ مینڈوزا وینزویلا اور کولومبیا کے کئی رسالوں کی ادارت کر چکے ہیں۔ Libre نامی رسالہ، جو ان کی ادارت میں ۱۹۶۰ کی دہائی میں پیرس سے شائع ہوا، ان متعدد لاطینی امریکی ادیبوں کو یکجا کرنے کا موجب بنا جن کے نام آج دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

"گابریئل" مینڈوزا کے لکھے ہوئے ان پانچ پاروں پر مشتمل ہے جو "امرود کی مہک" نامی کتاب میں مختلف مقامات پر شامل ہیں اور مارکیز کے نجی حالات، ادبی نشوونما اور خیالات پر ایک دوست کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اس انتخاب میں شامل تحریروں کے لیے ایک پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ مارکیز کی گفتگو سے ترتیب دیا گیا متن "امرود کی مہک" کے عنوان سے انتخاب کے نویں حصے میں شامل کیا گیا ہے۔

پلینیو اپولیئو مینڈوزا

ترجمہ : اجمل کمال

گابریئل

ریل گاڑی — جیسے بعد میں اس کی یادداشت میں ایک زرد رنگ کی، گرد آلود اور دم گھونٹنے والے دھوئیں میں لپٹی ہوئی ریل گاڑی کی صورت میں محفوظ رہنا تھا — کیلوں کے وسیع باغات سے گزر کر ہر روز گیارہ بجے قصبے میں پہنچتی۔ پٹریوں کے ساتھ ساتھ چلتی کچی سڑکوں پر سبز کیلوں سے لدی سست رفتار بیل گاڑیاں ہچکولے کھا رہی ہوتیں۔ ریل گاڑی کے قصبے میں داخل ہوتے ہی مسافروں کو گرمی کی ایک شدید لہر محسوس ہوتی، اور اسٹیشن پر انتظار کرتی عورتیں ہمیشہ اپنی بڑی بڑی رنگین چھتریوں کے نیچے دھوپ سے پناہ لیے ہوئے ہوتیں۔

فرسٹ کلاس کے ڈبوں کی نشستیں بید کی بنی ہوتی تھیں۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں، جن میں باغات کے مزدور سفر کیا کرتے تھے، لکڑی کی بنچیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک اور ڈبا گاڑی میں جوڑ دیا جاتا، مکمل ایرکنڈیشنڈ اور نیلے شیشے کی کھڑکیوں والا، جس میں بنانا کمپنی کے اعلا عہدےدار سفر کرتے تھے۔ جو لوگ اس ڈبے سے اترتے تھے نہ ان کے کپڑے قصبے کی گلیوں میں نظر آنے والے لوگوں جیسے ہوتے، نہ ان کی رنگت قصبے کے لوگوں کی طرح سرسوں کی سی ہوتی، اور نہ ان کا انداز ان کی طرح سویاسویا ہوتا تھا۔ وہ بھورے بالوں، مضبوط جسموں اور جھینگے جیسی سرخ رنگت والے لوگ مہم جوؤں کی طرح دھوپ سے بچانے والے ہیٹوں اور موزوں سے لیس ہوتے تھے۔ اگر ان کی بیویاں بھی ساتھ ہوتیں تو وہ باریک ململ کے لباس میں لپٹی بےحد نازک اندام دکھائی دیتی تھیں۔

"امریکی"، اس کے نانا، جو کرنل تھے، اسے بتاتے۔ ان کے انداز میں اس تحقیر کا شائبہ سا

سے جو قصبے کے قدیم، معتبر خاندان تمام نئے آنے والوں کی بابت ظاہر کرتے تھے۔

جب گابریئل پیدا ہوا، اس وقت تک کیلوں کی تجارت کے اُس جوش وخروش کے آثار باقی تھے جس نے چند سال پہلے اس علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اراکاتاکا وائلڈ ویسٹ کے کسی قصبے جیسا لگتا تھا، نہ صرف اس ریل گاڑی اور پرانے چوبی مکانوں اور جھلستی ہوئی کچی سڑکوں کی وجہ سے، بلکہ اُن اسٹوروں اور قسمت آزماؤں کی وجہ سے بھی جو اب تک اپنی جڑیں گاڑ چکی تھیں۔ انیس سو دس کے لگ بھگ، جب یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کیلے کے کھیتوں کے درمیان اپنی آبادیاں قائم کر چکی تھی، یہ قصبہ انتہائی نمائشانہ اسراف کے ایک دور سے گزر رہا تھا۔ اُن دنوں میں پیسہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ برہنہ عورتیں تاجروں کے سامنے رقص کیا کرتی تھیں، جو اپنے سگار جلتے ہوئے نوٹوں سے سلگاتے تھے۔

اس قصبے اور اس جیسے اور قصبوں کی کشش بےشمار مہم جوؤں اور طوائفوں کو غول در غول کولمبیا کے شمالی ساحل کے اس اجاڑ قصبے میں لے آئی۔ یہ نچلے طبقے کے لوگ تھے، اکیلی عورتیں اور مرد، جو اپنے خچر ہوٹل کے باہر لکڑی کے کھمبوں سے باندھتے اور ہاتھ میں اپنا کل اسباب یعنی لکڑی کا صندوق یا کپڑوں کی گٹھری اٹھائے ہوتے۔

اس کی نانی، دونیا ترانکیلینا کے لیے، جو شہر کے ایک قدیم ترین خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اُن جاہل چہروں، ریگزاروں کے کنارے لگے سائبانوں تلے میں کپڑے بدلتے مردوں، کھلی چھتریوں تلے صندوقوں پر بیٹھی عورتوں، اور ہوٹل کے آس پاس بھوک سے ایک کے بعد ایک مرتے لاوارث خچروں کا یہ طوفان "محض "پتوں کا طوفان" تھا، انسانی کوڑےکرکٹ کا بگولا جو کیلوں کی تجارت کا سنہری دور اپنے پیچھے اراکاتاکا میں چھوڑ گیا تھا۔

دونیا ترانکیلینا اُس مکان پر حکمراں تھیں جس کو وہ بعد میں ایک وسیع وعریض، قدیم مکان کے طور پر یاد رکھنے والا تھا، جس کے پائیں باغ میں تپتی ہوئی راتوں میں چنبیلی کی گاڑھی خوشبو تیرتی رہتی تھی، اور جس کے بےشمار کمرے تھے جن میں سے گاہےگاہے مرحوم رشتہ داروں کے آہیں بھرنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دونیا ترانکیلینا کا خاندان جھلستی ریت کے جزیرہ نما گواہیرا سے تعلق رکھتا تھا جو مقامی انڈین باشندوں، اسمگلروں اور ساحروں کا مسکن تھا۔ وہ غیرمعمولی چیزوں کے بارے میں اس طرح بات کرنے کی عادی تھیں گویا وہ روزمرہ کی باتیں ہوں۔ آہنی عزم کی مالک اس پست قد اور بھینگی آنکھوں والی اس عورت کے واسطے مرے ہوؤں اور زندوں کے درمیان سرحد واضح نہ تھی، اور جوں جوں ان کی عمر میں اضافہ اور بینائی میں کمی ہوتی گئی، یہ سرحد اور بھی زیادہ دھندلی ہونے لگی، یہاں تک کہ خاتمے کے قریب انہیں اکثر مُردوں سے باتیں کرتے اور ان کی آہیں، سسکیاں اور شکایتیں سنتے ہوئے پایا جا سکتا تھا۔

جب رات — سوسن اور چنبیلی کی گہری خوشبو اور جھینگروں کی آواز سے بوجھل، گرم، حبس زدہ رات — یک لخت مکان پر آن اترتی تو کرسی پر بیٹھے ہوئے پانچ سالہ گابریئل کو اس کی نانی ان مرے ہوؤں کے قصے سنا سنا کر دہشت زدہ کیا کرتیں جو ہر طرف گھومتے پھرتے تھے۔ ان میں خالہ پیترا تھیں، ماموں لزارو اور خالہ مارگریتا — حسین مارگریتا مارکیز جو کہ جوانی میں مر گئی تھی، لیکن جس کی یاد خاندان کی دو نسلوں کے ذہنوں میں

سلگتی رہی۔ "اگر تم ہلے،" نانی ننھے گابریئل سے کہتیں، "تو خالہ پیترا اپنے کمرے سے نکل آئیں گی۔ یا "پھر ماموں لزارو۔"

(آج پچاس برس بعد بھی، جب گابریئل کی آنکھ روم یا بینکاک کے کسی ہوٹل کے کمرے میں کھلتی ہے تو وہ ایک لمحے کے لیے بچپن کی اسی قدیم دہشت سے گزرتا ہے؛ اندھیرا اس کے اُن مرحوم قرابت داروں کا مسکن ہے۔)

جس مکان میں اس کا بچپن گزرا وہ اس کے ماں باپ کا نہیں بلکہ نانا نانی کا تھا۔ بعض مخصوص حالات اسے بڑوں کی دنیا میں گم ایک بچہ بنا دینے کا باعث بنے، وہ دنیا جو ماضی کی یادوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی؛ جنگوں کی یادیں، خشک سالی کے برسوں اور گزرے وقتوں کی آب و تاب کی یادیں۔

اس کی ماں، لوئیزا کبھی شہر کی حسین لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ وہ خانہ جنگی کے ایک سورما، کرنل مارکیز کی بیٹی تھی جن کی تمام لوگ عزت کرتے تھے، اور اس کی پرورش علاقے کے قدیم معتبر خاندانوں سے مخصوص سخت گیر، اخلاقی اور فطری طور پر بےحد قدامت پرست، کاسٹیلیئی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان خاندانوں کا طریقہ تھا کہ وہ نئے آنے والوں اور اجنبیوں کو فاصلے پر رکھتے تھے۔ لیکن جنھیں وہ اتنا ناپسند کرتے تھے، انھی اجنبیوں میں سے ایک شخص ایک — پھر ان کے دروازے پر آیا اور لوئیزا کا رشتہ طلب کیا۔

گابریئل ایلیجیو گارسیا، کارتاخینا یونیورسٹی میں اپنی طب کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ٹیلیگراف آپریٹر کے طور پر کام کرنے اراکاتاکا چلا آیا تھا۔ طب کا پیشہ اپنانے کے لیے مناسب وسائل میسّر نہ ہونے کی وجہ سے اس نے سرکاری ملازمت اختیار کرنے اور شادی کر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنے ذہن میں قصبے کی تمام مقامی لڑکیوں کی فہرست بنا کر اس نے بالآخر لوئیزا مارکیز کے لیے قسمت آزمائی کی ٹھانی؛ وہ حسین اور سنجیدہ تھی اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی اپنی محبت کے اظہار کے لیے اس لڑکی سے مخاطب ہو کر ایک لفظ بھی نہ کہا تھا، پھر بھی وہ اس کا رشتہ طلب کرنے کے لیے ایک عزم کے ساتھ اس کے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اس کے خاندان نے صاف انکار کر دیا۔ لوئیزا کسی ٹیلیگراف آپریٹر سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی، خاص طور پر جب اس آپریٹر کا آبائی وطن بولیوار کا علاقہ رہا ہو جہاں کے لوگ سہل پسند اور اکھڑ تھے اور اس استحکام اور وقار سے محروم تھے جو کرنل اور اس کے خاندان کا امتیاز تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ گارسیا کنزرویٹو تھا یعنی اُس پارٹی سے تعلق رکھتا تھا جس کے خلاف کرنل نے زندگی بھر جدوجہد اور بعض موقعوں پر مسلح جنگ تک کی تھی۔

(کولومبیا ۱۸۱۹ میں ہسپانیہ کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد وقفے وقفے سے جاری رہنے والی خانہ جنگی کا ایک صدی تک شکار رہا۔ اٹھارہ سو چالیس میں دو پارٹیوں نے واضح شکل اختیار کر لی تھی؛ ایک طرف کنزرویٹو تھے جن کے روایتی فلسفے کی بنیاد خاندان، کلیسا اور ریاست پر تھی، اور دوسری طرف لبرل جو آزادخیال، مخالفِ کلیسا اور معاشی آزادروی کے قائل تھے۔ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان تمام خانہ جنگیوں میں سے خونریزترین وہ تھی جسے "ہزار روزہ جنگ" کہا جاتا ہے، جو ۱۸۹۹ سے ۱۹۰۲ تک جاری رہی اور جس نے ملک

کو دیوالیہ اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔)

لوئیزا اور اس کے خواستگار کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کی غرض سے اسے اس کی ماں کے ساتھ ساحل پر واقع دیگر قصبوں اور شہروں کے ایک طویل سفر پر روانہ کر دیا گیا۔ لیکن اس کا چنداں فائدہ نہ ہوا۔ ہر قصبے میں تارگھر موجود تھا اور تمام ٹیلیگراف آپریٹر اپنے اراکاتاکا کے ساتھی سے تعاون کرتے ہوئے اس کے عشقیہ پیغامات مورس کوڈ میں وصول کر کے نوجوان خاتون تک پہنچاتے رہے۔ وہ جہاں جہاں گئی یہ تار اس کا اسی طرح پیچھا کرتے رہے جس طرح زرد تتلیاں موریسیو بابیلونیا کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ لوئیزا کے خاندان کو اس مستقل مزاجی کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ شادی کے بعد گابریئل ایلیخیو اور لوئیزا نے کریبیئن کے ساحل پر واقع ایک قدیم شہر ریوہاچا میں سکونت اختیار کی۔ یہ شہر ایک زمانے میں بحری قزاقوں کی یلغار کا بہت دنوں تک شکار رہ چکا تھا۔

کرنل کی خواہش پر لوئیزا نے اپنے پہلے بچے کو اراکاتاکا میں جنم دیا۔ اور پھر، شاید ٹیلیگراف آپریٹر سے اس کی شادی کے باعث پیدا ہونے والی تلخی کی باقیات کو رفع کرنے کی غرض سے، اس نے نومولود کو اس کے نانانانی کے ہاتھوں پرورش پانے کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔ اس طرح گابریئل اس گھر میں، بہت سی عورتوں کے درمیان تنہا لڑکے کے طور پر بڑا ہوا۔ ان میں دونا ترانکیلینا تھیں جو مُردوں سے زندوں کی طرح بات کرتی تھیں، اور ان کے علاوہ خالہ فرانسسکا، خالہ پیترا اور خالہ الویرا تھیں۔ یہ تمام عورتیں تخیل پرست تھیں اور مستقل طور پر پرانی یادوں کے درمیان رہا کرتی تھیں۔ ان سب میں پیش گوئی کی حیران کن صلاحیت موجود تھی اور اکثر وہ اپنے گوابیرا کے انڈین ملازموں کی طرح توہّم پرستی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ وہ سب غیرمعمولی واقعات کو اس طرح برتتی تھیں گویا وہ انتہائی فطری باتیں ہوں۔ مثلاً خالہ فرانسسکا سیموتوسیا، جو ایک مضبوط اور کبھی نہ تھکنے والی عورت تھیں، ایک روز اپنا کفن بُننے بیٹھ گئیں۔ جب گابریئل نے پوچھا کہ "آپ یہ کفن کیوں بنا رہی ہیں؟" تو اس نے جواب دیا "اس لیے بیٹے کہ میں مرنے والی ہوں"، اور یہ حقیقت ہے کہ جونہی اس کا کفن تیار ہوا، وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی، اور مر گئی۔

گابریئل کے نانا بلاشبہ گھر کی سب سے اہم ہستی تھے۔ کھانے کی میز پر بڑےمیاں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی اور ان کے اردگرد نہ صرف گھر کی عورتیں بیٹھی ہوتیں بلکہ وہ دوست اور رشتہ دار بھی جو اُس روز گیارہ بجے کی گاڑی سے وہاں پہنچے ہوتے۔ ان کی ایک آنکھ گلوکوما کے ہاتھوں ضائع ہو چکی تھی مگر وہ عمدہ اشتہا، نکلتی ہوئی توند اور سرگرم جنسیت کے مالک تھے جس کے سبب علاقے بھر میں درجنوں ناجائز بچوں کا جنم ہوا تھا۔ کرنل مارکیز ایک اصول پسند لبرل تھے اور پورا قصبہ ان کا بیحد احترام کرتا تھا۔ اس واحد آدمی کو جس نے کبھی ان کی توہین کی جراٴت کی تھی، انھوں نے اپنے پستول کی ایک ہی گولی سے قتل کر دیا تھا۔

بھری جوانی میں کرنل نے ان خانہ جنگیوں میں حصہ لیا تھا جو وفاق کے حامی لبرل اور روشن خیال لوگوں نے، بڑے جاگیرداروں، کلیسا اور ریاستی فوج کی پشت پناہی سے یکے بعد دیگرے اقتدار میں آنے والی کنزرویٹو حکومتوں کے خلاف لڑی تھیں۔ ان میں سے آخری جنگ،

جو ۱۸۹۹ میں شروع ہوئی اور ۱۹۰۲ تک جاری رہی، اپنے پیچھے ایک لاکھ لاشیں چھوڑ گئی تھی۔ گاریبالدی کی روایت اور فرانسیسی انقلابیت کے زیرِاثر ایک پوری نوجوان لبرل نسل سرخ قمیصوں میں ملبوس، جھنڈے اٹھائے میدانِ جنگ میں اتری تھی اور نیست و نابود کر دی گئی تھی۔ کرنل نے اپنے معرکے، افسانوی شہرت کے مالک جنرل رافیل اُریبے اُریبے کی کمان میں، ساحلی علاقوں میں سر کیے تھے جہاں سب سے زیادہ خونریزی ہوئی تھی۔ (جنرل کی شخصیت کے بعض پہلوؤں اور اس کے بہت سے جسمانی خدوخال کی بنیاد پر گابریئل آگے چل کر کرنل اوریلیانو بوئندیا کا کردار تراشنے والا تھا۔)

جنگ کے زمانے کے واقعات اپنے ذہن میں باربار بسر کرنے کی عادت میں مبتلا ساٹھ سالہ نانا اور ان کے پانچ سالہ نواسے کے درمیان، جن کے سوا اس عورتوں سے بھرے گھر میں کوئی اور مرد نہ تھا، ایک انوکھی اور مضبوط دوستی قائم ہو گئی۔

گابریئل کے حافظے میں اس بوڑھے آدمی کی انتہائی خوشگوار یادیں ہمیشہ محفوظ رہنی تھیں: کھانے کی میز پر، جب وہ گھر کی عورتوں کی مستقل چلتی رہنے والی باتوں کے درمیان پُرسکون اور تحکّمانہ انداز سے اپنی چمک سنبھالتے تھے اور سالن کی بھاپ اگلتی قاب ان کے سامنے رکھی ہوتی تھی؛ — پھر میں جب وہ دونوں پیدل قصبے کا چکر لگاتے تھے؛ جب وہ چلتے چلتے اچانک گلی کے درمیان رک کر اسے (ایک پانچ سالہ لڑکے کو) ایک لمبی سانس بھر کر کسی اہم راز میں شریک کرتے: "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مرا ہوا آدمی کتنا وزنی ہوتا ہے۔"

گابریئل کو وہ صبحیں بھی یاد رہنے والی تھیں جب نانا اسے لے کر کیلوں کے باغات میں گئے تھے تاکہ وہ دونوں پہاڑوں سے بہہ کر آنے والی ندی میں تیر سکیں۔ بڑے بڑے، سفید اور ماقبلِ تاریخ کے انڈوں سے مشابہ پتھروں پر تیزی سے بہتا ٹھنڈا صاف پانی؛ باغ کی خاموشی اور دن کی گرمی بڑھنے کے ساتھ ساتھ جھینگروں کی بڑھتی ہوئی آوازیں؛ اور بڑےمیاں کی طویل گفتگو: خانہ جنگیوں، محاصروں، لڑائیوں، خنجر جڑی ہوئی توپوں، گرجاگھروں کی راہداریوں میں دم توڑتے زخمیوں اور قبرستان کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیے جانے والوں کے بارے میں باتیں — یہ سب کچھ، یادداشت کے دورافتادہ ساحل پر سر مارتی پُرخروش لہروں کے جھاگ کی طرح، ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہنے والا تھا۔

نانا اپنے دوستوں سے دون انتونیو داسکونتی کے کیفے میں ملا کرتے تھے (جو "تنہائی کے سو سال" میں پیترو کریسپی کے کردار کا ماخذ بننے والا تھا)۔ یہ تمام دوست انھی کی طرح کے پرانے لبرل تھے جنھوں نے اپنے فوجی اعزازات بارود کی بُو اور جنگ کے شور کے درمیان حاصل کیے تھے: کپتان، کرنل اور جنرل۔ اس خونریز تنازعے کی یاد کیفے میں چھت کے پنکھوں کے نیچے ان کی طویل، یادآور گفتگو میں پھر سے یوں روشن ہو اٹھتی گویا اس کے بعد ہونے والے واقعات کی، یہاں تک کہ کیلے کی تجارت کے جوش وخروش کی بھی، ان کی زندگیوں میں کوئی اہمیت نہیں۔

پُرسکون شخصیت کے مالک عمررسیدہ کرنل کا سلوک اپنے نواسے سے بیحد توجّہ کا تھا۔ وہ اس کی بات دھیان سے سنتے اور اس کے تمام سوالوں کا جواب دیا کرتے۔ جب نہ دے پاتے تو کہتے، "آؤ ڈکشنری میں دیکھیں وہ کیا کہتی ہے۔" (اس طرح گابریئل کے دل میں اس گردآلود

کتاب کے لیے گہرا احترام پیدا ہو گیا جو اتنے سارے مشکل سوالوں کے جواب رکھتی تھی۔) جب کبھی کوئی سرکس قصبے میں اپنے خیمے گاڑتا تو بوڑھے کرنل مارکیز اپنے نواسے کو انگلی پکڑ کر وہاں لے جاتے اور اسے خانہ بدوشوں، رسّی پر کرتب دکھانے والوں اور سانڈنیوں کے بارے میں بتایا کرتے۔ اور وہیں ایکبار انھوں نے منجمد سمندری مچھلیوں کا ایک صندوق کھلوا کر برف کے اسرار سے اس کا پہلی بار تعارف کرایا تھا۔

گابریئل کو اپنے نانا کے ساتھ بنانا کمپنی کی زمینوں کے کنارے تک جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ نظارہ اسے مسحور کر دیتا تھا۔ غیروں کی اس جاگیر کے اردگرد لگی تاروں کی باڑھ میں سے اسے ہر چیز صاف ستھری، خنک، اور قصبے کی گرد اور شدید گرمی سے بےاندازہ دور لگتی تھی۔ وہاں تیراکی کے تالاب تھے جن کا پانی نیلا تھا اور جن کے گرد چھتریوں تلے میز کرسیاں چنی ہوئی تھیں؛ خوبصورت سبز لان تھے جو لگتا تھا ورجینیا کے پکچر پوسٹ کارڈوں سے اٹھائے گئے ہیں۔ یہ اس گرم خطے کے بیچوں بیچ بسی ہوئی اسکاٹ فٹزجیرالڈ کی دنیا تھی۔

شام کے وقت نوجوان امریکی لڑکیاں جدیدترین فیشن کے مطابق ملبوس، جنھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ براہ راست بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے پیرس کے موروپارناس، یا نیویارک کے ہوٹل پلازا کی لابی سے چلی آ رہی ہیں، اپنی کار میں بیٹھ کر اراکاتاکا کے قصبے کی گرم گلیوں میں چکر لگاتیں۔ یہ ایک کنورٹیبل کار تھی اور اس میں، دو عظیم الجثّہ السیشئین کتّوں کے درمیان بیٹھی، وہ بیحد نازک اور مسرور اور اپنے ململ کے سفید باریک لباسوں میں اردگرد کی گرمی سے بےنیاز معلوم ہوتی تھیں۔

وہ گردوغبار، وہ لڑکیاں، گلیوں میں شام کےوقت پھرنے والی وہ کنورٹیبل کار؛ اس کے نانا کے ساتھ جنگ کی پرانی یادیں تازہ کرنے والے شکست خوردہ بوڑھے سپاہی؛ اپنا کفن تیار کرتی ہوئی خالائیں؛ مُردوں سے گفتگو کرنے والی نانی؛ اور خالی خواب گاہوں میں آہیں بھرتے ہوئے مرحوم رشتےدار؛ باغیچے میں چنبیلی کے پودے؛ کیلوں سے لدی زرد ریل گاڑی؛ گھنے باغات کے درمیان سے گزرتی ہوئی تازہ پانی کی ندی؛ صبح سویرے کراکلوں کی چہکار۔ یہ سب مٹ جانے والا تھا، اسے ہوا اسی طرح اڑا لے جانے والی تھی جس طرح "تنہائی کے سو سال" کے آخری صفحوں میں ماکونڈو کے قصبے کو۔

جب گابرئیل کی عمر آٹھ برس کی تھی، اس کے نانا کی موت نے اس کے ابتدائی بچپن، اور ساتھ ہی اس کے اراکاتاکا کا خاتمہ کر دیا۔ اسے اتنی پلاتو سطح مرتفع پر واقع دوردراز دارالحکومت میں بھیج دیا گیا۔ جہاں سے اسے، برسوں بعد، اپنی قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بہت مختصر وقت کے لیے واپس آنا اور اس ویرانی کو دریافت کرنا تھا جو کسی شے کے ہمیشہ کے لیے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ نانا کا مکان فروخت کرنے کو لیے آیا تھا۔ شکستہ اسٹیشن پر، جو کبھی لوگوں اور رنگین چھتریوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا، کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ ریل گاڑی نے انھیں دوپہر کی سانس لیتی ہوئی خاموشی کے درمیان اتار دیا جیسے جھینگروں کی آوازیں چیر رہی تھیں، اور وہ اپنے راستے پر چل دی، جیسے کسی آسیبی قصبے سے گزرتی چلی جا رہی

ہو۔ ہر شے برباد، ترک کردہ، اور گرمی اور بےاعتنائی کی کھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ لکڑی کے پرانے مکانوں اور چوک پر لگے بادام کے درختوں پر برسوں کی گرد جم چکی تھی۔

جذبات سے مغلوب گابرئیل اور اس کی ماں ان گلیوں میں چلتے ہوئے، بربادی کی اس تصویر میں، رونق اور خوش حالی کے جیتےجاگتے دنوں کی دوردراز کی یادوں سے رنگ بھرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھیں جگہوں اور مکانوں کو پہچاننے میں بہت دشواری ہوئی اور انھیں یقین نہ آیا کہ یہ مکان کبھی معزز گھرانوں کی، ولندیزی جالی کے لباسوں سے مزیّن عورتوں اور بڑی بڑی مونچھوں والے جنرلوں کے مسکن رہ چکے تھے۔

اس کی ماں کو اپنی جو پہلی سہیلی ملی (جو ایک نیم تاریک کمرے میں سلائی کی مشین لیے بیٹھی تھی)، وہ پہلی نظر میں پہچان میں نہ آئی۔ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا کیں جیسے اِن تھکے ہوئے اور سال خوردہ خدوخال کے پیچھے ماضی کی اُن حسین اور کھلکھلاتی لڑکیوں کی جھلک تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں جو وہ کبھی رہ چکی تھیں۔ سہیلی کی آواز میں غمناکی اور کچھ حیرت تھی۔

"ارے تم!" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"میرے پہلے ناول کا جنم اسی ملاقات میں ہوا"، گابرئیل کہتا ہے۔

پہلے ناول کا، اور شاید اس کے بعد آنے والے تمام ناولوں کا بھی۔

دریا کے ریتیلے کناروں پر گرمی کے ہاتھوں غنودہ ایک مگرمچھ اچانک نمودار ہوتا۔ ہوپھٹے یا شام کے وقت جب سورج کی آتشیں کرنیں رخصت ہو رہی ہوتیں، دور کے کناروں سے بندر اور توتے شور مچایا کرتے۔ مارک ٹوین کے دریائے مسی سپی میں چلنے والی دریائی اسٹیمروں کی طرح، پہیوں کے زور سے چلائی جانے والی کشتی دریائے ماگدالینا میں ہولے ہولے ملک کے اندرونی علاقوں کی سمت بڑھ رہی ہوتی۔ یہ آٹھ دنوں کا سفر ہوا کرتا تھا۔ اسی کشتی میں تیرہ سالہ گابرئیل نے پہلی مرتبہ ایک قسم کی جلاوطنی کا آغاز کیا جو اس کی زندگی کی راہ متعین کرنے والی تھی۔

کشتی کے بعد ایک ریل گاڑی تھی جو کہرآلود پہاڑوں پر، زور لگا کر، آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی۔ اس طویل سفر کے اختتام پر، جنوری کی ایک سہ پہر، جو اسے اپنی زندگی کی اداس ترین سہ پہر کے طور پر اب بھی یاد ہے، اس نے خود کو بوگوتا کے اسٹیشن پر پایا۔ اس نے اپنے باپ کے سوٹ کو تراش کر بنایا ہوا سیاہ سوٹ، واسکٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا، اور ایک صندوق اٹھا رکھا تھا "جس میں تدفین کے مقدّس تابوت کی سی شان تھی۔"

اسے بوگوتا "ایک دورافتادہ، اداس شہر" معلوم ہوا، "جہاں ایک متواتر ہلکی بارش سولھویں صدی کے آغاز سے جاری تھی۔ اس کے دارالحکومت کی پہلی چیز جس کا مجھے احساس ہوا، یہ تھی کہ بہت سارے لوگ بیحد عجلت میں نظر آ رہے تھے؛ انھوں نے مردوں سی

طرح سیاہ سوٹ اور ہیٹ پہنے رکھتے تھے، اور کہیں کوئی عورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پھر میں نے بارش میں بیئر کی بوتلوں سے بھری گاڑیاں کھینچتے ہوئے قوی ہیکل گھوڑوں، برستی بارش میں گلیوں کے موڑ کاٹتے وقت پھلجھڑیوں کی طرح چنگاریاں چھوڑتی ٹراموں اور طویل جنازوں کی وجہ سے باربار ہونے والے ٹریفک جام کے وجود کو محسوس کیا۔ یہ دنیا کے سب سے زیادہ مضحکہ خیز جنازے تھے: آراستہ اور عظیم الشان میت گاڑیاں، اور کالی کلغیوں والے پٹوں سے مزیّن سیاہ گھوڑے، اور اہم خاندانوں سے تعلق رکھنے والی میت، وہ بلند رتبہ خاندان جن کے خیال میں موت کی ایجاد انھی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔"

یوروپ کے لوگ جو موسم کی سست رو تبدیلی کے عادی ہوتے ہیں — وہ تبدیلی جس کا تعلق سال کے مخصوص وقت سے ہوتا ہے نہ کہ کسی مخصوص مقام سے — اساسی سیاسی تضاد کا تصور نہیں کر سکتے جو کولومبیا کی سرحدوں کے اندر آباد کریبیئن کے ساحل اور اینڈیز کے پہاڑوں کی دو مختلف دنیاؤں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

یہ تضاد سب سے بڑھ کر [illegible] ہے۔ کریبیئن کو، جو گرمی اور تیز روشنی کی دنیا ہے، صرف گہرے سبز اور نیلے رنگوں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اینڈیز میں، جو کہر، بارش اور سرد ہواؤں کی دنیا ہے، مٹیالی اور اداس ہلکے سبز رنگوں کا ایک بدلتا ہوا سلسلہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تضاد لوگوں کا بھی ہے۔ اندلسیوں، افریقیوں اور سرکش کریب انڈین نسلوں سے پیدا ہونے والے ساحلی باشندے بےتکلف اور پرجوش لوگ ہیں۔ وہ نام و نمود کی پروا نہیں کرتے اور نہ سماجی درجے اور حسب مراتب کا کوئی خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ انھیں رقص سے عشق ہے۔ ان کی پرتموج موسیقی میں، مست کر دینے والی افریقی تال شامل ہے۔ دوسری جانب پہاڑوں کے باسی کولومبیئن، کاسٹیلین روایت پسندی اور چبچا انڈین لوگوں کے سے کم گو اور شکّی انداز سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے موڈ بھی اچانک بدل جاتے ہیں۔ ان کے شائستہ آداب کے پیچھے جارحیت کا امکان پوشیدہ ہوتا ہے، جو کسی وقت شراب کے زیرِاثر غیرمتوقع طور پر سطح پر بھی آ سکتی ہے (ملک کے سیاسی تشدّد کا آغاز ہمیشہ انہی پہاڑوں سے ہوا ہے، نہ کہ ساحلی علاقوں سے۔) وہاں کے لوگوں کی موسیقی بھی ان کے اردگرد کے لینڈسکیپ سے ملتی جلتی ہے، اور حسرت ناک انداز میں جدائیوں، محرومیوں اور ناکام محبتوں کی کہانیاں سناتی ہے۔

ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کسی تیرہ سالہ لڑکے کے لیے اتنی مختلف دنیا میں بھیج دیے جانے سے بڑھ کر دشوار اور مضطرب کر دینے والی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اداسی کے عالم میں وہ دارالحکومت میں گھومتا پھرتا رہا۔ دھندلی ہوتی روشنی میں گھنٹیاں ایمان والوں کو عبادت کے لیے بلا رہی تھیں۔ ٹیکسی کی کھڑکیوں سے اس نے بارش میں بھیگی سنسان سڑکیں دیکھیں اور اس کا دل اس ماتمی ماحول میں کئی برس گزارنے کے خیال سے ڈوبنے لگا۔ جو شخص اسٹیشن پر اسے لینے پہنچا تھا وہ اسے روتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

سیکنڈری اسکول، جس میں اسے داخلہ ملا تھا، "ایک کانوینٹ میں واقع تھا جہاں نہ شاور تھے اور نہ پھول" اور "دورافتادہ، اداس، سمندر سے چھ سو میل کے فاصلے پر واقع"

اسی قصبے میں قائم تھا جہاں اوریلیانو سیگندو، فرناندا دیل کارپیو کو لینے کی غرض سے گیا۔ کریبیئن سے تعلق رکھنے والے لڑکے گابریئل کے لیے یہ اسکول ایک سزا سے کم نہ تھا اور یہ برفیلا شہر ایک ناانصافی کی بات تھی۔

پڑھنا اس کے لیے واحد بہلاوا تھا۔ خاندان سے دُوری اور پیسوں سے محرومی کے عالم میں شہری دنیا میں رہنے پر مجبور ساحلی لڑکے گابریئل کو اس عسرت کی حقیقت سے کتابوں ہی میں پناہ ملنے والی تھی۔ انھیں اسکول کی ڈارمیٹری میں کتابیں بلند آواز سے پڑھ کر سنائی جاتی تھیں — "دی میجک ماؤنٹین"، "دی تھری مسکیٹیئرز"، "دی ہنچ بیک آف نوٹرڈیم"، "دی کاؤنٹ آف مونٹی کرسٹو" اور "ڈون کیہوٹی"۔ زپاکیرا کی سردی اور اداسی سے ترساں گابریئل اسکول کی لائبریری میں چھپ کر جیول ورن اور سالگری کے ناول، اور اسکول کی کتابوں میں شامل ہسپانوی و کولمبیئی شاعروں کی نظمیں پڑھا کرتا جو خراب اور مصنوعی شاعر تھے۔ خوش قسمتی سے اس نے اسی زمانے میں ایک ادبی دریافت کر لی۔ اس کی ملاقات چند ایسے کولومبیئی شاعروں سے ہوئی جنھوں نے روبن داریو، خوان رامون خمینیز اور (زیادہ فوری اور قابل فہم طور پر) پابلو نیرودا سے متاثر ہو کر "پتھر اور آسمان" کے نام سے ایک گروپ بنا رکھا تھا۔ ادبی باغیوں کا یہ گروپ رومانویوں، پارناسیوں اور نوکلاسیکیوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ حیران کن جرأت مندی سے استعارے کا استعمال کرتے تھے۔ "وہ اس زمانے کے دہشت پسند تھے،" گابریئل اب کہا کرتا ہے۔ "اگر میری ملاقات ان لوگوں سے نہ ہوئی ہوتی تو شاید آج میں ادیب نہ ہوتا۔"

جب اس نے سیکنڈری اسکول کی تعلیم مکمل کی اور بوگوتا کی نیشنل یونیورسٹی میں قانون پڑھنے کے لیے داخلہ لے لیا، تب بھی شاعری کو اس کی زندگی کی بنیادی دل چسپی کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ قانونی متون کی بجائے نظمیں پڑھا کیا۔ نظمیں، نظمیں، نظمیں، جیسا کہ وہ اب کہتا ہے۔ "اس زمانے میں میرا سب سے زیادہ پُرتعیش مشغلہ یہ تھا کہ ہر اتوار کو نیلے شیشوں والی ٹرام میں سوار ہو جاتا جو پانچ سینٹ کے عوض پلازا بولیوار سے ایوینیدا دچیلے تک لے جاتی اور واپس لاتی تھی۔ اداس سہ پہروں کا وہ تسلسل جس میں ایک اور ویران اتوار کے امکان کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ میں اس چکّردار سفر کو نظموں کی لاتعداد کتابیں پڑھ پڑھ کر گزارتا تھا اور شہر کے ہر بلاک کو طے کرتے ہوئے ایک مختصر مجموعہ پڑھ ڈالتا، یہاں تک کہ کبھی نہ رُکنے والی بارش میں گلیوں کے لیمپ روشن ہونے لگتے۔ تب میں پرانے شہر کے خاموش کیفوں میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں گھوما کرتا جو مجھ پر ترس کھا کر میری پڑھی ہوئی بےشمار نظموں کے بارے میں مجھ سے بات کرے۔"

ناول میں اس کی دل چسپی اس رات شروع ہوئی جب اس نے کافکا کا "میٹامورفوسس" پڑھا۔ اب اسے یاد آتا ہے کہ کس طرح وہ شہر کے وسط میں واقع اپنے خستہ حال ہوسٹل میں، ایک کتاب بغل میں دبائے واپس پہنچا جو اسے ایک دوست نے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ اور جوتے اتارے، بستر پر لیٹ گیا، کتاب کھولی اور پڑھنے لگا، "جب ایک صبح گریگر سمسا اپنے مضطرب خوابوں سے بیدار ہوا تو اس نے خود کو اپنے بستر پر ایک بڑے سے کیڑے میں منقلب پایا۔" گابریئل پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس نے کتاب بند کر دی۔ "میرے

خدا؟" وہ سوچنے لگا، "تو ایسا بھی لکھا جا سکتا ہے؟" اگلے روز اس نے اپنی پہلی کہانی لکھی۔ تعلیم وغیرہ سب اس کے دماغ سے محو ہو گئی۔

لیکن بلاشبہ اس کا یہ جرأت مندانہ فیصلہ اس کے باپ کی سمجھ میں نہ آیا۔ سابق ٹیلیگراف آپریٹر اپنے بیٹے سے وہ کچھ کر دکھانے کی توقع رکھتا تھا جو وہ خود کبھی نہ کر سکا؛ یعنی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنا۔ جب اسے پتا چلا کہ گابرئیل نے پڑھائی ترک کر دی ہے تو وہ اس کے مستقبل سے مایوس ہو گیا۔ گابرئیل کے دوستوں نے بھی، اپنے قدرے مہربان اور پُرمزاح انداز میں، یہی خیال کیا۔ بےترتیب لباس اور بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ بغل میں کتاب دبائے ایک کیفے سے دوسرے کیفے میں آتا جاتا، جہاں رات پڑ جاتی وہیں سو جانے والا گابرئیل لوفر اور آوارہ گرد دکھائی دیتا تھا۔ تب وہ منظم طریقے سے پڑھنے کی بجائے ناول، ناول، ناول پڑھا کرتا تھا۔ سب سے پہلے دستوئیفسکی، پھر تالستائی، ڈکنز، انیسویں صدی کے فرانسیسی ادیب، فلوبیر، ستاں دال، بالزاک، زولا۔

جب وہ بیس برس کا ہوا تو ساحلی علاقوں کو لوٹ گیا۔ اس نے کارتاخینا میں، جو بالکنیوں اور مغرور دیواروں سے گھری تنگ نوآبادیاتی گلیوں والا ایک پرانا شہر تھا، اس نے کریبئن کی روشنی اور گرمی کو ازسرنو دریافت کیا۔ وہ "ایل یونیورسل" نامی اخبار کے گردآلود ادارتی دفتر میں بطور سب ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ اس ملازمت میں اسے اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ کہانیاں لکھ سکے اور بندرگاہ کے قریب ہنگامہ خیز شراب خانوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ صبح اس وقت تک رم پی سکے جب اسمگلروں کے جہاز طوائفوں کو بطور سامان لاد کر اروبا اور کوراساؤ کے جزیروں کی طرف جانے کے لیے بادبان چڑھانے لگتے۔

اس دمکتے ہوئے بھروا شہر میں، جسے رقص، حسن کی ملکاؤں اور بیس بال سے پیار تھا، ایک عجیب بات ہوئی۔ وہاں گابرئیل اچانک یونانیوں، خصوصاً سوفوکلیز کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس کا ذمہ دار اس کے من چاہے دوستوں میں سے ایک تھا، جو آج ایک خوشحال کسٹم وکیل ہے اور جو یونانیوں سے اپنی ہتھیلی کی پشت کی طرح واقف تھا۔ اس نے گابرئیل پر کیرکیگارد اور کلوڈیل کو بھی منکشف کیا۔

یونانیوں کے بعد، اس کی ادبی تعلیم کے سلسلے میں مرکزی حیثیت رکھنے والا ایک اور سنگِ میل بیسویں صدی کے اینگلو سیکسن ادب، خصوصاً جوئس، ورجینیا وولف اور ولیم فاکنر کی صورت میں ہوا۔ اس کی اس دریافت کا سہرا ادب گزیدہ بلوہ پسند دیوانوں کے ایک گروپ کے سر تھا جو کریبئن کے ایک اور ساحلی شہر بارنکیلا میں جمع ہو گئے تھے جہاں گابرئیل کارتاخینا کے بعد مقیم ہو گیا تھا۔

بارنکیلا، جو دریائے ماگدالینا کے ڈیلٹا کے گردوغبار اور گرمی میں گھرا ہوا ایک بڑا صنعتی شہر ہے، کارتاخینا کی سی کوئی کشش نہیں رکھتا؛ وہاں نہ نیلے کانچ کا چمکتا ہوا سمندر ہے، نہ کارتاخینا جیسی دیواریں، لائٹ ہاؤس یا قدیم بالکنیاں ہیں اور نہ شہزادیوں، بحری قزاقوں اور محتسبوں کی روحیں نوآبادیاتی حویلیوں میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ یہ ایک کھلا شہر ہے جو مختلف خطوں سے آنے والوں کے خیرمقدم کے لیے تیار رہتا ہے۔ ساتی سے فرار ہو کر یاہودی [illegible] کے رستے پر چل کر آنے والے فرانسیسی، پہلی جنگ عظیم کی شکست

خوردہ جرمن، پاگل نازیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے یہودی، جنوبی اٹلی، شام، لبنان اور اُردن کے تارکین وطن جو ایک، دو یا تین نسلوں پہلے نہ معلوم کس طرح آئے اور انہوں نے رفتہ رفتہ شہر کے موجودہ باعزت گھرانوں کی بنیاد ڈالی۔ کارنیوال کے سالانہ وقفے کو چھوڑ کر، جس میں پھولوں، حسین لڑکیوں اور ساٹن کے شوخ لباسوں میں شور مچاتی سازندوں کی ٹولیوں سے لدی گاڑیاں شہر کی گلیوں میں دوڑتی ہیں، اس شہر کے باسیوں کی زیادہ تر توانائی صنعت اور تجارت میں صرف ہو جاتی ہے۔ تجارتی سرگرمی اور سہل تفریحات کے اس ماحول میں ادب اور آرٹ کو کسی ویران گوشے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ایسی جگہ کسی بھی اور جگہ سے بڑھ کر ادیبوں اور مصوروں کی حیثیت سماجی ہیئت میں اجنبی عناصر کی سی ہوتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ، شاید اسی ناامید تنہائی کے سبب سے، بارنکیلا میں آرٹسٹ بوگوٹا کے مقابلے میں کہیں زیادہ توانائی سے پھلتے پھولتے ہیں، حالانکہ بوگوٹا کو نوآبادیاتی وقتوں سے تہذیبی برتری کا دعوا ہے۔

ادب کے جنون میں مبتلا دیوانوں کے جس گروہ سے گابرئیل کی بارنکیلا میں انیس سو پچاس کے عشرے میں ملاقات ہوئی انہیں آج یوروپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں میں لاطینی [امریکی ا]دب کے ماہرین سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔ ان کے خیال میں گارسیا مارکیز اسی دیدہ زیب ادبی خاندان کا خلف ہے جسے "بارنکیلا گروپ" کہا جاتا ہے۔ خواہ اس براہِ راست نسب پر اصرار درست ہو یا نہ ہو، یہ یقیناً درست ہے کہ یہ گروہ اس براعظم کے انتہائی باعلم اور عقلی تجسس کے حامل گروہوں میں سے تھا اور گارسیا مارکیز کی ادبی تربیت پر اس کا فیصلہ کن اثر ہوا۔

یہ گروپ نہایت بے ادب اور فراوانی سے لبریز نوجوانوں پر مشتمل تھا جو پکے شرابی تھے اور درحقیقت پینیول (Pagnol) کی تحریروں سے نکل کر آنے والے مخصوص کریبئن کرداروں سے مشابہ تھے۔ یہ لوگ خود کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے پکے دوست تھے اور اُن دنوں اَن تھک مطالعے میں مصروف تھے؛ جوئس، ورجینیا وولف، اشٹائن بیک، کالڈویل، فاکنر (جسے وہ بڑے میاں کہا کرتے تھے) ان کے مشترک شغف تھے۔ وہ اکثر رات بھر ان دیومالائی قحبہ خانوں میں بیٹھے پیتے اور ادب پر بحث کرتے رہتے تھے، جو پرندوں اور پودوں اور خوردہ کمسن لڑکیوں سے بھرے ہوئے تھے جو بھوک کے باعث جسم فروشی کرتی تھیں، جسے بعد میں اس نے "تنہائی کے سو سال" میں بیان کیا۔

"یہ میری زندگی کا انتہائی حیرانی کا دور تھا" گابرئیل پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "اور یہ نہ صرف ادب کی بلکہ زندگی کی دریافت کا دور تھا۔ ہم پوری رات شراب سے مست ہوتے اور ادب پر گفتگو کرنے میں گزار دیتے۔ ہر رات گفتگو میں کم ازکم دس ایسی کتابوں کا ذکر آ جاتا جو میں نے نہیں پڑھی ہوئی تھیں۔ اگلے روز وہ سب (اس گروپ کے دوستوں سے) مجھے ادھار مل جاتیں۔ یہ سب کتابیں ان کے پاس تھیں اور پھر اس گروپ میں ایک کتب فروش بھی شامل تھا اور کتابیں منگوانے کے لیے فہرست بنانے میں ہم سب اس کی مدد کرتے تھے۔ جب کبھی بیونس آئرس سے کتابوں کا صندوق موصول ہوتا تو ہم سب ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ یہ کتابیں ارجنٹینا کے اشاعت گھروں سیُودامیریکانا، لوسادا اور سُور سے

آتی اور ان تمام شاندار تحریروں کا ترجمہ بورخیس کے دوستوں نے کیا ہوتا تھا۔"

اس گروپ کا ادبی اتالیق دون رامون وینیز نامی ایک کتالان جلاوطن تھا۔ اس کی عمر ان سب سے زیادہ تھی۔ وہ چند سال پیشتر پہلے اپنے وطن سے ری پبلک کی شکست کے باعث، اور پھر پیرس سے نازیوں کے ہاتھوں نکالے جانے کے بعد، بارنکیلا میں وارد ہوا تھا۔ دون رامون کو ادب سے ویسا ہی لگاؤ تھا جیسا کسی سپاہی کو اپنی بندوق سے ہوتا ہے۔ اس نے ان نوجوانوں کے اندھادھند مطالعے میں ایک ترتیب پیدا کی۔ اس کی باعث گابریئل اور اس کے دوستوں نے ایک سحرزدگی کے عالم میں فاکنر کے ناولوں کی دنیا دریافت کی، اور جوئس کی ستائش زدہ جھوٹی بڑی شاعر ہوں پر ورد گردی کی لیکن گھیرکسے وہ ممیں پکار کر چونک دیتا اور ان کی توجہ ہومر کی جانب مبذول کراتا۔

برسوں بعد گابریئل وینیز کا یہ قرض اتار کر اسے "تنہائی کے سو سال" کے بوڑھے دانش مند کتالان کا روپ دینے والا تھا جو اپنی موت سے پہلے بارسلونا چلا جاتا ہے لیکن ماکوندو کی یاد میں سرگشتہ رہتا ہے۔ درحقیقت کتاب کے آخری صفحات کا ماکوندو، ارکاتاکا کی نہیں بلکہ اس دور کے بارنکیلا کی تصویر ہے۔

اس حیران کن، غلیظ شہر کو یاد کرتے ہوئے آج بھی گابریئل کو نوسٹلجیا کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ "کوچہ جرائم" کے مے خانے اور قحبہ خانہ "آئس" نامی مے خانہ جسے انھوں نے قرض لے لے کر کنگال کر دیا تھا، اور دوسرا "غار" نامی مشہور شراب خانہ جہاں ادب کے دھنی ان نوجوانوں کی ملاقات شکاریوں اور مچھیروں سے ہوا کرتی کبھی نہ ختم ہونے والی گلیاں اور راتیں۔

وہ کبھی کبھی طوائفوں کے اس "ہوٹل" کو یاد کرتا ہے جہاں اس کا ایک کمرہ تھا۔ جب اس کے پاس اگلی رات کا کرایہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے تو وہ ہوٹل کے ملازم کے پاس اپنے زیرِتحریر ناول کا نامکمل مسودہ ضمانت کے طور پر رکھوا دیا کرتا۔ "وہ ہوٹل،" اب وہ یاد کرتا ہے، "بہت بڑا تھا اور اس میں کمروں کو تقسیم کرنے والی گتّے کی دیواریں اتنی پتلی تھیں کہ برابر والے کمرے میں ہونے والی رازونیاز صاف سنائی دیتے تھے۔ کئی بار میں اعلا سرکاری افسروں کی آوازیں پہچان لیتا تھا اور یہ دریافت کر کے بہت متاثر ہوتا تھا کہ ان میں سے اکثر وہاں مباشرت کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنی عارضی محبوباؤں سے اپنے بارے میں گفتگو کرنے جایا کرتے تھے۔ صحافی کی طور پر میرے اوقات طوائفوں کے اوقات کار سے مطابقت رکھتے تھے، اور ہم سب دن چڑھے بیدار ہو کر ایک ساتھ ناشتہ کیا کرتے تھے۔"

انھی دنوں گواہیرا میں، جو اس کے ننھیال کا وطن اور جھلستی ہوئی ریت کا جزیرہ نما تھا اسے انسائیکلوپیڈیا اور طبّی کتابوں کے سیلزمین کی حیثیت سے روزگار مل گیا۔ بیچا ویچا تو اس نے کچھ نہیں، البتہ لاری ڈرائیوروں اور سفری تاجروں سے بھرے ہوٹلوں میں گرم تپتی راتیں بسر کرنے کے دوران اسے ایک نہایت وفادار ساتھی میسّر رہا، ایک انگریز خاتون جس کی وہ چھپ کر پرستش کرنے لگا، ورجینیا وولف۔

اب اسے اصرار ہے کہ اپنے پہلے ناول کے ابتدائی اشارے اسے "مسز ڈیلووے" سے ملے تھے۔ شاید شعوری طور پر یہ بات درست ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب وہ "پتّوں کا طوفان" لکھنے

بیٹھا تو اس کے پہلو میں صرف طبقۂ اشرافیہ کی یہ بظاہر دوشیزہ، مسز وولف، نہیں تھی۔ وہاں دوسرے ادیب بھی تھے جنھوں نے اس کی ادبی تعلیم وتربیت میں حصہ لیا تھا۔ سالگری او جیوُل ورن جن کے ساتھ اس نے اپنے بورڈنگ اسکول کی تنہائی کو فریب دیا تھا؛ وہ محبوب شاعر جنھیں اس نے بوگوتا کے اتواروں کی اُن کہرآلود سہ پہروں میں نیلے شیشوں والی ٹراموں میں سفر کرتے ہوئے پڑھا تھا؛ کافکا، اور روسی اور فرانسیسی ناول نگار، جنھیں اس نے اپنی طالب علمی کے ہوسٹل میں دریافت کیا تھا؛ انگریز اور امریکی ادیب جن کا انکشاف بارنکیلا کے مے خانوں اور قحبہ خانوں میں دوستوں کے ساتھ بیئر کی بوتلوں کے درمیان ہوا تھا۔

سو جب وہ اپنی ماں کے ساتھ اس سفر کے بعد اراکاتاکا سے واپس آیا تو نہ صرف اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا بلکہ لڑکپن اور پُرہیجان نوجوانی میں اتنے سارے ادیبوں کی صحبت میں رہنے کے بعد وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے کس طرح کہا جائے۔

اس نے اپنی پہلی کتاب ایک ہی ہلّے میں مکمل کی۔ وہ بارنکیلا میں "ہل ہیرالدو" کے دفتر کے خالی ہونے کے بعد رات بھر لکھتا رہتا۔ جب لائنوٹائپ مشینیں خاموش ہو جاتیں اور نیچے کی منزل میں لگے ہوئے پریس کے ہانپنے اور ہونکنے کی آوازیں آیا کرتیں، چھت کے پنکھے خالی کرسیوں کے اوپر گھوم گھوم کر گرمی کی شدت کم کرنے کی بےسود کوشش کر رہے ہوتے اور "کوچۂ جرائم" میں واقع مے خانوں سے موسیقی کی تیز آواز تیرتی ہوئی اندر آ رہی ہوتی۔ جب گابریئل تکان سے چُور، لیکن مکمّل بیدار، اس حالت میں اپنے ٹائپ رائٹر سے اٹھتا کہ ماکوندو کی تصویریں اور کردار اس کے ذہن میں گھوم رہے ہوتے، تو رات تقریباً ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ تازہ لکھے ہوئے صفحات چمڑے کے ایک بستے میں رکھ لیتا اور دفتر سے باہر نکل جاتا۔ باہر جا کر وہ دلدلی زمین کی گرم بُو اور گلتے ہوئے پھلوں کی باس میں سانس لیتا جو اس شہر پر عادتاً چھائی رہتی ہے۔ کوئی شرابی کسی مے خانے کی دہلیز پر ٹھوکر کھاتا۔ مسودہ بغل میں دبائے، گابریئل سان نکولاس کے چوک کو پار کرتا جہاں رات کے اس آخری حصے میں گداگروں اور غلاظت کے انباروں کے سوا کچھ نہ ہوتا، اور چوک پار کر کے گلی کے سرے پر واقع طوائفوں کے "ہوٹل" کا رخ کرتا جس کے قریب منشی بیٹھا کرتے تھے۔ ہر رات ڈیڑھ پیسو کے معاوضے پر ایک مختلف کمرہ (یا بلکہ گتّے کی چار دیواروں سے گھرا ایک سہابیاب پلنگ) اس کے لیے خالی رکھا جاتا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس کے پہلے ناول "پتّوں کا طوفان" نے جنم لیا۔ یہ ایک توانا تحریر تھی جس میں ماکوندو کی ویرانی اور نوسٹلجیا اپنا اظہار پانے لگا تھا۔ اور یہ اس لائق تھی کہ مارکیز کو لاطینی امریکا میں ایک مقام عطا کر دے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ قدرشناسی یا شہرت — جو بھی نام اس انعام کو دیا جائے جس کی ہر ادیب ایک اچھی کتاب (بلکہ گابریئل کے معاملے میں چار اچھی کتابیں) لکھنے کے بعد توقع کرتا ہے — اسے کئی برس بعد نصیب

ہوئی، جب اس کی پانچویں کتاب "تنہائی کے سو سال"، پہلے بیونس آئرس میں، پھر پورے لاطینی امریکا میں اور بالآخر تمام دنیا میں، ہاتھوں ہاتھ بکنے لگی، جس پر اسے بےحد حیرت ہوئی۔

اس سے پہلے انتظار کا طویل اور دشوار دور جاری رہا۔ وہ صبر کے ساتھ، جس میں شاید تھوڑی سی تحقیر بھی شامل تھی، انتظار کرتا رہا، پھر بھی اندر ہی اندر شکوک اور ناگزیر دشواریاں اس کا محاصرہ کیے رہیں۔

"پتّوں کا طوفان" کے چھپنے میں پانچ سال کا عرصہ لگا۔ ان چند ناشروں نے، جنھیں اس نے اس کا مسودہ پیش کیا، اس میں کسی دل چسپی کا اظہار نہ کیا۔ ہسپانوی نقاد گیلیرمو دی توریے نے، جو بیونس آئرس کے لوسادا اشاعت گھر کا مشیر تھا، اسے ایک تُندوتیز تبصرے کے ذریعے مسترد کر دیا، جس میں اس نے کہا کہ اسے ایک مخصوص شاعرانہ کشش کے سوا اس کتاب میں ایسی کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی جس کی بنا پر وہ اس کی سفارش کر سکے۔ اس نے نہایت نیک نیتی سے مصنف کو کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت تک گابریئل بوگوتا کے اخبار "ایل ایسپیکتادور" میں ملازمت اختیار کر چکا تھا اور بالآخر اسے یہ کتاب چند دوستوں کی مدد سے بوگوتا کے ایک چھوٹے سے طباعت گھر میں خود ہی چھاپنی پڑی۔

اگرچہ مقامی طور پر اس کتاب کو اچھے تبصرے حاصل ہوئے، لیکن اسے ان مضامین کے مقابلے میں جو گابریئل "ایل ایسپیکتادور" میں لکھ رہا تھا، کم توجہ حاصل ہوئی۔ اخبار کے وہ شمارے جن میں وہ ایک غرقاب شدہ جہاز کے ملاح کی مہم کا حال یا ایک سائیکلنگ چیمپئن کی سوانح حیات قسط وار لکھ رہا تھا، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے۔

اس وقت تک جب "ایل ایسپیکتادور" نے اسے اپنے نامہ نگار کی حیثیت سے یورپ روانہ کیا، گابریئل کولومبیا میں صحافی کے طور پر خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا، لیکن ادیب کے طور پر ابھی تک گمنام تھا۔ ریو کوژاس، پیرس، میں واقع ہوٹل دفلاندر کی مالکن کے لیے جس کے پاس وہ ۱۹۵۵ کے موسمِ سرما میں ٹھہرا تھا، وہ "ساتویں منزل والا صحافی" تھا، اور آج بھی جب کبھی وہ گابریئل کی تصویر کسی اخبار میں دیکھتی ہے تو اسے اسی لقب سے یاد کرتی ہے۔

تقریباً یہی زمانہ تھا جب میری اس سے ملاقات ہوئی۔ آج اس کی زندگی پر ہرُوج ثور کی کامیابیوں کا غلبہ ہے، لیکن اس وقت وہ ایک بےمدافعت برُجِ حوت میں تھا، جو صرف اپنی جبلّت کے راڈار کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ دبلا تھا اور الجزائری دکھائی دیتا تھا، جس کی وجہ سے پولیس والے، اور خود الجزائری بھی، شک میں پڑ جاتے۔ وہ بولوار سان‌مشیل میں اسے روک کر اس سے عربی میں بات کرنے کی کوشش کرتے۔ پتھر کی سِلوں کے فٹ پاتھوں اور کہر کے اس شہر میں، جس کا نام پیرس ہے، وہاں کی زبان سے ناآشنائی کے عالم میں، قدم جمانے کی کوشش میں وہ دن بھر میں تین پیکٹ سگریٹ پھونک ڈالتا۔ یہ الجزائر کی جنگ، براسانس کے اولیں گیتوں اور میترو میں اور عمارتوں کے دروازوں میں بوس وکنار کرتے ہوئے جوڑوں کا زمانہ تھا۔ ہوداپسٹ جانے سے قبل کے ان دنوں میں وہ سیاسی دنیا کو کسی ویسٹرن

فلم کی طرح اچھے اور برے لوگوں میں تقسیم شدہ دیکھا کرتا تھا اور اچھے لوگ سوشلزم کی طرف تھے۔

کچھ عرصے قبل ہم دونوں ریو کوژاس کے اس بالائی منزل کے کمرے میں دوبارہ گئے جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے لیٹن کوارٹر کی چھتیں دکھائی دیتی ہیں جہاں سوربون کا گھنٹا اب بھی وقت کا اعلان کرتا ہے، لیکن جو اب صبح کی گلیوں کو اپنی آوازوں سے بھرتے ہاتی چک فروشوں سے خالی ہو چکا ہے۔ گابریئل اس کمرے میں گھٹنے ریڈی ایٹر پر رکھے، دیوار پر آنکھوں کی بلندی کے پاس اپنی محبوبہ مرسیدس کی تصویر لگائے رات بھر لکھتا رہتا تھا۔ وہاں اس نے ایک ناول لکھنا شروع کیا جس نے بعد میں "منحوس وقت" کی شکل اختیار کی لیکن اسے ابتدا ہی میں اس تحریر کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔ ایک کردار، خانہ جنگی کے زمانے کی پنشن کا انتظار کرتا ہوا ایک بوڑھا کرنل، داخل انداز ہو اور پھر ایک کتاب کا مطالبہ کرنے لگا۔ گابریئل نے وہ کتاب لکھ ڈالی۔ اس نے "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کو "منحوس وقت" کے لیے راستہ صاف کرنے کی غرض سے بھی لکھا اور اپنے روزمرہ کے ہیجان پر ادب کے ذریعے قابو پانے کے مقصد سے بھی۔ اس کتاب کے مرکزی کردار کی طرح اسے بھی پتا نہیں ہوتا تھا کہ اس کا اگلا کھانا کہاں سے آئے گا۔ وہ خود بھی ایک خط کا منتظر تھا، ایک ایسے خط کا جس میں کچھ رقم ملفوف ہو، جو کبھی موصول نہیں ہوا۔

اس کی مالی مشکلات "لَ موند" میں چھپنے والی ایک تین سطری خبر سے شروع ہوئی تھیں جسے ہم دونوں نے ساتھ ریو دیریکول کے ایک کیفے میں بیٹھ کر پڑھا تھا: کولومبیا میں برسرِاقتدار آمر روہاس پینیلا نے گابریئل کے اخبار "ایل ایسپیکتادور" کو بند کر دیا تھا۔ "یہ کوئی سنگین بات نہیں ہو سکتی،" اس نے کہا تھا۔ لیکن یہ درحقیقت نہایت سنگین بات تھی۔ اس کی ڈاک میں چیک موصول ہونا بند ہو گئے اور ایک ماہ بعد وہ ہوٹل کا بل ادا کرنے کے قابل نہ رہا۔ براسانس اپنے گیت گاتا رہا، نوجوان جوڑے میترو میں بوس وکنار میں مشغول رہے، لیکن گابریئل کے لیے پیرس وہ پہلے والا شہر نہ رہا۔ وہ سرد کمروں اور بیٹھے ہوئے سویٹروں والا وہی کمینہ اور دشوار شہر بن گیا جس سے بےشمار لاطینی امریکی واقف رہے ہیں، جہاں گرم کھانا اور آتشدان کے قریب لگا ہوا بستر ایسے معجزات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو توقعات کی رسائی سے باہر ہوتے ہیں۔

بارنکیلا میں اس کی مفلسی ایک دبدبہ ریب شان رکھتی تھی، اور بہرحال پیرس کی قلاشی کے مقابلے میں کم سنگین تھی؛ وہاں ہر طرف اس کے دوست تھے؛ گورنر تک اسے لینے کے لیے ہی گاڑی "ہوٹل" بھجوایا کرتا تھا، جس پر ملازمین اور سو تعیین حیران رہ جاتیں۔ کریبیئن ایک انسانیت نواز خطہ ہے۔ وہاں کی ضرب المثل ہے کہ جب دو آدمیوں کے لیے کھانا موجود ہو تو تین بھی کھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، پیرس کسی مفلس کے سامنے اپنا دل پتھر کر لیتا ہے۔ یہ بات گابریئل کی سمجھ میں اسی دن آ گئی جب اسے میترو میں ایک سکّہ مانگنا پڑا۔ اسے سکّہ تو مل گیا، لیکن جس آدمی نے تُنک مزاجی سے وہ سکہ اس کے ہاتھ پر رکھا، اس نے اس کی وضاحت سننے کی زحمت نہ کی۔

گابریئل نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہر وہ شہر جس میں وہ رہا ہے، اس کے ذہن پر ایک ایسا

نقش چھوڑ جاتا ہے جو اس شہر کے دوسرے تمام نقوش پر غلبہ پا لیتا ہے۔ پیرس کے بارے میں اس کا تصور خوفناک ہے۔ "وہ ایک بیحد طویل رات تھی، جب میرے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی، اور اسی میں نے ادھر ادھر بنچوں پر اونگھتے ہوئے، میٹرو سے نکلنے والی بھاپ سے گرمی حاصل کرتے ہوئے اور پولیس کی عقابوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے گزارا تھا جو مجھے الجزائری سمجھ کر دھرنے کے چکر میں رہتی تھی۔ صبح کے وقت اچانک دریائے سین کا بہاؤ رک گیا، ابلی ہوئی گوبھیوں کی مہک غائب ہو گئی، اور ایک لمحے کے لیے حیران کن اس مکمل کی چمکتی دھند میں پورے خالی شہر میں میں اکیلا ذی روح رہ گیا۔ اس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ جب میں سان‌مشیل کا پُل پار کر رہا تھا۔ مجھے ایک شخص کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مجھے دھند میں سے وہ ادمی گہرے رنگ کی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے، سلیقے سے بال بنائے نکلتا نظر آیا۔ جیسے ہی ہم نے پل پار کیا تو مجھے اس کا زرد بذہالا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ رو رہا تھا۔'

اس کی دوسری کتاب "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اسی دور کی پیداوار تھی۔ اس نے بھی گابریئل کے لیے دروازے وا نہ کیے۔ مجھے یاد ہے کہ زرد کاغذوں پر ٹائپ کیا ہوا وہ مسودہ میرے پاس بھی کافی دن تک رہا تھا۔ میں نے یہ مسودہ کئی ایسے لوگوں کو دکھایا جو اسے چھپوانے میں مددگار ہو سکتے تھے لیکن وہ اس کی ادبی خوبیوں سے ناآشنا معلوم ہوئے۔

پیرس میں گزارے ہوئے ان برسوں کے بعد، جب ہم دونوں کاراکاس میں صحافیوں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، گابریئل نے راتوں کو اور فارغ وقت میں لکھنا جاری رکھا۔ اب وہ جس کتاب پر کام کر رہا تھا وہ "بڑی ماما کا جنازہ" تھی لیکن کسی نے اخباری رپورٹر کے بھیس میں چھپے اس عمدہ ادیب کو دریافت نہ کیا جو اتفاقات کے ہاتھوں کاراکاس میں آ نکلا تھا۔ کاراکاس، تارکین وطن کا شہر — جس کی بلند عمارتوں اور پکی سڑکوں کے اندر کوئی روح نہیں ہے اور جہاں کامیابی کو بولیوار کے سکوں میں ناپا جاتا ہے — ایسی کسی صلاحیت کو بقدر کرنے کی فرصت نہیں رکھتا جو پہلے ہی سے تسلیم شدہ نہ ہو۔ آج وہ شہر گارسیا مارکیز پر بیحد مہربان ہے لیکن ان دنوں میں اس دبلے، بیچین، تیس سالہ صحافی کے وجود سے یکسر بےخبر تھا جو اس قدر عمدہ مضامین لکھا کرتا تھا لیکن جسے اخباروں کے کہانیوں کے مقابلوں میں کبھی کامیابی نہ ہوتی تھی۔

بعد میں بوگوٹا میں بھی انتظار کا یہ دور جاری رہا۔ اس کی راتیں اب بھی لکھنے میں گزرتی تھیں (اب اس نے "منحوس وقت" پر دوبارہ کام شروع کر دیا تھا) اور دن میں ہم دونوں کیوبا کی خبررساں ایجنسی "پرینسا لاطینا" کا مقامی دفتر چلایا کرتے۔ انہی دنوں میں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" ایک ادبی رسالے میں شائع ہوا جس کے مدیروں نے نہ تو گابریئل سے اجازت حاصل کرنے کی زحمت کی اور نہ اسے کوئی رقم ادا کی۔ وہ واقعی یہ سمجھتے تھے کہ ایک ایسے مسودے کو شائع کرنا جسے سارے ناشر رد کر چکے ہیں، بجائے‌خود ایک احسان اور قدرشناسی کا عمل ہے۔ مقامی نقادوں نے بلاشبہ اس کا خیرمقدم کیا، جیسا کہ کچھ عرصے بعد "منحوس وقت" کا بھی، جسے ایسو کولمبیانا نامی ایک تیل کی کمپنی کا جاری کیا ہوا ایک قومی انعام دیا گیا۔

لیکن یہ کامیابی بیحد معمولی تھی۔ ناول کی بہت کم کاپیاں طبع ہوئیں، رائلٹی کی شرح بہت کم تھی اور یہ تحریریں بہت تھوڑے سے مقامی پڑھنے والوں تک ہی پہنچ سکیں۔ کولمبیا سے باہر کسی نے گارسیا مارکیز کا نام تک نہ سنا تھا اور ملک کے اندر بھی لوگ، اس کے قریبی دوستوں کو چھوڑ کر، اسے ایک قدآور ادیب کی بجائے علاقائی ادب کا ایک اچھا نمائندہ تصور کرتے تھے۔ بوگوٹا کے اعلا طبقے کے مدبرین، لوگوں کی حیثیت کا اندازہ ان کے خاندانی ناموں اور لباسوں سے لگانے کے عادی تھے، اور یوں وہ اب تک اس کے آبائی ساحلی علاقے، اس کی خشخشی داڑھی، لال موزوں اور مچھلی کھانے کے چھری کانٹوں اور میٹھا کھانے کے چھری کانٹوں میں تمیز کرنے میں اس کی نااہلی سے صرفِ نظر کرنے پر تیار نہ تھے۔

اکثر کہا جاتا ہے، اور بجا طور پر، کہ لاطینی امریکا کے اعلا طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ وجود رکھنے (to be) اور ملکیت رکھنے (to have) کے معنوں کو ایک میں مدغم کر دیتے ہیں۔ آپ کس کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بات اس سے زیادہ اہم ہے کہ آپ دراصل خود کیا ہیں۔ جس روز گابریئل اس قابل ہوا کہ ان کی طرح اعلا درجے کے ہوٹلوں میں قیام کر سکے، اونچے ریستورانوں میں جھینگے کھا سکے، ان کی طرح بلکہ ان سے بہتر طور پر وائن کے درست درجۂ حرارت اور پنیر کی مختلف قسموں کو پہچان سکے، نیویارک، پیرس و لندن میں گھوم پھر سکے اور ممتاز نظر آ سکے، اس دن انھوں نے اپنے دروازے گابریئل کے لیے وا کر دیے اور اس بات کو اپنا اعزاز جاننے لگے کہ اس نے ان کی پیش کی ہوئی وسکی کو قبولیت بخشی و یہاں تک کہ وہ "تنہائی کے سو سال" کے مصنف کے بائیں بازو کے خیالات اور فیدل کاسترو کے لیے اس کی حمایت کو بھی نظرانداز کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

لیکن اُن زمانے میں نہیں، ہرگز نہیں۔ اس کی شائع شدہ کتابوں کے باوجود ("بڑی ماما کا جنازہ" کے میکسیکو میں یونیورسٹی آف ویراکروز پریس کے زیراہتمام شائع ہونے کے بعد ان کی تعداد چار ہو چکی تھی) اس کے انتظار کے چند برس اور باقی تھے۔ جب اسے پرینسا لاطینا کی طرف سے نیویارک بھیجا گیا تو گابریئل نے دن میں صحافی اور رات کو ہوٹل کے کمرے میں ادیب کے طور پر اپنی دوہری زندگی کو جاری رکھا۔ یہ دور کئی اعتبار سے اس کے لیے دشوار تھا۔ اسے نیویارک میں مقیم کیوبن جلاوطنوں کی طرف سے دھمکانے والے ٹیلیفون آتے جن میں اسے یاد دلایا جاتا کہ اس کی بیوی اور ایک بچہ ہے جنھیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ کام کے دوران ایک آہنی سلاخ اپنے ہاتھ کی پہنچ کے اندر رکھتا تاکہ حملے کی صورت میں دفاع کر سکے۔ درین‌اثنا کیوبا میں وہ سال شروع ہو چکا تھا جسے بعد میں "فرقہ واریت کا سال" کہا گیا۔ پرانی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان ریاستی اداروں میں کلیدی عہدوں پر ابھرنے لگے تھے۔ پرینسا لاطینا خاص طور پر ایک پُرکشش ادارہ تھا۔ اس ایجنسی کا ڈائرکٹر خورخے ریکاردو ماسیٹی تھا، جو ارجنٹینا سے تعلق رکھنے والا ایک محبوب اور دیانتدار نوجوان تھا۔ پارٹی کے ارکان کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی، اور جب اسے اس کے عہدے سے برطرف کیا گیا تو ہم سب، جو اس انقلابی جوش وخروش اور فرقہ وارانہ کمیونزم کے استرداد میں اس کے شریک تھے، اس کے ساتھ ہی مستعفی ہو گئے۔ گابریئل نے بھی یہی کیا۔

(میرے لیے یہ واقعات کیوبا کے انقلاب کے ایک ناگوار رخ پر چل پڑنے کے آئینہ دار تھے۔

لیکن گابرئیل کی نظر میں اس کی یہ معصومیت نہ تھی۔ میرے خیال میں وہ انھیں راستے میں لگنے والا ایک ہلکا سا جھٹکا سمجھتا تھا اور اس نے کیوبا کی حکومت کے لیے اپنی حمایت کو سرد نہ پڑنے دیا، حالانکہ اس کی حمایت نہ اس وقت غیرمشروط تھی اور نہ اب ہے۔)

استعفے کے بعد اس کے پاس نیویارک میں نہ روزگار تھا اور نہ واپسی کا ٹکٹ۔ کسی لغو وجہ سے — حالانکہ اس کی لغویتوں میں بھی ایک قسم کی خالص جبلّی منطق پوشیدہ ہوتی ہے — اس نے اپنی بیوی اور بچے کو ہمراہ لے کر بس کے ذریعے میکسیکو جانے کی ٹھان لی، جبکہ اس کی جیب میں سو ڈالر کی حقیر رقم تھی (جو اس کا کل سرمایہ تھا)۔

جس روز اسے میکسیکو میں عورتوں کے ایک رسالے میں سب ایڈیٹر کے طور پر ملازمت ملی، اس کے جوتوں کے تلے ادھڑنے لگے تھے۔ اس رسالے کے مالک سے، جو ایک معروف فلم ساز بھی تھا، اسے ایک بار میں ملاقات کرنی تھی۔ گابرئیل جان بوجھ کر وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور سب سے آخر میں اٹھا تاکہ اس کے ٹوٹے ہوئے جوتوں کی جھلک دکھائی نہ دے۔ اتنے برسوں تک لکھتے رہنے کے بعد بھی اس کی حالت وہی تھی جو اس پہلے دن تھی جب اس نے لکھنے کا آغاز کیا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میں اس سے ملنے میکسیکو گیا ہوا تھا یا وہ مجھ سے ملنے بارنکیلا آیا ہوا تھا، جب اس نے ایک نئے ناول کا ذکر کیا جس پر وہ ان دنوں کام کر رہا تھا۔ "یہ ایک بولیرو کی طرح ہے،" اس نے کہا۔ (بولیرو لاطینی امریکی موسیقی کی سب سے زیادہ مست طرز ہے۔ اس کی یہ بات شاید نہایت جذباتی معلوم ہو، لیکن اس میں ایک قسم کی شرارت بھی تھی، اور اس مبالغے میں مزاح کا عنصر بھی تھا جو یہ کہتا تھا کہ اس سے لغوی معنی مراد نہ لیے جائیں، اور اس مزاح کو غالباً صرف ہم لاطینی امریکی ہی پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بورخیس کی تحریروں میں استعمال کیے ہوئے استعارےصفت کی طرح ہے۔) "اب تک،" اس نے میز پر انگلیاں رکھ کر انھیں وسط کی طرف چلاتے ہوئے کہا، "میں نے اپنے ناولوں میں محفوظ ترین راستہ اختیار کیا ہے۔ میں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے کھائی کے کنارے کنارے چلنا ہے۔" اور اس کی انگلیاں میز کے کنارے پر خطرناک انداز میں لڑکھڑاتے ہوئے چلنے لگیں۔ "سنو، اس کتاب میں ایک کردار جب گولی مار کر خودکشی کرتا ہے تو اس کے خون کی پتلی سی لکیر شہر کی گلیوں میں بہتے بہتے بالآخر مرنے والے کی ماں تک پہنچ جاتی ہے۔ پوری کتاب اسی طرح کی ہے، رفیع اور عامیانہ کے درمیان کی تیز دھار پر چلتی ہوئی۔ بالکل بولیرو کی طرح۔" پھر اس نے اضافہ کیا، "یا تو یہ کتاب میری کامیابی ہو گی یا میں اپنا سر گولی سے اڑا دوں گا۔"

بلاشبہ وہ "تنہائی کے سو سال" کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ جب، اس کے مکمل ہونے کے تھوڑے دن بعد، میں نے اس کا مسودہ پڑھا، تو اسے ایک رقعہ لکھا کہ یہ کتاب بغیر کسی شبے کے اس کی بڑی کامیابی ہے۔ اگلی ڈاک سے اس کا جواب آیا۔ "تمھارا خط پڑھنے کے بعد آج رات میں سکون سے سو سکوں گا۔ میرا بڑا مسئلہ اس ناول کو لکھنا نہیں تھا بلکہ ان دوستوں کا سامنا کرنا تھا جو اسے پڑھیں گے، اور جن کی رائے میرے نزدیک اہم ہے۔ اس پر آنے والے ردعمل میری امید سے بڑھ کر ہیں۔ میرے خیال میں ان سب کا خلاصہ یونس اتری کے

ایڈیٹوریال سڈوامیریکانا کے ردعمل میں موجود ہے۔ انھوں نے دس ہزار کی تعداد میں اسے شائع کرنے کی حامی بھری تھی لیکن دو ہفتے بعد اپنے ماہرین کو پروف دکھاتے وقت یہ تعداد دگنی کر دی ہے۔"

وہ طویل انتظار جس کا آغاز پندرہ سال قبل ہوا تھا، جب وہ "پتّوں کا طوفان" لکھتے لکھتے صبح کو نمودار ہوتے دیکھا کرتا، بالآخر پورا ہو چکا تھا۔

بےشک اب اس میں تبدیلی آ چکی ہے۔ کبھی اس کا برج حوت ہوا کرتا تھا، مگر اب ثور ہے۔ وہ دبلا اور بےچین تھا اور بےتحاشا سگریٹ نوشی کیا کرتا تھا۔ اب اس نے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے، اس کے وزن میں دس کلوگرام کا اضافہ ہو چکا ہے اور اس کے انداز میں ایک ٹھوس پن اور ٹھہراؤ آ گیا ہے، جو ہم میں سے ان لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے جو اس سے ماضی میں واقف رہ چکے ہیں۔ اس کی نوجوانی کے لاابالی دور کا شائبہ تک باقی نہیں رہا۔ ان دنوں کا جسے اس کی صبح سے ملاقات بےخبری کے عالم میں اداریہ ڈیسک پر، یا کسی مےخانے یا نامانوس کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ اب اس کی مصروفیات کا ڈائری میں کڑا حساب رکھا جاتا ہے۔ اس کی بیوی، مرسیدس، اور اس کی لٹریری ایجنٹ، کارمین بالسیلز، اسے ملاقات کے خواہش مندوں کی زد سے محتاط طور پر باہر رکھتی ہیں، جن میں عموماً صحافی، یونیورسٹیوں کے استاد یا طلبا شامل ہوتے ہیں جو اس سے اس کی تحریروں کی بابت گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی کی پہلے سے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ وہ ستمبر کی کسی ملاقات کا پیشگی وعدہ جنوری میں کر سکتا ہے، اور اس کی پابندی بھی کر سکتا ہے، جو کسی لاطینی امریکی کے لیے ایک نہایت نادر بات ہے۔

"تنہائی کے سو سال" سے پہلے کے زمانے میں اسے اپنے دوستوں کو مختصر وقفوں سے خط لکھنے اور انھیں سب کچھ بتانے کی واقعی ضرورت محسوس ہوتی تھی: سب کچھ، اپنی امیدیں، اپنے اضطراب، اپنی ناکامیاں، اپنی ذہنی کیفیات ("اپس کی بات ہے، مجھے اس چیک ڈر سے لگتا ہے"؛ یا، "یہ مت سمجھنا کہ اس تناؤ کا اثر نہیں ہو رہا ہے" وغیرہ)۔ اب وہ خط لکھنا اصولی طور پر ترک کر چکا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ رکھتا ہے۔ اس کا برتاؤ نہایت پُرسکون، دوستانہ، لیکن بےحد کریپٹک ہوتا ہے — "کابو بول رہا ہوں، کیا ہو رہا ہے؟" — لیکن اب وہ اپنے رازوں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

وہ موقع جب وہ اپنے اندر پوشیدہ رکھے ہوئے کسی احساس کو اچانک ظاہر کر دے، اسی وقت آتا ہے جب اس کے لیے تمام حالات بیک وقت مہیا ہوں: وسکی کے چند جام، صبح کا اوّلین وقت۔ تب اس کے کسی ناممکنہ فقرے یا آنکھ کی اچانک چمک میں دبی کسی پوشیدہ یاد یا ملال کی ایک لمحاتی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً کس طرح کہنیوں پر سے پھٹے ہوئے سویٹر میں ملبوس تیس سالہ ادیب، جس سے میں ان دنوں واقف تھا، اس حسین اور شائستہ خاتون سے عشق کے امکان پر لپک اٹھا تھا جو آج پچاس سالہ ادیب کو نوازشات کے اشارے

دیتی رہتی ہے۔ اب وہ اس خوف سے ان اشاروں کا جواب نہیں دیتا کہ کہیں اپنی زندگی کے سکون اور ترتیب کو خاک میں نہ ملا بیٹھے۔

ان معروف شخصیات کے باوصف جن میں وہ اب اٹھتا بیٹھتا ہے، دنیا کی تمام قوموں سے تعلق رکھنے والے ان گنت ایسے شائقین اور صحافیوں کے باوجود جو اس سے ملاقات کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں، شہرت نے اس کا دماغ خراب نہیں کیا۔ اپنے دوستوں کے لیے وہ اب بھی وہی "گابو" یا "گابیتو" ہے، اور ان کا سلوک بھی اس کے ساتھ وہی پرانا ہے۔ یہ بات اس کے بارنکیلا والے دوستوں کے بارے میں خصوصاً درست ہے جو، کریبئن کے اچھے باشندوں کی طرح، شہرت سے بہ آسانی متاثر نہیں ہوتے۔ ان میں سے اس کے کئی قریبی دوست جوانی میں مر چکے ہیں۔ دوسرے کئی دوست، جن کا وزن بڑھ چکا ہے اور بالوں میں سفیدی آ گئی ہے، اس سے اپنے پرانے ساتھی کے طور پر برتاؤ کرتے ہیں جسے وہ بیس سال پہلے جوئس اور فاکنر کی کتابیں ادھار دیا کرتے تھے۔

گابریئل اور مرسیڈس بیحد متحد میاں بیوی ہیں۔ گابریئل اس سے اس وقت ملا تھا جب وہ تیرہ سال کی افسردہ اور غیرمعمولی حد تک پرسکون آنکھوں والی ایک بیحد دبلی لڑکی تھی۔ زندگی کے المیوں، اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ کہ زندگی کی انتہائی خوش قسمتیوں، کے مقابل وہ اپنا پتھریلا سکون برقرار رکھتی ہے اور ہر چیز کو اس خاموش، اندر اتر جانے والی نگاہ سے دیکھتی ہے، جس نگاہ سے اس کے باپ کے آباواجداد نے دریائےنیل کو دیکھا ہو گا۔ لیکن اس کی شباہت گارسیا مارکیز کے ناولوں میں آنے والی کریبئن عورتوں میں بھی ہے، جو حقیقت پر اپنی ذہنی گرفت کے سبب تاج وتخت کے عقب میں اقتدار کی اصل طاقت ہیں۔ مرسیڈس تمام شہرۂ آفاق لوگوں سے — خواہ وہ فیدل کاسترو ہو، مونیکا وِٹّی ہو یا لوئی بونوئل — اپنے شوہر کے ہمراہ اسی فطری انداز سے ملتی ہے جس کی جڑیں بہت پہلے کی بیحد محفوظ دنیا میں پیوست ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ وہ اب بھی زندگی کو یوں برتتی ہے جیسے مگانگوے کے اس دورافتادہ گرم قصبے میں، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، اپنے ہم راہیوں سے مل جل رہی ہو۔

ان کے دونوں بیٹوں، رودریگو اور گونزالو، کا اپنے باپ سے تعلق بیحد عمدہ ہے۔ یہ ایک نہایت قربت کا تعلق ہے جس میں ہر جانب بےتکلفی کا ماحول ہے۔ "کہاں ہے ہمارا مشہور ادیب؟" وہ گھر میں داخل ہوتے ہی مذاقاً پکارتے ہیں۔ گابریئل نے اپنے بچوں کی تربیت لاطینی امریکا کی روایات کے قطعاً برعکس انداز میں کی ہے، جہاں امیر غریبوں کا، سفیدفام سیاہ فاموں کا اور والدین بچوں کا ہرگز احترام نہیں کرتے۔ وہ ان کے ساتھ مکمل برابری کا برتاؤ کرتا ہے اور تحکم کی آسان ترغیب کو دبائے رکھتا ہے۔ اس کے نتائج قابلِ تحسین ہیں۔ اس کے دونوں لڑکے خود اپنے مالک ہیں، اور دنیا اور اس کے لوگوں پر ذہانت اور عقل مندی کی فراواں مقدار سے نظر ڈالتے ہیں۔

گابریئل سال کا بیشتر حصہ میکسیکو میں گزارتا ہے۔ وہاں اس کا پُرآسائش مکان پیدریگل دسان انجل پر ہے جو آتش فشاں پہاڑ پر بنے ہوئے بیحد عالی شان مکانات پر مشتمل ایک مضافہ ہے جہاں سابق صدور، بینکار اور فلمی دنیا کے لوگ اپنی امارت کی شان وشوکت

کے ساتھ رہتے ہیں۔ مکان کے اندر سارے سال ایک ہی درجۂ حرارت برقرار رہتا ہے، ماکوندو کی طرح گرم، ان دنوں میں بھی جب باہر برسات یا سردی کا موسم ہو۔ اس کے کام کرنے کے آلات میں مختلف درجن لغات، ہر قسم کے انسائیکلوپیڈیا (یہاں تک کہ ہوابازی سے متعلق بھی)، ایک فوٹوکاپیئر، ایک بےآواز برقی ٹائپ رائٹر اور کاغذ کے ہر وقت مہیا رہنے والے پانچ سو سادہ اوراق شامل ہیں۔

اب وہ رات کے وقت نہیں لکھتا جیسا کہ ان اوّلین غربت زدہ دنوں میں لکھا کرتا تھا۔ اب وہ ہوائی جہازوں کے مکینکوں کی سی ایک ڈانگری میں ملبوس، ہر روز صبح نوبجے سے سہ پہر تین بجے تک لکھتا ہے۔ دوپہر کا کھانا تین بجے کے روایتی ہسپانوی وقت پر لگایا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد وہ بیٹھ کر موسیقی سنتا ہے۔ اسے چیمبر موسیقی اور مقبول عام لاطینی امریکی موسیقی پسند ہے، جس میں اگسٹین لارا کے وہ پرانے بولیرو بھی شامل ہیں جو اس کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد میں پرانی یادیں جگا دیتے ہیں۔ لیکن وہ ان ادیبوں میں سے نہیں ہے جو خود کو باتھی دانت کے مینار میں قید کر لیتے ہیں۔ گرچہ اسے صبح کے وقت مکمل تنہائی درکار ہوتی ہے، مگر — سہ پہر کے بعد اسے لوگوں میں گھرے رہنا پسند ہے۔ وہ ہفتے میں کئی بار رات کا کھانا باہر جا کر کھاتا ہے یا شراب اعتدال سے پیتا ہے۔ وہ خبروں کا غلام ہے یا ملک کے تمام اخبار ہوائی ڈاک سے روز منگواتا ہے، اور امریکی اور فرانسیسی رسالوں کا بیحد پرشوق قاری ہے۔ اس کے ٹیلیفون کا بل بےپناہ زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر دنیا بھر میں بکھرے اپنے دوستوں سے ہم کلام ہونے کا عادی ہے۔ وہ کسی عُجلت کے بغیر مختلف چیزوں کے بارے میں ان سے یوں باتیں کرتا ہے گویا وہ کوبیاک کے گلاس تھامے اس کے روبرو بیٹھے ہوں۔

وہ سفر بھی بہت کرتا ہے۔ میکسیکو شہر کے مکان، اور قریب ہی کورناواکا میں ایک اور مکان کے علاوہ، اس کا ایک فلیٹ بوگوتا میں ہے اور ایک پیرس میں، جہاں وہ موسمِ خزاں میں قیام کرتا ہے۔ یہ لا کوپول سے صرف تیس قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کے تمام مکانات کم سامان، آرام دہ اور خوش ذوقی سے آراستہ ہیں۔ (لمبوس چمڑے کی ایک آرام کرسی اور ایک اعلا درجے کا ہائی فائی ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔) شیلفوں میں کتابیں، الماریوں میں کپڑے اور بار میں عمدہ اسکاچ کی بوتلیں ہمیشہ مہیا رہتی ہیں تاکہ وہ کسی بھی وقت اسباب کی زحمت اٹھائے بغیر وہاں آ سکے۔ وہاں پہنچ کر اسے صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ زرد پھولوں کا ایک دستہ گلدان میں لگا دے۔ یہ ایک پرانا توہم ہے۔ زرد پھول خوش قسمتی کا شگون ہیں۔

درحقیقت وہ گواہیرا کے انڈین باشندوں کی طرح، جو اس کی نانی کے گھر میں کام کیا کرتے تھے، توہم پرست ہے۔ وہ اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ بعض چیزیں، حالات اور افراد ایسے ہوتے ہیں جو بدقسمتی لاتے ہیں (جنھیں وینزویلا میں "پاوا" اور اٹلی میں "جیتاتیورا" کہا جاتا ہے) سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ عموماً اس کا یہ اعتقاد درست نکلتا ہے۔ جن افراد کو وہ بدشگون قرار دیتا ہے، وہ واقعی بدقسمتی کے پیامبر ثابت ہوتے ہیں۔ گابریئل میں کرنل اوریلیانو بوئندیا کی طرح مستقبل کی پیش گوئی کی صلاحیت موجود ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ کوئی چیز گر کر پاش پاش ہونے والی ہے، اور جب واقعی ایسا ہو جاتا ہے، جب وہ

شہر کو کو چکناچور ہو جاتی ہیں، تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ اسے کوئی علم نہیں کہ یہ پیش گویانہ احساس اسے کیوں کر ہو جاتا ہے۔ کسی بھی لمحے کوئی بات ہونے والی ہے۔" اس نے ایک بار جنوری کی پہلی تاریخ کو کاراکاس میں مجھ سے کہا۔ ہم اس وقت ساحل سمندر پر جانے ہی والے تھے۔ ہم نے اپنے غسل کے لباس اور تولیے بغل میں داب رکھے تھے۔ تین منٹ بعد وہ روشن، سہل انگار شہر، جو پچھلے کئی برسوں سے فسادات اور ہنگاموں سے محفوظ تھا، اچانک بموں کے دھماکوں سے لرز اٹھا۔ باغیوں کے ہوائی جہازوں نے ڈکٹیٹر پیریز جمینیز کے صدارتی محل پر حملہ کر دیا تھا۔

اس کی شخصیت میں ساحری کے سے عناصر موجود ہیں۔ اس کی زندگی کے کئی فیصلے کسی ایسی وجدانی کیفیت میں کیے گئے جس کی کوئی عقلی توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ وہ اور دیکارت کبھی اچھے دوست نہیں ہو سکتے تھے (رابلے یقیناً، لیکن دیکارت ہرگز نہیں)۔ دیکارت کا اندازِفکر اسے ایک تنگ واسکٹ کی طرح غیر آرام دہ محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ فرانسیسیوں میں سے کئی اس کے بیحد عمدہ دوست ہیں، جن میں صدر فرانسوا متراں بھی شامل ہیں، لیکن اسے منطق کا وہ گہرا رنگ جس میں ہر فرانسیسی اوائل عمر سے رنگا جانے لگتا ہے، بہت محدود کر دینے والا لگتا ہے۔ اسے وہ ایک ایسا سانچا محسوس ہوتا ہے جس میں حقیقت کے صرف ایک پہلو کی گنجائش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ، مائیکروفون اور کیمرے سے اس کی قدیم دہشت سے قطع نظر، وہ فرانسیسی ٹیلیوژن کو انٹرویو دینے سے عموماً احتراز کرتا ہے۔ "ادب کیا ہے؟" (یا "زندگی کیا ہے؟"، "موت کیا ہے؟"، "آزادی کیا ہے؟"، "محبت کیا ہے؟") قسم کے سوال جو مجرد تصورات اور تجربوں کے پروردہ فرانسیسی صحافی ایک عجیب چالاکی کے ساتھ انٹرویو دینے والے پر اچھالنے کے بیحد شائق ہوتے ہیں، اس کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک اس قسم کی بحث میں پڑنا ایسا ہی خطرناک ہے جیسے بارودی سرنگوں سے بھرے میدان سے گزرنا۔

اس کے اظہار کا پسندیدہ ذریعہ حکایتیں اور قصےکہانیاں ہیں۔ اسی لیے وہ ناول نگار ہے، مضمون نگار نہیں۔ ممکن ہے یہ صرف جغرافیے اور کلچر کا معاملہ ہو، کیونکہ کریبئن باشندے، بحیثیت مجموعی، حقیقت کو قصےکہانیوں کے ذریعے بیان کرنے کے عادی ہیں۔ بہت سے یورپی دانشوروں کے برعکس گارسیا مارکیز کو نظریاتی بیانات جاری کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ وہ پرکثرت خطابت جو آلتی پلانو کے خطے میں سیاستدانوں کی باقیات ہے، اسے بےمعنی اور خود اپنا ہی مضحکہ اڑاتی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ فیدل کاسترو سے اس کی دوستی، بڑی حد تک، زندگی کو دیکھنے کے ایک مخصوص انداز، ایک مخصوص زبان اور حس مزاح سے پیدا ہوئی ہے جو ان دونوں کے مشترک جغرافیائی پس منظر کا حصہ ہے۔

اگر آپ گارسیا مارکیز پر اسی سخت گیری سے نظر ڈالیں جو بہت سے یورپی دانشور روا رکھتے ہیں، تو اس کی سیاسیات کو سمجھنا آسان نہیں۔ وہ کاسترو کا دوست ہے لیکن سوویت حکومت یا اس سلیٹی بیوروکریسی کا مدح خواں نہیں جو کمیونسٹ دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس کے نزدیک بریژنیف اور کاسترو دو بالکل مختلف مظاہر ہیں۔ حالانکہ

اس بات سے کم ہی لوگ انکار کر سکیں گے کہ کیوبا کا نظام کئی اعتبار سے سوویت نظام کی طرز پر ڈھالا گیا ہے۔ (اس موضوع پر ہماری بحث عرصہ ہوا معطل کا شکار ہو چکی ہے۔) مگر یہ بات واضح ہے کہ آرتھوڈوکس کمیونزم کا اسے دماغ نہیں۔ اس کے قریبی دوستوں کے حلقے سے باہر، چند ہی لوگ اس اہم سیاسی کردار سے باخبر ہیں جو وہ خیرسگالی کے ایک غیررسمی سفیر کی حیثیت سے کریبئن کے علاقے میں ادا کرتا ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک رجحانات اور ترقی پسند لبرل لوگوں سے اس کے قریبی رابطے ہیں۔ ایک ایسے براعظم میں جس کو بیک وقت ایک طرف رجعت پسند، عسکریت پسند، امریکہ نواز دائیں بازو اور دوسری طرف ایک سخت گیر، سوویت نواز بائیں بازو کے درمیان ایک کڑے انتخاب کا سامنا ہے، وہ مقبول جمہوری متبادل کو ترجیح دیتا ہے۔ ممکن ہے متراں کے لیے اس کی حمایت کا یہی سبب ہو۔

چونکہ لاطینی امریکہ کا دایاں بازو تقریباً ہمیشہ عسکری آمریت کی حمایت کرتا ہے اس لیے وہ ہمیشہ مارکیز کا مخالف رہا ہے۔ وہ لوگ اسے کاسترو کا ایک خطرناک ایجنٹ تصور کرتے ہیں۔ "وہ اپنی دولت میں غریبوں کو حصےدار کیوں نہیں بناتا؟" اس کے مستقل دشمن، جو مارکس اور سینٹ فرانسس آف اسیسی میں کوئی فرق نہیں دیکھتے، سوال کرتے ہیں۔ یہ بات انھیں ناگوار ہے کہ وہ کیوی آر، آوئسٹر، عمدہ شمپین، اوّل درجے کے ہوٹلوں، عمدہ تراش خراش کے ملبوسات اور جدیدترین کاروں کی سی بورژوا آسائشوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ درحقیقت وہ اپنی دولت کے معاملے میں انتہائی شاہ خرچ واقع ہوا ہے، اپنی اس دولت کے معاملے میں جسے اس نے، کسی کا استحصال کیے بغیر، صرف و محض اپنے ٹائپ رائٹر کی مدد سے حاصل کیا ہے۔

بہت سے لوگ اس کی یہ بات سن کر حیران رہ جاتے ہیں کہ "سردار کا زوال" ایک ایسی کتاب ہے جس میں اس کی خودنوشت کے سب سے زیادہ اجزا شامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک عمیق پوشیدہ سطح پر ایسا ہی ہے۔ اس کتاب کے ڈکٹیٹر کے برعکس جس نے اقتدار حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش کی تھی، شہرت گابریئل پر غیرمتوقع طور پر نازل ہوئی ہے۔ اور اگرچہ اس کے اچھے پہلو بھی ہیں، مگر اس کی بڑی بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اب وہ کوئی چیز پرانے دنوں کی سی بےساختگی کے ساتھ کر، کہہ، یا لکھ نہیں سکتا۔ شہرت سے بھی اقتدار ہی کی طرح نبردآزما ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایک طرح کا اقتدار ہی ہے۔ اس میں آدمی کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے اور کسی پر ضرورت سے زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کچھ باتیں یقیناً ہوں گی جنھیں آج کل وہ صرف اپنے آپ سے کہہ سکتا ہے۔ قلاشی اور نوجوانی کے دنوں کا مکالمہ اب ایک خودکلامی میں تبدیل ہو چکا ہے۔

یہ بلاوجہ نہیں ہے کہ تنہائی کا موضوع اس کی تمام تحریروں پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی جڑیں اس کے اپنے تجربے میں بہت گہری ہیں۔ اس وقت جب وہ اراکاتاکا میں، اپنے نانانانی کے بڑے سے مکان میں ایک ننھا بچہ تھا، یا اس وقت جب وہ بوگوتا کی ٹراموں میں طالبعلمی کے زمانے میں اتوار کی سہ پہروں کی اداسی کو شاعری کے مطالعے میں ڈبویا کرتا تھا، یا اس وقت جب وہ بارنکیلا کے ایک قحبہ خانے میں مقیم ایک نوجوان ادیب تھا، تنہائی کا سایہ ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہا ہے۔ اب بھی جب وہ ایک مشہورِعالم ادیب ہے، یہ سایہ ہر جگہ اس کا

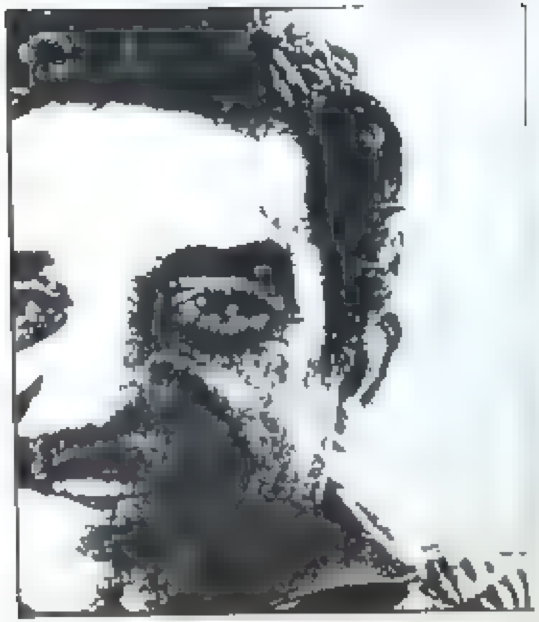

پیچھا کرتا رہتا ہے۔ لا گوہیرا کی پرشکوہ شادیوں میں بھی جب وہ دوستوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے تنہائی کا ... موجود ... وہ ہمیشہ جنگیں جیت لی ہیں جو کرنل اوریلیانو بوئندیا ہار گیا تھا، لیکن وہ تقدیر جس نے پورے بوئندیا خاندان پر ایسا اَن مٹ نشان چھوڑ دیا تھا، وہی سرحم تقدیر اس کی بھی ہے

گیبریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: راشد مفتی

معصوم ارینڈرا

اور اس کی سنگ دل دادی
کی ناقابلِ یقین اور غمناک داستان

جب اس کی بدبختی کی ہوائیں چلنی شروع ہوئیں تو ارینڈرا اپنی دادی کو نہلا رہی تھی۔ صحرا کی تنہائی میں گم سفید کنکریٹ کی وسیع حویلی پہلے ہی جھکڑ میں بنیادوں تک ہل گئی تھی۔ لیکن ارینڈرا اور اس کی دادی صحرا کے فطری خطرات کی عادی تھیں۔ سو انہوں نے غسل خانے میں، جو موروں کی تصویروں اور رومی حماموں کی بچکانہ پچی کاری سے مزین تھا، ہوا کی شدّت پر مشکل ہی سے توجہ دی۔

عریاں اور بھاری بھرکم دادی سنگ مرمر کے ٹب میں ایک خوبصورت سفید وہیل کی طرح لگ رہی تھی۔ پوتی ابھی ابھی پندرھویں سال میں لگی تھی۔ اس کا چہرہ پژمردہ اور ہڈیاں نرم تھیں، اور وہ اپنی عمر کے لحاظ سے بہت کمزور تھی۔ وہ اپنی دادی کو اس جزرسی کے ساتھ نہلا رہی تھی جس میں مقدّس پابندی کا سا عنصر تھا۔ غسل کے پانی میں بوٹیاں اور خوشبودار پتّیاں ابالی گئی تھیں اور موخرالذکر، اس کی موٹی کمر، گھنے دھات رنگ بالوں اور طاقت ور شانوں سے چپٹی ہوئی تھیں، جو اس بےرحمی سے گُدے ہوئے تھے کہ ملاح بھی دیکھتے تو شرما جاتے۔

"رات میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے ایک خط کا انتظار ہے" دادی نے کہا۔

ارینڈرا نے، جو صرف اس وقت بولتی تھی جب بولنا ناگزیر ہو، پوچھا "خواب میں دن کون سا تھا؟"

"جمعرات"

"تب تو یہ بُری خبر والا خط تھا" ارینڈرا نے کہا، "لیکن یہ کبھی آئے گا نہیں۔"

صحائف کا یہ حصہ مارکیز کے ناولٹ "معصوم ارینڈرا" اور چار کہانیوں پر مشتمل ہے۔
"معصوم ارینڈرا" جس کا مکمل عنوان The Incredible and Sad Tale of Innocent Eréndira and Her Heartless Grandmother ہے، مارکیز کے معروف ترین ناول "تنہائی کے سو سال" میں بیان کی گئی ایک ضمنی کہانی پر بنیاد رکھتا ہے۔ یہ ناولٹ اور اس کی دو کہانیاں "گم گشتہ وقت کا سمندر" (The Sea of Lost Time) اور "محبت کے اس پار منتظر موت" (Death Constant Beyond Love) مارکیز کی کہانیوں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل مجموعے Innocent Eréndira and Other Stories سے لی گئی ہیں۔

"بہت بڑے پروں والا ایک بوڑھا بہت بوڑھا" (A Very Old Man with Enormous Wings) اور "دنیا بھر کا حسین ترین ڈوب مرنے والا" (The Handsomest Drowned Man in the World) مارکیز کے انگریزی مجموعے Leaf Storm and Other Stories میں شامل ہیں۔ ان دونوں بےحد خوبصورت اور سحرانگیز کہانیوں کو مارکیز نے بچوں کی کہانیوں کا ذیلی عنوان دیا ہے۔

جب وہ اپنی دادی کو نہلا چکی تو اسے خواب گاہ میں لے گئی۔ دادی اتنی فربہ تھی کہ صرف اپنی پوتی کے شانے پر جھک کر یا لاٹھی کے سہارے، جو کسی پادری کے عصا سے مشابہ تھی، چل سکتی تھی۔ لیکن اس کی دشوار ترین کوششوں میں بھی ایک کہنہ شکوہ کی علامت عیاں تھی۔ خواب گاہ میں، جسے باقی سارے گھر کی طرح بہت زیادہ اور کسی حد تک جنونی ذوق سے سجایا گیا تھا، ایرندرا کو اپنی دادی کی مشاطگی کے لیے مزید دو گھنٹے درکار تھے۔ اس نے دادی کے بالوں کی ایک ایک لٹ کو سلجھایا، خوشبو لگائی، کنگھی کی، اسے پھول دار لباس پہنایا، چہرے پر پوڈر اور ہونٹوں پر چمک دار لپ اسٹک لگائی، گالوں کو روژ اور پلکوں کو مشک سے رنگا اور اس کے ناخنوں پر سیپی کے رنگ کی پالش لگائی۔ جب وہ اسے ایک بڑی سی گڑیا کی طرح سنوار چکی تو ایک مصنوعی باغ میں لے گئی جس میں ویسے ہی حبس زدہ پھول تھے جیسے کہ اس کے لباس پر۔ اس نے دادی کو ایک بڑی سی کرسی پر، جس کی ساخت اور سج دھج تخت جیسی تھی، بٹھا دیا اور بھونپو جیسے سپیکر والے گراموفون پر گزرے دنوں کے ریکارڈ سننے کے لیے چھوڑ دیا۔

دادی جب ماضی کی دلدلوں میں بھٹکتی، ایرندرا اس تاریک و پراگندہ اور عجیب و غریب فرنیچر والے مکان کی جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو گئی، جو خیالی سیزروں کے مجسموں، متروک فانوسوں اور سنگ مرمر کے فرشتوں، ایک سنہری پیانو اور نامعلوم جسامتوں و صورتوں کی لاتعداد گھڑیوں سے بھرا تھا۔ مکان میں پانی ذخیرہ کرنے کا حوض تھا جو دور دراز کے چشموں سے ملازمین کی کمر پر لاد کر کئی برسوں میں لایا جاتا رہا تھا اور حوض کی دیوار پر لگے ایک حلقے سے بندھا ایک زکر رفتہ شترمرغ تھا جو اس اذیت ناک موسم میں زندہ رہ سکنے والی واحد پردار مخلوق تھی۔ یہ مکان ہر چیز کے پچھواڑے، صحرا کے قلب میں ایک خستہ و خراب اور ویران گلیوں والی آبادی سے متصل تھا جہاں بدبختی کی ماری بکریاں گرمی کی شدت سے خودکشی کر لیتی تھیں۔

یہ ٹھکانہ جائے پناہ دادی کے شوہر نے بنوائی تھی جو امادیس نامی ایک افسانوی سمگلر تھا۔ اس شخص سے اس کا اسی نام کا ایک بیٹا تھا جو ایرندرا کا باپ تھا۔ کسی کو اس گھرانے کی اصل کا پتہ تھا نہ دلچسپیوں کا۔ مقامیوں کی زبانی جو زیادہ سے زیادہ معلوم روایت تھی کہ باپ امادیس نے اپنی خوبصورت بیوی کو اینٹیلز کے ایک قحبہ خانے سے چھڑایا تھا جہاں اس نے ایک آدمی کو چاقوؤں کی لڑائی میں قتل کر دیا تھا، اور یہ کہ اس نے اپنی بیوی کو صحرا کی ویرانی میں ہمیشہ کے لیے لا بسایا تھا۔ جب دونوں امادیس مر گئے — ایک مرطوب بخار کے باعث اور دوسرا ایک عورت کے سبب گولیوں سے چھلنی ہو کر — تو دادی نے ان کی لاشوں کو صحن میں دفنا دیا، اپنی چودہ برہنہ پا خادماؤں کو فارغ کر دیا اور اپنی ناجائز پوتی کی قربانیوں کے طفیل، جسے اس نے پیدائش سے پالا تھا، اس پوشیدہ مکان کے سایوں میں اپنی شان و شوکت والے خوابوں پر غوروخوض جاری رکھا۔

ایرندرا کو صرف گھڑیاں ملانے اور انہیں چابی دینے ہی میں چھ گھنٹے لگتے تھے۔ جس دن اس کی بدبختی شروع ہوئی اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ گھڑیوں میں اگلی صبح

تک چلتے رہنے کے لیے کافی چابی موجود تھی۔ لیکن اس کے برخلاف اسے اپنی دادی کو نہلانا اور ملبوس کرنا تھا، فرش صاف کرنا تھا، دوپہر کا کھانا پکانا تھا اور بلوری برتنوں کو چمکانا تھا۔ [illegible] بجے کے قریب جب وہ شترمرغ کے پیالے کا پانی تبدیل کر رہی تھی اور [illegible] کے عذاب کا سبب کرب پر جو اس وقت تک ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ لیکن اسے ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ یہ اس کی بدبختی کی ہوا تھی۔ بارہ بجے جب وہ شمپین کے گلاس صاف کر رہی تھی تو اسے بجلی کی بو آئی اور اسے اپنے عقب میں کسی بلور کی کرچیاں چھوڑے بغیر لپک کر باورچی خانے پہنچنے کا معجزہ دکھانا پڑا۔

پھر [illegible] کر کے [illegible] کہ اس نے چولہے سے شوربے کا [illegible] پھر اس نے ایک دم [illegible] میز پر رکھ دیا اور دم بھر کی فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باورچی خانے میں رکھے اسٹول پر سستانے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں [illegible] دوبارہ [illegible] اور ڈونگے میں [illegible] بکھرے۔ وہ سوتے میں کام کر رہی تھی۔

چاندی کے شمع دانوں والی بارہ افراد کی طعام میز کے سرے پر دادی اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی گھنٹی ہلائی اور ایرندرا جواب دیتے ہوئے تقریباً فوراً ہی پہنچ گئی۔ ایرندرا جب بھی پیش کر رہی تھی تو اس کی خوابیدگی نے دادی کی توجہ مبذول کر لی۔ اس نے ایرندرا کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا گویا کسی غیر مرئی شیشے کو صاف کر رہی ہو۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ نہیں دیکھا۔ دادی نظروں سے اس کا تعاقب کرتی رہی اور جب ایرندرا واپس باورچی خانے جانے کے لیے مڑی، وہ [illegible] چیخ پڑی:

"ایرندرا!"

چونک کر جاگتے ہوئے لڑکی نے ڈونگا قالین پر گرا دیا۔

"کوئی بات نہیں بچی،" دادی نے یقین دلانے والی شفقت سے کہا۔ "تم پھر چلتے پھرتے سو گئی تھیں۔"

"میرے جسم کو اس کی عادت ہے،" لڑکی نے عذرخواہی کے طور پر کہا۔

ایرندرا نے جو ابھی تک نیند کے حصار میں تھی ڈونگا اٹھایا اور قالین کے داغ صاف کرنے لگی۔

"اسے چھوڑ دو،" دادی نے [illegible] ہوئے کہا۔ "[illegible] پھر میں دھو سکتی ہو۔"

اپنی روزمرہ کے کام کاج کے علاوہ ایرندرا کو کھانے کے کمرے کا قالین بھی دھونا پڑا اور اس نے غسل خانے میں اپنی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیر کے دن کی دھلائی بھی کر ڈالی، جبکہ دادی [illegible] کے گرد چکر کاٹتی ہوئی [illegible] تلاش کرتی رہیں۔ ایرندرا کے پاس اتنا کام تھا کہ اس کے محسوس کیے بغیر رات ہو گئی، اور جب اس نے کھانے کے کمرے کا قالین دوبارہ بچھایا تو سونے کا وقت ہو چکا تھا۔

دادی تمام سہ پہر پیانو پر اپنے زمانے کے گیت اونچی آواز میں گاتے ہوئے اپنے آپ کو بہلاتی رہی

تھی۔ اس کی پلکوں پر افشاں اور آنسوؤں کے دھبّے تھے۔ لیکن اپنے ململ کے لباسِ شب خوابی میں وہ بستر پر لیٹی تو پُرشوق یادوں کی تلخی لوٹ آئی۔

"کل کا دن مصرف میں لا کر بیٹھک کا قالین بھی دھو ڈالو،" اس نے ایرینڈرا سے کہا۔ "اسے رونق کے دنوں سے دھوپ لگی ہی نہیں ہے۔"

"اچھا دادی،" لڑکی نے جواب دیا۔

اس نے پروں کا پنکھا اٹھایا اور کٹھور مالکن کو، جو غنودگی میں شدید احکام گنوا رہی تھی، جھلنے لگی۔

"سونے سے پہلے سارے کپڑے استری کر لینا تاکہ تم صاف ضمیر کے ساتھ سو سکو۔"

"اچھا دادی۔"

"کپڑوں کی الماریاں احتیاط سے دیکھنا، طوفانی راتوں میں کیڑے زیادہ بھوکے ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا دادی۔"

"تمھارے پاس جو وقت بچے اس میں پھولوں کو آنگن میں لے جاؤ کہ انھیں ذرا ہوا لگ سکے۔"

"اچھا دادی۔"

"اور شترمرغ کو دانہ ڈال دو۔"

وہ سو چکی تھی لیکن پھر بھی حکم چلا رہی تھی کیونکہ پوتی کو سوتے میں بیدار رہنے کی صلاحیت اسی سے ورثے میں ملی تھی۔ ایرینڈرا دبے پاؤں کمرے سے چلی گئی اور رات کے آخری کام کاج سمیٹنے لگی۔ وہ اب بھی خوابیدہ دادی کے احکام کا جواب دے رہی تھی۔

"قبروں پر تھوڑا سا پانی ڈال دینا۔"

"اچھا دادی۔"

"اور اگر اماڈیس آئیں تو انھیں روک دینا" دادی نے کہا، "کیونکہ پورفیریو گالاں کا گروہ ان کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔"

ایرینڈرا نے جواب نہیں دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دادی ہذیان میں گم ہو رہی ہے، لیکن اس نے ایک بھی حکم گوش انداز نہیں کیا۔ جب اس نے کھڑکی کی چٹخنیوں کی پڑتال ختم کی اور آخری بتیاں بجھا کر اپنی خواب گاہ میں جانے کے لیے کھانے کے کمرے سے ایک شمع دان اٹھایا تو ہوا کے وقفوں کو دادی کے پرسکون اور زوردار انفاس پُر کر رہے تھے۔

اس کا کمرہ بھی پرتکلف تھا، لیکن اس کی دادی جتنا نہیں۔ اس میں اس کے حالیہ بچپن کے چابی والے جانوروں اور گڑیوں کا ڈھیر تھا۔ دن بھر کے وحشیانہ کام کاج کی ماری ایرینڈرا میں اتنا دم نہ تھا کہ لباس تبدیل کر سکتی۔ اس نے شمع دان میز پر رکھا اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی بدبختی کی ہوا شکاری کتوں کے غول کی طرح خواب گاہ میں در آئی اور شمع کو پردوں پر دے مارا۔

صبح کے وقت جب ہوا آخرکار تھم گئی تو بارش کی چند موٹی اور اکادکا بوندیں گرنے لگیں

جنھوں نے بچےکھچے انگارے بجھا کر حویلی کی دھواں دیتی ہوئی راکھ کو بٹھا دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے، جو زیادہ تر انڈین تھے، تباہی سے بچی ہوئی چیزیں نکالنے کی کوشش کی جو شترمرغ کی سوختہ لاش، سنہری پیانو کے ڈھانچے اور ایک مجسمے کے اوپری حصے پر مشتمل تھیں۔ دادی اپنی دولت کی خاکستر پر ناقابلِ سرایت افسردگی کے ساتھ گہری سوچ میں گم تھی۔ ایرینڈرا نے روناد ھونا بند کر دیا تھا اور وہ دونوں اماڈیسوں کی قبروں کے درمیان بیٹھی تھی۔ دادی کو جب یقین ہو گیا کہ ملبے میں صرف چند ہی چیزیں سلامت ہیں تو اس نے پُرخلوص رحم سے اپنی پوتی پر نظر ڈالی۔

"میری بدنصیب بچی،" اس نے آہ بھری۔ "اس سانحے کی ادائیگی کے لیے تجھے ساری زندگی بھی کم پڑے گی۔"

ایرینڈرا نے اسی دن، بارش کے شور تلے ادائیگی شروع کر دی، جب اسے گاؤں کے دکان دار کے ہاں لے جایا گیا جو ایک دبلاپتلا قبل از وقت رنڈوا تھا، اور دوشیزگی کی اچھی قیمت چکانے کے لیے صحرا میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ رنڈوے نے سائنسی سخت گیری کے ساتھ ایرینڈرا کا معائنہ کیا۔ دادی اس دوران ڈھٹائی سے انتظار کرتی رہی۔ اس نے لڑکی کی رانوں کی طاقت، اس کی چھاتیوں کے ابھار، کولہوں کی گولائی پر غور کیا اور جب تک اس کی قیمت کا اندازہ نہ لگا لیا، ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔

پھر وہ بولا، "یہ تو ابھی بالکل بچّی ہے۔ اس کی چُوچیاں کتیا جیسی ہیں۔"

پھر اس نے اپنے فیصلے کو اعدادوشمار سے ثابت کرنے کے لیے لڑکی کو ترازو پر کھڑا کر دیا۔ اس کا وزن نوے پونڈ نکلا۔

"اس کا مول سو پیسو سے زیادہ نہیں،" رنڈوے نے کہا۔

دادی بھونچکا رہ گئی

"ایک بالکل نئی لڑکی کا مول سو پیسو!" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "نہیں جنابِ من، اس سے تو آپ میں خوبی کی قدر کا فقدان ظاہر ہوتا ہے۔"

"چلو، میں ڈیڑھ سو دے دوں گا۔"

"اس لڑکی نے مجھے دس لاکھ پیسو سے زیادہ کا نقصان پہنچایا ہے،" دادی نے کہا۔ "اس رفتار سے تو اسے ادائیگی کے لیے دو سو سال چاہییں۔"

"تم خوش قسمت ہو کہ اس کی واحد اچھی خاصیت اس کی عمر ہے،" رنڈوے نے کہا۔

طوفان مکان کو ڈھائے دے رہا تھا اور چھت میں اتنے سوراخ تھے کہ جتنا پانی باہر برس رہا تھا اتنا ہی اندر ٹپک رہا تھا۔ دادی اس مصیبت بھری دنیا میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔

"اچھا، تین سو دے دو،" وہ بولی۔

"ڈھائی سو۔"

آخرکار وہ دو سو بیس پیسو نقد اور کچھ اجناس پر متفق ہو گئے۔ پھر دادی نے ایرینڈرا کو رنڈوے کے ساتھ جانے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر عقبی کمرے کی طرف اس طرح لے چلا گویا اسے اسکول لے جا رہا ہو۔

"میں یہاں تمہارا انتظار کروں گی،" دادی نے کہا۔

"اچھا دادی۔"

عشق کمرہ ایک طرح کا اینٹوں کے چار ستونوں والا چھپر تھا جسے پام کے گلے سڑے پتوں کی چھت سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے گرد ایک میٹر اونچی گارے کی دیوار تھی جس کے باعث باہر کی [illegible] اندر آتی تھی۔ دیوار کے اوپر کیکٹس اور دوسرے صحرائی پودوں کے گملے رکھے تھے۔ دو ستونوں کے درمیان ہوا پر رواں کشتی کے آزاد بادبان کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا، ایک اڑی ہوئی رنگت والا جھولا لٹک رہا تھا۔ طوفان کے شور اور پانی کی بوچھاڑ میں دور سے آتی ہوئی چیخیں، دور دراز کے جانوروں کی غراہٹ اور ڈوبنے والے جہاز سے آتی ہوئی پکار سنی جا سکتی تھی۔

جب ایرینڈرا اور ونڈو چھپر میں گئے تو بارش کی ایک ریلے نے ان کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ مشکل سے سنبھل پائے اور پانی کی بوچھاڑ نے انہیں بھگو کر رکھ دیا۔ ان کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں بلکہ ان کی حرکات و سکنات شدید ہوا کے شور میں واضح ہو گئی تھیں۔ ونڈوے کی پہلی کوشش پر ایرینڈرا نے بادلِ ناخواستہ طور سے چیخ کر بچ نکلنے کی کوشش کی۔ ونڈوے نے اسے کسی آواز کے بغیر جواب دیا۔ کلائی سے پکڑ کر اس کا بازو مروڑا اور [illegible] کہا۔ وہ ونڈوے کے چہرے پر خراش ڈالتی ہوئی اس کی گرفت سے نکل گئی اور [illegible] خاموشی میں پھر چیخ پڑی۔ لیکن ونڈوے کے زوردار تھپڑ نے اسے زمین سے [illegible] میں معلق کر دیا اور اس کے [illegible] جیسے [illegible] میں لہرا گئے۔ [illegible] کے بازو پھر سے زمین پکڑنے [illegible] ونڈوے نے اسے کمر سے پکڑ کر ایک [illegible] جھولے میں گرا دیا اور [illegible] گھٹنوں سے جکڑ لیا۔ پھر ایرینڈرا پر [illegible] وہ بےہوش ہو گئی۔ اس کی بس حالت ہو گئی جیسے طوفانی ہوا میں تیرتی ہوئی مچھلیوں سے سکتے [illegible] چاندکرنوں سے مسحور ہو کر رہ گئی ہو۔ ونڈوے نے اس دوران ایک باقاعدہ طریقے کے مطابق اس کا لباس نوچتے کھسوٹتے ہوئے اسے عریاں کر دیا۔ [illegible] کھسکتے [illegible] ایرینڈرا کے لباس کی دھجیاں اڑ [illegible] کے دوش پر بکھر گئیں۔

[illegible]

[illegible] انہوں نے یہ سفر ٹرک کے پیچھے حصے میں چاول کی بوریوں اور چربی کی بالٹیوں کے درمیان طے کیا جہاں [illegible] بچا کھچا سامان جو [illegible] کی سرہانے ایک جگمگ فرشتے جیسے ہوئے تخت [illegible] پر مشتمل تھا [illegible] کے علاوہ تھا، دونوں امادیسوں کی باقیات تھیں، ایک [illegible] میں [illegible] جن پر دو [illegible] صلیبیں بنی تھیں۔

دادی نے سفر بھی پرانی چھتری کے ذریعے اپنے آپ کو دھوپ سے بچا رکھا تھا۔ گو پسینے اور گرد کے باعث اس کے لیے سانس لینا بھی دشوار تھا لیکن اس ناخوشگوار حالت میں بھی وہ [illegible] وقار [illegible]۔ [illegible] ڈبوں اور چاول کی بوریوں کے ڈھیر کے پیچھے ایرینڈرا بیس پیسو [illegible] حساب سے ٹرک کے لوڈر کو سفر اور باربرداری کی ادائیگی کر رہی تھی۔

پہلے پہل اس کا دفاعی نظام ویسا ہی تھا جیسا اس نے ونڈوے کے حملے کے خلاف استعمال کیا تھا، لیکن لوڈر کی رسائی مختلف تھی، دھیمی اور دانش مندانہ۔ اس کی نرمی نے ایرینڈرا کو رام کر لیا تھا۔ سو ایک جان لیوا سفر کے بعد جب وہ پہلے شہر میں پہنچے تو ایرینڈرا اور لوڈر سامان کی مدافعت کے پیچھے ایک سرسری مباشرت کے بعد سستا رہے تھے۔

ڈرائیور نے چلا کر دادی سے کہا،

"یہ وہ جگہ ہے جہاں سے دنیا شروع ہوتی ہے۔"

دادی نے بےیقینی سے خستہ و خراب اور تنہا گلیوں کو دیکھا۔ یہ قصبہ کسی حد تک بڑا تھا، لیکن اتنا ہی اداس جتنا کہ وہ چھوڑ آئی تھی۔

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا،" اس نے کہا۔

"یہ مشنریوں کا علاقہ ہے،" ڈرائیور نے بتایا۔

"مجھے خیرات سے نہیں، اسمگلروں سے دلچسپی ہے،" دادی بولی۔

سامان کے عقب سے مکالمہ سنتی ہوئی ایرینڈرا نے چاول کی ایک بوری کو انگلی سے کریدا۔ اچانک اس کے ہاتھ ایک ڈوری آ گئی۔ اس نے اسے کھینچا تو نیچے سے سچے موتیوں کا ہار نکل آیا۔ وہ اسے اپنی انگلیوں کے درمیان ایک مردہ سانپ کی طرح تھامے حیرانی سے دیکھا کی۔ ڈرائیور اس کی دادی کو جواب دے رہا تھا،

"خواب میں خواب مت دیکھو خاتون، اسمگلر نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔"

"یقیناً نہیں،" دادی نے کہا، "مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے۔"

"ڈھونڈنے کی کوشش کرو، تمہیں خود پتا چل جائے گا،" ڈرائیور نے شیخی بگھاری۔ "اسمگلروں کی بات ہر شخص کرتا ہے لیکن آج تک کسی نے ایک بھی اسمگلر نہیں دیکھا۔"

لوڈر نے محسوس کر لیا کہ ایرینڈرا نے ہار نکالا ہے، سو اس نے جلدی سے ہار اس سے لے کر دوبارہ بوری میں چھپا دیا۔ دادی نے اس قصبے کی غربت کے باوجود ٹھہرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، اپنی پوتی کو آواز دی کہ ٹرک سے اترنے میں اس کی مدد کرے۔ ایرینڈرا نے لوڈر کو بوسہ دیتے ہوئے جو عجلت بھرا لیکن بےساختہ اور سچا تھا الوداع کہی۔

انہوں نے جب تک سامان اتارنے کا کام مکمل کیا، دادی سڑک کے وسط میں اپنے تخت پر بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ آخری عدد امادیسوں کی باقیات والا ٹرنک تھا۔

"اس کا وزن تو مرے ہوئے آدمی جتنا ہے،" ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس میں ایک نہیں، دو ہیں،" دادی نے کہا، "لہذا انہیں مناسب احترام دو۔"

"میں شرط لگاتا ہوں کہ دونوں سنگ مرمر کے مجسمے ہیں،" ڈرائیور دوبارہ ہنسا۔

اس نے باقیات والا ٹرنک بےپروائی سے جھلسے ہوئے فرنیچر کے درمیان رکھ دیا اور اپنا کھلا ہوا ہاتھ دادی کے آگے بڑھایا۔

"پچاس پیسو،" اس نے کہا۔

"تمہارا غلام پہلے ہی دائیں ہاتھ پر ادائیگی کر چکا ہے۔"

ڈرائیور نے اپنے مددگار کو حیرانی سے دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈرائیور ٹرک کے کیبن میں واپس چلا گیا جہاں ماتمی لباس میں ایک عورت گود میں بچہ لیے بیٹھی تھی جو

گرمی سے بلبلا رہا تھا۔ لوڈر نے بڑے پُراعتماد لہجے میں دادی سے کہا:

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اریندرا میرے ساتھ چل رہی ہے۔ میرے ارادے نیک ہیں۔"

لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر مداخلت کی:

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی؟"

"یہ سراسر میرا اپنا خیال تھا" لوڈر نے کہا۔

دادی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، تحقیر سے نہیں بلکہ اس کی جرأت کا اندازہ کرنے کے لیے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" اس نے لوڈر کو بتایا، "بشرطیکہ تم اس کی غفلت سے ہونے والے نقصان کا ازالہ کر دو۔ کل رقم آٹھ لاکھ بہتر ہزار تین سو پندرہ پیسو ہے، جس میں سے چار سو بیس، جن کی ادائیگی یہ کر چکی ہے، منہا کرنے کے بعد آٹھ لاکھ اکہتر ہزار آٹھ سو پچانوے پیسو باقی ہیں۔"

ڈرائیور نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔

"یقین کیجیے اگر میرے بس میں ہوتا تو یہ ڈھیر ساری رقم آپ کو ضرور دے دیتا" لوڈر نے سنجیدگی سے کہا، "یہ لڑکی اس لائق ہے۔"

دادی کو لڑکے کے فیصلے سے خوشی ہوئی۔

"اچھا، تو پھر تمھارے پاس جب اتنی رقم ہو تب آنا" اس نے ہمدردانہ لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن بہتر یہ ہے کہ اب تم چلے جاؤ، کیوںکہ اگر ہم پھر حساب کتاب کریں تو تمھیں دس پیسو دینے پڑیں گے۔"

لوڈر ٹرک کے عقبی حصے میں کود گیا اور ٹرک چل پڑا۔ اس نے ٹرک میں سے اریندرا کو الوداع کہی لیکن وہ ابھی تک اتنی حیران تھی کہ اس نے جواب نہ دیا۔

ریت کے اسی خالی ٹکڑے پر جہاں ٹرک نے انھیں چھوڑا تھا، اریندرا اور اس کی دادی نے رہنے کے لیے، جستی چادروں اور قالین کے بچےکھچے ٹکڑوں سے ایک چھپر کھڑا کر لیا۔ انھوں نے زمین پر دو چٹائیاں بچھا دیں اور اسی طرح اچھی نیند سو گئیں جیسی کہ حویلی میں سوتی تھیں، یہاں تک کہ دھوپ کی شدت نے چھت میں سوراخ کر دیے اور ان کے چہرے جلانے لگی۔

عام طور پر جو معمول تھا اس کے بالکل برعکس، دادی اس صبح خود اریندرا کے بناؤسنگھار میں مشغول ہو گئی۔ اس نے اریندرا کا چہرہ سریچی حُسن کی طرز پر سنوارا جو اس کی جوانی کے دنوں کا رواج تھا۔ اسے مصنوعی ناخنوں اور ارگنڈی بو سے مزیّن کیا جو اس کے سر پر ایک تتلی کی طرح نظر آتی تھی۔

"تم بہت عجیب لگ رہی ہو" اس نے تسلیم کیا، "لیکن یہی بہتر ہے۔ مرد نسوانی معاملات میں بالکل احمق ہوتے ہیں۔"

انھیں دیکھنے سے بہت پہلے ان دونوں نے صحرا کی پتھریلی زمین پر دو خچروں کے چلنے کی آواز پہچان لی تھی۔ دادی سے ہدایت ملنے پر اریندرا چٹائی پر اس طرح دراز ہو گئی جیسے کوئی شوقیہ اداکارہ ان لمحوں میں ہوتی جب پردہ اٹھنے والا ہوتا۔ اپنے پادری کے عصا کے سہارے دادی چھپر سے باہر آئی اور تخت پر بیٹھ کر خچروں کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔

ڈاکیا آ رہا تھا۔ وہ صرف بیس سال کا تھا، لیکن اس کے کام نے اسے معمّر بنا دیا تھا۔ وہ خاکی وردی، ساق پوش اور پودوں کے خشک گودے سے بنا ہیلمٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی کارتوسوں والی پیٹی میں ایک فوجی پستول لگا تھا۔ وہ ایک توانا خچر پر سوار تھا اور ایک دوسرے خچر کی، جو زیادہ کاریافتہ تھا اور جس پر کینوس کے ڈاک تھیلے لدے تھے، رسّی تھامے ہوئے تھا۔

اس نے دادی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے سلام کیا اور اپنی راہ چلتا گیا۔ لیکن دادی نے اسے چھپر میں جھانکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رکا اور اریندرا کو گورے رساموں کے سنگھار اور عنابی گوٹ دار لباس میں چٹائی پر دراز دیکھا۔

"پسند ہے؟" دادی نے پوچھا۔

اس وقت تک ڈاکیا سمجھا نہیں تھا کہ تجویز کیا ہے۔

"پرہیز پر رہنے والے کے لیے خیال برا نہیں ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پچاس پیسو" دادی نے کہا۔

"مائی، تم تو پوری ٹکسال مانگ رہی ہو؟" اس نے کہا۔ "اس رقم سے میں پورا مہینہ گزار سکتا ہوں۔"

"کنجوسی مت کرو" دادی نے کہا۔ "ہوائی ڈاک میں تو پادری سے بھی زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔"

"میں مقامی ڈاک میں ہوں" اس نے کہا۔ "ہوائی ڈاک والا پک اپ میں سفر کرتا ہے۔"

"بہرحال، پیار بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ غذا" دادی نے کہا۔

"لیکن اس سے پیٹ نہیں بھرتا۔"

دادی کو احساس ہو گیا کہ اس شخص کے پاس، جو اپنی روزی دوسروں کے انتظار سے کماتا ہے، سودےبازی کے لیے ضرورت سے زیادہ وقت ہے۔

"تمھارے پاس کتنی رقم ہے؟" اس نے پوچھا۔

ڈاکیا خچر سے اترا اور جیب سے کچھ مڑےتڑے نوٹ نکال کر دادی کو دکھائے۔ اس نے سب کے سب نوٹ سُرعت سے اس طرح جھپٹ لیے جیسے وہ کوئی گیند ہوں۔

"میں تمھارے لیے قیمت گھٹا دوں گی" وہ بولی، "لیکن ایک شرط ہے: تم یہ خبر چاروں طرف پھیلاؤ گے۔"

"دنیا کے پرلے سرے تک" ڈاکیے نے کہا۔ "اپنا تو کام یہی ہے۔"

اریندرا نے، جو پلکیں جھپکانے کے بھی قابل نہ تھی، اپنی مصنوعی پلکیں اتاریں اور اس اتفاقی محبوب کو جگہ دینے کے لیے چٹائی پر ایک طرف کو سرک گئی۔ وہ جوں ہی چھپر میں داخل ہوا، دادی نے پھسلواں پردہ زور سے کھینچ کر راستہ بند کر دیا۔

یہ ایک موثر سودا تھا۔ ڈاکیے کی پھیلائی ہوئی خبر کی بدولت لوگ اریندرا کی شہرت سے واقف ہونے کے لیے دور دور سے آنے لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے جوئے کی میزیں اور کھانے کے اسٹال آئے اور ان سب کے پیچھے ایک بائیسکل سوار فوٹوگرافر، جس نے پڑاؤ کے دوسری طرف جھیل اور بےروح بطخوں کے پس منظر اور ایک ماتمی آستین کے ساتھ تپائی پر کیمرا سجا لیا۔

یہی وقت تھا جب پنکھا جھلاتی ہوئی دادی خود اپنی دکان سے نکلتی نظر آتی تھی۔ اسے اگر کسی بات سے دلچسپی تھی تو صرف اپنی باری کے منتظر گاہکوں کی قطار میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور اس رقم کی پڑتال سے جو ایرینڈرا کے پاس جانے کے لیے وہ پیشگی ادا کرتے تھے۔ وہ پہلے پہل اتنی سخت گیر تھی کہ اس نے ایک چھوٹے سپاہی گاہک کو صرف پانچ پیسے کم ہونے کی وجہ سے لوٹا دیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ حقائق سے سمجھوتہ کرنے لگی اور آخرکار ایسے لوگوں کو بھی چانس دینے لگی جو اپنی ادائیگی مذہبی تمغوں، خاندانی یادگاروں، شادی کی انگوٹھیوں اور ہر اس چیز سے پوری کرتے تھے جسے وہ اپنے دانتوں کی کاٹ سے خالص سونا ثابت کر سکیں، چاہے اس میں چمک کا فقدان ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے قصبے میں طویل قیام کے بعد دادی کے پاس کافی رقم اکٹھی ہو گئی [illegible] ایک گدھا خرید لیا اور [illegible] کے لیے زیادہ سازگار مقامات کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ وہ گدھے کے اوپر [illegible] سفر کر رہی تھی [illegible] ایرینڈرا [illegible] خدمت گار [illegible] فرشتے [illegible]

[illegible] صورت حال سمجھنے کے قابل ہوئی ہو [illegible]

[illegible] اسی طرح چلتے رہے [illegible] چکی ہو گی۔"

[illegible] رکھی ہوئی تھیں [illegible] کرتے ہوئے ہوں۔

[illegible] دوسرے چھوٹے موٹے [illegible]

[illegible] کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی [illegible] مشکل ہی سے روک پاتی۔

[illegible] کہا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور [illegible] میں چلی گئی۔

[illegible] ایک چھوٹا [illegible] پرندوں [illegible] کا

جھپٹ رہی تھی [illegible] سٹیرنگ پر [illegible] جسیم شخص ولندیزی [illegible] بیٹھا تھا جس [illegible] در ونیہ کے اثرات واضح تھے۔ اس کی مونچھوں کا رنگ، جو کسی جدامجد کی وراثت تھی، گلہری جیسا تھا۔ اس کا بیٹا یولیسس جو دوسری سیٹ پر بیٹھا تھا، ایک سنہری رنگت والا نوعمر تھا جس کی آنکھیں سمندر کی طرح اور شباہت کسی گنام فرشتے جیسی تھی۔ ولندیزی کی توجہ ایک خیمے نے مبذول کرائی جس کے سامنے مقامی محافظ دستے کے تمام سپاہی اپنی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ دبیں در دبیں منتقل ہوتی ہوئی ایک ہی بوتل سے پی رہے تھے۔ ان کے سروں پر بادام کی شاخیں تھیں جیسے وہ لڑائی کے لیے کیموفلاژ کی حالت میں ہوں۔ ولندیزی نے اپنی زبان میں پوچھا:

"اس خیمے میں کیا بک رہا ہے؟"

"ایک عورت،" اس کے بیٹے نے بالکل فطری انداز میں جواب دیا۔ "اس کا نام ایرنڈرا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"صحرا میں ہر شخص کو معلوم ہے،" یولیسس نے جواب دیا۔

ولندیزی نے شہر کے چھوٹے سے ہوٹل پر ٹرک روکا اور نیچے اتر آیا۔ یولیسس ٹرک میں بیٹھا رہا۔ اس نے سبک دستی سے بریف کیس کھولا جو اس کا باپ سیٹ پر چھوڑ گیا تھا اور نوٹوں کا ایک بنڈل نکالتے ہوئے بہت سے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس لیے۔ پھر اس نے ہر چیز کو اسی طرح رکھ دیا جیسی کہ تھی۔ اس رات جب اس کا باپ سو رہا تھا وہ ہوٹل کی کھڑکی سے کودا اور ایرنڈرا کے خیمے کے سامنے قطار میں کھڑا ہو گیا۔

رنگ رلیاں اپنے عروج پر تھیں۔ مدہوش ریکروٹ آپ ہی آپ ناچ رہے تھے کہ مفت کی موسیقی ضائع نہ ہو، اور فوٹوگرافر میگنیشیم پیپر کی مدد سے شبینہ تصویریں بنا رہا تھا۔ اپنے کاروبار کی نگرانی کرتی ہوئی دادی نے گود میں پڑے ہوئے نوٹوں کو گنا اور مساوی ڈھیریوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک ٹوکری میں رکھ دیا۔ اس وقت صرف [illegible] سپاہی تھے لیکن شام کی قطار شہری گاہکوں کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ یولیسس قطار کے آخری سرے پر تھا۔

یہ ایک بہت بدہیئت سپاہی کی باری تھی۔ دادی نے نہ صرف [illegible] کہ اس کا راستہ مسدود کر دیا بلکہ اس کی رقم کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔

"نہیں بیٹا،" اس نے سپاہی کو بتایا۔ "تم دنیا بھر کا سونا [illegible] میں اندر نہیں جا سکتے۔ تم بدشگون ہو۔"

سپاہی، جس کا تعلق ان علاقوں سے نہیں تھا، حیران رہ گیا۔

"کیا مطلب؟"

"تمہارے ساتھ بدی کا سایہ ہے،" دادی نے کہا۔ "آدمی کو صرف تمہارا چہرہ دیکھ لینے کی ضرورت ہے۔"

دادی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چھوئے بغیر رخصت کر دیا اور اگلے سپاہی کے لیے راستا چھوڑ دیا۔

"سیدھے اندر جاؤ، خوش صورت،" دادی نے خوش طبعی سے کہا، "لیکن زیادہ دیر مت لگانا، تمہارے ملک کو تمہاری ضرورت ہے۔"

سپاہی اندر گیا لیکن آدھے گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا کیونکہ ایرندرا دادی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے رقم کی ٹوکری اپنے بازو پر لٹکائی اور خیمے کے اندر چلی گئی، جو زیادہ کشادہ تو نہیں، لیکن صاف ستھرا ضرور تھا۔ عقبی حصے میں ایرندرا ایک فوجی چارپائی پر لیٹی اپنے بدن کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سپاہیوں کے پسینے میں شرابور ہوئی وہ بڑی افسوس ناک حالت میں تھی۔

"دادی،" اس نے سسکی بھری، "میں مر رہی ہوں۔"

دادی نے اس کی پیشانی کو چھوا اور جب اس نے دیکھا کہ اسے بخار نہیں ہے تو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"صرف دس سپاہی رہ گئے ہیں،" اس نے کہا۔

ایرندرا نے کسی خوف زدہ جانور کی طرح چیختے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ تب دادی کو احساس ہوا کہ وہ دہشت کی حدوں سے گزر چکی ہے۔ اس نے ایرندرا کا سر تھپتھپاتے ہوئے اسے چپ کرایا۔

"مشکل یہ ہے کہ تم کمزور ہو،" اس نے کہا۔ "چھوڑو بھی، اب چلاؤ مت۔ بوٹی والے پانی سے نہا لو تمہارے خون کی گردش بحال ہو جائے گی۔"

ایرندرا چپ ہوئی تو دادی خیمے سے باہر آئی، اور منتظر سپاہی کو اس کی رقم لوٹا دی۔ "آج کا وقت ختم ہو گیا،" اس نے سپاہی کو بتایا۔ "کل آنا، میں تمہیں قطار میں پہلی جگہ دوں گی۔" پھر وہ قطاروں میں کھڑے لوگوں پر چلائی:

"بس، لڑکو، کل صبح نو بجے۔"

سپاہیوں اور شہریوں نے احتجاجاً چیختے چلاتے ہوئے قطاریں توڑ دیں۔ دادی نے خوش مزاجی سے ان کا سامنا کیا، لیکن وہ اپنا خوفناک عصا سنجیدگی سے لہرا رہی تھی۔

"تم خودغرض گنواروں کا ایک ٹولا ہو!" وہ چلائی۔ "تمہارے خیال میں یہ لڑکی کس چیز کی بنی ہوئی ہے، لوہے کی؟ میں اس کی جگہ تمہیں دیکھنا پسند کروں گی۔ بدراہ رو! غلیظ آوارہ گردو!"

لوگوں نے اسے جواباً اور بھی بیہودہ گالیاں دیں لیکن وہ بغاوت پر قابو پانے میں کامیاب رہی، اور اپنی لاٹھی کے ساتھ اس وقت تک نگرانی کرتی رہی جب تک وہ کھانے کی میزیں اور جوئے کے اسٹال اٹھا کر نہ لے گئے۔ وہ خیمے میں واپس جانے ہی کو تھی کہ اس کی نظر یولیسس پر پڑی، جو اس تاریک اور خالی جگہ پر پورے قد سے اکیلا کھڑا تھا جہاں ابھی ابھی لوگوں کی قطار تھی۔ اس کے گرد ایک غیرحقیقی ہالہ تھا اور اپنی جمال کی دمک کے باعث وہ سایوں میں بھی مرئی لگ رہا تھا۔

"تم،" دادی نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے پروں کو کیا ہوا؟"

"پروں والا میرا دادا تھا،" یولیسس نے اپنے فطری انداز میں جواب دیا، "لیکن کسی کو اس بات پر یقین نہیں ہے۔"

دادی نے اسے دوبارہ سر سے پاؤں تک گرویدگی سے دیکھا۔ "خیر، مجھے ہے،" اس نے کہا۔ "کل پر لگا کر آنا۔" وہ یولیسس کو وہیں تڑپتا چھوڑ کر خیمے میں چلی گئی۔

غسل کے بعد ایرندرا بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا سا گوٹ دار جانگیہ پہن رکھا تھا اور سونے سے قبل اپنے بال خشک کر رہی تھی، لیکن ابھی تک آنسو پینے کی کوشش میں تھی۔ اس کی دادی سو رہی تھی۔

ایرندرا کے بستر کے پیچھے، بہت آہستگی سے یولیسس کا سر نمودار ہوا۔ اس نے شفاف و مضطر آنکھیں دیکھیں، لیکن کچھ بولنے سے پہلے یہ یقین کرنے کے لیے کہ یہ فریب نظر نہیں اپنے سر کو تولیے سے رگڑا۔ جب یولیسس نے پہلی بار پلکیں جھپکائیں، ایرندرا نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا:

"تم کون ہو؟"

یولیسس نے اپنے آپ کو کندھوں تک اٹھایا۔ "میرا نام یولیسس ہے،" اس نے کہا۔ اس نے ایرندرا کو اپنے چرائے ہوئے نوٹ دکھائے، اور بولا:

"میرے پاس پیسے ہیں۔"

ایرندرا نے اپنے ہاتھ بستر پر رکھے اور اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے اس طرح باتیں کرنے لگی گویا کوئی بچوں کا کھیل کھیل رہی ہو۔

"تمہیں قطار میں کھڑا ہونا چاہیے تھا،" اس نے یولیسس سے کہا۔

"میں نے رات بھر انتظار کیا ہے،" یولیسس بولا۔

"اچھا، اب تمہیں کل تک انتظار کرنا ہو گا،" ایرندرا نے کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے گردوں پر ضربیں لگاتا رہا ہے۔"

عین اسی لمحے دادی نے نیند میں بولنا شروع کر دیا۔

"بارش ہوئے بیس سال ہونے کو ہیں،" وہ کہنے لگی۔ "ایسا ہولناک طوفان تھا کہ بارش اور سمندر کا پانی یک جان ہو گیا تھا، اور اگلی صبح سارا گھر مچھلیوں اور گھونگھوں سے بھرا ہوا تھا۔ تمہارے دادا کو — ان پر خدا کی رحمتیں ہوں — ہوا میں تیرتی ایک دمکتی ہوئی کرن دکھائی دی۔"

یولیسس پھر سے بستر کے پیچھے چھپ گیا۔ ایرندرا دلچسپی سے مسکرانے لگی۔

"گھبراؤ نہیں،" اس نے کہا۔ "دادی سوتے میں ہمیشہ دیوانوں کی سی حرکتیں کرتی ہے لیکن اس کی نیند میں زلزلہ بھی خلل نہیں ڈال سکتا۔"

یولیسس دوبارہ سامنے آ گیا۔ ایرندرا نے اسے شرارت بھری مسکراہٹ سے، جس میں قدرے پیار بھی تھا، دیکھا اور گدے پر سے میلی چادر ہٹانے لگی۔

"آؤ،" اس نے کہا۔ "چادر بدلنے میں میری مدد کرو۔"

یولیسس بستر کے پیچھے سے نکلا اور چادر کا ایک سرا تھام لیا۔ چونکہ چادر گدے سے کافی بڑی تھی لہذا انہیں اس کو کئی بار تہہ کرنا پڑا۔ وہ ہر تہہ کے ساتھ ایرندرا کے قریب ہوتا گیا۔

"میں تمہیں دیکھنے کو پاگل ہوا جا رہا تھا،" وہ اچانک بولا۔ "سب لوگ کہتے ہیں تم بہت حسین ہو۔ ان کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔"

"لیکن میں تو مری جا رہی ہوں،" ایرندرا نے کہا۔

"میری ماں کہتی ہے صحرا میں مرنے والے آسمان پر نہیں بلکہ سمندر میں جاتے ہیں۔" یولیسس نے کہا۔

اریندرا نے گندی چادر ایک طرف رکھ دی اور گدے پر نئی چادر بچھا دی جو اجلی اور استری کی ہوئی تھی۔

"میں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا" وہ بولی۔

"صحرا جیسا ہوتا ہے لیکن پانی کے ساتھ" یولیسس نے بتایا۔

"تب تو تم اس پر چل نہیں سکتے۔"

"میرے ابا ایک آدمی کو جانتے تھے جو چل سکتا تھا" یولیسس نے کہا، "لیکن یہ بات بہت پرانی ہے"

اریندرا مسحور ہو چکی تھی لیکن ابھی نیند آ رہی تھی۔

"اگر تم کل بہت جلدی آ جاؤ تو قطار میں سب سے آگے ہو سکتے ہو" اس نے کہا۔

"میں صبح صبح ابا کے ساتھ جا رہا ہوں" یولیسس نے بتایا۔

"واپسی پر اس راستے سے نہیں گزرو گے؟"

"کون جانے؟" یولیسس نے کہا۔ "ہم تو صرف سرحد والی سڑک سے بھٹک کر یہاں آ گئے۔"

اریندرا نے کچھ سوچتے ہوئے پھر خوابیدہ دادی کو دیکھا۔

"اچھا" وہ یکسو ہو گئی۔ "لاؤ پیسے نکالو"

یولیسس نے اسے رقم تھما دی۔ اریندرا بستر پر لیٹ گئی لیکن وہ جہاں کھڑا تھا وہیں [illegible] کے لمحے میں اس کا عزم جواب دے گیا تھا۔ اریندرا اس کے ہیجان اور پریشانی کو اسی وقت محسوس کر سکی جب اس نے یولیسس کو ہاتھ سے پکڑ کر لٹانا چاہا۔ وہ اس خوف سے واقف تھی۔

"کیا یہ پہلی بار ہے؟" اس نے پوچھا۔

یولیسس نے جواب نہیں دیا لیکن اداسی سے مسکرا دیا۔ اریندرا ایک [illegible] کی ہو گئی۔

"آہستہ آہستہ سانس لو" اس نے یولیسس سے کہا۔ "پہلی بار ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد تم محسوس بھی نہیں کرو گے۔"

اس نے یولیسس کو اپنے برابر لٹایا اور اس کے کپڑے اتارنے کے دوران مادرانہ طور سے اس کی دلجوئی کرتی رہی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یولیسس"

"یہ تو غیر ملکی نام ہے" اریندرا نے کہا۔

"نہیں، ملاحی نام ہے۔"

اریندرا نے اس کا سینہ کھولا اور چند چھوٹے چھوٹے اکھڑے ہوئے بوسے دیتے ہوئے اسے سونگھا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے تم سارے کے سارے سونے کے بنے ہو" اس نے کہا، "لیکن تم سے

پھولوں کی مہک آتی ہے۔"

"مالٹوں کی بو کی،" یولیسس نے کہا۔

وہ اب نسبتاً مطمئن تھا اور اس کی مسکراہٹ سازباز کی غماز تھی۔

"لوگوں کو غلط تاثر دینے کے لیے ہم بہت سارے پرندے لیے پھرتے ہیں،" اس نے سلسلہ جاری رکھا، "لیکن حقیقت میں ہم مالٹوں کی کھیپ سرحد پار اسمگل کر رہے ہیں۔"

"مالٹوں پر تو پابندی نہیں ہے۔" اریندرا نے کہا۔

"ہمارے مالٹوں پر ہے۔" یولیسس نے کہا۔ "ایک ایک پچاس ہزار پیسو کا ہے۔"

اریندرا کافی دیر بعد پہلی بار ہنسی۔

"تم لغویات کو بھی سنجیدہ بنا دیتے ہو۔ تمہاری یہ بات مجھے پسند ہے۔" اس نے کہا۔

وہ پھر سے بےساختہ اور باتونی ہو گئی تھی، جیسے یولیسس کی معصومیت نے اس کا مزاج ہی نہیں کردار بھی بدل ڈالا ہو۔ دادی جو بدبختی سے قدم بھر کے فاصلے پر تھی نیند میں اب تک بول رہی تھی۔

"اسی زمانے کے آس پاس، مارچ کی ابتدا میں، وہ تمہیں گھر لے آتا،" وہ بولی۔ "تم روئی میں لپٹی ہوئی چھپکلی لگ رہی تھیں۔ تمہارا نوجوان اور خوبصورت باپ اماڈیس اس سے پھر اتنا خوش تھا کہ اس نے پھولوں سے بھرے بیس چھکڑے منگوائے جو گلیوں میں پھول بکھراتے آئے حتیٰ کہ سارا گاؤں سمندر کی طرح پھولوں سے سنہرا ہو گیا۔"

وہ کئی گھنٹوں تک اسی طرح بلند جذبے کے ساتھ اونچی آواز میں بڑبڑاتی رہی۔ لیکن یولیسس کچھ سننے سے قاصر تھا، کہ اریندرا نے اسے اتنی افراط اور اتنی شدّت سے پیار کیا تھا کہ اس نے، جب کہ دادی کی لن ترانیاں جاری تھیں، آدھی قیمت کے عوض اسے پھر پیار کیا اور صبح تک بےقیمت پیار کرتی رہی۔

مبلّغوں کی ایک جماعت مصلوب مسیح کے مجسمے اٹھائے، کندھے سے کندھا ملائے صحرا کے وسط میں کھڑی تھی۔ ایک تندوتیز ہوا، جو غضب ناکی میں بدبختی کی ہوا جیسی تھی، ان کے کھردرے لباس اور ناہموار داڑھیوں کو ہلا رہی تھی اور وہ مشکل ہی سے اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں تبلیغی مرکز تھا، جو نوآبادیاتی عہد کی ایک سنگی عمارت تھی، جس کی کھردری سپید دیواروں کے اوپر ایک چھوٹا سا گھنٹاگھر تھا۔

سب سے کم عمر مبلغ نے، جو اس جماعت کا نگراں تھا، چمک دار چکنی زمین میں ایک قدرتی دراڑ کی طرف اشارہ کیا۔

"تم اس لکیر کے پار نہیں جاؤ گی؟" اس نے چلا کر کہا۔

ان چار انڈین خدمت گاروں نے، جو تختوں کی بنی ہوئی ڈولی میں دادی کو اٹھائے ہوئے تھے، جب یہ صدا سنی تو ٹھہر گئے۔ اس کے باوجود کہ وہ ڈولی میں بےآرام تھی اور اس کی خوش دلی کو صحرا کی گرد اور پسینے نے مرجھا دیا تھا، اس کی تمکنت جوں کی توں تھی۔ اریندرا پیدل چل رہی تھی۔ ڈولی کے پیچھے سامان اٹھائے ہوئے آٹھ خدمت گاروں کی قطار تھی اور سب سے آخر میں اپنی بائیسکل پر سوار فوٹوگرافر تھا۔

"صحرا کسی کی ملکیت نہیں ہے،" دادی نے کہا۔

"یہ خدا کی ملکیت ہے،" مبلغ نے کہا، "اور تم اپنے گھناؤنے کاروبار سے اس کے مقدّس قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہو۔"

تب دادی نے مبلغ کا مخصوص استعمال الفاظ اور اسلوب پہچان لیا اور اس کی کٹرپن سے بچنے کے لیے دوبدو مقابلے سے گریز کیا۔ وہ اپنے آپ میں آ گئی۔

"بیٹا، میں تمھارے اسرار سمجھی نہیں۔"

مبلغ نے اریندرا کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لڑکی ابھی بچی ہے۔"

"لیکن یہ میری پوتی ہے۔"

"پھر تو اور بھی بُرا ہے،" مبلغ نے جواب دیا۔ "اسے رضامندی سے ہماری نگرانی میں دے دو، ورنہ ہمیں دوسرے ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔"

دادی کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس حد تک چلے جائیں گے۔

"اچھا، یہ بات ہے تو یوں ہی سہی۔" اس نے حرفِ سے ہتھیار ڈال دیے۔ "لیکن دیکھ لینا جلد یا بدیر، میں اسے پار کر جاؤں گی۔"

مبلغوں سے جھڑپ کے تین دن بعد دادی اور اریندرا تبلیغی مرکز کے نزدیک ایک گاؤں میں سو رہی تھیں کہ چپ و خاموش بدموں کا ایک گروہ گشتی سپاہیوں کی طرح رینگتا ہوا ان کے خیمے میں در آیا۔ وہ نئے نئے عیسائی ہونے والی چھ نوعمر اور طاقت ور انڈین تھیں، ان کے کھردرے لباس چاندنی میں دمکتے ہوئے لگ رہے تھے۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر انھوں نے اریندرا کو ایک مچھردانی سے ڈھانپ کر اسے جگائے بغیر اٹھا لیا اور چودھویں کی رات میں پکڑی ہوئی کسی بڑی اور نازک مچھلی کی طرح لپیٹ کر لے گئیں۔

اپنی پوتی کو مبلغوں کے تحفظ سے چھڑانے کے لیے دادی نے ہر ممکن ذریعہ آزمایا، اور جب راست ترین سے پیچیدہ ترین تک تمام ذریعے ناکام ہو گئے تو اس نے شہری اقتدار سے، جو ایک فوجی میں مرکوز تھا، رجوع کیا۔ دادی نے اسے اپنے گھر کے آنگن میں اس حال میں پایا کہ اس کا سینہ عریاں تھا اور وہ ایک گھمبیرے اور اکیلے بادل پر فوجی رائفل سے گولیاں چلا رہا تھا۔ وہ اسے برسانے کے لیے اس میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے نشانے تندوتیز اور رائیگاں تھے، تاہم اس نے دادی کی بات سننے کے لیے وقت نکالا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا،" دادی کی بات سن کر اس نے واضح کیا۔ "معاہدے کے مطابق مبلغوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بلوغت تک لڑکی کو اپنے پاس رکھیں، یا اس وقت تک جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے۔"

"تو پھر تم کس لیے میئر ہو؟" دادی نے پوچھا۔

"بارش برسانے کے لیے۔"

پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ بادل اس کی زد سے نکل گیا ہے، اس نے اپنے سرکاری فرائض معطّل کیے اور دادی پر پوری توجہ مرکوز کر دی۔

"تمھیں کسی بااثر آدمی کی ضرورت ہے جو تمھارا ضامن ہو سکے،" اس نے دادی کو بتایا۔

"کوئی ایسا شخص جو دستخط شدہ خط کے ذریعے تمھاری اخلاقی حیثیت اور مناسب طرزِعمل کی تصدیق کر سکے۔ تم سینیٹر اونیسیمو سانچیز کو جانتی ہو؟"

دادی نے، جو اپنے فراخ کولھوں کے لیے ایک بہت تنگ اسٹول پر بیٹھی تھی، طیش میں آ کر جواب دیا:

"میں تو صحرا کی وسعت میں ایک بےکس تنہا عورت ہوں۔"

میئر نے، جس کی دائیں آنکھ دھوپ کی وجہ سے مچی ہوئی تھی، اسے ترحّم سے دیکھا۔

"پھر اپنا وقت ضائع نہ کرو، خاتون۔ تم دوزخ کا ایندھن بن جاؤ گی۔"

مگر بلاشبہ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنا خیمہ تبلیغی مرکز کے سامنے لگا لیا اور کسی قلعہ بند شہر کا محاصرہ کرنے والے تنہا جنگجو کی طرح سوچنے بیٹھ گئی۔ جہاں‌گرد فوٹوگرافر جو اسے اچھی طرح جانتا تھا، اپنا سازوسامان سائیکل کے بارگیر پر لاد کر اکیلا رخصت ہونے کو تھا کہ اس نے دادی کو نصف النّہار کی دھوپ میں تبلیغی مرکز پر نظریں گاڑے دیکھا۔

"دیکھنے میں پہلے کون تھکتا ہے،" دادی نے کہا، "وہ یا میں؟"

"وہ یہاں تین سو سال سے ہیں، اور ابھی مزید رہ سکتے ہیں،" فوٹوگرافر نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

دادی نے اس وقت تک لدی ہوئی بائیسکل پر توجہ نہیں کی تھی۔

"کہاں جاؤ گے؟"

"جہاں بھی ہوا لے جائے،" فوٹوگرافر نے جواب دیا اور چل پڑا۔ "دنیا بہت بڑی ہے۔"

دادی نے آہ بھری۔

"اتنی بڑی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو، ناشکرگزار۔"

لیکن غصّے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں، مبادا اس کی نظروں سے تبلیغی مرکز اوجھل ہو جائے۔ اس نے قیامت خیز گرمی کے بہت سے دن اور تندوتیز ہواؤں کی بہت سی راتیں اسی کیفیت میں گزاریں۔ وہ ہمہ وقت سوچ بچار کر رہی تھی لیکن تبلیغی مرکز سے باہر کوئی نہیں آیا۔ خدمت گاروں نے خیمے کے برابر پام کے پتّوں سے ایک چھپّر سا بنا کر وہاں اپنے جھولنے لٹکا لیے، لیکن دادی تادیر اپنے تخت پر بیٹھی آرام کرتے ہوئے بیل کی ناقابلِ شکست منشی کے ساتھ، اپنی تھیلی میں سے دانے چباتی ہوئی نگرانی کرتی رہی۔

ایک رات ڈھکے ہوئے ٹرکوں کا ایک سست رو کارواں، جن میں رنگین بلبوں کے حلقوں کے سوا کوئی اور روشنی نہ تھی، اس کے بہت قریب سے گزرا۔ رنگ برنگی مدّھم روشنیوں نے ٹرکوں کو خواب خرام قربان گاہوں کی طلسماتی جسامت دے رکھی تھی۔ دادی نے انھیں فوراً پہچان لیا کہ وہ ہوبہو اماڈیسوں کے ٹرکوں کی طرح تھے۔ کارواں کا آخری ٹرک سست ہو کر رکا اور کیبن میں سے ایک آدمی عقب میں کوئی چیز ٹھیک کرنے اترا۔ وہ اوپر اٹھے ہوئے کناروں والا ہیٹ اور اونچے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سینے پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی کارتوسوں کی دو پیٹیاں، شانے پر فوجی رائفلیں اور پہلوؤں پر دو پستول سجے تھے۔ اس وضع قطع میں وہ اماڈیسوں کی یادگار لگ رہا تھا۔ ایک ناقابلِ مزاحمت تحریص سے مغلوب ہو کر دادی نے اسے پکارا۔

"جانتے ہو میں کون ہوں؟" دادی نے اس آدمی سے پوچھا۔

آدمی نے دادی کو بے رحمی سے فلیش لائٹ کی زد پر لے لیا۔ اس نے لمحہ بھر کو شب بیداری سے مرجھائے ہوئے چہرے، تکان سے بجھی ہوئی آنکھوں اور عورت کے خشک بالوں پر غور کیا، جو اسے چہرے پر پڑتی ہوئی تندوتیز روشنی میں۔ اس عمر اور خستگی میں بھی کہہ سکتی تھی کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت رہی ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس عورت کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تو اس نے فلیش لائٹ بجھا دی۔

"میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم دائمی مدد کی دیوی نہیں ہو۔"

"اس کے برعکس،" دادی نے بے حد شیریں آواز میں جواب دیا "میں بیگم ہوں۔"

آدمی نے محض جبلت سے مجبور ہو کر اپنا ہاتھ پستول پر رکھ لیا۔

"کون بیگم؟"

"بے امادیس کی بیگم۔"

"پھر تم اس دنیا کی نہیں ہو" [illegible] سے کہا۔ "چاہیے [illegible] ہو"

"میری پوتی [illegible] امادیس کی پوتی [illegible] امادیس کی بیٹی [illegible] تبلیغی مرکز میں [illegible]

[illegible]

[illegible] خواب پر قادر [illegible]

[illegible] دروازے پر [illegible] "اگر تم سمجھتی ہو کہ ہمارا ارادہ [illegible] معاملات میں دخل [illegible] وہ نہیں جس کا دعویٰ کرتی ہو، تم امادیسوں [illegible] نہیں ہو [illegible] کے بارے میں سمجھیں خاک بھی نہیں معلوم۔"

اس رات کی آخری ساعتوں میں دادی پہلے کی نسبت کم سوئی۔ وہ اونی کمبل میں لپٹی، بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر نے اس کی یادوں کو گڈمڈ کر دیا تھا اور دبا ہوا ہذیان اس کی بیداری کے باوجود ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس خوف سے کہ سمندر کے قریب بڑے بڑے سرخ پھولوں والے ایک مکان کی یاد، جہاں وہ خوش رہی تھی، اس کا دم نہ گھونٹ دے، اسے اپنے دل پر اپنے ہاتھوں سے زور ڈالنا پڑا۔ وہ اسی عالم میں رہی یہاں تک کہ تبلیغی مرکز کا گھنٹہ بجنے لگا اور کھڑکیوں میں پہلی روشنیاں چمکنے لگیں اور صحرا صبح کی گرم خوشبو سے معمور ہو گیا۔ پھر اس وہم کے دام میں آ کر کہ ایرندرا بیدار ہو گئی ہے اور [illegible] اس کے پاس [illegible] ڈھونڈ رہی ہے اس نے بھی مشقت ترک کر دی۔

تاہم جب سے اسے تبلیغی مرکز میں لایا گیا تھا، ایرندرا نے ایک شب کی بھی نیند ضائع نہیں کی تھی۔ انھوں نے چھانٹنے والی قینچی سے اس کے بال تراش دیے تھے اور اس کا سر برش جیسا ہو گیا تھا۔ اسے گوشہ نشینوں کا کھردرا چوغہ پہنا کر، سفیدی کی ایک بالٹی اور جھاڑو دے دی گئی تھی کہ ہر آنے جانے والے کے بعد سیڑھیوں پر سفیدی کرتی رہے۔ یہ کام جان لیوا تھا، کہ کیچڑ میں لتھڑے میلوں اور نومسیحی حمالوں کی آمدورفت مسلسل جاری رہتی تھی، لیکن اس ڈراؤنی کشتی کے بعد، جو اس کا بستر رہی تھی، ایرندرا کو ہر دن اتوار لگتا تھا۔ علاوہ ازیں رات کو تھکن سے چور اکیلی وہی نہیں ہوتی تھی کیونکہ تبلیغی مرکز شیطان کے خلاف نہیں، صحرا کے خلاف برسرپیکار تھا۔ وہ اندین نومسیحیوں کو اناج گھر میں کائیں

دوہنے کے لیے انھیں قابو کرتے، پیر جمانے کے لیے کئی کئی دن تختوں پر اچھلتے، بکریوں کو بچہ جننے میں مدد کرتے دیکھ چکی تھی۔ اس نے انھیں سیاہ فام قلیوں کی طرح پسینا بہاتے ہوئے تالاب سے پانی لا کر ایک ایسے سنگلاخ باغ کو سیراب کرتے دیکھا تھا جسے دوسرے نومسیحی صحر کی پتھریلی زمین میں سبزیاں کاشت کرنے کے لیے کھرپیوں سے تیار کرتے تھے۔ اس نے روٹیاں پکانے کے لیے تنوروں کا رمیں جہنم اور کپڑے استری کرنے کے کمرے دیکھے تھے۔ اس نے ایک راہبہ کو سؤر کے تعاقب میں صحن میں دوڑتے ہوئے اور پھر اس کو کانوں سے پکڑے پکڑے پھسل کر کیچڑ کے گڑھے میں گرتے دیکھا تھا، تاوقتیکہ چمڑے کے پیش بندوں والے دو نومسیحیوں نے اس پر قابو پانے میں راہبہ کی مدد کی، اور ان میں سے ایک نے اس کے گلے پر چھری پھیر دی اور وہ سب خون اور کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ اس نے اسپتال کے علیحدہ حصے میں تپ دق کی مریض راہباؤں کو دیکھا تھا جو اپنے شبینہ چوغوں میں، خدا کے آخری احکام کی منتظر، جبوتروں پر بیٹھی [illegible] کڑھتی رہتی تھیں جبکہ مرد صحرا میں تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ایرندرا اپنے سایوں میں جی رہی تھی۔ وہ حسن و دہشت کی ایسی صورتیں دریافت کر رہی تھی جن کا اپنے بستر کی محدود دنیا میں اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جس دن سے اسے تبلیغی مرکز میں لایا گیا تھا، نہ تو سب سے اکھڑ اور نہ ہی سب سے مہذب نومسیحی اسے بولنے پر آمادہ کر سکا تھا۔ ایک صبح، جب وہ بالٹی میں سفیدی تیار کر رہی تھی، اس نے وائلن کی آواز سنی جو ایسے نور کی طرح تھی جو صحرا کی روشنی سے بھی زیادہ شفاف تھا۔ اس نے مسحور ہو کر تنگی دیواروں اور بڑی بڑی کھڑکیوں والی ایک کشادہ اور خالی بیٹھک میں جھانکا، جس میں آتی ہوئی جون کی خیرہ کن روشنی ساکت تھی۔ اس نے کمرے کے وسط میں ایک بہت خوبصورت راہبہ کو، جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، کلاوی کارڈ پر ایسٹر کا غنائیہ بجاتے دیکھا۔ ایرندرا کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل کسی دھاگے سے معلّق ہے۔ وہ محویت کے عالم میں سنتی رہی حتیٰ کہ دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بج اٹھی۔ کھانے کے بعد، اپنے برش کے برش سے سیڑھیوں پر سفیدی کرتے ہوئے، وہ منتظر رہی یہاں تک کہ تمام نومسیحیوں کی آمدورفت ختم ہو گئی اور وہ بالکل تنہا ہو گئی اور اس کی آواز سننے والا کوئی نہ رہ گیا۔ تب اس نے تبلیغی مرکز میں داخل ہونے کے بعد سے پہلی بار اپنے لب کھولے۔

"میں خوش ہوں،" وہ بولی۔

سو اس طرح ان اُمیدوں کا خاتمہ ہو گیا جو دادی کو ایرندرا کے واپس آنے کے بارے میں تھیں۔ لیکن اس نے پینٹی کوسٹ کے تہوار تک، کسی فیصلے پر پہنچے بغیر اپنا کڑا محاصرہ جاری رکھا۔ اس زمانے میں مبلّغ، حاملہ داشتاؤں کی تلاش میں، کہ ان کی شادیاں کرا سکیں، صحرا کو چھان رہے تھے۔ وہ ایک ٹوٹے پھوٹے ٹرک میں چار مسلّح سپاہیوں اور سستے کپڑے کے ایک صندوق کے ساتھ انتہائی دوردراز کی موآبادیوں تک جاتے تھے۔ مہم کا مشکل ترین حصہ عورتوں کو قائل کرنا تھا، جو اپنے آپ کو خدائی کرم سے اس حقیقت پسندانہ دلیل کے ذریعے بچاتی تھیں کہ مرد، جو اپنے جھولوں میں ٹانگیں چوڑی کیے سو رہے ہوتے تھے، یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں داشتاؤں کی نسبت قانونی بیویوں سے زیادہ بھاری کام لینے کا حق

حاصل ہے۔ منشائی‌پردی کو ان کی اپنی زبان کے شہد میں گھولتے ہوئے، کہ انھیں کم تلخ محسوس ہو، انھیں دھوکے سے پھسلانا ضروری تھا۔ لیکن ان میں سے عیّارترین بھی چمک دار بالوں کی جوڑنے سے قائل ہو جاتی تھی۔ ان کے برعکس مردوں کو، جب ایک بار عورتوں کی رضامندی لے لی جاتی تھی، وائلن کے کندوں کے ذریعے جھولوں سے اٹھا دیا جاتا اور ٹرک میں بٹھا کر جبری شادی کے لیے لے جایا جاتا تھا۔

دادی کئی دن تک حاملہ انڈین عورتوں سے بھرے چھوٹے ٹرک کو تبلیغی مرکز میں جاتے دیکھتی رہی، لیکن اپنا موقع پہچاننے میں ناکام رہی۔ اس نے اسے خاص پینٹی کوسٹ کے اتوار کے دن پہچانا، جب اس نے آتش بازی دیکھی اور بجتی ہوئی گھنٹیاں سنیں اور شادماں و غم زدہ ہجوم کو جشن میں جاتے دیکھا، ہجوم میں شامل دلہنوں کے لباس میں حاملہ عورتیں دیکھیں جو اپنے اتفاقی ساتھیوں کے بازو تھامے ہوئے تھیں، جنھیں اجتماعی شادی میں ان کے جائز خاوند قرار دیے جانے والا تھا۔

جلوس کے آخری شرکا میں چیتھڑوں میں ملبوس مخصوص انڈین طرز کے بالوں والا ایک سادہ لوح لڑکا گزرا، جس نے ریشمی ربن میں بندھی ایسٹر کی شمع اٹھا رکھی تھی۔ دادی نے اسے بلایا۔

"بیٹا، ایک بات تو بتاؤ" اس نے انتہائی نرم آواز میں پوچھا۔ "اس معاملے میں تمھارا کردار کیا ہے؟"

لڑکے کو جلتی ہوئی شمع سے ڈر آ رہا تھا اور اپنے بڑے بڑے دانتوں کے باعث اسے منھ بند کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

"مجھے پہلا عشائے‌ربانی ملنے والا ہے" اس نے کہا۔

"انھوں نے تمھیں کتنی رقم دی ہے؟"

"پانچ پیسو۔"

دادی نے اپنی تھیلی سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ لڑکا حیرت سے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔

"میں تمھیں بیس پیسو دے رہی ہوں" دادی نے کہا "لیکن تمھارے پہلے عشائے‌ربانی کے لیے نہیں بلکہ تمھاری شادی کے لیے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"میری پوتی سے۔"

سو گوشہ نشینوں کے چوغے میں ملبوس ایرینڈرا، جس نے نوعمر جوڑوں کی دی ہوئی ریشمی شال اوڑھ رکھی تھی، تبلیغی مرکز کے صحن میں ایک ایسے دولہا سے، جسے دادی نے اس کے لیے خریدا تھا اور جس کا نام بھی وہ نہیں جانتی تھی، بیاہ دی گئی۔ وہ ساکت اور سلگتے ہوئے سورج تلے شوررزدہ زمین پر گھٹنوں کے بل جھکنے کی اذیت، دو سو حاملہ دلہنوں کی بکری کے بالوں جیسی بُو اور لاطینی میں چلا چلا کر پڑھی جانے والی سینٹ پال کی خطوں کی سزا غیریقینی امید کے ساتھ برداشت کر گئی، کہ مبلغوں کے پاس اس اچانک شادی کی فریب سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن انھوں نے اسے تبلیغی مرکز میں رکھنے کی آخری کوشش کرنے کا وعدہ کر لیا۔ تاہم داعیانہ حاکم، بادلوں پر گولیاں چلانے والے فوجی میئر، اپنے

حالیہ شوہر اور اپنی بےحس دادی کی موجودگی میں تقریب کے بعد ایرینڈرا نے اپنے آپ کو ایک بار پھر اس افسوں کے زیرِ اثر پایا جو پیدائش کے دن سے اس پر طاری تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی آزادانہ، حقیقی اور حتمی مرضی کیا ہے تو اس نے تذبذب میں آہ بھی نہیں بھری۔

"میں جانا چاہتی ہوں" اس نے کہا، اور اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔ "لیکن اس کے ساتھ نہیں، اپنی دادی کے ساتھ۔"

یولیسس نے باپ کے باغ سے ایک سالم چرانے کی کوشش میں پوری سہ پہر ضائع کر چکا تھا کیونکہ اس کا باپ درختوں کی کاٹ چھانٹ کے دوران اس پر سے نظر نہیں ہٹا رہا تھا اور اس کی ماں گھر میں سے نگرانی کر رہی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنا منصوبہ کم سے کم اس دن کے لیے ترک کر دیا اور آخری درختوں کی کاٹ چھانٹ تک بادل نخواستہ اپنے باپ کی مدد کرتا رہا۔

دور تک پھیلا ہوا یہ باغ پرسکون و پوشیدہ تھا، اور ٹین کی چھت والے لکڑی کے مکان کی کھڑکیاں تانبے کی جنگلوں سے مزین تھیں۔ سامنے کے حصے میں ستونوں پر اٹھا ہوا کشادہ برامدہ تھا جس میں افراط سے پھول دینے والے قدیم پودے لگے تھے۔ یولیسس کی ماں برامدے میں جھولنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے سردرد سے نجات کے لیے کنپٹیوں پر دھواں لگے ہوئے پتے باندھ رکھے تھے اور اس کی مکمل انڈین نگاہ کسی غیرمرئی شعاعِ نور کی طرح باغ کے دوردراز حصوں تک اپنے بیٹے کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ بہت حسین تھی اور عمر میں اپنے شوہر سے کافی چھوٹی۔ وہ نہ صرف یہ کہ اب تک اپنے قبیلے کا پہناوا استعمال کرتی تھی، بلکہ اپنے لہو کے قدیم ترین رازوں سے بھی آگاہ تھی۔

جب یولیسس کاٹ چھانٹ کرنے والے اوزاروں کے ساتھ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اسے اپنی چار بجے کی دوا دینے کو کہا جو ایک قریبی میز پر دھری تھی۔ اس نے جوں ہی انھیں چھوا تو گلاس اور بوتل کا رنگ بدل گیا۔ پھر اس نے محض کھیل میں، ایک شیشے کی صراحی کو ہاتھ لگایا جو میز پر پیالوں کے برابر رکھی تھی۔ صراحی بھی نیلی ہو گئی۔ اس کی ماں دوا پینے کے دوران برابر اسے دیکھ رہی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ اس کے درد کا شاخسانہ نہیں ہے تو اس نے یولیسس سے گواہیرو انڈین زبان میں پوچھا،

"ایسا کب سے ہو رہا ہے؟"

"جب سے ہم صحرا سے لوٹے ہیں" یولیسس نے بھی گواہیرو میں جواب دیا۔ "لیکن ایسا صرف شیشے کی چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

مظاہرے کی غرض سے اس نے یکے بعد دیگرے میز پر رکھے ہوئے گلاسوں کو چھوا اور وہ سب مختلف رنگوں کے ہو گئے۔

"ایسی باتیں صرف محبت کی وجہ سے ہوتی ہیں" اس کی ماں نے کہا۔ "کون ہے وہ؟"

یولیسس نے جواب نہیں دیا۔ اس کا باپ، جو گواہیرو زبان نہیں سمجھتا تھا، اس لمحے مالٹوں کا ایک گچھا لیے برامدے کے پاس سے گزر رہا تھا۔

"تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو؟" اس نے یولیسس سے ولندیزی زبان میں پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں،" یولیسس نے جواب دیا۔

یولیسس کی ماں ولندیزی نہیں جانتی تھی۔ جب اس کا شوہر اندر چلا گیا، اس نے اپنے بیٹے سے گواہیرو میں پوچھا:

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"کوئی خاص بات نہیں،" یولیسس نے جواب دیا۔

باپ اندر گیا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، لیکن یولیسس نے دفتر کی ایک کھڑکی میں سے اسے پھر دیکھا۔ ماں اس وقت تک منتظر رہی جب تک یولیسس کے ساتھ اکیلی نہ رہ گئی۔ تب اس نے دوہرایا:

"بتاؤ کون ہے وہ؟"

"کوئی بھی تو نہیں،" یولیسس نے کہا۔

وہ بےخیالی سے جواب دے رہا تھا کیونکہ اس کی توجہ دفتر میں اپنے باپ کی حرکات پر تھی۔ وہ اسے قفل کے عدد ملانے کے دوران مالٹے تجوری کے اوپر رکھتے دیکھ چکا تھا۔ لیکن جس دوران وہ اپنے باپ پر نظر رکھے ہوئے تھا اس کی ماں اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

"تم بہت دنوں سے روٹی نہیں کھا رہے ہو،" ماں نے اظہار کیا۔

"مجھے پسند نہیں ہے۔"

ماں کے چہرے پر یکایک غیرمعمولی بشاشت آ گئی۔ "یہ جھوٹ ہے،" اس نے کہا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ تم محبت کے مریض ہو، اور جو لوگ محبت کے مریض ہوتے ہیں وہ روٹی نہیں کھا سکتے۔" آنکھوں کی طرح اس کی آواز بھی التجا سے دھمکی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"بہتر ہو گا تم مجھے بتا دو کہ وہ کون ہے،" وہ بولی، "ورنہ مجھے تمھیں پاک کرنے والے غسل کرانے پڑیں گے۔"

دفتر میں ولندیزی نے تجوری کھول کر مالٹے اندر رکھے اور بکتربند دروازہ بند کر دیا۔ یولیسس کھڑکی سے ہٹ اور اپنی ماں کو بےصبری سے جواب دیا۔

"میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کوئی نہیں ہے،" اس نے کہا۔ "میرا یقین نہیں تو ابا سے پوچھ لو۔"

ولندیزی اپنا ملاحوں والا پائپ جلاتا ہوا دفتر کے دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کی بغل میں بائبل کا گھسا پٹا نسخہ تھا۔ اس کی بیوی نے ہسپانوی میں اس سے پوچھا:

"صحرا میں تم کس سے ملے تھے؟"

"کسی سے بھی نہیں،" اس کے شوہر نے قدرے مشکوک ہو کر جواب دیا۔ "میرا یقین نہیں تو یولیسس سے پوچھ لو۔"

وہ ہال کے پرلے سرے میں بیٹھ کر پائپ پینے لگا یہاں تک کہ سارا تمباکو ختم ہو گیا۔ پھر اس نے بےسوچےسمجھے بائبل کھولی اور لگ بھگ دو گھنٹے تک رواں اور گونج دار ولندیزی میں نشان زدہ حصے بلند آواز سے پڑھتا رہا۔

آدھی رات کو یولیسس اتنی شدت سے سوچ رہا تھا کہ سو نہیں سکتا تھا۔ یادوں کے کرب پر قابو پانے کی کوشش میں وہ مزید ایک گھنٹے تک اپنے جھولنے میں لوٹتا رہا حتیٰ کہ

اسی کرب نے اسے وہ توانائی بخش دی جو فیصلہ کرنے کے لیے درکار تھی۔ اس نے اپنی کاؤبوائے پتلون، اونی قمیص اور گھڑسواری کے بوٹ پہنے اور کھڑکی سے کود کر پرندوں سے لدے ٹرک میں گھر سے بھاگ نکلا۔ باغ سے گزرتے ہوئے اس نے وہ تین پکے ہوئے مالٹے توڑ لیے جنھیں سب پہر کو اڑانے میں ناکام رہا تھا۔

رات کے باقی حصے میں اس نے صحرا کو عبور کیا، اور صبح سویرے شہروں اور دیہات میں ایرندرا کا اتاپتا پوچھتا پھرا، لیکن کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ آخرکار اسے معلوم ہوا کہ وہ سینیٹر اونسیمو سانچیز کی انتخابی مہم کے جلوس میں سفر کر رہی ہے، اور یہ کہ غالباً اس دن وہ نیووا کاستیلا میں ہو گا۔ سینیٹر یولیسس کو وہاں نہیں بلکہ اگلے شہر میں ملا، لیکن ایرندرا اب اس کے ساتھ نہیں تھی، کہ دادی نے اسے اپنے ہاتھ سے لکھے خط کے ذریعے اپنے کردار کی ذمےداری لینے پر آمادہ کر لیا تھا، اور اب وہ اس خط سے صحرا کے سارے مقفل دروازے کھول رہی تھی۔ تیسرے دن اس کی مدبھیڑ مقامی ڈاکیے سے ہوئی جس نے اسے بتایا کہ وہ کس سمت میں جائے۔

"وہ سمندر کی طرف جا رہے ہیں،" اس نے بتایا۔ "بہتر ہے کہ تم جلدی کرو۔ وہ بدبخت بڑھیا آروبا کے جزیرے میں جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

اس سمت میں آدھے دن کے سفر کے بعد یولیسس کو وہ چوڑا داغ دار خیمہ نظر آیا جسے دادی نے ایک دیوالیہ سرکس سے خریدا تھا۔ جہاں‌گرد فوٹوگرافر اس کے پاس لوٹ آیا تھا۔ وہ قائل ہو چکا تھا کہ دنیا واقعی اتنی بڑی نہیں ہے جتنی کہ وہ سمجھے تھا۔ اس نے اپنے دلکش پردے خیمے کے نزدیک لگا لیے تھے۔ پیتل کے باجوں والا بینڈ ایرندرا کے متلاشیوں کو دھیمے والز سے رجھا رہا تھا۔

یولیسس نے اندر جانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کیا۔ پہلی چیز جس نے اس کی توجہ مبذول کرائی، خیمے کے اندر کی ترتیب اور صفائی تھی۔ دادی کی شاہانہ مسہری کا شکوہ بحال ہو چکا تھا اور فرشتے کا مجسمہ اماڈیسوں کی باقیات کے صندوق کے برابر اپنی جگہ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ نہانے کا ایک جستی ٹب، جس کے پائے شیر کے پنجوں جیسے تھے، خیمے کی زینت بڑھا رہا تھا۔ اپنے چھتردار پلنگ پر لیٹی ہوئی ایرندرا عریاں اور پرسکون تھی۔ خیمے میں چھن کر آنے والی روشنی نے اس کے جسم کو ایک معصومانہ چمک دے رکھی تھی۔ وہ کھلی آنکھوں سو رہی تھی۔ یولیسس، جس کے ہاتھ میں مالٹے تھے، اس کے برابر ٹھہر گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اسے دیکھے بغیر دیکھ رہی ہے۔ اس نے ایرندرا کی آنکھوں کے آگے اپنا ہاتھ پھیرا، اور اس نام سے پکارا جو اسے یاد کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا:

"اریندرِیٹ۔"

ایرندرا جاگ اٹھی۔ یولیسس کے سامنے خود کو عریاں محسوس کر کے اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے چادر سے اپنے آپ کو گردن تک ڈھانپ لیا۔

"میری طرف مت دیکھو،" اس نے کہا۔ "میں خوفناک لگ رہی ہوں۔"

"تمھارا رنگ سر سے پاؤں تک مالٹوں جیسا ہے،" یولیسس نے کہا۔ اس نے پھل اس کی آنکھوں کے مقابل کر دیے کہ وہ خود موازنہ کر لے۔ "دیکھو۔"

ایرندرا نے انگلیوں پر سے ہاتھ ہٹائے تو دیکھا کہ مالٹوں کا رنگ واقعی اس کے اپنے رنگ جیسا تھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ تم اس وقت رکو" وہ بولی۔

"میں تو صرف یہ دکھانے آیا تھا" یولیسس نے کہا۔ "ادھر دیکھو۔"

اس نے ایک مالٹا اپنے ناخنوں سے کھولا۔ اسے دو حصوں میں چیرا اور اندر جو کچھ تھا، ایرندرا کو دکھایا؛ پھل کے عین قلب میں ایک اصلی ہیرا رکھا تھا۔

"یہ مالٹے ہیں جو ہم سرحد پار لے جاتے ہیں،" اس نے کہا۔

"لیکن یہ تو جیتے جاگتے مالٹے ہیں؟" ایرندرا نے کہا۔

"بے شک،" یولیسس مسکرایا۔ "انہیں میرے ابّا اگاتے ہیں۔"

ایرندرا کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے چہرے سے چادر ہٹائی اور ہیرے کو انگلیوں سے پکڑ کر حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ان جیسے تین ہیروں سے ہم دنیا کا چکر لگا سکتے ہیں،" یولیسس نے کہا۔ ایرندرا نے مایوسی کے تاثر کے ساتھ ہیرا اسے لوٹا دیا۔ یولیسس کہتا رہا۔

"اس کے علاوہ میرے پاس پک اپ ٹرک بھی ہے،" وہ بولا۔ "اور اس کے علاوہ ۔۔۔ دیکھو؟"

اپنی قمیص کے نیچے سے اس نے ایک پرانے وقتوں کا پستول نکالا۔

"میں ابھی دس سال تک نہیں جا سکتی،" ایرندرا نے کہا۔

"تم جاؤ گی،" یولیسس نے کہا۔ "آج رات، جب سفید وہیل سو جائے گی تو میں باہر الو کی آواز نکالوں گا۔"

اس نے الو کی آواز کی ایسی سچی نقل کی کہ ایرندرا کی نظریں پہلی بار مسکرا اٹھیں۔

"دادی کو کیا ہے؟" اس نے

"الو؟"

"وہی۔"

اس غلطی پر دونوں ہنس پڑے، لیکن ایرندرا نے بات پھر نکال لی۔

"بِن دادی کی اجازت کے بغیر کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اسے بہرحال پتا چل جائے گا،" ایرندرا نے کہا۔ "وہ خواب میں سب باتیں دیکھ سکتی ہے۔"

"جب وہ یہ خواب دیکھنا شروع کرے گی کہ تم جا رہی ہو، اس وقت تک ہم سرحد پار کر چکے ہوں گے۔ ہم اسمگلروں کی طرح نکل جائیں گے،" یولیسس نے کہا۔

[illegible] پستول پکڑے ہوئے ایرندرا کو اپنی بے خوفی سے جوش دلانے کے لیے گولیاں چلنے کی آوازیں نکالیں۔ گو ایرندرا نے ہامی بھری نہ انکار کیا، لیکن نظروں سے آہ بھرتے ہوئے اسے ایک بوسے کے ساتھ رخصت کر دیا۔

یولیسس نے متاثر ہو کر سرگوشی کی:

"ہم کل جہازوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔"

اس رات، سات بجے کے ذرا بعد ایرندرا اپنی دادی کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ اس کی بدبختی کی ہوا پھر چلنے لگی۔ خیمے میں انڈین خدمت گار اور باجے والوں کا نگراں ادائیگی کے منتظر تھے۔ دادی نے ایک صندوق پر جو اس کے قریب ہی رکھا تھا، نوٹ گنے اور ایک کھاتا دیکھنے کے بعد سب سے معمّر انڈین کو ادائیگی کر دی۔

"لو سنبھالو" دادی نے اس سے کہا۔ "ایک ہفتے کے بیس پیسو۔ کھانے کے آٹھ پیسو، پانی کے تین، نئی قمیصوں کے پچاس سینٹ، ان سب کو گھٹا کر باقی بچے ساڑھے آٹھ۔ گن لو۔"

معمّر انڈین نے رقم گنی اور وہ سب بندگی کرتے ہوئے چلے گئے۔

"شکریہ، سفید خاتون۔"

اب باجے والوں کے نگراں کی باری تھی۔ دادی نے اپنا کھاتا دیکھا اور فوٹوگرافر سے، جو کٹاپارچا کے ٹکڑوں سے اپنے کیمرے کا بطور مرمّت کر رہا تھا، مخاطب ہوئی۔

"کیا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔ "تم موسیقی کا چوتھائی خرچ ادا کرو گے یا نہیں؟"

فوٹوگرافر نے جواب دینے کے لیے سر اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی۔

"موسیقی تصویروں میں نظر نہیں آتی۔"

"مگر لوگوں کو اپنی تصویریں کھنچوانے پر آمادہ تو کرتی ہے،" دادی نے جواب دیا۔

"اس کے برخلاف،" فوٹوگرافر نے کہا۔ "موسیقی انہیں رفتگاں کی یاد دلاتی ہے اور پھر وہ تصویروں میں آنکھیں بند کیے نظر آتے ہیں۔"

باجے والوں کے نگراں نے مداخلت کی۔

"آنکھیں بند کرنے پر موسیقی مجبور نہیں کرتی،" اس نے کہا۔ "بلکہ اس کا سبب وہ چکاچوند ہے جو تم رات کو تصویریں کھینچتے وقت پیدا کرتے ہو۔"

"نہیں، اس کا سبب موسیقی ہے،" فوٹوگرافر نے اصرار کیا۔

دادی نے جھگڑا چکایا۔ "بخیل مت بنو،" اس نے فوٹوگرافر سے کہا۔ "دیکھو سینیٹر اونیسیمو سانچیز کے معاملات کتنے عمدہ طریقے سے چل رہے ہیں اور یہ سب ان سازندوں کی بدولت ہے جو اس کے ساتھ ہیں۔" پھر ذرا سخت لہجے میں اس نے بات سمیٹی:

"لہٰذا تمہاری طرف جو نکلتا ہے وہ ادا کرو یا پھر اپنی قسمت کا پیچھا کرو۔ اس غریب بچّی کے لیے اخراجات کا سارا بوجھ تنہا اٹھانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں اپنی قسمت کا پیچھا کروں گا،" فوٹوگرافر نے کہا۔ "بہرحال، میں ہوں تو ایک فنکار۔"

دادی نے اپنے کندھے اچکائے اور موسیقار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے نوٹوں کی ایک گڈی، جو اس کے کھاتے میں درج رقم کے مطابق تھی، موسیقار کے حوالے کی۔

"دو سو چون دُھنیں،" دادی نے اسے بتایا، "پچاس سینٹ فی عدد کے حساب سے، اور اتواروں اور چھٹیوں کی بتّیس دھنیں ساٹھ سینٹ کے حساب سے، یہ کل رقم ہوئی ایک سو چھپن بیس۔"

موسیقار یہ رقم لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

"ایک سو بیاسی چالیس بنتے ہیں،" وہ بولا۔ "والز کا نرخ زیادہ ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ والز کی دُھن زیادہ اداس ہوتی ہے۔" موسیقار نے کہا۔

دادی نے اسے رقم لینے پر مجبور کر دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میری طرف نکلنے والے ہر والز کے بدلے تم اس ہفتے دو طربیہ دُھنیں بجا دینا۔ اس طرح ہمارا حساب برابر ہو جائے گا۔"

دادی کی منطق موسیقار کی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن اس نے رقم لے لی اور اس گتھی کو سلجھاتا رہا۔ اسی لمحے خوفناک ہوا نے خیمے کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی اور اس خاموشی میں، جو وہ پس عقب میں چھوڑ گئی تھی، الو کی اداس اور واضح آواز سنائی دی۔

ایرندرا نہیں جانتی تھی کہ اپنی پریشانی کس طرح چھپائے۔ اس نے رقم والا صندوق بند کر کے بستر کے نیچے چھپا دیا لیکن جب اس نے چابی دادی کو دی تو وہ اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ کو بھانپ گئی۔ "خوف زدہ مت ہو،" اس نے ایرندرا سے کہا۔ "طوفانی راتوں میں ہمیشہ الو بولتے ہیں۔" لیکن جب اس نے فوٹوگرافر کو کمر پر کیمرا اٹھائے باہر جاتے دیکھا، تو وہ اپنی بات کی اسی قائل معلوم نہ ہوتی تھی۔

"چاہو تو کل تک ٹھہر جاؤ،" اس نے فوٹوگرافر سے کہا۔ "آج رات تو موت کی عمل داری ہے۔"

الو کی آواز فوٹوگرافر نے بھی سنی تھی لیکن اس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔

"رک جاؤ بیٹا،" دادی نے اصرار کیا۔ "خواہ اس کا سبب تمھارے لیے میری پسندیدگی ہی کیوں نہ ہو۔"

"لیکن میں موسیقی کا خرچ نہیں دوں گا۔" فوٹوگرافر نے کہا۔

"اوہ نہیں،" دادی نے کہا۔ "اس کا یہ مطلب نہیں۔"

"دیکھا؟" فوٹوگرافر نے کہا۔ "تمھیں کسی سے بھی لگاؤ نہیں۔"

دادی غصے سے اک بگولا ہو گئی۔

"جاؤ، دفع ہو جاؤ کمینے،" اس نے کہا۔

دادی نے اس قدر توہین محسوس کی کہ جب ایرندرا نے اسے سلانے کو لٹایا تو وہ اس وقت بھی فوٹوگرافر پر غصہ نکال رہی تھی۔ "فاحشہ کی اولاد،" وہ بڑبڑائی۔ "اس حرامی کو کسی دوسرے کے دل کی کیا خبر؟" ایرندرا نے اس کی باتوں پر توجہ نہیں دی کہ ہوا کے وقفوں کے درمیان الو مستحکم اصرار کے ساتھ اسے پکار رہا تھا اور وہ کومگو کے عذاب میں تھی۔ آخرکار دادی ان ساری رسومات کے ساتھ جو پرانی حویلی میں رائج تھیں، سونے کو لیٹ گئی، اس نے ابھی پوتی کے پنکھا جھلانے کے دوران غصے پر قابو پا لیا اور ایک بار پھر اپنے رائیگاں سانس لینے لگی۔

"صبح تمھیں جلدی اٹھنا ہے،" وہ بولی، "تاکہ لوگوں کے پہنچنے سے پہلے میرے غسل کے لیے خیساندہ ابال سکو۔"

"اچھا دادی۔"

"تمھارے پاس جو وقت ہے اس میں خدمت گاروں کے میلے کپڑے دھو ڈالو۔ اس طرح تم

اگلے ہفتے ان کی تنخواہ سے مزید کٹوتی کر سکو گی۔"

"اچھا دادی،" ایرندرا نے کہا۔

"آہستہ آہستہ سونا، مبادا تم تھک جاؤ کیونکہ کل جمعرات ہے، ہفتے کا طویل ترین دن۔"

"اچھا دادی۔"

"اور شترمرغ کو دانہ ڈال دو۔"

"اچھا دادی،" ایرندرا نے کہا۔

اس نے پنکھا مسہری کے سرہانے چھوڑا اور مُردوں والے صندوق کے آگے قربان گاہ کی دو شمعیں جلا دیں۔ دادی، جو اب سو چکی تھی، اپنی ہدایات سے پیچھے رہ گئی تھی۔

"امادیسوں کے لیے شمعیں جلانا مت بھول جانا۔"

"اچھا دادی۔"

ایرندرا جان گئی کہ دادی نہیں جاگے گی کیونکہ اس نے ہذیان بکنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ہوا کو خیمے کے گرد چنگھاڑتے سنا، لیکن اس بار بھی نہیں سمجھ سکی کہ یہ اس کی بدبختی کی ہوا ہے۔ وہ منتظر رہی یہاں تک کہ الو کی آواز پھر سنائی دی اور خودمختار آزادی کے لیے اس کی تڑپ دادی کے افسوں پر غالب آ گئی۔

اس نے خیمے سے باہر ابھی چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہو گا کہ اس کی مڈبھیڑ فوٹوگرافر سے ہو گئی جو بائیسکل کے بارگیر پر اپنا سامان لاد رہا تھا۔ فوٹوگرافر کی رازدارانہ مسکراہٹ نے اسے اطمینان بخشا۔

"میں کچھ نہیں جانتا،" اس نے کہا، "میں نے کچھ نہیں دیکھا، اور میں موسیقی کا خرچ نہیں دوں گا۔"

فوٹوگرافر نے سب کے لیے ٹھیک مصافحے کے ساتھ رخصت لی۔ پھر ایرندرا یک بارگی فیصلہ کر کے صحرا کی طرف دور بھاگی اور ہوا کے جھکڑوں نے جہاں سے الو بول رہا تھا، اسے نگل لیا۔

اس بار دادی بلاتاخیر شہری حکام کے پاس گئی۔ جب صبح چھ بجے دادی نے سینیٹر کا خط اس کے سامنے رکھا تو مقامی دستے کا کمانڈر بستر سے اچھل پڑا۔ یولیسس کا باپ دروازے پر انتظار کر رہا تھا

"لیکن مجھے کیا معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہے؟" کمانڈر نے چلا کر کہا۔ "میں پڑھنا نہیں جانتا۔"

"یہ سینیٹر اونیسیمو سانچیز کا سفارشی خط ہے،" دادی نے بتایا۔

مزید کوئی سوال کیے بغیر کمانڈر نے اپنے بستر کے قریب رکھی ہوئی رائفل سنبھال لی، اور چلا چلا کر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ سب ایک فوجی ٹرک میں، اس ہوا کی مخالف سمت میں اڑے جا رہے تھے جس نے مفروروں کے تمام سراغ مٹا دیے تھے۔ کمانڈر اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ پیچھے دادی اور ولندیزی عقبی حصے میں تھے۔ ٹرک کے ہر پائیدان پر ایک ایک مسلح سپاہی تھا

شہر کے نزدیک انھوں نے ترپالوں سے ڈھکے ٹرکوں کے ایک کارواں کو روکا۔ کئی آدمیوں

سے جو عقبی حصے میں چھپے ہوئے تھے، ترپال اٹھائی اور چھوٹی گاڑی کو مشین گنوں اور فوجی رائفلوں کی زد پر لے لیا۔ کمانڈر نے پہلے ٹرک کے ڈرائیور سے پوچھا کہ انھوں نے پرندوں سے لدے فارم ٹرک کو کتنا پیچھے دیکھا تھا۔

ڈرائیور نے جواب دینے سے پہلے ٹرک چلا دیا۔

"ہم مخبر نہیں ہیں۔" اس نے بدمزگی سے کہا، "ہم اسمگلر ہیں۔"

کمانڈر نے مشین گنوں کی سیاہ نالیں اپنی آنکھوں کے قریب لہراتی دیکھیں تو اپنے بازو اٹھا کر مسکرانے لگا۔

"کم سے کم،" اس نے چلا کر کہا، "تم اتنی شائستگی تو برت سکتے ہو کہ دن دہاڑے نہ سکتو۔"

آخری ٹرک کے پچھلے بمپر پر لکھا تھا، "اریندرا، میں تمھارے ہی لیے سوچتا ہوں۔"

جوں جوں وہ شمال کی طرف بڑھتے گئے ہوا خشک ہوتی گئی اور دھوپ ہوا سے شدید تر۔ گرمی اور دھول کے باعث بند ٹرک کے اندر سانس لینا دشوار تھا۔

فوٹوگرافر کو سب سے پہلے دیکھنے والی دادی تھی۔ وہ اسی جانب رواں تھا جدھر وہ جا رہے تھے۔ سر پر بندھے ہوئے رومال کے سوا اس کے پاس دھوپ سے کوئی بچاؤ نہ تھا۔

"وہ رہا" اس نے اشارہ کیا۔ "وہ کمینہ ان کا شریک جرم تھا۔"

کمانڈر نے پائیدان پر کھڑے ایک سپاہی کو فوٹوگرافر کی گرفتاری کا حکم دیا۔

"اسے پکڑ لو اور یہیں ہمارا انتظار کرو۔ ہم آ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

سپاہی پائیدان سے چھلانگ لگا کر اترا اور فوٹوگرافر سے دو دفعہ چلا کر ٹھہر جانے کو کہا۔ فوٹوگرافر مخالف ہوا کے باعث اس کی آواز سن نہیں سکا۔ ٹرک اس کے قریب سے گزرا تو دادی نے اسے پراسرار سا اشارہ کیا، لیکن وہ اسے سلام سمجھا اور جواب میں مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا۔ اس نے گولی کی آواز نہیں سنی۔ وہ ہوا میں اچھلا اور بےجان ہوکر اپنی بائیسکل پر ڈھیر ہو گیا۔ رائفل کی گولی نے اس کا بھیجا اڑا دیا تھا، لیکن وہ کبھی نہیں جان سکا کہ گولی کدھر سے آئی تھی۔

دوپہر سے پہلے پہلے انھیں ہوا میں اڑتے ہوئے پر نظر آنے لگے جو نوخیز پرندوں کے تھے۔ ولندیزی نے انھیں پہچان لیا کیونکہ وہ اسی کے پرندوں کے پر تھے جنھیں ہوا نے نوچ ڈالا تھا۔ ڈرائیور نے سمت بدلی اور ایکسیلریٹر پر پورا دباؤ ڈال دیا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ افق پر پک اپ ٹرک کا ہیولا دیکھ رہے تھے۔

یولیسس نے عقبی شیشے میں فوجی گاڑی کو نمودار ہوتے دیکھا تو اس نے درمیانی فاصلہ بڑھانے کی کوشش کی لیکن اس کا ٹرک کوئی بہتر کارکردگی نہ دکھا سکا۔ انھوں نے سوئے بغیر سفر جاری رکھا تھا اور تکان اور پیاس سے بےحال تھے۔ اریندرا جو یولیسس کے شانے پر سر رکھے اونگھ رہی تھی، خوف زدہ ہو کر جاگ اٹھی۔ اس نے ٹرک کو دیکھا جو انھیں آ لینے کو تھا اور ایک معصومانہ عزم کے ساتھ دستانوں کے خانے سے پستول نکال لیا۔

"یہ بیکار ہے،" یولیسس نے کہا۔ "یہ سر فرانسس ڈریک کا پستول ہوا کرتا تھا۔"

اریندرا نے کئی بار پستول کو الٹا پلٹا اور پھر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ فوجی گاڑی لنجی

پرندوں سے لدے خستہ حال ٹرک کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے جا کر تیزی سے گھومی اور ٹرک کا راستا کاٹ دیا۔

اسی زمانے کے آس پاس، جو اِن کا بہترین دور تھا، مَیں نے ان کے بارے میں سُنا، لیکن میں ان کی زندگیوں کی تفصیل میں نہیں گیا، حتی کہ کئی سال بعد جب رفیل ایسکالونا نے ایک گیت میں اس ڈرامے کا ہولناک انجام آشکار کیا تو میں نے سوچا کہ یہ کہانی بیان کرنا اچھا رہے گا۔ میں ریوہاچا کے صوبے میں گھوم پھر کے انسائیکلوپیڈیا اور طبی کتابیں فروخت کر رہا تھا۔ الوارو سیپیدا سامودیو نے، جو بیئر ٹھنڈا کرنے والی مشینیں بیچنے کے لیے خود بھی اسی خطے میں گھوم رہا تھا، راستے میں باتیں کرنے کی غرض سے مجھے اپنے ٹرک میں بٹھا لیا تھا۔ ہم صحرائی قصبوں میں گھومتے پھرے اور ہم نے اتنی فضول گوئی کی اور اتنی بیئر پی کہ صحرا عبور کرنے اور سرحد پر پہنچنے کا ہمیں علم ہی نہیں ہوا۔ سامنے بھٹکی ہوئی محبت کا ڈیرہ تھا۔ خیمے کے اوپر کینوس کی پٹیاں لٹک رہی تھیں: "اریندرا بہترین ہے۔ چھوڑو، لوٹ آؤ — اریندرا تمھاری منتظر ہے۔ اریندرا کے بغیر زندگی زندگی نہیں ہے۔" مختلف نسلوں اور زبانوں کے لوگوں پر مشتمل بل کھاتی ہوئی لامتناہی قطار انسانی ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے ایسے سانپ سے مشابہ تھی جو خالی جگہوں اور چوراہوں، پُررونق بازاروں اور پُرشور منڈیوں میں سے اونگھتا ہوا اس قصبے کی سڑکوں پر رینگ رہا تھا جو گزرتے ہوئے تاجروں کے شور سے معمور تھا۔ ہر سڑک عوامی جواخانہ تھی، ہر گھر شراب خانہ اور ہر دروازہ بھگوڑوں کی پناہ گاہ۔ سمجھ میں نہ آ سکنے والے بہت سے گیت اور چلا چلا کر اشیا کی قیمتیں پکارنے کا شور فریب نظر پیدا کرتی ہوئی گرمی میں ہراس کی ایک واحد اونچی آواز میں ڈھل رہے تھے۔

بےوطن لوگوں کے اژدہام اور خوش‌سازوں میں بلاکامان دی گُڈ بھی تھا، جو ایک میز پر بیٹھا اپنے ایجادکردہ تریاق کو خود اپنے اوپر آزمانے کے لیے اصلی سانپ مانگ رہا تھا۔ پھر وہ عورت بھی جو اپنے والدین کی نافرمانی کرنے پر مکڑی میں تبدیل ہو گئی تھی، جسے پچاس سینٹ کے عوض چھوا جا سکتا تھا تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ اس میں کوئی چال نہیں ہے، اور جو ان لوگوں کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی جو اس کی بدنصیبی کا سبب جاننے کے مشتاق تھے۔ عدم آباد کا ایک ایلچی تھا جو خوفناک آسمانی چمگادڑ کی جلد آمد کا اعلان کر رہا تھا جس کی جلتی ہوئی دوزخی سانسوں سے نظام فطرت الٹ جائے گا اور سمندر کے اسرار سطح پر آ جائیں گے۔

واحد پرسکون جگہ چکلے کا علاقہ تھا جہاں شہری شوروشغب کی صرف دم توڑتی آوازیں ہی پہنچ پاتی تھیں۔ عورتیں، جن کا تعلق بحری گلاب کے چاروں ربع دائروں سے تھا، ویران کمروں میں کساد سے جمائیاں لے رہی تھیں۔ بعض نے دوپہر کی نیند بیٹھے بیٹھے پوری کی تھی، کہ لوگوں نے، جن کو ان کی ضرورت تھی، انھیں نہیں جگایا تھا اور وہ چھتوں پر گھومتے پنکھوں کے نیچے ابھی تک سماوی چمگادڑ کی منتظر تھیں۔ اچانک ان میں سے ایک اٹھ کر سڑک پر کھلنے والے دریچے میں گئی جو گملوں اور پیری کے پھولوں سے سجا تھا۔ نیچے اریندرا کے چاہنے والوں کی قطار گزر رہی تھی۔

"یہاں آؤ۔" عورت نے ان سے چلا کر کہا۔ "اس کے پاس کیا ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے؟"
"سینیٹر کا خط۔" کسی نے جواب دیا۔
اونچی آوازوں اور قہقہوں سے متوجہ ہو کر دوسری عورتیں دریچے میں آ گئیں۔
"کئی دنوں سے یہ قطار اسی طرح ہے۔" ان میں سے ایک بولی۔ "ذرا سوچو تو، پچاس پیسو فی کس۔"
دریچے میں آنے والی پہلی عورت نے ایک فیصلہ کیا۔
"اچھا۔ میں معلوم کرتی ہوں کہ اس سات ماہی بچی میں کون سے لعل جڑے ہیں۔"
"میں بھی چلتی ہوں،" ایک اور بولی۔ "یہاں بیٹھ کر مکھیاں مارنے سے تو یہی بہتر ہے۔"
راستے میں دوسری عورتیں بھی شامل ہو گئیں اور جب وہ اریندرا کے خیمے میں پہنچیں تو اچھا خاصا فسادی جلوس بن چکا تھا۔ وہ کسی اطلاع کے بغیر اندر داخل ہو گئیں اور اس آدمی کو تکیے مار مار کر بھگا دیا جو اپنی رقم کے عوض اپنے آپ کو بساط بھر بہتر طور پر صرف کر رہا تھا۔ انھوں نے اریندرا کا پلنگ اٹھایا اور ڈولی کی طرح سڑک پر لے گئیں۔
"یہ تو دست درازی ہے؟" دادی چلائی۔ "غدار ٹولہ، بد ماریو!" اور پھر قطار میں کھڑے مردوں کی طرف مڑتے ہوئے: "اور تم، زنخو! تمھاری مردانگی کہاں ہے؟ ایک غریب بے کس بچی کے خلاف حملہ ہوتے دیکھ رہے ہو، ملعون اغلام بازو؟"
یہ سب کچھ جو اس کی زد میں تھا اپنی لاٹھی سے ضربیں لگاتی ہوئی وہ اپنی آواز کی آخری حد تک چلاتی رہی، لیکن ہجوم کی اونچی آوازوں اور تمسخرانہ سیٹیوں میں اس کا غصہ ناقابل سماعت تھا۔
اریندرا اس تمسخر سے نہ بچ سکی، کیونکہ جب سے اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، دادی اسے کتے کی زنجیر سے باندھنے لگی تھی جو اس کے پلنگ سے جڑی ہوئی تھی۔ لیکن عورتوں نے اسے گزند نہیں پہنچائی۔ انھوں نے بارونق سڑکوں پر یا یہ زنجیر تائب کے تمثیلی سفر کی طرح چھتردار قربان گاہ پر اس کی نمائش کی، اور آخرکار اسے ایک جنازے کی طرح مرکزی چوک کے وسط میں رکھ دیا۔ اریندرا شرم سے سمٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا، لیکن وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ چوک میں جلتے ہوئے سورج کے نیچے اسی عالم میں شرم اور غصے سے اپنی بدنصیبی کی زنجیر چباتی رہی، تاوقتیکہ کسی نے ترس کھا کر اسے ایک قمیص سے ڈھانپ دیا۔
یہی وہ واحد موقع تھا جب میں نے انھیں دیکھا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ عوامی طاقتوں کے زیر تحفظ اسی سرحدی شہر میں اس وقت تک مقیم رہے جب تک دادی کے صندوق دولت سے لبریز نہ ہو گئے۔ پھر وہ صحرا کو چھوڑ کر سمندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ غریبوں کے اس خطے میں اتنی دولت ایک جگہ اکٹھی کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ یہ بیل گاڑیوں کا جلوس تھا جن پر حویلی کی تباہی میں ضائع ہونے والے سامان کی سستی یادگاریں لدی ہوئی تھیں۔ اور صرف شاہی مجسمے اور نادر گھڑیاں ہی نہیں، بلکہ ایک پرانا پیانو اور کئی دھنوں کے ریکارڈوں کے ساتھ ایک چابی والا گراموفون بھی۔ مقامیوں کی ایک جماعت اس سازوسامان کو سنبھالے ہوئے تھی اور موسیقاروں کا ایک جتھا دیہات میں ان کی فاتحانہ آمد کا اعلان کر رہا

تھا۔
دادی اپنی نہیلی میں سے دانت چباتی ہوئی کاغذی حلقوں سے سجی ایک ڈولی میں سفر کر رہی تھی، جس پر کلیسائی چھتر نے سایہ کر رکھا تھا۔ اس کی حیران کن حجم میں اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ اس نے بلاؤز کے نیچے ملاحوں والا کپڑے کی صدری پہن رکھی تھی جس کی جیبوں میں وہ سونے کی سلاخیں اس طرح رکھتی تھی جیسے کوئی پیٹی میں کارتوس رکھتا ہے۔ بھڑک دار کپڑوں میں ملبوس اور اوپراں زیورات سے آراستہ اریندرا اس کے پہلو میں بیٹھی تھی، لیکن کتے کی زنجیر اب بھی اس کے ٹخنے پر تھی۔
"تمھارے پاس شکایت کا کوئی جواز نہیں ہے۔" جب انھوں نے سرحدی قصبہ چھوڑا تو دادی نے اس سے کہا تھا۔ "تمھارے پاس ملکاؤں جیسے ملبوسات ہیں، شاہانہ مسہری ہے، موسیقاروں کا اپنا دستہ ہے اور خدمت پر مامور چودہ انڈین ہیں۔ تمھارے خیال میں یہ سب شاندار نہیں ہے؟"
"ہاں دادی۔"
"جب میں تمھارے پاس نہیں ہوں گی" دادی نے سلسلہ جاری رکھا "تم مردوں کے رحم و کرم پر نہیں رہو گی کیونکہ ایک اہم شہر میں تمھارا اپنا ذاتی گھر ہو گا۔ تم آزاد اور شادماں ہو گی۔"
یہ مستقبل کا نیا اور نادیدہ تصور تھا۔ دوسری طرف، اب اس نے اصل قرضے کی بات ہی کرنی چھوڑ دی تھی کہ اس کی تفصیلات گڈمڈ ہو گئی تھیں اور دھندے کے اخراجات میں پیچیدگی کے باعث اقساط بڑھ گئی تھیں۔ اس کے باوجود اریندرا اُف تک نہ کرتی تھی، مبادا کوئی اس کے خیالات جان لے۔ وہ شورے کے گڑھوں میں، ساحلی قصبوں کی بے حسی میں، ابرق کی کانوں کے دیہاتوں میں بستر کی اذیت سہتی رہی، اور دادی اسے مستقبل کے سپنے اس طرح دکھاتی رہی گویا تاش کے پتوں پر قسمت کا حال دیکھ رہی ہو۔ ایک سہ پہر، جب وہ ایک تکلیف دہ گھاٹی سے باہر آ رہے تھے، انھیں ہوا میں قدیم لارل کی مہک محسوس ہوئی اور جمیکا کی بول چال کے منتشر ٹکڑے سنائی دیے تو انھوں نے جینے کی امنگ اور اپنے دلوں میں گرہ سی محسوس کی۔ وہ سمندر تک پہنچ گئے تھے۔
"وہ رہا" دادی نے نصف زندگی کی جلاوطنی کے بعد بحیرۂ کریبیئن کی بلوری روشنی میں سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمھیں اچھا نہیں لگ رہا؟"
"ہاں دادی۔"
انھوں نے وہاں خیمہ لگا دیا۔ دادی نے خواب دیکھے بغیر باتیں کرتے میں رات گزاری اور بعض اوقات ماضی کی یادوں کو مستقبل بینی میں گڈمڈ کر دیا۔ وہ معمول سے زیادہ سوئی اور سمندر کی آواز سے تازہ دم بیدار ہوئی۔ تاہم جب اریندرا اسے نہلا رہی تھی تو اس نے پھر پیش گوئیاں شروع کر دیں اور یہ ایسی پرجوش غیب بینی تھی کہ شب بیداری کا ہذیان معلوم ہوتی تھی۔
"تم طبقۂ امرا کی خاتون ہو گی" اس نے اریندرا کو بتایا۔ "ایک خاتون خوبی، زبردست جس کا احترام کریں گے اور اعلیٰ ترین حکام کرم فرمائی اور عزت افزائی۔ جہازوں کے کپتان

دنیا کی ہر بندرگاہ سے تمھیں پوسٹ کارڈ بھیجا کریں گی۔"

ایرندیرا اس کی باتیں سمجھ نہیں رہی تھی۔ خوشبودار بوٹیوں میں اُبلا ہوا گرم پانی جو ایک ٹنکی کے ذریعے باہر سے آ رہا تھا، ٹب میں گر رہا تھا۔ ایرندیرا نے، جس کا ذہن جامد تھا اور جو سانس بھی نہیں لے رہی تھی، ایک تونبے میں پانی بھرا اور ایک ہاتھ سے دادی پر انڈیلا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اسے صابن لگانے لگی۔

"تمھاری خوبی کی شہرت انٹیلس کے جزیروں سے ہالینڈ کی مملکت تک رواں دواں پرواز کرے گی،" دادی کہہ رہی تھی۔ "اور اس کی اہمیت صدارتی محل سے زیادہ ہو گی، کہ وہاں معاملاتِ حکومت پر بحث ہو گی اور قوم کی قسمت کا فیصلہ ہو گا۔"

اچانک ٹنکی سے پانی آنا بند ہو گیا۔ ایرندیرا دیکھنے کے لیے خیمے سے باہر نکلی تو اس نے پانی پہنچانے والے انڈین کو باورچی خانے کے پاس لکڑیاں چیرتے پایا۔

"پانی ختم ہو گیا،" انڈین نے کہا۔ "اور پانی ٹھنڈا کرنا ہو گا۔"

ایرندیرا چولہے کے پاس گئی جہاں ایک اور بڑے برتن میں خوشبودار بوٹیوں والا پانی ابل رہا تھا۔ اس نے ایک کپڑے میں اپنے ہاتھ لپیٹے اور دیکھا کہ وہ انڈین کی مدد کے بغیر برتن اٹھا سکتی ہے۔

"تم جا سکتے ہو،" اس نے انڈین سے کہا۔ "پانی میں انڈیل لوں گی۔"

انڈین جب تک باورچی خانے سے چلا نہ گیا اس نے توقف کیا۔ پھر اس نے اُبلتے برتن کو چولہے سے اتارا اور بڑی مشکل سے ٹنکی کی بلندی تک اونچا کیا۔ وہ اس مہلک پانی کو نل میں انڈیلنے ہی والی تھی کہ خیمے کے اندر سے دادی چلائی

"ایرندیرا!"

ایسا تھا جیسے اس نے دیکھ لیا ہو۔ اس کی آواز سے خوف زدہ ہوتی آخری لمحے پر پچھتانے لگی۔

"جی دادی،" اس نے کہا۔ "پانی ٹھنڈا کر رہی ہوں۔"

اس رات وہ دیر گئے تک سوچتی رہی جبکہ اس کی دادی سونے کی صدری پہنے نیند میں گا رہی تھی۔ ایرندیرا اسے اپنے بستر سے ایسی تیز نظروں سے دیکھ رہی تھی جو اندھیرے میں بلی کی نظروں سے مشابہ تھیں۔ پھر وہ اس شخص کی طرح سونے کو لیٹ گئی جو ڈوب چکا ہو۔ اس کے ہاتھ سینے پر تھے اور آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے اپنی اندرونی آواز کی پوری طاقت سے پکارا

"یولیسس!"

مالٹے کے باغ والے مکان میں یولیسس اچانک جاگ اٹھا۔ اس نے ایرندیرا کی آواز اتنی واضح طور پر سنی تھی کہ وہ اسے کمرے کی پرچھائیوں میں ڈھونڈنے لگا۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اپنے کپڑوں اور جوتوں کی گٹھڑی بنائی اور شب خوابی کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ ڈیوڑھی عبور کر چکا تھا کہ باپ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

چاند کی روشنی میں وہ یولیسس کو نیلا نظر آ رہا تھا۔

"دنیا میں،" اس نے جواب دیا۔

"اس بار میں تمھیں نہیں روکوں گا،" ولندیزی نے کہا۔ "لیکن تمھیں ایک بات سے متنبہ کرتا ہوں، تم جہاں بھی جاؤ گے باپ کی بددعا تمھارا پیچھا کرے گی۔"

"یوں ہی سہی،" یولیسس نے کہا۔

اپنے بیٹے کے عزم پر متحیّر اور قدرے متاثر ولندیزی، جس کے چہرے کا تاثر جلد ہی مسکراہٹ میں ڈھل گیا تھا، پیڑوں کی جھنڈ میں اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اس کی بیوی انڈین عورتوں کے خوبصورت انداز میں اس کے عقب میں کھڑی تھی۔

یولیسس نے پھاٹک بند کیا تو ولندیزی بولا۔

"زندگی سے ہار کر،" اس نے کہا، "وہ تمھارے دروازے سے پہلے لوٹ آئے گا۔"

"تم کتنے احمق ہو،" اس کی بیوی نے آہ بھری۔ "وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

اس بار یولیسس کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ ایرندیرا کہاں ہے۔ اس نے خوراک اور آرام کے لیے چھپ کر اور بعض اوقات محض خطرے سے لطف اندوز ہونے کی خاطر چوریاں کرتے ہوئے صحرا سے گزرنے والے ٹرکوں میں سفر کیا حتیٰ کہ اسے خیمہ مل گیا جو اب ایک ایسے ساحلی شہر میں تھا جس کی شیشے کی عمارتیں شہر پر غالب کا تاثر دے رہی تھیں، اور جہاں اروبا کے جزیرے کے لیے لنگر اٹھانے والے جہازوں کے شبینہ الوداعی کوچ کرتے تھے۔ ایرندیرا مسہری سے زنجیر بہ پا سو رہی تھی۔ وہ ساحل پر ڈوبے ہوئے شخص کی اسی حالت میں تھی جس میں اس نے یولیسس کو پکارا تھا۔ یولیسس اسے جگائے بغیر تادیر کھڑا دیکھتا رہا، لیکن اس کی نظروں میں ایسی شدت تھی کہ ایرندیرا جاگ اٹھی۔ انھوں نے اندھیرے میں ایک دوسرے کو چوما، آہستگی سے مہکا اور ایک گہری ملائمت اور پنہاں مسرت کے ساتھ، جو پہلے سے کہیں زیادہ محبت سے مشابہ تھی، تھکے ہوئے انداز میں بے لباس ہو گئے

خیمے کے پرلے سرے پر سوئی ہوئی دادی نے ایک حیرانی کی کروٹ لی اور بڑبڑانے لگی۔

"یہ اس زمانے کی بات ہے جب یونانی جہاز آیا،" اس نے کہا۔ "اس کا عملہ دیوانوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے عورتوں کو شادکام کیا لیکن انھیں ادائیگی پیسوں سے نہیں بلکہ اسفنج کے ٹکڑوں سے کی، زندہ اسفنج کے ٹکڑوں سے جو بعدازاں مریضوں کی طرح کراہتے ہوئے گھروں میں چلتے پھرتے تھے، جنھیں دیکھ کر ہنستے ہنستے بچوں کے آنسو نکل آتے تھے۔"

اس نے جھرجھری لی اور بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میرے خدا، یہی زمانہ تھا جب وہ آیا،" وہ چلائی، "لوئی، ڈرکلد اور امادیس سے کہیں زیادہ مرد۔"

یولیسس، جس نے اس وقت تک بڑبڑاہٹ پر کوئی توجہ نہیں کی تھی، دادی کو بستر میں بیٹھے دیکھ کر چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایرندیرا نے اسے تسلی دی۔

"ڈرو نہیں،" اس نے یولیسس سے کہا۔ "ہر بار جب وہ اس حصے پر پہنچتی ہے تو بستر میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، لیکن جاگتی کبھی نہیں۔"

یولیسس اس کے کندھے پر سے جھک کے دیکھنے لگا۔

"میں اس شب ملاحوں کے ساتھ گا رہی تھی کہ مجھے ایک زلزلہ محسوس ہوا،" دادی کہتی رہی۔ "اوروں نے بھی یہی سمجھا ہو گا کیونکہ وہ چیختی چلاتی، ہنسی سے بےقابو بھاگ نے اور جھمر کے نیچے وہ سہا کھڑا رہ گیا۔ یہ واقعہ مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل ہی گزرا ہو۔ میں وہی گیت گا رہی تھی جو ان دنوں ہر ایک کی زبان پر تھا۔ صحن میں طوطے بھی یہی گیت گاتے تھے۔"

ساٹر سے خالی ٹھمریاں رو میں۔ جیسے کوئی نیند ہی میں گا سکتا ہے، وہ اپنی تلخی کے یہ مصرعے گانے لگی

خدا، اے خدا، میری معصومیت کر دے واپس مجھے
کہ میں پھر سے اس کی محبت کو محسوس کرنے لگوں

تب یولیسس کو دادی کی موسیقی میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔

"وہ میرے سامنے تھا،" دادی کہہ رہی تھی۔ "اپنے کندھے پر طوطا بٹھائے اور ہاتھ میں چوری مال وہی آدم خور مار بندوق لیے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے گوتارل گیانا میں داخل ہو رہا ہو۔ جب اس نے میرے مقابل کھڑے ہو کر بات کی تو میں نے اس کا نفس مرگ اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ میں دنیا کے گرد ہر روز چکر لگا چکا ہوں۔ میں نے ہر قوم کی عورتیں دیکھی ہیں۔ اور میں اس تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ تم روئے زمین پر سب سے پُرغرور اور سب سے خوش خلق ... حسین عورت ہو۔"

وہ پھر سے بند گئی۔ تکیے میں منہ دے کر سسکیاں بھرنے لگی۔ یولیسس اور اریندرا پر تک خاموش رہے۔ ... کی پرچھائیاں سوتی ہوئی بوڑھی عورت کے مہیب تنفس سے ہل رہی تھیں۔ ... اریندرا نے ... پوچھا

"تم سے قتل کر سکتے ہو؟"

حیرت زدہ یولیسس سے جواب نہ بن پڑا۔

"کون جانے؟" اس نے کہا۔ "تم کر سکتی ہو؟"

"نہیں،" اریندرا نے کہا۔ "وہ میری دادی ہے۔"

یولیسس نے ایک بار اور خوابیدہ جسم پر نظر ڈالی گویا اس کی کیفیت حیات کو ناپ رہا ہو اور فیصلہ کر لیا۔

"تمہاری خاطر میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

اس نے ایک پونڈ چوہےمار زہر خرید کر پھینٹی ہوئی کریم اور رس بھری کے جام میں ملایا، اور یہ زہریلا مادہ ایک پیسٹری میں بھر دیا، جسے اس نے پہلے سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ پھر سطح پر تھوڑی سی گاڑھی کریم لگا کر اسے چمچے سے اس طرح ہموار کر دیا کہ اس کی سنسنی خیز چال کا کوئی سراغ نہ رہا، اور یوں اس فریب کو بہتر سہی گلابی شمعیں لگا کر مکمل کر دیا۔

تخت پر نیم دراز دادی نے جب اسے سالگرہ کا کیک لیے خیمے میں آتے دیکھا تو اپنی خوفناک لاٹھی گھماتے ہوئے تن کر بیٹھ گئی۔

"تم! گستاخ شیطان!" وہ چلائی۔ "تمہیں یہاں قدم رکھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

یولیسس اپنے ملکوتی چہرے کے پیچھے چھپ گیا۔

"میں معافی طلب کرنے آیا ہوں،" اس نے کہا۔ "آج آپ کی سالگرہ ہے نا؟"

دادی نے اس کے کارگر جھوٹ سے پسیج کر میز اس طرح لگوائی گویا شادی کی دعوت ہو۔ اریندرا جب تک کھانا چُنتی، دادی نے یولیسس کو اپنے دائیں طرف بٹھایا اور ایک زوردار پھونک سے شمعیں بجھانے کے بعد کیک کو دو برابر حصوں میں کاٹ دیا۔ اس نے یولیسس کو کیک پیش کیا۔

"جو شخص اپنے آپ کو بخشوانا جانتا ہے، سمجھو کہ اس نے آدھی جنت حاصل کر لی،" وہ بولی۔ "میں کیک کا پہلا حصہ تمہیں دے رہی ہوں، جو اصل میں تمہارا حصہ خوشی ہے۔"

"مجھے میٹھی چیزیں پسند نہیں،" یولیسس نے کہا۔ "آپ لیجیے۔"

دادی نے ایک ٹکڑا اریندرا کو دیا۔ وہ اسے باورچی خانے میں لے گئی اور کوڑے دان میں پھینک دیا۔

باقی کیک اکیلی دادی نے کھایا۔ لطف سے کراہتی اور بڑی مسرت کے سرور سے یولیسس کو دیکھتی ہوئی وہ پورے پورے ٹکڑے منہ میں رکھتی اور چبائے بغیر نگل جاتی۔ جب اس کی پلیٹ خالی ہو گئی تو اس نے وہ بھی کھا لیا جس سے یولیسس نے انکار کر دیا تھا۔ آخری ٹکڑا نگلتے ہوئے اس نے میزپوش پر سے بچےکھچے ذرے سمیٹے اور انہیں منہ میں رکھ لیا۔

اس نے سنکھیا کی اتنی مقدار کھا لی تھی جو چوہوں کی ایک پوری نسل کا قلع قمع کرنے کو کافی تھی۔ اس کے باوجود وہ نصف شب تک پیانو بجاتی اور گاتی رہی، خوش و خرّم سونے کے لیے لیٹی اور معمول کی نیند سوئی۔ کوئی بات خلاف معمول تھی تو اس کے تنفس میں پتھریلی سی کھرکھراہٹ تھی۔

اریندرا اور یولیسس دوسرے بستر پر سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کے دم واپسیں کے منتظر تھے۔ لیکن جب اس نے ہذیان بکنا شروع کیا تو اس کی آواز ہمیشہ کی طرح جیتی جاگتی تھی۔

"میں پاگل ہو گئی تھی، میرے خدا، میں پاگل ہو گئی تھی!" وہ چلائی۔ "میں نے خواب گاہ کے دروازے پر دو بلیاں لگائیں کہ وہ اندر نہ آ سکے۔ دروازے کے آگے الماری اور میز رکھی اور میز پر کرسیاں۔ اور ان تمام حصاروں کے توڑنے کے لیے، کرسیوں کے میز سے خودبخود گرنے کے لیے، میز اور الماری کے خودبخود علیحدہ ہونے کے لیے، بلیوں کے اپنے کھانچوں میں سے خودبخود نکلنے کے لیے اسے صرف اپنی انگلیوں سے ہلکی سی دستک دینی پڑی۔"

اریندرا اور یولیسس لرزتے ہوئے حیرت کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے، کہ ہذیان زیادہ گہرا اور ڈرامائی ہوتا جا رہا تھا اور آواز زیادہ مانوس۔

"میں خوف سے پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو کہ میں مر رہی ہوں۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ دروازہ کھلے بغیر ہی کھل جائے، وہ اندر آئے بغیر اندر آ جائے، لوٹ کر چلا نہ جائے لیکن واپس بھی نہ آئے، کہ مجھے اس کو قتل نہ کرنا پڑے۔"

وہ اس دوران کو، جس کے اس کی منہ سے نکلی جرأت کو بھی گھنٹوں دہراتی رہی جیسے نیند میں خواب میں پھر سے جی رہی ہو۔ فجر سے ذرا قبل وہ کسی بھونچال میں زمین کے ہلنے کی طرح بستر میں لوٹنے لگی اور سسکیوں کی بہتات سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"میں نے سب سہہ لی لیکن وہ بس دیا۔" وہ چلائی۔ "میں نے سب پھر سہہ لی اور وہ پھر بس دیا۔" اور پھر دہشت میں اس نے اپنی آنکھیں یہ کہتے ہوئے کھولیں۔ "اہ، رامی! اہ، رامی!" لیکن آواز اس کے منہ سے نہیں نکلی بلکہ اس شگاف سے آ رہی تھی جو چاقو نے اس کی کمر میں ڈال دیا تھا۔

دادی کی خوفناک چیخ سے دہشت زدہ یولیسس نے لپک کر اریندرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"قاتل بڑھیا!" وہ چلایا۔

اریندرا نے اس پر توجہ نہیں کی کیونکہ اس لمحے پو پھٹنے لگی تھی۔ گھڑیال پانچ بجا رہے تھے۔

"جاؤ" اس نے کہا۔ "وہ اب جاگنے والی ہے۔"

"ہرن میں تو ہاتھی سے زیادہ جان ہے" یولیسس بولا۔ "یہ ہو نہیں سکتا!"

اریندرا نے اسے مہلک نظروں سے دیکھا۔

"مشکل یہ ہے" وہ بولی، "کہ تم کسی کو قتل کرنے کے قابل نہیں ہو۔"

یولیسس پر اس ملامت کا اتنا اثر ہوا کہ وہ خیمے سے نکل گیا۔ اریندرا خوابیدہ دادی کو اپنی چھپی ہوئی نفرت اور مایوسی کی شدت سے دیکھتی رہی یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور ہوا پرندوں کے شور سے جاگ اٹھی۔ دادی نے آنکھیں کھولیں اور اسے پرسکون مسکراہٹ سے دیکھا۔

"خدا تمہیں [illegible] بچی۔"

دادی کے معمولات میں واحد [illegible] کی [illegible] تھی۔ گرچہ وہ [illegible] اس نے طے کیا کہ اریندرا گیارہ بجے سے پہلے کسی گاہک [illegible] نہیں کرے گی۔ اس نے اریندرا سے اپنے ناخن سرخ کرنے کو کہا اور سر کے لیے [illegible]۔

"مجھے [illegible] ایسی شدید خواہش کبھی نہیں ہوئی" اس نے ملتجی آواز میں کہا۔

[illegible] لیکن جب اس نے بالوں میں کنگھی پھیری تو بالوں کے لچھے کنگھی کے دندانوں میں پھنسے رہ گئے۔ اس نے چونک کر ٹوٹے ہوئے بال دادی کو دکھائے۔ دادی نے انہیں ہاتھ میں لے کر دیکھا، اس نے اپنی انگلیوں سے ایک اور لٹ کھینچی اور اس کے ہاتھوں میں بالوں کا ایک اور گچھا آ گیا۔ اس نے اسے زمین پر پھینک دیا اور پھر [illegible] پہلے سے بھی بڑا گچھا آ گیا۔ پھر ہنسی سے بے قابو ہو کر وہ دونوں [illegible] ناقابل فہم مسرت کے ساتھ مٹھیاں بھر بھر کے بال [illegible] یہاں تک کہ اس کا سر چھلے ہوئے ناریل جیسا ہو گیا۔

اریندرا کو یولیسس کی خبر [illegible] دو ہفتے ہو چکے تھے کہ اس نے خیمے کے باہر الو کی

آواز سنی۔ دادی پیانو بجانا بند کر چکی تھی۔ وہ اپنے نوسٹلجیا میں اتنی محو تھی کہ اسے حقیقت کی خبر ہی نہیں تھی۔ اس کے سر پر چمک دار پروں کی وگ تھی۔

اریندرا نے آواز کا جواب دیا اور تبھی وہ فلیتہ دیکھا، جو پیانو سے نکل کر جھاڑیوں کے بیچ سے ہوتا ہوا تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ وہ ادھر دوڑ پڑی جہاں یولیسس تھا اور اس کے برابر جھاڑیوں میں چھپ گئی۔ وہ دونوں دھڑکتے دلوں کے ساتھ اس ننھے سے نیلے شعلے کو دیکھتے رہے جو فلیتے پر رینگتا ہوا اندھیرے فاصلے کو عبور کرتا ہوا خیمے میں داخل ہو گیا۔

"کان ڈھانپ لو" یولیسس نے کہا۔

ان دونوں نے ایسا ہی کیا گو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ دھماکا نہیں ہوا۔ خیمے کا اندرونی حصہ درخشاں سرخی کے ساتھ روشن ہو کر خاموشی سے پھٹا اور نم بارود کے بگولے میں غائب ہو گیا۔ اریندرا نے یہ سمجھتے ہوئے کہ دادی مر چکی ہے، جب اندر جانے کی ہمت کی تو اسے اس کی وگ کو جھلسا ہوا اور اس کی شب خوابی کی قمیص کو پرزے پرزے پایا۔ لیکن دادی، جو کمبل سے آگ بجھانے کی کوشش کر رہی تھی، پہلے سے زیادہ جیتی جاگتی نظر آ رہی تھی۔

یولیسس انڈین خدمت گاروں کی چیخ پکار سے فائدہ اٹھا کر کھسک گیا کہ انہیں دادی کے متضاد احکام نے بوکھلا دیا تھا اور وہ گومگو کے عالم میں تھے۔ بالآخر جب انہوں نے شعلوں پر قابو پایا اور دھوئیں سے چھٹکارا حاصل کیا تو ان کے سامنے گویا کسی جہاز کی تباہی کا منظر تھا۔

"یہ تو شیطان کی کارستانی لگتی ہے" دادی نے کہا۔ "پیانو اس طرح نہیں پھٹا کرتے۔"

اس نئی تباہی کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے دادی نے ہر طرح کی قیاس آرائی کی لیکن اریندرا کا بہانہ گریز اور جذبات سے عاری رویہ اس کے الجھاؤ ہی میں [illegible]۔ وہ اپنی پوتی کے طورعمل میں معمولی سی دراڑ بھی نہ پا سکی، اور نہ اس نے یولیسس کی موجودگی پر غور کیا۔ [illegible] صبح تک جاگتی رہی۔ وہ کم سوئی اور وہ بھی ٹھیک سے نہیں۔ اگلی صبح جب اریندرا نے موتیوں کی سلاخوں والی صدری اس کے جسم سے اتاری تو اسے دادی کے شانوں پر چھالے اور سینے پر گوشت نکلا نظر آیا۔ "میں نیند میں بڑی کروٹیں نہیں لے رہی تھی؟" اس نے اریندرا سے کہا جو اس کے جلے ہوئے زخموں پر انڈوں کی سفیدی لگا رہی تھی۔ "اور اس کے علاوہ میں نے ایک عجیب خواب بھی دیکھا ہے۔" اس نے عکس بندی کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالا یہاں تک کہ وہ اس کی یادداشت میں اتنا ہی روشن ہو گیا جتنا خواب میں تھا۔

"وہ سفید جھولے میں ایک مور تھا" اس نے کہا۔

اریندرا حیران رہ گئی لیکن اس نے فوراً ہی ایک بار پھر اپنا روزمرہ کا انداز اختیار کر لیا۔

"یہ تو اچھی علامت ہے" اس نے دروغ گوئی کی۔ "خوابوں میں مور طویل عمروں والے جاندار ہوتے ہیں۔"

"خدا تمہاری بات قبول کرے" دادی نے کہا "کیونکہ ہم وہیں پہنچ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ ہمیں پھر سے آغاز کرنا ہو گا۔"

ایرندرا نے اپنا ہاتھ سحرزدہ نہیں کیا۔ وہ دادی کو چھوڑ کر، جس کا دھڑ انڈوں کی سفیدی سے تر اور کھوپڑی رائی کے لیپ سے پُر ہوتی تھی، لیمپ کا برتن لیے خیمے سے باہر چلی گئی۔ وہ بام کے چھپر میں، جو ان کا باورچی خانہ تھا، مزید انڈوں کی سفیدی برتن میں ڈال رہی تھی کہ اس نے چولھے کے عقب میں یولیسس کی آنکھیں اسی طرح نمودار ہوتی دیکھیں جس طرح پہلی بار اپنے بستر کے پیچھے دیکھی تھیں۔ وہ چونکی نہیں لیکن تھکی ہوئی آواز میں اس سے کہا:

"تم کچھ کر سکتے ہو تو صرف میرے قرض میں اضافہ کر سکتے ہو۔"

یولیسس کی آنکھیں تشویش سے دھندلا گئیں۔

وہ بت بنا خاموشی سے مطربی جمانی ایرندرا کو دیکھ رہا تھا جو اپنے چہرے پر مکمل حقارت کا مستقل مظہر لیے اس طرح نظر موڑ رہی تھی گویا وہ موجود ہی نہ ہو۔ لمحہ بھر کے بعد اس کی نظروں نے حرکت کی اور وہ باورچی خانے میں رکھے ہوئے برتنوں، ریشے کی ڈوریوں اور گوشت کاٹنے والے چاقو کو سونگنے لگیں۔ وہ کھڑا ہوا اور اسی خاموشی سے چھپر کے پیچھے جا کر چاقو اٹھا لیا۔

ایرندرا نے اس پر دوبارہ نظر نہیں ڈالی لیکن جب وہ چھپر سے نکلا تو اس نے بہت مدھم آواز میں اسے متنبہ کیا:

"ذرا احتیاط سے۔ اسے پہلے ہی موت کی آگاہی ہو چکی ہے۔ اس نے خواب میں سفید گھونسے والا مور دیکھا ہے۔"

دادی نے یولیسس کو چاقو لیے اندر آتے دیکھا تو ایک انسانی کوشش سے لاٹھی کے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بازو اٹھا دیے۔

"لڑکے!" وہ چیخی۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

یولیسس نے اس پر چھلانگ لگائی اور چاقو اس کے عریاں سینے میں گھونپ دیا۔ دادی کراہتے ہوئے اس پر گری اور اپنے ریچھ جیسے طاقتور بازوؤں میں اس کا گلا گھونٹنے لگی۔

"کتیا کے جنے،" وہ غرائی۔ "مجھے بڑی دیر میں پتا چلا کہ تیرا چہرہ کسی غدار فرشتے کا چہرہ ہے۔"

وہ کچھ اور کہنے کے قابل نہ تھی کہ یولیسس نے چاقو چھڑا کر اس کے پہلو میں دوبارہ گھونپ دیا تھا۔ دادی کے منہ سے ایک مدھم سی کراہ نکلی اور اس نے پہلے سے زیادہ شدت سے اپنے حملہ آور کو بھینچ لیا۔ یولیسس نے ترس کھائے بغیر اس پر تیسرا وار کیا اور شدید دباؤ سے نکلنے والے خون کے فوارے نے اس کے چہرے پر چھینٹیں ڈال دیں۔ یہ چکنا خون تھا، چمکیلا اور سبز، بالکل پودینے والے شہد جیسا۔

ایرندرا ہاتھ میں برتن لیے دروازے پر نمودار ہوئی اور اس کشمکش کو مجرمانہ بے حسی سے دیکھنے لگی۔

غصے اور درد سے دھاڑتی ہوئی، جنگلی سؤر کی طرح ٹھوس اور دیوقد دادی نے یولیسس کے جسم کو جکڑ لیا۔ اس کے بازو، ٹانگیں، حتیٰ کہ گنجی کھوپڑی بھی خون سے سبز تھی۔ اس کی دھونکنی جیسی سانس کی آواز، جو مرگ کے ولین غرغروں سے بگڑ چکی تھی، سارے خیمے

میں گونج رہی تھی۔ یولیسس، جو ایک بار پھر اپنا ہتھیار والا بازو چھڑوا کر اس کے پیٹ میں شگاف ڈالنے میں کامیاب رہا تھا، خون کے ایک زوردار بہاؤ سے سر سے پاؤں تک سبز ہو گیا۔ دادی نے کھلی ہوا میں پہنچنے کی کوشش کی، جس کی اسے اب زندہ رہنے کے لیے ضرورت تھی، لیکن منہ کے بل گر پڑی۔ یولیسس نے اپنے آپ کو اس کے مردہ بازوؤں سے چھڑایا اور ایک لمحہ توقف کیے بغیر اس گرے ہوئے بھاری بھرکم جسم پر آخری وار کیا۔

ایرندرا نے برتن میز پر رکھا اور دادی پر جھکتے ہوئے اسے چھوئے بغیر دیکھنے لگی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے تو یکایک اس کے چہرے نے عمر کی وہ ساری بلوغت حاصل کر لی جو اس کی بیس سال بدبختی نے اسے نہیں دی تھی۔ تیز اور محکم و سبک حرکات کے ساتھ اس نے سونے والی صدری اٹھائی اور خیمے سے نکل گئی۔

یولیسس جو اس جدوجہد سے بری طرح تھک چکا تھا، لاش کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ جتنا زیادہ اپنے چہرے کو صاف کرنے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی زیادہ اس سبز اور جیتے جاگتے مادے سے لتھڑا جا رہا تھا جو اس کی انگلیوں سے بہتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اسے اپنی حالت کا احساس صرف اسی وقت ہوا جب اس نے ایرندرا کو سونے والی صدری لیے باہر جاتے دیکھا۔

اس نے ایرندرا کو پکارا لیکن اسے جواب نہ ملا۔ وہ گھسٹتا ہوا خیمے کے دروازے تک آیا تو ایرندرا ساحل کے ساتھ ساتھ شہر سے دور بھاگتی نظر آئی۔ پھر اس نے دردناک چیخوں کے ساتھ پکارتے ہوئے، جو اب عاشق سے زیادہ بیٹے کی تھیں، تعاقب کرنے کی آخری کوشش کی تاہم کسی کی مدد کے بغیر ایک عورت کو قتل کرنے کی ہولناک تکان اس پر حاوی آ گئی۔ وہ ساحل پر منہ کے بل پڑا تنہائی اور خوف سے رو رہا تھا کہ دادی کے بنائے خدمت گاروں نے اسے آ لیا۔

ایرندرا نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ہرن سے سبک تر ہوا میں دوڑ رہی تھی اور اس دنیا کی کوئی آواز اسے نہیں روک سکتی تھی۔ وہ گردن موڑ کر دیکھے بغیر شورے کے گڑھوں، ابرق کی دلدلوں اور جھونپڑوں کی ویرانی کو پیچھے چھوڑتی ہوئی دوڑتی چلی گئی یہاں تک کہ سمندر کا قدرتی منظر ختم ہو گیا اور صحرا شروع ہو گیا لیکن وہ سونے کی صدری کے ساتھ بانجھ ہواؤں اور غیر مختتم شاموں سے پرے دوڑتی رہی۔ کسی نے اس کے بارے میں پھر سنا اور نہ کبھی اس کی بدبختی کا کوئی سراغ ملا۔

[illegible] گارسیا مارکیز

ترجمہ: [illegible]

محبت کے اُس پار منتظر موت

سینیٹر ونیسیمو سانچیز کی اپنی موت سے پہلے چھ مہینے اور گیارہ دن باقی تھے کہ اسے وہ عورت ملی جو اس کی زندگی کا حاصل تھی۔ اس کی ملاقات روزل ڈیل ویریے نامی ایک موہوم سے گاؤں میں ہوئی جو رات کے وقت اسمگلروں کے جہازوں کے لیے خفیہ بندرگاہ کا کام دیتا تھا اور دوسری طرف روز روشن میں کسی انتہائی ناکارہ صحرائی رخنے کی طرح ایسے سمندر پر کھلتا نظر آتا تھا جو نہ صرف بے سمت اور بے کیف تھا بلکہ ہر جگہ سے اتنی دور تھا کہ وہاں کسی ایسے شخص کے رہنے کا خواب بھی نہیں آ سکتا تھا جو کسی کی تقدیر بدلنے پر قادر ہو۔ اس گاؤں کا نام بھی ایک طرح کا مذاق تھا کہ وہاں دستیاب واحد گلاب کا پھول سینیٹر ونیسیمو سانچیز نے اسی سہ پہر جب وہ لورا فارینا سے ملا تھا، خود اپنی قمیص میں ٹانک رکھا تھا۔

یہ اس انتخابی مہم کا ایک ناگزیر پڑاؤ تھا جو سینیٹر ہر چوتھے سال چلایا کرتا تھا۔ تماشے والی گاڑیاں صبح ہی آ چکی تھیں۔ اس کے بعد مقامیوں سے بھرے ہوئے ٹرک آئے، جنھیں مجمع بڑھانے کی خاطر جلسوں کی حاضری بڑھانے کے لیے کرائے پر لایا جاتا تھا۔ گیارہ بجنے سے ذرا قبل موسیقی، آتش بازی اور جلوس کی جیپوں کے جلو میں اسٹرابیری سوڈے کی سی رنگت والی سرکاری کار آ پہنچی۔ ائیرکنڈیشنڈ کار میں سینیٹر ونیسیمو سانچیز موسم سے بے نیاز پرسکون بیٹھا تھا لیکن جوں ہی اس نے دروازہ کھولا گرم ہوا کے تھپیڑے نے اسے ہلا دیا۔ اس کی خالص ریشم کی قمیص ایک طرح کے ہلکے رنگ کے شوربے میں بھیگ گئی اور وہ خود کو اپنی عمر سے کئی سال بڑا اور پہلے سے کہیں زیادہ تنہا محسوس کرنے لگا۔ حقیقی زندگی

میں وہ ابھی بھی بیالیس سال کا ہوا تھا۔ اس نے گوٹنگن سے اعزاز کے ساتھ میٹلرجیکل انجینئر کی حیثیت سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ ناقص طور پر ترجمہ کی ہوئی لاطینی کلاسیکی کتابوں کا مشتاق قاری تھا، گو اس مطالعے سے اسے کچھ زیادہ حاصل نہ تھا۔ اس نے ایک خوش دل جرمن عورت سے شادی کی تھی جس سے اس کے پانچ بچے تھے جو سب کے سب اپنے گھر میں مسرور تھے۔ ان سب سے زیادہ مسرور وہ خود تھا تاآنکہ تین ماہ قبل، اسے بتایا گیا کہ اگلے کرسمس تک وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مر چکا ہو گا۔

جب تک جلسۂ عام کی تیاریاں مکمل ہوتیں، سینیٹر نے اس مکان میں جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، آرام کے لیے ایک گھنٹہ نکال لیا۔ لیٹنے سے قبل اس نے پانی سے بھرے گلاس میں وہ گلاب ڈال دیا جسے اس نے سارے صحرا کے سفر میں زندہ رکھا تھا۔ پرہیزی غذا کھائی جو وہ ساتھ رکھتا تھا تاکہ بکری کے گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑوں سے بچ سکے جو باقی دن میں اس کے منتظر بار بار آنے والے تھے، اور وقت سے پہلے کئی دردکش گولیاں کھا لیں تاکہ درد اٹھنے پر اس کا مداوا پہلے سے موجود ہو۔ پھر اس نے بجلی کا پنکھا جھولنے کے نزدیک کیا اور ننگا ہو کر پندرہ منٹ کے لیے گلاب کے سائے میں دراز ہو گیا۔ اونگھنے کے دوران موت کے خیال سے دھیان ہٹانے کے لیے اسے اپنی کوشش کرنا پڑی۔ ڈاکٹروں کے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ اسے ایک مقررہ میعاد کی سزا ملی ہے، کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی لائے بغیر اس راز کو اکیلے ہی برداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اس کا باعث فخر نہیں بلکہ شرم تھی۔

تین بجے اور نہانے دھونے کے بعد جب وہ دوبارہ جلسے میں آیا تو خود پر مکمل قابو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کھردری لنن کی پتلون اور پھولوں والی قمیص پہن رکھی تھی، اور اس کی روح دردکش گولیوں سے سنبھالا لے چکی تھی۔ تاہم موت کی کاٹ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ مضرت رساں تھی کیونکہ پلیٹ فارم پر چڑھتے ہی اسے ان لوگوں کے لیے ایک عجیب سی تحقیر محسوس ہوئی جو اس سے ہاتھ ملانے کی خوش بختی کے لیے لڑ رہے تھے، اور گزشتہ کے برعکس اسے ان برہنہ پا مقامیوں پر افسوس نہیں ہوا جو چھوٹے سے بنجر چوک میں شورے کے گرم ڈلوں کی تپش بمشکل برداشت کر پا رہے تھے۔ اس نے تالیوں کے شور کو تقریباً طیش میں آتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور گرمی سے ہانپتے سمندر پر نظریں جمائے ہوئے اپنے ہاتھوں کو حرکت دیے بغیر بولنا شروع کر دیا۔ اس کی دھیمی، ٹھہری گہری آواز میں پرسکون پانی کی سی کیفیت تھی۔ لیکن یاد کی ہوئی اور بار بار دہرائی ہوئی تقریر اس کی زبان پر سچی بات کی طرح نہیں بلکہ مارکس اوریلیس کی "مراقبات" کی کتاب چہارم میں درج کسی جبریہ بیان کے متضاد کے طور پر ابھری تھی۔

"ہم یہاں فطرت کو شکست دینے آئے ہیں،" اس نے اپنے تمام معتقدات کے برعکس آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہم اپنے ملک میں لاوارثوں جیسی زندگی نہیں جئیں گے اور دشوار آب و ہوا کی اس مملکت میں خدائی یتیم نہیں رہیں گے، اپنی زمین پر جلاوطن نہیں رہیں گے۔ ہم ایک مختلف قوم ہوں گے، خواتین و حضرات، ہم ایک عظیم اور مسرور قوم ہوں گے۔"

اس تماشے کا ایک خاص ڈھب تھا۔ اس کی تقریر جاری تھی کہ اس کے ساتھیوں نے کاغذی

پرندوں کے جھنڈ ہوا میں چھوڑ دیے۔ ان مصنوعی مخلوقات میں جان سی پڑ گئی اور وہ تختوں کے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر سے اڑتی ہوئی سمندر کی طرف چلی گئیں۔ اسی دوران دوسرے آدمیوں نے گاڑیوں میں سے نمدے کے پتوں والے مصنوعی درخت نکال کر ہجوم کے عقب میں شوریدہ زمین میں لگا دیے۔ انہوں نے یہ سوانگ گتّے کا پیش منظر لگا کر مکمل کیا، جس میں سرخ اینٹوں اور شیشے کی کھڑکیوں والے جھوٹ موٹ کے مکان بنے تھے، اور اس طرح انہوں نے حقیقی زندگی کے خستہ حال جھونپڑوں کو ڈھانپ دیا۔

سینیٹر نے سوانگ کو مزید وقت دینے کے لیے اپنی تقریر کو لاطینی کے دو اقتباسات کے ذریعے طویل کر دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ بارش برسانے والی مشینیں، غذائی جانوروں کی افزائش کے دستی آلات، شورے میں سبزیاں اور کھڑکیوں میں پھول اگانے والا روغنِ مسرت فراہم کرے گا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی افسانوی دنیا تیار ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا، "ہماری دنیا یہی ہو گی، خواتین و حضرات؟" اس نے بلند آواز سے کہا۔ "دیکھیے! ہماری دنیا یہی ہو گی۔"

سامعین نے مڑ کر دیکھا۔ رنگ دار کاغذ کا بنا ہوا ایک بحری جہاز، جو اس مصنوعی شہر کی بلند ترین عمارتوں سے بھی اونچا تھا، مکانوں کے عقب سے گزر رہا تھا۔ یہ بات صرف سینیٹر نے ہی محسوس کی کہ بار بار بکسے اتارنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے باعث گتّے کا شہر شدید موسمی اثرات سے بری طرح متاثر ہو چکا ہے اور اب اتنا ہی خستہ و خراب ہے جتنا خود یہ روزل دیل ویرے کا گاؤں۔

بارہ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ نیلسن فاریا سینیٹر کا سواگت کرنے نہیں گیا۔ اس نے اپنے باقی ماندہ قیلولے کے دوران گھر کے ایک ٹھنڈے کنج میں جھولے پر لیٹے لیٹے تقریر سنی۔ [illegible] یہ گھر اس نے [illegible] بنایا تھا جب سے اپنی پہلی بیوی کو کھسیٹ کر اس کے ٹکڑے کیے تھے۔ وہ ڈیولز آئی لینڈ سے فرار ہو کر معصوم طوطوں سے لدے ہوئے ایک جہاز کے ذریعے روزل دیل ویرے میں وارد ہوا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک خوب صورت اور بیدین سیاہ فام عورت تھی جو اسے پارامریبو میں ملی تھی اور جس سے اس کی ایک بیٹی تھی۔ کچھ عرصے بعد یہ عورت فطری اسباب سے مر گئی اور اس طرح اس عورت کے انجام سے بچ گئی جس کے ٹکڑوں نے اس کی گوبھی کے قطعے کو زرخیز کیا تھا، اور سالم حالت میں، ولندیزی نام کے ساتھ مقامی قبرستان میں دفن ہوئی۔ لڑکی کو اپنے باپ کی زرد اور متحیر آنکھوں کے ساتھ اپنی ماں کا رنگ روپ ورثے میں ملا تھا، یوں نیلسن کے پاس یہ تصور کرنے کی معقول وجہ تھی کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت کی پرورش کر رہا ہے۔

سینیٹر ونیسیو سانچیز سے اس کی پہلی انتخابی مہم کے دوران ملاقات ہونے کے دن سے نیلسن فاریا قانون کی پہنچ سے دور ہونے کے لیے اس سے درخواست کر رہا تھا کہ اسے جعلی شناختی کارڈ بنوا دے۔ سینیٹر نے دوستانہ لیکن سخت انداز میں انکار کر دیا تھا، لیکن نیلسن فاریا نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ کئی سال تک، جب بھی اسے موقع ملتا، یہی درخواست مختلف انداز سے دہراتا رہا۔ لیکن اس بار وہ قزاقوں کے اس جلتے ہوئے بہشت میں اپنے جھولے میں پڑا رہا۔ اس نے [illegible] تالیاں سنیں کر اپنا سر اٹھایا اور باڑھ کی ٹخنوں کے اوپر سے

نظریں دوڑاتے ہوئے، سوانگ کا عقبی حصہ دیکھا جو عمارتوں کے پیل پایوں، درختوں کے سہاروں اور بحری جہاز کو دھکیلتے ہوئے پوشیدہ فریب کاروں پر مشتمل تھا۔ اس نے کوئی حیرت محسوس کیے بغیر تھوک دیا۔

"[illegible] سیاست کا شعبدہ باز؟" اس نے فرانسیسی میں تبصرہ کیا۔

تقریر کے بعد، جیسا کہ رواج تھا، سینیٹر موسیقی اور آتش بازی کے شور میں شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ لوگ اپنی بپتا سناتے ہوئے شہر کے باسیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ ان کی شکایتیں خندہ پیشانی سے سن رہا تھا۔ اسے ہر ایک کو کوئی خاص مہربانی کیے بغیر مطمئن کرنے کا گر آتا تھا۔ چھ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہمراہ ایک مکان کی چھت پر استادہ عورت نے شوروغل اور آتش بازی کے ہنگامے میں جیسے تیسے اپنی آواز اس کے کانوں تک پہنچائی۔

"میں کوئی بڑی چیز نہیں مانگ رہی ہوں سینیٹر،" وہ بولی۔ "پھانسی پانے والے کے کنوئیں سے پانی لانے کے لیے صرف ایک گدھا۔"

سینیٹر نے چھ سوکھے بچوں پر نظر کی۔ "تمہارے شوہر کا کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ قسمت آزمانے اروبا کے جزیرے میں گیا تھا،" عورت نے خوش مزاجی سے جواب دیا "لیکن وہاں ایک غیر ملکی عورت کا ہو رہا۔ اس طرح کی جو ہیرے دانتوں پر جڑے ہوتی ہیں۔"

اس جواب نے قہقہوں کا طوفان برپا کر دیا۔

"خوب!" سینیٹر نے فیصلہ کیا۔ "تمہیں گدھا مل جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد اس کا ایک نائب عورت کے گھر ایک اچھا لدّو گدھا چھوڑ گیا جس کے پٹھے پر انمٹ رنگ سے یک انتخابی نعرہ لکھا تھا تاکہ لوگ سینیٹر کے تحفے کو بھول نہ جائیں۔

گلی کی مختصر طوالت طے کرتے ہوئے اس نے دیگر چھوٹی چھوٹی نوازشات کیں۔ حتیٰ کہ ایک بیمار آدمی کو، جس نے اسے گزرتا دیکھنے کے لیے اپنا بستر گھر کے دروازے پر لگوا لیا تھا، چمچے سے دوا بھی پلائی۔ آخری موڑ پر باڑھ کے تختوں کی درزوں میں سے اس نے نیلسن فاریا کو جھولے میں لیٹے دیکھا جو زرد اور ملول نظر آ رہا تھا۔ تاہم سینیٹر نے کوئی لگاوٹ ظاہر کیے بغیر اس کی مزاج پرسی کی۔

"ہیلو۔ کیسے ہو؟"

نیلسن فاریا نے جھولے میں کروٹ لی اور اپنی نظر کی اداسی سے اسے بھگو دیا۔

"کون؟ میں؟ آپ جانتے ہی ہیں،" اس نے فرانسیسی میں جواب دیا۔

اس کی بیٹی نے علیک سلیک کی آواز سنی تو وہ آنگن میں آ گئی۔ اس نے مقامیوں کی گھٹیا سی پرانی گایرو پوشاک پہن رکھی تھی۔ سر پر رنگین کپڑے کی پٹیاں سجا رکھی تھیں اور چہرے پر دھوپ سے بچاؤ کے لیے رنگ ملا ہوا تھا، لیکن اس خستہ حالی میں بھی یہ تصور کرنا ممکن تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ حسین عورت نہیں رہی ہو گی۔ سینیٹر دم بخود رہ گیا۔ "مارا گیا!" اس نے حیرت سے سانس لیا۔ "خدا بھی عجب بدحواسیاں کرتا ہے!"

اس رات نیلسن فاریا نے اپنی بیٹی کو بہترین پوشاک پہنا کر سینیٹر کے پاس بھیجا۔ دو

رشتہ داروں محافظوں نے جو عارضی مکان میں گرمی کی شدت سے اونگھ رہے تھے اسی ریفائنری میں پورٹ ایبل کرسی پر اسے بیٹھنے کو کہا۔

سینیٹر دوسرے کمرے میں تھا جہاں وہ روزل ڈیل ویرے کے سرکردہ لوگوں سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اس غرض سے اکٹھا کیا تھا کہ وہی تقریروں کی بچی کچھی سکیں [illegible] سنا سکے۔ وہ ان سب لوگوں سے جن سے سینیٹر کا صحرا کے سبھی شہروں میں ہمیشہ سابقہ پڑتا تھا اس قدر مشابہ تھے کہ [illegible] شبینہ جلاسوں سے وہ خود تنگ آ چکا تھا [illegible] پسینے سے تر تھی اور وہ [illegible] پر گرم ہو [illegible] جو کمرے کی شدید گرمی میں گھرمکھی کی طرح بھنبھنا [illegible] رہی تھی۔

[illegible] وہ کہہ رہا تھا، ہمیں اور [illegible] میں کہ جس دن [illegible] کی فصل اور ہمیں جوہڑوں میں کیڑوں کی جگہ [illegible] گی [illegible]۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا [illegible]

[illegible] پھر کر سے کاغذی [illegible] اس نے [illegible] کسی [illegible] کی پنکھے سے [illegible] اس کمرے میں ادھر ادھر [illegible] اور پھر [illegible] دروازے سے [illegible] پانی ہوئے [illegible] کی ساتھ گفتگو جاری رکھی۔

[illegible] کی ضرورت نہیں جو تم پہلے ہی جانتے ہو۔ [illegible] مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو [illegible] کیونکہ میں بند چاہی اور [illegible] دوسری طرف تم لوگ روٹی سی کی کھاتے ہو۔"

[illegible] کاغذی [illegible] کو [illegible] دیکھا۔ صرف [illegible] کو دیکھا کیونکہ [illegible] محافظ [illegible] کو [illegible] سیڑھیوں پر سو چکے تھے۔ چند گردشوں کے بعد کاغذی [illegible] کی نہیں منتشر طور پر کھو گئی [illegible] اور وہ دیوار کے ساتھ چپک کر وہیں جم [illegible] لورا فارینا نے [illegible] محافظوں سے گریز کرتے [illegible] کی کوشش کی۔ ایک محافظ [illegible] جو [illegible] کی کونج سے [illegible] کی رنگین کوشش دیکھی۔

[illegible] دیوار پر نقش ہے۔"

[illegible] دوبارہ بیٹھ گئی۔ سینیٹر دروازے کی چلی پر [illegible] کو سبھی دیکھ [illegible] حالی ہو گئی۔

[illegible] وہ فرنسیسی میں بولی۔

سینیٹر سمجھ گیا۔ [illegible] محافظوں کا جائزہ لیا پھر لورا فارینا کو بہ غور دیکھا جس کا غیرمعمولی حسن اس کے درد سے کہیں زیادہ توجہ طلب تھا، اور تب اسے یقین ہو گیا کہ جو [illegible] اس کو کرنا تھا وہ موت کر چکی ہے۔

[illegible] اس نے لڑکی سے کہا۔

[illegible] فارینا دہلیز پر قدم رکھتے ہی ششدر رہ گئی۔ ہزاروں نوٹ اس تتلی کی طرح

پھڑپھڑاتے ہوئے ہوا میں تیر رہے تھے۔ سینیٹر نے پنکھا بند کر دیا اور نوٹ بےہوا ہو کر کمرے کی مختلف اشیا پر اتر گئے۔

"دیکھا تم نے؟" وہ بولا، "غلاظت بھی اڑ سکتی ہے۔"

لورا فارینا ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کی جلد، جس کا رنگ اور سنولایا ہوا گاڑھاپن خام تیل جیسا تھا، ہموار اور تنی ہوئی تھی۔ اس کے بال کسی نوعمر گھوڑی کی ایال تھے اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں روشنی سے زیادہ چمک دار تھیں۔ سینیٹر نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور بالآخر گلاب تک پہنچ گیا جو شورے میں اپنی چمک کھو چکا تھا۔

"گلاب ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔" لڑکی نے قدرے الجھاؤ سے کہا۔ "میں نے ریوہاچا میں پہلی بار دیکھے تھے۔"

سینیٹر ایک فوجی چارپائی پر بیٹھ گیا اور، اپنی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے، گلابوں کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے سینے پر، اس طرف جہاں اس کے خیال میں اس کا دل تھا، کسی قزاق کی طرح تیر سے گُدا ہوا دل نقش تھا۔ اس نے گیلی قمیص فرش پر پھینکی اور لورا فارینا سے اپنے جوتے اتارنے میں مدد کرنے کو کہا۔

وہ چارپائی کے مقابل گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ سینیٹر کچھ سوچتے ہوئے اس کا جائزہ لیتا رہا اور، جب تک وہ اس کے تسمے کھولتی رہی، حیران ہوتا رہا کہ اس حادثے کی بدنصیبی دونوں میں سے کس کے حصّے میں آئے گی۔

"تم تو ابھی بالکل بچی لگتی ہو۔" اس نے کہا۔

"اس پر نہ جاؤ۔" وہ بولی۔ "میں اپریل میں انیس سال کی ہو جاؤں گی۔"

سینیٹر کی دلچسپی جاگ اٹھی۔

"کس تاریخ کو؟"

"گیارہ" وہ بولی۔

سینیٹر بہتر محسوس کرنے لگا۔ "ہم دونوں کا بُرج حمل ہے۔" اس نے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے اضافہ کیا:

"یہ تنہائی کی علامت ہے۔"

لورا فارینا توجہ نہیں دے رہی تھی، کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے جوتوں کا کیا کرے۔ ادھر سینیٹر بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ لورا فارینا کا کیا کرے۔ وہ چونکہ معاشقوں کا عادی نہیں تھا اور پھر وہ جانتا تھا کہ موجودہ معاملے کی جڑیں ہی ذلت میں پیوست ہیں۔ سوچنے کے لیے چند لمحے چرانے کو اس نے لورا فارینا کو اپنے گھٹنوں کے درمیان مضبوطی سے جکڑ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیے اور پشت کے بل چارپائی پر لیٹ گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ لڑکی اپنی پوشاک کے نیچے برہنہ ہے کیونکہ اس کے بدن سے کسی جنگلی جانور کی سی پُراسرار خوشبو آ رہی تھی لیکن اس کا دل خوف زدہ تھا اور اس کی جلد ٹھنڈے پسینے سے نم۔

"ہم لوگوں سے کوئی محبت نہیں کرتا۔" سینیٹر نے آہ بھری۔

لورا فارینا نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہاں صرف اتنی ہوا تھی کہ وہ سانس ہی لے

پانی۔ سینیٹر نے اسے سنبھالا دینے کے لیے اپنے برابر لٹا لیا۔ اس نے روشنی گل کر دی اور کمرہ گلاب کے سائے میں آ گیا۔ لڑکی نے اپنے آپ کو قسمت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ سینیٹر ٹٹولتے ہوئے ہاتھوں سے نرمی سے اس کا بدن سہلانے لگا، لیکن جہاں اسے اس کی نسوانیت پانے کی توقع تھی، وہاں کوئی سخت سی چیز اس کی راہ میں حائل تھی۔

"یہ، یہ کیا ہے؟"

"تالا،" لڑکی نے بتایا۔

"لعنت ہو،" سینیٹر نے مشتعل ہو کر کہا، اور وہ سوال کیا جس کا جواب وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ "چابی کہاں ہے؟"

لورا فارینا نے سکون کا سانس لیا۔

"میرے ابا کے پاس،" اس نے جواب دیا۔ "انھوں نے کہا ہے کہ آپ چابی کے لیے اپنا آدمی بھیج دیں اور اس کے ہاتھ یہ تحریری پیغام بھی کہ آپ ان کا مسئلہ حل کر دیں گے۔"

سینیٹر کا چہرہ چڑھ گیا۔ "حرامی مینڈک،" وہ غصے سے بڑبڑایا۔ اس نے سکون کی خاطر ہی آنکھیں بند کر لیں اور اندھیرے میں اپنے آپ سے ملا۔ یاد رکھو، اسے یاد آیا، چاہے تم ہو یا کوئی اور، اس میں زیادہ دیر نہیں ہے کہ تم فنا ہو جاؤ گے اور اس میں بھی زیادہ دیر نہیں ہے کہ تمھارا نام بھی باقی نہیں رہے گا۔

اس نے تھرتھری کے گزرنے کا انتظار کیا۔

"ایک بات بتاؤ،" اس نے پوچھا، "تم نے میرے بارے میں کیا سنا ہے؟"

"سچ سچ سننا چاہتے ہو؟"

"سچ سچ۔"

"اچھا،" لورا فارینا نے جرأت کی، "لوگ کہتے ہیں کہ تم دوسروں سے بدتر ہو، کیونکہ تم مختلف ہو۔"

سینیٹر برہم نہیں ہوا۔ وہ آنکھیں بند کیے کافی دیر خاموش رہا، اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو یہی انتہائی پوشیدہ جبلتوں سے لوٹ ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"اوہ کیا مصیبت ہے،" اس نے فیصلہ کیا۔ "اپنے حرامی باپ کو بتا دینا میں اس کا کام کر دوں گا۔"

"اگر آپ چاہیں تو میں خود جا کر چابی لا سکتی ہوں،" لورا فارینا نے کہا۔

سینیٹر نے اسے روک لیا۔

"چابی کو بھول جاؤ،" اس نے کہا، "بس کچھ دیر میرے ساتھ لیٹی رہو۔ آدمی تنہا ہو تو کسی کے پاس ہونا اچھا ہوتا ہے۔"

پھر لڑکی نے اپنی نظریں گلاب پر جماتے ہوئے اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ سینیٹر نے اس کی کمر سے تھام کر اپنا چہرہ اس کی بغل میں چھپا لیا اور دہشت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ چھ مہینے اور گیارہ دن بعد لورا فارینا کے اسکینڈل کے باعث بے قدر اور مسترد ہو کر اور اس کے بغیر مرنے پر غصے سے روتے ہوئے وہ اسی حالت میں مر جائے گا۔

گابرئیل گارسیا مارکیز

ترجمہ: [illegible]

گم گشتہ وقت کا سمندر

جنوری کے آخر میں سمندر تیز و تند ہو جاتا تھا، کوڑے کے ڈھیر لا لا کر قصبے پر پھینکنے لگتا اور چند ہفتوں کے بعد ہر چیز اس کی ناقابلِ برداشت کیفیت سے آلودہ ہو جاتی۔ اس دن کے بعد سے دنیا رہنے کے قابل نہ رہتی، کم از کم اگلے دسمبر تک، چنانچہ کوئی بھی آٹھ بجے رات کے بعد جاگتا ہوا نہیں ملتا تھا۔ مگر جس سال مسٹر ہربرٹ آئے، اس سال سمندر نہیں بدلا، فروری میں بھی نہیں، بلکہ اس کے برخلاف وہ پہلے سے بھی زیادہ پرسکون، ہموار اور منور ہو گیا، اور مارچ کی اولین راتوں میں سمندر سے گلابوں کی خوشبو آنے لگی۔

توبیاس نے یہ خوشبو سونگھی۔ اس کا خون کیکڑوں کو بھی جاذب کھینچتا تھا اور وہ آدھی آدھی رات انھیں اپنے بستر سے جھٹکنے میں گزارتا یہاں تک کہ ہوا تیز ہو جاتی تب وہ سو پاتا۔ جاگتے پڑے رہنے کے طویل وقفوں میں اس نے ہوا میں ہونے والی تمام تبدیلیوں کو پہچاننا سیکھ لیا تھا، چنانچہ جب اسے گلابوں کی خوشبو آئی تو اسے یہ معلوم کرنے کے لیے دروازہ کھول کر باہر نہیں جھانکنا پڑا کہ خوشبو سمندر سے آئی ہے۔

وہ دیر سے اٹھا۔ کلوتیلدے انگنائی میں آگ جلا رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور تارے اپنی اپنی جگہوں پر تھے، مگر انھیں گننا مشکل تھا کیونکہ افق پر سمندر کی روشنی سے چھوٹ پڑ رہی تھی۔ کافی پینے کے بعد بھی توبیاس کو اپنے حلق میں رات کا ہلکا سا ذائقہ چپکا ہوا محسوس ہوا۔

"کل رات ایک عجیب بات ہوئی،" اس نے یاد کیا۔

کلوتیلدے کو یقیناً خوشبو نہیں آئی تھی۔ اس کی نیند اس گہری تھی کہ اسے اپنے

خواب بھی یاد نہ رہتے تھے۔

"گلابوں کی خوشبو تھی،" توبیاس نے کہا، "اور مجھے یقین ہے کہ سمندر سے آ رہی تھی۔"

"مجھے نہیں پتا گلابوں کی خوشبو کیسی ہوتی ہے،" کلوتیلدے نے کہا۔

یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہو۔ قصبہ بالکل بنجر تھا۔ اس کی پتھریلی زمین شورے سے کٹی ہوئی تھی، اور کبھی کبھار ہی کوئی باہر سے گل دستہ لے کر آتا کہ سمندر میں ڈال دے جہاں وہ اپنے مُردے پھینکا کرتے تھے۔

"یہ وہی خوشبو ہے جو گواکامایال کے اُس ڈوبے ہوئے آدمی سے آتی تھی،" توبیاس نے کہا۔

"اچھا!" کلوتیلدے مسکراتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ اچھی خوشبو ہے تو پھر سمجھ لو کہ اِس سمندر سے نہیں آ سکتی۔"

یہ سمندر واقعی بےحد سفّاک تھا۔ بعض دنوں میں، جب مچھیروں کے جال میں بہتے ہوئے خس و خاشاک کے سوا کچھ نہ آتا، تب بھی پانی اترنے کے بعد قصبے کی سڑکیں مُردہ مچھلیوں سے بھر جاتیں۔ بارود لگانے سے یہ حاصل ہوتا کہ پرانے غرقاب جہازوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، سطح تک اٹھ آتے۔

قصبے میں کلوتیلدے کی طرح جو چند عورتیں باقی رہ گئی تھیں، وہ تلخی کے مارے کھول رہی تھیں۔ اور، اسی کی طرح، بوڑھے یاکوب کی بیوی تھی، جو اس صبح اپنے معمول سے پہلے اٹھ گئی، گھر کی چیزیں ترتیب سے رکھیں اور ناشتے کی میز پر مخاصمانہ چہرہ لیے بیٹھ گئی۔

"میری آخری خواہش،" اس نے اپنے شوہر سے کہا، "یہ ہے کہ مجھے زندہ دفن کر دیا جائے۔"

اس نے یہ بات اس طرح کہی جیسے وہ بسترِمرگ پر پڑی ہو، حالاں کہ وہ کھانے کے کمرے میں میز پر بیٹھی تھی، جہاں مارچ کی چمکیلی دھوپ کھڑکیوں میں سے اندر آتی ہوئی پورے گھر میں بھر رہی تھی۔ جو شخص اس کے سامنے بیٹھا اپنی پُرسکون بھوک مٹا رہا تھا، بوڑھا یاکوب تھا، جس نے اس سے اتنی محبت کی تھی، اور اتنے طویل عرصے سے کیے جا رہا تھا، کہ اسے کوئی ایسا دکھ ذرہ یاد نہ رہتا تھا جس کا آغاز اس کی بیوی سے نہ ہوا ہو۔

"میں اس یقین کے ساتھ مرنا چاہتی ہوں کہ مجھے معقول لوگوں کی طرح سے زمین میں دفن کیا جائے گا،" وہ کہتی رہی، "اور اس یقین کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں گھر گھر جا کر لوگوں سے کہوں کہ مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے زندہ دفن کر دو۔"

"تمھیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں،" بوڑھے یاکوب نے تمام تر سکونِ قلب کے ساتھ کہا، "میں خود تمھیں گاڑ آؤں گا۔"

"تو پھر چلو، چلیں،" وہ بولی، "کیوں کہ میں جلد ہی مر جاؤں گی۔"

بوڑھے یاکوب نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں وہ واحد شے تھیں جن میں ابھی تک جوانی کی رمق باقی تھی۔ اس کے جوڑوں کی ہڈیوں میں گانٹھیں پڑ گئی تھیں اور اس کے چہرے پر بل چلے ہوئے کھیت کا وہ تاثر تھا جو سچ پوچھیں تو اس پر ہمیشہ سے طاری تھا۔

"تم پہلے سے زیادہ ٹھیک لگ رہی ہو۔"

"کل رات مجھے گلابوں کی خوشبو آئی،" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"اس پر قطعی دھیان نہ دو،" بوڑھے یاکوب نے اسے تسلّی دینے کے لیے کہا۔ "ایسی چیزیں تو

ہم غریبوں کے ساتھ روز ہوتی رہتی ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں،" وہ بولی، "میں نے ہمیشہ یہ دعا مانگی ہے کہ مجھے پہلے سے معلوم ہو جائے کہ میری موت کب آنے والی ہے تاکہ میں سمندر سے دور جا کر مروں۔ اس قصبے میں گلابوں کی خوشبو خدا کا پیغام ہی ہو سکتی ہے۔"

بوڑھا یاکوب بس یہی سوچ سکا کہ اس سے چیزیں ٹھیک سے رکھنے کے لیے کچھ مہلت مانگ لے۔ اس نے سُنا تھا کہ لوگ اس وقت نہیں مرتے جب انھیں مرنا چاہیے بلکہ اس وقت مرتے ہیں جب وہ مرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ اپنی بیوی کی پیش گوئی سے بہت پریشان ہو گیا۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ وہ لمحہ آیا تو کیا وہ اسے زندہ دفن کر سکے گا؟

نو بجے کے قریب اس نے وہ جگہ کھولی جہاں اس کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اس نے دو کرسیاں ڈالیں اور چھوٹی سی میز پر بساط بچھا کر دروازے کے پاس رکھ لی اور تمام صبح یہ کرتا رہا کہ جو بھی وہاں سے گزرتا اس سے ایک بازی کھیل لیتا۔ اپنے گھر میں بیٹھ کر اس نے کھنڈراتے ہوئے تباہ حال قصبے کو دیکھا جس میں ان گذشتہ رنگوں کے آثار باقی تھے جنھیں اب دھوپ نے اور سڑک کے آگے بہتے سمندر نے چبا ڈالا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے وہ ہمیشہ کی طرح ڈون ماکسیمو گومیز کے ساتھ کھیلنے بیٹھا۔ بوڑھے یاکوب کو اس شخص سے زیادہ نرم خُو حریف نہیں مل سکتا تھا جو دو خانہ جنگیوں سے زندہ سلامت، اور تیسری میں ایک آنکھ گنوا کر بچ نکلا تھا۔ ایک بازی جان بوجھ کر ہارنے کے بعد بوڑھے یاکوب نے اسے دوسری کے لیے روک لیا۔

"ایک بات بتاؤ، ڈون ماکسیمو،" تب اس نے پوچھا۔ "کیا تم اپنی بیوی کو زندہ دفن کرنے کا بُوتا رکھتے ہو؟"

"یقیناً،" ڈون ماکسیمو گومیز نے جواب دیا۔ "اور میں جو کہہ رہا ہوں اس کا اعتبار کر لو کہ اس وقت میرا ہاتھ ذرا سا بھی نہ کانپے گا۔"

بوڑھا یاکوب حیرت زدہ خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اپنی بہترین گوٹیں گنوا بیٹھنے کے بعد، اس نے ٹھنڈی سانس بھری:

"اچھا، مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ پیٹرا مرنے والی ہے۔"

ڈون ماکسیمو گومیز کے چہرے کا تاثر ذرا نہیں بدلا۔ "تو پھر،" اس نے کہا، "اسے زندہ دفن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے دو گوٹیں اور پیٹ لیں اور ایک کو بادشاہ بنا دیا۔ پھر اداسی کی نمی سے بھیگی آنکھیں اپنے مدِّ مقابل پر جما دیں۔

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"کل رات،" بوڑھا یاکوب سمجھانے لگا، "اسے گلابوں کی خوشبو آئی۔"

"تب تو آدھا قصبہ مرنے والا ہے،" ڈون ماکسیمو گومیز نے کہا۔ "صبح سے سب یہی بات کر رہے ہیں۔"

بوڑھے یاکوب کے لیے دشوار تھا کہ اسے ناراض کیے بغیر ایک بازی اور ہار جائے۔ وہ میز اور کرسیاں اندر اٹھا لایا، دکان بند کی، اور سارے قصبے میں گھوم کر ان لوگوں کو ڈھونڈتا پھرا جنھوں نے یہ خوشبو سونگھی تھی۔ آخر میں جا کر صرف توبیاس ہی ملا جسے خوشبو کا

پہنچی تھی۔ سو بوڑھے یاکوب نے اس سے درخواست کی کہ مہربانی کر کے اس کے گھر کی طرف سے ہوتا جائے جیسے اتفاقاً وہاں سے گزر رہا ہو، اور اس کی بیوی کو یہ حال سنائے۔

ٹوبیاس نے یہی کیا۔ چار بجے کے قریب، اپنا اتوار والا بہترین لباس پہنے ہوئے، وہ وہاں نمودار ہوا جہاں بوڑھی عورت دوپہر سے بیٹھی بوڑھے یاکوب کے لیے رنڈسالے کا جوڑا تیار کر رہی تھی۔

وہ اتنی خاموشی سے داخل ہوا کہ بڑھیا سہم گئی۔

"خدا کی پناہ،" اس نے کہا، "میں سمجھی موت کا فرشتہ آ گیا۔"

"اب تو دیکھ لیں کہ موت کا فرشتہ نہیں ہوں،" ٹوبیاس نے کہا۔ "بلکہ یہ میں ہوں۔ اور میں تمہیں کچھ بتانے آیا ہوں۔"

اس نے عینک سنبھالی اور دوبارہ سلائی میں جٹ گئی۔

"مجھے پتا ہے کیا بات ہے،" وہ بولی۔

"شرط لگ لو تمہیں نہیں پتا،" ٹوبیاس نے کہا۔

"تمہیں کل رات گلابوں کی خوشبو آئی تھی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" ٹوبیاس نے دکھی ہوتی آواز میں پوچھا۔

"میری جیسی عمر میں،" وہ بولی، "سوچنے کے لیے اتنا وقت بچ رہتا ہے کہ آدمی اچھا خاصا پیغمبر ہو سکتا ہے۔"

یاکوب جو دکان کے پچھواڑے دیوار سے کان لگائے کھڑا تھا، شرمندہ ہو گیا۔

"ارے عورت، دیکھو تو،" وہ دیوار کے پیچھے سے چلایا۔ پھر مڑ کر برساتی میں آ گیا۔ "دیکھ لیا، تم جو سوچ رہی تھیں وہ نہیں نکلا۔"

"یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے،" وہ سر اٹھائے بغیر بولی۔ "اسے کوئی خوشبو نہیں آئی تھی۔"

"یہ کوئی رات دس بجے کی بات ہوگی،" ٹوبیاس نے کہا۔ "میں کیکڑے بھگا رہا تھا۔"

عورت نے گریبان ترپ کر سی دیا۔

"جھوٹ،" وہ مصر رہی۔ "سب کو پتا ہے تم بہت چالاک ہو۔" اس نے پہلے دانتوں سے دھاگہ توڑا اور عینک کے شیشوں میں سے ٹوبیاس کو گھورنے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے بالوں میں تیل چپڑ کر اور جوتے چمکا کر یہاں آنے کی زحمت صرف میری بے عزتی کرنے کے لیے کیوں اٹھائی۔"

اس وقت سے ٹوبیاس سمندر پر نظر رکھنے لگا۔ اس نے اپنا جھولنا آنگن کے پاس برساتی میں ٹانگ لیا اور ساری رات انتظار کرتا اور حیران ہوتا رہا کہ جب لوگ سو جاتے ہیں تو دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ کئی راتوں تک وہ کیکڑوں کی مایوسانہ کھرکھراہٹ سنتا رہا کہ وہ پنجوں کے بل مکانوں کی بنیادوں پر چڑھنے کی جدوجہد کر رہے تھے یہاں تک کہ اتنی راتیں بیت گئیں کہ وہ کوشش کرتے کرتے ہار گئے۔ وہ کلوریندے کے سونے کا طریقہ جان گیا۔ اسے پتا چلا کہ اس کے سریلے خراٹے کس طرح گرمی کی بڑھتی ہوئی شدت کے ساتھ اونچے ہوتے جاتے، یہاں تک کہ جولائی کی گرم راتوں میں مکمل طور پر ایک سوئی ہوئی مدھم دھن سی بن جاتے۔

ٹوبیاس نے پہلے پہل سمندر پر اس طرح نظر رکھی جیسے وہ لوگ رکھتے ہیں جو سمندر

کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور افق کے ایک مخصوص نقطے پر نظریں جمائے رہتے ہیں۔ وہ سمندر کو رنگ بدلتے دیکھتا رہا۔ وہ دیکھتا رہا کہ سمندر اپنی روشنیاں گل کر رہا ہے، جھاگوں بھرا اور غلیظ ہوا جا رہا ہے اور جب تند خو طوفانِ بادوباراں اس کا پاسہ پلٹ دیتے تو وہ کچرے سے بھری الٹیاں کرنے لگتا۔ دھیرے دھیرے اس نے ان لوگوں کی طرح نظر رکھنا سیکھ لیا جو سمندر کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن اسے سوتے میں بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

بوڑھے یاکوب کی بیوی اگست میں مر گئی۔ اس کا سوتے میں دم نکل گیا اور لوگوں کو اسے باقی تمام مردوں کی طرح پھولوں سے عاری سمندر میں پھینکنا پڑا۔ ٹوبیاس انتظار کرتا رہا۔ وہ اتنے عرصے سے انتظار کر رہا تھا کہ انتظار کرنا اس کے جینے کا ڈھنگ بنتا جا رہا تھا۔ ایک رات وہ اپنے جھولنے میں پڑا اونگھ رہا تھا تو اسے احساس ہوا کہ ہوا بدل گئی ہے۔ وقفے وقفے سے ایک موج سی تھی، اس وقت کی طرح جب ایک جاپانی جہاز نے [illegible] کے لیے سڑی ہوئی پیاز کا لدا کارگو بندرگاہ کے دہانے پر پھینک دیا تھا۔ پھر بو گاڑھی ہوتی گئی اور صبح تک ہوا میں ٹھہر گئی۔ جب اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اسے ہاتھوں سے چھو سکتا ہے اور دوسروں کو دکھا سکتا ہے، تبھی وہ اپنے جھولنے میں سے باہر نکلا اور کلوریندے کے کمرے میں گیا۔ اس نے کلوریندے کو جھنجھوڑا۔

"یہ رہی،" اس نے اسے بتایا۔

کلوریندے کو یہ بو مکڑی کے جالے کی طرح ہاتھ سے ہٹانی پڑی۔ تب وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وہ نیم گرم چادروں پر ڈھیر ہو گئی۔

"خدا کی مار اس پر،" وہ بولی۔

ٹوبیاس دروازے کی طرف لپک کر گلی میں آیا اور چیخنے لگا۔ [illegible] زور سے سانس لیا اور پھر چیخا، اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے [illegible] سمندر پر خوشبو چھائی رہی لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر وہ گھر گھر [illegible] پھرا، ان مکانوں کے بھی جن کے مکین [illegible] یہاں تک کہ اس کا واویلا کتوں کے رونے میں خلط ملط ہو گیا اور اس نے سب کو جگا دیا۔

بہت سے لوگ کچھ نہ سونگھ پائے۔ مگر باقی لوگ، خاص طور پر بوڑھے، [illegible] اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ساحل پر جمع ہو گئے۔ [illegible] اور خوشبو [illegible] بعض لوگ سونگھ سونگھ کر تھک گئے اور گھر چلے گئے۔ زیادہ تر لوگ [illegible] ساحل پر ٹھہر گئے۔ صبح ہونے تک خوشبو میں اس قدر نکھار آ گیا تھا کہ سانس لینے میں [illegible]

[illegible] کلوریندے [illegible] کے وقت [illegible] اور [illegible] دوپہر [illegible] کی طرح [illegible] خرگوشوں کی طرح [illegible] کی طرح [illegible] اور پھر سے اندھیرا ہو گیا [illegible] گلابوں کا [illegible] موسیقی کی [illegible]

"کاتارینو کے ہاں سے آ رہی ہے،" کلوتیلدے نے کہا، "کوئی آیا ہو گا قصبے میں۔"

ایک عورت اور تین مرد آئے تھے۔ کاتارینو نے یہ سوچ کر کہ شاید بعد میں اور لوگ آئیں، اپنا گراموفون ٹھیک کرنا چاہا۔ جب وہ یہ کام نہیں کر سکا تو اس نے پانچو اپاریسیدو سے کہا، جو ہر طرح کا کام کر لیا کرتا تھا، کیوں کہ کوئی چیز کبھی اس کی ملکیت نہیں رہی تھی، اور پھر اس کے پاس اوزاروں کا صندوق اور ہاتھوں میں پھرتی تھی۔

کاتارینو کا ٹھکانا لکڑی کی ایک الگ تھلگ عمارت میں تھا جو سمندر کے رخ پر تھی۔ اس میں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بنچیں اور چھوٹی میزیں بچھی تھیں، اور پیچھے کی طرف کئی کمرے شب بسری کے لیے تھے۔ پانچو کو کام کرتا دیکھتے، وہ عورت اور تینوں مرد شراب خانے میں بیٹھے خاموشی سے پیتے رہے، اور باری باری جمائیاں لیتے رہے۔

کئی دفعہ کی کوششوں کے بعد گراموفون بج اٹھا۔ جب لوگوں نے موسیقی کی دور سے آتی ہوئی مگر واضح آواز سنی تو باتیں بند کر دیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ہکابکا رہ گئے کہ اس وقت کہیں جا کر انھیں احساس ہوا کہ آخری بار جب انھوں نے موسیقی سنی تھی تب سے لے کر اب تک وہ کتنے بوڑھے ہو چکے ہیں۔

مونیاس کو تمام لوگ نو بجے کے بعد بھی جاگتے ہوئے ملے۔ وہ اپنے دروازوں کی دہلیز پر بیٹھے کاتارینو کے پرانے رکارڈ سن رہے تھے اور چہروں پر بچوں کے سے توکّل کا تاثر تھا گویا گرہن کو دیکھ رہے ہوں۔ ہر گیت پر انھیں کچھ نہ کچھ یاد آنے لگتا، وہ لوگ جو مر گئے، بہت لمبی بیماری سے اٹھ کر کھانا کھانے کا مزا یا کوئی کام جو برسوں پہلے انھیں اگلے دن کرنا تھا اور کبھی نہ کر پائے کیوں کہ اس کے بارے میں بھول چکے تھے۔

موسیقی گیارہ بجے کے قریب بند ہوئی۔ بہت سے لوگ، یہ سوچ کر کہ بارش ہو گی، جا کر سو گئے کیوں کہ سمندر پر گہرا بادل چھایا ہوا تھا۔ مگر بادل نیچے اتر آیا، کچھ دیر سطح سمندر پر تیرتا رہا، اور پھر پانی میں ڈوب گیا۔ اوپر بس ستارے رہ گئے۔ ذرا دیر میں ہوا قصبے سے باہر کی سمت چلی اور واپس آئی تو گلابوں کی خوشبو لیے ہوئے تھی۔

"دیکھا، میں نے تم سے کیا کہا تھا یاکوب!" دون ماکسیمو گومیز چلایا۔ "خوشبو ہمارے پاس لوٹ آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ ہر رات ہمارے ساتھ ہو گی۔"

"خدا نہ کرے،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔ "یہ خوشبو واحد چیز ہے جو میری زندگی میں اس وقت آئی ہے جب بہت دیر ہو چکی۔"

وہ دونوں موسیقی کے رکارڈوں پر کوئی توجہ دیے بغیر، خالی دکان میں بیٹھے کھیلتے رہے۔ ان کی یادیں اتنی قدیمی تھیں کہ ان کو جگانے کے لیے اتنے پرانے رکارڈ بھی نہیں تھے۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے چیزوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتا،" دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔ "اتنے برس خاک پھانکنے کے بعد اور پھول اگانے کی ذرا سی کھلی جگہ کے لیے اتنی عورتوں کی خواہش کرنے کے بعد، یہ عجیب بات نہیں کہ آدمی ایسی خوشبو سونگھنے لگے اور سے سچ بھی سمجھنے لگے۔"

"مگر ہم سب نے خود سے اپنی ناک سے سونگھا ہے،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،" دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔ "جنگ کے زمانے میں، جب انقلاب غارت ہو چکا تھا، تو ہم ایک جنرل کی اتنی شدید ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ ہم نے ڈیوک آف مارلبورو کو گوشت پوست کی حالت میں ظاہر ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، یاکوب۔"

آدھی رات بیت چکی تھی۔ اکیلے رہ جانے کے بعد یاکوب نے دکان بند کی اور لیمپ لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس کھڑکی میں سے، سمندر کی سرحد میں کھڑی وہ کھائی دکھائی دی جہاں سے لوگ اپنے مُردے سمندر میں پھینکا کرتے تھے۔

"پیترا!" اس نے دھیرے سے پکارا۔

وہ اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ اس لمحے وہ دوپہر کی چمک دار دھوپ میں تقریباً سطح پر بہتی ہوئی خلیج بنگال تک پہنچی تھی۔ اس نے ایک بڑے سے بحری جہاز کو دیکھنے کے لیے اپنا سر پانی سے یوں اٹھایا جیسے روشنی سے جگمگ کرتے شوکیس میں جھانک رہی ہو۔ مگر وہ اپنے شوہر کو نہیں دیکھ سکی جسے اس لمحے دنیا کے دوسرے سرے پر دوبارہ کاتارینو کے گراموفون کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"ذرا سوچو،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔ "صرف چھ مہینے پہلے یہ لوگ تمھیں پاگل سمجھتے تھے اور اب خود اسی خوشبو کا میلہ لگا رہے ہیں جو تمھارے لیے موت کا پیغام تھی۔"

اس نے بتّی بجھا دی اور بستر میں لیٹ گیا۔ وہ اس بھونڈے انداز میں دریا کر دھیرے دھیرے رونے لگا جو بوڑھوں سے مخصوص ہے، لیکن جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

"میں اس قصبے سے اگر نکل سکتا تو نکل جاتا،" وہ کروٹیں لیتے میں سسکیاں بھرتا رہا۔ "میں سیدھا جہنّم چلا جاتا، یا کہیں بھی اور، بس اگر میرے پاس بیس پیسو جمع ہو جاتے۔"

اس رات کے بعد متواتر کئی ہفتوں تک خوشبو سمندر پر طاری رہی۔ خوشبو مکانوں کی لکڑی میں بس گئی؛ غذا میں، پینے کے پانی میں، کہیں اس سے مفر نہیں تھا۔ کئی لوگ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے کہ یہ خوشبو ان کے فُضلے کی ایخارات میں موجود تھی۔ وہ تین مرد اور ایک عورت جو کاتارینو کے ہاں آئے ہوئے تھے ایک جمعے کو چلے گئے، لیکن ہفتے کو پورا ایک مجمع ساتھ لے کر پھر واپس آ گئے۔ اتوار کے دن اور لوگ آ گئے۔ وہ ہر جگہ اندر باہر آ جا رہے تھے، چیونٹیوں کی طرح، اور کھانا اور سونے کی جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے، یہاں تک کہ گلیوں میں چلنا ناممکن ہو گیا۔

اور لوگ آنے لگے۔ وہ عورتیں جو قصبے کے مُردہ پڑ جانے کے بعد چلی گئی تھیں، کاتارینو کے ہاں لوٹ آئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ فربہ ہو گئی تھیں، زیادہ سنگھار کیے ہوئے تھیں، اور تازہ ترین گیتوں کے رکارڈ لے کر آئی تھیں، جنھیں سن کر کسی کو کوئی پرانی بات یاد نہ آتی تھی۔ قصبے کے بعض پرانے باشندے واپس آ گئے، جو غلاظت کی حد تک دولت مند ہونے کہیں اور چلے گئے تھے، اور واپس آ کر اپنی اپنی جمع پونجی کی باتیں کرنے لگے، مگر کپڑے وہی پہنے ہوئے تھے جو پہن کر یہاں سے گئے تھے۔ سازندے اور کھیل تماشے آنے لگے، قسمت کے چکر، تقدیر کا حال بتانے والے اور بندوق باز اور گردن پر موٹے موٹے سانپ لپیٹے ہوئے سپیرے جو بوتلوں میں آبِ حیات بیچ رہے تھے۔ ہفتوں ان کی آمد کا سلسلہ رہا، موسم کی پہلی بارشوں

کے بعد بھی جب سمندر ہموار ہو گیا اور خوشبو غائب ہو گئی۔

ایک پادری [illegible] میں تھا۔ وہ سارے میں پھرتا پھرا، ہنگی کافی میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا، اور ایک ایک کر کے اس نے ہر چیز کو جو اس کے سامنے تھی، حلال شروع کر دیے اور [illegible] لگاتار ان کی [illegible] اور اس پر [illegible] کی گئی۔ اور ساحل پر [illegible] ایک شام، [illegible] کے گھر، اس نے سمندر کی خوشبو کے موضوع پر ایک وعظ کیا۔

"شکر ادا کرو میرے بچو" اس نے کہا "کہ یہ خدا کی خوشبو ہے۔"

[illegible]

"[illegible] سونگھ سکتے نہیں۔"

[illegible] "خوشبو کے [illegible] میں بہت وسیع ہے۔ [illegible] خدا کی [illegible]

[illegible] وہ خوش [illegible]

[illegible]

[illegible] اور یہ سوچ کر کہ وہ [illegible] بہت سا روپیا جیب [illegible] بہت [illegible] سمجھنے لگے۔ مگر بعد [illegible] انھوں نے یہ نہیں [illegible] کہ وہ [illegible] کو سکتی تھی۔

[illegible] جب مسٹر ہربرٹ [illegible] وہ [illegible] کی سیڑھیوں [illegible] اور [illegible] بھرے ہوئے تھے۔ [illegible] زیادہ [illegible] ہی نہیں [illegible] ہو سکتی تھی۔ جب مسٹر ہربرٹ نے [illegible] شروع کر دی

[illegible]

[illegible] کو [illegible] کی [illegible]

[illegible] کا راستہ دے

دیا۔

"بلکہ" مسٹر ہربرٹ نے کہا، "ہمارے یہ بہترین دوست خود ہمیں یہ موقع فراہم کریں گے کہ یہ لوگوں کو دولت کی تقسیم کا سب سے زیادہ منصفانہ طریقہ سمجھتے ہیں۔" انھوں نے ہاتھ اگے بڑھایا اور اس آدمی کو اوپر بلا لیا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"پیتریچیو۔"

"اچھا تو پیتریچیو" مسٹر ہربرٹ نے کہا "سب لوگ [illegible] ہے جو تم بہت دیر سے حل نہیں کر پا رہے ہو۔"

اس نے ٹوپی اتار دی اور اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا مشکل ہے؟"

"میری مشکل یہ ہے" پیتریچیو نے کہا، "کہ میرے پاس پیسے [illegible] نہیں ہے"

"تمھیں کتنے کی ضرورت ہے؟"

"اڑتالیس پیسو۔"

مسٹر ہربرٹ نے فاتحانہ نعرہ مارا "اڑتالیس پیسو!" انھوں نے دہرایا۔ مجمع تالیاں بجانے میں ان کا ساتھ دینے لگا۔

"بہت خوب پیتریچیو" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "اب ہمیں [illegible] کر سکتے ہو۔"

"بہت سی چیزیں۔"

"ایک کا انتخاب کر لو" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "جو تم سب سے اچھی طرح کر سکتے ہو۔"

"اچھا" پیتریچیو بولا۔ "چڑیاں۔"

مسٹر ہربرٹ نے ایک بار پھر [illegible] کے ڈونگرے برسائے اور مجمعے کی طرف رخ پھیرا۔

"اچھا تو خواتین و حضرات، ہمارے دوست پیتریچیو جو پرندوں کی نقل اتارنے کا کام غیرمعمولی مہارت سے کرتے ہیں، اس وقت اڑتالیس مختلف پرندوں کی نقل اتاریں گے اور اس طرح اپنی زندگی کی مشکل آسان کر لیں گے۔"

[illegible] مجمعے کی حیرت [illegible] خاموشی کے سامنے پیتریچیو چڑیاں بن کر کبھی [illegible] بجاتا کبھی [illegible] اس نے تمام جانے پہچانے پرندوں کی نقل اتاری اور پھر [illegible] اور ایسی نکال کر یہ تعداد مکمل کی جنھیں کوئی نہ پہچان سکا۔ جب وہ یہ کام کر چکا تو مسٹر ہربرٹ نے مجمعے سے تالیاں بجانے کو کہا اور اڑتالیس پیسو اس کے حوالے کر دیے۔

"اور اب" وہ بولے "ایک ایک کر کے آتے جاؤ۔ میں کل اسی وقت تک یہاں لوگوں کی مشکلیں آسان کرتا رہوں گا۔"

بوڑھے جیکوب کو اس شور شرابے کا [illegible] کے سامنے سے گزرنے والوں کی بات چیت سے ہر فقرے کے ساتھ اس کا ڈر بڑھتا گیا یہاں تک کہ اسے لگا بہت حد [illegible]

"تمھارا کیا خیال ہے اس گریگو کے بارے میں؟" اس نے پوچھا۔

دون ماکسیمو گومیز نے کندھے اچکا دیے۔ "کوئی سخی سیٹھ ہو گا۔"

"کاش میں بھی کچھ کر سکتا" بوڑھا یاکوب بولا۔ "میں بھی اپنی چھوٹی سی مشکل آسان کر لیتا۔ زیادہ نہیں، صرف بیس پیسو۔"

"تم گوٹیں اچھی کھیل سکتے ہو" دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔

بظاہر یوں لگا کہ بوڑھے یاکوب نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی، لیکن اکیلا ہوتے ہی اس نے گوٹوں کا ڈبہ اور بساط اخبار میں لپیٹی، اور مسٹر ہربرٹ کو مقابلے کی دعوت دینے چل دیا۔ وہ آدھی رات تک اپنی باری کا انتظار کرتا رہا۔ آخرکار مسٹر ہربرٹ نے اپنے صندوق بند کروا دیے اور اگلی صبح تک کے لیے خدا حافظ کہہ دیا۔

وہ سونے کے لیے نہیں گئے۔ وہ ساتھ میں صندوق اٹھانے والوں کو لیے کاتارینو کے ہاں پہنچ گئے اور مجمع سارے راستے ان کے پیچھے پیچھے اپنی مشکلیں لیے چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ ان کی مشکلیں حل کرتے گئے اور انھوں نے اتنی مشکلیں آسان کیں کہ آخر میں دکان کے اندر صرف عورتیں اور چند مرد رہ گئے تھے اور ان کی بھی مشکلیں آسان ہو چکی تھیں۔ اور کمرے کے پچھلے حصے میں ایک تنہا عورت گتے کے اشتہار سے اپنے آپ کو دھیرے دھیرے پنکھا جھل رہی تھی۔

"اور تم" مسٹر ہربرٹ نے چلا کر اس سے پوچھا۔ "تمھاری کیا مشکل ہے؟"

عورت نے پنکھا جھلنا بند کر دیا۔

"مجھے اپنے تماشے میں پھانسنے کی کوشش نہ کرو مسٹر گرینگو" وہ کمرے کے دوسرے سرے سے چلائی۔ "میری کسی قسم کی کوئی مشکل نہیں ہے، اور میں رنڈی ہوں کیونکہ میرے پیڑو کی سج سہت بیر ہے۔"

مسٹر ہربرٹ نے کندھے اچکا دیے۔ وہ اپنے کھلے صندوق کے ساتھ بیٹھے ٹھنڈی بیئر پیتے رہے اور اور مشکلوں کا انتظار کرتے رہے۔ انھیں پسینہ آ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ایک عورت ان لوگوں سے کٹ کر آ گئی جو اس کی ساتھ میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور دھیمی آواز میں ان سے کچھ کہنے لگی۔ اسے پانچ سو پیسو کی مشکل تھی۔

"تم اس کا حساب کیسے کرو گی؟"

"پانچ کر کے"

"ذرا سوچو" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "یہ سو آدمی ہو گئے۔"

"کوئی بات نہیں" وہ بولی۔ "اگر مجھے یہ پوری رقم مل جائے تو یہ میری زندگی کے آخری سو مرد ہوں گے۔"

مسٹر ہربرٹ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ کافی نوعمر تھی۔ اس کی ہڈیاں نرم تھیں مگر آنکھوں میں سیدھا سادا عزم جھلک رہا تھا۔

"ٹھیک ہے" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "اپنے کمرے میں چلی جاؤ اور میں تمھارے پاس آدمی بھیجنا شروع کرتا ہوں، ہر ایک تمھیں پانچ پیسو دے گا۔"

وہ گلی میں آئی اور گھنٹی بجانے لگی۔

صبح چھ بجے توبیاس کو کاتارینو کی دکان کھلی ہوئی ملی۔ ساری بتیاں بجھی ہوئی

تھیں۔ مسٹر ہربرٹ، نیند میں ڈوبے ہوئے اور بیئر سے پھولے ہوئے، لڑکی کے کمرے میں مردوں کے داخلے کی نگرانی کر رہے تھے۔

توبیاس اندر چلا گیا۔ لڑکی نے اسے پہچان لیا اور اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "تم بھی؟"

"انھوں نے مجھ سے کہا کہ اندر چلے جاؤ" توبیاس بولا۔ "مجھے پانچ پیسو دیے اور کہا کہ زیادہ دیر نہ لگانا۔"

لڑکی نے بستر پر سے گیلی چادر اتاری اور توبیاس سے کہا کہ دوسرا سرا پکڑ لے۔ چادر ترپال کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ وہ اس کے دونوں سرے مروڑ کر اسے نچوڑنے لگے یہاں تک کہ وہ پہلے کی طرح ہلکی ہو گئی۔ پھر انھوں نے گدا پلٹا اور گدے کی دوسری طرف سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ توبیاس جو کچھ کر سکتا تھا اس نے کیا۔ جاتے وقت اس نے پانچ پیسو نوٹوں کے اس ڈھیر پر رکھ دیے جو بستر کے پاس دھیرے دھیرے بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"جس جس کو بھیج سکتے ہو بھیج دو" مسٹر ہربرٹ نے اس سے کہا۔ "دیکھیں اگر یہ معاملہ دوپہر سے پہلے نپٹ جائے۔"

لڑکی نے دروازہ ذرا سا کھولا اور ٹھنڈی بیئر مانگی۔ اس وقت تک کئی لوگ منتظر کھڑے تھے۔

"کتنے اور رہ گئے؟" اس نے پوچھا۔

"تریسٹھ" مسٹر ہربرٹ نے جواب دیا۔

بوڑھا یاکوب تمام دن بغل میں ڈبا تھامے ان کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ اس کی باری کہیں رات گئے آئی اور اس نے اپنی مشکل بیان کر دی، اور مسٹر ہربرٹ اس کی بات مان گئے۔ انھوں نے دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز گلی میں بچھی ہوئی بڑی میز پر رکھ دیں اور بوڑھے یاکوب نے پہلی چال چلی۔ یہ آخری بازی تھی جس کی وہ پیش بندی کر سکا۔ وہ ہار گیا۔

"چالیس پیسو" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "اور اس دفعہ میں تمھیں دو چالوں سے مات دوں گا۔"

وہ پھر جیت گئے۔ ان کے ہاتھ گوٹوں پر ٹکتے ہوئے بھی نظر نہ آئے۔ پھر وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر، محض اپنے مدمقابل کی چالوں کا اندازہ لگا کر کھیلنے لگے اور پھر بھی جیت گئے۔ مجمع کھیل دیکھتے دیکھتے اکتا گیا۔ جب بوڑھے یاکوب نے ہار مانی تو اس وقت تک وہ کوئی پانچ ہزار سات سو بیالیس پیسو اور تیئس سینٹ کے برابر رقم کا مقروض ہو چکا تھا۔

ان کے چہرے کا تاثر ذرا نہیں بدلا۔ انھوں نے یہ رقم کاغذ کے پرزے پر لکھ لی، جو ان کی جیب میں پڑا ہوا تھا۔ پھر انھوں نے بساط تہ کی، گوٹیں ڈبے میں ڈالیں، اور ساری چیزیں اخبار میں لپیٹ لیں۔

"میرے ساتھ جو جی چاہے کرو" اس نے کہا، "مگر یہ چیزیں میرے پاس رہنے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمام زندگی محنت کر کے تمھارا ایک ایک سینٹ چکا دوں گا۔"

مسٹر ہربرٹ نے گھڑی دیکھی۔

"مجھے بہت افسوس ہے" وہ کہنے لگے۔ "تمھارے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔" وہ انتظار

کرتے رہے یہاں تک کہ انھیں یقین ہو گیا کہ ان کے حریف کو کوئی حل نہیں ملا۔ "تمھارے پاس داؤ پر لگانے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے؟"

"میری عزت۔"

"میرا مطلب ہے،" مسٹر ہربرٹ نے سمجھایا "کوئی ایسی چیز جس پر رنگ میں ڈوبا ہوا برش پھیرا جاتا ہو [illegible]"

[illegible]

کیا ہو رہا ہے۔"

"سب لوگ بکھر گئے،" پادری نے کہا۔ "زیادہ دن نہیں جاتے کہ قصبہ بالکل ویسا ہی ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ بس یہی ایک خبر ہے۔"

"لوگ پھر واپس آ جائیں گے جب سمندر سے گلابوں کی خوشبو آنے لگے گی،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔

"لیکن اس دوران ہمیں یہاں رہ جانے والوں کے فریب نظر کو کسی نہ کسی چیز سے برقرار رکھنا ہو گا،" پادری نے کہا۔ "یہ بہت ضروری ہے کہ ہم فوراً گرجا کی تعمیر شروع کر دیں۔"

"تو آپ اس لیے مسٹر ہربرٹ سے ملنے آئے ہیں،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔

"بالکل درست،" پادری نے کہا۔ "گرینگو دل کے بہت سخی ہوتے ہیں۔"

"تو پھر ذرا انتظار کیجیے، مقدس باپ،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔ "شاید وہ جاگ ہی جائیں۔"

وہ گوٹیں کھیلنے لگے۔ یہ بہت طویل اور پیچیدہ بازی تھی جو کئی دنوں تک چلتی رہی مگر مسٹر ہربرٹ سو کر نہ اٹھے۔

پادری مایوسی کے ہاتھوں الجھن میں پڑ گیا۔ وہ تانبے کی طشتری لیے گرجے کی تعمیر کے لیے چندہ مانگتا سارے میں پھرتا رہا لیکن اسے کوئی خاص رقم نہیں ملی۔ وہ اتنی بھیک مانگنے سے روز بروز پُرنور ہوا جا رہا تھا۔ اس کی ہڈیوں میں آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور ایک اتوار کو وہ زمین سے دو ہاتھ اوپر اٹھ گیا، مگر کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ پھر اس نے ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے ڈالے، دوسرے میں جمع کی ہوئی رقم ڈالی اور ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔

"وہ خوشبو واپس نہیں آئے گی،" اس نے ان دوستوں سے کہا جنھوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "تم لوگوں کو اس حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے کہ قصبہ گناہ میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

جب مسٹر ہربرٹ جاگے تو قصبہ ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔ بارش نے کوڑے کے ان ڈھیروں کو سڑا دیا تھا جو ہجوم گلیوں میں چھوڑ گیا تھا اور زمین ایک بار پھر بنجر اور اینٹ کی طرح سخت ہو گئی تھی۔

"میں بہت دیر سوتا رہا،" مسٹر ہربرٹ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"صدیوں تک،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔

"بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔"

"سب کی یہی حالت ہے،" بوڑھے یاکوب نے کہا۔ "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ساحل پر جائیں اور کیکڑوں کے لیے زمین کھودیں۔"

جب توبیاس کی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ زمین کھود رہے تھے اور ان کے منھ سے جھاگ نکل رہا تھا اور توبیاس کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ جب دولت مند لوگ فاقے میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہ بڑی حد تک غریبوں کی طرح لگنے لگتے ہیں۔ مسٹر ہربرٹ کو زیادہ کیکڑے نہیں ملے۔ رات پڑنے پر انھوں نے توبیاس کو کھانے کی چیزیں ڈھونڈنے کے لیے سمندر کی تہوں میں چلنے کی دعوت دی۔

"سنو،" توبیاس نے انھیں خبردار کیا، "صرف مُردوں کو معلوم ہے کہ وہاں گہرائی کے اندر

کیا ہے۔"

"سانس دانوں کو بھی پتا ہے۔" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "ڈوبے ہوئے لوگوں کے سمندر کی تہہ میں کچھوے ہیں جن کا گوشت بہت عمدہ ہوتا ہے۔ چلو، کپڑے اتارو اور چلتے ہیں۔"

وہ چلے گئے۔ پہلے پہل وہ سیدھے سیدھے تیرتے رہے، پھر بہت بہت گہرائیوں میں جہاں پہلے سورج کی روشنی ختم ہوئی اور پھر سمندر کی، اور چیزیں اپنی ہی روشنی میں نظر آنے لگیں۔ وہ ایک غرقاب گاؤں کے پاس سے گزرے جہاں مرد اور عورتیں گھوڑوں پر بیٹھے موسیقی کی تال پر گھوم رہے تھے۔ وہ ایک شان دار دن تھا اور برآمدوں میں شوخ رنگ پھول کھلے تھے۔

"گیارہ بجے صبح ڈوبا ہو ایک اتوار،" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "غالباً کوئی طغیانی آئی ہو گی۔"

توبیاس گاؤں کی طرف مڑنے لگا مگر مسٹر ہربرٹ نے اسے اشارہ کیا کہ پیچھے ہی پیچھے جانا ہے۔

وہاں گلاب ہیں۔" توبیاس بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ کلوتیلدے کو بھی پتا لگ جائے کہ گلاب کیسے ہوتے ہیں۔"

"تم یہاں کسی اور دن فرصت سے آ جانا۔" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "اس وقت تو میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔"

مسٹر ہربرٹ ہاتھوں اور بازوؤں کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے، آکٹوپس کی طرح نیچے جاتے رہے۔ توبیاس جو پوری کوشش کر رہا تھا کہ انھیں آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے، یہ سوچنے لگا کہ امیر آدمیوں کے تیرنے کا یہی طریقہ ہوتا ہو گا۔ رفتہ رفتہ وہ معمولی آفات کے سمندر کو پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے اور مردوں کے سمندر میں داخل ہو رہے تھے۔

وہاں اتنی بڑی تعداد میں مُردے تھے کہ توبیاس نے سوچا کہ میں نے دنیا میں اتنے آدمی کبھی نہیں دیکھے۔ سارے مُردے بےحس و حرکت بہتے چلے جا رہے تھے، چہرے اوپر کیے، مختلف سطحوں پر بہتے ہوئے، اور ان سب پر بھولی بسری ارواح کا تاثر تھا۔

"یہ سب بہت پرانے مُردے ہیں۔" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "انھیں صدیاں لگ گئیں تب جا کر سب موت کی اس حالت کو پہنچے۔"

اس سے اور نیچے، تازہ تر مُردوں کے پانیوں میں پہنچ کر مسٹر ہربرٹ رک گئے۔ توبیاس لمحے ان کے پاس آ کر رکا جب ایک بہت نوعمر عورت ان کے سامنے سے گزری۔ وہ پہلو کے بل تیر رہی تھی، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پیچھے پیچھے پھولوں کی موج تھی۔

مسٹر ہربرٹ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور اس وقت تک رکھے رہے جب تک کہ آخری پھول سامنے سے بہہ نہ گئے۔

"میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ حسین عورت نہیں دیکھی۔" انھوں نے کہا۔

یہ بوڑھے یاکوب کی بیوی ہے۔" توبیاس بولا۔ "اس کی عمر پچاس سال کم ہو گئی ہے، مگر یہ وہی ہے، مجھے یقین ہے۔"

... مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "اس کے پیچھے دنیا کے تمام سمندروں ... میں۔"

وہ تہہ تک پہنچ گئے۔ مسٹر ہربرٹ نے زمین پر دو تین چکر لگائے جو چمک دار چٹائی کی طرح لگ رہی تھی۔ توبیاس نے ان کی پیروی کی۔ جب وہ تہہ کی نیم روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو گیا تو اس نے دیکھا کہ اردگرد کچھوے ہی کچھوے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں، تہہ میں چپکے ہوئے اور اس قدر بےحس و حرکت کہ پتھرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"یہ زندہ ہیں۔" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "مگر یہ ہزاروں لاکھوں برس سے سو رہے ہیں۔"

انھوں نے ایک کچھوے کو پلٹا۔ ہولے سے اسے چھو کر اوپر کی طرف دھکیلا، اور سوتا ہوا حیوان ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اوپر کی طرف بہتا گیا۔ توبیاس نے اسے جانے دیا۔ پھر اس نے سطح سمندر کی طرف دیکھا اور اسے پورا سمندر الٹا نظر آیا۔

"یہ تو بالکل خواب کی طرح ہے۔" اس نے کہا۔

"تمھارے حق میں بہتر ہو گا کہ کسی کو اس کے بارے میں نہ بتاؤ۔" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "ذرا سوچو کہ دنیا میں کتنا انتشار برپا ہو جائے گا اگر لوگوں کو ان چیزوں کے بارے میں پتا چل گیا۔"

جب وہ واپس قصبے میں پہنچے تو رات آدھی بیت چکی تھی۔ انھوں نے کلوتیلدے کو جگایا کہ پانی ابال دے۔ مسٹر ہربرٹ نے کچھوے کا گوشت بنا دیا، مگر وہ تینوں ساتھ لگے تب جا کر کچھوے کے دل کا پیچھا کر کے اسے ایک بار پھر ہلاک کر سکے، جو اس وقت اچھل کر انگنی میں آ گیا جب وہ گوشت کے پارچے کاٹ رہے تھے۔ انھوں نے اتنا کھا لیا کہ ان سے سانس نہ لیا جاتا تھا۔

"اچھا توبیاس،" تب مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا ہے۔"

"بےشک۔"

"اور حقیقت یہ کہتی ہے،" مسٹر ہربرٹ بولے، "کہ خوشبو واپس نہیں آئے گی۔"

"ضرور آئے گی۔"

"نہیں آئے گی،" کلوتیلدے نے دخل دیا، "علاوہ اور وجوہات کے اس لیے بھی کہ خوشبو اصل میں آئی ہی نہیں تھی، یہ تم ہی تھے جس نے سب لوگوں میں ہنگامہ مچا دیا۔"

"تم نے خود بھی تو سونگھی تھی۔" توبیاس نے کہا۔

"میں اس رات مدہوش ہو رہی تھی،" کلوتیلدے بولی، "مگر اب، اس وقت، میں کسی بھی ایسی چیز کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی جس کا تعلق اس سمندر سے ہو۔"

"اچھا، تو میں اپنی راہ لوں،" مسٹر ہربرٹ بولے۔ پھر ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اور تمھیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ دنیا میں کرنے کے لیے اتنا کچھ ہے کہ تم یہاں پڑے بھوکے نہیں کر سکتے۔"

وہ چلے گئے۔ توبیاس انگنی میں بیٹھا افق کی آخری حدوں تک تارے گنتا رہا، اور اسے معلوم ہوا کہ پچھلے دسمبر کے مقابلے میں اس مرتبہ تین تارے زیادہ ہیں۔ کلوتیلدے نے اسے خواب گاہ میں بلایا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

"یہاں آؤ، مٹی کے مادھو۔" کلوتیلدے نے اصرار کیا۔ "کتنے سال گزر گئے ہم نے خرگوشوں کی طرح نہیں کیا۔"

[illegible] جب وہ اندر گئی تو وہ سو چکی تھی۔ اس نے [illegible] تھکی ہوئی تھی کہ وہ دونوں گزر گئے اور بس [illegible] کی طرح کر پائی۔

[illegible] کہ وہ کوئی اور چیز کہ ہے اور [illegible] نے اس شرط پر [illegible] کہ وہ [illegible] کا ذکر نہیں کرے گی۔ [illegible] نے وعدہ کر لیا۔

[illegible] میں چھوٹے چھوٹے [illegible]

[illegible] پھر سے شروع [illegible]

[illegible] اور سوچ کی کوشش [illegible] ٹکڑوں [illegible] چیز [illegible]

گبریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ : عطا صدیقی

بڑے بڑے پَروں والا ایک بوڑھا پھوس

(بچّوں کے لیے ایک کہانی)

لگاتار بارشوں کے تیسرے دن وہ اتنے بہت سے کیکڑے ٹھکانے لگا چکے تھے کہ پیلایو کو اپنے پانی بھرا صحن پار کر کے ان سب کو سمندر میں پھینکنے کے لیے جانا پڑا۔ بات یہ تھی کہ نومولود بچّے کو تیز بخار تھا، اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کا سبب ان کی بساند ہے۔ منگل کے دن سے سارا عالم اداس اداس سا تھا۔ کیا سمندر اور کیا آسمان، سب ایک جیسے گدلے گدلے نظر آ رہے تھے، اور ساحل کی وہ ریت جو مارچ کی راتوں میں مثلِ افشاں کے جھلملایا کرتی تھی، اس وقت کیچڑ اور سڑے بسے گھونگوں کی گاد بن چکی تھی۔ عین دوپہر میں بھی روشنی اتنی کم کم تھی کہ پیلایو جب کیکڑے پھینک کر گھر واپس آ رہا تھا تو اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آخر وہ کیا شے ہے جو صحن کے پچھواڑے رینگ رہی ہے اور کراہ رہی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ایک بڈھا ہے، اسے اس کے بہت ہی قریب جانا پڑا۔ ایک بہت فرتوت جو منھ کے بل کیچڑ میں پڑا ہے اور سرتوڑ کوشش کے باوجود اپنے بڑے بڑے پَروں کی وجہ سے اٹھ نہیں پا رہا۔

اس کابوس سے دہشت زدہ ہو کر پیلایو اپنی بیوی ایلی سینڈا کو بلانے لپکا، جو کہ بیمار بچے کے ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھ رہی تھی، اور اس کو لے کر صحن کے پچھواڑے تک آیا۔ وہ دونوں زمین پر پڑے ہوئے اس جسم کو گم سم، پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ وہ چیتھڑوں بٹورنے والوں کا سا لباس پہنے تھا۔ اس کی سپاٹ چندیا پر چند گنے چنے بال رہ گئے تھے اور منھ میں دانت بھی اکادکا تھے، اور اس کی تربتر، سکڑداداؤں والی افسوس ناک حالت نے اس کی رہی سہی شان کو، جو اس میں کبھی ہو گی، خاک میں ملا دیا تھا۔ اس کے میلے، ادھ نُچے

بڑے بڑے، عقاب جیسے پنکھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ دونوں اس کو اتنی دیر تک اور اتنے غور سے دیکھا کیے کہ پیلایو اور ایلی سینڈا کی حیرانی دھیرے دھیرے جاتی رہی اور ہوتے ہوتے وہ ان کو مانوس سا لگنے لگا۔ تب انھوں نے اس سے بات کرنے کی ہمت کی، جس کا جواب اس نے ملاحوں کی سی بھاری آواز میں کسی اجنبی زبان میں دیا۔ یوں انھوں نے پروں والی دقّت کو نظرانداز کرتے ہوئے، اپنی دانست میں بڑی دانش مندی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ طوفان کے مارے کسی شکستہ فرنگی جہاز کا آخری بچ جانے والا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے پڑوس کی اُس عورت کو بلا لیا جو زندگی اور موت کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی، تاکہ وہ اس کا معائنہ کر لے۔ ان کے غلط اندازے کو جھٹلانے کے لیے اس عورت کا اس کو بس ایک نظر دیکھنا کافی تھا۔

"یہ تو فرشتہ ہے۔" اس نے ان کو بتایا۔ "وہ بچّے کے لیے آ رہا ہو گا، پر بے چارہ اتنا بوڑھا ہے کہ بارش نے راستے ہی میں ڈھیر کر دیا۔"

کلی دن سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ایک جیتا جاگتا فرشتہ پیلایو کے گھر میں بند ہے۔ پڑوس کی سیانی عورت کی رائے کے برخلاف، جس کا کہنا تھا کہ آج کل کے فرشتے دراصل ایک آسمانی سازش کے بعد بچ جانے والے بھگوڑے ہیں، ان کا دل نہ مانتا کہ وہ ڈنڈے مار مار کر اس کی جان نکال دیں۔ پیلایو ڈنڈا اُٹھائے سارا سہ پہر باورچی خانے میں بیٹھا اس کی نگرانی کرتا رہا، اور رات کو سونے سے قبل اس نے اسے کیچڑ میں سے گھسیٹا اور لے جا کر جالی دار دڑبے میں مرغیوں کے ساتھ بند کر دیا۔ آدھی رات گئے جس وقت بارش تھمی تو پیلایو اور ایلی سینڈا ابھی کیکڑے ہی مار رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بچّے کی آنکھ کھل گئی؛ اس کو بخار نہیں تھا اور وہ کچھ کھانے کو مانگ رہا تھا۔ تب ان کی دریادلی نے جوش مارا اور انھوں نے طے کر لیا کہ وہ فرشتے کو تازہ پانی اور تین دن کی رسد دے کر، ایک تختے پر سوار کرا کے، سمندر میں اس کی تقدیر پر چھوڑ آئیں گے۔ مگر جب وہ منھ اندھیرے صحن میں گئے تو کیا دیکھا کہ پورا محلّہ ٹولا دڑبے کے سامنے جمع، فرشتے کے ساتھ دل لگی بازی میں لگا ہے۔ وہ لوگ بولتی جالی میں سے کھانے کی چیزیں ذرا سے بھی ادب و احترام کے بغیر اس کی طرف اس طرح پھینک رہے تھے جیسے وہ کوئی علوی وجود نہ ہو بلکہ سرکس کا کوئی جانور ہو۔

اس عجیب و غریب خبر سے گھبرا کر پادری گونزاگا سات بجے سے پہلے پہلے ہی آ گئے۔ اس وقت تک صبح والوں سے ذرا کم شریر تماشائی بھی آ چکے تھے، اور قیدی کے مستقبل کے بارے میں جو منھ میں آ رہا تھا قیاس آرائی کر رہے تھے۔ ان میں سب سے بھولا خیال تھا کہ اس کو ساری دنیا کا میئر نامزد کر دیا جائے۔ ذرا زیادہ عقل کے بوڑھوں نے محسوس کیا کہ اس کو پنج ستاری جنرل ہونا چاہیے کہ ساری جنگیں فتح کر لے۔ چند خیال پرستوں نے اس یگانگی کا حسن سوچا کہ کیا نہیں یہ جا سکتا ہے کہ وہ روئے زمین پر پردار سپاہیوں کی ایک ایسی نسل پیدا کر دے جو پوری کائنات کا چارج سنبھال سکے۔ لیکن پادری گونزاگا پادری بننے سے پہلے ایک سوسمند لکڑہارے رہ چکے تھے۔ جالی کے پاس کھڑے کھڑے انھوں نے جھٹ پٹ علم دینیات کے تمام سوالات و جوابات کو دماغ میں تازہ کیا اور ان لوگوں سے کہا

کہ وہ دروازہ کھولیں تاکہ وہ قریب سے اس دکھیا آدمی کو دیکھیں جو حیران پریشان، مرغیوں کے درمیان خود ایک بڑی سی خستہ حال مرغی لگ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں پھلوں کے چھلکوں اور بچے کھچے ناشتے کی چیزوں کے درمیان، جو صبح کو آنے والے پھینک گئے تھے، پڑا اپنے پھیلے ہوئے پروں کو دھوپ میں سکھا رہا تھا۔ جس وقت پادری گونزاگا نے دڑبے میں داخل ہو کر لاطینی زبان میں صبح بخیر کہا تو اس نے دنیا کی گستاخیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بس اپنی عمررسیدہ نظریں اُٹھائیں اور اپنی بولی میں کچھ منمنایا۔ جب پادری گونزاگا نے دیکھا کہ نہ تو وہ خدا کی زبان جانتا ہے اور نہ اس کے خادموں کے استقبال کے طورطریقوں سے واقف ہے، تو ان کو پہلی بار اس پر جعلیا ہونے کا شبہ ہوا۔ پھر انھوں نے غور کیا کہ بہت قریب سے دیکھنے پر وہ بالکل آدمیوں جیسا تھا۔ اس کے پاس سے کھلے میں رہنے والوں کی سی ناقابل برداشت بُو آ رہی تھی، اس کے پروں میں جوئیں بجبجا رہی تھیں اور زمینی جولانی نے اس کے اصل پروں کا برا حشر کر دیا تھا؛ اور اس میں کوئی بات بھی تو ایسی نہیں تھی جو فرشتوں کے قابل فخر وقار کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ پھر وہ دڑبے میں سے باہر آئے اور ایک مختصر خطبے کے ذریعے متجسس نفوس کو سادہ لوحی کے خطرات سے خبردار کیا۔ انھوں نے ان کو یاد دلایا کہ شیطان کی ایک بری عادت کارنیوالی کرتبوں کا استعمال کرنا بھی ہے تاکہ غافلوں کو دھوکا دے سکے۔ انھوں نے دلیل پیش کی کہ اگر ہوائی جہاز اور عقاب میں فرق کرنے کے لیے پنکھ لازمی عنصر نہیں، تو فرشتوں کی پہچان کے لیے تو ان کی اہمیت اور بھی کم ہو گی۔ پھر بھی انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اسقف کو عریضہ روانہ کریں گے، تاکہ وہ اپنے اسقفِ اعظم کو اس بابت لکھیں، تاکہ وہ پاپائے روم کو لکھیں، اور یوں اعلیٰ ترین عدالت سے قول فیصل حاصل ہو جائے گا۔

ان کی دانش مندی چکنے گھڑوں پر ضائع گئی۔ اسیر فرشتے کی خبر اتنی تیزی سے پھیلی کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر صحن میں بازار کی سی چہل پہل ہو گئی اور سنگین بردار سپاہی بلوانے پڑے تاکہ اس مجمعے کو منتشر کریں جو کہ مکان کو تلپٹ کیے دے رہا تھا۔ ایلی سینڈا کو، جس کی کمر اتنا سارا بازاری گند جھاڑتے جھاڑتے دوہری ہو چکی تھی، یہ سوجھ گئی کہ صحن میں کٹہرا لگا دے اور فرشتے کو دیکھنے کے لیے پانچ پانچ سینٹ وصول کر لے۔ مشتاقانِ دید دور دور سے آنے لگے۔ ایک گشتی کارنیوال نے پھیرا لگایا؛ اس میں ایک اُڑان بھرنے والا نٹ مجمعے کے سروں پر باربار بھنبھناتا پھرا، مگر کسی نے اسے گھاس نہ ڈالی کیونکہ اس کے پَر فرشتوں کے مانند نہیں تھے بلکہ چمگادڑوں جیسے تھے۔ زمانے بھر کے بدنصیب ترین معذور لوگ تندرستی کی آس میں آنے لگے؛ ایک دکھیاری جو بچپن سے دل کی دھڑکنیں شمار کر رہی تھی اور گنتے گنتے جس کی گنتی ہی ختم ہو گئی تھی؛ ایک پرتگالی مرد جو اس لیے سو نہیں سکتا تھا کہ ستاروں کا شور اس کو تنگ کرتا تھا؛ ایک نیند میں چلنے والا جو راتوں کو اٹھ کر اپنے دن میں کیے ہوئے کام بگاڑا کرتا تھا؛ اور دوسرے بہت سارے جن کے مرض ان سے ذرا کم تشویش ناک تھے۔ پیروں تلے کی زمین ہلا دینے والی، ڈوبتے جہاز جیسی اس بڑبونگ کے بیچ پیلایو اور ایلی سینڈا اپنی تھکن میں بھی مگن تھے، کیونکہ ایک ہفتے سے بھی کم مدّت میں انھوں نے اپنا گھر رقم سے ٹھسا ٹھس بھر لیا تھا اور اب بھی اپنی باری کے منتظر زائرین کی

قطار افق کے اُس پار تک پہنچی ہوئی تھی۔

فرشتہ ہی فقط ایک واحد ہستی تھا جو خود اپنے تماشے میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا۔ حاجی کے نزدیک رکھے گئے تیل کے چراغوں اور عشائےربانی والی موم بتیوں کی جھجھی حدت سے چکرایا چکرایا سا، وہ اپنا وقت اپنے ٹھکانے کے ٹھکانے میں اپنی آسائش کی جستجو میں گزارتا۔ اوّل اوّل انھوں نے اس کو کپڑوں میں رکھنے والی گولیاں کھلانے کی کوشش کی، جو ہمسائی پڑوسن کے علم کے مطابق فرشتوں کی غذا تھی، لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا، بالکل اسی طرح جیسے اس نے پوپ کا وہ خاص کھانا سے انکار کر دیا تھا جو تائب لوگ لاتے تھے۔ وہ اتنا کبھی نہ جان سکے کہ اس کا سبب اس کا فرشتہ ہونا تھا یا یہ کہ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ وہ آخر کو وہ بینگن کے گودے کے سوا کچھ نہیں کھاتا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت ہی ایک اکیلی خارقِ عادت نظر آتی تھی، خاص کر ابتدائی ایام میں، جب مرغیاں ان ستاروں جوؤں کی تلاش میں جو اس کے پروں کے اندر بڑھتی چلی جا رہی تھیں ٹھونگیں مارا کرتیں، اور اپاہج لوگ اپنے ناقص اعضا سے چھوانے کے لیے اس کے پر نوچا کرتے، اور سب سے زیادہ مہربان لوگ تک اس کو کھڑا کرنے کی کوشش میں پتھر مار دیا کرتے تاکہ وہ اس کو کھڑے قد دیکھ سکیں۔ وہ صرف ایک بار اس کو اپنی جگہ سے ہلانے میں کامیاب ہو سکے تھے، جب انھوں نے بچھڑوں کو داغنے والے لوہے سے اس کے پہلو میں چرکا لگا دیا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ اتنے گھنٹوں سے بےحس وحرکت پڑا تھا کہ انھوں نے سوچا کہیں مر نہ گیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے بھرے اپنی جناتی زبان میں بلبلانے لگا اور جو ایک بار اپنے پر پھڑپھڑائے تو مرغیوں کی بیٹ اور قمری مٹی کا بگولا ناچنے لگا اور دہشت کا وہ جھکڑ چلا جو اس دنیا کا تو لگتا نہیں تھا۔ گو بہتوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ خفگی کا نہیں بلکہ تکلیف کا مظاہرہ تھا مگر اس دن کے بعد سے وہ سب احتیاط کرنے لگے کہ اس کو ناراض نہ کریں کیوں‌کہ اکثر لوگ سمجھ چکے تھے کہ اس کی معمولیت اُس سورما کی سی نہیں جو اگلے حملے کے لیے سستا رہا ہو، بلکہ کسی خوابیدہ فتنے کی سی ہے۔

قیدی کی اصلیت کے بارے میں قولِ فیصل آنے کے انتظار کے دوران پادری گونزاگا نے مجمعے کی شرارتوں کو خادماؤں کی سی سوجھ بوجھ والے چٹکلوں سے قابو میں رکھا۔ مگر روم کی ڈاک نے آنے میں‌کوئی عجلت نہ دکھائی؛ کبھی وہ لوگ یہ دیکھتے کہ اس کی ناف ہے یا نہیں، کبھی یہ سوچتے کہ اس کی بولی کا تعلق آرامی زبان سے تو نہیں، کبھی یہ کہ ایک سوئی کی کھڈی پر وہ کتنی مرتبہ سما سکتا ہے یا یہ کہ کہیں وہ محض کوئی پردار ناروےوالا نہ ہو ورنہ وہ لوگ اپنا وقت بتایا کرتے تھے۔ اگر رحمتِ خداوندی نے آڑے آ کر پادری کی زحمتوں کا خاتمہ نہ کر دیا ہوتا تو یہ مختصر سے عریضے قیامت تک آتے جاتے رہتے۔

ہوا یہ کہ انھی دنوں میں آنے والے بہت سے کھیل تماشوں میں ایک ایسی عورت کا گشتی تماشہ بھی آیا جس کو والدین کی نافرمانی کرنے پر مکڑی بنا دیا گیا تھا۔ اس کو دیکھنے کی قیمت نہ صرف یہ کہ فرشتے کی دید کی رقم سے کم تھی، بلکہ لوگوں کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ وہ اس کی مضحکہ خیز حالت کے بارے میں قسم قسم کے سوالات بھی پوچھ سکیں اور سر سے پیر تک اس کو چھو کر معائنہ بھی کر سکیں تاکہ کسی کو بھی اس ہولناک

حقیقت پر کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ وہ مینڈھے جتنی ایک ڈراونی تری تولا مکڑی تھی جس کا سر ایک غم زدہ دوشیزہ کا سا تھا۔ تاہم سب سے بڑھ کر دل ہلا دینے والی شے اس کی نامانوس ہیئت نہ تھی بلکہ وہ پرخلوص اندازِ بیان تھا جس میں وہ اپنی بپتا کی ایک ایک تفصیل سناتی تھی۔ ابھی وہ بالی ہی تھی کہ ایک بار ناچ رنگ میں حصہ لینے کے لیے گھر سے چھپ کر چپ چاپ نکل گئی تھی، اور جب وہ بغیر اجازت لیے ساری رات ناچ لینے کے بعد جنگل میں سے ہوتی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی تو ایک ہولناک کڑاکے نے آسمان کو دو کر دیا، اور شگاف میں سے لاوے کا برقی تیر سا لپکا جس نے اسے مکڑی بنا دیا۔ اس کا پیٹ فقط ان گولیوں سے بھرتا تھا جو سخی لوگ اس کے منھ میں ڈال دیتے تھے۔ ایک ایسے نظارے کو، جس میں اتنی انسانی سچائی بھری ہو اور اتنی خوف دلانے والی نصیحت ہو، کوشش کیے بغیر ہی ایک ایسے تنک چڑھے فرشتے کی نمائش پر غالب رہنا ہی تھا جو فانی انسانوں کی طرف آنکھ اٹھانا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ علاوہ ازیں جو تھوڑی بہت کرامات فرشتے سے منسوب کی گئیں ان میں بھی کچھ نہ کچھ عقل کا فتور نظر آیا، مثلاً وہ نابینا جس کو بینائی تو نہ ملی مگر تین نئے دانت نکل آئے، یا وہ مفلوج جو چل تو نہ سکا لیکن لاٹری تقریباً جیت لی، اور وہ کوڑھی جس کے زخموں کے اندر سے سورج مکھی پھوٹ نکلے۔ ان بہلانے والی کرامات کے سبب، جو کہ ہنسی دل لگی سے زیادہ کیا تھیں، فرشتے کی ساکھ گر تو چکی ہی تھی کہ مکڑی بن جانے والی عورت نے آ کر آخرکار اس کو بالکل ملیامیٹ کر دیا، اور یوں پادری گونزاگا کے بےخوابی کا روگ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاتا رہا، اور پیلایو کا آنگن بھی پھر سے اتنا ہی خالی رہنے لگا جتنا وہ اس تین دن کی بارشوں کے زمانے میں تھا جب کیکڑے کمروں میں رینگ کرتے تھے۔

گھر والوں کے لیے کڑھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جو رقم انھوں نے اس دوران جمع کر لی تھی اس سے انھوں نے چھجّوں اور پھلواریوں والی دومنزلہ حویلی کھڑی کر لی جس میں اونچی اونچی جالیاں لگائی گئی تھیں کہ جاڑوں میں کیکڑے نہ گھس آئیں۔ اور دریچوں میں لوہے کی سلاخیں لگوائی گئی تھیں کہ فرشتے اندر نہ آ جائیں۔ پیلایو نے بستی کےقریب ہی خرگوش پالنے کا کاروبار جما لیا اور بیلف کی نوکری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی اور ایلی سینڈا نے ساٹن کے اونچی ایڑی والے چند پمپ اور ست رنگی ریشم کی پوشاکیں خریدیں ویسی جو اس زمانے کی سی موہنی عورتیں اتوار کے دن زیب تن کیا کرتی تھیں۔ بس مرغیوں کا دڑبہ ہی ایک ایسی چیز تھا جس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ جو وہ کبھی کبھار اس کی دھلائی کریولین سے کر دیتے تھے اور اس کے اندر مُر اور لوبان سلگا دیتے تھے تو یہ کوئی فرشتے کی عقیدت میں نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد فضلے کی اس سڑاند سے پیچھا چھڑانا ہوتا تھا جو آسیب کی طرح ہر وقت لپٹی رہتی تھی اور ان کے نئے مکان کو بھی پرانا کیے دے رہی تھی۔ جب بچے نے چلنا سیکھ لیا تو پہلے پہل انھوں نے احتیاط کی کہ وہ دڑبے کے بہت نزدیک نہ جانے پائے پھر رفتہ رفتہ ان کا خوف دور ہوتا گیا، اور وہ بدبو کے عادی ہوتے گئے، اور دوسرا دانت نکلنے سے پہلے ہی بچہ کھیلنے کے لیے جہاں سے جالی ٹوٹ رہی تھی دڑبے میں گھس گیا۔ فرشتہ بچے سے بھی اتنا ہی لاتعلق رہا جتنا وہ دوسرے لوگوں سے رہتا تھا، مگر وہ اس کی نت نئی چھیڑخانیوں کو

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

اس کتے کے سے صبر سے برداشت کرتا رہتا جس کو کوئی خوش فہمیاں نہ ہوں۔ دونوں کو ایک ساتھ خسرہ نکل آئی۔ جس ڈاکٹر نے بچے کا علاج کیا وہ فرشتے کے دل کی دھڑکن سننے کے شوق کو دبا نہ سکا اور اس نے اس کے دل میں اس قدر سیٹیاں بجتی اور گردے میں اتنی آوازیں سنیں کہ اس کو فرشتے کا زندہ رہنا محال نظر آیا۔ پروں کی تک نے اس کو سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا۔ وہ مکمل انسانی بدن پر وہ اتنے فطری لگتے تھے کہ ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ آخر سب انسانوں کے جسم پر وہ کیوں نہیں ہوتے۔

جس وقت بچے نے اسکول جانا شروع کیا تو مرغی خانے کو دھوپ اور بارشوں کی وجہ سے تباہ ہوئے کچھ عرصہ گذر چکا تھا۔ فرشتہ ایک بھٹکتے ہوئے جاں بہ لب آدمی کی طرح یہاں وہاں گھسٹتا پھرتا تھا۔ وہ اسے جھاڑو مار مار کر خواب گاہ میں سے نکالتے تو پل بھر بعد وہ باورچی خانے میں نظر آتا۔ وہ بیک وقت اتنے مقامات پر نظر آنے لگا کہ وہ یہ سوچنے لگے کہ وہ ایک سے دو ہو گیا ہے، کہ وہ گھر بھر میں اپنی ہی نوع کو بڑھاتا پھر رہا ہے، اور بھنائی اور بولائی ہوئی ایلی سیندا چیخ پڑی کہ اس فرشتوں بھرے جہنم زار میں جینا دوبھر ہو گیا۔ وہ اب مشکل ہی سے کچھ کھاتا تھا، اور اس کی بوڑھی آنکھیں اتنی دھندلا گئی تھیں کہ وہ ستونوں سے ٹکراتا پھرتا تھا۔ اب اس کے پاس جھڑتے ہوئے آخری پروں کے ننگے سرے ہی رہ گئے تھے۔ پیلایو اس پر کمبل ڈال دیتا اور اتنا احسان اور کرتا کہ اس کو سائبان میں پڑ رہنے دیتا۔ اور تب ہی انھوں نے دیکھا کہ رات کو اسے بخار ہو جاتا اور وہ ہذیانی سا ہو کر بوڑھے نارویجیوں کی طرح زبان کھینچا کرتا۔ یہ چند موقعوں میں سے ایک موقع تھا جب وہ پریشان ہو گئے، کیونکہ انھوں نے سوچا کہ اس کا آخری وقت آ گیا اور پڑوس کی سیانی عورت بھی یہ بتانے سے قاصر تھی کہ وہ مرے ہوئے فرشتے کے لیے کیا کریں۔

اس کے باوجود وہ نہ صرف یہ کہ اپنا بدترین موسم سرما جھیل گیا بلکہ دھوپ سے روشن دنوں کے شروع ہوتے ہی سنبھالا لیتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ صحن کے پرلے سرے پر، سب کی نظروں سے دور کئی دنوں تک چپ چاپ پڑا رہا اور دسمبر شروع ہوتے ہی چند لمبے اور سخت پر اس کے شہپروں پر نمودار ہونے لگے بجوکے کے پر جو اس سے کہیں زیادہ ناتوانی کی ایک اور نحوست دکھائی دیتے تھے۔ مگر وہ اپنی تبدیلیوں کی وجہ ضرور جانتا ہو گا، اسی لیے وہ اس بات کا بہت خیال رکھتا تھا کہ کوئی ان تبدیلیوں کو دیکھ نہ لے، کوئی وہ سمندری گیت نہ سن لے جو وہ رات کو تاروں کی چھاؤں میں گنگناتا رہتا تھا۔ ایک صبح ایلی سیندا بیٹھی پیاز کتر رہی تھی کہ ہوا کا ایک جھونکا، جو سمندروں پر سے ہوتا ہوا آ رہا تھا، باورچی خانے میں در آیا۔ وہ اٹھ کر دریچے کے پاس گئی اور تب ہی اس نے فرشتے کو اڑان بھرنے کی ابتدائی کوششیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کوششیں اس قدر بھونڈی تھیں کہ اس کے ناخنوں نے سبزی کی کیاری میں گہرا شگاف ڈال دیا تھا اور اپنے پروں کی بھدی سی پھڑپھڑاہٹ سے، جو ہوا میں شک نہیں پا رہی تھی، وہ سائبان کو گرانے ہی والا تھا۔ پھر بھی وہ تھوڑا بہت اوپر اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایلی سیندا نے جب اس کو ایک بوڑھے عقاب کی طرح تشویشناک انداز میں پر ہلا ہلا کر اور کسی نہ کسی طرح خود کو ہوا میں سنبھالے سنبھالے، آخری مکانوں کے اوپر سے دور ہوتے دیکھا تو اس نے خود اپنے لیے اور اس کی خاطر

اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی، پیاز کترنے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ تکتی رہی، اور اس وقت تک نظریں جمائے رہی جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ اس کے جی کا جنجال نہ تھا بلکہ سمندری افق پر ایک خیالی نقطہ تھا۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ عطا صدیقی

دنیا بھر کا حسین ترین ڈوب مرنے والا

(بچوں کے لیے ایک کہانی)

سب سے پہلے جن بچوں نے سمندر سے ابھرتے اور ڈوبتے ابھار کو سمندر کی جانب سے اپنی طرف بہہ کر آتے دیکھا انھوں نے خیال کیا کہ دشمن کا کوئی جہاز ہو گا۔ پھر ان کو نظر آیا کہ اس پر نہ تو کوئی مستول ہے اور نہ کوئی پھریرا تو اس کو وہیل سمجھے۔ مگر جب وہ کنارے آ لگا اور جب انھوں نے اس پر سے سمندری جھاڑجھنکاڑ، جیلی فش کے پنجے، مچھلیوں کے بچے کھچے حصے اور ملبہ والا کوڑا صاف کر لیا، تب ہی ان کو معلوم ہوا کہ وہ کوئی ڈوب کر مر جانے والا ہے۔

سارے سہ پہر وہ اس سے کھیلتے رہے، کبھی اس کو بالو میں دبا دیتے، کبھی اس کو نکال لیتے کہ اتفاقاً کسی کی نظر ان پر پڑ گئی اور اس نے گاؤں میں خبر پھیلا دی۔ جو لوگ اس کو اٹھا کر قریب ترین گھر تک لائے انھوں نے دیکھا کہ وہ ان تمام مُردوں سے کہیں زیادہ بھاری بھرکم ہے جن سے اب تک ان کا سابقہ پڑا تھا، وہ قریب قریب گھوڑے جتنا لدّھڑ تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہو سکتا ہے کافی عرصے تک پانی میں رہنے کی وجہ سے پانی اس کی ہڈیوں تک میں اتر گیا ہو۔ جب ان لوگوں نے اس کو فرش پر لٹا دیا تو بولے کہ یہ تو باقی سب لوگوں سے زیادہ دراز قد نکلا کیونکہ گھر کے اندر اس کی سمائی کے لیے جگہ ناکافی تھی، مگر انھیں خیال آیا کہ شاید مر جانے کے بعد بھی بالیدگی کی صلاحیت بعض ڈوب مرنے والوں کی فطرت میں شامل ہو۔ اس میں سے سمندری بساند اٹھ رہی تھی اور اس کی بناوٹ ہی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی انسانی لاش ہے کیونکہ اس کی جلد مٹی کی پپڑیوں اور مچھلیوں کے سفنوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مرنے والا کوئی اجنبی ہے انھیں اس کا چہرہ صاف کرنے کی

کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گاؤں میں کوئی بیس ایک پتھریلی انگنائیوں والے چوبی مکانات تھے جن میں پھول پودے نام کو نہیں تھے اور سب کے سب ایک ریتیلی راس کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں زمین اتنی کم تھی کہ مائیں ہر وقت ڈری سہمی رہتی تھیں کہ کوئی جھکڑ کہیں ان کے بچوں کو اڑا نہ لے جائے، اور وقتاً فوقتاً مر جانے والوں کو ساحلی چٹانوں کے کنارے لے جا کر سمندر میں ٹھنڈا کر دیا جاتا تھا۔ مگر سمندر پُرسکون اور بڑا سخی داتا تھا اور گاؤں کے کل مرد سات کشتیوں میں سما جاتے تھے۔ اس لیے لاش ملنے کے بعد انھوں نے بس ایک نظر ایک دوسرے پر ڈال کر تسلی کر لی کہ وہ سب کے سب موجود ہیں۔

اس رات وہ اپنی روزی کی تلاش میں سمندر کی طرف نہیں گئے۔ مرد آس پاس کی بستیوں میں یہ معلوم کرنے نکل گئے کہ کہیں کوئی لاپتا تو نہیں اور عورتیں ڈوب مرنے والے کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہ گئیں۔ انھوں نے گھاس کی کوچیوں کی مدد سے اس کے بدن پر لگی ہوئی کیچڑ کو صاف کیا، اس کے بالوں میں پھنسی سمندری بالو کو نکالا اور مٹی کے پپڑوں کو مچھلیوں کے سفنے اتارنے والے اوزاروں سے کھرچا۔ یہ کام کرتے کرتے انھوں نے بھانپ لیا کہ جو جھاڑجھنکاڑ اس کے جسم سے چمٹا ہوا ہے وہ دوردراز کے گہرے پانیوں سے آیا ہے اور اس کے بدن پر بیریاں لگی ہوئی ہیں جیسے وہ مونگوں کی بھول بھلیوں میں سے ڈبکیاں کھاتا ہوا آیا ہو۔ انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ اپنی موت کو خودداری کے ساتھ سہہ رہا ہے، نہ تو اس کا منہ دوسرے ڈوب مرنے والوں کی مانند اجاڑ سا تھا اور نہ دریا میں غرق ہونے والوں کی طرح بھک منگوں کا سا اترا اترا تھا۔ اس کو پوری طرح پاک صاف کر لینے کے بعد ہی یہ عیاں ہو سکا کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا اور ان کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان سب مردوں میں جو اب تک ان کی نظر سے گزرے تھے سب سے زیادہ درازقد، سب سے زیادہ توانا، سب سے زیادہ زورآور اور سب سے زیادہ خوش اندام تھا بلکہ اتنا تکے جانے کے باوجود وہ ان کے تصور میں سما نہیں پا رہا تھا۔

گاؤں بھر میں نہ تو اتنا بڑا پلنگ دستیاب تھا جس پر اس کو لٹایا جا سکتا اور نہ کوئی میز اتنی سخت تھی جو اس کی سوگ جاگ کے لیے استعمال کی جا سکتی۔ اس کے بدن پر نہ تو سب سے لانبے آدمی کا کوئی بڑھیا پتلون چڑھا، نہ سب سے موٹے آدمی کی اتوار کو پہنی جانے والی قمیص اور نہ سب سے بڑے پیر والے کے جوتے۔ اس کے پھیلاؤ سے تن وتوش اور اس کے حسن سے مسحور ہو کر عورتوں نے طے کیا کہ وہ بادبان کے کسی بڑے ٹکڑے سے اس کے لیے پتلون بنائیں اور عروسی لنن سے قمیص تیار کریں تاکہ وہ راہ عدم کا سفر اپنی حیثیت کے مطابق طے کر سکے۔ جب وہ جھرمٹ مارے سلائی میں جٹی تھیں اور ٹانکے بھرتے بھرتے ٹکرٹکر اس کو دیکھے جا رہی تھیں تو ان کو یوں لگ رہا تھا کہ نہ تو ہوا کبھی اتنی یکساں رفتار سے چلی اور نہ سمندر کبھی اس قدر بےچین بےچین سا رہا جس قدر وہ آج رات ہے اور انھوں نے فرض کر لیا کہ ہو نہ ہو مرنے والے کا اس تبدیلی سے کوئی واسطہ ضرور ہے۔ انھیں خیال آیا کہ اگر وہ عظیم الشان انسان ان کے گاؤں میں رہتا ہوتا تو اس کے مسکن کے دروازے سب سے کشادہ، چھت سب سے بلند اور فرش سب سے مضبوط ہوتا، اس کی مسہری کسی جہازرانی والی لکڑی کی پٹیوں سے بنی ہوتی جن کو لوہے کے پیچوں سے کسا گیا ہوتا، اور اس

کی بیوی خورسندترین عورت رہی ہوتی۔ انھوں نے سوچا کہ اس کا اس قدر رعب ودبدبہ ہوتا کہ وہ مچھلیوں کو نام بہ نام پکار کر سمندر میں سے بلا لیا کرتا۔ اور اس نے اپنی زمینوں پر اس قدر محنت کی ہوتی کہ چٹانوں میں سے چشمے ابل پڑے ہوتے اور یوں اس نے سمندر کے ساحلی کراڑوں کو پھولوں کی تختہ بندی کے قابل بنا لیا ہوتا۔ دل ہی دل میں انھوں نے اس کا موازنہ اپنے اپنے مردوں سے کر ڈالا اور سوچا کہ وہ سب ساری عمر بھی کریں تو وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو وہ ایک رات میں کر گزرا ہوتا، اور انھوں نے ایسے اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اپنے اپنوں کو زمانے بھر میں سب سے زیادہ بودے، سب سے زیادہ گھٹیا اور سب سے زیادہ نکما آدمی ٹھہرا کر دل سے نکال دیا۔ وہ اپنے تصورات کی بھول بھلیوں میں گم تھیں کہ ان میں ان میں سے سب سے بزرگ عمر والی عورت، جو عمر رسیدہ ہونے کے باعث ڈوب مرنے والے کو محبت سے زیادہ شفقت بھری نظر سے دیکھ رہی تھی، بولی "صورت تو اس کی ایستیبان نامی شخص کی سی ہے۔"

بات سچ کی تھی۔ اس کا کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنی بات مان لینے کے لیے ان میں سے اکثر کو اس پر بس ایک نظر اور ڈالنی پڑی۔ وہ عورتیں جو عمر میں سب سے کم تھیں اور خودسر بھی، چند گھنٹے اس تصور میں مگن رہیں کہ جب وہ اس کو نئے کپڑے پہنا دیں گی اور وہ چمک دار جوتے ڈالے، پھولوں کے بیچ لیٹا ہو گا تو لاتارو نام شاید اس پر زیادہ جچے۔ مگر یہ ایک خام خیال تھا۔ ان کے پاس کپڑا خاطرخواہ نہیں تھا، پھر برا سیوتا گیا اور خراب ڈھنگ کا پتلون تنگ بھی بہت تھا اور دروں دل کسی دبی قوت سے اس کی قمیص کے بٹن بھی پٹ پٹ کھل گئے تھے۔ ہوا کی سائیں سائیں بند ہو چکی تھی اور سمندر کو بھی اپنی بدھ کے دن والی اونگھ آ گئی تھی۔ اس سکوت نے گویا ان کے آخری شبہات بھی دور کر دیے، وہ ایستیبان ہی تھا۔ جب ان کو اس کا فرش پر گھسیٹا جانا مجبوراً برداشت کرنا پڑا تو وہ عورتیں جنھوں نے اس کے کپڑے بدلائے تھے، بال سنوارے تھے، ناخن تراشے تھے اور حجامت بنائی تھی، ترس کے مارے کپکپانے سے باز نہ رہ سکیں۔ اس وقت کہیں جا کر ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ بھی اس جہازی ڈیل ڈول کے ہاتھوں کتنا تنگ رہتا ہو گا جب کہ مرنے کے بعد بھی اس قیامت نے اس کا پیچھا لے رکھا ہے۔ وہ اس کو جیتاجاگتا دیکھ سکتی تھیں، دروازوں میں سے ترچھا ہو کر گزرنے کی سزا بھگتتے ہوئے، چھت کی کڑیوں سے سر ٹکراتے ہوئے، کہیں مہمان کب تو کھڑا رہنے پر مجبور اس الجھن میں مبتلا کہ اپنے نرم گلابی سیل نما ہاتھوں کا کیا کرے۔ جبکہ خاتون خانہ گھر بھر کی سب سے مضبوط کرسی چن کر اپنے دم خشک کیے کیے اس کو پیش کرے، لو ایستیبان اس پر بیٹھ جاؤ اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے مسکراتا نہیں مادام تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ ہر ملاقات پر بار بار یہی کرتے کرتے اس کے تلوے چھلنی اور پیٹھ سوختہ ہو چکی ہوتی مگر کرسی توڑ دینے کی شرمندگی سے بچنے کے لیے ہمیشہ وہی ایک بات، نہیں مادام تکلف کی ضرورت نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں اور غالباً اس بات سے قطعی ناواقف رہتے ہوئے کہ جو ابھی ابھی یہ کہتیں کہ رکو ایستیبان، کافی تیار ہونے تک تو رک جاؤ، وہی پیٹھ موڑتے ہی زیرلب بول اٹھتیں، آخرکار ٹل گیا دیوہیکل بونگا۔ چلو اچھا ہوا خوبصورت بھوندو گیا۔ دن نکلنے سے ذرا پہلے لاش کی

چاروں طرف بیٹھی ہوئی عورتیں بھی کچھ سوچ رہی تھیں۔ بعد میں جب انھوں نے رومال سے اس کا منھ اس لیے ڈھک دیا کہ دھوپ اس کو کہیں نہ ستائے، تو وہ ان کو جنم جنم کا مرا ہوا لگا، بےیارومددگار، بالکل ان کے اپنے مردوں کا سا، اور رقت نے ان کے کلیجوں میں ابتدائی دراڑیں ڈال دیں۔ وہ کوئی نوجوان عورت تھی جس نے پہلےپہل رونا شروع کیا۔ دوسری عورتیں بھی اس کی دیکھادیکھی ٹھنڈی آہوں سے لے کر ہچکیوں تک کرنے لگیں، اور جتنی زیادہ وہ سسکیاں بھرتیں اتنا ہی زیادہ ان کا دل امڈتا کہ ڈوب مرنے والا اب ان کی نظروں میں عین مین ایستیبان ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں، کیونکہ وہ ہی تو دنیا بھر میں سب سے زیادہ محروم، سب سے زیادہ صلح کل، سب سے زیادہ بامروت تھا بےچارہ ایستیبان۔ اس لیے جب مرد لوگ یہ خبر لے کر لوٹے کہ مرنے والا آس پاس کی کسی بستی کا نہیں ہے تو عورتوں کو بہتے آنسوؤں کی جھڑی میں مسرت بھی محسوس ہوئی۔

"خداوند کی حمد ہو" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ اپنا ہے!"

مردوں نے اس کہرام کو زنانہ خرافات جانا۔ رات بھر کی کٹھن پوچھ تاچھ سے بےحال ہو چکنے کے بعد وہ تو بس اتنا چاہتے تھے کہ کسی طرح اس خشک اور ہوابند دن، دھوپ چڑھ جانے سے پہلے پہلے، اس نووارد کے جھنجھٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارغ ہو جائیں۔ انھوں نے فالتو پڑے ہوئے بادبانوں اور ماہی گیری کے تیروں کو جوڑجاڑ کر ایک ڈولا سا بنایا اور اس کو رسیوں سے خوب کس کس کر باندھا تاکہ وہ اس کا بوجھ اس وقت تک برداشت کر لے جائے جب تک وہ چٹانوں کے کنارے تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ باربردار جہاز کا لنگر بھی باندھ جانا چاہتے تھے تاکہ وہ بآسانی قعردریا میں اتر جائے جہاں مچھلیوں کو بھی کچھ سجھائی نہیں دیتا اور جہاں غوطہ خور تک خشکی کی ہڑک میں ختم ہو جاتے ہیں، اور پھر اس لیے بھی کہ تند لہریں اس کو دوبارہ کنارے پر نہ لے آئیں، جیسا کہ دوسری کئی لاشوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ مگر مرد جتنی جتنی عجلت کرتے، عورتیں وقت ٹالنے کی اتنی اتنی ترکیبیں نکالتیں۔ اپنے سینوں پر سمندری تعویذ جھلاتی وہ بدحواس مرغیوں کی مانند کڑکڑاتی پھر رہی تھیں۔ کچھ ایک جانب سے مداخلت کرتیں کہ مرنے والے کو مبارک ہوا والا منتی احرام پہنایا جائے تو چند دوسری جانب سے رائے دیتیں کہ اس کی کلائی پر قطب نما باندھا جائے اور "ایک طرف ہو جا بی بی، راستے سے ہٹ، دیکھو دیکھو مجھے مُردے پر گرا ہی دیا تھا" کی کائیں کائیں سے زیادہ چل پوں کے بعد آخرکار مردوں کے دلوں میں شکوک سر اٹھانے لگے اور انھوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا کہ ایک اجنبی کی خاطر بڑی قربان گاہ والے اتنے سارے چڑھاوے آخر کیوں، کیونکہ چاہے جتنی بھی میخیں چڑھاؤ اور متبرک پانی کے جتنے چاہو اتنے برتن چڑھا دو، پر شارک بہرصورت اس کو چٹ کر جائیں گی۔ مگر عورتیں تھیں کہ لپک جھپک کرتی ہوئی اپنے تبرکات کا سارا کباڑ لا لا کر اس پر نچھاور کیے جا رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ جو کچھ اپنے آنسوؤں سے ظاہر نہیں کر پا رہی تھیں وہ ٹھنڈی آہوں کی صورت نکال رہی تھیں۔ یہاں تک کہ مرد لوگ آپے سے باہر ہو گئے، "ارے ایک بھٹکتی لاش، ایک انجانے بےحقیقت آدمی، ایک بدھواری ٹھنڈے گوشت کی خاطر اتنے چونچلے کبھی کاہے کو ہوئے تھے جو اب ہونے لگے۔" احترام کی اس کمی سے دل برداشتہ ہو کر ان میں سے ایک عورت نے مرنے والے کے منھ پر سے رومال ہٹا دیا، اور پھر تو

مردوں کی بھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

وہ ایسٹےبان تھا۔ اس کو پہچان لینے کے لیے ان کے سامنے اس کا نام دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر کہا جاتا کہ سر والٹر ریلی، تو وہ شاید اس کے فرنگی لہجے، اس کے کندھے پر بیٹھے طوطے، اس کی آدم خوروں کو مارنے والی توڑےدار بندوق کے رعب میں آ گئے ہوتے، مگر ایسٹےبان تو سارے عالم میں بس ایک ہی تھا، اور وہ سامنے پڑا تھا بالکل سفید وہیل کی طرح، جوتے اتارے، کسی بونے کا پتلون چڑھائے، سخت سخت ناخونوں والا، جن کو چاقو سے تراشنا پڑا تھا۔ یہ جان لینے کے لیے بس اس کے چہرے سے رومال ہٹنے کی دیر تھی کہ وہ بہت نادم ہے، یوں کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں کہ وہ اتنا جہاز کا جہاز، اتنا بھاری بھرکم اور اتنا صورت دار ہے، اور جو کہیں اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ سب کچھ یوں ہو گا تو اس نے اپنی غرقابی کے لیے کوئی الگ تھلگ سی جگہ دیکھی ہوتی۔ مذاق نہیں، میں تو بلکہ حالات سے بیزار ہو جانے والے آدمی کی طرح اپنے گلے میں کسی جنگی جہاز کا لنگر باندھ کر کسی کراڑ پر سے جا لڑھکتا تاکہ اب تو اس بدھواری لاش کی طرح لوگوں کو پریشان نہ کروں، بقول آپ لوگوں کے ٹھنڈے گوشت کے اس غلیظ لوتھڑے سے کسی کا ناک میں دم کیوں کیا جائے جس سے اب میرا کوئی واسطہ بھی نہ ہو۔ اس کے انداز میں اس قدر کھری صداقت تھی کہ نہ صرف ان سب سے زیادہ وہمی لوگوں کو، جو کہ سمندر میں گزاری ہوئی ان بے انت راتوں کی تلخیوں کو محسوس کر سکتے تھے جن میں ان کو یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ کہیں ان کی عورتیں ان کے خواب دیکھتے دیکھتے تھک ہار کر غرق ہو جانے والوں کے خواب نہ دیکھنے لگی ہوں، بلکہ دوسرے ان سے بھی بڑھ کر سخت، لوگوں تک کے تن بدن کے رونگٹے ایسٹےبان کی بےریائی پر کھڑے ہو گئے۔

اور یوں انھوں نے اپنی ذہنی اُڑان کے مطابق ایک لاوارث ڈوب مرنے والے کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا۔ جب کچھ عورتیں پھولوں کی تلاش میں قریب کے گاؤں میں گئیں تو وہاں سے اور عورتوں کو ساتھ لے آئیں جن کو ان کی سنائی ہوئی باتوں پر اعتبار نہ آیا تھا اور جب انھوں نے مرنے والے کے دیدار کر لیے تو وہ مزید پھول لانے چل دیں اور پھر تو اور آتی گئیں اور آتے گئے، یہاں تک کہ وہاں اس قدر پھول اور اس قدر خلقت جمع ہو گئی کہ پیر سرکانے بھر کی جگہ نہ رہی۔ آخری لمحات میں ان کا دل اس بات پر دکھا کہ اس کو یتیم کی حالت میں پانی کے سپرد کر دیں، سو انھوں نے بہترین میں سے اس کے ماں باپ اور ان کو منتخب کیے اور خالائیں اور پھوپھیاں اور چچا اور ماموں اور چچیرے اور ممیرے بھائی بند، یہاں تک کہ اس کے توسط سے گاؤں کا گاؤں ایک دوسرے کا قرابت دار ہو گیا۔ چند ملاح جنھوں نے دور سے رونے کی صدا سنی اپنے راستے سے بھٹک گئے؛ اور لوگوں نے ایک کے بارے میں یہاں تک سنا کہ اس نے قدیم داستانوں کی ساحرہ عورتوں کا گمان کرتے ہوئے خود کو مرکزی مستول سے کس کر بندھوا لیا۔ جس وقت وہ سب چٹانوں کی کھڑواں ریت پر اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے شرف کے لیے لڑ بھڑ رہے تھے، اس وقت اپنے ڈوب مرنے والے کے کروفر اور حسن کا سامنا کرتے ہوئے کیا مرد اور کیا عورتیں، سب ہی کو پہلی بار اپنی گلیوں کی ویرانی، اپنی انگنائیوں کی بے برگ و باری اور اپنے خوابوں کی تنگ دامنی کا احساس ہوا۔

انھوں نے اس کو لنگر کے بغیر ہی جانے دیا تاکہ اگر وہ آنا چاہے تو واپس آ سکے، چاہے جب بھی وہ آنا چاہے۔ اور چٹکیوں کے اس مختصرترین پل تک وہ سب دم سادھے رہے جب تک کہ لاش گہرائی میں نہ پہنچ گئی۔ یہ جان لینے کے لیے کہ وہ سب نہ اب وہاں موجود ہیں اور نہ کبھی ہوں گے، انھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر وہ اتنا ضرور جان گئے تھے کہ اس وقت کے بعد ہر چیز کی کایا پلٹ جائے گی؛ اب ان کے گھروں کے دروازے کشادہ، چھتیں بلند اور فرش مضبوط ہوا کریں گے، تاکہ ایسٹےبان کی یاد جہاں چاہے کڑیوں سے سر ٹکرائے بغیر آ جا سکے اور آئندہ کسی کو بھی زیرلب یہ کہنے کی ہمت نہ ہو کہ دیوپیکر بونگا بالآخر مر گیا، بہت برا ہوا خوبصورت بھوندو انجام کار جاتا رہا، کیوں کہ اب وہ ایسٹےبان کی یاد کو ہمیشہ ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے اپنے گھروں کو باہر سے چٹکیلے رنگوں سے رنگنے جا رہے تھے اور چٹانوں کے درمیان سے چشمے نکالنے اور کراڑوں پر پھولوں کی تختہ بندی کرنے کے لیے جی توڑ مشقت کرنے جا رہے تھے، تاکہ آنے والے زمانوں میں صبح سویرے بڑے بڑے جہازوں کے مسافر سمندر پر آتی ہوئی پھولوں کی مہکار سے گھٹ کر جاگ اٹھیں، اور کپتان کو اپنی پوری وردی، اپنے اسطرلاب، اپنے قطب تارے اور جنگ میں کمائے ہوئے اپنے تمغوں سمیت عرشے پر اتر کر آنا پڑے، اور پھر سامنے افق پر گلابوں کی پٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ چودہ زبانوں میں کہے، اُدھر دیکھو جہاں ہوا اتنی پُرسکون ہے جیسے کیاریوں میں پڑی نیند لے رہی ہو، اُدھر جہاں دھوپ اتنی روشن ہے کہ سورج مُکھی بھی حیران ہے کہ کدھر منھ کرے، وہاں اُس طرف، وہی ایسٹےبان کا گاؤں ہے۔

نستعلیق نظامی اور میکنٹوش کمپیوٹر
اردو کتابت کا مکمل نظام

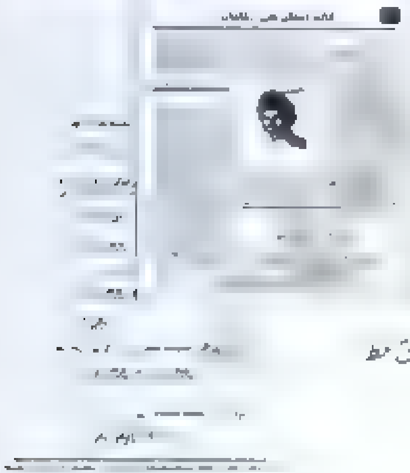

پاکستان کے ماہر خطاطوں کے خوبصورت نستعلیق خط
پیج میکنگ کی سہولت کے ساتھ

- نستعلیق کتابت کا حسن، جدید ٹیکنالوجی کی آسانیوں کے ساتھ
- خفی اور جلی کتابت (۱۲ پوائنٹ سے ۲۵۰ پوائنٹ تک)
- تمام اردو اور غیر مانوس الفاظ کی کتابت
- متن میں انگریزی (English) اور عربی لکھنے کی گنجائش
- جیسا اسکرین پر ویسا پرنٹ WYSIWYG (What you see is what you get)
- پورا صفحہ اسکرین پر ضرورت کے مطابق وضع کرنے کی سہولت
- متن میں تصاویر
- صفحات میں مختلف علامات اور ماسٹ ہیڈز کی کتابت
- متن میں جس انداز سے اور مختلف انداز میں
- کمپوزنگ پر مکمل کنٹرول

PDMS Pakistan Data Management Services
87 D.A.C.H.S. Karachi

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ فاروق حسن

منگل کے دن کا قیلولہ

ریل گاڑی ریتیلے پتھروں کی مُرتعش سرنگ میں سے برآمد ہوئی اور کیلوں کے لامتناہی اور متناسب کاشت کیے ہوئے باغوں میں سے گزرنے لگی۔ ہوا زیادہ بوجھل ہو گئی، اور اب انھیں سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ دھوئیں کا ایک دم گھونٹنے والا جھونکا گاڑی کے ڈبے کے اندر داخل ہوا۔ گاڑی کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی تنگ سڑک پر کیلے کے گچھوں سے لدی بیل گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سڑک سے پرے، غیرمزروعہ زمین پر غیریکساں فاصلوں پر قائم، دفتروں کی بجلی کے پنکھوں سے آراستہ عمارتیں، سرخ اینٹوں کے مکان اور بنگلے دکھائی دینے لگے تھے جن میں میزیں اور چھوٹی چھوٹی سفید کرسیاں گردآلود کھجور کے پودوں اور گلاب کی جھاڑیوں کے درمیان چبوتروں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے اور گرمی شروع نہیں ہوئی تھی۔

"بہتر ہے کہ کھڑکی بند کر دو،" عورت نے کہا، "تمھارے بالوں میں کالک بھر جائے گی۔"

لڑکی نے کوشش کی مگر زنگ کی وجہ سے کھڑکی ہل نہ سکی۔

گاڑی کے تیسرے درجے کے ڈبے میں صرف یہ دونوں ہی مسافر تھیں۔ گاڑی کا دھواں لگاتار ڈبے کے اندر آ رہا تھا، اس لیے لڑکی کھڑکی کے پاس سے اٹھ گئی۔ اپنا اسباب، جس میں کھانے کے سامان والی پلاسٹک کی تھیلی تھی اور اخبار کے کاغذوں میں لپٹا ہوا ایک گل دستہ، اس نے وہیں نشست پر رہنے دیا اور خود، کھڑکی سے دور، اپنی ماں کے سامنے والی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں سادہ اور غریبانہ ماتمی لباس پہنے ہوئے تھیں۔

لڑکی بارہ سال کی تھی، اور پہلی بار ریل گاڑی کا سفر کر رہی تھی۔ عورت اتنی

* [illegible] ان نو کہانیوں پر مشتمل مجموعہ [illegible] Mama [illegible] ہے، جس کا مکمل ترجمہ انتخاب کی اس حصے [illegible] میں شائع ہوا اور انگریزی مجموعے No One Writes to the Colonel میں شامل ہے۔

یہ کہانیاں مارکیز کی ادبی نشوونما میں بےحد اہمیت رکھتی ہیں کہ ان میں مارکیز کے خیالی قصبے ماکوندو کے خدوخال رفتہ رفتہ اجاگر ہونے شروع ہوتے ہیں، جس کے آباد ہونے اور اجڑنے کا روپ بعد میں [illegible] میں سامنے آیا۔ اس کے علاوہ یہ کہانیاں اپنے اردگرد کی زندگی اور لوگوں سے مارکیز کے [illegible]

[illegible] کی طرح کہانی "بڑی ماما کا جنازہ" میں مارکیز نے جمہوریت کی بازی گری کے پہلو بہ پہلو [illegible] نے اس موضوع کو نادر حس مزاح اور داستانوی اسلوب کے ساتھ برتا ہے، جس کا اظہار بعد میں [illegible] The Autumn of the Patriarch کی صورت میں ہوا۔

معمر رسیدہ تھی کہ اس کی ماں نہ لگتی تھی۔ اس کے پپوٹوں پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں، اس کا جسم مختصر، نرم اور بےڈھب تھا، اور لباس کسی پادری کے جبے کی وضع کا تھا۔ وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کی ٹیک مضبوطی سے کرسی کی پشت کے ساتھ لگا کر بالکل سیدھی بیٹھی تھی اور گود میں اس نے چمکدار نقلی چمڑے کا دستی تھیلا دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ تھیلے کا چمڑا کئی جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے متقی لوگوں کی سی استقامت تھی جو غربت اور تنگدستی کے عادی ہوں۔

بارہ بجے تک گرمی شدید ہو چکی تھی۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر، جس کے ساتھ کوئی قصبہ نہ تھا، پانی لینے کے لیے دس منٹ ٹھہری۔ باہر، باغوں کی پراسرار خاموشی میں سائے زیادہ واضح لگ رہے تھے۔ ڈبے کے اندر رکی ہوئی ہوا میں کچے چمڑے کی سی بُو تھی۔ گاڑی نے رفتار نہ پکڑی۔ وہ دو باہم مشابہ اسٹیشنوں پر رکی جن کے اردگرد شوخ رنگوں والے لکڑی کے بنے گھر تھے۔ عورت سر جھکا کر اونگھنے لگی۔ لڑکی نے اپنے جوتے اتار دیے۔ پھر وہ غسل خانے میں جا کر گل دستے پر پانی چھڑکنے لگی۔

جب وہ اپنی نشست پر واپس آئی تو اس کی ماں کھانا کھانے کے لیے اس کی منتظر تھی۔ اس نے پنیر کا ٹکڑا، مکئی کی آدھی روٹی اور ایک بسکٹ لڑکی کو دیا اور اپنے لیے بھی اتنی ہی مقدار میں کھانا پلاسٹک کی تھیلی میں سے نکالا۔ جس وقت وہ دونوں کھانا کھا رہی تھیں گاڑی نے آہستہ رفتار سے لوہے کا ایک پل پار کیا اور ایک قصبے میں سے گزری جو کہ پہلے دو قصبوں جیسا ہی تھا، صرف اس کے چوک میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ شدید دھوپ میں ایک بینڈ شکستہ سی دھن بجا رہا تھا۔ قصبے کے دوسرے سرے پر، جہاں باغ ختم ہوتے تھے، زمین خشک سالی کے سبب تڑخ چکی تھی۔

عورت نے کھانا ختم کیا۔

"جوتے پہن لو" اس نے کہا۔

لڑکی نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاں سے گاڑی کی رفتار تیز ہونا شروع ہوئی تھی وہاں بےآباد زمین کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تاہم اس نے بسکٹ کا ٹکڑا تھیلی میں رکھ دیا اور جلدی سے جوتے پہن لیے۔ عورت نے اس کے ہاتھ میں کنگھی تھما دی۔

"اپنے بال بھی ٹھیک کر لو" اس نے کہا۔

جس وقت لڑکی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی، گاڑی نے سیٹی بجانا شروع کر دی۔ عورت نے اپنی گردن پر سے پسینا پونچھا اور انگلیوں سے چہرے پر لگی چکنائی کو صاف کیا۔ جب لڑکی بال سنوارنے سے فارغ ہوئی، گاڑی کسی قصبے کے مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ یہ قصبہ پہلے تمام قصبوں سے بڑا تھا مگر ان سب سے زیادہ اداس بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"اگر تمھیں کچھ اور کرنا ہے تو ابھی کر لو" عورت نے کہا۔ "بعد میں خواہ پیاس سے تمھارا دم نکل رہا ہو کسی کے گھر پانی کا گھونٹ تک نہیں پینا۔ اور یاد رکھو رونا نہیں ہے۔"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ خشک اور گرم ہوا کا جھونکا گاڑی کی سیٹی اور پرانے ڈبوں کی کھٹاکھٹ کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ عورت نے پلاسٹک کی تھیلی میں کھانے کی چیزیں رکھ کر، اسے تہ کر کے، اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ ایک لمحے کے لیے قصبے کا مکمل عکس

اگست کے اس روشن منگل کے دن، کھڑکی کے شیشے میں اجاگر ہوا۔ لڑکی نے گل دستے کو اخبار کے گیلے کاغذوں میں لپیٹ اور کھڑکی سے تھوڑی دور کھڑی ہو کر اپنی ماں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ماں جواباً مسکرائی۔ گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ ہونے لگی، اور تھوڑی دیر بعد رک گئی۔

اسٹیشن پر کوئی نہ تھا۔ سڑک کی دوسری جانب، بادام کے درختوں کے سائے میں، صرف بلیرڈ ہال کھلا تھا۔ سارا قصبہ گرمی میں تیر رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر انھوں نے ویران اسٹیشن کو عبور کیا۔ اسٹیشن کے فرش کی ٹائلیں درمیان میں گھاس اگنے سے پھٹ رہی تھیں۔ وہ دونوں دوسری جانب، سڑک کی سایہ دار سمت میں چل پڑیں۔

اس وقت تقریباً دو بجے کا عمل تھا اور غنودگی کے بوجھ تلے دبا ہوا قصبہ قیلولہ کر رہا تھا۔ دکانیں، دفتر، اسکول، سب گیارہ بجے بند ہو جاتے تھے اور چار بجے سے پہلے، جب گاڑی واپس جاتی تھی، نہ کھلتے تھے۔ صرف اسٹیشن کے سامنے والا ہوٹل اپنے بلیرڈ ہال اور شراب خانے سمیت اور چوک کے ایک کونے میں واقع تارگھر دوپہر میں کھلے رہتے تھے۔ قصبے کے گھر، جن میں سے زیادہ تر بنانا کمپنی کے ماڈل کے مطابق ایک ہی وضع کے بنے ہوئے تھے، اندر سے بند تھے اور ان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض گھروں کے اندر اتنی گرمی ہوتی تھی کہ گھر کے باسی باہر آنگن میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ باقی لوگ اپنی کرسیاں بادام کے درختوں کے سائے میں، دیوار کے ساتھ ٹکا کر سڑک پر ہی قیلولہ کر لیا کرتے تھے۔

بادام کے درختوں کے پُرحفاظت سائے میں چلتے چلتے، اور قیلولے میں خلل ڈالے بغیر عورت اور لڑکی قصبے میں داخل ہوئیں۔ وہ سیدھی پادری کے گھر گئیں۔ عورت نے اپنے ناخن سے گھر کے باہر لوہے کے جنگلے کو کھرچا، پھر ایک لمحہ انتظار کرنے کے بعد دوبارہ یہی عمل دوہرایا۔ اندر بجلی کا پنکھا گھوں گھوں کر رہا تھا اور ماں بیٹی اندر سے آنے والی قدموں کی آہٹ کو بھی نہ سن سکیں۔ انھوں نے بہ مشکل دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ اور اس کے فوراً بعد کی محتاط آواز سنی، جو جنگلے کے قریب سے آئی تھی اور جس نے دریافت کیا تھا،

"کون ہے؟"

عورت نے جنگلے کے درمیان میں سے گھر کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔

"مجھے پادری سے ملنا ہے،" اس نے کہا۔

"وہ آرام کر رہے ہیں۔"

"معاملہ بہت ہنگامی نوعیت کا ہے" عورت کی آواز میں ٹھہراؤ والا عزم تھا۔

دروازہ آواز پیدا کیے بغیر تھوڑا سا کھلا اور اندر سے بڑی عمر کی ایک فربہ عورت باہر آئی جس کے چہرے کی جلد پیلی اور سر کے بال فولاد کے رنگ کے تھے۔ موٹے شیشوں والی عینک کے عقب میں اس کی آنکھیں بہت چھوٹی لگ رہی تھیں۔

"اندر آ جاؤ" اس نے کہا اور دروازہ پورا کھول دیا۔

وہ کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ اندر پرانے پھولوں کی بُو بسی ہوئی تھی۔ وہ عورت انھیں ایک لکڑی کی بنچ کی طرف لے گئی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی تو بیٹھ گئی، مگر ماں،

غیر حاضر سی، دونوں ہاتھوں میں تھیلی کو تھامے کھڑی رہی۔ بجلی کے پنکھے کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ گھر کے اندر کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر دروازے میں گھر والی عورت پھر نمودار ہوئی۔ "وہ کہہ رہے ہیں کہ تین بجے کے بعد آئیں،" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "ابھی پانچ منٹ پہلے ہی وہ سونے لیٹے ہیں۔"

"گاڑی ساڑھے تین بجے واپس چلی جاتی ہے۔" عورت نے کہا۔

یہ جواب مختصر تھا، لیکن وثوق اور خوداعتمادی سے دیا گیا تھا، اور جواب دیتے وقت عورت کا لہجہ خوش گوار اور دھیما تھا۔ گھر والی عورت پہلی بار مسکرائی۔

"ٹھیک ہے" اس نے کہا۔

جب کمرے کے دوسرے سرے پر دروازہ پھر بند ہو گیا تو عورت اپنی بیٹی کے نزدیک بیٹھ گئی۔ انتظار کا تنگ سا کمرہ غریبانہ، مگر نہایت صاف ستھرا تھا۔ لکڑی کے ایک کٹہرے نے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ کٹہرے کی دوسری جانب ایک سادہ سی میز تھی جس کی موٹی میزپوش کے اوپر ایک قدیم طرز کا ٹائپ رائٹر گلدان کے نزدیک رکھا تھا۔ ذرا دور مسیحی حلقے کے تمام کوائف رکھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی غیر شادی شدہ عورت نے اس دفتر کا انتظام سنبھال رکھا ہو۔

سامنے والا دروازہ کھلا اور پادری اپنی عینک کے شیشے رومال سے صاف کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عینک پہن لینے پر ہی اس کی مشابہت سے ظاہر ہوا کہ دروازہ کھولنے والی عورت اس کی بہن تھی۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"قبرستان کی کنجیاں،" عورت نے جواب دیا۔

لڑکی گود میں گل دستہ سنبھالے بیٹھی تھی اور بنچ کے نیچے اس کے پیر ایک دوسرے کو قطع کر رہے تھے۔ پادری نے اس کی طرف، اور پھر عورت کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کی لوہے کی جالی میں سے روشن اور بادلوں سے خالی آسمان کو دیکھ کر کہا

"اس گرمی میں؟ سورج غروب ہونے کا انتظار کر لیا ہوتا۔"

عورت نے آہستگی سے سر ہلایا۔ پادری کٹہرے کے دوسری جانب چلا گیا۔ وہاں الماری میں سے اس نے ایک کاپی جس پر مومی کاغذ چڑھا ہوا تھا، لکڑی کا قلمدان اور سیاہی کی دوات نکالی اور میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر جتنے بال تھے، ان سے سر پر بالوں کی کمی کی کافی حد تک تلافی ہو رہی تھی۔

"کس کی قبر پر جانا چاہتی ہو؟" پادری نے پوچھا۔

"کارلوس سینتینو کی" عورت نے جواب دیا۔

"کس کی؟"

"کارلوس سینتینو" عورت نے دوہرایا۔

پادری کے پلے اب بھی کچھ نہ پڑا تھا۔

"وہ چور جو پچھلے ہفتے یہاں مارا گیا تھا،" عورت نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں اس کی

ماں ہوں۔

پادری نے غور سے عورت کا جائزہ لیا۔ عورت نظریں جما کر پُرسکون اعتماد کے ساتھ اسے دیکھتی رہی حتیٰ کہ پادری جھینپ گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور لکھنے لگا۔ صفحہ بھرتے بھرتے اس نے عورت سے کہا کہ اپنی شناخت کرائے۔ بغیر حیل وحجت کیے، عورت نے وضاحت اور تفصیل سے بات کی جیسے کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی ہو۔ پادری کو پسینہ بہنا شروع ہو گیا۔ لڑکی نے اپنے بائیں جوتے کا بکسوا کھولا اور ایڑی جوتے میں سے نکال کر بنچ کے نیچے لگی ہوئی لکڑی پر رکھ لی۔ پھر دائیں پاؤں کے ساتھ بھی یہی کیا۔

اس واقعے کا آغاز پچھلے ہفتے کے سوموار کو صبح کے وقت یہاں سے چند بلاک پرے ہوا تھا۔ بیوہ ربیکا نے، جو عجیب الخلقت بکڑم چیزوں سے بھرے ہوئے گھر میں تنہا رہتی تھی، اس روز بوندا باندی کی آواز سے بلند، باہر سے کسی کے دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ وہ اٹھی اور الماری میں سے ڈھونڈ کر ایک قدیم ریوالور نکالا جسے کرنل اوریلیانو بوئندیا کے زمانے کے بعد سے کسی نے استعمال نہ کیا تھا۔ ریوالور لے کر، اور گھر کی بتیاں جلائے بغیر، وہ نشست کے کمرے میں آ گئی۔ اس کا یہ ردعمل دروازے کے تالے کے کھولے جانے کی آواز کے باعث کم اور اس دہشت کی وجہ سے زیادہ تھا جو اٹھائیس برسوں کی تنہائی نے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ اپنے ذہن میں اس نے نہ صرف دروازے کی جگہ کا، بلکہ تالے کی زمین سے اونچائی کا بھی قطعی حساب لگایا، اور دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑ کر، آنکھیں بند کر کے گھوڑا دبا دیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی آتشیں ہتھیار چلایا تھا۔ دھماکے کے فوراً بعد اسے جست کی چھت پر بارش کی کن من کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر اسے باہر انگنائی کے سیمنٹ والے فرش پر کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی اور کسی نے آہستہ سے، تلخی کے بغیر، مگر سخت تھکے ہوئے لہجے میں "ہائے ماں" کے الفاظ ادا کیے۔ جو شخص اس صبح ربیکا کے گھر کے باہر مردہ پایا گیا (اس کی ناک کے پرخچے اڑ گئے تھے) اس نے فلالین کی رنگدار دھاریوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی پتلون روزمرہ والی تھی جسے اس نے پیٹی کی بجائے رسی سے باندھا ہوا تھا اور وہ ننگے پاؤں تھا۔ قصبے میں اسے کوئی نہ جانتا تھا۔

"تو اس کا نام کارلوس سینتینو تھا؟" پادری نے لکھنے کا کام ختم کر کے کہا۔

"سینتینو ایالا،" عورت نے کہا۔ "وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔"

پادری دوبارہ الماری کی طرف چلا گیا۔ الماری کے دروازے کے اندر دو زنگ آلود بڑی کنجیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے سوچا جیسے کہ اس کی ماں نے اپنے لڑکپن میں سوچا تھا، اور جیسے کہ پادری نے بھی کسی نہ کسی وقت سوچا ہو گا، کہ وہ حضرت پطرس کی کنجیاں ہیں۔ پادری نے کنجیوں کو کیل سے اتارا، انہیں کٹہرے پر رکھی کھلی ہوئی کاپی کے صفحے پر رکھ کر اپنی شہادت کی انگلی سے صفحے پر ایک جگہ اشارہ کیا، اور عورت سے کہا

"یہاں دستخط کرو۔"

عورت نے تھیلے کو بغل میں دبا کر اپنا نام اس جگہ پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ لڑکی نے گل دستہ ہاتھ میں تھاما اور پاؤں رگڑتی ہوئی کٹہرے کے پاس آ کر ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔

پادری نے آہ بھری۔

"تم نے کبھی اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش نہیں کی؟"

عورت نے دستخط ختم کرنے کے بعد پادری کو جواب دیا۔

"وہ بہت اچھا آدمی تھا۔"

پادری نے پہلے عورت کی طرف اور پھر لڑکی کی جانب دیکھا اور صالح تحیّر کے ساتھ باور کیا کہ ماں بیٹی دونوں میں سے کسی کا آنسو بہانے کا ارادہ نہیں تھا۔ عورت نے اسی انداز میں بات جاری رکھی۔ "میں نے اسے کہا تھا کہ جو چیز کسی کی کھانے کی ہو اسے چوری نہ کرے، اور اس نے ہمیشہ میرا کہا مانا۔ اس کے برعکس، پہلے، جب وہ مکّے بازی کیا کرتا تھا مار کھا کھا کر بےحال ہو جانے کے باعث اس کے تین تین دن بستر پر گزرتے تھے۔"

"اور اسے اپنے دانت بھی تو نکلوانے پڑے تھے،" لڑکی نے اضافہ کیا۔

"ہاں،" عورت نے اتفاق کیا۔ "ان دنوں میرے ہر نوالے میں اس مار کا ذائقہ ہوتا تھا جو میرے بیٹے نے ہفتے کی راتوں کو کھائی ہوتی تھی۔"

"خدا کی مشیّت کو کون جان سکا ہے؟" پادری نے کہا۔

مگر یہ اس نے بغیر کسی یقین کے کہا تھا کچھ تو اس لیے کہ اس کو زندگی کے تجربے نے ذرا شک میں ڈال دیا تھا اور کچھ گرمی بھی بہت زیادہ تھی۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ سرسام سے بچنے کے لیے اپنے سروں کو ڈھانپ کر باہر جائیں۔ جمائیاں لیتے ہوئے اور تقریباً سوتے سوتے اس نے انہیں کارلوس سینتیو کی قبر تک پہنچنے کا راستہ سمجھایا اور کہا کہ کنجیاں لوٹانے کے لیے واپسی پر انہیں دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں، باہر کے دروازے کے نیچے کنجیاں رکھ دیں۔ اور اگر ممکن ہو تو گرجے کے لیے نذر نیاز بھی وہیں چھوڑ دیں۔ عورت نے بہت توجہ سے پادری کی ہدایات کو سنا لیکن شکریہ ادا کرتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

سڑک والا دروازہ کھولنے سے پیشتر ہی پادری نے معلوم کر لیا تھا کہ کوئی شخص لوہے کی جالی سے ناک لگائے کھڑا ہے اور جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ باہر بہت سارے بچے جمع ہو گئے تھے۔ جب دروازہ کھلا تو وہ سب ادھر ادھر ہو گئے۔ عموماً دوپہر کے اس وقت سڑک پر کوئی نہ ہوتا تھا۔ آج نہ صرف وہاں بچے تھے، بلکہ بادام کے درختوں کے نیچے بالغوں کے گروہ بھی موجود تھے۔ پادری نے گرمی میں تیرتی ہوئی سڑک کا جائزہ لیا اور ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو،" اس نے عورت کی طرف دیکھے بغیر اس سے کہا۔

پادری کی بہن پرلے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے شب خوابی کے کپڑوں پر کالی جیکٹ پہن رکھی تھی اور بال شانوں پر کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" پادری نے اس سے پوچھا۔

"لوگوں کو پتا چل گیا ہے" اس کی بہن نے سرگوشی کی۔

"بہتر ہو کہ تم دونوں آنگن والے دروازے سے باہر جاؤ،" پادری نے کہا۔

"وہاں بھی وہی حال ہے" پادری کی بہن نے کہا۔ "سب لوگ کھڑکیوں میں سے جھانک رہے

ہیں۔"

اس وقت تک بات عورت کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس نے لوہے کے جنگلے میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ تب اس نے لڑکی کے ہاتھ سے گل دستہ لے لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

"سورج غروب ہونے تک رک جاؤ،" پادری نے مشورہ دیا۔

"تم پگھل جاؤ گی،" پادری کی بہن نے کہا، جو کمرے کے عقب میں بےحس و حرکت کھڑی تھی۔ "ٹھہرو، میں تمہیں اپنا چھاتا دیے دیتی ہوں۔"

"نہیں، شکریہ۔" عورت نے جواب دیا۔ "ہم یوں ہی ٹھیک ہیں۔"

اس نے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور دروازہ عبور کر کے سڑک پر نکل گئی۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

ایک نہ ایک دن

سوموار کا دن گرم اور بارش کے بغیر طلوع ہوا۔ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی، بغیر ڈگری کے دندان‌ساز اوریلیو ایسکوبار نے چھ بجے اپنا دفتر کھولا۔ پلاستر کے سانچے میں نصب چند نقلی دانت اُس نے شیشے کی الماری میں سے نکالے اور مٹھی بھر اوزاروں کو اُن کی قامت کے مطابق ترتیب دے کر میز پر رکھا یوں جیسے اُن کی نمائش کی جانے والی ہو۔ اوریلیو ایسکوبار نے بےکالر کی قمیص پہن رکھی تھی جس کا گلا سونے کی کیل سے بند تھا اور اُس کی پتلون کو گارٹرز نے بھی جکڑ کر سنبھالا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ سوکھا ہوا آدمی تھا جو ہر وقت عموداً سیدھا کھڑا رہتا تھا اور اُس کے چہرے پر ایسا تاثر رہتا تھا جیسا عموماً بہرے لوگوں کے چہروں پر ہوتا ہے، حالانکہ اس تاثر کی اصل صورتِ حال سے مطابقت خلافِ حال تھی۔

اوزار میز پر ترتیب دینے کے بعد دانتوں کی صفائی کی مشین کو اپنی طرف کھینچ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور نقلی دانتوں کو چمکانے کے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس کا ذہن اپنی اس مصروفیت کے بارے میں ہر طرح کی سوچ سے عاری لگتا تھا لیکن وہ انہماک اور باقاعدگی سے، ضرورت بےضرورت، مشین کو پاؤں کے پیڈل سے چلاتا اور دانتوں کو چمکاتا رہا۔

آٹھ بجے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، کھڑکی سے باہر جھانک کر اُس نے آسمان کا جائزہ لیا، اور پڑوس کے گھر کی چھت پر نصب اڑی چوب پر دو مغموم گدھوں کو بیٹھے سورج کی گرمی میں اپنے پروں کو سکھاتے دیکھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ دوپہر کے کھانے کے

وقت سے قبل بارش ہونے کا امکان ہے، پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اُس کے گیارہ سالہ بیٹے کی چیختی ہوئی آواز نے اُس کے انہماک کا تسلسل توڑا:

"پاپا۔"

"ہاں؟"

"باہر قصبے کا میئر آیا ہے، وہ پوچھتا ہے آپ اُس کا ایک دانت نکال دو گے؟"

"اُسے کہہ دو میں موجود نہیں ہوں۔"

وہ سونے کے ایک دانت کو چمکا رہا تھا۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر رکھ کر اور آنکھیں ادھی بند کر کے اُس نے دانت کو غور سے دیکھا۔ اُس کے بیٹے نے انتظار کے کمرے سے دوبارہ آواز لگائی:

"پاپا وہ کہتا ہے آپ موجود ہو کیونکہ وہ آپ کی آواز سن سکتا ہے۔"

دندان‌ساز دانت کے معائنے میں مصروف رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے دانت کو دوسرے پالش کیے ہوئے دانتوں کے قریب میز پر رکھا اور بیٹے کو جواب دیا:

"تب تو اور بھی بہتر ہے۔"

اُس نے دوبارہ مشین کو چلانا شروع کیا۔ گتّے کے ایک ڈبے میں سے، جس میں سب طرح کی نامکمل چیزیں پڑی رہتی تھیں، اُس نے دانتوں کے پُل کا ایک حصّہ نکالا اور اُس کے سونے کو چمکانے لگا۔

"پاپا۔"

"ہاں!"

اُس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میئر کہتا ہے اگر آپ اُس کا دانت نہیں نکالو گے تو وہ آپ کو گولی مار دے گا۔"

کسی قسم کی عجلت دکھائے بغیر اس نے اطمینان سے مشین کے پیڈل کو چلانا بند کیا اور اسے پرے دھکیلا۔ تب اُس نے میز کی ایک دراز کو پورا باہر نکالا، وہاں ایک ریوالور پڑا تھا۔ "ٹھیک ہے،" اُس نے کہا۔ "اُسے کہو آ کر گولی مار دے مجھے۔"

کرسی کو دھکیل کر اُس نے دروازے کے سامنے کر دیا اور اپنا ہاتھ میز کی دراز پر ہی رکھا۔ میئر دروازے میں نمودار ہوا۔ اُس کے چہرے کا بایاں حصہ شیو کیا ہو تھا لیکن اُس کے سوجے ہوئے اور درد کرتے ہوئے دائیں گال پر پانچ دن کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ دندان‌ساز نے میئر کی بےرحس آنکھوں میں یاس اور بےبسی کی متعدد راتوں کو جھانکتے ہوئے پایا۔ اُس نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے دراز کو بند کر دیا اور نرمی سے بولا:

"بیٹھ جاؤ۔"

"صبح بخیر،" میئر نے کہا۔

"صبح بخیر،" دندان‌ساز نے کہا۔

دانت نکالنے کے اوزار پانی میں ابل رہے تھے۔ میئر نے اپنا سر کرسی کی پشت کے ساتھ ٹکا دیا، یوں تھوڑا سا آرام محسوس ہوا۔ اُس کا سانس یخ تھا۔ اُس نے دفتر کا جائزہ لیا۔ نہایت غریبانہ سا انتظام تھا۔ لکڑی کی ایک پرانی کرسی، پیڈل والی مشین اور شیشے کی ایک

الماری جس میں مٹی کی بوتلیں رکھی تھیں۔ کرسی کے مقابل کھڑکی میں شانوں کی اونچائی پر کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ دندان‌ساز کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میئر نے ایڑیاں مضبوطی سے جوڑیں اور منہ کھول دیا۔

اوریلیو ایسکوبار نے اس کا چہرہ روشنی کی طرف موڑا اور اس کے متاثرہ دانت کو دیکھا۔ پھر اس نے جبڑا انگلیوں کے محتاط دباؤ سے بند کر دیا اور کہا:

"تمہیں بیہوش کیے بغیر یہ دانت نکالنا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ دانت کی جڑ میں پیپ بھری ہوئی ہے۔"

میئر نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ٹھیک ہے" اس نے کہا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ دندان‌ساز نے اس کی مسکراہٹ کا جواب نہ دیا۔ ابلے ہوئے اوزاروں والا گرم تسلا اس نے میز پر رکھا اور ایک ٹھنڈی چمٹی سے، کسی عجلت کے بغیر اوزار باہر نکالے۔ جوتے کی نوک سے اگال دان کو ہلا کر اس نے ٹھیک جگہ رکھا اور ہاتھ دھونے کی خاطر سنک کے آگے جا کھڑا ہوا۔ یہ سب کاموں کے دوران میں اس نے ایک بار بھی میئر کی طرف نہ دیکھا۔ لیکن میئر نے ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر کو اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

متاثرہ دانت نچلے جبڑے کی عقل داڑھ تھی۔ دندان‌ساز نے اپنے پاؤں پھیلائے اور گرم زنبور سے دانت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میئر نے اپنی تمام قوت سے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے بازوؤں کو جکڑا اور پاؤں گڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے گردوں میں برف آلود خلا کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن اس نے آواز نہ نکالی۔ دندان‌ساز فقط اپنی کلائی کو حرکت دے رہا تھا۔ کسی کینے کے بغیر بلکہ ایک تلخی بھری ملائمت سے اس نے میئر سے کہا:

"ہمارے بیس آدمیوں کے قتل کا حساب تم اب چکاؤ گے۔"

میئر نے اپنے جبڑے میں ہڈی کی کڑکڑاہٹ کو محسوس کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن جب تک دانت منہ سے باہر نہ آ گیا اس نے سانس تک نہ لیا۔ آنسوؤں کے عقب میں اس نے دانت کو دیکھا۔ اسے یہ دانت اپنی ساری تکلیف سے اس قدر غیرمتعلق لگا کہ وہ پچھلی پانچ راتوں کی اذیت کو سمجھنے میں ناکام رہا۔

پسینے میں شرابور، کانپتا ہوا وہ اگال دان کے اوپر جھک رہا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور پتلون کی جیب میں سے رومال نکالنے کی کوشش کی۔ دندان‌ساز نے صاف کپڑا اس کی طرف بڑھایا۔

"اپنے آنسو صاف کرو" اس نے کہا۔

میئر نے آنسو پونچھے۔ وہ کانپ رہا تھا۔ جب تک دندان‌ساز ہاتھ دھوتا رہا، میئر بوسیدہ چھت کو دیکھتا رہا جس پر گردآلود جالے لگے ہوئے تھے جن میں مکڑیوں کے انڈے اور مردہ کیڑے مکوڑے پھنسے ہوئے تھے۔ دندان‌ساز ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آیا۔ "گھر جا کر آرام کرو" وہ بولا، "اور نمک کے پانی سے غرارے کرتے رہو۔"

میئر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے تقریباً فوجیوں کے سے سرسری انداز میں دندان‌ساز کو سلیوٹ کیا اور دروازے کی طرف چلا۔ چلتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگوں کو جھٹک کر سیدھا کیا اور کوٹ

کے بٹن بند کیے۔

"بل بھجوا دینا" اس نے کہا۔

"کس کے نام؟ تمہارے یا ٹاؤن کمیٹی کے؟"

میئر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کلینک کا دروازہ بند کیا۔ جالی کے دروازے کے باہر سے اس کی آواز آئی:

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سالی ایک ہی بات ہے۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

اِس قصبے میں کوئی چور نہیں

داماسو [illegible] کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی انا، چھ ماہ کی حاملہ، کپڑے اور جوتے پہنے بستر میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تیل کا لیمپ بجھنے کے قریب تھا۔ داماسو کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی لمحہ لمحہ کر کے ساری رات اس کا انتظار کرتی رہی ہے بلکہ اب بھی جب وہ اس کے سامنے موجود ہے وہ انتظار کیے جا رہی ہے۔ اس نے انگلی سے انا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ انا کی خوف زدہ آنکھیں سرخ کپڑے کی اس بنڈل پر مرکوز تھیں جو داماسو نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے اور وہ یکلخت کانپنے لگی۔ داماسو نے خاموشی مگر درشتی کے ساتھ اس کو قمیص سے پکڑ لیا۔ داماسو کے پاس سے کڑوی سی بو آ رہی تھی۔

داماسو نے انا کو تقریباً ہوا میں اٹھا لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کے جسم کا سارا بوجھ آگے کو جھک گیا اور وہ اپنے خاوند کی سرخ دھاریوں والی قمیص سے چمٹ کر ہاتھ اس کی کمر کے گرد لے جا کر اسے گردوں کے قریب پکڑ کر رونے لگی اور اس وقت تک روتی رہی جب تک سے قرار نہ آ گیا۔

"میں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی" اس نے کہا۔ "یکدم دروازہ کھلا اور کسی نے تمہیں خون میں لت پت اندر دھکیل دیا۔"

کچھ کہے بغیر داماسو نے اسے ہاتھ کے فاصلے پر روکے رکھا۔ پھر اس نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور بنڈل اس کی گود میں رکھ کر باہر صحن میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ انا نے ڈوری کو کھولا اور دیکھا بنڈل کے اندر بلیرڈ کی تین گیندیں تھیں، دو سفید اور ایک سرخ، اور تینوں

کثرت استعمال سے بدرنگ سی ہو رہی تھیں۔

داماسو جب کمرے میں واپس آیا تو وہ بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔

"اور ان کا کیا فائدہ ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

داماسو نے کندھے اچکائے۔ "بلیرڈ کھیلنے کے کام آئیں گی۔"

اس نے بنڈل کو دوبارہ ڈوری سے باندھا اور دوسری چیزوں، ٹارچ، چاقو اور گھریلو ساختہ کنجی، کے ہمراہ ٹرنک کی تہہ میں رکھ دیا۔ انا کپڑے تبدیل کیے بغیر دیوار کی جانب منہ کر کے بستر میں لیٹ گئی۔ داماسو نے صرف اپنی پتلون اتاری۔ بستر میں لیٹ کر سگریٹ پیتے ہوئے وہ صبح کاذب کی بکھری ہوئی سرسراہٹ میں اپنی مہم کے خدوخال کا جائزہ لینے لگا، یہاں تک کہ اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی جاگ رہی ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ بولی۔

انا کی آواز، جو عموماً دھیمی ہوتی تھی، غصے اور عناد کی بدولت اس وقت بھاری ہو گئی تھی۔ داماسو نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ٹکڑے کو فرش پر مسل کر بجھا دیا۔

"وہاں کچھ اور تھا ہی نہیں۔" داماسو نے آہ بھری۔ "میں تقریباً گھنٹہ بھر اندر رہا۔"

"اگر تمہیں کوئی گولی مار دیتا تو؟" انا نے پوچھا۔

داماسو خوف سے کانپ اٹھا۔ "لعنت ہو تم پر۔" اس نے اپنی انگلیوں کے جوڑ پلنگ کے ڈنڈے پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ نیچے فرش پر سگریٹ اور دیاسلائی تلاش کرنے لگا۔

"تم گدھوں کی طرح بےحس ہو۔" انا نے کہا۔ "اتنا تو سوچا ہوتا کہ میں یہاں سو نہیں پا رہی۔ سڑک پر کوئی آواز آتی تھی تو لگتا تھا جیسے ابھی کوئی تمہاری لاش لے کر اندر داخل ہو گا۔" اس نے آہ بھر کر اضافہ کیا،

"اور اس سارے عذاب سے حاصل کیا ہوا؟ بلیرڈ کی تین گیندیں؟"

"دراز میں صرف پچیس سینٹ کا سکہ پڑا تھا۔"

"تو پھر کچھ بھی لے کر نہ آتے۔"

"مشکل کام تو اندر داخل ہونے کا تھا۔" داماسو نے کہا۔ "وہاں سے بالکل خالی ہاتھ لوٹ آتا؟"

"کچھ اور اٹھا لاتے!"

"وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔" داماسو نے کہا۔

"جتنی چیزیں بلیرڈ ہال میں ہوتی ہیں اور کہاں ہوتی ہوں گی؟"

"ہاں، لگتا یہی ہے۔" داماسو نے کہا۔ "لیکن ایک بار اندر داخل ہو کر تلاش کرنا اور ہر چیز کو دیکھنا شروع کرو تو پتا چلتا ہے کہ وہاں کوئی ٹکے کے مول کی چیز بھی نہیں۔"

وہ دیر تک خاموش لیٹی رہی۔ داماسو کو لگا جیسے وہ آنکھیں کھولے اپنی یادداشت کے اندھیرے میں کسی قیمتی چیز کو تلاش کر رہی ہو۔

"ہاں شاید۔" وہ بولی۔

داماسو نے سگریٹ سلگا لیا۔ رات کی پی ہوئی شراب کا نشہ لہر کے بعد لہر بن کر اس

کے جسم سے زائل ہو رہا تھا، اور اسے دوبارہ اپنے اعضا کے وزن، حجم اور فرائضِ منصبی کا احساس ہونے لگا تھا۔ "وہاں ایک بلی تھی۔" اس نے بالآخر کہا۔ "ایک بہت بڑی سفید بلی۔" انا نے بستر میں کروٹ لی، اپنا پھولا ہوا پیٹ اپنے خاوند کے پیٹ کے ساتھ لگا دیا اور ٹانگ اس کے گھٹنوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے پاس سے پیاز کی بُو آ رہی تھی۔

"بہت ڈر لگ رہا تھا؟" انا نے پوچھا۔

"مجھے؟"

"ہاں تمہیں،" انا نے کہا۔ "سنا ہے مردوں کو بھی ڈر لگتا ہے۔"

اسے احساس ہوا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ "ہاں، تھوڑا سا،" اس نے کہا۔ "مجھے اتنے زور کا پیشاب آ رہا تھا کہ برداشت کرنا مشکل تھا۔"

انا نے اسے چوما مگر اس نے جواباً کچھ نہ کیا۔ تب، اس احساس کے باوجود کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے لگا ہے، جو خطرے سے خالی بات نہ تھی، تاہم بغیر کسی تاسّف کے، اس نے تمام واقعہ، تفصیل کے ساتھ انا کو سنایا یوں جیسے کسی پرانے سفر کی یاد تازہ کر رہا ہو۔

طویل خاموشی کے بعد انا نے کہا،

"تم تو پاگل ہی ہو۔"

"بس شروع کرنے کی ہمت چاہیے،" داماسو نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔ "اور پھر پہلی کوشش کے لحاظ سے معاملہ برا تو نہیں رہا۔"

سورج کی تپش دیر سے شروع ہوئی۔ انا داماسو کے بیدار ہونے سے بہت پہلے جاگ چکی تھی۔ داماسو نے چند منٹ کے لیے اپنا سر صحن میں لگے ملکے کی ٹونٹی کے نیچے ٹکائے رکھا حتیٰ کہ پانی کی دھار سے وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس کا کمرہ بہت سارے ایک جیسے مگر الگ الگ کمروں میں سے ایک تھا۔ صحن میں، جو تمام کمروں کا مشترک تھا، کپڑے سکھانے کی رسی بندھی ہوئی تھی۔ عقبی دیوار کے پاس والے حصے میں، جسے ٹین کی ایک چادر صحن سے الگ کرتی تھی، انا نے کھانا پکانے اور استریاں گرم کرنے کے لیے ایک سفری چولہا، اور کھانا کھانے اور کپڑے استری کرنے کے لیے ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کو قریب آتا دیکھ کر اس نے استری کیے ہوئے کپڑے ایک طرف رکھ دیے اور استریاں چولھے پر سے اتار دیں تاکہ کافی گرم کر سکے۔ انا اپنے خاوند سے عمر میں بڑی تھی۔ اس کی جلد کی رنگت پیلی تھی اور حرکات و سکنات میں ایسے لوگوں کی سی نرم روی اور اہلیت تھی جن کا حقیقت سے روزانہ واسطہ رہتا ہو۔

سردرد کی دھند میں سے اسے محسوس ہوا کہ انا نظروں ہی نظروں میں اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت تک داماسو نے صحن میں دوسرے لوگوں کی آوازوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

"اس سب نے صبح سے اور کوئی بات ہی نہیں کی،" انا اسے کافی دیتے ہوئے بڑبڑائی۔ "مرد لوگ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں گئے ہیں۔"

داماسو نے خود دیکھا، صحن میں سے مرد اور بچے غائب تھے۔ کافی پیتے ہوئے وہ خاموشی

سے اُن عورتوں کی گفتگو سننے اور سمجھنے کی کوشش میں لگ رہا جو رسی پر کپڑے لٹکا رہی تھیں۔ بالآخر اس نے سگریٹ سلگایا اور باورچی خانے میں سے باہر نکل آیا۔

"تیریسا!" اس نے پکارا۔

جسم کے ساتھ چپکے ہوئے گیلے کپڑے پہنے ایک لڑکی نے اس کی آواز کا جواب دیا۔ "ذرا احتیاط سے بات کرنا،" انا نے سرگوشی کی۔ لڑکی چل کر داماسو کے قریب آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" داماسو نے پوچھا۔

"رات کو بلیرڈ ہال میں چوری ہوئی ہے۔ چور سب کچھ لے گئے۔"

لڑکی کو جیسے تمام تفصیلات کا علم تھا۔ اس نے وضاحت سے بتایا کہ چوروں نے رات کس طرح ہال میں سے یکے بعد دیگرے ساری چیزیں نکالیں حتیٰ کہ بلیرڈ کھیلنے کی میز بھی۔ وہ اس یقین سے بات کر رہی تھی کہ خود داماسو کو یوں لگا جیسے اسے ہر بات کا صحیح علم ہو۔

"لعنت ہے!" باورچی خانے میں لوٹتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

انا دانت بھینچ کر گنگنانے لگی۔ داماسو اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش میں کرسی دیوار کے ساتھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ تین ماہ قبل جب وہ بیس برس کا ہوا تھا، اس کی تحریر جیسی مونچھ کی بدولت، جس کی نگہداشت وہ نہ صرف ایثار کے پوشیدہ جذبے کے تحت بلکہ کچھ کچھ شفقت سے کرتا تھا، اس کا چیچک کے داغوں سے بھرا چہرہ قدرے پختہ لگنے لگا تھا۔ تب سے اس نے خود کو بالغ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آج صبح، جبکہ کل رات کے واقعے کی یاد اس کے سردرد کی دلدل میں تیرتی پھر رہی تھی، اسے یہ بھی معلوم نہ ہو پا رہا تھا کہ بہرصورت تو کجا وہ زندگی کے کس مقام سے اپنے آپ کو زندہ تصور کرنا شروع کرے۔

استری ختم کرنے کے بعد انا نے کپڑوں کو ایک جیسی قامت کے دو ڈھیروں میں بانٹا اور باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

"زیادہ دیر نہ لگانا" داماسو نے کہا۔

"نہیں معمول سے زیادہ نہیں۔"

وہ اس کے پیچھے کمرے میں آیا۔ "تمہاری چارخانے والی قمیص وہاں رکھی ہے،" انا نے کہا۔ "بہتر ہو گا کہ آج دھاریوں والی قمیص نہ پہنو۔" انا نے اپنے خاوند کی بلی جیسی شفاف آنکھوں میں دیکھا۔ "کیا پتا کل کسی کی نظر تم پر پڑ گئی ہو؟"

داماسو نے ہتھیلیوں کا پسینا پتلون پر رگڑ کر صاف کیا۔ "نہیں، مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"پکا پتا تو نہیں،" انا نے دوہرایا۔ وہ دونوں بازوؤں پر کپڑوں کا ایک ایک بنڈل اٹھائے ہوئے تھی۔ "ویسے بھی تمہیں آج باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ کچھ دیر رکو میں باہر کا چکر لگا کر آتی ہوں، جیسے مجھے کسی بات سے کوئی غرض نہیں۔"

قصبے میں لوگوں کی زبانوں پر کسی اور بات کا ذکر ہی نہ تھا۔ انا کو بار بار اسی ایک واقعے کی مختلف بلکہ ایک دوسرے کی تردید کرتی ہوئی تفصیلات سننی پڑیں۔ لوگوں کے دھلے ہوئے کپڑے ان کے حوالے کرنے کے بعد وہ ہر سنیچر کی طرح مارکیٹ جانے کی بجائے سیدھی

چوک کی جانب ہو لی۔

بلیرڈ ہال کے سامنے اس کے خیال کے برعکس کم لوگ تھے۔ کچھ لوگ بادام کے درخت کے نیچے کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ شامیوں نے دوپہر کے کھانے کے بعد دسترخوان اٹھا دیا تھا، اور دکانیں اپنے کینوس کے سائبانوں کے نیچے اونگھتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ایک شخص ہوٹل کے ملاقات کے کمرے میں جھولنے والی کرسی میں ٹانگیں پھیلائے اور منہ کھولے سو رہا تھا۔ دوپہر کی گرمی میں ہر چیز مفلوج سی لگتی تھی۔

آنا بلیرڈ ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتی گئی، اور جب وہ گودی کے مقابل زمین کے خالی قطعے پر سے گزر رہی تھی تو اسے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ تب اسے وہ بات یاد آئی جو داماسو نے اسے بتائی تھی، اور یہ وہ بات تھی جس کا علم تو سب کو ہو گا مگر یہ بلیرڈ ہال کے گاہکوں کے سوا کسی کے ذہن میں نہ رہی ہو گی؛ بلیرڈ ہال کا عقبی دروازہ زمین کے ایک خالی قطعے پر کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بازو پھولے ہوئے پیٹ کے اوپر باندھے لوگوں سے باتوں میں لگ گئی؛ اس کی نظریں اس دروازے پر گڑی تھیں جسے رات کو توڑا گیا تھا۔ تالا تو اپنی جگہ موجود تھا لیکن ایک طرف کا کنڈا ایسے اکھیڑ لیا گیا تھا جیسے کسی کا دانت نکالا جاتا ہے۔ کچھ دیر تک آنا اس نقصان کا جائزہ لیتی رہی جو اس تنہا اور معمولی سی کوشش کے نتیجے میں ہوا تھا اور ترحم کے احساس کے ساتھ اسے اپنے خاوند کا خیال آیا۔

"کون تھا؟" اس نے پوچھا۔

اس میں ادھر ادھر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

لوگوں نے جواب دیا "کسی کو معلوم نہیں۔ سنا ہے کوئی اجنبی تھا۔"

"ہاں، اجنبی ہی ہو سکتا ہے،" اس کے عقب میں کھڑی ایک عورت بولی۔ "اس قصبے میں تو کوئی چور نہیں ہے۔ یہاں تو ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا ہے۔"

آنا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "ہاں یہ تو ہے،" اس نے کہا اور ہلکے سے مسکرائی۔ وہ پسینے میں تربتر تھی۔ اس کے نزدیک ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کی گردن کی پشت پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔

"کیا وہ سب کچھ لے گئے؟" آنا نے پوچھا۔

"دو سو پیسو اور بلیرڈ کی گیندیں،" بوڑھے نے جواب دیا۔ وہ قدرے غیرمعمولی دلچسپی سے آنا کو دیکھ رہا تھا۔ "آئندہ سے ہمیں آنکھیں کھول کر سونے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔"

آنا نے نظریں پھیر لیں۔ "ہاں یہ تو ہے،" اس نے دوسری بار کہا۔ سر کے اوپر رومال باندھ کر وہ چل پڑی۔ چلتے وقت وہ ذہن سے یہ خیال نکالنے سے قاصر رہی کہ وہ بوڑھا اسے گھورے جا رہا ہے۔

خالی قطعے پر جمع لوگ پندرہ منٹ تک تو باتمیز انداز میں بات چیت کرتے رہے جیسے دروازے کے عقب میں کسی کا جنازہ رکھا ہو۔ پھر وہ سب اضطراب کے عالم میں واپس مڑ کر چوک کی جانب چل دیے۔

بلیرڈ ہال کا مالک قصبے کے میئر اور دو پولیس والوں کے ساتھ، ہال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ٹھگنا اور گول مٹول آدمی تھا، اس کی پتلون پیٹ کے دباؤ کے باعث اپنی جگہ پر ٹکی

ہوئی تھی اور عینک ایسی تھی جیسے عموماً بچے تاروں سے بنا لیا کرتے ہیں، لیکن وہ قصبے کا بےحد معزز آدمی گردانا جاتا تھا۔

ہجوم نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دیوار کے ساتھ لگی آنا اس کا بیان سنتی رہی، حتی کہ ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ تب، گرمی سے مضمحل، وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی، جس کے گرد اس کے شور مچاتے ہوئے پڑوسی جمع تھے۔

بستر میں دراز داماسو بارہا اس سوال پر غور کر چکا تھا کہ پچھلی رات آنا نے سگریٹ پیے بغیر اتنی دیر تک اس کا انتظار کیسے کر لیا تھا۔ اسے مسکراتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوتے اور سر پر سے پسینے میں بھیگا رومال اتارتے دیکھ کر اس نے تقریباً ان پیا سگریٹ کچے فرش پر بجھا کر سگریٹ کے اور بہت سے بجھے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان ڈال دیا اور بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

"تو کیا پتہ چلا؟"

آنا بستر کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"پتا یہ چلا کہ تم چوری کرنے علاوہ جھوٹ بھی بولتے ہو،" اس نے کہا۔

"کیسے؟"

"ایسے کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ دراز میں کچھ بھی نہیں تھا۔"

داماسو کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

"کچھ تھا ہی نہیں۔"

"وہاں دو سو پیسو تھے،" آنا نے کہا۔

"بالکل جھوٹ،" وہ زور سے بولا۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ رازدارانہ لہجے میں بات کرنے لگا۔ "وہاں صرف پچیس سینٹ تھے۔"

اس نے آنا کو اپنی بات کا یقین دلا دیا۔ "روک بہت بدمعاش آدمی ہے،" داماسو نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "اس کی خواہش یہ ہے کہ میں جا کر اس کا جبڑا توڑ دوں۔" آنا زور سے ہنس پڑی۔

"بیوقوف مت بنو۔"

داماسو بھی ہنسنے لگا۔ جس وقت وہ شیو بنا رہا تھا، آنا نے اسے وہ تمام باتیں بتائیں جو وہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ پولیس والے کسی اجنبی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ "کہتے ہیں وہ جمعرات کو قصبے میں وارد ہوا تھا اور کل رات گودی کے اردگرد گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا،" وہ بولی۔ "لیکن اب پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔" داماسو اس اجنبی کے بارے میں سوچنے لگا جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا، ایک لمحے کے لیے اسے یقین ہو گیا کہ واقعی وہ اجنبی ہی اصل مشتبہ کردار ہے۔

"شاید وہ قصبے سے چلا ہی گیا ہو،" آنا نے کہا۔

ہمیشہ کی طرح داماسو کو تیار ہونے میں تین گھنٹے لگے۔ اولیں کام نفاست سے مونچھوں کی مناسب حد تک تراش کا تھا۔ پھر صحن میں نلکے کے نیچے غسل۔ آنا اسی دلچسپی کے ساتھ جس میں اس رات سے لے کر، جب اس نے پہلی بار داماسو کو دیکھا تھا، آج تک کسی

چہرے کے باعث کوئی کمی نہیں آئی تھی، اس کے بالوں میں کنگھی کرنے کے دشوار اور پُرمشقت عمل کا نظروں سے قدم بہ قدم تعاقب کرتی رہی۔ آنا نے جب اسے گھر سے باہر جانے سے قبل سرخ چارخانے والی قمیص پہنے، آئینے میں اپنا معائنہ کرتے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ خود عمررسیدہ اور ناقص ہو چکی ہو۔ داماسو نے کسی مشاق باکسر کی سی چستی کے ساتھ انا کو دوچار جھوٹ موٹ کے مکّے لگانے کی ادا دکھائی۔ آنا نے اسے کلائیوں سے پکڑ لیا۔

"پاس خرچ کے لیے بھی کچھ ہے؟"

"ارے میں امیر آدمی ہوں،" داماسو نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ "میرے پاس دو سو پیسو ہیں۔"

آنا نے دیوار کی طرف منھ کر کے اپنی چولی میں سے کچھ مڑے ہوئے نوٹ نکالے اور ان میں سے ایک پیسو کا نوٹ داماسو کو تھماتے ہوئے بولی، "یہ رکھ لو بڑے آئے ویلنٹینو!"

اس رات داماسو اپنے چند دوستوں کے ہمراہ چوک میں تھا۔ اتوار کے روز گردونواح کے دیہاتوں سے جو لوگ مال اسباب فروخت کرنے قصبے کے بازار میں آتے تھے، وہ آلو کے تلنے اور لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے اسٹالوں کے درمیان اپنے سائبان نصب کر رہے تھے۔ شام کی اوائل ہی سے ان کے خراٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ داماسو کے دوستوں کو بلیرڈ ہال میں چوری کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا ریڈیو پر بیس بال کے مقابلوں کی کمنٹری کے نہ سُن پانے کا تھا۔ بلیرڈ ہال بند ہونے کی وجہ سے وہ کمنٹری سے محروم ہو گئے تھے۔ بیس بال کے بارے میں باتیں کرتے کرتے وہ سینما ہال میں چلے گئے۔ انھوں نے یہ بھی دریافت نہ کیا، اور نہ ان میں سے کسی کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ کون سی فلم چل رہی ہے۔

کانتی فلاس کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ بالکنی کی پہلی قطار میں بیٹھا داماسو بےشرمی سے ہنسے جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے جذبات سے صحت یاب ہو رہا ہو۔ وہ جون کی ایک خوش گوار رات تھی، اور فلم کے لمبے خاموش وقفوں میں، جب پروجیکٹر کی دودھیا شعاع کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، بغیر چھت کے اس ہال میں ستاروں کی خاموشی اپنا بوجھ ڈالتی محسوس ہونے لگتی۔

اچانک اسکرین پر ہلتے ہوئے نقش مدغم ہو کر تھم گئے اور آرکسٹرا کے عقب سے شور سنائی دیا۔ [illegible] چمک میں داماسو کو یوں لگا جیسے اس کی چوری [illegible] ہو گیا ہو اور [illegible] سرعام [illegible] اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن یکدم اس نے دیکھا آرکسٹرا کے قریب سامعین جیسے مفلوج سے ہو گئے تھے، اور پولیس کا ایک سپاہی کسی شخص کو اپنی مٹھی کے گرد لپٹی ہوئی پیٹی کے تانبے کے وزنی بکسوے سے بےرحمی کے ساتھ مارے جا رہا تھا۔ مار کھانے والا ایک دیوقامت کالا تھا۔ عورتوں نے چیخ پکار شروع کر دی، اور پولیس والا، جو کالے کو پیٹ رہا تھا، عورتوں کی چیخوں سے بلند آواز میں چلایا "یہ چور ہے! چور!" کالے نے بڑھک کر کرسیوں کی دو قطاروں کے درمیان رینگنا شروع کر دیا لیکن پولیس نے اس کا تعاقب نہ چھوڑا اور دو سپاہی اس کے پیچھے بھاگے اور سر کے گردوں پر ضربیں لگاتے رہے حتیٰ کہ وہ اسے کمر سے قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تب اس سپاہی نے جو اسے پیٹی سے مار رہا تھا، اس کی کلائیاں کمر کے پیچھے

رسی سے باندھ دیں اور تین سپاہی اسے دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف لے گئے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ داماسو کو تب ہی پتا چلا جب وہ اس کے قریب سے گزرے۔ کالے آدمی کی قمیص پھٹ چکی تھی اور اس کا چہرہ دھول، پسینے اور خون کے آمیزے سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا اور پولیس والوں کو قاتل اور خونی کے القاب سے پکار رہا تھا۔ تب پروجیکٹر دوبارہ چلا دیا گیا اور فلم جاری ہو گئی۔

داماسو دوبارہ نہیں ہنسا۔ اس نے باقی کی فلم ٹکڑوں میں دیکھی جن کا ایک دوسرے سے کم ہی تعلق تھا، اور وہ لگاتار سگریٹ پھونکتا رہا، یہاں تک کہ ہال کی بتیاں جلا دی گئیں اور حاضرین نے ایک دوسرے کی جانب یوں دیکھا جیسے حقیقت سے خوف زدہ ہوں۔ "اچھی فلم تھی،" کسی نے جو داماسو کے قریب تھا، کہا۔ داماسو نے اسے مڑ کر نہ دیکھا۔

"کانتی فلاس اچھا ایکٹر ہے،" اس نے جواب دیا۔

لوگوں کی رو کے ساتھ بہتے بہتے وہ دروازے تک آ گیا۔ چھابڑیوں پر خوردونوش کا سامان بیچنے والے گھروں کو جا رہے تھے۔ گیارہ کے بعد کا عمل تھا لیکن بازار میں بہت سے لوگ کھڑے اس انتظار میں تھے کہ کب فلم دیکھنے والے باہر آئیں تاکہ ان سے کالے کی گرفتاری کی تفصیل دریافت کی جا سکے۔

اس رات کمرے میں داخل ہوتے وقت داماسو اتنا محتاط تھا کہ آنا کو، جو آدھی سوئی ہوئی تھی، اس کی موجودگی کا پتا اس وقت چلا جب وہ بستر میں لیٹ کر دوسرا سگریٹ پی رہا تھا۔

"کھانا چولھے پر رکھا ہے،" وہ بولی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے،" داماسو نے جواب دیا۔

آنا نے آہ بھری اور بیدار ہوئے بغیر کہا، "میں خواب دیکھ رہی تھی کہ نورا مکھن سے پتلیاں بنا رہی ہے۔" پھر یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ سونے کی نیت سے نہیں لیٹی تھی تاہم سو گئی تھی۔ وہ بستر میں پلٹی، چہرہ داماسو کی جانب موڑا اور غیرہ ہو کر اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

"وہ اجنبی پکڑا گیا ہے،" آنا نے کہا۔

داماسو نے بولنے سے قبل ذرا توقف کیا۔

"کس نے خبر دی ہے؟"

"انھوں نے اسے سینما ہال میں سے پکڑا ہے،" وہ بولی۔ "سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔"

آنا نے اجنبی کی گرفتاری کی غلط سلط روداد داماسو کو سنائی۔ داماسو نے اس کی تصحیح کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

"ہائے بیچارہ!" آنا نے آہ بھری۔

"بیچارہ کیوں؟" داماسو غصے میں آتے ہوئے بولا۔ "تمھارا دل تب خوش ہوتا اگر اس کی جگہ میں شکنجے میں ہوتا؟"

آنا اس کی طبیعت کے اتارچڑھاؤ سے خوب واقف تھی، اس لیے خاموش رہی۔ پو پھٹنے تک وہ اسے بستر میں بیٹھے، سگریٹ پیتے اور دمے کے مریضوں کی طرح سانس لیتے محسوس کرتی

رہی۔ ایک بار اسے لگا جیسے وہ بستر سے نکلا اور کسی غیرواضح تلاش میں، جس میں وہ بصارت سے زیادہ حس لامسہ سے کام لیتا معلوم ہو رہا تھا، کمرے کی تمام چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا، پھر پندرہ منٹ سے زیادہ دیر تک بستر کے نیچے کی زمین کھرچتا رہا۔ پھر انا نے اندھیرے میں اسے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ہر کام حتی الامکان خاموشی سے کر رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ انا اس سارے عمل کے دوران، اسے یہ احساس دلا کر کہ وہ سو رہی ہے، اس کی لگاتار مدد کر رہی تھی۔ انا کے ذہن میں کوئی قدیم، خوابیدہ حس بیدار ہوتی اور وہ جان گئی کہ داماسو پچھلی رات فلم دیکھنے گیا ہوا تھا اور یہ بھی سمجھ گئی کہ اس نے گیندیں ابھی ابھی بستر کے نیچے کہیں دفن کی ہیں۔

سوموار کو جب بلیرڈ ہال کھلا، تو پرجوش گاہکوں کے ایک ہجوم نے اس پر ہلا بول دیا۔ بلیرڈ کی میز جامنی کپڑے سے ڈھکی رکھی تھی جیسے وہ منظر کسی بلیرڈ ہال کا نہیں بلکہ جنازگاہ کا ہو۔ دیوار پر ایک اعلان چسپاں تھا: "گیندیں ختم، بلیرڈ بند۔" لوگوں نے اندر آ آ کر اس اعلان کو یوں پڑھا جیسے وہ اخبار کی کوئی خبر ہو۔ چند ایک تو اس کے سامنے کھڑے کافی دیر تک ناقابل فہم عقیدت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے رہے۔

داماسو بلیرڈ ہال میں داخل ہونے والے اولیں گاہکوں میں سے تھا۔ اپنی زندگی کا ایک حصہ وہ ان بنچوں پر بیٹھے گزار چکا تھا جو ہال میں تماشائیوں کے لیے مخصوص تھے، اور دروازہ کھلتے ہی وہ وہاں موجود تھا۔ آج ہال میں موجود ہونا البتہ اتنا ہی مشکل، لیکن اتنا ہی غیرارادی کام تھا جتنا تعزیت کے لیے کہیں جانا۔ اس نے کاؤنٹر کی دوسری جانب کھڑے مالک کی کمر تھپتھپائی اور کہا،

"کسی اذیت کی بات ہے، روک؟"

مالک نے افسردگی سے سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر دکھی سی مسکراہٹ تھی۔ آہ بھر کر اس نے جواب دیا، "ہاں بھئی، وہ تو ہے۔" اور وہ دوبارہ گاہکوں کو مشروبات فراہم کرنے میں لگ گیا، جبکہ داماسو کونے میں دھرے اسٹول پر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا جامنی کفن میں لپٹی بلیرڈ کی میز کے بارے میں سوچ بچار کرتا رہا۔

"کیسی عجیب بات ہے،" اس نے کہا۔

"ہاں،" ایک اور شخص نے، جو داماسو کے برابر والے اسٹول پر بیٹھا تھا، اس سے اتفاق کیا۔ "لگتا ہے جیسے یہ ماتم کا ہفتہ ہو۔"

جب گاہکوں کی اکثریت دوپہر کے کھانے کے لیے گھر جا چکی، تو داماسو نے ریکارڈوں کی مشین میں چونی ڈالی اور میکسیکو کے ایک گیت کا انتخاب کیا جس کی جگہ اسے مشین کے کارڈ پر زبانی یاد تھی۔ روک میز کرسیاں اٹھا اٹھا کر ہال کی پچھلی دیواروں کے ساتھ رکھنے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" داماسو نے پوچھا۔

"تاش کے لیے میزیں لگا رہا ہوں،" روک نے کہا۔ "جب تک نئی گیندیں نہیں آتیں، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔"

دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کرسی اٹھائے رک رک کر چلتا ہوا وہ کسی نئے نئے رنڈوے کی

طرح لگ رہا تھا۔

"کب آ رہی ہیں گیندیں؟" داماسو نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ایک مہینا لگ جائے گا۔"

"اس وقت تک تو پرانی گیندیں بھی برآمد ہو چکی ہوں گی،" داماسو نے کہا۔

روک نے چھوٹی چھوٹی میزوں کی قطاروں کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ "نہیں، وہ نہیں ملیں گی،" اس نے ماتھے کا پسینا آستین سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کالے کو ہفتے کے دن سے بھوکاپیاسا رکھا ہوا ہے مگر وہ بتا کر ہی نہیں دیتا کہ گیندیں کہاں ہیں۔" اس نے پسینے سے دھندلی عینک کے شیشوں میں سے داماسو کو غور سے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے اس نے دریا میں پھینک دی ہیں۔"

داماسو نے دانتوں میں اپنے ہونٹ دبا لیے۔

"اور دو سو پیسو؟"

"وہ بھی،" روک نے کہا۔ "اس کے پاس سے صرف تیس ہی برآمد ہوئے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ داماسو شاید کبھی بھی اس احساس کی وضاحت نہ کر پاتا کہ اس ایک نظر نے جیسے ان دونوں کے درمیان ایک مجرمانہ سا تعلق قائم کر دیا۔ اس دوپہر انا نے غسل خانے کی کھڑکی میں سے داماسو کو مکےبازوں کی طرح ناچتے ہوئے گھر لوٹتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے کے اندر آ گئی۔

"سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے،" داماسو نے کہا۔ "بڈھے نے صبرشکر کر کے نئی گیندوں کا آرڈر بھی دے دیا ہے۔ اب صرف اس وقت تک انتظار کرنے کی ضرورت ہے جب تک لوگ یہ قصہ بھول نہیں جاتے۔"

"اور کالے کا کیا بنے گا؟"

"کیا بنے گا؟" داماسو نے کندھے اچکائے۔ "اگر اس کے پاس سے گیندیں برآمد نہ ہوئیں تو اسے رہا کرنے کے سوا کیا چارہ رہ جائے گا؟"

کھانے کے بعد وہ دونوں گھر کے سامنے والے دروازے کے آگے بیٹھ کر ہمسایوں سے باتیں کرتے رہے حتی کہ سینما ہال کا لاؤڈسپیکر بند ہو گیا۔ بستر میں دراز ہوتے وقت داماسو پُرجوش تھا۔

"ابھی ابھی مجھے ایک نہایت زبردست کام کا خیال آیا ہے،" اس نے کہا۔

انا کو لگا جیسے وہ سورج غروب ہونے کے وقت سے اسی کام کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا۔

"میں ایک قصبے سے دوسرے، اور دوسرے سے تیسرے تک سفر کرتا رہوں گا،" داماسو نے بات جاری رکھی، "اور ایک سے بلیرڈ کی گیندیں چرا کر دوسرے میں بیچتا جاؤں گا۔ ہر قصبے میں بلیرڈ ہال تو ہوتا ہی ہے۔"

"یہاں تک کہ کوئی تمھیں گولی مار دے گا۔"

"کیسی گولی؟" اس نے کہا۔ "وہ سب فلموں میں ہوتا ہے۔" کمرے کے درمیان میں کھڑا وہ اپنے ہی جوش وجذبے سے بےحال ہوا جا رہا تھا۔ انا کپڑے بدلنے لگی۔ وہ بظاہر لاتعلقی سے،

لیکن دراصل گہری ہمدردانہ توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں سُولوں کی قطار خریدوں گا۔" داماسو نے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھیلی ہوئی ایک خیالی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہاں سے وہاں تک۔ اور پچاس جوڑی جوتے۔"

"اگر خدا کو منظور ہوا تو" انا نے کہا۔

داماسو سنجیدگی سے انا کو دیکھنے لگا۔

"تمھیں میرے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں" اس نے کہا۔

"انھیں میرے حالات سے دور کا بھی واسطہ نہیں" انا نے جواب دیا۔ اس نے لیمپ بجھا دیا، دیوار کے ساتھ لگ کر بستر پر لیٹ گئی اور واضح تلخی سے بولی، "جب تم تیس برس کے ہو گے تو میں سینتالیس کی ہو جاؤں گی۔"

"فضول باتیں مت کرو" داماسو نے کہا۔

وہ ابھی جیبوں میں دیاسلائی ڈھونڈ رہا تھا۔ "تمھیں لوگوں کے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی" اس نے قدرے چکرا کر کہا۔ انا نے اس کے لیے ماچس کی تیلی جلائی اور اس وقت تک شعلے کو جلتے دیکھتی رہی جب تک وہ بجھ نہ گیا۔ تب اس نے تیلی زمین پر پھینک دی۔ داماسو بستر میں لیٹا، باتیں کرتا رہا۔

"پتا ہے بلیرڈ کی گیندیں کس چیز سے بنتی ہیں؟"

انا نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہاتھی دانت سے۔" وہ کہتا رہا۔ "اور پتا ہے، وہ دنیا میں اتنی کم ہیں کہ انھیں منگوانے میں ایک مہینا لگتا ہے۔"

"سو جاؤ" انا نے قطع کلامی کی۔ "مجھے صبح پانچ بجے اٹھنا ہے۔"

داماسو اب اپنے روزمرہ کے معمول کی جانب لوٹ چکا تھا۔ تمام دن وہ بستر میں لیٹے گزرتا اور قیلولے کے بعد باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگتا۔ رات کو وہ بلیرڈ ہال میں بیٹھ کر بیس بال کی کمنٹری سنا کرتا۔ جیسے جوش وخروش سے وہ نت نئے منصوبے سوچتا تھا، اتنے ہی جوش وخروش سے انھیں فراموش بھی کر دیا کرتا تھا۔

سنیچر کے دن اس نے اپنی بیوی سے پوچھا، "تمھارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"گیارہ پیسو ہیں۔" اس نے کہا، اور نرمی کے ساتھ اضافہ کیا، "مکان کا کرایہ۔"

"میں تمھارے ساتھ ایک سودا کرتا ہوں۔"

"کیا؟"

"وہ رقم مجھے ادھار دے دو۔"

"ہمیں کرایہ ادا کرنا ہے۔"

"بعد میں دے دیں گے۔"

انا نے نفی میں سر ہلایا۔ داماسو نے اس کی کلائی دبوچ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔ وہ میز کے پاس بیٹھی تھی، جہاں ابھی دونوں نے ناشتہ ختم کیا تھا۔

"چند دنوں کی بات ہے" اس نے پریشانی ملائمت سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ "گیندیں بک

جائیں گی تو ریل پیل ہو جائے گی۔"

انا راضی نہ ہوئی۔

اس رات داماسو اسے فلم دکھانے لے گیا اور سارا وقت اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھے رہا حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ وقفے کے دوران میں اپنے دوستوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ فلم بھی انھوں نے توجہ سے نہ دیکھی۔ فلم ختم ہوئی تو داماسو بیتاب سا تھا۔

"تب تو مجھے کہیں ڈاکا مارنا پڑے گا" اس نے کہا۔

انا نے کندھے اچکائے۔

"جو بھی پہلا شخص مجھے نظر آیا میں اس کا بھیجا نکال دوں گا۔" فلم سے باہر آنے والے مجمعے میں داماسو اسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ "اور قتل کے جرم میں مجھے جیل بھیج دیا جائے گا۔" انا اندر ہی اندر ہنستی رہی مگر ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اگلی صبح ایک طوفانی رات گزرنے کے بعد داماسو صریحی سرعت سے، اور آپ کو خوفزدہ کرنے کی نیت سے، باہر جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ غرایا۔

"میری واپسی کی توقع نہ رکھنا۔"

انا نے خفیف سا ڈر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"خدا کرے تمھارا سفر اچھا کٹے۔" اس نے بلند آواز میں دعا دی۔

دروازہ دھڑ سے بند ہونے کے وقت سے داماسو کے لیے اتوار کا خالی اور نہ ختم ہونے والا دن شروع ہوا۔ بڑے بازار میں سجی چمک دار پرتیں، اور رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عورتیں جو اپنے بچوں کو ہمراہ لیے آٹھ بجے کی عبادت کے لیے گرجے کی طرف رواں تھیں چوک کو ایک خوشی کی تاثر دے رہی تھیں، لیکن گرمی کے باعث فضا میں گھٹن صبح سویرے ہی شروع ہو چکی تھی۔

داماسو نے سارا دن بلیرڈ ہال میں گزارا۔ صبح کے وقت لوگ گروہوں میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے اور دوپہر کے کھانے سے قبل تھوڑی دیر کے لیے ہال میں گاہکوں کا خاصا ہجوم ہو گیا۔ لیکن یہ بات مسلّم تھی کہ لوگوں کی نظر میں بلیرڈ ہال کی کشش ختم ہو گئی تھی۔ صرف سورج ڈھلنے پر جب بیس بال کی کمنٹری شروع ہوئی تب بلیرڈ ہال کی تھوڑی بہت پرانی چہل پہل اور زندگی دوبارہ دیکھنے میں آئی۔

بلیرڈ ہال کے بند ہونے پر داماسو کو احساس ہوا کہ اس کے پاس جانے کو کوئی جگہ نہیں ہے اور چوک میں سے تمام زندگی نچڑ چکی ہے۔ اس نے گھاٹ کی متوازی سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ کہیں دور سے خوشی کی موسیقی کی آواز آ رہی تھی، وہ اسی جانب بڑھتا گیا۔ سڑک کے اختتام پر ایک بہت وسیع لیکن خالی ناچ گھر تھا، جس کی کاغذ کے پھولوں سے سجاوٹ کی گئی تھی جن کے رنگ اڑ چکے تھے۔ اس کے ہال کے عقب میں لکڑی کے بنے پلیٹ فارم پر ایک بینڈ تھا۔ میک اپ کی دم گھونٹنے والی بو ہوا میں تیر رہی تھی۔

داماسو جا کر کاؤنٹر پر بیٹھ گیا۔ جب گانا ختم ہوا، مجیرے بجانے والا لڑکا ناچنے والوں کے درمیان پھر پھر کر ان سے سکّے اکٹھے کرنے لگا۔ ایک لڑکی اپنے ہم رقص کو ہال کے فرش پر اکیلا چھوڑ کر داماسو کی جانب بڑھی۔

"اور، جانِ من، کیا خبریں ہیں؟"

داماسو نے بیٹھنے کے لیے اسے اپنے ساتھ کی جگہ پیش کی۔ شراب فروش، چہرے پر پوڈر لگائے اور کان میں کارنیشن کا پھول اڑسے، ان کے پاس آیا۔ باریک اور تیز آواز میں اس نے پوچھا۔

"کیا پیو گے؟"

لڑکی نے مڑ کر داماسو کی جانب دیکھا۔

"ہم کیا پییں گے؟"

"کچھ نہیں"

"چلو میں پلا دیتی ہوں۔"

"نہیں، یہ بات نہیں" داماسو نے کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔"

"ہائے!" شراب فروش نے آہ بھر کر کہا۔ "اتنی خوبصورت آنکھوں والے بھی بھوکے؟"

داماسو اور وہ لڑکی دونوں اٹھ کر ہال کے دوسرے سرے پر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے لڑکی بہت ہی کم عمر لگ رہی تھی۔ لیکن سرخی پوڈر اور بناؤ سنگھار کی وجہ سے اس کی اصل عمر کا پتہ لگانا ناممکن تھا۔ کھانا کھانے کے بعد داماسو لڑکی کے پیچھے پیچھے اندھیرے برآمدے کے عقب میں ایک کمرے میں چلا گیا جہاں باہر سوئے ہوئے جانوروں کے سانس لینے کی آواز ان کے کانوں میں آ رہی تھی۔ بستر پر ایک شیرخوار بچہ لیٹا ہوا تھا جس کے جسم پر رنگ برنگے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے۔ لڑکی نے وہ چیتھڑے اٹھا کر لکڑی کے ایک صندوق میں ڈال دیے اور بچے کو ان کے اوپر لٹا کر صندوق فرش پر رکھ دیا۔

"چوہے اسے کاٹ کھائیں گے" داماسو نے کہا۔

"نہیں، وہ اسے نہیں کھاتے۔"

لڑکی نے جو سرخ لباس پہن رکھا تھا اسے اتار کر دوسرا بڑے بڑے پیلے پھولوں والا لباس پہن لیا جس کا گلا خاصا کھلا اور نیچا تھا۔

"اس بچے کا باپ کون ہے؟" داماسو نے دریافت کیا۔

"خدا جانے۔" کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

داماسو نے دروازے کی چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز سنی۔ کپڑے پہنے پہنے بستر پر دراز ہو کر اس نے یکے بعد دیگرے کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ ہال میں بجنے والی دھنوں کی دھمک سے بستر کی کمانیاں تک جھنجھنا رہی تھیں۔ اسے پتہ نہ چلا کہ اسے کس وقت نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی، موسیقی بند ہو جانے کے سبب کمرہ پہلے کی نسبت بڑا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔

لڑکی بستر کے قریب کھڑی اپنا لباس اتار رہی تھی۔

"کیا وقت ہو رہا؟"

"چار بجے ہوں گے،" لڑکی نے کہا۔ "بچہ رویا تو نہیں؟"

"نہیں، میرے خیال میں تو نہیں،" داماسو نے جواب دیا۔

لڑکی بستر میں اس کے ساتھ، بہت ہی قریب لیٹ گئی۔ اس کی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے

وہ ایسی نگاہوں سے جو پوری طرح داماسو پر مرکوز نہ تھیں، اسے گھورتی رہی۔ داماسو کو احساس ہوا کہ لڑکی نے خاصی شراب پی رکھی ہے۔ اس نے بتی بجھانے کی کوشش کی۔

"رہنے دو،" لڑکی نے کہا۔ "میں تمہاری آنکھوں کو دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔"

تڑکے کے بعد سے کمرہ ایسی آوازوں سے بھر گیا جیسی عموماً دیہاتوں میں آیا کرتی ہیں۔ بچہ رونے لگا۔ لڑکی اسے اٹھا کر بستر میں لے آئی اور دودھ پلانے لگی۔ اس دوران میں وہ ایک سہل سی لوری بھی گنگناتی رہی حتیٰ کہ وہ تینوں دوبارہ سو گئے۔ داماسو کو پتا ہی نہ چلا کہ سات بجے کے قریب لڑکی بیدار ہو کر کمرے سے باہر گئی تھی اور بچے کو کہیں چھوڑ آئی تھی۔

"سب لوگ گھاٹ پر جا رہے ہیں،" لڑکی نے کہا۔

داماسو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ رات بھر میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں سویا۔

"کس لیے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کالے کو دیکھنے جس نے گیندیں چرائی تھیں" لڑکی نے کہا۔ "آج وہ اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں۔"

داماسو نے سگریٹ سلگایا۔

"بے چارہ!" لڑکی نے آہ بھری۔

"بے چارہ کیوں؟" داماسو نے کہا۔ "اسے چوری کرنے کو کس نے کہا تھا؟"

لڑکی نے ایک لمحے کو اپنا سر اس کے سینے میں چھپا لیا۔ پھر آہستہ سے بولی،

"وہ چور نہیں ہے۔"

"کون کہتا ہے؟"

"مجھے پتا ہے،" لڑکی نے کہا۔ "جس رات بلیرڈ ہال میں چوری ہوئی، وہ گلوریا کے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ اس سے اگلے روز بھی وہ شام پڑنے تک اسی کے کمرے میں تھا۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ اسے سنیما ہال میں سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"تو گلوریا نے پولیس کو بتایا کیوں نہیں؟"

"کالے نے بتایا تھا۔ لیکن قصبے کا میئر گلوریا کے کمرے میں آیا، اس کا سارا سامان الٹ پلٹ کر دیا اور اسے دھمکی دی کہ اسے بھی شریک جرم کے طور پر دھر لیا جائے گا۔ آخرکار بیس پیسو دے کر بےچاری نے اپنی جان چھڑائی۔"

آٹھ بجے داماسو اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہیں رہ جاؤ،" لڑکی نے کہا۔ "آج دوپہر تمہارے لیے مرغا ذبح کر کے پکاؤں گی۔"

داماسو نے کنگھی کو اپنی پتلون کی جیب میں اڑسنے سے پہلے ہتھیلی پر دو تین بار جھٹکا۔ "مشکل ہے،" اس نے لڑکی کو کلائیوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے ابھی ابھی منہ دھویا تھا اور وہ واقعی بہت کم عمر تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کی وجہ سے اس کے چہرے پر بےبسی کا تاثر تھا۔ وہ بازو داماسو کی کمر کے گرد حمائل کیے کھڑی رہی۔

"نہیں، یہیں رہ جاؤ" لڑکی نے اصرار کیا۔

"بھیک کے لیے؟"

لڑکی شرما کر داماسو سے الگ ہو گئی۔

"مسخرہ!" اس نے کہا۔

اس صبح بھکر ہوئی تھی لیکن قصبے میں پھیلا ہوا جوش و خروش معدی بیماری کی طرح اسے بھی لگ گیا۔ سابقہ دنوں کی نسبت اس ہفتے کی دھلائی اس نے زیادہ تیزی سے اکٹھی کی، اور گھاٹ پر کالے کی روانگی کا منظر دیکھنے کے لیے چل دی۔ لوگوں کا بے صبرا ہجوم دخانی کشتیوں کے قریب منتظر تھا، جو روانہ ہونے والی تھیں۔ داماسو بھی وہیں تھا۔

انا نے انگلیوں سے اس کے گردوں کے پاس ٹہوکا دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" داماسو نے چونک کر پوچھا۔

"تمھیں خدا حافظ کہنے [illegible] آئی ہوں۔"

داماسو نے نزدیک کے ایک کھمبے کو کس کر مکا لگایا۔

"لعنت ہو تم پر،" اس نے کہا۔

سگریٹ سلگا کر خالی پیکٹ اس نے دریا میں پھینک دیا۔ انا نے ایک نیا بھرا ہوا پیکٹ اپنی اسکرٹ کے اندر سے نکال کر داماسو کی قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔

"مجال ہے جو تم نے زندگی سے کچھ سیکھا ہو،" داماسو نے کہا۔

انا زور سے ہنسی۔

تھوڑی دیر کے بعد کالے کو لا کر عرشے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اسے چوک کے عین درمیان میں سے لے جایا گیا تھا اور اس کی کلائیاں کمر کے پیچھے رسی سے بندھی ہوئی تھیں جسے پولیس کے ایک سپاہی نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دو اور سپاہی بندوقیں اٹھائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ [illegible] کا دھڑ ننگا تھا۔ نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور کسی مکے‌باز کی طرح اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ وہ مستقل وقار کے ساتھ ہجوم کے مذاق اور فقروں کو نظرانداز کر رہا تھا۔ بلیرڈ ہال کے دروازے پر، جہاں اس تماشے کو دونوں حصے دیکھنے کے لیے زیادہ ہجوم جمع تھا، ہال کا مالک خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے، کالے کو گزرتا دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگ ایک طرح کے اشتیاق سے اس پر نظر جمائے ہوئے تھے۔

کشتی فوراً ہی روانہ ہو گئی۔ کالا عرشے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں تیل کے ایک بڑے ڈرم کے ساتھ باندھ دیے گئے تھے۔ جب دریا کے درمیان میں پہنچ کر کشتی نے آخری بار سیٹی بجائی اور مڑی تو کالے کی کمر چمک اٹھی۔

"بے چارہ،" انا نے سرگوشی کی۔

"جرائم پیشہ، حرام خور،" انا کے قریب ہی کسی نے پولیس والوں کو گالی دی۔ "کسی انسان کا جسم کتنی دیر تک دھوپ کی تپش سہ سکتا ہے؟"

داماسو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ آواز ایک بے حد موٹی عورت کی تھی۔ وہ چوک کی طرف چل دیا۔ "تم زیادہ ہی بکواس کرتی ہو،" اس نے انا کے کان میں سرگوشی کی۔ "چلا چلا کر سب کو ساری کہانی کیوں نہیں سنا دیتیں؟" وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی بلیرڈ ہال تک گئی۔

"گھر چل کر کپڑے تو تبدیل کر لو،" اس سے جدا ہوتے وقت انا نے کہا۔ "فقیروں جیسے لگ رہے ہو۔"

کالے کے واقعے کی بدولت بلیرڈ ہال کے اندر بہت سے جوشیلے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ روک ان سب کو ایک ساتھ مشروبات فراہم کرنے کی کوشش میں کئی میزوں کے آرڈر اکٹھے لے رہا تھا۔ داماسو منتظر رہا کہ کب روک اس کے قریب سے گزرے۔

"میری مدد کی ضرورت ہے؟" داماسو نے پوچھا۔

روک نے بیئر کی آدھی درجن بوتلیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ گلاس بوتلوں کے اوپر اوندھے رکھے تھے۔

"خدا تمھارا بھلا کرے،" روک نے کہا۔

داماسو بوتلیں اٹھا کر مختلف میزوں تک لے گیا اور دوپہر کے کھانے کے وقت تک، جب گاہک بالآخر گھروں کو روانہ ہو گئے، لوگوں کے آرڈر لیتا اور بوتلیں لاتا لے جاتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا، انا نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ اس نے داماسو کا ہاتھ اٹھا کر اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر رکھا۔

"یہاں محسوس کرو،" اس نے کہا۔ "کچھ حرکت محسوس ہوئی؟"

داماسو نے کسی جذبے یا شوق کا اظہار نہ کیا۔

"اندر وہ لاتیں چلا رہا ہے،" انا نے کہا۔ "ساری رات یہی کرتا رہتا ہے۔"

لیکن اس نے کوئی ردعمل نہ دکھایا۔ اپنے آپ میں گم، دوسرے روز وہ صبح سویرے ہی گھر سے باہر نکل گیا اور آدھی رات کے بعد لوٹا۔ پورا ہفتہ یوں ہی گزرا۔ جو چند لمحے وہ گھر میں بسر کرتا ان میں بھی بستر میں لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور گفتگو سے گریز کرتا۔ انا نے بھی اپنے کام میں انہماک بڑھا دیا۔ ان دونوں کے تعلق کے آغاز میں بھی ایک موقعے پر اس نے اسی طرح کا رویہ اختیار کر لیا تھا، لیکن تب انا اسے اچھی طرح نہیں جانتی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ ایسے حالات میں داماسو کی طرف زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اس وقت داماسو نے اس کی پیٹ پر چڑھ کر اسے اتنی زور زور سے مکے مارے تھے کہ وہ لہولہان ہو گئی تھی۔

اس بار وہ انتظار کرتی رہی۔ رات کو وہ لیمپ کے نزدیک سگریٹوں کا ایک پیکٹ رکھ دیا کرتی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ داماسو بھوک پیاس برداشت کر سکتا ہے مگر اسے سگریٹ کی طلب کی سہار نہیں۔ بالآخر جولائی کے وسط میں ایک روز داماسو شام پڑتے ہی گھر لوٹ آیا۔ انا اسے دیکھ کر سخت مضطرب ہوئی۔ اس کے اتنی جلدی گھر واپس آنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہے جس کے بارے میں وہ انا سے بات کرنا چاہتا ہے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا، لیکن بستر میں داخل ہونے سے پہلے داماسو کھویا کھویا لگ رہا تھا اور نرمی سے باتیں کر رہا تھا۔ یکلخت اس نے کہا،

"میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی۔"

آنا نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ رسالوں کے سرورق جنہیں اس نے خود رسالوں سے اتار کر دیواروں پر چسپاں کیا تھا اور جن پر مختلف فلم اسٹاروں کی تصویریں تھیں اب پھیکے اور بدرنگ ہو چلے تھے۔ اب اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ ان میں سے کتنے مرد بستر پر سے روزانہ لگاتار دیکھے جاتے رہنے کی بدولت اب غائب ہو چکے ہیں اور جاتے جاتے اپنی تصویروں کے رنگ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

"مجھ سے اکتا گئے ہو؟" آنا نے پوچھا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ اس قصبے سے اکتا گیا ہوں۔"

"باقی تمام قصبے بھی اسی جیسے ہیں۔"

"گیندیں بھی نہیں بیچ سکتا۔"

"گیندوں کی فکر چھوڑو۔" آنا نے کہا۔ "جب تک خدا نے مجھے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی طاقت دے رکھی ہے، تمہیں کوئی خطرہ مول لینے پھرنے کی کیا ضرورت ہے؟" پھر اس نے نرمی سے صاف کیا، "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے یہ کام کیا کیوں؟"

بولنے سے پہلے داماسو نے سگریٹ ختم کیا۔

"وہ اتنا آسان کام تھا کہ مجھے تعجب تھا کہ کسی اور کو کیوں نہیں سوجھا۔" اس نے کہا۔

"پیسے کی خاطر تو ٹھیک تھا۔" آنا نے اعتراف کیا، "لیکن کوئی اور گیندیں چرانے کی حماقت نہ کرے۔"

"وہ تو میں نے سوچے بغیر ہی کیا تھا۔" داماسو نے کہا۔ "میں واپس آنے لگا تھا جب مجھے گیندیں کاؤنٹر کے پیچھے ایک ڈبے میں رکھی دکھائی دیں اور میں نے سوچا اتنی محنت کے بعد خالی ہاتھ کیوں واپس جاؤں۔"

"یہی تمہاری غلطی تھی۔" آنا نے کہا۔

داماسو کو کچھ طمینان کا احساس ہوا۔ "اور نئی گیندیں آ ہی نہیں چکتیں۔" وہ بولا۔ "شک اب تو یہ پتہ چلا ہے کہ وہ اور بھی مہنگی ہو گئی ہیں اس لیے روک نے آرڈر ہی منسوخ کر دیا ہے۔" اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا، اور جیسے جیسے وہ باتیں کرتا گیا، اسے اپنے دل پر سے تیرہ خیالات کا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے انا کو بتایا کہ ہال کا مالک بلیرڈ کی میز ہی فروخت کرنے کے درپے ہے۔ میز زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ نوآموز کھیلنے والوں کی بےڈھنگی حرکتوں سے میز کا کپڑا کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور اس پر رنگارنگ کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ میز کو مکمل نئے کپڑے کی ضرورت تھی۔ ہال کے گاہکوں کے لیے، جو بلیرڈ کھیلتے کھیلتے بوڑھے ہوئے تھے، اس دوران میں سوائے بیس بال کی کمنٹری سننے کے اور کوئی شغل نہیں تھا۔

"سو،" داماسو نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے کہا "نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تمام قصبے کی حق تلفی کی ہے۔"

"اور کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔"

"اگلے ہفتے بیس بال کے مقابلے بھی ختم ہو جائیں گے۔" داماسو نے کہا۔

"یہ تو اتنی پریشانی کی بات نہیں۔" آنا نے کہا۔ "یہ سوچو کہ اس بیچارے کالے کا کتنا بُرا

حشر ہوا ہے؟"

جب وہ داماسو کے کندھے سے لگی بستر پر دراز تھی، جیسے اس کے ساتھ تعلقات کے اوائل میں کبھی ہوا کرتی تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے اس کے سگریٹ ختم کرنے کا انتظار کیا، تب محتاط آواز میں بولی:

"داماسو۔"

"ہاں، کیا بات ہے؟"

"گیندیں واپس کر دو۔"

اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"میں خود کئی دن سے یہی سوچ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "مگر یہ پتا نہیں چل رہا کہ کیسے کروں۔"

انہوں نے طے کیا کہ گیندوں کو کسی ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں لوگوں کا عام گزر ہو۔ مگر پھر آنا نے سوچا کہ اس حرکت سے بلیرڈ ہال کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا مگر کالے کا معاملہ یوں ہی اٹکا رہے گا۔ پولیس والے پتہ نہیں گیندوں کی برآمدگی سے کیا مطلب نکالیں اور کالے آدمی کو شک کا ذرا سا فائدہ بھی نہ دیں۔ اور یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ گیندیں کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بھی لگ سکتی ہیں جو انہیں واپس کرنے کی بجائے خود بیچ کھانے کا ارادہ کر لے۔

"اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بہتر یہی ہو گا کہ اسے ٹھیک سے کیا جائے۔" آنا نے بات مکمل کی۔

انہوں نے فرش کھود کر گیندیں نکالیں۔ آنا نے انہیں اخبار کے کاغذوں میں لپیٹا، ایسے کہ باہر کی کاغذ کی تہوں سے پیکٹ کے اندر ملفوف اشیا کی شکل کا اندازہ نہ کیا جا سکے، اور انہیں صندوق کے اندر رکھ دیا۔

"مناسب موقعے کا انتظار ضروری ہے۔" آنا نے کہا۔

لیکن اس مناسب موقعے کا انتظار کرتے کرتے ہفتوں گزر گئے۔ بیس اگست کی رات کو گیندوں کی چوری ہونے کے دو ماہ بعد، جب داماسو نے روک کو دیکھا تو وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا پنکھے سے مچھروں کو بھگانے میں مصروف تھا۔ ریڈیو بند ہونے کے باعث اس کی تنہائی اور زیادہ شدید لگ رہی تھی۔

"میں نے تمہیں کہا بتایا تھا؟" روک نے یوں جیسے اپنی پیشین گوئی کے پورا ہونے پر مسرور ہو داماسو سے کہا۔ "دیکھ لو کاروبار کا کباڑا ہو گیا ہے؟"

داماسو نے رکارڈوں کی مشین میں ایک سکہ ڈالا۔ گانے کی اونچی آواز اور مشین کے رنگوں کی نمائش داماسو کی نظر میں گویا اس کی اپنی وفاداری کا پرشور ثبوت تھے۔ لیکن اس کا تاثر یہ تھا کہ یہ بات روک کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور الٹے سیدھے دلائل سے روک کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جوں ہی وہ کوئی دلیل دیتا، روک جذباتی ہوئے بغیر اور اپنے ہاتھ کے پنکھے کی الکل بےجُز حرکت کا تواتر قائم رکھے رکھے اس کی دلیل کی دھجیاں اڑا دیتا۔

"کچھ نہیں کیا جا سکتا،" وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ بال کے مقابلے قیامت تک تو جاری نہیں رہ سکتے۔"

"ہو سکتا ہے گیندیں برآمد ہو جائیں۔"

"نہیں ہوں گی۔"

"وہ کالا انھیں کھا تو نہیں گیا ہوگا۔"

"پولیس نے ہر جگہ تلاشی لے لی تھی،" روک نے رچ کر دینے والے یقین کے ساتھ کہا۔ "اس نے انھیں دریابُرد کر دیا ہے۔"

"معجزہ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"بدبختی گھونگے کی رفتار سے چلتی ہے۔ تم معجزوں پر ایمان رکھتے ہو؟"

"ہاں، کبھی کبھار،" داماسو نے کہا۔

جب داماسو وہاں سے روانہ ہوا، اس وقت تک فلم ختم نہیں ہوئی تھی۔ لاؤڈسپیکر پر طویل اور ٹوٹتے پھوٹتے مکالمے تاریک ہوتے ہوئے قصبے میں گونج رہے تھے۔ چند سکونت گاہیں جو ابھی کھلی تھیں عارضی سی لگ رہی تھیں۔ داماسو نے چند قدم سینما ہال کی طرف اٹھائے لیکن پھر مڑ کر ناچ گھر کی طرف چل دیا۔

ناچ کے ہال میں بینڈ ایک اکیلے گاہک کے لیے، جس کے ساتھ دو عورتیں تھیں، دُھن بجا رہا تھا۔ باقی سب لوگ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے دیواروں کے ساتھ یوں لگے بیٹھے تھے جیسے ڈاک کا انتظار کر رہے ہوں۔ داماسو بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس نے شراب فروش لڑکے کو اشارہ کیا کہ اسے ایک بیئر لا دے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے سانس لینے کو رک رک کر بوتل ہی سے بیئر پیتا رہا اور اس شخص کو جو دو عورتوں کے ساتھ فرش پر ناچ رہا تھا یوں دیکھتا رہا جیسے شیشے کی اوٹ سے دیکھ رہا ہو۔ وہ شخص قد میں ان دونوں عورتوں سے چھوٹا تھا۔

آدھی رات کو وہ تمام عورتیں جو فلم دیکھنے گئی ہوئی تھیں، آ پہنچیں۔ مردوں کا ایک گروہ ان کے تعاقب میں تھا۔ داماسو کی دوست لڑکی جو ان کے ہمراہ تھی، انھیں چھوڑ کر داماسو کے ساتھ آ بیٹھی۔

داماسو نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ وہ اب تک بیئر کی نصف درجن بوتلیں پی چکا تھا اور اس شخص کو گھورے جا رہا تھا جو اب تین عورتوں کے ساتھ ناچ رہا تھا لیکن ناچ کے دوران ان عورتوں کی نسبت اپنے پاؤں کی پیچیدہ حرکات پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ اگر اس کے پاس ٹانگوں اور بازوؤں کے ساتھ ساتھ ایک دم بھی ہوتی تو وہ اور بھی زیادہ خوش ہوتا۔

"مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"تو اس کی طرف مت دیکھو،" لڑکی نے کہا۔

لڑکی نے بھی پینے کے لیے شراب کا گلاس منگوایا۔ فرش ناچنے والے جوڑوں سے بھرنے لگا، لیکن تین عورتوں کے ساتھ ناچنے والے شخص نے اپنا ناچ جاری رکھا جیسے وہ ہال میں اکیلا

ہو۔ ایک بار ناچ میں مڑتے ہوئے اس کی آنکھیں داماسو سے چار ہوئیں، اور وہ اور زیادہ شدّومد سے ناچنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس کے خرگوش جیسے دانت نظر آنے لگے۔ داماسو پلک جھپکائے بغیر اسے گھورتا رہا، حتیٰ کہ اس شخص کو بھی سنجیدگی اختیار کرنا پڑی اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

"اس کا خیال ہے کہ وہ بہت خوش ہے،" داماسو نے کہا۔

"وہ واقعی بہت خوش ہے،" لڑکی نے کہا۔ "وہ جب بھی قصبے میں آتا ہے دوسرے سفری تاجروں کی طرح یہاں کی موسیقی کے تمام اخراجات برداشت کرتا ہے۔"

داماسو نے اپنی نظریں اس شخص کی طرف سے ہٹاکر لڑکی کی طرف کیں۔

"تو تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" اس نے کہا۔ "اس کے پاس چلی جاؤ۔ جہاں تین کے لیے جگہ ہے چار کے لیے بھی ہو جائے گی۔"

داماسو کی بات کا جواب دیے بغیر لڑکی ناچ کے فرش کی طرف دیکھنے لگی اور گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔ زرد لباس اس کے شرمیلے پن کو اور نمایاں کر رہا تھا۔

اگلا ناچ داماسو اور لڑکی نے مل کر ناچا۔ جب ناچ ختم ہوا تو داماسو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ "میں تو بھوک سے مری جا رہی ہوں،" لڑکی بولی، اور داماسو کا ہاتھ پکڑ کر اسے کاؤنٹر کی جانب لے چلی۔ "تمھیں بھی تو کھانا کھانا ہے۔" وہ خوش وخرم آدمی دوسری جانب سے اپنی تینوں عورتوں کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

"اے، سنو،" داماسو نے اسے پکارا۔

وہ داماسو کی طرف دیکھ کر رکے بغیر مسکرایا۔ داماسو نے اپنی ساتھی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس آدمی کا راستا روک کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے تمھارے دانتوں کی نمائش اچھی نہیں لگتی۔"

آدمی کا رنگ سفید پڑ گیا مگر وہ مسکراتا رہا۔

"مجھے بھی نہیں،" اس نے جواب دیا۔

پیشتر اس کے کہ لڑکی اسے روک سکتی، داماسو نے کس کر ایک مکّا اس آدمی کے جبڑے پر ٹکا دیا۔ وہ آدمی فرش کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ کسی اور گاہک نے مداخلت نہ کی۔ تینوں عورتوں نے داماسو کو کمر سے جکڑ لیا اور چیخنے چلانے لگیں۔ داماسو کی دوست اسے دھکیل کر ہال کی دوسری جانب لے گئی۔ وہ آدمی فرش پر سے اٹھا۔ مکے کی بدولت اس کا منہ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ وہ بندر کی طرح چھلانگ لگاتا ہوا فرش کے وسط میں جا پہنچا اور بینڈ کو حکم دیا کہ موسیقی دوبارہ شروع کریں۔

دو بجے کے قریب ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ وہ تمام عورتیں جنھیں رات کے لیے گاہک نہیں ملے تھے، اب بیٹھ کر کھانا کھانے لگی تھیں۔ داماسو کی دوست پھلیوں، تلے ہوئے گوشت اور چاولوں کی ایک قاب لے کر میز پر آئی اور چمچ سے سارے کا سارا کھانا خود کھانے لگی۔ داماسو مدہوش سا بیٹھا اسے تکتا رہا۔ لڑکی نے چمچ میں بھر کر ایک لقمہ اس کی طرف بڑھایا۔

"منہ کھولو۔"

داماسو نے ٹھوڑی جھکا کر سینے پر ٹکا لی اور نفی میں سر ہلایا۔

"یہ عورتوں کی خوراک ہے۔ مردوں کی نہیں۔"

کھڑے ہونے کے لیے داماسو کو ہاتھوں سے میز کا سہارا لینا پڑا۔ جب اس کا جسمانی توازن درست ہوا شراب فروش بازو سینے پر باندھے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"نواسی پیسو تمہارے ذمے نکلتے ہیں،" وہ بولا۔ "شراب مفت کی نہیں تھی۔"

داماسو نے اسے ایک جانب دھکیل دیا۔

"مجھے ہیجڑے اچھے نہیں لگتے۔"

بڑکے نے اسے آستین سے دبوچ لیا، لیکن لڑکی کے اشارہ کرنے پر چھوڑ دیا، اور بولا

"تمہیں کچھ پتا نہیں ہے کہ بہت سی چیزوں کا کیا مزا ہوتا ہے۔"

داماسو لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا۔ دریا کی سطح پر چاند کی پراسرار چمک دیکھ کر اس کے ذہن میں تابندگی کی ایک لکیر سی ابھری، لیکن فوراً ہی غائب بھی ہو گئی۔ قصبے کے دوسرے سرے پر اپنے گھر کے آگے پہنچ کر، اپنے دروازے کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ نیند میں چل کر وہاں پہنچا ہے۔ اس نے سر کو دو تین بار جھٹکا اور پریشانی کے عالم میں اسے سرعت سے یہ احساس ہو کہ اسے اگلا ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانا ہے۔ دروازے کو اس نے نہایت آہستگی سے دھکیلا تاکہ قبضوں کی چرچراہٹ کی آواز نہ اٹھے۔

انا کو احساس ہوا کہ وہ صندوق میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ لیمپ کی روشنی سے بچنے کے لیے اس نے بستر میں اپنا رخ دیوار کی جانب کر لیا، لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند کپڑے نہیں بدل رہا ہے۔ تب جیسے اس کے ذہن میں وجدان کا کوندا لپکا اور وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داماسو صندوق کے قریب ٹارچ اور گیندوں کا پیکٹ ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔

داماسو نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

انا بستر میں سے کود کر باہر آئی۔ "تم پاگل ہو گئے ہو" وہ بڑبڑائی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ جلدی سے اس نے کنڈی چڑھا دی۔ داماسو نے ٹارچ اپنی پتلون کی جیب میں اڑسی، ساتھ ہی چھوٹا چاقو اور چند ریتیاں بھی جیب میں رکھیں، اور پیکٹ کو بغل میں دبائے دروازے کی جانب بڑھا۔ انا دروازے سے پیٹھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"میرے جیتے جی تم باہر نہیں جا سکتے،" وہ آہستہ سے بولی۔

داماسو نے اسے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ "پرے ہٹو" اس نے کہا۔ انا نے دروازے کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ پلکیں جھپکائے بغیر دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ "تم بالکل گدھے ہو۔" انا نے سرگوشی کی۔ "خدا نے تمہیں خوبصورتی تو دے دی مگر دماغ دیتے وقت سخت کنجوسی سے کام لیا۔" داماسو نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور اس کی کلائی مروڑنے لگا۔ انا کا سر جھک گیا۔ بھینچے ہوئے دانتوں کے ساتھ داماسو نے اسے دھمکایا، "میں نے کہا ہے پرے ہٹ جاؤ۔" انا نے سر موڑ کر آنکھ کے کونے سے اسے یوں دیکھا جیسے بیل میں جتا ہو بیل دیکھتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے انا کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچایا جا سکتا، اور وہ اپنے خاوند سے زیادہ طاقت ور ہے، لیکن داماسو

نے اس کے بالوں کو اتنے بل دیے کہ اس کا گلا آنسوؤں سے رندھ گیا۔

"تم میرے پیٹ میں بچے کو مار ڈالو گے" انا نے کہا۔

کچھ گھسیٹتے اور کچھ بازوؤں میں اٹھائے ہوئے وہ انا کو بستر تک لے گیا۔ لیکن جب اس نے اسے چھوڑا تو وہ اس کی کمر پر سوار ہو گئی اور اپنی ٹانگوں سے اسے جکڑ لیا۔ وہ دونوں بستر پر گر گئے۔ دونوں کا سانس پھول رہا تھا۔ "میں چیخنا شروع کر دوں گی،" انا نے سرگوشی میں کہا۔ "تم یہاں سے ہلے تو میں چیخنا شروع کر دوں گی۔" داماسو غصے میں پھنکار رہا تھا۔ اس نے گیندوں کا پیکٹ اٹھا کر انا کے گھٹنے پر مارا۔ انا کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی اور اس کی ٹانگوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، لیکن داماسو کو دروازے تک جانے سے روکنے کے لیے وہ اس کی کمر سے چمٹ گئی۔ پھر اس نے التجا اور منت سماجت شروع کر دی، "میں قسم کھاتی ہوں میں کل خود گیندیں وہاں لے جاؤں گی،" وہ کہہ رہی تھی "اور وہاں ایسے چھوڑ کر آؤں گی کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔" دروازے کی جانب گھسٹتے داماسو اس کے ہاتھوں پر گیندوں کے پیکٹ سے ضربیں لگاتا رہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہی گرفت ڈھیلی کرتی تاکہ چوٹ کے درد پر قابو پا سکے، لیکن پھر اس سے چمٹ جاتی اور التجائیں کرنے لگتی۔

"میں یہاں تک کہہ دوں گی کہ گیندیں میں نے چرائی تھیں،" وہ کہہ رہی تھی۔ "میری اس حالت میں کوئی مجھے جیل میں نہیں ڈالے گا۔"

بالآخر داماسو نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ "سارا قصبہ تمہیں دیکھ رہا ہے گا" انا نے کہا۔ "تم اسے بیوقوف ہو کہ تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ آج پورے چاند کی رات ہے۔" پیشتر اس کے کہ وہ چٹخنی کھولتا انا نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر کے اس کی گردن اور چہرے پر مکے مارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ چیخ بھی رہی تھی، "وحشی! درندہ!" جب داماسو نے مکوں کی بوچھاڑ سے چہرہ بچانا چاہا تو انا نے لپک کر ایک ہاتھ سے چٹخنی کو قابو میں کر لیا اور دوسرے سے کس کر مکا اس کے سر پر لگایا۔ داماسو جب وار سے بچنے کے لیے جھکا تو چٹخنی اس کے شانے کی ہڈی سے ٹکرا کر یوں گونجی جیسے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرائی ہو۔

"کتیا" وہ زور سے چیخا۔

اس لمحے اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنا شور کر رہا ہے۔ ہاتھ کی پشت سے اس نے زور سے انا کو کنپٹی پر مارا اور اس کے درد سے کراہنے اور پورے جسم کے زور کے ساتھ دیوار سے ٹکرانے کو محسوس کیا، لیکن مڑ کر اسے دیکھے بغیر دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

درد اور تکلیف سے بے سدھ انا فرش پر پڑی اپنے پیٹ میں کچھ ہونے کی منتظر رہی۔ دیواروں کی دوسری جانب سے ہمسایوں نے اسے آواز دی جیسے کہیں قبر کے اندر سے بول رہے ہوں۔ اس نے اپنے رونے کی آواز روکنے کی خاطر ہونٹ کاٹ لیے۔ تب وہ فرش سے اٹھی اور کپڑے بدلے۔ اس کے ذہن میں پھر یہ خیال نہ گزرا، جیسے ماضی میں بھی ایک بار ایسے ہی ایک موقع پر نہیں گزرا تھا، کہ داماسو ہنوز کمرے کے باہر کھڑا اپنے آپ کو یہ احساس دلانے میں مصروف ہو گا کہ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے اور وہ آ کے تھوڑی دیر میں چیختی پکارے

ہوئے باہر آنے کا منتظر ہو گا۔ آنا نے پرانی غلطی کا اعادہ کیا اور اپنے خاوند کے پیچھے باہر بھاگنے کی بجائے جوتے کپڑے پہن کر دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

دروازہ بند ہو جانے پر داماسو کو اندازہ ہوا کہ وہ واپس نہیں جا سکے گا۔ کتوں کے شوروغوغا نے گلی کے آخر تک اس کا تعاقب کیا مگر اس کے بعد وحشت ناک خاموشی چھا گئی۔ وہ اپنے قدموں کی آواز کے خوف سے فٹ پاتھ پر چلنے سے گریز کر رہا تھا جو اس خوابیدہ قصبے میں مہیب اور اجنبی لگ رہی تھی لیکن بلیرڈ ہال کے عقبی دروازے کے مقابل زمین کے خالی قطعے تک پہنچنے تک اس نے کسی احتیاط کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس بار اسے اپنی ٹارچ استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ دروازہ جہاں سے ٹوٹا تھا صرف وہیں سے ٹھیک کیا گیا تھا۔ اینٹ کے حجم اور شکل کا لکڑی کا ٹکڑا نکال کر ایک نیا ٹکڑا دروازے میں نصب کر کے وہی پرانی کنڈی اور قبضے دوبارہ وہاں لگا دیا گیا تھا۔ باقی سب کچھ ویسا تھا۔ داماسو نے بائیں ہاتھ سے تالے کو کھینچا اور زنجیر کو کنڈی کے ان قبضوں کے درمیان پھنسا دیا جو ٹھیک نہیں تھے اور قدرے زور سے لیکن تشدد کے بغیر زنجیر کو موڑ کر لیور کی طرح جھٹکے دینے لگا حتیٰ کہ لکڑی غمگین سی آواز کے ساتھ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی اور قبضے باہر نکل آئے۔ دروازے کو دھکیلنے سے قبل اس نے اسے تھوڑا سا اونچا اٹھا لیا تاکہ اس کے فرش پر رگڑے جانے کی آواز مدھم پڑ جائے۔ دروازہ اس نے صرف آدھا کھولا۔ اپنے جوتے اتار کر گیندوں کے پیکٹ کے ساتھ اندر کھسکا دیے اور چاندنی سے روشن کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

اس کے عین مقابل بوتلوں اور خالی ڈبوں سے بھرا ہوا ایک نیم تاریک برآمدہ تھا۔ آگے چھت کے شیشے میں سے چھن کر آتی چاندنی میں بلیرڈ کی میز پڑی تھی اس کے بعد الماریوں کی پشت تھی اور سب سے آخر میں، صدر دروازے کے سامنے چھوٹی چھوٹی کرسیوں اور میزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہر چیز سوائے چاندنی کے سیلاب اور خاموشی کے گزشتہ رات کی طرح تھی۔ داماسو اب تک اپنے اعصاب کو قابو میں رکھے ہوئے تھا لیکن اب آ کر عجیب سحر میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس بار اس نے اکھڑی ہوئی اینٹوں کے بارے میں بھی احتیاط نہ کی۔ کھلے دروازے کے درمیان اس نے اپنے جوتے رکھ دیے اور چاندنی کو عبور کر کے ٹارچ جلائی اور کاؤنٹر کے عقب میں اس چھوٹے سے ڈبے کو تلاش کرنے لگا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ تمام کام وہ بغیر کسی احتیاط کے کر رہا تھا۔ ٹارچ کی اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی روشنی میں اس نے گردآلود شیشیاں، گھوڑے کی رکاب اور مہمیز، موٹر کے تیل میں لتھڑی ہوئی گول کر کے رکھی ہوئی ایک قمیص، اور بالآخر وہ ڈبا دیکھا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ ڈبا عین اسی جگہ پڑا تھا جہاں پچھلی بار تھا۔ ٹارچ کی روشنی کو حرکت دیتے ہوئے وہ کاؤنٹر کے آخر تک آ گیا۔ وہاں وہی بلی تھی۔

بغیر کسی اسرار کے بلی نے اسے ٹارچ کی روشنی کے مقابل دیکھا۔ داماسو نے روشنی کی شعاع اس پر مرکوز رکھی حتیٰ کہ اسے قدرے خوف کے ساتھ یاد آیا کہ دن کے دوران میں اس نے کبھی بلی کو اس جگہ بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے شعاع کو جھٹکا دے کر اور بلی کو

"ہش" کہہ کر بھگانے کی کوشش کی، مگر اس جانور پر اس حرکت کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ تب یک لخت اس کے ذہن میں ایک خاموش سا دھماکہ ہوا اور بلی اس کے ذہن سے یکسر محو ہو گئی۔ جب تک وہ یہ باور کر سکا کہ کیا وقوع پذیر ہو رہا ہے، ٹارچ اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور وہ گیندوں کے پیکٹ کو سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ ہال کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

"خوب!"

اس نے روک کی آواز پہچان لی۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے گردوں میں گہری تھکن اتر آئی تھی۔ روک کمرے کے عقب سے چلتا ہوا اس کی جانب آیا۔ وہ زیرجامہ پہنے ہوئے تھا، اس کے ہاتھ میں لوہے کا سریا تھا اور اس کی آنکھیں بجلی کی روشنی سے چندھیائی ہوئی تھیں۔ بوتلوں اور خالی ڈبوں والے برآمدے میں، جہاں سے داماسو گزر کر آیا تھا، ایک جھولنے والا بستر لٹک رہا تھا۔ یہ بستر پچھلی بار وہاں موجود نہیں تھا

داماسو سے تیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر روک تھوڑا سا اچھلا اور اپنا دفاع کرنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ داماسو نے اپنا ہاتھ جس میں گیندیں تھیں، کمر کے پیچھے چھپا لیا۔ روک نے ناک سکیڑی اور سر آگے نکال کر عینک کے بغیر داماسو کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"تم!" وہ چلایا۔

داماسو کو لگا جیسے کوئی لامتناہی بات بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئی ہو۔ روک سریے کو جھکا کر چلتا ہوا داماسو کے قریب آیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، اور نقلی دانتوں کے بغیر اس کا چہرہ کسی عورت کا لگ رہا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" داماسو نے جواب دیا۔

اس نے جسم کی خفیف غیرمحسوس سی حرکت سے پہلو بدلا۔

"یہ تمہارے پاس کیا ہے؟"

داماسو ایک قدم پیچھے ہٹا۔ "کچھ نہیں۔" وہ بولا۔ روک کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ کانپنے لگا۔ "یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے!" وہ چیخ کر بولا اور سریا ہاتھ میں اٹھائے اس کی طرف بڑھا۔ داماسو نے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ روک نے بائیں ہاتھ سے پیکٹ پکڑ لیا اور انگلیوں سے اسے جانچنے لگا۔ وہ اب بھی چوکس تھا۔ تب بالآخر اسے پتا چل گیا۔

"یہ ناممکن ہے!" اس نے کہا۔

وہ اتنا حیرت زدہ تھا کہ اس نے سریا کاؤنٹر پر رکھ دیا اور تھوڑی دیر کے لیے داماسو کی موجودگی کو بھول کر پیکٹ کو کھولنے میں لگ گیا۔ خاموشی سے وہ گیندوں کو دیکھتا رہا۔

"میں انہیں واپس رکھنے آیا تھا۔" داماسو نے کہا۔

"یقیناً" روک بولا۔

داماسو کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ شراب کا اثر اس کے جسم سے یکسر زائل ہو چکا تھا اس کی زبان پر بجریوں سی گاد باقی تھی اور ذہن میں اکیلے پن کا مبہم احساس تھا۔ "تو یہ تھا وہ معجزہ!" روک نے گیندوں کو دوبارہ کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنے بیوقوف بھی ہو سکتے ہو۔" جب اس نے سر اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے کا تاثر بدل

چکا تھا۔

"اور میرے دو سو پیسو؟"

"دراز خالی تھی" داماسو نے کہا۔ عورت نے غور سے، خالی منہ چلاتے ہوئے داماسو کو دیکھا اور مسکرا دی۔ "اچھا تو دراز خالی تھی" اس نے کئی بار دوہرایا۔ "دراز میں کچھ نہیں تھا؟" اس نے ... پھر پوچھا۔

"اس واقعہ کی اطلاع تو میئر کو فوراً مل جانی چاہیے۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"وہاں دو سو پیسو نہیں" اس نے کہا۔ "اور اب وہ رقم تمہاری چمڑی ادھیڑ کر نکالی جائے گی۔ اس لیے نہیں کہ تم نے چوری کی تھی بلکہ اس لیے کہ تم جیسا احمق آج تک پیدا نہیں ہوا۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: [illegible]

بالتازار کی حیرت انگیز سہ پہر

پنجرہ تیار ہو چکا تھا۔ بالتازار نے اسے ہمیشہ کی عادت کے مطابق چھجے سے لٹکا دیا اور جب دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آیا تو لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ دنیا کا خوبصورت ترین پنجرہ ہے۔ پنجرے کو دیکھنے کے لیے اتنے لوگ آئے کہ گھر کے سامنے مجمع لگ گیا اور بالتازار کو مجبوراً دکان بند کرنی پڑی۔

"داڑھی بنا لو" اس کی گھر والی اُرسلا نے کہا۔ "بالکل کیپوچین لگ رہے ہو۔"

"کھانے کے بعد حجامت بنانا بری بات ہے" بالتازار نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر دو ہفتے کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی ایال جیسے چھوٹے چھوٹے سخت اور کھڑے بال تھے اور چہرے پر سہمے ہوئے لڑکے کا سا تاثر تھا۔ مگر یہ تاثر جھوٹا تھا۔ فروری میں وہ تیس سال کا ہو چکا تھا۔ چار سال سے وہ اُرسلا کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس نے شادی کی تھی نہ کوئی اولاد ہوئی تھی۔ زندگی نے اسے محتاط ہونے کی وجہ تو دی تھی مگر ڈرنے کی نہیں۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس نے ابھی ابھی جو پنجرہ مکمل کیا ہے وہ بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کا خوبصورت ترین پنجرہ ہے۔ وہ بچپن سے پنجرے بنانے کا عادی تھا اور یہ پنجرہ اس کے لیے دوسرے پنجروں سے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

"پھر کچھ دیر آرام کر لو" اُرسلا نے کہا۔ "اس داڑھی کے ساتھ تو تم کہیں بھی منہ نہیں دکھا سکتے۔"

آرام کرنے کے دوران کئی دفعہ اسے پڑوسیوں کی خاطر جھولنے سے اٹھ کر انہیں پنجرہ دکھانا پڑا۔ اُرسلا نے اس وقت تک پنجرے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اس بات پر

چڑ ہوئی تھی کہ اس کے شوہر نے اپنی بڑھئی کی دوکان کو نظرانداز کر کے سارا وقت اس پنجرے میں لگا دیا۔ وہ دو ہفتے سے چین کی نیند نہیں سویا، رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہے، بڑبڑاتا رہتا ہے اور اسے داڑھی مونڈنے کا خیال تک نہ آیا۔ مگر اس کی خفگی پنجرے کو دیکھ کر ہوا ہو گئی۔ بالتازار نیند لے کر اٹھا تو وہ اس کے لیے پتلون اور قمیص پر استری کر چکی تھی، جن کو اس نے اسٹول کے پاس کرسی پر رکھ دیا تھا اور پنجرے کو کھانے کی میز پر لے گئی تھی۔ وہ خاموشی بیٹھی پنجرے کو گھور رہی تھی۔

"اس کے کیا دام لگاؤ گے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"معلوم نہیں۔" بالتازار نے جواب دیا۔ "تیس پیسو مانگوں گا تاکہ بیس تو مل جائیں۔"

"پچاس مانگو۔" ارسلا نے کہا، "دو ہفتے تم نے اپنی نیندیں حرام کی ہیں، اور پھر یہ بڑا بھی بہت ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا پنجرا نہیں دیکھا۔"

بالتازار داڑھی مونڈنے لگا۔

"تمہارے خیال میں وہ مجھے اس کے پچاس پیسو دے دیں گے؟"

"چیپے مونتیل صاحب کے لیے تو یہ کوئی بات ہی نہیں، اور یہ پنجرا واقعی اس لائق ہے۔" ارسلا نے کہا۔ "تمہیں ساٹھ مانگنے چاہییں۔"

گھر پر گھنی چھاؤں پھیلی ہوئی تھی۔ اپریل کا پہلا ہفتہ تھا اور ٹڈوں کی چرچراہٹ کی وجہ سے گرمی اور بھی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ کپڑے بدل کر بالتازار نے صحن کے کواڑ کھول دیے کہ مکان ٹھنڈا ہو جائے، اور بچوں کی ٹولی گھر میں گھس گئی۔

پنجرے کی خبر پھیل چکی تھی۔ بوڑھے معالج ڈاکٹر اوکٹاویو خیرالدو زندگی سے مطمئن لیکن اپنے پیشے سے بیزار، اپنی مفلوج بیوی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے اس پنجرے کے بارے میں سوچتے رہے۔ باہر برآمدے میں، جہاں گرم دنوں میں وہ میز بچھا لیا کرتے تھے، پھولوں کے بہت سے گملے رکھے ہوئے تھے، اور دو پنجرے تھے جن میں سنہری پروں والی کینری چڑیاں پلی ہوئی تھیں۔ اس کی بیوی کو پرندے بہت پسند تھے، اور اس حد تک پسند تھے کہ اسے بلیوں سے نفرت ہو گئی تھی، کیونکہ بلیاں پرندوں کو کھا جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے ڈاکٹر خیرالدو دوپہر کے وقت ایک مریض کو دیکھنے گئے اور واپسی میں بالتازار کے گھر کی طرف ہوتے گئے کہ پنجرے کا معائنہ کر لیں۔

کھانے کے کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میز پر پنجرا نمائش کے لیے رکھا ہوا تھا۔ تار کا بنا ہوا بہت بڑا گنبد، تین منزلیں، راستے، الگ الگ خانے سونے اور کھانے کے خانے، اور چڑیوں کے لیے ایک مخصوص جگہ میں جھولے بھی لگے ہوئے۔ یہ پنجرا چھوٹے پیمانے پر کسی دیوہیکل برف کے کارخانے کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت غور سے اس کا معائنہ کیا۔ چھوئے بغیر، اور یہ سوچتا رہا کہ جیسا سنا تھا پنجرا اس سے بھی بہتر ہے اور خوبصورت کہ اپنی بیوی کے لیے اس نے کبھی ایسے پنجرے کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہ تو تخیل کی کارفرمائی کا نمونہ ہے۔" اس نے کہا۔ اس نے لوگوں کے ہجوم میں بالتازار کو ڈھونڈ نکالا اور مادرانہ شفقت سے بھرپور نظریں اس پر جماتے ہوئے کہا، "تم تو غیرمعمولی ماہرِ تعمیر ثابت ہوتے۔"

بالتازار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"شکریہ۔" اس نے کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ وہ گول مٹول تھا اور اس کے مٹاپے میں کسی عورت کی سی نزاکت تھی جو اپنی جوانی میں حسین رہی ہو، اور اس کے ہاتھ بہت نازک تھے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی پادری لاطینی بول رہا ہو۔ "تمہیں اس میں چڑیاں پالنے کی بھی ضرورت نہیں۔" اس نے کہا، اور پنجرا حاضرین کی نظروں کے سامنے گھمانے لگا جیسے اس کا نیلام کر رہا ہو۔ "اسے تو بس پیڑ میں لٹکا دو اور یہ خودبخود چہچہانے لگے گا۔" اس نے پنجرا واپس میز پر رکھ دیا، ایک لمحے کو سوچا، پنجرے کی طرف دیکھا اور کہا،

"ٹھیک ہے، پھر میں اسے لے لوں گا۔"

"یہ بک چکا ہے۔" ارسلا بولی۔

"یہ چیپے مونتیل صاحب کے بیٹے کا ہے۔" بالتازار نے کہا۔ "اس نے خاص طور پر آرڈر دے تھا۔"

ڈاکٹر یہ سنتے ہی باادب ہو گیا۔

"اس کا نمونہ اسی نے تمہیں دیا تھا؟"

"نہیں۔" بالتازار نے کہا۔ "اس نے تو یہ کہا تھا کہ اسے بڑا سا پنجرا چاہیے ٹروپیالوں کے جوڑے کے لیے۔"

ڈاکٹر نے پنجرے کی طرف دیکھا۔

"مگر یہ ٹروپیالوں کے لیے نہیں ہے۔"

"اور کیا؟ بالکل ہے۔" بالتازار نے میز کے قریب آتے ہوئے کہا۔ بچے اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ "اس کی پیمائش کا بڑی احتیاط سے حساب لگایا گیا ہے۔" اس نے انگلی سے مختلف خانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے پنجرے کے گنبد پر انگلیوں کے کنڈوں سے چوٹ لگائی اور سارے پنجرے میں سُر گونجنے لگے۔

"اس سے زیادہ مضبوط تار مل نہیں سکتا، اور ہر جوڑ پر اندر باہر ٹانکا لگایا گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ تو توتے کے لیے بھی کافی ہو گا۔" بچوں میں سے کوئی بولا۔

"بالکل!" بالتازار نے کہا۔

ڈاکٹر نے گھوم کر دیکھا۔

"ٹھیک ہے، لیکن اس نے تمہیں یہ نمونہ تو نہیں دیا تھا۔" اس نے کہا۔ "اس نے تمہیں کوئی ہدایات تو نہیں دی تھیں سوائے اس کے کہ اتنا بڑا پنجرا بنا دو جو دو ٹروپیالوں کے لیے کافی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔" بالتازار نے کہا۔

"بس پھر کوئی مسئلہ نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ایک چیز ہوتی ٹروپیالوں کے لیے بڑا سا پنجرا۔ اور یہ پنجرا جو تم نے بنایا ہے یہ دوسری چیز ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ وہی پنجرا ہے جو تم سے بنانے کے لیے کہا گیا تھا۔"

"یہی تو ہے وہ!" بالتزار نے پریشان ہو کر کہا۔ "اسی وجہ سے تو میں نے بنایا تھا۔"

ڈاکٹر نے بےصبری سے ہاتھ ہلا دیا۔

"تم ایک اور بنا لینا" اُرسلا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اور پھر ڈاکٹر سے کہنے لگی "آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟"

"میں نے اپنی بیوی سے آج دوپہر کا وعدہ کیا تھا" ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہے ڈاکٹر صاحب!" بالتزار بولا "مگر میں آپ کے ہاتھ ایسی چیز نہیں فروخت کر سکتا جو پہلے ہی بک چکی ہو۔"

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔ رومال سے گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے وہ اسی طرح خاموشی کے ساتھ پنجرے کو تکنے لگا جیسے وہ شخص جو ٹکٹکی باندھ کر دھندلی نظروں سے جہاز کو سمندر میں دور جاتا دیکھ رہا ہو۔

"انھوں نے تمھیں اس کے کتنے پیسے دیے ہیں؟"

بالتزار نے جواب دیے بغیر ارسلا کی طرف دیکھا۔

"ساٹھ پیسو" وہ بولی۔

ڈاکٹر پنجرے کو دیکھتا رہا۔ "بہت خوبصورت ہے" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "حد سے زیادہ خوبصورت۔" دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت مستعدی سے اپنے آپ کو پنکھا جھلنے اور مسکرانے لگا اور اس واقعے کے تمام نشان اس کی یادداشت سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئے۔

"مونٹیل کے پاس بہت پیسہ ہے" اس نے کہا۔

سچ پوچھو تو خوزے مونٹیل اتنا پیسے والا تھا نہیں جتنا نظر آتا تھا، مگر وہ دولت حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہاں سے چند گلیاں آگے سازوسامان سے اٹے ایک گھر میں، جہاں کسی نے آج تک ایسی بو نہیں سونگھی تھی جو برائے فروخت نہ ہو، وہ پنجرے کی اطلاع سے لاتعلق رہا۔ اس کی بیوی نے، جسے موت کا خوف ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتا تھا، دوپہر کے کھانے کے بعد دروازے کھڑکیاں بند کر دیں اور پھر آنکھیں کمرے کے سائے پر جمائے ہوئے دو گھنٹے کے لیے لیٹ گئی، اور خوزے مونٹیل قیلولہ کرنے لگا۔ اس کی بیوی کو کئی آوازوں کے شور نے چونکا دیا۔ وہ اٹھ کر بڑے کمرے کا دروازہ کھولنے گئی اور دیکھا کہ گھر کے سامنے مجمع لگا ہوا ہے اور مجمعے کے درمیان بالتزار پنجرہ لیے، اجلے کپڑے پہنے، داڑھی بنائے اور چہرے پر خوش سلیقہ بےباکی کا وہ تاثر لیے کھڑا ہے جو غریب غربا کے چہروں پر اس وقت آ جاتا ہے جب وہ کسی دولت مند کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔

"کیا عمدہ چیز ہے!" خوزے مونٹیل کی بیوی پکار اٹھی اور اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ اس نے خوشی خوشی بالتزار کو اندر بلا لیا۔ "میں نے زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔" پھر دروازے پر جمع ہونے والی بھیڑ سے چڑ کر یہ بھی کہا

"اندر لے آؤ، اس سے پہلے کہ یہ لوگ کمرے کو گھڑدوڑ کا میدان بنا دیں۔"

خوزے مونٹیل کے گھر کے لیے بالتزار اجنبی نہ تھا۔ مختلف موقعوں پر اس کی مہارت اور صفائی کا پکا ہونے کی وجہ سے بڑھئی کے چھوٹے موٹے کام کاج کے لیے یہاں بلایا جا چکا تھا۔ مگر امیر دولت مند لوگوں کے درمیان بےچینی ہوتی تھی۔ وہ ان کے بارے میں سوچا کرتا

ان کی بدصورت جھگڑالو بیویوں کے بارے میں، ان ہولناک بیماریوں کے بارے میں جو ان لوگوں کو لاحق رہتیں، اور اس کے اندر رحم کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ جب وہ ان کے گھروں میں داخل ہوتا تو پیر گھسیٹے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔

"پیپے گھر پر ہے؟"

اس نے پنجرا کھانے کی میز پر ٹکا دیا۔

"وہ اسکول گیا ہوا ہے" خوزے مونٹیل کی بیوی نے کہا، "مگر آتا ہی ہو گا" اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہنے لگی "مونٹیل نہا رہا ہے"

اصل میں مونٹیل کو نہانے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ جلدی جلدی اپنے بدن پر الکحل ملنے لگا کہ جا کر دیکھے کیا ہو رہا ہے۔ وہ اس قدر محتاط آدمی تھا کہ بجلی کا پنکھا چلائے بغیر سوتا تھا تاکہ گھر کی ایک ایک آواز پر کان دھر سکے۔

"ادیلیدے!" وہ چلایا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"باہر آ کر دیکھو کیا شاندار چیز ہے!" اس کی بیوی نے پکار کر کہا۔

خوزے مونٹیل، موٹا تازہ اور جھبرا سا آدمی، گردن پر تولیہ ڈالے خواب گاہ کی کھڑکی میں نمودار ہوا۔

"یہ کیا ہے؟"

"پیپے کے لیے پنجرہ" بالتزار نے کہا۔

مونٹیل کی بیوی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کس کا؟"

"پیپے کا" بالتزار نے جواب دیا اور پھر خوزے مونٹیل کی طرف مڑ کر کہا "پیپے نے اس کا آرڈر دیا تھا۔"

اس لمحے کچھ نہیں ہوا، مگر بالتزار کو یوں لگا جیسے کسی نے اس پر غسل خانے کا دروازہ کھول دیا ہو۔ خوزے مونٹیل خواب گاہ سے زیرجامہ پہنے ہوئے نکلا۔

"پیپے!" وہ دہاڑا۔

"وہ ابھی نہیں آیا" اس کی بیوی نے سرگوشی کی۔ وہ دم سادھے کھڑی تھی۔

پیپے دروازے میں نمودار ہوا۔ وہ کوئی بارہ سال کا ہو گا اور اس کی ویسی ہی مڑی ہوئی گھنی پلکیں اور قابل رحم انداز تھا جو اس کی ماں کا تھا۔

"یہاں آؤ!" خوزے مونٹیل نے اس سے کہا۔ "تم نے اس کا آرڈر دیا تھا؟"

بچے نے سر جھکا لیا۔ اس کے بالوں سے پکڑ کر خوزے مونٹیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میری بات کا جواب دو۔"

بچے نے کچھ کہے بغیر اپنا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

"مونٹیل!" اس کی بیوی نے سرگوشی کی۔

مونٹیل نے بچے کو چھوڑ دیا اور غصے سے بےتاب ہو کر بالتزار کی طرف مڑا۔ "مجھے افسوس ہے بالتزار" اس نے کہا "لیکن کام کرنے سے پہلے تمھیں مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔

تمھارے ہی دماغ میں آ سکتی تھی کہ نابالغ سے معاہدہ کر لو۔" اور یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر سکون لوٹ آیا۔ اس نے پنجرا اٹھایا اور دیکھے بغیر بالتازار کو پکڑا دیا۔

"اِسے فوراً لے جاؤ اور جس کے ہاتھ بیچ سکتے ہو بیچ ڈالو۔" اس نے کہا۔ "اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری درخواست ہے مجھ سے بحث نہ کرنا۔" اس نے بالتازار کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے سمجھایا، "ڈاکٹر نے مجھے غصہ کرنے سے منع کیا ہے۔"

بچہ بالکل ساکت کھڑا تھا اور پلک تک نہیں جھپکا رہا تھا کہ بالتازار نے ہاتھ میں پنجرا اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بچے کے حلق سے ایک آواز نکلی، کتے کی غراہٹ جیسی، اور وہ فرش پر گر کر چیخنے لگا۔

خوزے مونتیل نے کوئی تاثر قبول کیے بغیر اسے دیکھا اور ماں اسے چپ کرانے لگی۔
"اسے چھوڑ بھی دو" اس نے کہا۔ "اسے فرش پر اپنا سر پھوڑ لینے دو، پھر اس پر لیموں اور نمک چھڑک دینا تاکہ دل بھر کے رو پیٹ لے۔" بچہ آنسو بہائے بغیر چلا رہا تھا اور اس کی ماں نے کلائیوں سے پکڑے ہوئے تھی۔

"اسے چھوڑ دو" خوزے مونتیل نے اصرار کیا۔

بالتازار بچے کو یوں دیکھتا رہا جیسے کسی گزیدہ جانور کی جاں کنی کا عالم دیکھ رہا ہو۔ چار بجنے والے تھے۔ اس گھڑی اس کے گھر میں اُرسلا ایک بہت ہی پرانا گیت گا رہی تھی اور پیاز کے چھلکے اتار رہی تھی۔

"پیپے" بالتازار نے کہا۔

وہ مسکراتا ہوا بچے کے پاس آیا اور پنجرا اس کی طرف بڑھا دیا۔ بچہ اچھلا اور پنجرے سے لپٹ گیا جو قد میں تقریباً اس کے برابر تھا۔ وہ اس کے تاروں میں سے بالتازار کو جھانکتا رہا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلا تھا۔

"بالتازار" خوزے مونتیل نے دھیمے لہجے میں کہا، "میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اسے لے جاؤ۔"

"واپس دو" اس کی ماں نے بچے سے کہا۔

"رکھ لو" بالتازار نے کہا۔ اور پھر خوزے مونتیل سے بولا، "آخر یہ تو میں نے اسی لیے بنایا تھا۔"

خوزے مونتیل اس کے پیچھے پیچھے بڑے کمرے میں آ گیا۔

"بےوقوف مت بنو بالتازار" اس نے راستہ روک کر کہا، "اپنا یہ تماشا اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤ۔ میں تمھیں ایک دھیلا بھی دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

"کوئی بات نہیں" بالتازار نے کہا۔ "میں نے یہ خاص طور پر پیپے کو تحفہ دینے کے لیے بنایا تھا۔ میں اس کے دام وصول کرنے کی توقع بھی نہیں رکھتا۔"

جب بالتازار ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا واپس جا رہا تھا تو خوزے مونتیل کمرے میں کھڑا ہو چیخ رہا تھا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔

"احمق" وہ چلا رہا تھا، "اپنا یہ کھلونا لے جاؤ یہاں سے۔ ہمیں نہیں ضرورت کہ کوئی ہمارے گھر میں آ کر ہم پر حکم چلائے۔ کمینے کہیں کے!"

ستّا گھر میں بالتازار کا باقاعدہ استقبال ہوا۔ اب تک اس نے یہی سوچا تھا کہ اس نے پہلے

سے بہتر پنجرا بنایا ہے اور خوزے مونتیل کے بیٹے کو دے دیا ہے کہ وہ روتا نہ رہے۔ اور ان میں سے کوئی بات بھی بہت اہم نہیں تھی، مگر پھر اسے احساس ہوا کہ ان سب باتوں کی بہت سے لوگوں کے نزدیک خاصی اہمیت تھی، اور وہ کچھ پُرجوش ہو گیا۔

"تو انھوں نے تمھیں پنجرے کے پچاس پیسو دیے؟"

"ساٹھ،" بالتازار نے کہا۔

"تم نے خوب کام کر دکھایا،" کسی نے کہا۔ "تم واحد شخص ہو جو مونتیل صاحب سے اتنی بڑی رقم وصول کر سکے ہو۔ اس کا جشن منانا چاہیے۔"

انھوں نے اسے بیئر لا کر دی اور بالتازار نے سب کے لیے ایک ایک گلاس کا آرڈر دے دیا۔ اب چونکہ یہ پہلی دفعہ تھی جو وہ باہر پینے نکلا تھا تو جھٹ پٹے کے وقت تک بالکل دھت ہو گیا اور نہایت عظیم الشان منصوبے کی باتیں کرنے لگا جس میں ایک ہزار پنجرے تھے، ساٹھ پیسو کا ایک، پھر ایک لاکھ پنجرے، اور اس کے پاس ساٹھ لاکھ پیسو آ گئے۔ "ہمیں بہت سی چیزیں بنانی ہیں، امیروں کے ہاتھ بیچنے کے لیے، ان کے مرنے سے پہلے۔" نشے میں دھت وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ سب بیمار ہیں، وہ مر جائیں گے۔ وہ اس قدر مشکل میں ہیں کہ غصہ بھی نہیں کر سکتے۔" وہ دو گھنٹے سے جیوک باکس کی موسیقی کے دام ادا کیے جا رہا تھا اور موسیقی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ تمام لوگوں نے بالتازار کی صحت، خوش قسمتی اور امیروں کی موت کے لیے جام تجویز کیے اور پی گئے، لیکن کھانے کا وقت آیا تو سب اسے ستّا گھر میں اکیلا چھوڑ گئے۔

ارسلا آٹھ بجے تک تلے ہوئے گوشت پر پیاز کے قتلے سجائے بیٹھی اس کی راہ دیکھتی رہی۔ کسی نے اسے بتایا کہ اس کا شوہر ستّا گھر میں ہے اور خوشی کے مارے بدحواس ہو کر سب کو بیئر خرید کر پلا رہا ہے، مگر ارسلا نے یقین نہیں کیا کیونکہ بالتازار نے کبھی نشہ نہیں کیا تھا۔ جب آدھی رات کے قریب وہ بستر میں لیٹ گئی تو اس وقت بالتازار ایک روشن کمرے میں تھا جہاں چھوٹی چھوٹی میزیں بچھی ہوئی تھیں اور ہر میز کے ساتھ چار کرسیاں، اور باہر کھلی رقص گاہ تھی جہاں چلوور پرندے پھدک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر غازہ پھیل گیا تھا اور چونکہ وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا، اس نے خیال کیا کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ ایک ہی بستر میں لیٹ جائے۔ اس نے اتنے پیسے خرچ کیے تھے کہ وہاں سے جانے کے لیے اسے اپنی گھڑی گروی رکھ کر اگلے دن ادائیگی کا وعدہ کرنا پڑا۔ اگلے ہی لمحے گلی میں ڈھیر پڑے پڑے اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے جوتے اتار رہا ہے، مگر اس نے نہیں چاہا کہ اپنی زندگی کے حسین ترین خواب سے چونکے۔ صبح پانچ بجے والی عبادت کے لیے جانے والی عورتوں کو وہاں سے گزرتے ہوئے ہمت نہیں پڑی کہ اس کی طرف دیکھیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ مرا ہوا پڑا ہے۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

مونتیئل کی بیوہ

خوزے مونتیئل کے مرنے پر، اُس کی بیوی کے سوا ہر شخص نے ایک پُرکیف اطمینان محسوس کیا لیکن ہر شخص کو یہ باور کرنے میں کئی گھنٹے لگے کہ وہ واقعی مر چکا ہے۔ کئی لوگوں کو تو اُس کی میّت کو گرمی سے تپے کمرے میں تربوز کی طرح گول کیے ہوئے گدّوں والے پیلے تابوت میں لنن کی چادروں میں لپٹے اور تکیوں کے سہارے لیٹے ہوئے دیکھنے کے بعد بھی اس کی موت کا یقین نہیں آیا۔ اس کی داڑھی سلیقے سے اچھی طرح تراشی گئی تھی اور گیتروں میں ملبوس، چمک دار نقلی چمڑے کے جوتے پہنے وہ اتنا صحت مند اور زندہ لگ رہا تھا کہ زندگی بھر نہ لگ سکا تھا۔ یہ شخص وہی چیپے مونتیئل صاحب تھا جو ہر اتوار کو گرجے میں آٹھ بجے صبح کی عبادت کے لیے موجود ہوتا تھا، صرف اس موقعے پر اُس نے ہاتھ میں گھڑسواری کی چھڑی کی بجائے صلیب تھام رکھی تھی۔ جب اس کے تابوت کا ڈھکن پیچوں سے ٹھونک کر بند کر دیا گیا اور اسے اس کے ٹیپ ٹاپ والے خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تب ہی لوگوں کو مکمل یقین آسکا کہ وہ مرنے کی اداکاری نہیں کر رہا تھا۔

تدفین کے بعد اُس کی بیوی کے سوا ہر ایک کے لیے تعجب کی بات صرف یہ رہ گئی تھی کہ خوزے مونتیئل طبعی موت کیسے مر گیا، جب کہ ہر شخص کے دل میں یہی توقع تھی کہ وہ گھات میں بیٹھے کسی شخص کی گولی پشت پر لگنے سے مرے گا۔ اس کی بیوی کو یقین تھا کہ مونتیئل کو اس کی نظروں کے سامنے بوڑھا ہو کر، اپنے بستر میں اعتراف کرنے کے بعد آج کل کے زمانے کے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح اذیت کے بغیر موت نصیب ہو گی۔ صرف چند تفصیلات میں اس کا خواب پورا نہ ہو سکا تھا۔ خوزے مونتیئل اپنے جھولنے والے بستر میں

دو اگست ۱۹۵۱ کو دوپہر کے دو بجے برہمی اور غصے کے ایک دورے کے سبب مرا۔ اسے دوروں کے خطرناک نتائج سے ڈاکٹر اُسے پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا۔ اس کی بیوی کو یہ بھی توقع تھی کہ جنازے کو کندھا دینے کے لیے پورا قصبہ اُمڈ آئے گا اور یہ کہ مختلف جگہوں سے آئی ہوئی پھولوں کی چادروں کے لیے اس کا گھر ناکافی ثابت ہو گا۔ لیکن فی الواقع صرف خاندان کے چند لوگ اور مونتیئل کی مذہبی برادری کے رکن ہی جنازے میں شریک ہوئے، اور اُس کی قبر کے لیے پھولوں کی چادریں صرف وہی تھیں جو میونسپل کمیٹی والوں نے بھجوائی تھیں۔ مونتیئل کے بیٹے نے، جو جرمنی میں کونسل کے عہدے پر فائز تھا، اور دو بیٹیوں نے، جو پیرس میں مقیم تھیں، تین تین صفحے کے تار بھجوائے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُن سب نے تارگھر میں کھڑے ہو کر، وہاں کی وافر سیاہی کو استعمال کر کے وہ تار رقم کیے ہوں گے، اور یہ بھی کہ تاروں کی آخری عبارت ترتیب دینے میں انھوں نے کئی ہی فارم پھاڑ کر پھینکے ہوں گے، اور یوں ہر تار میں بیس بیس ڈالر کی قیمت کے الفاظ جمع کیے ہوں گے۔ اُن میں سے کسی نے بھی واپس آنے کی حامی نہ بھری تھی۔ اُس رات باسٹھ سال کی عمر میں، تکیے پر سر رکھ کر اُس شخص کے لیے روتے ہوئے جس نے اُسے خوشی سے ہمکنار کیا تھا، مونتیئل کی بیوہ نے پہلی بار آزردگی کا مزا چکھا۔ میں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے گھر میں قید کر لوں گی، وہ سوچ رہی تھی۔ میرے بچوں نے اپنی دانست میں مجھے بھی اپنے باپ کے ساتھ ہی دفن کر دیا ہے۔ میں اس دنیا کے بارے میں کچھ اور جاننا نہیں چاہتی۔

مونتیئل کی بیوہ، نازک، اپنی توہم پرستی کے ہاتھوں لاچار، مگر مخلص عورت تھی۔ اس کے ماں باپ نے اُس کی شادی بیس برس کی عمر میں اُس پہلے شخص سے کر دی تھی جسے تیس فٹ سے کم فاصلے سے دیکھنے کی اُسے اجازت ملی تھی۔ دنیا کے حقائق سے براہِ راست تعلق قائم کرنے کا اُسے کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اپنے خاوند کا جنازہ اٹھائے جانے کے تین دن بعد اسے اپنے آپ کو سنبھالنے کی ضرورت کا احساس ہوا، لیکن وہ اپنی زندگی کی سمت کا تعین کرنے سے قاصر تھی۔ اسے ازسرِنو جب شروع کرنا تھا۔

اُن بےشمار رازوں میں جو خوزے مونتیئل اپنے ساتھ قبر میں لے گیا تھا، گھر میں رکھی تجوری کو کھولنے کی ترکیب بھی تھی۔ قصبے کے میئر نے تجوری کھلوانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ اُس نے حکم دیا کہ تجوری کو صحن میں دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا جائے اور دو سپاہی تالے پر فائر کریں۔ پوری صبح مونتیئل کی بیوہ اپنے سونے کے کمرے میں لیٹی میئر کے پُرشور احکام کے جواب میں سپاہیوں کی دبی دبی آوازیں سنتی رہی۔

یہ تو حد ہو گئی، اس نے سوچا۔ میں نے پانچ سال خدا سے دعائیں کرنے میں گزارے ہیں کہ قصبے میں گولیاں چلنی بند ہوں اور آج میرے ہی گھر میں گولیاں چل رہی ہیں اور ان گولیوں کے لیے مجھے لوگوں کا شکرگزار بھی ہونا پڑے گا!

اس روز مونتیئل کی بیوہ نے اپنے تمام احساسات اور قوتیں مجتمع کر کے موت کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کوشش بارور نہ ہوئی۔ جب وہ سونے کو تھی اس وقت انگنائی سے ایک زوردار دھماکے کی آواز نے سارے گھر کو ہلا دیا۔ تجوری کے تالے کو بارود سے اُڑانا پڑا تھا۔

مونٹیل کی بیوہ نے آہ بھری۔ اکتوبر کا مہینا ابھی بارشوں اور کیچڑ سمیت طویل ہوتا جا رہا تھا۔ حوزے مونٹیل کی ابتری کی شکار لیکن لامحدود جائیداد پر موجود، بغیر تحریک اور سمت کے زندگی بسر کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو راہ گم کردہ محسوس کر رہی تھی۔ خاندان کے ایک پرانے اور مخلص دوست مسٹر کارمائیکل نے جائیداد کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ جب مونٹیل کی بیوہ نے اس ٹھوس حقیقت کا سامنا کیا کہ اس کا خاوند مر چکا ہے تب وہ خود گھر کی دیکھ بھال کی خاطر سونے کے کمرے سے برآمد ہوئی۔ گھر میں سب نمائشی چیزوں کو اس نے نکال کر پھینک دیا، فرنیچر پر ماتمی رنگوں کے غلاف چڑھوا دیے اور دیواروں پر [illegible] مرحوم کی تمام تصویروں کے گرد تعزیتی ربن بندھوا دیے۔ تدفین کے بعد کے دو ماہ کے وقفے میں اس نے دانتوں سے ناخن کترنے کی بُری عادت ڈال لی تھی۔ ایک روز جب دیر تک رونے سے اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی اور سرخ تھیں، اسے احساس ہوا کہ مسٹر کارمائیکل کھلا چھاتا لیے گھر کے اندر داخل ہو رہا ہے۔

"مسٹر کارمائیکل، چھاتا بند کرو،" اس نے کہا۔ "پہلے اس گھر میں کم بدقسمتی ہے کہ تمہارے کھلا چھاتا اندر لے کر آنے کی کسر باقی ہے؟"

مسٹر کارمائیکل نے چھاتا ایک کونے میں رکھ دیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ نیگرو تھا جس کی [illegible]

[illegible]

خاوند کی موت کے بعد پہلی بار اس کی بیوہ نے کھڑکی کھولی۔

"پہلے ہی اتنی بدقسمتی کا سامنا ہے، اوپر سے یہ سردی کا موسم،" اس نے دانتوں سے ناخن کترتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے بارش کبھی بند نہیں ہو گی۔"

"[illegible] مطلع صاف ہونے سے رہا،" جائیداد کے منتظم نے کہا۔ "کل رات میرے پھوڑوں کی سوجن نے مجھے بالکل سونے نہیں دیا۔"

موسم کے بارے میں مسٹر کارمائیکل کے پاؤں کی سوجن کی پیش گوئیوں کی وہ مکمل طور پر قائل تھی۔ اس نے کھڑکی کے باہر سنسان چوک کو دیکھا اور ان بےصدا گھروں کو جن کے دروازے حوزے مونٹیل کا جنازہ دیکھنے کے لیے وا نہ ہوئے تھے، اور اپنی ناخن کترنے کی عادت سے، اپنی بےحساب دولت سے، اور اپنے خاوند سے ورثے میں ملے ہوئے متعدد فرائض سے جنہیں سمجھنے سے وہ قطعی قاصر تھی، ناامیدی محسوس کی۔

"دنیا کا سارا نظام ہی غلط ہے،" وہ سسکی بھر کر بولی۔

ان دنوں اس کے گھر آنے والے مہمانوں کے پاس یہ سمجھنے کی بہت سی وجوہ تھیں کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ لیکن اس کا ذہن اتنی واضح سوچ کے قابل پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ قصبے میں سیاسی فسادات شروع ہونے سے قبل، وہ اکتوبر کی صبحیں اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے بیٹھے مرنے والوں کی روحوں کے لیے دعا کرنے اور یہ سوچنے میں گزارا کرتی تھی کہ اگر خداوند خدا نے اتوار کے دن آرام نہ کیا ہوتا تو شاید اس نے دنیا کی زیادہ بہتر طور پر تکمیل کی ہوتی۔ "اسے چاہیے تھا کہ اتوار کا دن دنیا کی چھوٹی موٹی غلطیاں اور بےترتیبیاں درست کرنے

میں صرف کرتا،" وہ کہا کرتی۔ "کیا مضائقہ تھا، بعد میں اس کے پاس ابد تک آرام کرنے کا وقت تھا۔" اس کے خاوند کی وفات کے بعد صرف یہ فرق پڑا تھا کہ اس وقت اس کے پاس ایسی تیرہ سوچوں کے لیے ٹھوس دلیل موجود ہوا کرتی تھی۔

سو جس زمانے میں ناامیدی مونٹیل کی بیوہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی، مسٹر کارمائیکل ڈوبتے ہوئے سفینے کو بچانے کی کوشش میں جٹا ہوا تھا۔ کاروبار اور جائیداد کا انتظام ازحد خراب تھا۔ حوزے مونٹیل نے تشدد اور دہشت پسندی کی مدد سے قصبے کی تمام تجارت پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ اس کے خوف سے آزاد ہونے پر اب سارا قصبہ اس سے انتقام لینے کے درپے تھا۔ گاہکوں کے انتظار میں، جو ہفتوں ادھر کا رخ نہ کرتے، صحن میں رکھے بڑے بڑے برتنوں میں دودھ پھٹ جاتا، شہد چھتوں میں پڑا پڑا خراب ہو جاتا اور پنیر کے کمرے کی تاریک الماریوں میں رکھے پنیر میں کیڑے رینگنے لگتے۔ حوزے مونٹیل بجلی کے قمقموں سے روشن مزار میں، نقلی سنگ مرمر کے بنے فرشتوں کے پروں کے سائے میں لیٹا اب اپنے پچھلے چھ برسوں کے جبر اور قتل و غارت کا حساب چکا رہا تھا۔ ملک کی تاریخ میں کوئی شخص اتنے کم عرصے میں اتنا زیادہ مالدار نہ ہوا تھا۔ جس زمانے میں آمریت کا نامزد کیا ہوا پہلا میئر قصبے میں وارد ہوا، حوزے مونٹیل اپنی آدھی عمر، زیرجامے میں ملبوس، اپنی چاولوں کی مل کے سامنے بیٹھ کر [illegible] چکا تھا اور ہر طرح کی حکومت کا پوشیدہ حامی رہا تھا۔ [illegible] لوگوں کی نظروں میں ایک خوش قسمت شخص [illegible] شہرت حاصل تھی۔ مثلاً ایک بار اس نے علانیہ کہا تھا کہ اگر اسے لاٹری میں انعام مل گیا تو وہ گرجے میں سینٹ جوزف کا قدآدم مجسمہ نصب کروائے گا۔ اس اعلان کے دو ہفتے بعد، جب اسے انعام کی بڑی سی رقم وصول ہوئی تو اس نے اپنا وعدہ مکمل طور پر نبھایا تھا۔ پہلی بار جوتے پہنے ہوئے اسے اس روز دیکھا گیا تھا جس روز نیا میئر، جو کہ نہایت وحشی اور بدطینت پولیس سارجنٹ تھا، قصبے میں آیا تھا۔ نئے میئر کا پہلا کام حکومت کی ہر طرح کی [illegible] کا قلع قمع کرنا تھا۔ حوزے مونٹیل نے میئر کا خفیہ مُخبر بن کر اپنی زندگی کا دھارا بدلا۔ اس معمولی سے تاجر نے، جس کی موٹے آدمیوں کی سی مزاح کی حس نے کبھی کسی کو رنجیدہ نہ کیا تھا، مخبر بننے کے بعد اپنے دشمنوں کو امیروں اور غریبوں کے دو طبقوں میں بانٹ دیا۔ غریبوں کو تو قصبے کے چوک میں گولی مار دی گئی اور امیروں کو قصبے سے نکل جانے کے لیے چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے دیا گیا۔ اس قتل و غارتگری کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کی خاطر حوزے مونٹیل میئر کے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھٹے ہوئے دفتر میں کئی کئی دن مقید رہتا، اور اس کی بیوی قصبے کے مُردوں کے لیے دعائے خیر میں مصروف رہتی۔ جب میئر اس کے گھر سے نکل کر باہر جاتا تو وہ اپنے خاوند کا راستہ روکتی [illegible]۔
"حکومت سے اپنا اثرورسوخ کام میں لا کر اس سے اس قصبے کی جان چھڑواؤ۔ یہ یہاں ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" حوزے مونٹیل، جو ان دنوں نہایت مصروف آدمی تھا، اپنی بیوی کی طرف دیکھے بغیر اسے جھڑک دیتا، "بےوقوفی کی باتیں مت کرو۔" اصل میں مونٹیل کا بنیادی کام غریبوں کا قلع قمع کرنا نہ تھا بلکہ قصبے سے امیروں کو خارج کروانا تھا۔ چنانچہ جب میئر کی پولیس نے امرا کے دروازے گولیوں سے چھلنی کر دیے اور انہیں

چوبیس گھنٹے کی مہلت دے دی تو جوزے مونتیئل نے اُن کی جائیداد، مویشی اور مال اسباب اپنی مرضی سے طے کی ہوئی قیمتوں پر اُن سے خرید لیے۔ "یہ کیا فضول حرکت ہے،" اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ "تم ان لوگوں پر احسان کرتے کرتے، کہ وہ کہیں اور جا کر بھوکے نہ مریں، خود کو تباہ کر لو گے، اور ان میں سے کوئی تمھارا شکرگزار بھی نہ ہو گا۔" جوزے مونتیئل نے، جس کے پاس ان دنوں مسکرانے کے لیے بھی وقت نہ تھا، اُسے ڈانٹ دیا اور کہا، "تم باورچی خانے میں جا کر اپنا کام کرو اور میرا دماغ مت چاٹو۔" اس رفتار سے ایک سال کے اندر اندر قصبے سے مخالفت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی بیٹیوں کو پیرس بھجوایا، لڑکے کو جرمنی میں کونسل کی نوکری دلوائی اور خود کو اپنی سلطنت مستحکم کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن اسے اپنی بے پناہ دولت سے لطف اندوز ہونے کے لیے چھ سال کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔

اس کی پہلی برسی کے بعد اس کی بیوہ کو گھر کی سیڑھیوں میں صرف اُسی لمحے چرچراہٹ سنائی دیتی جب کوئی شخص بری خبر لے کر آتا۔ ایسے لوگ عموماً شام کے وقت آیا کرتے۔ "ایک بار پھر ڈاکہ پڑ گیا ہے،" وہ کہتے۔ "کل پچاس بچھیاں لے کر بھاگ گئے۔" اپنی جھولنے والی کرسی میں بے حس بیٹھی، مونتیئل کی بیوہ دانتوں سے ناخن کترتی رہتی اور دنیا سے بددل اور کشیدہ خاطر ہوتی رہتی۔

"جوزے مونتیئل، میں نے تمھیں کہا تھا؟" وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "یہ قصبہ ناشکرے لوگوں کا ہے۔ ابھی قبر میں تمھارا جسم بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور ان لوگوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔"

اس کے گھر کوئی نہ آتا۔ اُن دنوں میں جب لگاتار بارش ہوتی رہتی تھی، صرف ایک انسان جو باقاعدگی سے اس کے گھر آتا رہتا تھا وہ مسٹر کارمائیکل تھا اور وہ ہمیشہ کھلا چھاتا لیے اندر داخل ہوتا تھا۔ کاروبار کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو رہی تھی۔ مسٹر کارمائیکل جوزے مونتیئل کے بیٹے کو کئی ہی خط لکھ چکا تھا۔ اُس نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ قصبے میں واپس آ کر کاروبار کا انتظام سنبھال لے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؛ حتیٰ کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی صحت کی خرابی کے بارے میں بھی اپنے تاثرات لکھ ڈالے تھے۔ مگر مونتیئل کے بیٹے کی جانب سے اُسے ہمیشہ ٹال مٹول والے جواب ہی موصول ہوئے۔ آخرکار مونتیئل کے بیٹے نے لکھا کہ واقعہ یہ ہے کہ وہ قصبے میں واپس آنے سے خوف زدہ تھا اسے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی اسے گولی سے اڑا دے گا۔ تب مسٹر کارمائیکل کو خواب گاہ میں بیوہ کے سامنے جا کر اعتراف کرنا پڑا کہ اُس کی مالی حالت تباہ ہو چکی ہے۔

"یہی بہتر ہے،" اس نے جواب دیا۔ "میں تو مکھیوں اور پنیر سے تنگ آ چکی ہوں۔ تمھارا بھی جو جی چاہے یہاں سے لے لو اور مجھے چین کی موت مرنے دو۔"

اس کے بعد بیوہ کا دنیا سے تعلق صرف اُن خطوں کی بدولت قائم رہا جو وہ اپنی بیٹیوں کو ہر ماہ کے اختتام پر لکھا کرتی تھی۔ "یہ بہت منحوس، جھلسا ہوا، پاپ لگا قصبہ ہے،" وہ انھیں لکھتی۔ "تم ہمیشہ کے لیے وہیں رہو اور میرے بارے میں فکرمند نہ ہو۔ میں یہ جان کر مطمئن ہوں کہ تم وہاں خوش ہو۔" اس کی بیٹیاں باری باری اس کے خطوں کا جواب دیتیں۔ اُن

کے خط ہمیشہ مسرت اور شادمانی سے پُر ہوتے اور صاف محسوس ہوتا کہ وہ خط گرم اور روشن جگہوں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں، اور یوں لگتا جیسے دونوں لڑکیاں جب سوچنے کو رکتی ہوں گی تو انھیں مختلف آئینوں میں اپنے عکس نظر آتے ہوں گے۔ انھیں بھی وطن واپس آنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ "تہذیب صرف یہیں ہے،" وہ اپنی ماں کو لکھتیں۔ "وہاں تمھارے ملک میں ہمارے لیے ماحول اچھا نہیں ہے۔ کسی ایسے وحشی ملک میں رہنا قطعی ناممکن ہے جہاں لوگ سیاسی وجوہات پر قتل کر دیے جاتے ہوں۔" ان خطوں کو پڑھ کر مونتیئل کی بیوہ کو خوشی اور بہتری کا احساس ہوتا اور وہ خطوں کے ہر جملے کے ساتھ رضامندی میں اپنا سر ہلاتی رہتی۔

ایک موقعے پر اس کی بیٹیوں نے اسے پیرس کے قصابوں کی دکانوں کے بارے میں لکھا۔ انھوں نے بتایا کہ کیسے گلابی رنگ کے سالم سؤر وہاں دروازوں میں لٹکے رہتے ہیں، اور کیسے انھیں پھولوں کے ہاروں سے سجا کر رکھا جاتا ہے۔ خط کے آخر میں کسی اور نے، جس کا لکھنے کا انداز اُس کی بیٹیوں کے انداز سے مختلف تھا، اس جملے کا اضافہ کیا ہوا تھا: "ذرا غور کریں کہ کارنیشن کا سب سے بڑا اور سب سے خوبصورت پھول سؤر کے چوتڑوں میں ٹکا ہوا ہوتا ہے۔"

یہ جملہ پڑھ کر مونتیئل کی بیوہ دو سال کے عرصے میں پہلی دفعہ مسکرائی۔ گھر کی بتیاں جلائے بغیر، وہ اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے اس نے بجلی کے پنکھے کا رخ موڑ کر دیوار کی طرف کر دیا۔ پھر اس نے چھوٹی میز کی دراز میں سے قینچی، پٹی اور اپنی تسبیح نکالی اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر، جہاں ناخن کترتے رہنے سے اُسے درد کا احساس ہو رہا تھا، پٹی باندھی۔ تب اس نے تسبیح پھیرنا شروع کی لیکن دوسرے ہی منتر پر اس نے تسبیح کو بائیں ہاتھ میں لے لیا کیونکہ دائیں انگوٹھے پر پٹی کی وجہ سے تسبیح کے دانے اسے محسوس ہی نہ ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کو اس نے دور سے طوفان کی گرج کی آواز سنی، لیکن جلد ہی اس کا سر سینے پر جھک گیا اور وہ سو گئی۔ اس کا تسبیح والا ہاتھ ایک طرف گر گیا، اور خواب میں اس نے "بڑی ماما" کو دیکھا جو سفید چادر لپیٹے اس کے گھر کے صحن میں بیٹھی تھی؛ اس کی کنگھی اس کی آغوش میں پڑی تھی اور وہ ناخنوں سے جوئیں مارنے میں مشغول تھی۔ اس نے بڑی ماما سے پوچھا،

"مجھے موت کب آئے گی؟"

بڑی ماما نے اپنا سر اٹھایا۔

"جب تھکن تمھارے بازو میں اتر آئے گی۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ : فاروق حسن

سنیچر کے بعد کے دن

ساری مصیبت جولائی میں شروع ہوئی جب ریبکا پر، جو دو غلام گردشوں اور نو خواب گاہوں والے بے حساب بڑے گھر میں تنہا رہنے والی ایک تلخ مزاج بیوہ تھی، یہ انکشاف ہوا کہ اس کے گھر کی کھڑکیوں کی جالیاں ایسے پھٹی ہوئی ہیں جیسے کسی نے باہر سے ان پر پتھراؤ کیا ہو۔ پہلی بار جب اس نے اپنی خواب گاہ کی جالی ٹوٹی ہوئی دیکھی تو اس نے سوچا کہ ارخیمیدا سے بات کرے جو نہ صرف اس کی ملازمہ تھی بلکہ، جب سے ریبکا کے خاوند کا انتقال ہوا تھا، اس کی ہم راز بھی تھی۔ کچھ دیر بعد کمروں کی چیزیں بدلتے جاتے سے (عرصہ دراز سے ریبکا نے گھر کی چیزیں ادھر سے ادھر رکھنے کے سوا کوئی کام نہ کیا تھا) اسے پتا چلا کہ صرف اسی کمرے کی نہیں بلکہ گھر کی تمام کھڑکیوں کی جالیاں پھٹی ہوئی ہیں۔ ریبکا کو اپنے اقتدار کا ایک فطری قسم کا احساس تھا، جو شاید اسے اپنے پردادا سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ جنوبی امریکا کا پیدائشی ہسپانوی تھا جو جنگ آزادی میں شاہ پرستوں کی جانب سے شریک ہوا تھا اور بعدازاں نہایت کٹھن سفر طے کر کے، صرف اس مقصد سے ہسپانیہ گیا تھا کہ اس عالی شان محل کا دیدار کر سکے جسے چارلس سوم نے سان الدیفونسو میں تعمیر کیا تھا۔ لہٰذا جب ریبکا کو گھر کی جالیوں کی صورت حال کا پتا چلا تو اس نے ارخیمیدا سے بات کرنے کے خیال کو رد کر دیا اور اس کی بجائے وہ اپنی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپی پہن کر، جس پر مخمل کے چھوٹے چھوٹے پھول تھے، ٹاؤن ہال کی طرف روانہ ہو گئی تاکہ اپنے گھر پر حملے کے خلاف شدید درج کرا سکے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبے کا میئر خود قمیص کے بغیر، بالوں بھرے جسم کے ساتھ، اپنے وجود کا ٹھوس پن عیاں کرتے ہوئے جو

ریبکا کو حیرانی محسوس ہوا، ٹاؤن ہال کی کھڑکیوں کی جالیاں مرمت کرنے میں مصروف تھا جو ریبکا کے گھر کی جالیوں کی طرح ٹوٹی ہوئی تھیں۔

ریبکا کاٹھ کباڑ سے بھرے اس گندے دفتر کے اندر چلی آئی، اور جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ میز پر مردہ پرندوں کا ڈھیر تھا۔ لیکن کچھ گرمی اور کچھ جالیوں کی تباہی پر برہمی کی وجہ سے وہ اتنی بدحواس تھی کہ اسے میز پر پڑے مردہ پرندوں کے ناقابلِ یقین منظر کو دیکھ کر لرزنے کا وقت ہی نہ ملا۔ نہ وہ عہدے اور منصب کی توہین سے دل برداشتہ ہوئی جس کا مالک اس کی آنکھوں کے سامنے سیڑھیوں کے اوپر کھڑا، جالی کا بنڈل اور پیچ کس ہاتھ میں لیے، کھڑکیوں کی جالیاں ٹھیک کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں اپنے مرتبہ اور اپنی کھڑکیوں کے نقصان کے سوا کوئی خیال نہ تھا اور اسی انہماک کی بدولت وہ اپنی کھڑکیوں اور ٹاؤن ہال کی کھڑکیوں کے درمیان کسی اشتراک کا تعین نہ کر سکی۔ وہ دروازے سے دو قدم اندر، تمیزدارانہ سنجیدگی سے کھڑی ہو گئی اور اپنے چھاتے کے طویل اور مرصع دستے پر وزن ڈالتے ہوئے بولی:

"میں ایک شکایت درج کرانے آئی ہوں۔"

سیڑھیوں کے اوپر کھڑے میئر نے اپنا گرمی سے تپا ہوا چہرہ موڑا۔ بیوہ کی اس وقت دفتر میں بےوجہ موجودگی پر اس نے کسی جذبے کا اظہار نہ کیا۔ معمولانہ لاتعلقی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی جالیوں کو اکھیڑنا جاری رکھتے ہوئے۔ اس نے سیڑھیوں کے اوپر ہی سے پوچھا:

"کیا شکایت ہے؟"

"محلے کے لڑکوں نے میرے گھر کی تمام جالیاں توڑ دی ہیں۔"

میئر نے ایک بار پھر بیوہ کی طرف دیکھا۔ اس بار اس نے، مخمل کے پھولوں سے لے کر پرانی چاندی کے رنگ کے جوتوں تک، اس کا احتیاط سے جائزہ لیا جیسے اسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ جسمانی حرکت کی ازحد کفایت کرتے ہوئے اور اپنی نظریں بیوہ پر سے ہٹائے بغیر وہ سیڑھیوں سے اترا۔ نیچے پہنچ کر اس نے ایک ہاتھ اپنی پتلون کی پیٹی پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے، جس میں پیچ کس پکڑا ہوا تھا، ڈیسک کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"سینیورا، یہ کارگزاری پرندوں کی ہے، لڑکوں کی نہیں۔"

تب، بالآخر، ریبکا کو ڈیسک پر پڑے مردہ پرندوں، سیڑھیوں کے اوپر کھڑے آدمی اور اپنے گھر کے کمروں کی شکستہ جالیوں کے درمیان تعلق کا احساس ہوا، اور اپنے گھر کی خواب گاہوں میں مردہ پرندوں کے ڈھیر کا سوچ کر وہ کانپ اٹھی۔

"پرندوں کی؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"جی، پرندوں کی،" میئر نے اس سے اتفاق کیا۔ "تعجب ہے کہ یہ بات اب تک آپ کے مشاہدے میں نہیں آئی، جب کہ پچھلے تین روز سے ہمیں پرندوں کے کھڑکیوں سے اندر گھسنے اور گھروں کے اندر آ کر مرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔"

ٹاؤن ہال سے نکلتے وقت ریبکا شرمندہ سی تھی اور ارخیمیدا سے کچھ ناراض بھی، جو کہ شہر کی باقی تمام بکواس گھر میں لے آیا کرتی تھی تاہم اس نے ریبکا سے پرندوں کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ اگست سے قبل کی دھوپ سے ریبکا کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے اپنا چھاتا

کھول لیا۔ سنسان اور دم گھونٹنے والی گلی میں چلتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے تمام گھروں کی خراب کابکوں میں سے مرے ہوئے پرندوں کی تیز اور چبھتی ہوئی سڑاند اٹھ رہی ہے۔

یہ جولائی کا آخر تھا اور قصبے کی تاریخ میں آج تک اتنی شدید گرمی نہ پڑی تھی۔ لیکن قصبے کے باسیوں کو، جو پرندوں کے مرنے سے گھبرائے ہوئے تھے، گرمی کی شدت کا پتا نہ چلا تھا۔ اس عجیب وغریب واقعے نے بستی والوں کے روز کے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تھی تاہم لوگوں کی اکثریت اگست کے اوائل میں اس واقعے کے باعث مخمصے میں تھی۔ اس اکثریت میں قصبے کے روکھے پھیکے پادری، عزت مآب اینتونی ایزابیل کا شمار نہیں تھا، جو کاستانیدا ای مونتیرو کی مقدس قربان گاہ سے تعلق رکھتا تھا، اور جس نے، چورانوے برس کی عمر میں، لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ تین بار ابلیس سے مل چکا ہے، تاہم ابھی تک اس نے صرف دو مردہ پرندے دیکھے تھے اور ان کی موت سے کوئی اہمیت وابستہ نہیں کی تھی۔ پہلا مردہ پرندہ اسے ایک منگل کو عبادت کے بعد کلیسا کے محراب میں نظر آیا تھا۔ اس نے سوچا شاید محلے کی کوئی بلی اسے گھسیٹ کر وہاں لے آئی ہو گی۔ دوسرا اسے بدھ کے دن اپنے گھر کے دالان میں پڑا ملا تھا جسے اس نے جوتے کی نوک سے دھکیل کر، یہ سوچتے ہوئے کہ بلیاں نہایت فالتو اور غیرضروری مخلوق ہیں، سڑک کے بیچوں بیچ پھینک دیا تھا۔

لیکن جمعے کے دن جب وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اس بنچ پر جس پر اس نے بیٹھنے کا ارادہ کیا، اسے تیسرا مردہ پرندہ دکھائی دیا۔ جب وہ پرندے کو چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے تھام کر اپنی آنکھوں کے سامنے لایا اور الٹ پلٹ کر غور سے اس کا معائنہ کیا تو اسے اپنے اندر بجلی کا سا کڑکا محسوس ہوا اور اس نے سخت متعجب ہو کر سوچا، خدا رحم کرے ایک ہفتے میں یہ تیسرا مردہ پرندہ مجھے نظر آیا ہے۔

اس لمحے کے بعد سے اس نے قصبے میں ہونے والے واقعات کا مشاہدہ شروع کیا، لیکن بہت ہی غیرواضح طریقے سے اس لیے کہ فادر اینتونی ایزابیل، کچھ تو اپنی عمر کے سبب اور کچھ اس باعث کہ وہ تین بار ابلیس سے ملنے کا بیان دے چکا تھا (جو کہ لوگوں کے خیال میں تھوڑا سا غیرموزوں تھا) اپنے مسیحی حلقے والوں کی نظر میں دماغی طور پر عادتاً غیرحاضر جانا جاتا تھا باوجود اس کے کہ لوگ اس کی نیکوکاری، امن پسندی اور خوش خلقی کے بھی قائل تھے۔ اسے احساس ہو کہ پرندوں کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی تھا اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کے آئندہ خطبے کا موضوع بن سکے۔ فادر اینتونی ایزابیل وہ پہلا شخص تھا جسے قصبے میں پھیلی ہوئی بو کا احساس ہوا تھا۔ جمعے کی رات کو وہ خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھا تھا، اس کی ہلکی نیند مردہ پرندوں کی جی متلا دینے والی سڑاند سے اڑ گئی تھی لیکن وہ یہ باور نہ کر سکا کہ اس بدبو کو کسی خواب بد سے منسوب کرے یا ابلیس سے جس نے اس کی نیند خراب کرنے کے لیے کوئی نیا اور انوکھا حربہ وضع کیا تھا۔ اس نے چاروں طرف سونگھا اور بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ تجربہ اس کے خیال میں ایک ڈرامائی وعظ کا موضوع بننے کے لائق تھا کہ ابلیس کس طرح حواس خمسہ میں سے کسی ایک کے ذریعے، لوگوں کے دلوں میں سرایت کرنے کا اہل ہے۔

دوسرے روز عبادت سے قبل جب وہ صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا تو اس نے پہلی بار کسی کو مردہ پرندوں کا ذکر کرتے سنا۔ وہ اپنے خطبے، ابلیس، اور ان گناہوں کے بارے میں غوروفکر کر رہا تھا جن کا حس شامہ کے ذریعے ارتکاب کیا جا سکتا ہے، جب اس نے کسی کو کہتے سنا کہ قصبے میں پھیلی بدبو ان مردہ پرندوں کی وجہ سے ہے جو پچھلے ہفتے کے دوران میں اکٹھے کیے گئے تھے۔ اس کے دماغ میں انجیلی تنبیہات، کریہہ بدبوؤں اور مردہ پرندوں کا ملغوبہ سا بننے لگا حتیٰ کہ اتوار کے روز خطبے کے دوران اسے خیرات کے موضوع پر ایک طویل پیراگراف فی البدیہہ گھڑنا پڑا جس کا مطلب خود اس پر بھی مکمل طور پر واضح نہ تھا اور یوں ابلیس اور حواس خمسہ کا ربط ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن سے فراموش ہو گیا۔

تاہم اس کی فکر کے کسی دورافتادہ کونے میں یہ تجربات ضرور پوشیدہ رہ گئے ہوں گے۔ یہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہوتا تھا، نہ صرف مذہبی دارالعلوم میں، جہاں وہ ستر سال قبل طالب علم رہا تھا بلکہ اب، نوے سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد، یہ سب کچھ خاص طرح سے ہو رہا تھا۔ دارالعلوم میں ایک چمکدار سہ پہر کو، جب بادل گرجے بغیر موسلا دھار بارش ہوتی تھی وہ سوفوکلیز کا ایک انتخاب اصل زبان میں پڑھنے میں مشغول تھا۔ جب بارش تھمی تو اس نے کھڑکی سے باہر تھکے ہوئے میدان اور نئی دھلی دھلائی سہ پہر کو دیکھا تھا اور اس لمحے یونانی تھیٹر اور کلاسیکی ادب کو یکسر بھول گیا تھا۔ ویسے بھی ان دونوں میں اس نے کبھی زیادہ امتیاز نہ کیا تھا، بلکہ انہیں عمومی طور پر "پرانے وقتوں کی قدیم چیزیں" کہہ کر ہی پکارا کرتا تھا۔ ایک بےبارش کی سہ پہر کو، شاید تیس چالیس برس بعد، کسی نئے قصبے میں جہاں وہ دورے پر گیا ہوا تھا اینٹوں والے چوک کو عبور کرتے ہوئے اس نے غیرارادی طور پر سوفوکلیز کا وہی قطعہ دوہرا دیا تھا جو وہ اس روز دارالعلوم میں پڑھ رہا تھا۔ اسی ہفتے اس نے باتوں کے رسیا اور اثر پذیر ایک بوڑھے نائب پادری سے "پرانے وقتوں کی قدیم چیزوں" کے بارے میں طویل گفتگو بھی کی تھی۔ وہ نائب پادری ایک خاص طرز کے پیچیدہ معموں کا شوقین تھا جن کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس نے خود ایجاد کیے ہیں، بعد ازاں وہی معمے "کراس ورڈ" کے نام سے خاصے مشہور ہوئے تھے۔

نائب پادری کے ساتھ گفتگو سے اس کا یونانی علوم کے ساتھ پہلے جیسا دلی لگاؤ ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔ اسی سال کرسمس کے موقعے پر اسے ایک خط موصول ہوا تھا۔ اور اگر اس وقت تک اس کے مبالغہ آمیز تخیل، تشریحات کی دلیری اور وعظوں میں بےوقوفی کی مکمل شہرت نہ ہو چکی ہوتی تو اس موقعے پر اسے بشپ کا عہدہ دے دیا گیا ہوتا۔

لیکن اس نے تو اپنے آپ کو ۱۸۸۵ کی جنگ سے قبل ہی اس قصبے میں زندہ دفن کر دیا تھا، اور ان دنوں جب پرندوں نے خواب گاہوں میں مرنا شروع کیا تھا، اس بات کو ایک مدت گزر چکی تھی کہ قصبے والوں نے، خصوصاً اس کی ابلیس سے ملاقاتوں کے دعوے کے بعد، اس کی جگہ کسی کم عمر پادری کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ اس کے بعد سے انہوں نے اس کی طرف دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تھا، اور یہ بات اس کی اپنی نظر سے پوشیدہ رہی تھی حالانکہ اس کی نظر اب بھی ایسی تیز تھی کہ وہ دعاؤں کی کتاب کے باریک حروف عینک کے

بغیر پڑھ سکتا تھا۔

اس کی عادات ہمیشہ سے مخصوص اور معین رہی تھیں۔ چھوٹے قد اور غیراہم شخصیت، نمایاں اور مضبوط ہڈیوں اور پرسکون حرکات والے اس شخص کی آواز گفتگو میں آسودگی دینے والی تھی، لیکن خطبے کے دوران ضرورت سے زیادہ ہی آسودگی بہم پہنچایا کرتی تھی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت تک صرف اپنی سوتی پتلون میں ملبوس، جس کے پائنچے پنڈلیوں تک مڑے ہوئے تھے، کینوس کی کرسی میں سیل ایکوری میں دراز دن سپنے دیکھا کرتا تھا۔

عبادت میں وعظ کرنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ وہ اعتراف کی کوٹھری میں جا بیٹھتا لیکن عرصۂ دراز سے کوئی شخص اعتراف کے لیے نہ آیا تھا۔ اس نے محض یہ سمجھا کہ نئے زمانے کے طورطریقوں کے باعث اس کے مسیحی حلقے کے لوگوں کا ایمان کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اسی لیے اس کے حساب سے ابلیس سے اس کی تین بار ملاقات ایک تجربہ تھا جو وقت اور زمانے کے عین مطابق تھا۔ تاہم اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لوگ اس کی باتوں پر کم ہی کان دھرتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ خود بھی ان تجربات کا ذکر کرتے وقت زیادہ قابل یقین نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لیے خود اپنے آپ یہ دریافت کر لینا حیرانی کی بات ہوتی کہ پچھلے پانچ سالوں کے دوران خاص طور پر ان غیرمعمولی لمحوں میں جب اس نے پہلے دو مردہ پرندے دیکھے تھے وہ مردہ رہا تھا۔ اس میں زندگی کی تھوڑی سی رمق اس وقت پیدا ہوئی جب اس نے تیسرا مردہ پرندہ دیکھا تھا، اب پچھلے چند دنوں سے وہ بڑی کثرت سے سٹیشن کی بنچ پر پائے گئے پرندے کے بارے میں غور وفکر میں مصروف تھا۔

گرجے سے دس قدم کے فاصلے پر اس کا بغیر جالیوں کا چھوٹا سا گھر تھا جس کا برآمدہ سڑک کی طرف تھا اور پیچھے دو کمرے تھے جو اس کے دفتر اور خواب گاہ کا کام دیتے تھے۔ کبھی کبھی شاید ایسے لمحوں میں جب اس کا ذہن غیرواضح ہوتا وہ سوچتا کہ دنیا میں اگر گرمی کا وجود نہ ہوتا تو خوشی کا حصول ممکن تھا، اور یہ خیال اس کے ذہن کو الجھا دیتا۔ مابعدالطبیعیات کی دشوار گزار راہوں میں بھٹکنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر صبح اپنی خواب گاہ میں دروازہ بھیڑے، آنکھیں موندے اور جسم کے پٹھے اکڑائے بیٹھا وہ یہی کیا کرتا تھا۔ تاہم اسے یہ احساس نہ تھا کہ اس کی سوچ اس قدر لطیف ہو چکی ہے کہ پچھلے تین برس سے اپنے مراقبے کے لمحوں میں وہ کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوتا۔

ٹھیک بارہ بجے دوپہر ایک لڑکا ہاتھوں پر خانوں والا طشت تھامے برآمدہ عبور کرتا جس میں ہمیشہ وہی چیزیں ہوتی تھیں: ہڈیوں کا سوپ، یکہ کا ایک ٹکڑا، ابلے ہوئے چاول، بغیر پیاز کا گوشت ملا ہوا، تلا ہوا کیلا یا مکئی کی روٹی اور تھوڑی سی دال، جسے مقدس قربان گاہ کے سینٹیسیمو سیکرامنٹو کے پادری انتونی ایزابیل نے کبھی چکھ کر نہ دیکھا تھا۔

لڑکا طشت کو اس کرسی کے نزدیک رکھ دیتا جس پر پادری بیٹھا ہوتا تھا، لیکن پادری اپنی آنکھیں اس وقت تک نہ کھولتا جب تک کہ برآمدے میں واپس جاتے ہوئے قدموں کی آواز ختم نہ ہو جاتی۔ اس کی اس عادت کے باعث قصبے میں مشہور ہو چکا تھا کہ پادری دوپہر کے کھانے سے قبل ہی قیلولہ کر لیتا ہے (جو کہ نہایت فضول حرکت سمجھی جاتی تھی)۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ بےچارے پادری کو رات میں بھی ٹھیک سے نیند نہ آتی تھی۔

اس عمر میں اس کی عادتیں کم پیچیدہ، بلکہ بالکل غیرمہذب سی ہو گئی تھیں۔ مثلاً وہ دوپہر کا کھانا اپنی کینوس کی کرسی ہی میں بیٹھے بیٹھے کھا لیا کرتا، خوراک کو طشت میں سے باہر بھی نہ نکالتا اور رکابیاں اور چھری کانٹے بھی استعمال نہ کرتا۔ ایک ہی چمچ سے جس سے وہ سوپ پیتا تھا، وہ سارا کام چلاتا۔ بعدازاں وہ اٹھتا، تھوڑا سا پانی سر پر انڈیل کر اپنی سفید عبا پہنتا جس میں بڑی بڑی چوکور ٹکڑیاں تھیں، اور عین اس وقت جب باقی کا قصبہ قیلولے کے لیے لیٹ رہا ہوتا، وہ ریلوے اسٹیشن کا رخ کرتا۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ ایک ہی راستے سے، ایک خاص دعا پڑھتا، آ جا رہا تھا جو اس نے خود ہی اس وقت وضع کی تھی جب ابلیس سے اس کی آخری بار ملاقات ہوئی تھی۔

ایک سنیچر کو — مردہ پرندوں کی بارش شروع ہونے کے نو دن بعد — جب مقدس قربان گاہ کا پادری انتونی ایزابیل یوں ہی چلا جا رہا تھا تو ربیکا کے گھر کے عین سامنے، ایک مرتا ہوا پرندہ آسمان سے اس کے پیروں میں آ کر گرا۔ اس کے دماغ میں وجدان کا کوندا سا لپکا اور اسے احساس ہوا کہ باقی پرندوں کے برعکس اس مرتے ہوئے پرندے کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ اس نے پرندے کو ہاتھوں میں اٹھایا اور ربیکا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ربیکا اس لمحے، قیلولہ کرنے کی خاطر، اپنا شلوکہ اتارنے میں مصروف تھی۔

اپنی خواب گاہ میں سے ربیکا نے دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز سنی اور جبلی طور پر جالیوں کی طرف دیکھا۔ پچھلے دو روز سے کوئی پرندہ اس کی خواب گاہ میں داخل نہ ہوا تھا لیکن جالی اب تک پھٹی ہوئی تھی۔ جالیوں کی مرمت کرانا، جب تک پرندوں کی یورش جاری تھی جس سے اس کے اعصاب میں تناؤ رہنے لگا تھا، بالکل فضول ہوتا۔ بجلی کے پنکھے کی آواز سے اوپر اٹھتی ہوئی اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی اور بےصبری سے اسے یاد آیا کہ ارخینیدا برآمدے کے دوسرے کونے والے کمرے میں قیلولہ کر رہی ہے۔ اس نے اس بابت بالکل غور نہ کیا کہ اس لمحے اپنی موجودگی اس پر مسلط کرنے والا کون شخص ہو سکتا ہے۔ اپنا شلوکہ اس نے دوبارہ پہن لیا، جالی کا دروازہ کھول کر تنے ہوئے انداز میں سیدھے چلتے ہوئے پورا برآمدہ طے کیا اور نشست کے کمرے میں سے گزر کر، جس میں مختلف زیبائشی اشیا اور فرنیچر کی بھرمار تھی، دروازہ کھولنے سے قبل پیتل کی جالی میں سے باہر جھانکا۔ باہر کم گو فادر انتونی ایزابیل آنکھیں بند کیے اور ہاتھوں میں ایک پرندہ اٹھائے کھڑا تھا۔ ابھی اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا کہ پادری نے کہا، "اگر اسے تھوڑا سا پانی پلا کر تھالی کے نیچے رکھ دیا جائے تو مجھے یقین ہے یہ اچھا ہو جائے گا۔" اور جب ربیکا نے دروازہ کھولا تو اسے لگا جیسے خوف کے مارے وہ وہیں ڈھیر ہو جائے گی۔

پادری پانچ منٹ سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرا۔ ربیکا کو احساس ہوا جیسے اس کی کسی بات نے پادری کے قیام کو مختصر کر دیا ہو، لیکن دراصل پادری نے خود ہی ملاقات کو مختصر کیا تھا۔ ربیکا اگر اسی لمحے غور کرتی تو اسے احساس ہو جاتا کہ پادری پچھلے تیس برسوں میں، جب سے وہ اس قصبے میں مقیم تھا، کبھی اس کے گھر میں پانچ منٹ سے زیادہ دیر کے لیے نہ رکا تھا۔ پادری کو اس گھر میں رکھی چیزوں کی فراوانی میں گھر کی مالکہ کی شہرت پرست روح کا عکس صاف دکھائی دیتا تھا باوجود اس کے کہ، جیسا کہ ہر ایک کو معلوم تھا

ربیکا کی بشپ سے دور کی قرابت داری بھی تھی۔ اس کے علاوہ ربیکا کے خاندان کے بارے میں ایک روایت (یا محض ایک کہانی) مشہور تھی جو یقیناً، پادری کے خیال میں، کلیسائی محل والوں کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی حالاں کہ ربیکا کے ایک دور کے عم زاد، کرنل اوریلیانو بوئندیا نے، جسے ربیکا خاندانی شفقت سے قطعی عاری سمجھتی تھی، ایک بار قسم کھا کر بیان دیا تھا کہ بشپ نے اس پوری صدی میں قصبے میں اس لیے قدم نہ رکھا تھا کہ وہ اپنے رشتےداروں سے ملنے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال، یہ خواہ تاریخی واقعہ تھا یا من گھڑت کہانی، حقیقت یہ تھی کہ مقدس قربان گاہ کے پادری ایسوبی ایزابیل کو اس گھر میں ہمیشہ بےآرامی کا احساس ہوتا تھا، جس میں تنہا رہنے والی مالکہ نے کبھی خداترسی نہیں دکھائی تھی اور جو سال بھر میں صرف ایک بار اعتراف کے لیے گرجے جاتی تھی اور اس اعتراف کے دوران میں بھی ہر اس سوال کا جو اس کے خاوند کی موت کے حیرت ناک حادثے کے بارے میں ہوتا تھا، گول مول جواب دیا کرتی تھی۔ اگر پادری اس موقعے پر اس گھر میں موجود تھا اور ہاتھ میں پرندہ تھامے ربیکا کے پانی کا گلاس لا کر پرندے کو ڈبکی لگوانے کا منتظر تھا تو اس کا باعث چند اتفاقات تھے جن کے لیے وہ ہرگز جواب دہ نہ تھا۔

بیوہ کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے، چوبی کام والی آرام کرسی میں دھنسے ہوئے، پادری نے اس گھر کی عجیب و غریب سیلن کو محسوس کیا۔ اس لمحے سے بیس برس پہلے ایک دن، اس گھر میں پستول چلنے کی آواز گونجی تھی اور خوزے آرکادیو بوئندیا (کرنل اوریلیانو اور بیوی کا عم زاد) گولی لگنے سے چکرا کر، مہمیزوں اور بکسوؤں کے ڈھیر کے درمیان اپنے اتارے ہوئے چرمی موزوں پر گرا تھا۔ انھی موزوں پر جن میں اس کے جسم کی گرمی ابھی موجود تھی۔ اس دن سے اس گھر کو سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہ ہوا تھا۔

ربیکا جب دوبارہ نشست کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے پادری کو آرام کرسی میں بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی دھندلاہٹ تھی کہ وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

"خداوند خدا کو ایک پرندے کی زندگی بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی ایک انسان کی،" پادری نے کہا۔

لیکن یہ کہتے وقت اس کے ذہن میں خوزے آرکادیو بوئندیا کا خیال نہ آیا تھا اور نہ ہی بیوہ نے یہ سن کر اپنے مرحوم خاوند کو یاد کیا تھا۔ لیکن بیوہ کو پادری کی باتوں پر اعتقاد نہ کرنے کی عادت ہو چکی تھی، خاص طور پر اس وقت سے جب پادری نے گرجے کے منبر پر کھڑے ہو کر ابلیس کے تین بار اس کے سامنے ظاہر ہونے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی بات پر زیادہ دھیان نہ دیتے ہوئے ربیکا نے پرندے کو ہاتھوں میں پکڑا، اسے پانی میں ڈبکی دی اور پھر جھنجھوڑا۔ پادری نے غائر نظر سے دیکھا کہ اس عورت کے طریقۂ کار میں خداترسی اور احتیاط کا فقدان تھا اور اسے پرندے کی زندگی کی ذرہ بھر پروا نہ تھی۔

"تمھیں پرندے اچھے نہیں لگتے!" پادری نے نرمی سے مگر اثبات کے لہجے میں کہا۔

بیوہ نے بےصبری اور مخاصمت کے انداز سے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "ایک وقت ایسا تھا کہ مجھے پرندے پسند تھے،" وہ بولی۔ "مگر جب سے انھوں نے ہمارے گھروں کے اندر آ کر مرنا شروع کیا ہے مجھے زہر لگنے لگے ہیں۔"

"بہت سے پرندے مر گئے ہیں،" پادری کٹرپن سے بولا۔ لیکن کسی شخص کو یہ گمان بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے ہموار لہجے میں بہت چالاکی چھپی ہوئی ہے۔

"سب مر گئے ہیں،" بیوہ نے کہا۔ اور ساتھ ہی ناگواری سے ہاتھ میں تھامے پرندے کو زور سے دبا کر تھالی کے نیچے رکھتے ہوئے اضافہ کیا، "مجھے ان کے مرنے کی بھی پروا نہ ہوتی اگر وہ میری جالیاں نہ توڑتے۔"

پادری نے باور کیا کہ اس نے اپنی تمام زندگی میں اس سے زیادہ سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں دیکھا۔ ایک لمحے بعد پرندے کے مختصر سے بےمدافعت جسم کو ہاتھ میں اٹھانے پر اسے پتا چلا کہ اس کی سانس بند ہو چکی ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے سب کچھ فراموش ہو گیا — گھر کی سیلن، گھر کی مالکہ کی شہوت پرستی، خوزے آرکادیو بوئندیا کے جسم سے اٹھتی ہوئی بارود کی ناقابل برداشت بُو — اور اس پر وہ عظیم الشان حقیقت آشکار ہوتی جو اس ہفتے کے آغاز سے اس کے قرب وجوار میں موجود تھی۔ بیوہ نے اسے مردہ پرندہ ہاتھوں میں تھامے اور دہشت دلانے والا اشارہ کرتے ہوئے گھر سے نکلتے دیکھا۔ لیکن پادری اس وقت ایک حیرت انگیز کشف سے گزر رہا تھا کہ قصبے پر مُردہ پرندوں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ خود خداوند خدا کا برگزیدہ اور منصب خدمت گار، جس کا زندگی میں خوشی سے واسطہ رہا تھا جب گرمی نہ پڑ رہی ہوتی تھی، قربِ قیامت کے بارے میں سب کچھ فراموش کر چکا ہے۔

اس روز بھی وہ حسبِ سابق ریلوے اسٹیشن پر گیا، مگر اس روز وہ اپنی حرکات سے بےخبر نہ تھا۔ اسے مبہم طور پر احساس تھا کہ دنیا میں کچھ ہو رہا ہے مگر اس کا ذہن گڈمڈ اور ساکت تھا اور وہ خود حالات کا سامنا کرنے سے قطعی قاصر تھا۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آیا قربِ قیامت کے آثاروں میں مُردہ پرندوں کی بارش کا ذکر بھی تھا، لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ ایک دم اسے خیال آیا کہ شاید ربیکا کے گھر میں رکنے کے سبب اس نے دیر کر دی ہو اور گاڑی آ کر چلی گئی ہو، لیکن اس نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے اور گردآلود شیشے کے اندر سے گزرتی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی تو اسے پتا چلا کہ ابھی بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ جب وہ دوبارہ بنچ پر بیٹھا تو اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ آج سنیچر ہے۔ کھجور کے پتوں کے دستی پنکھے سے اپنے آپ کو ہوا کرتے وقت وہ ذہن کی تاریک دھند میں کھویا رہا۔ کچھ دیر وہ اپنی عبا، اپنے جوتوں اور اپنی پادریوں والی لمبی آرام دہ پتلون کے بٹنوں کے بارے میں جھنجھلاہٹ کا شکار رہا۔ تب اس نے گھبرا کر محسوس کیا کہ آج تک اسے اتنی گرمی نہ لگی تھی جتنی اس وقت لگ رہی تھی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی عبا کے بٹن کھولے، آستین میں سے رومال نکال کر اپنا تپا ہوا چہرہ صاف کیا اور جذبے کی بصیرت والے ایک عارضی لمحے میں سوچا کہ شاید وہ کسی زلزلے کی تہیں کھلنے کا منظر دیکھ رہا ہے۔ یہ عبارت اس نے کہیں پڑھی تھی۔ مگر آسمان بالکل صاف تھا، نیلا اور شفاف آسمان جس میں سے تمام پرندے پُراسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اس نے آسمان کے رنگ اور شفافیت کو تو دیکھا مگر ایک لمحے کے لیے پرندوں کو بھول گیا۔ اب وہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا: شاید کوئی طوفان آنے والا ہے۔ لیکن آسمان ٹھہرا ہوا، پُرسکون اور بےحرکت تھا جیسے بہت دور کے کسی اور قصبے کا آسمان ہو

جہاں اسے گرمی کا کبھی احساس نہ ہوا ہو، اور جیسے اس کی یہی آنکھیں کسی اور کی آنکھیں ہوں جو اس آسمان کو دیکھ رہی ہوں۔ تب اس نے شمال کی جانب نظر دوڑائی اور وہاں کھجور کے پتوں اور زنگ آلود جست کی چھتوں سے پرے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے اوپر، خوش آہستگی اور روانی سے اڑتے ہوئے گدھوں کا ایک دھبا سا دیکھا۔

کسی نامعلوم وجہ سے اس لمحے پادری اُسی کیفیت سے گزرا جس سے ایک اتوار کو دارالعلوم میں اپنے ادنیٰ مدارج حاصل کرنے سے کچھ روز پہلے گزرا تھا۔ ریکٹر نے اسے اپنا ذاتی کتب خانہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور وہ روزانہ (خصوصاً اتواروں کو) گھنٹوں وہاں بیٹھ میلی ہوتی ہوئی کتابیں پڑھتا رہتا تھا، جن میں سے پرانی لکڑی کی بُو آیا کرتی تھی اور جن میں لاطینی زبان کے چھوٹے چھوٹے خمدار حروف میں ریکٹر نے اپنے ہاتھ سے حاشیہ آرائی کی ہوئی ہوئی تھی۔ ایک اتوار کو، جب وہ صبح سے مطالعے میں مصروف تھا، بعد شام کے وقت [illegible] کمرے میں داخل ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ کر برافروختہ سا ہو کر اس نے ایک کارڈ فرش پر سے اٹھا لیا جو اس کتاب میں سے گرا تھا جسے پادری پڑھ رہا تھا۔ پادری نے رتبے میں اپنے سے برتر اس شخص کی ذہنی ابتری کو پوشیدہ لاتعلقی سے دیکھا اور اس دوران میں کارڈ پر لکھی عبارت بھی پڑھ لی۔ کارڈ پر جامنی روشنائی میں صاف اور سیدھے خط میں ایک ہی فقرہ درج تھا، "مادام اِی وینٹ آج رات مر گئی۔" تقریباً نصف صدی کے بعد آج گدھوں کے ایک دھبے کو ایک بھولے ہوئے قصبے کے آسمان پر دیکھ کر پادری کو اُس اتوار کو بینچ سامنے بیٹھے ہوئے ریکٹر کی معصوم کیفیت یاد آ گئی جب غروبِ آفتاب کے مقابل ریکٹر کا چہرہ عنابی ہو رہا تھا اور اس کی سانس تیز ہو گئی تھی۔

یادداشت کے اس تعلق سے لوٹ کر پادری کو اس وقت گرمی کا نہیں بلکہ اس کے برعکس پاؤں کے تلووں میں اور زیرناف برف کی کاٹ محسوس ہوئی۔ وہ بے جا بغیر دہشت زدہ تھا کہ کس مخصوص وجہ سے دہشت زدہ ہے اور پراگندہ خیالات کے جال میں گرفتار تھا جن میں یہ تمیز کرنا ناممکن تھا کہ کون سا خیال سب سے بڑھ کر قریب المنظر ہے، آیا ابلیس کی کیچڑ میں دھنسے ہوئے سحروں کا یا سماں سے مردہ پرندوں کی ڈھیروں ڈھیر بارش کا گرچہ وہ خود، مقدس قربان گاہ کا فادر اینتونی ایزابیل اس موخرالذکر واقعے سے لاتعلقی محسوس کر رہا تھا۔ تب وہ یک دم سیدھا ہو بیٹھا، اپنا سہما ہوا ہاتھ ہوا میں اوپر اٹھایا جیسے ایسی تہنیت کا بیان شروع کرنے والا ہو جو خالی فضا میں غائب ہو چکی ہو، اور حواس باختہ ہو کر چیخا:

"گردش زدہ یہودی!"

عین اس وقت ریل کی سیٹی بجی۔ اتنے برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے سیٹی کی آواز سنائی نہ دی۔ اس نے گاڑھے دھوئیں میں لپٹی ریل گاڑی کو اسٹیشن میں داخل ہوتے دیکھا اور زنگ آلود جست کی چادروں پر برستے کوئلے کے ذروں کی آواز سنی۔ لیکن یہ ایک دورافتادہ اور ناقابل فہم خواب کی طرح تھا جس سے وہ اس سہ پہر، چار بجے کے بعد تک بھی، پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا جب وہ اپنے ذہن میں اس متاثرکن وعظ کی نوک پلک سنوار رہا تھا جو اسے اگلے دن، اتوار کو، کرنا تھا۔ آٹھ گھنٹے بعد اسے ایک عورت کے لیے آخری دعائیں پڑھنے

جانا پڑا۔

نتیجہ یہ کہ پادری کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس سہ پہر ریل گاڑی سے کون اترا تھا۔ بہت عرصے سے وہ گاڑی کے چار بےرنگ اور بوسیدہ ڈبوں کو دیکھتا [illegible] یاد نہیں تھا کہ کوئی شخص پچھلے کئی برسوں میں ٹھہرنے کے لیے [illegible] ہو۔ پرانے وقتوں میں معاملہ مختلف تھا جب وہ ساری سہ پہر کیلوں سے بھری گاڑی کو گزرتے دیکھتا رہتا تھا۔ اس گاڑی کے ایک سو چالیس ڈبے ہوتے تھے، اور پھلوں سے لدی وہ گاڑی لامتناہی وقت تک گزرتی رہتی تھی حتیٰ کہ سورج ڈھلنے سمے اس کا آخری ڈبہ گزرتا جس میں سے ایک دمی سبز بتی باہر لٹکائے ہوئے ہوتا تھا۔ تب کہیں اسے قصبے کا ریل کی پٹری کی دوسری طرف والا حصہ نظر آتا، جہاں اب بتیاں روشن ہو چکی ہوتیں، اور اسے یوں لگتا جیسے گاڑی کو دیکھتے ہی دیکھتے وہ کسی دوسرے قصبے میں جا پہنچا ہو۔ شاید اسی وجہ سے [illegible] ہر سہ پہر اسٹیشن پر موجود ہونے کی عادت ڈال لی تھی جو اب بھی قائم تھی حالانکہ بعدازاں انھوں نے کیلے کے باغوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو گولی مار دی تھی اور باغ بھی ختم ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ایک سو چالیس ڈبوں والی گاڑی بھی [illegible] گردآلود گاڑی رہ گئی تھی جو کسی کو لاتی تھی نہ لے جاتی تھی۔

لیکن اس سنیچر کو بہرحال ایک شخص اس گاڑی سے اترا تھا۔ جب مقدس قربان گاہ کا پادری اینتونی ایزابیل اسٹیشن سے باہر نکل رہا تھا تو ایک خاموش سے لڑکے نے، جس کے چہرے پر بھوک کے آثار کے سوا کوئی خاص بات نہ تھی، گاڑی کے آخری ڈبے کی کھڑکی میں سے اسے دیکھا تھا [illegible] نہیں کھایا۔ اس نے سوچا اس قصبے میں اگر پادری ہے تو یقیناً ہوٹل بھی ہو گا۔ اور وہ گاڑی سے اتر آیا اور سڑک پار کر گیا، جس پر اگست کے دہکتے سورج کی گرمی سے چھالے پڑے ہوئے تھے۔ اسٹیشن کے عین سامنے ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ [illegible] عمارت کے اندر سائے میں کچھ ٹھنڈک تھی اور وہاں سے ایک گھسے ہوئے گراموفون ریکارڈ کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی حس شامہ نے جو دو روز کی بھوک سے اور بھی تیز ہو چکی تھی اسے بتایا کہ یہ ہوٹل ہے۔ اور وہ "ہوٹل ماکوندو" کے سائن بورڈ کو دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ وہ سائن بورڈ جسے پڑھنے کا اسے زندگی میں کوئی اور موقع نہیں ملنے والا تھا۔

ہوٹل کی مالکہ کو پانچ ماہ سے زیادہ کا حمل تھا۔ اس کا رنگ سرسوں جیسا پیلا تھا بالکل ویسا ہی جیسا اس کی ماں کا تھا جب وہ اس کے پیٹ میں تھی۔ لڑکے نے کھانے کا آرڈر دیا اور کہا، "جتنی جلدی ہو سکے!" لیکن اس عورت نے جلدی دکھائے بغیر سُوپ کا پیالا اس کے آگے رکھا۔ سُوپ میں بغیر گوشت کی ایک ہڈی تھی اور کچھ کیلے کے کٹے ہوئے چند ٹکڑے تھے۔ اسی وقت گاڑی نے سیٹی دی۔ سوپ کی گرم اور صحت مند بھاپ میں مہمک لڑکے نے ہوٹل سے اسٹیشن تک کے فاصلے کا ذہنی طور پر اندازہ لگایا اور یکدم افراتفری سے پیدا ہونے والے اس ہول کا شکار ہو گیا جس سے وہ لوگ دوچار ہوتے ہیں جن کی گاڑی چھوٹ گئی ہو۔

اس نے دوڑنے کی کوشش کی۔ وہ کرب کی حالت میں دروازے تک پہنچا، لیکن ابھی اس نے دہلیز کے باہر ایک قدم بھی نہ رکھا تھا کہ اسے احساس ہو گیا کہ وہ گاڑی نہ پکڑ سکے گا۔

جب وہ میز پر واپس آیا تو وہ اپنی بھوک فراموش کر چکا تھا۔ اس نے گراموفون کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا جو اسے ترحّم آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسا دم ہلاتے ہوئے کسی کتّے کے چہرے پر ہوتا ہے۔ تب سارے دن میں پہلی بار اس نے اپنی سر سے ہیٹ اتار دیا جو اس کی ماں نے اسے دو ماہ قبل تحفے کے طور پر دیا تھا اور کھانے کے دوران وہ ہیٹ کو گھٹنوں میں دبائے بیٹھا رہا۔ جب وہ میز سے اٹھا تو گاڑی چھوٹ جانے کے باعث پریشان نظر نہ آتا تھا اور نہ اس امکان سے رنجیدہ تھا کہ اسے اگلے دو روز اس قصبے میں گزارنے ہوں گے جس کا نام تک جاننے کی اس نے کوشش نہ کی تھی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں ہی پیٹھ کو ایک کرسی کی سیدھی اور سخت پشت سے ٹکا کر بیٹھ گیا، دیر تک گراموفون پر بجتے ہوئے ریکارڈوں کو سنے بغیر وہاں بیٹھا رہا حتیٰ کہ ریکارڈوں کا انتخاب کرتی ہوئی لڑکی نے اسے مخاطب کر کے کہا

"باہر برآمدے میں گرمی کم ہے۔"

اس نے خود کو بےآرام محسوس کیا۔ اجنبیوں کے ساتھ گفتگو شروع کرنا اس کے لیے ہمیشہ سے مشکل رہا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے وہ خوف زدہ رہتا تھا، اور جب بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے الفاظ اس طرح ادا نہیں ہو سکے جیسے وہ چاہتا تھا۔ "ہاں۔" اس نے جواب دیا اور اسے خفیف سی کپکپی آئی۔ اس نے کرسی کو جھلانے کی کوشش کی مگر یہ بھول گیا کہ وہ جھولنے والی کرسی میں نہیں بیٹھا۔

"جو لوگ بھی یہاں آتے ہیں وہ کرسی برآمدے میں لے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہاں ٹھنڈک ہوتی ہے،" لڑکی نے کہا۔ اس کی بات سنتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی شدت سے گفتگو کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس نے لڑکی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال ہی لی۔ اس وقت جب وہ گراموفون کو چابی دے رہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ مہینوں، بلکہ شاید برسوں سے وہیں بیٹھی ہے اور وہاں سے ہلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ گراموفون کو چابی تو دے رہی تھی مگر اس کی پوری جان لڑکے پر ہی مرکوز تھی۔ پھر وہ مسکرانے لگی۔

"شکریہ۔" لڑکے نے جواب دیا اور لہجے میں اور اپنی دوسری حرکات میں کچھ روانی اور بےساختگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی اپنی نظریں اس پر گاڑے رہی اور بولی "اور وہ لوگ اپنے ہیٹ کھونٹے پر ٹانگ دیا کرتے ہیں۔"

اس بار اسے یہ کان جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ لڑکی کے تجویز دینے کے انداز کے بارے میں سوچ کر اسے کپکپی سی آئی۔ اس نے تکلیف دہ حد تک اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کیا اور ایک بار پھر گاڑی چھوٹ جانے کے ہول کا شکار ہو گیا۔ لیکن اسی وقت مالک کمرے میں داخل ہوئی۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ کرسی گھسیٹ کر برآمدے میں لے جا رہا ہے، جیسے سب کرتے ہیں" لڑکی نے کہا۔

لڑکے کو لہجے سے ایسا لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"کرسی گھسیٹنے کی ضرورت نہیں،" مالکہ نے کہا۔ "میں تمھیں اسٹول لائے دیتی ہوں۔"

لڑکی ہنسی اور وہ مزید بدحواس ہو گیا۔ گرمی کافی تھی، خشک اور مسلسل پڑنے والی گرمی اور اس کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ مالکہ ایک چمڑے کی نشست والا لکڑی کا اسٹول کھینچ کر برآمدے میں لے گئی۔ وہ کمرے سے باہر جانے ہی والا تھا کہ لڑکی نے دوبارہ بات کی۔

"مشکل یہ ہے کہ باہر اسے پرندے خوفزدہ کریں گے،" وہ بولی۔

لڑکے نے مالکہ کی اس سخت نگاہ کو دیکھ لیا جو اس نے لڑکی پر ڈالی تھی۔ وہ نگاہ مختصر مگر درشت تھی۔ "تمھارے لیے منھ بند رکھنا زیادہ مناسب ہو گا۔" اس نے لڑکی سے کہا اور پھر لڑکے کی طرف مڑ کر مسکرائی۔ لڑکے کا اکیلے پن کا احساس کم ہو گیا اور اسے بات کرنے کی خواہش ہوئی۔

"اس نے کیا کہا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"یہ اس کا اپنا وہم ہے،" مالکہ نے کہا اور جھک کر کمرے کے درمیان رکھی چھوٹی سی میز پر پڑے کاغذی پھولوں کے گلدان کو ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔ اعصابی اضطراب سے اس کی انگلیاں اینٹھ رہی تھیں۔

"میرا وہم نہیں،" لڑکی نے کہا۔ "پرسوں تم نے خود جھاڑو سے برآمدے میں سے دو مردہ پرندوں کو پھینکا تھا۔"

مالکہ نے رنج اور لاچار ہو کر لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی کے چہرے پر قابلِ رحم تاثر تھا، اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر بات کو اتنی تفصیل سے بیان کرے کہ شک کی گنجائش نہ رہ جائے۔

"بھائی، ہوا یہ تھا کہ کچھ لڑکوں نے اسے ستانے کی خاطر پرسوں دو مرے ہوئے پرندے یہاں ہال میں ڈال دیے اور اس سے کہا کہ آسمان سے مردہ پرندے گر رہے ہیں۔ اسے تو جو کوئی کچھ بتائے اس پر ایمان لے آتی ہے۔"

لڑکا مسکرایا۔ واقعے کی یہ جزئیات اسے مضحکہ خیز لگیں۔ وہ ہاتھ ملتا ہوا لڑکی کو دیکھنے کے لیے مڑا جو کرب کی حالت میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ گراموفون چلنا بند ہو گیا تھا۔ مالکہ دوسرے کمرے میں چلی گئی، اور جب وہ ہال سے گزر کر باہر آنے لگا تو لڑکی نے دھیمی آواز میں اصرار کیا:

"میں نے خود انھیں گرتے دیکھا تھا۔ یقین کرو، ہر ایک نے دیکھا ہے۔"

لڑکے کو محسوس ہوا جیسے اسے لڑکی کے گراموفون کے ساتھ چمٹے ہونے اور مالکہ کی بےچارگی کی وجہ سمجھ میں آ گئی ہو۔ "ہاں،" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا، اور ہال کی جانب مڑتے ہوئے اضافہ کیا، "میں نے بھی دیکھا ہے۔"

باہر بادام کے درختوں تلے گرمی کم تھی۔ اسٹول کو ٹیڑھا کر کے اس نے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگا لی اور سر پیچھے ڈال کر اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کام کاج سے تھک کر وہ جھولنے والی کرسی میں بیٹھی جھاڑو کے لمبے ڈنڈے سے مرغیوں کو پرے ہٹانے میں مشغول ہو گی اور اسے پہلی بار یہ احساس ہوا ہو گا کہ اس کا بیٹا گھر میں نہیں ہے۔

ایک ہفتہ پہلے تک اس لڑکے کو یہی گمان تھا کہ اس کی زندگی ایک سیدھے تار کی طرح ہے جو پچھلی خانہ جنگی کے زمانے کی اس بارش کے دن سے لے کر، جب اس نے صبح سویرے قصباتی اسکول کی مٹی اور پھوس سے بنی چاردیواری میں آنکھ کھولی تھی، اس کے بائیسویں

جنم دیا، جون کی اس صبح تک سیدھا کھنچا ہوا تھا، جب اس کی ماں نے اس کے جھولے تک آ کر اسے بیٹ کی قمیص اور ایک کارڈ دیا تھا، جس پر لکھا تھا "میرے پیارے بیٹے کے لیے اس کے اپنے دن پر۔" کبھی کبھی وہ اپنی بےحرکت زندگی کا زنگ اتار کر اپنے اسکول کے دنوں کو یاد کیا کرتا؛ کلاس کے تختۂ سیاہ کی اور اس ملک کے نقشے کی یاد جو مکھیوں کی گند سے گنجلک تھا، اور دیوار پر ٹنگی پیالیوں کی قطار کی یاد، جس میں ہر پیالی کے نیچے ایک بچے کا نام لکھا ہوا تھا۔ اسے ستایا گرمی۔ جس قصبے میں وہ رہتا تھا وہاں گرمی نہیں پڑتی تھی۔ وہ سرسبز پرسکون سا قصبہ تھا جہاں خاکستری رنگ کی لمبی ٹانگوں والی مرغیاں سکول کے اندر آ جایا کرتی تھیں اور ہاتھ منہ دھونے والے چبوترے کے نیچے بیٹھ کر انڈے دیا کرتی تھیں۔ اس کی ماں ان دنوں اداس اور کم گو عورت ہوا کرتی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت وہ بیٹھ کر کافی کے باغوں سے سفر کر آنے والی ہوا میں سانس لیا کرتی اور کہتی تھی کہ "مانورے دنیا کا خوبصورت ترین قصبہ ہے۔" اور پھر اس کی طرف مڑ کر، جو ان دنوں اپنے جھولے میں لیٹا دن بدن بڑا ہو رہا تھا، اس سے کہتی "بڑے ہو کر یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔" لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں جب وہ اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا اور سیدھا رو زندگی کی ودیعت کی ہوئی کسی خاص اور بےدھڑک صحت سے پھٹ پڑ رہا تھا، اس وقت بھی وہ سمجھ سے عاری تھا۔ اس کی بیسویں سالگرہ تک اس کی زندگی میں سوائے اپنے جھولے والے بستر میں سونے کے انداز میں تبدیلی کے، کوئی اہم تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ لیکن انہی دنوں اس کی ماں کو جوڑوں کے درد کے باعث اٹھارہ سال کی نوکری کے بعد مدرّسی چھوڑنی پڑی تھی۔ نتیجے کے طور پر اسے اور اس کی ماں کو دو کمروں اور کشادہ صحن والے گھر میں جا کر رہنا پڑا تھا۔ وہاں وہ خاکستری رنگ کی لمبی ٹانگوں والی وہی مرغیاں پالنے لگے تھے جیسی کسی زمانے میں سکول کے اندر گھس آیا کرتی تھیں۔

مرغیوں کی نگہداشت اس کا حقیقت کے ساتھ پہلا ربط تھا اور جولائی کے مہینے تک وہی اکلوتا ربط تھا۔ جولائی میں اس کی ماں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے متعلق سوچا تھا اور اپنے بیٹے کو اس بات کا اہل جانا تھا کہ اس بارے میں عرضی دعوا کرے۔ لڑکے نے نہایت موثر طریقے سے ضروری کاغذات کی تیاری میں ہاتھ بٹایا تھا، حتیٰ کہ مناسب موقع شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حلقے کے پادری کو ماں کی بپتسمہ کی تاریخ چھ ماہ پیچھے کرنے پر بھی رضامند کر لیا تھا کیونکہ اس تبدیلی کے بغیر اس کی ماں کی عمر ابھی ریٹائرمنٹ کی نہ بنتی تھی۔ جمعرات کو اسے آخری ہدایات ملی تھیں جن میں اس کی ماں کی مدرّسی کے تجربے کی تفصیلات اسے انتہائی احتیاط سے بتائی گئی تھیں۔ تب اس نے بارہ پیسو جیب میں ڈال کر کپڑوں کا ایک جوڑا اور کاغذات کا پلندہ ساتھ لے کر شہر کی طرف سفر شروع کیا تھا۔ لفظ ریٹائرمنٹ سے اس نے بنیادی اور خاص طور پر یہ مراد لی تھی کہ حکومت اسے کچھ رقم دے گی تاکہ وہ سؤر پالنے کا کاروبار شروع کر سکے۔

ہوٹل کے برآمدے میں اونگھتے ہوئے، شدید گرمی سے بےسُدھ، اسے ابھی اپنی صورت حال کی گمبھیرتا کا مکمل ادراک نہ ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگلے روز تک اس کی ساری پریشانی صرف اس حد تک ہے کہ اتوار کے روز سفر دوبارہ جاری کرنے کا انتظار کرے اور

ہمیشہ کے لیے اس قصبے کو فراموش کر دے جہاں اتنی شدید گرمی پڑتی تھی۔ چار بجے سے کچھ پہلے اسے اینٹھن والی مگر بیزار سی کی نیند آ گئی اور وہ یہ سوچتے ہوئے سو گیا کہ اسے جھولے والا بستر ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے کپڑوں کی گٹھری اور ماں کی ریٹائرمنٹ کے کاغذات گاڑی ہی میں بھول گیا ہے۔ وہ خوف کے مارے چونک کر اٹھ بیٹھا اور اپنی ماں کے بارے میں سوچتا ہوا ایک بار پھر ہول کا شکار ہو گیا۔

جس وقت وہ اسٹول کو گھسیٹ کر دوبارہ کھانے کے کمرے میں لایا، قصبے کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ اس نے کبھی بجلی کی روشنیاں نہ دیکھی تھیں اس لیے وہ ہوٹل میں غلط سلط جگہوں پر لگے بلب دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس کی ماں نے بجلی کے بارے میں اسے ایک بار بتایا تھا۔ گھڑسکھیوں سے بچتے ہوئے جو کوئیوں کی طرح شیشوں سے ٹکرا رہی تھیں، وہ اسٹول کو گھسیٹ کر کھانے کے کمرے کے اندر لے آیا۔ اس نے کھانا کھایا، مگر اس کی بھوک مر چکی تھی۔ کچھ تو اپنی صورت حال سے، کچھ شدید گرمی کی وجہ سے اور کچھ اپنے اکیلے پن کی تلخی سے۔ جس سے وہ پہلی بار روشناس ہو رہا تھا۔ وہ تذبذب میں تھا۔ نو بجے کے بعد اسے عمارت کے عقبی حصے میں لکڑی کے بنے ایک کمرے میں لے جایا گیا جس کی دیواروں پر اخباروں اور رسالوں کے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ آدھی رات کے وقت تک وہ ایک ہیجانی اور بخار کی سی نیند میں ڈوب چکا تھا، جبکہ وہاں سے پانچ بلاک پرے مقدس قربان گاہ کا پادری اینتونی اِزابیل بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس شام کو ہونے والے واقعات سے اس خطبے کو جو اس نے دوسرے دن صبح سات بجے کے لیے تیار کیا تھا، خاصی تقویت ملی ہے۔ بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے وہ پورا قصبہ پار کر کے ایک عورت کے لیے آخری دنیاوی رسوم ادا کر کے آیا تھا اور ابھی تک سرنگیت اور مضطرب تھا۔ جس کے نتیجے میں رسوم ادا کرنے کی مقدس اشیا اس نے اپنے بستر کے قریب ہی چھوڑ دیں اور بیٹ کر صبح کے خطبے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔ وہ کئی گھنٹے بستر میں یونہی اوندھا لیٹا رہا حتیٰ کہ اسے صبح کے وقت لمبی ٹانگوں والے پلوور پرندوں کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ تب اس نے بیدار ہونے کی کوشش کی اور تکلیف میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بستر سے نیچے اترتے ہوئے اس کا پاؤں مقدس گھنٹی پر پڑا اور وہ سیدھا سر کے بل اپنے کمرے کے ٹھنڈے اور سخت فرش پر جا گرا۔

ہوش آتے ہی اسے اپنے جسم کے بائیں حصے میں رعشے کا سا احساس ہوا جو اسے اوپر کی جانب اٹھتا ہوا لگا۔ اس لمحے میں وہ اپنے وجود کے بوجھ سے، جس میں اس کے جسم گناہوں اور عمر کا بوجھ سب شامل تھے، مکمل طور پر آگاہ تھا۔ اپنے رخساروں کے نزدیک اسے پتھریلے فرش کے جمود کا احساس ہوا۔ جب وہ اپنے خطبے تیار کیا کرتا تھا تو اسی فرش کے ٹھوس پن سے اس راستے کا واضح تصور کیا کرتا جو جہنم کی طرف جاتا تھا۔ "خداوندا!" وہ خوف سے بڑبڑایا اور سوچنے لگا، اب میں کبھی نہیں اٹھ سکوں گا۔

اسے احساس نہیں تھا کہ وہ گر کر کتنی دیر زمین پر لیٹا رہا، نہ اس دوران میں اس نے کچھ سوچا، حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اسے نیک موت کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ بس یوں تھا جیسے وہ ایک لمحے کے لیے حقیقتاً مر گیا ہو۔ لیکن جب اسے مکمل ہوش آیا تو اسے کسی خوف یا درد کا کوئی احساس نہ رہا تھا۔ دروازے کے نیچے سے اسے صبح کا اجالا دکھائی

دیا۔ اس نے دور سے مرغوں کی افسردہ اور بھرائی ہوئی آواز سنی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے اور خطبے کے الفاظ اسے مکمل طور پر یاد ہیں۔

جب اس نے دروازے کے کواڑوں کے آگے اٹکی ہوئی لکڑی ہٹائی تو اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ اسے اب کہیں درد کی شکایت نہ تھی، بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گرنے کی چوٹ نے اسے بڑھاپے کے بوجھ سے آزاد کر دیا ہو۔ قصبے کی تمام اچھائی، بدکرداری اور اذیت اس کے جسم میں داخل ہوئی جب اس نے مرغوں سے بھری بھیگی سی وائی ہوا میں پہلا سانس لیا۔ تب اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا جیسے خود کو تنہائی سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو، اور صبح کے پُرسکون سائے میں برآمدے میں ایک، دو، تین مردہ پرندوں کو پڑے دیکھا۔

نو منٹ تک وہ ان تین پرندوں کے خیال میں مستغرق رہا اور اپنے تیارکردہ خطبے کی روشنی میں سوچتا رہا کہ ان تین پرندوں کی اکٹھی موت کفارے کی آرزومند ہے۔ پھر وہ چلتا ہوا برآمدے کے دوسرے کونے تک گیا اور تینوں مردہ پرندوں کو اٹھا کر واپس پانی کے مٹکے تک لے آیا۔ پھر اس نے اپنی حرکت کا مقصد جانے بغیر تینوں پرندوں کو یکے بعد دیگرے مٹکے کے اندر سبز اور ساکت پانی میں ڈال دیا۔ تین اور تین مل کر نصف درجن پرندے ہو گئے، وہ سوچنے لگا اور وہ بھی ایک لمحے کے اندر، اور ذہنی درخشندگی کے معجزاتی شعلے نے اسے احساس دلایا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم دن گزارنے والا ہے۔

سات بجے گرمی شروع ہو گئی۔ ہوٹل میں اکیلا کرایہ دار ناشتے کا منتظر تھا۔ گراموفون والی لڑکی ابھی بیدار نہ ہوئی تھی۔ مالک اس کے قریب آئی، اور اس وقت یوں لگا جیسے گھنٹے کے سات بجانے کی آواز اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے اندر ہی سے آئی ہو۔

"تو تمھاری گاڑی چھوٹ گئی،" اس نے تاخیر سے کیے گئے افسوس کے لہجے میں کہا۔ اس نے ناشتہ لڑکے کے سامنے رکھا۔ ناشتے میں دودھ والی کافی، تلا ہوا انڈا اور کچھ کیلے کے قتلے تھے۔

لڑکے نے کھانے کی کوشش کی مگر اسے بالکل بھوک نہ تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ گرمی ابھی سے پڑنی شروع ہو گئی ہے۔ بالٹیوں کے حساب سے اس کا پسینا بہہ رہا تھا اور دم گھٹ رہا تھا۔ وہ کپڑے پہنے پہنے رات ٹھیک سے سویا بھی نہ تھا اور اب اسے کچھ بخار سا تھا۔ اسے پھر ہول سا اٹھا اور بس سٹاپ کی یاد آئی، عین اس وقت جب مالک نے آ کر میز پر سے برتن اٹھانے شروع کیے۔ اس نے بڑے بڑے سبز پھولوں والا نیا لباس پہن رکھا تھا اور بہت تابندہ لگ رہی تھی۔ اس کے لباس سے لڑکے کو یاد آیا کہ آج اتوار ہے۔

"کیا یہاں عبادت ہوتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہوتی تو ہے،" مالک نے جواب دیا۔ "مگر نہ ہونے کے برابر۔ کوئی عبادت کے لیے جاتا ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں نیا پادری ہی نہیں بھیجا۔"

"اس والے میں کیا خرابی ہے؟"

"ایک تو وہ سو سال کا ہے اور دوسرے آدھا پاگل ہے" عورت نے کہا۔ وہ ساکت، کچھ سوچتے ہوئے، ایک ہی ہاتھ میں تمام برتن تھامے کھڑی تھی۔ پھر وہ بولی "کچھ روز پہلے کی بات ہے اس نے منبر پر قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے ابلیس کو دیکھا ہے۔ اس دن سے لوگوں

نے عبادت کے لیے جانا چھوڑ دیا ہے۔"

چنانچہ کچھ تو اپنی امیدشکن صورت حال کی وجہ سے اور کچھ سو سالہ آدمی کو دیکھنے کے تجسس میں وہ لڑکا گرجے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ ایک مردہ قصبہ ہے جس کی گلیاں ختم نہ ہونے والی اور گردآلود ہیں اور جس کے لکڑی کے بنے، جست کی چھتوں والے اندھیرے گھر غیر آباد لگتے ہیں۔ اتوار کے دن قصبے کی یہ حالت تھی: گھاس سے خالی گلیاں، بغیر جالیوں کے گھر، نیچے تمتماتی گرمی اور اوپر شان دار آسمان۔ اس نے سوچا کہ یہاں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے اتوار اور کسی دوسرے دن کا فرق معلوم ہو سکے۔ ویران گلیوں میں چلتے ہوئے اسے اپنی ماں کی بات یاد آئی: "سارے قصبوں میں ساری گلیاں لازماً یا تو گرجے کو جاتی ہیں یا قبرستان کو۔" وہ پتھر کی اینٹوں کے بنے ایک چھوٹے سے چوک میں داخل ہوا جس میں ایک سفیدی کی ہوئی عمارت تھی، جس کا ایک مینار تھا اور اوپر ایک مرغ بادنما بنا ہوا تھا اور ایک گھڑیال تھا جس کی سوئیاں چار بج کر دس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔

چوک کو عبور کرنے میں جلدی کیے بغیر وہ گرجے کی ڈیوڑھی کی تین سیڑھیاں چڑھا اور اسے پرانے پسینے اور لوبان کی ملی جلی بُو آئی۔ وہ تقریباً خالی گرجے کے اندر کے نیم گرم سائے میں داخل ہو گیا۔

مقدس قربان گاہ کے پادری اینتونی ایزابیل ابھی منبر پر کھڑا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنا وعظ شروع کرنے والا تھا جب اس نے ایک لڑکے کو بیٹ پہنے گرجے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکے نے اپنی بڑی بڑی شفاف اور پُرسکون آنکھوں سے خالی گرجے کا بغور جائزہ لیا۔ پھر اس نے اسے آخری بنچ پر بیٹھتے دیکھا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ لڑکا قصبے میں نیا نیا آیا ہے۔ وہ پچھلے تیس برس سے اس قصبے میں رہ رہا تھا اور وہاں کے ہر باسی کو اس کی بُو سے پہچان سکتا تھا۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ یہ لڑکا جو ابھی گرجے میں داخل ہوا ہے، قصبے میں اجنبی ہے۔ ایک ہی مختصر اور گہری نظر میں اس نے جان لیا کہ وہ خاموش طبع اور اداس سا ہے اور اس کے کپڑے گندے اور شکن آلود ہیں جیسے وہ انھیں پہنے پہنے دیر تک سوتا رہا ہو۔ یہ بات سوچتے ہوئے اسے لڑکے سے گھن بھی آئی اور اس پر ترس بھی آیا۔ ساتھ ہی اسے بنچ پر بیٹھے دیکھ کر اس کا دل تشکر سے بھی بھر گیا اور وہ اپنا وہ خطبہ دینے کے لیے تیار ہوا جو اس کی زندگی کا سب سے اہم خطبہ تھا۔ خداوندا، اس نے اس دوران میں سوچا، لڑکے کو اپنا ہیٹ اتارنا یاد رہ جائے اور یہ نہ ہو کہ مجھے اسے گرجے سے بےدخل کرنا پڑے۔ اور اس نے اپنا خطبہ شروع کر دیا۔

شروع میں یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے وہ بولتا چلا گیا۔ وہ اپنی بات خود نہیں سن رہا تھا۔ ایک ہموار، بہتا ہوا، صاف معنی جو دنیا کے آغاز سے اس کی روح کی گہرائی میں رواں تھا، اس نے مشکل ہی سے سنا۔ اسے مبہم سا احساس ضرور تھا کہ وہ لفظ جو اس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے، صحیح، موزوں، مناسب اور برمحل تھے اور موقع ترتیب میں تھے۔ اسے یوں لگا جیسے نیم گرم بخارات اسے اندر سے دبا رہے ہوں، لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی روح نمودونمائش کے جذبے سے پاک ہے اور یہ کہ خوشی کا احساس جو اسے مفلوج

گیے دے رہا ہے، اس کا تکبر، سرکشی یا خودنمائی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ اس کی روح کی خداوند خدا سے محض شناسائی کا اظہار تھا۔

بند سونے کے کمرے میں ربیکا یہ جانتے ہوئے کہ چند ہی لمحوں میں گرمی ناقابل برداشت ہو جائے گی، بےہوش ہونے کے قریب تھی۔ اگر اسے نئی جگہوں سے گہرے خوف کی بنا پر اس قصبے میں گڑے ہوئے ہونے کا احساس نہ ہوتا تو اپنے پردادا کی طرح، جس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ اس نے ایک صندوق میں اپنا مال اسباب بند کر کے اور صندوق میں فینائل کی گولیاں ڈال کر وہاں سے سدھار گئی ہوتی۔ لیکن اسے علم تھا کہ اسے موت نہیں آنی ہے، لمبی غلام گردشوں اور نو خواب گاہوں والے اسی گھر میں جس کی جالیوں کی جگہ گرمی کا موسم ختم ہونے پر اس کا خیال تھا کہ نیم شفاف شیشے لگوا لے گی۔ لہذا اس کا وہیں رہنے کا ارادہ تھا (اور یہ ارادہ وہ جب بھی الماری میں اپنے کپڑے قرینے سے رکھتی ہمیشہ کیا کرتی تھی) اور اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اپنے "عالی مرتبت عم زاد" کو بھی لکھے گی کہ اس قصبے کے لیے کوئی جوان پادری بھیجا جائے تاکہ وہ ایک بار پھر اپنے مخمل کے پھولوں والا ہیٹ پہن کر گرجے میں جا سکے اور باربط عبادت کر سکے اور معقول اور اصلاحی وعظ سن سکے۔ کل سوموار ہے اس نے سوچا اور بشپ کو نوشتہ لکھنے کے لیے مناسب القاب کی تلاش شروع کر دی (وہ القاب جنھیں کرنل بوئندیا نے بیہودہ اور گستاخانہ کہا تھا)۔ عین اس وقت ارخینیدا نے جالی کا دروازہ کھولا اور چیخ کر کہا:

"سینورا، لوگ کہہ رہے ہیں کہ فادر منبر پر کھڑے کھڑے پاگل ہو گیا ہے۔"

بیوہ نے اپنا بلخ اور غیرمعمولی طور پر پژمردہ چہرہ دروازے کی جانب پھیرا۔ "وہ تو پچھلے پانچ برس سے پاگل ہے،" اس نے کہا۔ وہ کپڑے ترتیب سے رکھنے میں مصروف رہی، اور پھر بولی "اس نے ایک بار پھر ابلیس کو دیکھ لیا ہو گا؟"

"اس بار ابلیس نہیں ہے، سینورا،" ارخینیدا نے کہا۔

"تو کون ہے؟" ربیکا نے سنجیدگی اور لاتعلقی سے پوچھا۔

"اس بار وہ کہتا ہے کہ اس نے گردش زدہ یہودی کو دیکھا ہے۔"

بیوہ کو اپنی جلد پر کیڑے مکوڑے رینگتے ہوئے۔ الجھے ہوئے خیالات کا ایک انبوہ، جس میں پھٹی ہوئی جالیوں، گرمی، مردہ پرندوں اور طاعون کے درمیان تخصیص مشکل تھی "گردش زدہ یہودی" کے الفاظ سن کر اس کے ذہن سے گزرا، جو اسے اپنے دور دراز بچپن کی کسی دوپہر میں سننے کے بعد سے یاد بھی نہ رہے تھے۔ تب اس نے برہم ہو کر اور سردمہری سے اس جانب قدم بڑھائے جدھر ارخینیدا اپنا منہ پھاڑے کھڑی تھی۔

"ہاں، یہ سچ ہے،" اس نے کہا اور اس کی آواز وجود کی گہرائی میں سے برآمد ہوئی۔ "مجھے اب پتا چلا کہ پرندے کیوں مر رہے ہیں۔"

دہشت کے مارے اس نے اپنے آپ کو کڑھائی والی چادر میں لپیٹا اور وہ چشم زدن میں طویل برآمدہ اور چیزوں سے بھرا نشست کا کمرہ پار کر کے، گلی کا دروازہ کھول کر اور دو بلاک کا راستہ طے کر کے گرجے میں داخل ہو گئی، جہاں مقدس قربان گاہ کے پادری انتونیو ایزابیل اپنی نئی بیٹھت میں بیان دے رہا تھا "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج صبح جب میں حوباس بڑھئی کی بیوی کی آخری رسوم ادا کر کے واپس آ رہا تھا تو اس نے میرا راستا کاٹا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کا چہرہ یسوع مسیح کی بددعا سے تیرہ ہو چکا تھا اور وہ جس جس راستے سے گزر رہا تھا وہاں اپنے پیچھے جلتے ہوئے انگارے چھوڑتا جا رہا تھا۔"

خطبے کے الفاظ ہوا میں تیرتے تیرتے رک گئے۔ پادری کو احساس ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں کے رعشے پر قابو پانے سے قاصر ہے، اس کا سارا جسم کپکپا رہا ہے اور پسینے کا ایک ٹھنڈا قطرہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر لکیر سی بناتا ہوا نیچے سفر کر رہا ہے۔ رعشے اور پیاس اور انتڑیوں میں شدید مروڑ کے باعث اور ایک آواز سن کر جو ارگن پر کھرج کے سر جیسی تھی، اسے لگا جیسے وہ سخت علیل ہو۔ لیکن اس وقت اصل حقیقت اس پر آشکار ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ گرجا لوگوں سے بھر چکا ہے، اور ربیکا، دکھاوے اور بناوٹ کی شوقین وہی حسرت ناک عورت بازو کھولے اور اپنا درشت اور سرد چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے ناف کیسا میں چلی آ رہی ہے۔ پریشانی کے عالم میں اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سامنے کیا ہو رہا ہے، اور اسے اتنی سمجھ بھی اب تھی کہ اس واقعے کو معجزہ سمجھنا خودپسندی کی بات ہو گی۔ انکسار کے ساتھ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ منبر کے چوبی کنارے پر رکھ دیے اور خطبہ دوبارہ جاری کیا۔

"تب وہ میری طرف بڑھا،" اس نے کہا۔ اس بار اسے اپنی جذبے سے بھرپور اور یقین دلانے والی آواز سنائی دی۔ "وہ میری طرف بڑھا اور اس کی آنکھیں زمرد کی طرح تھیں اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے پاس سے ایسی بو آ رہی تھی جیسی بھیڑبکریوں کے پاس سے آیا کرتی ہے۔ تب میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے یسوع مسیح کے نام پر ملامت کی اور کہا، 'رک جاؤ، اتوار کا دن قربانی کے لیے مناسب نہیں ہوتا۔'"

جب وہ خطبے سے فارغ ہوا گرمی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اگست کے مہینے کی شدید، جامد، سرسمہ کرنے والی ناقابل فراموش گرمی، لیکن پادری انتونیو ایزابیل کو اب گرمی کا احساس نہ تھا۔ اسے علم تھا کہ اس کی پشت پر پورا قصبہ اس کے خطبے کے اثر سے ایک بار پھر منکسر اور بےزبان ہو چکا ہے، مگر یہ بات اس کے لیے باعث انبساط نہ تھی۔ نہ ہی اسے اس امکان سے خوشی ہوئی تھی کہ شراب کا ایک گلاس اس کے گلے کی خارشگی کا علاج کر دے گا۔ وہ بےآرام اور مضطرب تھا۔ اس کا دماغ ادھر ادھر بھٹک رہا تھا اور وہ قربانی کے پرعظمت لمحے پر دھیان نہ دے پا رہا تھا۔ یہ تجربہ اس کے ساتھ عرصے سے ہو رہا تھا لیکن آج اس کے ذہن کی ابتری مختلف تھی کیونکہ آج اس کا ہر احساس واضح بےچینی کا شکار تھا۔ تب، زندگی میں پہلی مرتبہ، اسے تکبر کا تجربہ ہوا۔ اور عین اسی طرح جیسے اس نے تکبر کو جانا تھا اور اپنے وعظوں میں بیان کیا تھا، اسے احساس ہوا کہ تکبر بھی پیاس کی طرح جسم کی ایک ضرورت ہے۔ اس نے تبرکات رکھنے کے صندوق کا ڈھکنا زور سے بند کیا اور پکارا،

"پیتاغورث!"

مددگار ملازم، منڈے ہوئے چمکدار سر والا ایک لڑکا جو کہ پادری انتونیو ایزابیل کا

بھیانک تھا اور جس کا اس نے خود یہ نام رکھا تھا قربان گاہ کی جانب بڑھا۔

"لوگوں سے نذر کے پیسے اکٹھے کرو۔" پادری نے کہا۔

لڑکے نے آنکھیں جھپکائیں اور ایڑیوں پر پورا گھوم گیا اور پھر بے حد دھیمی آواز میں بولا۔

"مجھے پتا نہیں کہ نذر والی تھالی کدھر ہے۔"

یہ ٹھیک بھی تھا۔ مہینوں ہو گئے تھے اور کسی نے کبھی نذر اکٹھی نہ کی تھی۔

"تو مخزن میں سے ایک تھیلا لے آؤ اور جتنی رقم اکٹھی کر سکتے ہو، کرو۔" پادری نے کہا۔

"اور لوگوں سے کہنا کیا ہے؟" لڑکے نے پوچھا۔

اب پادری کی آنکھیں جھپکانے کی باری تھی۔ وہ غور سے لڑکے کی منڈی ہوئی مینی کھوپڑی اور اس کے سر کی ہڈیوں کے جوڑوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

"لوگوں سے کہو کہ یہ رقم گردش زدہ یہودی کو خارج کرنے کے لیے ہے۔" یہ کہتے وقت اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے دل میں بہت بڑے بوجھ کو سنبھال رہا ہو۔ چند لمحے تک اس نے خاموش معبد میں موم بتیوں کے جل کر بہنے کی اور اپنی پرشکستہ اور دشوار سانس کی آمد و رفت کی آواز سنی۔ پھر مددگار ملازم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر، جو اسے پھٹی پھٹی گول آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا پادری نے اس سے کہا

"اور پھر ساری رقم اکٹھی کر کے جا کر اس لڑکے کو دے دینا جو خطبے کے شروع میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اسے کہنا کہ یہ پادری کی طرف سے ہے، اور یہ کہ وہ اپنے لیے نیا ہیٹ خرید لے۔"

گابرئیل گارسیا مارکیز

ترجمہ : آصف فرخی

کاغذی گلاب

صبح سویرے کی اداسی میں اپنا راستا تلاش کرتے ہوئے، مینا نے بغیر آستینوں والا وہ لباس پہن لیا جو ایک رات پہلے اس نے مسہری کے پاس ٹانک رکھا تھا اور بڑے صندوق کے اندر اس کی الگ ہو جانے والی آستینیں ڈھونڈنے لگی۔ پھر اس نے انہیں دیوار پر لگی کیلوں پر تلاش کیا، دروازوں کے پیچھے ڈھونڈا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ شور نہ مچے تاکہ اس کی اندھی نانی نہ جاگ اٹھیں، جو اسی کمرے میں سو رہی تھیں۔ مگر جب وہ اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تو اس نے دیکھا کہ نانی تو پہلے ہی سے اٹھی ہوئی ہیں اور باورچی خانے میں چلی آئی کہ ان سے آستینوں کے بارے میں دریافت کرے۔

"غسل خانے میں ہیں،" نابینا عورت نے کہا۔ "میں نے کل انہیں دھو ڈالا تھا۔"

وہیں تھیں وہ، ایک تار پر لکڑی کی دو چٹکیوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک گیلی تھیں۔ مینا واپس باورچی خانے میں گئی اور آستینوں کو آتش دان کے پتھروں پر پھیلا دیا۔ اس کے سامنے نابینا عورت بیٹھی کافی پھینٹ رہی تھی۔ اس کی مردہ پتلیاں برآمدے کی پتھریلی حد پر جمی ہوئی تھیں، جہاں گملوں کی ایک قطار میں جڑی بوٹیاں اگ رہی تھیں۔

"آئندہ سے میری چیزیں مت لینا،" مینا نے کہا۔ "آج کل دھوپ کا کوئی بھروسا نہیں۔"

نابینا عورت نے اپنا چہرہ آواز کے رخ پر کر لیا۔

"میں بھول گئی تھی کہ آج پہلا جمعہ ہے۔"

لمبا سانس بھر کر، یہ دیکھنے کے بعد کہ کافی تیار ہے یا نہیں، اس نے برتن آگ پر سے اتار دیا۔

"کاغذ کا ٹکڑا بیچ میں رکھ لو، کیوں کہ یہ پتھر میلے ہیں۔" مینا نے اپنی انگشتِ شہادت آتش دان کے پتھروں پر پھیر کر دیکھی۔ وہ میلے تھے مگر ان پر جمی ہوئی راکھ کی تہہ سمٹ کر چکی تھی جو اسفنجوں کو اس وقت تک میلا نہ کرتی جب تک انہیں پتھروں پر رگڑا نہ جاتا۔

"اگر یہ میلی ہو گئیں تو تمھاری ذمہ داری ہے،" اس نے کہا۔

نابینا عورت نے پینے کے لیے ایک پیالی کافی انڈیل لی۔ "تم غصے میں ہو،" اس نے برآمدے کی طرف کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "غصے کی حالت میں عشائے ربانی حاصل کرنا بےحرمتی ہے۔" وہ صحن میں گلابوں کے سامنے کافی پینے بیٹھ گئی۔ جب گرجا کی رسمِ عبادت کے لیے تیسری گھنٹی بجی تو مینا نے آتش دان پر سے اسفنجیں اٹھائیں جو اب تک گیلی تھیں، مگر اس نے پہن لیں۔ فادر ایینجل اسے برہنہ شانوں کے ساتھ عشائے ربانی حاصل کرنے نہیں دیں گے۔ اس نے منہ نہیں دھویا۔ اس نے چہرے پر سرخی کے آثار تولیے سے صاف، دعاؤں کی کتاب اور شال اٹھائی، اور سڑک پر نکل آئی۔ کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ واپس آ گئی۔

"تم وہاں کتابِ مقدس کی تلاوت کے بعد ہی پہنچ پاؤ گی،" نابینا عورت نے صحن میں گلابوں کے سامنے بیٹھے بیٹھے کہا۔

مینا سیدھی بیت الخلا میں گھس گئی۔ "میں عبادت میں نہیں جا سکتی،" اس نے کہا۔ "میری آستینیں گیلی ہیں اور سارے لباس پر سلوٹیں ہیں۔" اسے احساس ہوا جیسے سب کچھ جاننے والی نگاہیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔

"پہلا جمعہ ہے اور تم عبادت کے لیے نہیں جا رہیں،" نابینا عورت پکار اٹھی۔ بیت الخلا سے واپس آ کر مینا نے اپنے لیے پیالی میں کافی انڈیلی اور تازہ سفیدی کیے ہوئے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، نابینا عورت کے پاس۔ مگر وہ کافی نہ پی سکی۔

"سارا قصور تمھارا ہے،" وہ دبے دبے کینہ تور لہجے میں بولی۔ اس احساس کے ساتھ کہ وہ اپنے آنسوؤں میں ڈوبی جا رہی ہے۔

"تم رو رہی ہو،" نابینا عورت نے پکار کر کہا۔

اس نے پانی ڈالنے کا فوارہ اوریگانو کے گملے کے پاس رکھ دیا اور یہ دہراتے ہوئے کہ "تم رو رہی ہو" برآمدے میں چلی گئی۔ مینا نے اپنی پیالی زمین پر ٹکا دی اور تن کر بیٹھ گئی۔

"میں غصے کے مارے رو رہی ہوں،" اس نے کہا۔ اور نانی کے پاس آتے ہوئے بولی، "تمھیں گرجے میں جا کر اعتراف کرنا پڑے گا کہ تمھاری وجہ سے مجھے پہلے جمعے کا عشائے ربانی چھوڑنا پڑا۔"

نابینا عورت ساکت بیٹھی رہی۔ اس انتظار میں کہ مینا خواب گاہ کا دروازہ بند کر دے۔ پھر وہ برآمدے کے سرے تک چلتی ہوئی گئی۔ وہ رک رک کر جھکی یہاں تک کہ اسے زمین پر رکھی ہوئی پیالی مل گئی۔ جسے چھوا بھی نہ گیا تھا۔ پیالی کی کافی گملے میں انڈیلتے ہوئے وہ کہتی رہی،

"خدا جانتا ہے میرا ضمیر صاف ہے۔"

مینا کی ماں خواب گاہ سے نکل آئی۔

"تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کسی سے بھی نہیں،" نابینا عورت نے کہا۔ "میں تمھیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔"

اپنے کمرے میں محفوظ ہو کر مینا نے اپنی چولی کے بند کھولے اور تین چھوٹی چابیاں نکالیں جو وہ سیفٹی پن میں لگائے رکھتی تھی۔ ان میں سے ایک چابی سے اس نے سنگھارمیز کی نچلی دراز کھولی اور لکڑی کی چھوٹی سی صندوقچی نکالی۔ صندوقچی کو دوسری چابی سے کھولا۔ اس کے اندر رنگ دار کاغذ پر لکھے گئے خطوط کا ایک پلندہ تھا جس پر ربڑبینڈ چڑھا ہوا تھا۔

اس نے انہیں اپنی چولی میں چھپا لیا، صندوقچی جگہ پر رکھی، اور دراز میں تالا لگا دیا۔ پھر وہ بیت الخلا گئی اور خطوط پھینک دیے۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم گرجے گئی ہو،" جب مینا باورچی خانے میں آئی تو اس کی ماں نے کہا۔

"یہ جا نہیں سکی،" نابینا عورت بیچ میں بول اٹھی۔ "میں بھول گئی کہ آج پہلا جمعہ ہے اور میں نے کل دوپہر اس کی آستینیں دھو ڈالیں۔"

"اب تک گیلی ہیں،" مینا بڑبڑائی۔

"آج کل مجھے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے،" نابینا عورت نے کہا۔

"مجھے ایسٹر کے لیے ڈیڑھ سو درجن گلاب تیار کر کے دینے ہیں،" مینا نے کہا۔

دھوپ جلدی تیز ہو گئی۔ سات بجنے سے پہلے مینا نے بڑے کمرے میں کاغذی گلابوں کی دکان سجا لی: ایک ٹوکری بھر کر پنکھڑیاں اور تار، ایک ڈبا کریپ کے کاغذ، دو قینچیاں، دھاگے کی ایک لچھی اور لئی کا برتن۔ ایک لمحے بعد ترینیداد بغل میں دفتی کا ڈبا دبائے آ گئی اور اس سے پوچھنے لگی کہ وہ عبادت کے وقت کیوں نہیں گئی۔

"میرے پاس آستینیں نہیں تھیں،" مینا نے کہا۔

"کوئی بھی تمھیں ادھار دے دیتا،" ترینیداد بولی۔

اس نے کرسی کھینچ لی اور پنکھڑیوں کی ٹوکری کے پاس بیٹھ گئی۔

"بہت دیر ہو چکی تھی،" مینا کہنے لگی۔

اس نے ایک گلاب مکمل کیا۔ پھر ٹوکری پاس کر لی کہ پنکھڑیوں میں قینچی سے چنٹ ڈال سکے۔ ترینیداد نے دفتی کا ڈبا زمین پر رکھ دیا اور کام میں شامل ہو گئی۔ مینا نے ڈبے کی طرف دیکھا۔

"تم نے جوتے خرید لیے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ مرے ہوئے چوہے ہیں،" ترینیداد نے کہا۔

چوں کہ ترینیداد پنکھڑیوں میں چنٹ ڈالنے کی ماہر تھی، مینا تار کو بل دے کر پھولوں کی ڈنڈیاں بنانے اور ان پر سبز کپڑا چڑھانے کا کام پورا کرتی۔ دونوں خاموشی سے کام کرتی رہیں، اس بات پر توجہ دیے بغیر کہ دھوپ، چھپے ہوئے ساٹلر اور خاندانی تصاویر سے سجے ہوئے کمرے کے اندر بڑھتی آ رہی ہے۔ ڈنڈیاں ختم کر کے مینا نے اپنا چہرہ، جو کسی غیرمادی شے سے مکمل ہوتا ہوا لگ رہا تھا، ترینیداد کی طرف کر لیا۔ ترینیداد ٹانگیں جوڑے بیٹھی

تھی اور پنکھڑی کا کنارہ انگلیوں کے درمیان ذرا ذرا سرکاتے ہوئے بہت صفائی کے ساتھ جست ڈال رہی تھی۔ مینا اس کے مردانہ جوتے کی طرف دیکھنے لگی۔ ترینیداد سر اٹھائے بغیر اپنے پیر ذرا سا پیچھے کیے ہوئے، اور کام روکے بغیر اس سے نظر چرا گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

مینا اس کی طرف جھکی۔

"وہ چلا گیا،" اس نے کہا۔

ترینیداد کی قینچی چھوٹ کر اس کی گود میں گر پڑی۔

"نہیں؟"

"وہ چلا گیا،" مینا نے دوہرایا۔

ترینیداد ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی بھنوؤں میں ملی ہوئی بھنووں کو ایک سیدھی لکیر تقسیم کر رہی تھی۔

"اور اب؟" اس نے پوچھا۔

مینا نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"اب کچھ نہیں۔"

ترینیداد نے دس بجنے سے پہلے الوداع کہہ دیا۔

اس قربت کے بوجھ سے آزاد ہو کر مینا نے ایک لمحے کے لیے کام روکنے کے بعد مردہ چوہے بیت الخلا میں پھینک دیے۔ نابینا عورت گلاب کی جھاڑی کی چھنٹائی کر رہی تھی۔

"میں شرط لگاتی ہوں کہ تم کو یہ نہیں معلوم کہ میرے پاس اس ڈبے میں کیا ہے" مینا نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ وہ چوہوں کو ہلانے لگی۔

نابینا عورت متوجہ ہو گئی۔ "پھر سے ہلاؤ" اس نے کہا۔ مینا نے وہی عمل دوہرایا مگر نابینا عورت کان کی لو انگشت شہادت سے دبا کر تیسری دفعہ سننے کے بعد بھی ڈبے میں موجود شے کو نہیں پہچان سکی۔

"چوہے ہیں جو گذشتہ رات گرجا کے چوہے دانوں میں پکڑے گئے،" مینا نے کہا۔

جب وہ واپس آئی تو نابینا عورت کے پاس سے کچھ کہے بغیر گزر گئی۔ مگر وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ جب وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو مینا بند کھڑکی کے پاس اکیلی بیٹھی کاغذی گلاب مکمل کر رہی تھی۔

"مینا،" نابینا عورت نے کہا، "اگر تم خوش رہنا چاہتی ہو تو اجنبیوں کے سامنے اعتراف مت کیا کرو۔"

مینا نے کچھ کہے بغیر اس کی طرف دیکھا۔ نابینا عورت اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور اس کے کام میں مدد دینے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر مینا نے اسے روک دیا۔

"تم گھبرا رہی ہو،" نابینا عورت نے کہا۔

"تم عبادت کے لیے کیوں نہیں گئیں؟" نابینا عورت نے پوچھا۔

"تم اس کی وجہ خوب اچھی طرح جانتی ہو

کہ صرف مینیوں کی وجہ ہوئی ہو تم گھر سے باہر نہیں نکلیں" نابینا عورت نے کہا

"راستے میں کوئی تمہارا منتظر تھا جس نے تمہیں مایوس کیا۔"

مینا نے اپنے ہاتھ نانی کی آنکھوں کے سامنے یوں ہلائے جیسے کسی نادیدہ شیشے کو صاف کر رہی ہو۔

"تم چڑیل ہو،" اس نے کہا۔

"تم آج صبح دو مرتبہ بیت الخلا گئیں،" نابینا عورت نے کہا۔ "تم ایک دفعہ سے زیادہ کبھی نہیں جاتیں۔"

مینا کاغذی گلاب بناتی رہی۔

"تم مجھے دکھانے کی ہمت کرو گی کہ تم نے سنگھار میز کی دراز میں کیا چھپا رکھا ہے؟" نابینا عورت نے پوچھا۔

بہت آہستگی سے مینا نے گلاب کھڑکی میں دھرا، چولی میں ہاتھ ڈال کر تینوں چھوٹی چابیاں نکالیں اور نابینا عورت کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اور اپنے ہاتھوں سے اس کی مٹھی بند کر دی۔

"جاؤ خود ہی آنکھوں سے جا کر دیکھ لو،" اس نے کہا۔

نابینا عورت اپنی انگلیوں سے ٹٹول کر چابیوں کا معائنہ کرتی رہی

"میری آنکھیں بیت الخلا کی نالی کے اندر نہیں دیکھ سکتیں۔"

مینا نے سر اٹھایا اور اسے ایک نیا احساس ہوا، اسے یوں لگا جیسے نابینا عورت کو معلوم ہے کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔

"اپنے آپ کو نالی میں گرا کر دیکھ لو، اگر تمہیں اتنی ہی دلچسپی ہے کہ میں کیا کرتی ہوں"

نابینا عورت نے اس مداخلت کو نظرانداز کر دیا۔

"تم بستر میں لیٹے لیٹے صبح تک جاگ کر لکھتی رہتی ہو،" اس نے کہا

"تم خود بتی بجھاتی ہو،" مینا نے کہا

"اور تم فوراً ٹارچ جلا لیتی ہو" نابینا عورت نے کہا۔ "میں تمہارے سانسوں کی آواز سے پہچان سکتی ہوں کہ اس وقت تم لکھ رہی ہو۔"

مینا نے کوشش کی کہ پرسکون رہے۔ "بہت اچھا" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا "فرض کرو ایسا ہی ہے تو پھر؟ کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"کچھ نہیں،" نابینا عورت نے جواب دیا۔ "صرف یہ کہ اس وجہ سے تم نے پہلے جمعے کی عشائے ربانی چھوڑ دی۔"

دونوں ہاتھوں سے مینا نے دھاگے کی لچھی، قینچیوں اور ادھ بنے گلابوں اور ڈنڈیوں کو سمیٹ لیا۔ اس نے یہ سب چیزیں ٹوکری میں ڈال دیں اور اپنا رخ نابینا عورت کی طرف کر لیا۔ "تم سننا چاہتی ہو کہ میں نے بیت الخلا میں کیا کیا؟" اس نے پوچھا۔ دونوں سانس روکے رہیں جب تک کہ مینا نے اپنے پوچھے ہوئے سوال کا جواب نہیں دے دیا۔

"میں پاخانہ کرنے گئی تھی۔"

نابینا عورت نے تینوں چھوٹی چابیاں ٹوکری میں پھینک دیں۔ "اچھا بہانہ ہے،" باورچی

حامے میں جاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ "مجھے تمھاری بات کا اعتبار آ جاتا اگر تم نے اپنی زندگی میں بس بار ایسا لفظ منھ سے نہ نکالا ہوتا۔" میا کی ماں برامدے میں مخالف سمت سے آ رہی تھی اس کے بازو کانٹےدار پھولوں کے گچھوں سے بھرے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"میں پاگل ہوں" نابینا عورت بولی، "مگر ظاہر بات ہے تمھیں تو مجھ کو پاگل خانے بھجوانے کا خیال اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک میں پتھر نہ مارنے لگوں۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ : فاروق حسن

بڑی ماما کا جنازہ

تو لیجیے حضرات یہ رہی کل عالم کے منکرین کے لیے ماکوندو کی سلطنت کی مطلق العنان فرمانروا، بڑی ماما کی سچی داستان، جو بانوے برس بقیدِحیات رہی اور گزشتہ ستمبر کے ایک منگل کے روز، تحریم کی خوشبو میں لپٹی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئی اور جس کے جنازے میں پاپائےاعظم نے بنفس نفیس شرکت فرمائی۔

ناظرین، اب جب کہ اس سانحے سے بدحواس قوم کا ذہنی توازن بحال ہو چکا ہے اب جب کہ سان جاسنتو کے بین بجانے والے، گواہیرا کے اسمگلر، سینُو کے چاولوں کے کاشتکار، گواکامایال کی طوائفیں، سیئرپے کے جادوگر اور ارکاتاکا کے کیلے کے باغوں کے مزدور، طویل اور نڈھال کر دینے والے ماتم سے فارغ ہو کر اپنے اپنے خیمے سمیت چکے ہیں اور ان کی استقامت لوٹ آئی ہے، اب جب کہ جمہوریہ کے صدر، ان کی کابینہ کے ارکان اور سرکاری اور غیرسرکاری طاقتوں کے تمام نمائندے، جو تاریخ کے ابواب میں رقم کیے جانے والے اس عالیشان جنازے میں شریک تھے اپنی اپنی جاگیروں پر اپنا تسلط دوبارہ قائم کر چکے ہیں اب جب کہ مقدس مآب پاپائےاعظم اپنی روح اور جسم سمیت عرشِ بریں کی سمت سفر کر گئے ہیں اور اب جب کہ ماکوندو خالی بوتلوں اور ڈبوں، بجھے ہوئے سگریٹوں، چبائی ہوئی ہڈیوں چیتھڑوں، اور غلاظت کے انباروں سے، جو جنازے میں شریک ہجوم پیچھے چھوڑ گیا ہے اٹ گیا ہے حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں چلنا پھرنا محال ہو چکا ہے، … موقع آن پہنچا ہے کہ آدمی صدر دروازے کے آگے اسٹول نکال کر بیٹھے اور شروع سے لے کر اس قومی افراتفری کی داستان کو پیشتر اس کے کہ یہ تاریخ نویسوں کے ہاتھ چڑھ جائے پوری تفصیل کے ساتھ بیان

کر دے۔

چودہ ہفتے قبل بڑی ماما نے جو کہ ان گنت راتوں سے پلٹسوں، سرسوں کے پلاسٹروں اور جونکوں کا ہدف بنی رہی تھی، اور جو نزع کے عالم میں ہذیان کا شکار ہو چکی تھی، حکم دیا تھا کہ اسے اس کی بید کی جھولنے والی کرسی میں بٹھا دیا جائے تاکہ وہ اپنا وصیتی فرمان جاری کر سکے۔ یہی واحد کام ایسا تھا جو وہ مرنے سے قبل ادا کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ اس صبح اس نے پادری اینتونی ایزابیل کی اعانت سے اپنے روحانی معاملات کو سلجھا لیا تھا، اور اب اپنے نو بھیجے بھتیجیوں کی موجودگی میں جو کہ اس کی سلطنت کے بلا شرکت غیرے وارث تھے اور اس کے بستر کے گرد جمع تھے، اپنے دنیاوی معاملات سے فراغت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پادری جس کی سوویں سالگرہ نزدیک تھی، اور جو اپنے آپ سے گفتگو کرتے رہنے کا عادی تھا اسی کمرے میں مقیم تھا۔ دس آدمی اسے بڑی ماما کی خواب گاہ میں لے کر آئے تھے اور یہی مناسب سمجھا گیا تھا کہ وہ وہیں قیام کرے تاکہ ان آدمیوں کو اسے نیچے لے جانے اور پھر بڑی ماما کے حرف لمحات میں دوبارہ اوپر لانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

بڑی ماما کا سب سے بڑا بھیجا، نکانور، دیوہیکل اور وحشی آدمی، خاکی کپڑوں میں ملبوس، مہمیز لگے جوتے پہنے اور ۳۸ قطر کا ریوالور قمیص کے اندر لٹکائے، وکیل کی تلاش میں نکل گیا۔ عظیم الشان دومنزلہ حویلی، جس میں اجوائن اور گڑ کے شیرے کی خوشبو رچی بسی تھی اور جس کے تاریک حجرے صندوقوں اور پچھلی چار نسلوں کی، جو خاک ہو چکی تھیں، یادگاروں سے اٹے پڑے تھے، اس متوقع سانحے کے انتظار میں مفلوج پڑی تھی۔ طویل مرکزی ہال میں، جہاں اگلے زمانوں میں کھونٹیوں پر ہلاک کیے ہوئے سؤر لٹکے رہتے تھے یا جہاں بڑے اگست کے خوابیدہ اتواروں کو ذبح کیے جاتے تھے، اب چپراسی نمک کی بوریوں اور زراعتی سامان پر خوابیدہ تھے، اور احکام کے منتظر کہ کب گھوڑوں پر زینیں کسیں اور انہیں دوڑا کر وسیع و عریض جاگیر کے چاروں کونوں میں بری خبر کی منادی کریں۔ خاندان کے باقی افراد دیوان خانے میں موجود تھے۔ عورتیں کم خون اور وراثت کی تقسیم کے طویل کارروائی سے تھک کر ادھ موئی ہو رہی تھیں۔ وہ ایک سخت سوگ میں تھیں جو بےشمار جمع شدہ سوگوں کا نقطۂ عروج تھا۔ بڑی ماما کی مادرانہ سخت گیری اس کی خوش بختی اور شہرت کو چاروں جانب سے مقدس حفاظتی باڑھ کی طرح گھیرے رہی تھی، اور اس باڑھ کے عقب میں چچیوں نے اپنی بھتیجیوں کی اولادوں سے، عم زادوں اور خالہ زادوں نے اپنی خالاؤں سے، اور بھائیوں نے اپنی سالیوں سے شادیاں رچائی تھیں، حتیٰ کہ قربت داریوں کا ایک گنجلک تانابانا بن گیا تھا جس نے افزائش نسل کے فریضے کو ایک شیطانی چکر بنا دیا تھا۔ صرف بڑی ماما کی سب سے چھوٹی بھتیجی مگدالینا اس چکر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ اپنی وہمی بدخوابی سے دہشت زدہ ہو کر اس نے پادری اینتونی ایزابیل سے جن بھوت نکلوانے کا عمل کروایا تھا اور اپنا سر منڈوا کر دنیا کی شان و شوکت اور ظاہری بناوٹ کو تج کر، مبلغوں کے علاقے کی مبتدی راہباؤں کے گروہ میں شامل ہو گئی تھی۔

باضابطہ خاندان کی سرحدوں پر مردوں نے، جاگیردارانہ حقوق کو استعمال میں لاتے ہوئے جاگیر کی نئی آبادیوں، دیہاتوں اور مویشی خانوں میں ناجائز اولاد کی ایک کھیپ پیدا

کر دی تھی، اور یہ نسل، خاندانی نام کے بغیر، بڑی ماما کے نوکروں کے درمیان اس کے خادم، منظورِ نظر یا متوسل بن زندگی گزار رہی تھی۔

بڑی ماما کی موت کی قربت نے ایک تھکا دینے والی توقع کو جنم دیا تھا۔ دوسروں سے اطاعت اور تعظیم حاصل کرنے کی خوگر مرنے والی عورت کی آواز کسی بند کمرے میں کھرج کے سر بجاتے ہوئے آرگن سے زیادہ بلند نہ تھی، مگر اس کی گونج جاگیر کے دوردراز کونوں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کی موت سے لاتعلق رہا ہو۔ اس پوری صدی کے دوران بڑی ماما ماکوندو کی کششِ ثقل کا مرکز بنی رہی تھی، اپنے ماں باپ، بھائیوں اور آباواجداد کی طرح جو ماضی میں دو سو برس سے حکمرانی کرتے چلے آ رہے تھے۔ شہر کا نام بھی اس کے خاندانی نام پر رکھ گیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بڑی ماما نے اپنی جاگیر کہاں سے حاصل کی تھی اور نہ کسی کو اس کی دولت اور جائداد کی حد اور قیمت کا صحیح علم تھا۔ سب نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ بڑی ماما بہتے یا ساکن تمام پانیوں، تمام بارشوں، خشک سالی کے دنوں، ضلعے کی تمام شاہراہوں، بجلی کے کھمبوں، لیپ کے برسوں اور گرم ہواؤں کی مالک ہے اور مزید یہ کہ زندگی اور املاک پر اس کا موروثی حق ہے۔ جب وہ پچھلے پہر کی خشک ہوا میں بالکنی میں براجمان ہوتی اور اس کے سارے اقتدار اور اس کی بوجھل توند کا وزن بید کی جھولنے والی پرانی کرسی میں سمٹا ہوا ہوتا تو اس کی قوت اور دولت لامتناہی لگتی اور ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ دنیا کی امیرترین اور طاقتورترین آبائی خاتون ہے۔

قبیلے کے چند لوگوں کے اور بڑی ماما کے اپنے ذہن کے سوا، جسے پادری اینتونی ایزابیل اپنی سالخوردہ اندیشوں سے کچوکے دیتا رہتا تھا، کسی اور کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ بڑی ماما فانی ہستی ہے۔ بڑی ماما کا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ سو برس سے اوپر زندہ رہے گی، اپنی اس نانی کی طرح جس نے ۱۸۸۵ کی جنگ میں اپنے باورچی خانے میں مورچہ بندی کر کے کرنل اوریلیانو بوئندیا کے گشتی دستے کا مقابلہ کیا تھا۔ صرف اس سال اپریل کے مہینے میں آ کر بڑی ماما پر انکشاف ہوا تھا کہ اس کے مقدر میں خداوند نے یہ نہیں لکھا کہ وہ وفاق پرست میسنز سے کھلے میدان میں جنگ کر کے اپنے ہاتھوں سے انہیں تہس نہس کرنے کا شرف حاصل کرے۔

تکلیف کے پہلے ہفتے میں خاندانی معالج نے بڑی ماما کو سرسوں کے پلاسٹروں اور اونی جرابوں میں جکڑ کر زندہ رکھا تھا۔ یہ موروثی معالج تھا جس نے مونٹ پیلیئے میں تعلیم پائی تھی اور اپنے فلسفیانہ یقین کی بنیاد پر علمِ طب میں ترقی کے سخت خلاف تھا۔ بڑی ماما کی جانب سے اسے عمر بھر کے لیے یہ اختیار حاصل ہو چکا تھا کہ وہ کبھی بھی ماکوندو میں کسی دوسرے معالج کے پاؤں نہ جمنے دے۔ کسی زمانے میں وہ گھوڑے کی پیٹھ پر شہر کا دورہ کیا کرتا تھا اور شام کے جھٹپٹے میں دکھی اور بیمار لوگوں کے گھروں میں جاتا تھا۔ قدرت کی جانب سے اسے بہت سے لوگوں کے بےشمار بچوں کا باپ ہونے کی سعادت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اب وہ گٹھیا کے ہاتھوں بستر کا قیدی تھا، اس کے جوڑ اینٹھ گئے تھے اور اب وہ مریضوں کا علاج انہیں دیکھے بغیر، مفروضوں، نامہ بروں اور ملازموں کے بھروسے پر،

کر لیا کرتا تھا۔ بڑی ماما کا بلاوا آیا تو وہ دو چھڑیوں کے سہارے چلتے ہوئے، اپنے شب خوابی کے لباس ہی میں اس نے قصبے کا چوک عبور کیا اور حویلی میں پہنچ کر علیل عورت کی خواب گاہ ہی میں اپنا ڈیرا ڈال دیا۔ جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ بڑی ماما کا وقت آن پہنچا ہے، تب ہی اس نے اپنا صندوقچہ منگوایا جس میں تمام چینی کے مرتبان رکھے تھے جن پر لاطینی زبان میں لیبل چسپاں تھے۔ تین ہفتے تک ہر طرح کے مرہم لگا لگا کر اور اعلا قسم کی محرک ادویات اور امیجے دے دے کر اس نے بڑی ماما کا اندر باہر ایک کر دیا۔ پھر اس نے بڑی ماما کے متورم اعضا پر پھولے ہوئے مینڈک ملوائے اور اس کے گردوں پر جونکیں لگوائیں۔ لیکن بالآخر ایک صبح اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تو وہ کسی جراح سے بڑی ماما کی فصد کھلوائے یا پادری اینتونی ایزابیل سے بڑی ماما پر آسیب اترائی کا عمل کروائے۔

اس وقت نکانور نے پادری کو بلوا بھیجا۔ نکانور کے دس بہترین آدمی پادری کو گرجے سے ملحق اس کے گھر سے اٹھا کر بڑی ماما کی خواب گاہ میں لے آئے۔ وہ بید کی چرخ چوں کرتی ہوئی جھولنے والی کرسی میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سر پر کائی لگا چھتر سایہ کیے ہوئے تھا، جو صرف غیرمعمولی موقعوں کے لیے مخصوص تھا۔ ستمبر کی نیم گرم صبح کو سحری قربان گاہ کی مدھم سی گھنٹی کی آواز ماکوندو کے ساکنوں کے لیے متوقع حادثے کی اولین اطلاع تھی۔ سورج طلوع ہونے تک بڑی ماما کی حویلی کے سامنے والا چھوٹا سا چوک کسی دیہاتی میلے کا منظر پیش کرنے لگا۔

یہ منظر کسی دوسرے عہد کی یاد دلا رہا تھا۔ ستر برس کی عمر تک بڑی ماما اپنا جنم دن ہر سال ایسی دھوم دھام سے اور اتنے دنوں تک مناتی رہی تھی کہ اس کی مثال شاید ہی علاقے میں موجود ہو۔ مٹکوں میں شہر کے باسیوں کے لیے رم کی سبیل لگائی جاتی۔ عوامی چوک میں جانوروں کی قربانی کی جاتی۔ موسیقاروں کا ایک طائفہ، ایک بڑے سے تخت پوش پر [illegible] تین روز تک [illegible] لوگوں کا دل بہلاتا رہتا۔ بادام کے گردآلود درختوں کے نیچے، اس صدی کے پہلے ہفتے میں کرنل اوریلیانو بوئندیا کے دستوں نے خیمے لگائے تھے، وہاں دکانیں لگتیں جن پر کیلے کی شراب، گوشت کے تلے ہوئے پارچے، چھوٹی گول روٹیاں، خون کی پڈنگ، بھنا ہوا گوشت، کیمے کی روٹیاں، گوشت کے سموسے، ساسج، تیل میں تلے کیک، مکئی کی روٹیاں، پیسٹریاں، اوجھڑی، ناریل کے گول کیک، کالے تیتر، سیخ کباب اور تازی جیسی خوردونوش کی اشیا، دوسری الم غلم چیزوں، چھوٹے چھوٹے کھلونوں، سماشی [illegible] ور مرغوں کی لڑائی اور لاٹری کے ٹکٹوں کے ہمراہ بکتیں۔ پُرجوش ہجوم کی پیداکردہ افراتفری میں بڑی ماما کی شبیہ والے پرنٹ بکتے اور شانہ پٹیاں بھی فروخت ہوتیں۔

تقریبات دو دن پہلے شروع ہو جاتیں اور جنم دن کو گرجدار آتش بازی اور بڑی ماما کی حویلی کے اندر خاندان کے افراد کے رقص پر ختم ہوتیں۔ اس رقص میں احتیاط سے منتخب اور مدعو کیے گئے مہمانوں کے ساتھ خاندان کے افراد اور ان کی خدمت پر مامور ناجائز اولاد سب شرکت کرتے اور ایک قدیم پیانولا کی جدیدترین دھنوں پر رقص کرتے۔ بڑی ماما ہال کے عقب میں لنن کے گدیلوں والی آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر اس تقریب کی صدارت کرتی، اور

اپنے دائیں ہاتھ کے اشارے سے، جس کی تمام انگلیاں انگوٹھیوں سے آراستہ ہوتیں، موقع بموقع ہدایات جاری کرتی۔ اس رات آئندہ برس میں ہونے والی تمام شادیاں طے ہوتیں۔ گو بعض شادیوں میں فریقین کی حمیدہ مرضی کا دخل ہوتا لیکن ان کے فیصلے بڑی ماما اپنے دل کے مشورے کے مطابق کرتی۔ جشن کے اختتام پر وہ جاپانی قندیلوں اور پھولوں کے گجروں سے سجی بالکنی میں نمودار ہو کر ہجوم پر سکّے نچھاور کرتی۔

خاندان میں یکے بعد دیگرے متعدد اموات، اور ملک میں سیاسی عدم استحکام کے باعث پچھلے چند برسوں سے اس روایت کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ نئی نسلوں نے تو ان شاندار تقریبات کے صرف قصے ہی سن رکھے تھے۔ انھوں نے تو عشائے ربانی کی پرشکوہ رسم میں بڑی ماما کی شرکت کا منظر بھی نہ دیکھا تھا جس میں شہری انتظامیہ کا کوئی نہ کوئی افسر سے پنکھا جھلتا رہتا، اور جہاں بڑی ماما کو اختیار حاصل تھا کہ وہ چاہے تو گھٹنوں پر بھی نہ جھکے حتیٰ کہ رکوع کے دوران بھی نہیں تاکہ اس کا ولندیزی سکرٹ اور کلف لگے کیمبرک کا پیٹی کوٹ میلا نہ ہو۔ صرف بڑے بوڑھوں کو، جوانی کے کسی دھندلے خواب کی طرح وہ دن یاد تھا جب حویلی سے لے کر قربان گاہ تک دو سو گز لمبا قالین بچھایا گیا تھا جس پر چل کر ماریا دیل روزاریو کاستانیدا ای مونتیرو نے اپنے والد کی تجہیزوتکفین کی رسومات میں شرکت کی تھی اور پھر نئے اور ماہانہ وقار کے ساتھ اسی قالین سے [illegible] حویلی میں واپس آئی تھی اور بائیس برس کی عمر ہی میں بڑی ماما کہلائی جانے لگی تھی۔ وہ قرون وسطیٰ کا سا منظر نہ صرف بڑی ماما کے خاندان کی تاریخ میں شامل تھا بلکہ پوری قوم کے ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ اپنی رعایا سے بتدریج دست کش ہوتی، ان کے لیے غیرمرئی بنتی اور اپنی بالکنی میں بمشکل دکھائی دیتی ہوئی بڑی ماما، جھلسی دوپہروں میں جیرینیم کے پھولوں کی خوشبو میں مرجھائی ہوئی، اپنی داستانی عظمت میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ عملاً تمام اختیارات نکانور کے ہاتھوں میں تھے۔ خاندان کے افراد کے درمیان ایک خاموش معاہدہ چلا آ رہا تھا کہ جس روز بڑی ماما کی وصیت سربمہر کی جائے گی اس کے جانشین تین دن کے عوامی جشن کا اعلان کریں گے۔ دوسری طرف سب کو بڑی ماما کے اس فیصلے کا بھی علم تھا کہ وہ اسی وقت اپنی آخری خواہشات کا اظہار کرے گی جب اس کے مرنے میں صرف چند گھنٹے باقی رہ جائیں گے۔ مزیدبرآں کبھی کسی نے سنجیدگی سے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ بڑی ماما بھی فانی مخلوق ہے۔ صرف اس صبح جب قربانی کی مدھم گھنٹی نے ماکوندو کے باسیوں کو بیدار کیا تو انھیں احساس ہوا کہ بڑی ماما نہ صرف فانی ہے بلکہ موت کے دروازے پر ہے۔

اس کا وقت آ پہنچا تھا۔ مشرق سے درآمد کیے ہوئے کریپ سے بنے اور گردوغبار سے اَٹے چھتر کے نیچے، اسے اپنی لنن کے بستر پر دراز اور کانوں تک ایلوے کی پلٹس میں لتھڑا ہوا دیکھ کر یہ کہنا ناممکن تھا کہ اس کی بوڑھی چھاتیوں میں رواں خفیف سانس میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہے۔ پچاس برس کی عمر ہونے تک بڑی ماما نے شادی کے ہر امیدوار کی پیش کش کو رد کر دیا تھا۔ حالانکہ قدرت نے اسے ایسا جسم ودیعت کیا تھا کہ اپنی تمام اولاد کو اکیلی دودھ پلا کر پال سکتی تھی۔ نتیجتاً آج وہ کنواری اور بےاولاد اس جہاں سے جا رہی

بھی پادری انتونی ازابیل کو اس کی سہیلیوں پر مقدس روغنات کی مالش کرنے کے لیے دوسروں سے مدد لینا پڑی کیونکہ مرگ کا عالم شروع ہوتے ہی بڑی ماما نے اپنی سہیلیاں کمرے کی بند کر لی تھیں۔ بھانجیوں بھتیجیوں کی کمرے میں حاضری بے‌فائدہ تھی۔ اس کشمکش میں، ہفتے بھر میں پہلی بار، مرنے والی نے قیمتی جواہر سے لدے ہوئے ہاتھ کو سینے پر بھینچ کر اپنی بے‌رنگ آنکھوں سے بھانجیوں بھتیجیوں کو گھورا اور انھیں چور اور ڈاکو کہہ کر پکارا، لیکن پھر اس کی نگاہ پادری انتونی ازابیل پر پڑی، جس نے مذہبی فرائض کی ادائیگی والا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس کے مددگار ملازم پر جو مذہبی رسوم کا سامان اٹھائے کھڑا تھا۔ تب اس نے پُرسکون یقین کے ساتھ آہستہ آواز میں کہا "میرا وقت آن پہنچا ہے۔" پھر اس نے بڑے ہیرے والی انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر ماگدلینا کے حوالے کر دی جو اس کے وارثوں میں سب سے کم عمر ہونے کے باعث سکونتی کی حقدار تھی۔ یہ ایک روایت کا خاتمہ تھا۔ ماگدلینا اپنے ورثے سے کلیسا کے حق میں دستبردار ہو چکی تھی۔

صبح سویرے بڑی ماما نے نکانور کے ہمراہ تنہا چھوڑ دیے جانے کی خواہش ظاہر کی تاکہ وہ آخری ہدایات جاری کر سکے۔ نصف گھنٹے تک اس کے ہوش و حواس پوری طرح قائم رہے اور اس نے جاگیر سے متعلق معاملات پر استفسار کیا اور اپنی جسدِ خاکی کی تیاری کی بابت خصوصی ہدایات دیں۔ آخر میں اس نے شب بیداری پر اظہارِخیال کرتے ہوئے نکانور سے کہا "تمھیں ہر لمحے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہوں گی۔ ہر قیمتی چیز کو تالا لگا کر رکھنا ہو گا۔ بہت سے لوگ چوری کرنے کی خاطر شب بیداریوں میں شامل ہوتے ہیں۔" چند لمحوں بعد اس نے پادری کے سامنے لب جوڑ آخری اعتراف کیا جو مفصل بھی تھا اور دیانت دارانہ بھی۔ بعدازاں اس نے بھتیجیوں اور بھانجیوں کی موجودگی میں عشائے‌ربانی کی رسم ادا کی۔ اسی موقعے پر اس نے حکم دیا کہ اسے بید کی جھولنے والی کرسی میں بٹھا دیا جائے تاکہ وہ اپنی آخری خواہشات کا اظہار کر سکے۔

نکانور نے چوبیس ورقوں پر مشتمل اور خوشخط حروف میں مرقوم اس کی املاک کی بے‌عیب اور صاف فہرست بڑی احتیاط سے تیار کی تھی۔ سکون سے سانس لیتے ہوئے اور پادری انتونی ازابیل اور اپنے معالج کو شاہد بنا کر بڑی ماما نے وکیل کو اپنی جائیداد کی تفصیل لکھوائی۔ اس جائیداد ہی پر اس کے تمام شکوہ اور اقتدار کا دارومدار تھا۔ حقیقتاً اس کی جائیداد تین اضلاع پر مشتمل تھی۔ یہ اضلاع نوآبادی کے قیام کے وقت شاہی فرمان کی رو سے اس کے خاندان کو عطا ہوئے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور متعدد سہولت کی شادیوں کی پیچیدہ تانے بانے کی بدولت، بڑی ماما کے زیرِانتظام املاک اور جائیداد میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ اب یہ جائیداد پانچ اضلاع پر پھیل چکی تھی۔ اس غیرمزروعہ زمین پر، جس کی صحیح حدیں کبھی متعین نہ ہوئی تھیں، تین سو باون کرایہ دار مزارعوں کے کنبے قیام پذیر تھے اور اس تمام علاقے میں مالکوں کے خرچ پر کبھی ایک فصل بھی نہ بوئی گئی تھی۔ ہر سال اپنے نام کے دن بڑی ماما وہ واحد انتظامی قدم اٹھاتی تھی، جس کے باعث یہ علاقہ دوبارہ ریاست کی تحویل میں نہیں جا سکا تھا۔ وہ قدم تھا مزارعوں سے کرایہ وصول کرنے کا تھا۔ حویلی کے عقبی برآمدے میں بیٹھ کر وہ بنفسِ نفیس اپنی زمین پر قیام کے حق کا معاوضہ وصول کرتی تھی

جیسے اس کے آباواجداد اس کے مزارعوں کے آباواجداد سے سو برس سے زیادہ عرصے سے کرتے چلے آئے تھے۔ تین دن بعد جب وصولی کا سلسلہ ختم ہوتا تو اس کا برآمدہ مختلف تحائف سے، جن میں سؤر، مرغیاں، فیل مرغ، فصل کے اولین اثمار اور دوسری اجناس کے عُشر شامل ہوتے، پٹ چکا ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ پیمائش کی رو سے تقریباً ایک لاکھ ہیکٹیئر اراضی سے، جو ابتدا ہی سے بنجر تھی، پیداوار کے طور پر صرف یہی کچھ بڑی ماما کے خاندان کو حاصل ہوا تھا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے کہ اسی علاقے کی حدود کے اندر ماکوندو کے چھ قصبات پھل پھول رہے تھے اور ضلعی دارالحکومت قائم ہو چکا تھا حالانکہ وہاں کے کسی مکین کو صحیح معنوں میں حقِ ملکیت حاصل نہیں تھا، سوائے اس حق کے جو مکان کی چاردیواری تک محدود تھا۔ زمین کی اصل مالک بڑی ماما تھی جو اس کا کرایہ وصول کرتی تھی، ویسے ہی جیسے خود حکومت کو عوام کے تصرف میں آئی ہوئی گلیوں کے استعمال کے لیے اسے کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

ان آبادیوں کے اطراف میں متعدد مویشی، جن کی تعداد کا کسی کو علم نہیں تھا اور نہ جن کی کوئی دیکھ بھال کرتا تھا، آوارہ پھرتے رہتے تھے۔ ان کے پٹھوں پر تالے کا نشان ثبت تھا۔ یہ موروثی نشان دوردراز کے علاقوں میں معروف ہو چکا تھا، لیکن اس کی شہرت کی وجہ مویشیوں کی کثرت نہ تھی بلکہ مالکان کی بدانتظامی تھی جس کے باعث جانور ادھر اُدھر کے علاقوں میں نکل جاتے، جہاں یہ بھٹکتے پھرتے اور گرمیوں کے دنوں میں پیاس سے دم توڑ دیتے تھے۔ مویشیوں کا گلہ وہ ٹھوس ستون تھا جس پر خاندان کی داستانی عظمت استوار تھی۔ چند ایسے اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت کرنے کی کسی نے زحمت گوارا نہ کی تھی، خاندان کے وسیع و عریض اصطبل پچھلی خانہ جنگی کے بعد سے بتدریج خالی ہوتے گئے تھے اور وہاں مویشیوں کے بجائے نیشکر کچلنے اور دودھ دوہنے کی مشینیں اور چاول کے کارخانے کام کرنے لگے تھے۔

مذکورہ اشیا کے علاوہ بڑی ماما نے اپنی وصیت میں سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تین دیگوں کا ذکر بھی کیا۔ جنگ آزادی کے دوران یہ دیگیں حویلی کے کسی حصے میں دفن کر دی گئی تھیں۔ ان کو ڈھونڈنے کے لیے کئی جگہ محنت سے کھدائی کی گئی تھی مگر انھیں ابھی تک برآمد نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس وصیت کی رو سے نئے وارثوں کو جہاں کرائے پر دی ہوئی زمین سے استفادہ کرنے، عشر اور اثمارِ اولیں اور کئی دوسرے غیرمعمولی نوعیت کے محصول وصول کرنے کے حقوق تفویض ہوئے تھے، وہاں ساتھ ہی ایک نقشہ بھی مرحمت ہوا تھا جو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا تھا۔ ہر نسل نے مکمل حالت میں رکھنے کی ذمے‌داری لی تھی تاکہ مدفون خزانے کی بازیافت میں سہولت پیدا ہو سکے۔

اپنی مملوکہ اشیا کی تفصیلات بیان کرنے میں بڑی ماما کے تین گھنٹے صرف ہوئے۔ خواب گاہ کے گھٹے ہوئے ماحول میں بڑی ماما ہر چیز کو اس کا ذکر کر کے عزت بخشتی رہی۔ جونہی اس نے اپنے لرزاں ہاتھ سے وصیت پر دستخط کیے اور گواہوں نے اس کی تصدیق کی، حویلی کے سامنے چوک میں بادام کے گردآلود درختوں کے سائے میں جمع ہوتے ہوئے ہجوم کے دل ایک انجانے خوف سے لرز اٹھے۔

گنتی میں ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ ابھی تک بڑی ماما کی "غیرمادّی" املاک کا بیان نہ آیا تھا۔ بڑی ماما کے ہر پیشرو نے اپنی موت سے قبل خاندان کا اقتدار یقینی طور پر بحال رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی، اسی طرح بڑی ماما بھی اٹھ کر اپنے بھاری بھرکم چوتڑوں پر بیٹھ گئی اور تحکمانہ اور مخلص آواز میں وکیل کو اپنی غیرمادی جائیداد کی تفصیل لکھوانے لگی۔ اس جائیداد میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل تھیں:

زیرِ زمین دولت، علاقائی پانی، جھنڈے کے رنگ، قومی خودمختاری، روایتی جماعتیں، انسانی حقوق، شہری حقوق، قوم کی قیادت، اپیل کا حق، کانگریس کی سماعتیں، سفارشی خطوط، تاریخی مسودے، آزاد انتخابات، ملکۂ حسن کا انتخاب، مابعدالطبیعاتی تقاریر، عظیم عوامی مظاہرے، ممتاز نوجوان خواتین، معزز شریف مرد، تکلمات کے عادی عسکری، تقدس مآب حضور عالی مقام، عدالت عالیہ، ممنوعہ درآمدی سامان، آزادی پسند خواتین، مسئلۂ گوشت، زبان کی پاکیزگی، عمدہ مثالوں کا قیام، آزاد مگر ذمہ دار پریس، جنوبی امریکا کا ایتھنز، رائے عامہ، جمہوریت کے سبق، مسیحی اخلاقیات، زرِمبادلہ کی کمی، پناہ کا حق، اشتمالیوں کی دہشت پسندی، ریاست کا سفینہ، بڑھتی ہوئی مہنگائی، ری پبلکن روایات، غیرمراعات یافتہ طبقے، سیاسی حمایت کے بیانات، وغیرہ وغیرہ۔

بڑی ماما کو یہ گنتی مکمل کرنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔ یہ پرمشقت کام اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ دو صدیوں سے خاندان کے اقتدار کا اخلاقی جواز جن تجریدی کلّیوں پر قائم تھا، ان کے شوروغل میں غرق ہوتے ہوئے اس نے ایک زور کی ڈکار لی اور سدھار گئی۔

اس سہ پہر دورافتادہ، خاموش اور افسردہ دارالحکومت میں شائع ہونے والے اخباروں کے ضمیموں کے صفحۂ اول پر ایک بیس سالہ خاتون کی تصویر شائع ہوئی، جسے وہاں کے باشندوں نے نئی ملکۂ حسن کی تصویر سمجھا۔ اس تصویر کی مطلوبہ ری ٹچنگ کر کے، گھیرے بالوں کو اوپر اٹھا کر، ان میں ہاتھی دانت کی کنگھی اڑس کر، اور فیتے کے کالر میں پھولوں کا تاج [illegible] کر کے اسے چار کالموں پر پھیلایا گیا تھا، اور یوں بڑی ماما کی جوانی بصری طور پر دوبارہ وجود میں آ گئی تھی۔ سڑک پر دکان سجانے والے کسی فوٹوگرافر کے ہاتھوں، جو اس صدی کے اولین برسوں میں ماکوندو سے گزرا تھا، اتری ہوئی، سالہاسال سے اخبار کے غیرشناخت یافتہ افراد کے شعبے کے مردخانے میں رکھی ہوئی یہ تصویر آئندہ نسلوں کی یاد میں محفوظ ہو جانے والی تھی۔ پرانی شکستہ بسوں میں، وزارت خانوں کے ایلی ویٹروں میں، دھندلی اور پیلی پڑتی ہوئی سجاوٹ کی اشیا سے آراستہ تاریک چائےخانوں میں، ہر جگہ لوگ مرحومہ کے بارے میں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ملیریائی، لرزہ علاقے سے تعلق رکھنے والی اور چند گھنٹے قبل تک ملک کے دوسرے حصوں میں بالکل غیرمعروف، اس شخصیت کا احترام اور عزت کے ساتھ ذکر ہو رہا تھا۔ اخباروں میں چھپے ہوئے حروف نے اس کے گرد تقدس کا ہالہ بُن دیا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی نے راہگیروں کو وسوسوں اور کہرے میں ڈھانپ رکھا تھا۔ تمام گرجوں کی گھنٹیاں مرحومہ کے لیے نوحہ کناں تھیں۔ صدرِجمہوریہ کے لیے، جو اس وقت نئے بھرتی کیے گئے سپاہیوں کی جنگی مشقوں کے افتتاح کے لیے جا رہے تھے، یہ خبر غیرمتوقع حیرت کا باعث تھی۔ موصولہ تار کی پشت پر صدرِمملکت نے اپنے ہاتھ

سے وزیرِجنگ کے نام یہ پیغام درج کیا کہ خطبے کے اختتام پر بڑی ماما کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی جانی چاہیے۔

بڑی ماما کی موت سے لگتا تھا جیسے معاشرتی نظام پر خراش آ گئی ہو۔ صدرِمملکت خود شہری آبادی کے جذبات سے، جو کسی مقطّر کے ذریعے پاک صاف ہو کر صدر کے دل تک پہنچ گئے تھے، متاثر معلوم ہوتے تھے۔ کار میں گزرتے ہوئے، صدر نے شہر کے اضطراب کا عارضی مگر قدرے سفاک رُویا دیکھ لیا تھا۔ شہر میں صرف چند گھٹیا قہوہ خانے کھلے تھے۔ میٹروپولیٹن گرجا نو دن تک مرگ کی رسوم ادا کرنے کے لیے تیار کیا جا چکا تھا۔ قومی دارالحکومت کی عمارت میں، جہاں بھکاری اخباروں میں لپٹے لپٹائے، یونانی ستونوں اور جمہوریہ کے آنجہانی صدور کے خاموش مجسموں کے زیرِسایہ شب بسری کیا کرتے تھے، کانگریس روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ صدرِمملکت جن کا دل شہر میں سوگواری کی فضا دیکھ کر پگھل چکا تھا، جس وقت اپنے دفتر میں داخل ہوئے، ان کی کابینہ کے ارکان ماتمی لبادوں میں ملبوس ان کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے معمول سے زیادہ زرد اور سنجیدہ تھے۔

اس رات، اور اس کے بعد آنے والی راتوں میں رونما ہونے والے واقعات، بعدازاں، تاریخی سبق قرار دیے جانے والے تھے، کیوں‌کہ ان راتوں میں نہ صرف شہری اقتدار کے عالی نفس کارکنان مسیحی جذبے سے سرشار نظر آتے تھے بلکہ وہاں ایثار کی فضا قائم ہو گئی تھی، جس کے زیرِاثر بڑی ماما کے عالی مرتبت تنِ خاکی کے دفنائے جانے کے مشترک مقصد نے مخالف معاندت اور متصادم آرا میں مصالحت کرا دی تھی۔ عرصۂ دراز سے بڑی ماما کا وجود اپنے زیرِاقتدار علاقے میں سیاسی ہم آہنگی اور معاشرتی امن کا ضامن رہا تھا، جس کی بنیاد ان تین صندوقوں پر تھی جو جعلی انتخابی کاغذوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو بڑی ماما کی خفیہ جائیداد میں شامل تھے۔ بڑی ماما کے ملازم، اس کے پروردگان، اس کے مزارعے، بوڑھے یا جوان، اپنا حقِ رائےدہی استعمال کرتے وقت ان لوگوں کے ووٹ بھی ڈالا کرتے تھے جو سو سال قبل آنجہانی ہو چکے تھے۔ بڑی ماما کی ذات کی بدولت روایتی اور دیرپا اقتدار کو عارضی اور ناپائیدار اقتدار پر سبقت حاصل تھی۔ طبقوں کو عوام پر فوقیت، اور حکمت خداوندی کو عقل انسانی کی برجستگی پر فضیلت تھی۔ امن و امان کے زمانے میں بڑی ماما کی غالب منشا سے کلیسا کے عہدوں اور اوقاف اور جاگیروں کے بٹوارے کی تصدیق یا تردید ہوتی تھی، اور بڑی ماما کے طرفداروں کی فلاح و بہبود کی نگرانی، اور ایسے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وہ ہتھکنڈوں کے استعمال اور انتخابات میں جعل سازی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ بدامنی کے دنوں میں بڑی ماما اپنے حامیوں کو خفیہ ذریعوں سے ہتھیار فراہم کرتی تھی، لیکن عوام کے سامنے وہ جبر کا نشانہ بننے والے لوگوں کی مدد کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ اس انداز کے پرجوش جذبۂ حب الوطنی کے سبب وہ اعلاترین اعزاز کی مستحق قرار پائی تھی۔

اس معاملے میں صدرِجمہوریہ کو اپنی ذمّےداری کی اہمیت اور سنجیدگی کا احساس کرنے کے لیے اپنے مشیروں سے مشورہ کرنے کی حاجت نہ تھی۔ محل کے استقبالیہ ہال اور سیمنٹ کے فرش والے عقبی دالان کے درمیان سرو کے درختوں سے بھرا ایک باغیچہ تھا، جسے وائسرائے پورچ کے طور پر استعمال کرتے رہے تھے، اور جہاں کالونی کے آخری دنوں میں ایک پرتگالی

راہب نے عشق میں ناکامی کے باعث خودکشی کر لی تھی۔ غروبِ آفتاب کے وقت اس باغیچے میں سے گزرتے ہوئے صدرِمحترم، تسموں سے بوجھل، شور کرتے ہوئے مشیروں کی رفاقت کے باوجود ایک انجانے خوف کی لرزش محسوس کیا کرتے تھے۔ اس مخصوص شام کو وہ لرزش بدشگونی کا روپ دھار چکی تھی۔ اس وقت صدرِمحترم کو اپنے تاریخی مقدّر سے مکمل طور پر آگاہی ہوئی۔ نتیجتاً انھوں نے بڑی ماما کا سوگ نو دن تک قومی سطح پر منانے کا فرمان جاری کیا اور بڑی ماما کو اس اعزاز سے نوازا جو میدانِ جنگ میں وطن کی خاطر شہید ہونے والی ہستیوں کے لیے مختص ہوتا ہے، اور بعد از شہادت عطا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں، جیسا کہ صدرِمحترم نے صبح کے وقت ٹیلیویژن اور ریڈیو پر اپنے ہم وطنوں سے ایک ڈرامائی خطبے میں فرمایا، انھیں محکم یقین تھا کہ بڑی ماما کی رسومِ مرگ کی ادائیگی دنیا بھر کے لیے ایک نئی مثال قائم کرے گی۔

ان ارفع عزم اور چند گھمبیر عملی زحمتوں میں ٹکراؤ ناگزیر تھا۔ ملک کا عدلی نظام، جس کی تشکیل بڑی ماما کے قدیم پیش رووں نے کی تھی، ان حالات سے نمٹنے سے قاصر تھا جو رونما ہونے شروع ہوئے۔ زیرک قانون دان اور مستند دستوری کیمیاگر مقدس کتب کی تصریحات اور علمِ منطق کی قیاس آرائیوں کے معاملے میں غرق ہو گئے کہ کوئی فارمولا ایسا وضع کر لیں جس کی رُو سے صدرِجمہوریہ کا رسومِ تجہیزوتکفین میں شامل ہونا ممکن ہو جائے۔ سطحِ علا کے سیاست دان، دینی علما اور اصحابِ ثروت دن بھر دہشت زدہ رہے تھے۔ ایک صدی سے مجریدی قانون سازی کرنے کی سعی میں خود مجرّد بنی ہوئی، اور قومی سورماؤں کی روغنی تصویروں اور یونانی مفکروں کے مجسموں کے سائے میں واقع کانگریس کے وسیع حلقوں کی نظر میں بڑی ماما کے منصب کی اہمیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی۔ اس دوران میں ماکوندو کی درشت ستمبر کی گرمی میں بڑی ماما کی نعش میں بلبلے اٹھنے شروع ہو چکے تھے۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ عوام بڑی ماما کو وقت اور عمر کی قید سے آزاد، منزّہ اور داستانی ہستی کے طور پر دیکھ رہے تھے، اور اس کی بید کی جھولنے والی کرسی، اس کی سہ پہر کی قیلولوں اور سرسوں کے پلاستروں کو ذہن میں لائے بغیر اسے یاد کر رہے تھے۔

پوری جمہوریہ میں ہر جگہ الفاظ نے حکمرانی حاصل کر لی تھی۔ ان گنت گھنٹے لفظوں کی گونج کی نذر ہو چکے تھے۔ یہ لفظ وہ تھے جنھیں نشرواشاعت کے اداروں کے نمائندوں نے پروقار بنا دیا تھا اور یہ ساری گفتگوئیں اس وقت تک جاری رہیں جب تک اس حقیقت کے ذکر نے لفظوں کی چاندماری میں مشغول قانون دانوں کے معمّا گروہ کو یہ یاددہانی نہ کرا دی کہ بڑی ماما کا مردہ جسم سائے میں ایک سو چار درجے کی گرمی میں رکھا ان کے فیصلے کا منتظر ہے۔ عقلِ سلیم کے اس دھماکے سے تحریری قانون کی پاکیزہ فضا میں کسی کو آنکھ جھپکنا تک یاد نہ رہا۔ جسدِخاکی کو محفوظ کرنے کے فوری احکام جاری کیے گئے۔ اس اثنا میں قانونی موشگافیوں کا استنباط جاری رہا۔ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو ہم آہنگ کرنے کی تدبیریں ہوئیں اور دستور میں ترمیمیں کی گئیں تاکہ صدرِجمہوریہ کو کفن دفن کی رسوم میں شرکت کرنے کی اجازت حاصل ہو جائے۔

اس موضوع پر اتنا کچھ کہا گیا کہ بحث ملکی سرحدوں کو پار کر کے سمندر عبور کر گئی اور ایک شگون کی طرح قصرِ کونڈولفو میں پاپائےروم کے خلوت خانے میں جا گھسی۔ اگست کے کسالت کے دنوں کی غنودگی سے افاقہ حاصل کرنے کے بعد پاپائےاعظم کھڑکی کے قریب کھڑے خلیج کا نظارہ کر رہے تھے، جہاں اس وقت غوطہ خور ایک مقتول نوجوان لڑکی کے جسم سے علیحدہ کیے ہوئے سر کو برآمد کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ پچھلے چند ہفتوں سے شام کے اخباروں کو اس سربُریدہ لڑکی کی موت کے سوا کسی دوسرے معاملے سے سروکار نہ تھا، اور پاپائےاعظم اس لاینحل مسئلے سے جو ان کے گرمائی مستقر کے گردونواح میں وقوع پذیر ہوا تھا، لاتعلق نہ رہ سکے تھے۔ لیکن اس شام اخباروں نے غیرمتوقع ردوبدل کر کے ممکنہ مقتولین کی تصویروں کی بجائے ایک اکیس سالہ خاتون کی تصویر کالے حاشیوں میں شائع کر دی۔ "بڑی ماما!" پاپائےاعظم نے حیرت زدہ ہو کر پکارا۔ انھوں نے اس دھندلی ڈگیروٹائپ تصویر کو فوراً پہچان لیا۔ یہ انھیں بہت سال پہلے اس موقعے پر پیش کی گئی تھی جب انھوں نے سینٹ پیٹر کی گدی سنبھالی تھی۔ کارڈینل کے مدرسے کے ارکان نے بھی اپنے اپنے خلوت خانوں میں ہم نوا ہو کر "بڑی ماما، بڑی ماما" کا الاپ شروع کر دیا۔ بیس صدیوں کے عرصے میں یہ صرف تیسرا موقع تھا کہ عیسائیت کی لامحدود مملکت میں انتشار، جھنجھلاہٹ اور دوڑ دھوپ کی یہ ساعت آئی تھی اور یہ حالات اس وقت تک قائم رہے جب تک پاپائےاعظم اپنی طویل سیاہ لیموزین میں متمکن ہو کر بڑی ماما کے انوکھے اور بعیدالمسافت جنازے میں شمولیت کے لیے روانہ ہو گئے۔

چمکیلے آڑوؤں کے باغ پیچھے رہ گئے اور اپیا اینٹیکا کی شاہراہ بھی، جہاں کیفوں کے چبوتروں پر دھوپ سے گرمائے ہوئے فلمی ستارے اس ہلچل سے بےخبر اپنے جسموں کو سنولانے میں مگن تھے، حتیٰ کہ قصرِ سانت انجلو کی راس آ پہنچی جو دریائے تیویرے کے کنارے واقع ہے۔ آخر شام کے دھندلکے میں سینٹ پیٹر کے کلیسا کی گونجدار گھنٹوں کی آواز ماکوندو سے بلند ہونے والی پھٹی ہوئی ٹن ٹن سے ہم آغوش ہونے لگی۔ باہم الجھے ہوئے سرکنڈوں اور بےحد دلدلوں سے اُدھر، جو کہ سلطنتِ روما اور بڑی ماما کے مویشی باڑوں کے درمیان حدِفاصل تھیں، پاپائےاعظم اپنے گھٹن بھرے خیمے کے اندر تمام رات گزرتے لوگوں سے مشتعل ہوتے ہوئے بندروں کا شوروغل سنتے رہے۔ رات کے سفر کے دوران ان کا ڈونگا مکّا سے بھرے تھیلوں، کچے کیلوں کے ڈنٹھلوں اور مرغوں کے ٹوکروں سے لدا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس میں وہ عورتیں اور مرد بھی سوار تھے جو اپنے معمول کے کاروبار ترک کر کے، بڑی ماما کی رسومِ مرگ کی ادائیگی کے دنوں میں دوسرے کاروبار کرنے اور اپنی قسمت آزمانے جا رہے تھے۔ کلیسا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مقدس پاپائےاعظم کو اس رات بےخوابی کے تپ اور مچھروں کی اذیت سے پالا پڑا، لیکن بڑی ماما کی سلطنت پر دلفریب طلوعِ صبح کے منظر بلسانی سیبوں اور اگوانوں کے ازلی نظارے نے پاپائےاعظم کی ساری تکلیف کی تلافی کر دی اور سفر کی کوفت کو ان کی یادداشت سے یکسر محو کر دیا۔

دروازے پر تین بار دستک نے جو پاپائےمقدس کی آمد کا اعلان تھی، نکانور کو نیند سے بیدار کیا۔ حویلی موت کی گرفت میں تھی۔ صدرِمحترم کی تابڑتوڑ اور نہایت اہم تقریروں سے

اور ہیجاناتی تنازعات کی تپش سے، جو اب قدرے سرد پڑ چکی تھی مگر ابھی تک روایتی علامتوں کے ذریعے اظہار پا رہی تھی۔ متاثر ہو کر دنیا بھر کے افراد اور عوام کے جتھوں نے اپنے سب کاموں سے منہ موڑ کر تاریک گیلریوں، پُرہجوم دالانوں اور تنگ بالاخانوں میں جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ دُور سے پہنچنے والے، گرجے کی سیڑھی چاردیواری پر، کنگروں پر، مسٹیوں اور منڈیروں پر، جہاں جہاں انہیں جگہ ملی تھی چڑھ گئے تھے۔ بڑی ماما کا حنوط ہوتا ہوا جسم، ٹیلیگراموں کے مرتعش ڈھیر میں پوشیدہ اہم فیصلوں کا منتظر تھا۔ اس کے نو بھتیجے بھانجے جو رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے، نعش کے پہلو میں بیٹھے باری باری سے وجداور بکرانی میں مشغول، شب بیداری کی رسم ادا کر رہے تھے۔

لیکن کائنات کو ابھی اور بہت دن اس انتظار کو طول دینا تھا۔ بلدیہ کا ہال چمڑے کے چار اسٹولوں، مقطّر پانی کے جگ اور ریشوں سے بنے جھولنے والی بستر سے مزیّن کر دیا گیا تھا، جہاں پاپائےاعظم پسینے میں شرابور، بےخوابی میں مبتلا طویل دم گھونٹنے والی راتوں میں انتقامیہ کے احکام اور یادداشتوں کو پڑھ پڑھ کر اپنا دھیان بٹا رہے تھے۔ دن کے دوران میں وہ بچوں میں، جو انہیں دیکھنے کے لیے کھڑکی میں سے جھانکتے رہتے تھے، اطالوی مٹھائیاں بانٹتے اور دوپہر کا کھانا عموماً پادری انتونی ایزابیل کے ہمراہ بےسیکس کے کنج میں تناول کرتے۔ کبھی کبھار یہ شرف نکانور کو بھی حاصل ہو جاتا۔ انہوں نے بےشمار دن اور ہفتے، جنہیں گرمی کی حدّت اور شدید انتظار نے اور بھی طویل کر دیا تھا، یوں گزارے حتیٰ کہ ایک روز پادری پاستراتا اپنے طبنچیوں کے ہمراہ چوک کے درمیان نمودار ہوا اور یہ فرمان پڑھ کر سنایا کہ ملکی نظم و نسق میں خلل واقع ہونے کے باعث، دھی دُھما دھی، صدرِجمہوریہ کو، دھی دھما دھی، ایسے ہنگامی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں کہ، دھی دُھما دھی، کہ جن کی رو سے وہ بڑی ماما کے جنازے میں شامل ہو سکتے ہیں، دھی دھما دھی، دھی دھما دھی، دھی دھی

بالآخر وہ عظیم دن آن پہنچا۔ کوچہ و بازار میں لوگوں کا اژدحام تھا۔ ہر طرف ریڑھیاں اور چھابڑیاں سجی تھیں۔ ہانکیں لگا لگا کر خوراک بیچنے والے لوگ تھے۔ جگہ جگہ لاٹری کے کھوکھے لگے تھے۔ چند لوگ گردنوں میں سانپ لپیٹے، روغنِ اکسیر بیچ رہے تھے اور دعوے کر رہے تھے کہ ان کا روغن داد اور چنبل کا تیربہدف علاج ہے، اور مریضوں کو حیاتِ ابدی دینے کا اہل ہے۔ مختصر سے بچ رنگے چوک میں، جہاں لوگوں نے جگہ جگہ خیمے گاڑے ہوئے تھے یا بستر پھیلا لیے تھے، مستعد کمان بردار سپاہی افسرانِ بالا کے لیے راستا بنا رہے تھے۔

وہ سب کے سب وہاں اس عظیم لمحے کے منتظر تھے: سان حورخے کی دھوبنیں، کابو دلاویلا کے موتیوں کے غوطہ خور، سیناگا کے ماہی گیر، تاسابیرا کے جھینگے پکڑنے والے، موحاخانا کے جادوگر، مانورے کے نمک کی کانوں میں کام کرنے والے، والیدوپار کے اکارڈین بجانے والے، ایاپیل کے نفیس شہسوار، سان پیلایو کے بینڈ کے سازندے، لاکویوا کے نسلی مرغ پالنے والے، سابانا دے بولیوار کے کرشمہ ساز، ریمبولو کے بانکے، ماگدالینا کے کشتی راں، موپاکس کے جنسی وکیل۔ یہ سب ان کے علاوہ تھے جن کا ذکر اس سرگزشت کے آغاز میں کیا جا چکا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے جن میں کرنل اوریلیانو بوئندیا کی فوج کے

آزمودہ کار سپاہی تھے، جو بڑی ماما اور اس کی آل اولاد کے خلاف اپنی صدسالہ نفرت کو وقتی طور پر سرطاق رکھ کر جنازے میں شامل ہونے کے لیے چلے آئے تھے۔ ان کی سربراہی ڈیوک آف مارلبرو کر رہا تھا جس نے اپنی شان و شوکت کی نمود کی خاطر چیتے کی کھال اور شیر کے دانت اور پنجے جسم پر سجا رکھے تھے۔ یہ بوڑھے سپاہی صدرِمحترم سے اپنی پنشن کے بارے میں درخواست کرنے آئے تھے جس کے جاری ہونے کے انتظار میں وہ ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ گزار چکے تھے۔

گیارہ بجے سے ذرا پہلے، چلچلاتی دھوپ میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے اور سجی سجائی وردیوں والے مشاق سپاہیوں کے دستے کے ہاتھوں تھمے ہوئے ہجوم نے نشاط و مسرت سے سرشار ایک گرجدار نعرہ بلند کیا۔ سنجیدہ، باوقار، اپنے بلند ہیٹ اور لمبے کوٹ زیب تن کیے، صدرِ جمہوریہ، ان کی کابینہ کے ارکان، قومی اسمبلی کے مندوبین، عدالتِ عالیہ کے جج، مشیرانِ مملکت، روایتی جماعتوں اور کلیسا کے کارکن اور صنعت و تجارت اور بینکوں کے نمائندے تارگھر کے کونے پر جلوہ افروز ہوئے۔ گنجے اور علیل، صدرِمملکت عوام کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ عوام نے انہیں صدارت کا عہدہ سنبھالتے تو دیکھا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون اور کیسی ہستی ہیں، صرف آج وہاں انہیں دیکھ کر وہ ان کے بارے میں شہادت دینے کے اہل تھے۔ اپنی فرائض دہی کی متانت کے ہاتھوں نڈھال مذہبی عہدےداروں، اور چوڑے چکلے، تمغوں سے بوجھل سینوں والے فوجیوں کے درمیان چلتے پھرتے قائدِعوام کے پور پور سے قوت کے سرچشمے پھوٹتے معلوم ہوتے تھے۔ دوسری قطار میں ماتمی کریپ میں ملبوس خاموش قومی ملکائیں محوِ خشش تھیں۔ وہ ماضی حال، مستقبل کی ہر چیز کی ملکائیں تھیں اور آج پہلی بار اپنی ارضی شان و شوکت کے بغیر عالمی ملکہ کی رہنمائی میں پریڈ کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں لوبیے کی ملکہ، ہرے پیٹھے کی ملکہ، کیلوں کی ملکہ، یکّا کے پھلوں کی ملکہ، امرودوں کی ملکہ، ناریل کی ملکہ، مٹا کی پھلیوں کی ملکہ، چھپکلیوں کے انڈوں کے دو سو پچپن میل لمبے ہار کی ملکہ، اور بہت سی دوسری ملکائیں تھیں جن کا ذکر اس سرگزشت کی طوالت کے خوف سے حذف کر دیا گیا ہے۔

اس لمحے اپنے تابوت میں قرمزی کفن میں لپٹی بڑی ماما کو تابوت کے تانبے کے آٹھ کنڈوں نے دنیائےحقیقت سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ وہ جراثیم کش دواؤں سے وضع کی ہوئی ابدیت میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے اپنے جاہ و جلال کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ جاہ و حشم کے جو خواب وہ گرمی کی شدت سے پیداکردہ بےخوابی کی حالت میں اپنی حویلی کی بالکنی میں بیٹھ کر دیکھا کرتی تھی، وہ تمام خواب ان شہرۂ آفاق اڑتالیس گھنٹوں میں پورے ہو چکے تھے جن میں اس کے عہد کی ہر علامتی ہستی نے اسے خراجِ عقیدت پیش کیا تھا، حتیٰ کہ خود پاپائےاعظم نے بھی، جنہیں بڑی ماما اپنی ہذیانی کیفیت میں ویٹی کن کے باغات کے اوپر ایک نورانی بگھی میں پرواز کرتے دیکھا کرتی تھی، کھجور کے پتوں سے بنے چٹائی والے ایک دستی پنکھے کی مدد سے گرمی پر فتح حاصل کر لی تھی اور دنیا کے اس عظیم ترین جنازے کو اپنے برتر درجات سے سرفراز فرمایا تھا۔

طاقت کی اس نمائش سے مبہوت عوام کو اس حیرت انگیز سرگرمی کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا جو اس چوب پر رونما ہوئی جس پر حویلی کی چھت قائم تھی۔ اس سرگرمی کے نتیجے کے طور پر قصبے کے جھگڑالو بزرگوں کو مصالحت پر مجبور کر دیا گیا، اور اسی کی بدولت قصبے کا سب سے معمر بزرگ تابوت کو کندھا دے کر حویلی سے باہر لایا تھا۔ عوام میں سے کسی نے کندھوں کے ان چوکس سایوں کو بھی نہ دیکھا تھا جو ماکوندو کی گرمی سے تپی ہوئی تنگ گلیوں میں تابوت کی کڑی کے تعاقب میں رواں ہوئے تھے، اور نہ کسی کو یہ معلوم ہو کہ قصبے کے بزرگ اپنے جلو میں قصبے کے بازاروں میں مہلک گندگی کا کتنا طویل سلسلہ چھوڑ گئے ہیں۔ کسی کو یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ بڑی ماما کا جنازہ حویلی سے نکلتے ہی اس کے بھانجوں بھتیجوں، پوتوں دوہتوں، خادموں ملازموں اور پروردوں نے، حویلی کو بانٹنے کی غرض سے باہر کے دروازے بند کر کے اندرونی دروازے اکھاڑ ڈالے ان کے تختوں میں سے کیلیں نکال لیں اور دیواروں کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ لیکن ایک بات ایسی تھی جو جنازے کے غل غپاڑے کے باوجود کسی کی نظر سے اوجھل نہ رہی۔ اور یہ تھی کہ وہاں پر موجود جم غفیر نے، چودہ روز کی منت سماجت، وصف و ثنا اور بدمستانہ گائیکی کے اختتام پر اور پگھلے ہوئے سیسے سے بڑی ماما کی قبر کے سربمہر ہونے پر اطمینان کا زوردار سانس لیا تھا۔

اس موقعے پر موجود لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے [illegible] کی بدولت یہ محسوس کر چکے تھے [illegible] چکے ہیں [illegible] زندگی کی [illegible] [illegible] [illegible] کر سکتے تھے [illegible] صوابدید کے مطابق کاروبار حکومت چلا سکتے تھے اب تمام موجودہ اور [illegible] سکتی تھیں، خوش و خرم زندگی بسر کر سکتی تھیں [illegible] ہو سکتی تھیں اور [illegible] بیٹے پیدا کر سکتی تھیں اب عوام کھیم بندوں بڑی ماما کی [illegible] گئے تھے کیونکہ [illegible] [illegible] کی طاقت رکھتی تھی نہیں رہیں، پگھلے ہوئے سیسے کی [illegible] شروع ہو گئی تھی۔ صرف ایک کام باقی رہ گیا تھا جو یہ تھا کہ کوئی شخص [illegible] دروازے کے آگے ستون تکا کر بیٹھ جائے اور آئندہ نسلوں کے [illegible] پر بیان کر دے تاکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہ رہ جائے جو بڑی ماما کی کہانی کی شدید سے منکر ہو سکے کیونکہ کل بروز بدھ گندگی اٹھانے والا عملہ قصبے میں وارد ہو گا اور ان تمام کوڑے کرکٹ کو رہتی دنیا تک کے لیے سمیٹ کر لے جائے گا جو بڑی ماما کے جنازے کی بدولت ہر جانب پھیل چکا ہے۔

مختصر ناول "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" (No One Writes to the Colonel) حسن کا مکمل ترجمہ انتخاب کے اس حصے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مارکیز کی ہم زور ساختہ اور ذاتی طور پر پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ یہ خانہ جنگی کے ایک آزمودہ کار کرنل کی امید و بیم اور اس کی اپنی پنشن کے غیرمختتم انتظار کی کہانی ہے جو انتظار کی اس اذیت کو ہی دمے کی شکار بیوی اور ایک لڑاکا مرغ کے ساتھ بسر کر رہا ہے جو اس کے مقتول بیٹے کی نشانی ہے۔ ماہرانہ بیانیے کا یہ شاہکار جسے مارکیز نے پیرس کی لیٹن کوارٹرز میں واقع ایک سرد فلیٹ میں گزرے ہوئے عسرت اور کسمپرسی کے دنوں میں اپنے زیرتحریر ناول "منحوس وقت" پر کام روک کر تحریر کیا گیارہ مرتبہ لکھے جانے کے بعد اپنی حتمی شکل کو پہنچا، اور ۱۹۶۱ میں شائع ہوا۔

یہ ترجمہ اس سے قبل "چشم براہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور اسے "معاصر" (لاہور ۱۹۸۹) اور مترجم کے شکریے کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کافی کے ڈبے کا ڈھکنی اٹھانے پر کرنل کو پتا چلا کہ ڈبے میں صرف چمچ بھر کافی باقی ہے۔ اس نے کیتلی کو چولہے سے اتارا اور اس میں سے آدھا پانی مٹی کے فرش پر گرا دیا، پھر وہ چاقو لے کر ڈبے کی دیواروں پر لگی ہوئی کافی کُھرچنے لگا؛ کافی کے ساتھ زنگ بھی اتر اتر کر کیتلی میں گرنے لگا۔

جب کرنل، کافی اُبلنے کے انتظار میں، پتھر کے آتش دان کے سامنے، مطمئن مگر معصوم توقع کے ساتھ، بیٹھا تھا، اسے اپنی انتڑیوں میں کھمبیوں اور سوسن کے زہریلے پھولوں کے اگنے کا احساس ہوا۔ اکتوبر کا مہینہ آن پہنچا تھا۔ یہ ایک دُشوار صبح تھی، اس جیسے شخص کے لیے بھی جو ایسی بےشمار صبحیں گزار چکا تھا۔ تقریباً ساٹھ برس سے یعنی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد سے، کرنل نے سوائے انتظار کے کچھ نہ کیا تھا۔ اکتوبر کا مہینا اس کے پاس آنے والی گنی چنی چیزوں میں سے ایک تھا۔

کرنل کی بیوی نے اسے کافی کا پیالا اٹھائے خواب گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو مچھردانی کا کونا اٹھا دیا۔ پچھلی رات اسے دمے کا دورہ پڑا تھا اور وہ ابھی تک غنودگی کی حالت میں تھی۔ لیکن کافی کا پیالا لینے کے لیے اٹھ بیٹھی۔

"اور تمہاری کافی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں پی چکا ہوں،" کرنل نے جھوٹ بولا۔ "پھر بھی چمچ بھر کافی بچ رہی تھی۔" اسی وقت گرجے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ کرنل جنازے کے بارے میں بھول چکا تھا۔ جب اس کی بیوی کافی پی رہی تھی، اس نے اپنے جھولابچھونے کو ایک جانب سے اتار کر اور کول

کر کے پیچھے رکھ دیا۔ عورت کو مرنے والے کا خیال آیا۔

"وہ ۱۹۲۲ میں پیدا ہوا تھا" وہ بولی۔ "سات اپریل کو، ہمارے بیٹے کی پیدائش کے ایک ماہ بعد"

بے اکھڑے ہوئے سانسوں کے درمیانی وقفوں میں وہ کافی کے گھونٹ بھرتی رہی۔ اس کی حمیدہ، بےلوچ ریڑھ کی ہڈی پر بہت کم گوشت رہ گیا تھا۔ سانس لینے میں دشواری کے باعث اس کے سوالیہ فقرے بھی یوں لگتے تھے جیسے کوئی دعوا کیا جا رہا ہو۔ کافی ختم کرنے کے بعد بھی وہ مرنے والے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"اکتوبر کے مہینے میں دفنایا جانا کس قدر بھیانک ہوتا ہو گا" اس نے کہا۔ مگر اس کے خاوند نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ اکتوبر کا مہینا گھر کے صحن تک آ پہنچا تھا۔ سبزے کی بالیدگی پر غور کرتے ہوئے جو ہر جگہ گہرے سبز رنگ میں عیاں تھی، اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو دیکھتے ہوئے، جو کیچووں نے ہر سمت بنا رکھے تھے کرنل نے دوبارہ اپنی انتڑیوں میں اکتوبر کے نحوست زدہ مہینے کے وجود کو محسوس کیا۔

"میری ہڈیاں تک سیل گئی ہیں" اس نے کہا۔

"سردی کا موسم ہے" عورت نے جواب دیا۔ "جب سے بارشیں شروع ہوئی ہیں، میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ جرابیں پہن کر سویا کرو۔"

"ایک ہفتے سے تو پہن رہا ہوں۔"

بارش ہلکی ہلکی مگر لگاتار ہو رہی تھی۔ کرنل کا جی چاہا کہ اونی کمبل اوڑھ کر دوبارہ بستر میں جا لیٹے، مگر گرجے کی ٹوٹی ہوئی گھنٹیوں کی مسلسل آواز نے اسے جنازےکی یاد دلائی۔ "اف یہ اکتوبر!" اس نے سرگوشی میں کہا، اور کمرے کے وسط میں آ گیا۔ تب ہی اسے مرغ یاد آیا جو بستر کے پائے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ ایک لڑاکا مرغ تھا۔

کافی کا خالی پیالا باورچی خانےمیں رکھنے کے بعد کرنل نے پنڈولم والی گھڑی کو، جو بیٹھک کی دیوار پر لٹکی تھی، چابی دی۔ سونے کے کمرے کے برعکس جو خاصی تنگ تھی اور جس میں دمے کے مریض کا سانس گھٹتا محسوس ہوتا تھا، بیٹھک کشادہ اور ہوادار تھی۔ کمرے میں ایک چھوٹی میز کے اردگرد چار مضبوط جھولنے والی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر غلاف بچھا ہوا تھا اور اس پر مٹی کی بنی ہوئی بلّی رکھی تھی۔ گھڑی کے سامنے والی دیوار پر ایک تصویر تھی جس میں ایک عورت نے باریک کپڑے کا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ عورت کے اردگرد چھوٹے چھوٹے کیوپڈ گلابوں سے بھری کشتی میں بیٹھے تھے۔

جب کرنل نے گھڑی کو چابی دینا ختم کیا تو سات بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ مرغ کو باورچی خانے میں لے گیا، اسے چولھے کے پائے سے باندھ کر اس نے ڈبے کا پانی تبدیل کیا اور مٹھی بھر مکئی اس کے سامنے رکھی۔ صحن کی باڑھ کے ایک سوراخ میں سے محلے کے چند بچے اندر آ گئے اور خاموشی سے مرغ کے اردگرد بیٹھ کر اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

"مرغ کو ایسے مت گھورو" کرنل نے کہا۔ "مرغوں کو دیر تک یوں دیکھیں تو وہ گھس جاتے ہیں۔"

بچے وہیں بیٹھے رہے۔ ایک بچہ ماؤتھ آرگن پر ایک مشہور گیت کے سُر نکالنے لگا۔ "آج

اسے مت بجاؤ" کرنل نے اسے منع کیا۔ "قصبے میں ایک موت ہو گئی ہے" بچے نے باجا اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا، اور کرنل جنازے کے لیے تیار ہونے خواب گاہ میں چلا گیا۔

اس کی بیوی کے دمے کے دورے کے باعث اس کا سفید سوٹ استری نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے کرنل کو اپنا پرانا کالا سوٹ ہی پہننا پڑا، جو شادی کے بعد سے اب تک اس نے صرف چند خاص موقعوں ہی پر پہنا تھا۔ بڑے صندوق میں کپڑوں کے نیچے اخبار میں لپٹے ہوئے اس سوٹ کو ڈھونڈنے میں کرنل کو کچھ دقت ہوئی؛ کپڑوں کو کیڑوں سے بچانے کے لیے صندوق میں نفتالین کی گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرنل کی بیوی بستر میں دراز ابھی تک مرنے والے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"اب تک وہ ہمارے آگستین سے مل چکا ہو گا" وہ بولی۔ "ممکن ہے وہ ہمارے بیٹے کو یہ نہ بتائے کہ اس کے مرنے کے بعد سے ہمارا کیا حال ہے۔"

"اس وقت وہ دونوں شاید مرغوں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں گے" کرنل نے کہا۔

سُوٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کرنل کو صندوق میں ایک بڑی سی چھتری نظر آ گئی۔ یہ کرنل کی بیوی نے اس قرعہ اندازی میں جیتی تھی جو کرنل کی پارٹی کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی خاطر منعقد کی گئی تھی۔ تقریب کی رات، وہ گھر کے باہر بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے تھے جو بارش کے باوجود جاری رہا تھا۔ کرنل اس کی بیوی اور ان کے بیٹے آگستین نے — جو اس وقت آٹھ برس کا تھا — اس چھتری کے نیچے بیٹھ کر آخر تک تماشا دیکھا تھا۔ اب آگستین مر چکا تھا اور چھتری کی چمک دار ساٹن میں کیڑوں نے سوراخ کر دیے تھے۔

"ہماری سرکس کے مسخروں والی چھتری کا دیکھو کیا حال ہو گیا ہے" کرنل نے اپنا پرانا فقرہ دوہرایا۔ چھتری کو کھولنے پر اس کے اوپر بہت ساری پُراسرار سی سلاخیں نمودار ہو گئیں۔ "اب تو یہ صرف آسمان کے تارے گننے کے کام کی رہ گئی ہے۔"

وہ مسکرایا۔ مگر عورت نے مڑ کر چھتری کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ "ہر چیز کا یہی حال ہے" وہ سرگوشی میں بولی۔ "ہم خود جیتے جی گل سڑ رہے ہیں۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ مرنے والے کے بارے میں پورے انہماک سے سوچ سکے۔

ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر شیو کرنے کے بعد — کیوں کہ اس کے پاس عرصے سے کوئی آئینہ نہ تھا — کرنل نے خاموشی سے کپڑے پہنے۔ اس کی پتلون، جو اس کی ٹانگوں پر لمبے زیرجامے کی طرح کسی ہوئی تھی اور ٹخنوں پر فیتوں سے گانٹھ لگا کر بند کی جاتی تھی، کمر پر گردوں کے قریب اسی طرح کے فیتوں سے، جو ملمّع کیے ہوئے دو بکسوؤں میں سے گزرتے تھے سنبھلی رہتی تھی۔ کرنل پیٹی نہیں باندھتا تھا۔ اس کی قمیص جو میلا کے پرانے کاغذ کے رنگ کی تھی اور اسی جیسی سخت بھی تانبے کے کوں بٹن کے ساتھ کالر سے جوڑی جاتی تھی۔ قمیص کا الگ کالر اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ کرنل نے ٹائی لگانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کرنل ہر عمل اس طرح کر رہا تھا جیسے کوئی ارفع کام انجام دے رہا ہو۔ اس کی انگلیوں کے جوڑوں کی کھنچی ہوئی اور شفاف کھال پر سفید دھبے تھے جیسے اس کی گردن کی کھال پر تھے۔ اپنے نقلی چمڑے کے جوتے پہننے سے پہلے اس نے ان کی سیونوں میں گھسی ہوئی خشک مٹی کو کھرچ کر صاف کیا۔ اس کی بیوی نے اس وقت اسے دیکھا، اس نے وہی لباس پہن رکھا

تھا جو شادی کے روز پہنا تھا۔ تب ہی اس کی بیوی کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر عمر رسیدہ ہو چکا ہے۔

"یوں لگتا ہے جیسے تم کسی خاص موقع کے لیے ہی سج سنور رہے ہو،" وہ بولی۔

"یہ جنازہ ایک خاص موقع ہی ہے،" کرنل نے کہا۔ "برسوں بعد اس قصبے میں یہ پہلا آدمی ہے جو طبعی موت مرا ہے۔"

نو بجے کے بعد مطلع صاف ہو گیا۔ کرنل باہر نکلنے کے لیے تیار تھا جب اس کی بیوی نے اسے آستین سے پکڑ لیا۔

"بالوں میں کنگھی کر لو،" اس نے کہا۔

کرنل نے اپنے فولاد کے رنگ کے سخت بالوں کو کنگھی سے بٹھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

"میں ضرور طوطے جیسا لگ رہا ہوں گا،" اس نے کہا۔

عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ طوطے کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔ کرنل اکہرے جسم کا آدمی تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ نٹ بولٹ سے کس کر تیار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جان تھی، جس کے بغیر وہ شاید فارمالین میں محفوظ کیا ہوا نمونہ لگتا۔

"تم ٹھیک لگ رہے ہو،" اس نے جواب دیا، اور جب کرنل گھر سے باہر قدم رکھنے لگا تو اضافہ کیا، "ڈاکٹر سے ملو تو پوچھنا کہ کیا ہم نے کبھی اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا ہے۔"

کرنل اور اس کی بیوی قصبے کے سرے پر ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جس کی چھت پر کھجور کے پتوں کا چھپر تھا اور دیواروں سے چونا گرتا رہتا تھا۔ اس وقت ہوا میں نمی اسی طرح تھی لیکن بارش بند ہو چکی تھی۔ کرنل ایک تنگ گلی میں سے گزر کر جس کے دونوں جانب گھر تھے، قصبے کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ بڑی سڑک پر پہنچا تو اسے کپکپی سی آئی۔ سڑک پر جہاں تک نظر جاتی تھی پھولوں کا فرش بچھا تھا۔ گھروں کی دہلیزوں پر کالے کپڑوں میں ملبوس عورتیں جنازے کے گزرنے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

جب کرنل چوک میں پہنچا تو بوندا باندی پھر شروع ہو گئی۔ بلیرڈ ہال کے مالک نے اپنے دروازے میں سے کرنل کو آتے دیکھا، اور وہیں سے بازو پھیلا کر چلایا،

"کرنل! ٹھہرو میں تمھیں اپنی چھتری دے دوں۔"

کرنل نے مڑے بغیر اسے جواب دیا۔

"شکریہ۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

جنازے کا جلوس ابھی گرجے سے باہر نہیں آیا تھا۔ مرد، سفید لباس پر کالی ٹائیاں لگائے، نیچی چھتوں والے دروازوں میں اپنی اپنی چھتریوں کے نیچے کھڑے باتوں میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کرنل کو چوک میں پانی اور کیچڑ کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ پھلانگتے دیکھا۔

"ادھر چھتری کے نیچے آ جاؤ دوست!" اس نے پکار کر کہا۔

اس نے کرنل کے لیے چھتری کے نیچے جگہ بنائی۔

"مہربانی، دوست،" کرنل نے کہا۔

لیکن اس نے دعوت قبول نہ کی۔ وہ سیدھا مرنے والے کے گھر میں داخل ہو گیا تاکہ اس کی ماں سے تعزیت کر سکے۔ وہاں جس چیز کا اسے سب سے پہلے احساس ہوا وہ مختلف پھولوں کی مہک تھی۔ پھر گرمی کی ایک لہر اٹھی۔ لوگوں کے درمیان میں سے راستا بنا کر کرنل نے سونے کے کمرے کی طرف جانا چاہا۔ مگر کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا، اور اسے، لوگوں کے متعجب چہروں کے درمیان سے، کمرے کے عقبی حصے کی طرف دھکیلنے لگا، جہاں مرنے والا کھلے اور گہرے نتھنوں کے ساتھ پایا گیا تھا۔

مرنے والے کی ماں وہاں کھڑی ہوئی کھجور کے پنکھے سے لاش پر سے مکھیاں اڑا رہی تھی۔ دوسری عورتیں کالے کپڑے پہنے لاش کو ایسی ہی محویت سے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی دریا کے دھارے کو دیکھتا ہے۔ یکدم کمرے کے دوسری جانب سے کسی کی آواز آئی۔ کرنل ایک عورت کو ہاتھ سے پرے ہٹا کر مرنے والے کی ماں کے قریب جا پہنچا، اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے بہت افسوس ہے،" وہ بولا۔

عورت نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے منہ کھول کر زور سے چیخ ماری۔ کرنل لرز اٹھا۔ اسے لگا کہ تھرتھراتی آواز میں آہ و زاری کرتا ہوا بے ہنگم ہجوم اسے لاش کی جانب دھکیل رہا ہے۔ اس نے کسی مضبوط چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر اس کے نزدیک کہیں کوئی دیوار نہ تھی۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ کسی نے اس کے کان میں آہستہ سے سرگوشی کی، "کرنل! احتیاط سے۔" کرنل نے سر گھمایا اور اپنے سامنے مرنے والے کو پایا۔ لیکن کرنل نے اسے نہیں پہچانا کیونکہ وہ سفید کپڑوں میں ملفوف، بگل ہاتھ میں لیے، اکڑا ہوا اور متحرک تھا، اور کرنل ہی کی طرح گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ جب کرنل نے تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر اپنا چہرہ اوپر کیا تو اس نے دیکھا کہ بند تابوت سوزنیوں سے پھسلتا پھولوں کو کچلتا ہوا نیچے آ رہا ہے۔ اسے پسینا آ گیا۔ اس کے جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ باہر گلی میں کھڑا ہے، کیونکہ بارش کے قطرے پلکوں پر گرنے سے اسے تکلیف محسوس ہوئی۔ کسی نے اسے بازو سے پکڑ لیا، اور کہا،

"جلدی کرو دوست، میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔"

یہ سباس تھا، اس کے مرحوم بیٹے کا دینی باپ، اور پارٹی کا واحد رہنما جو سیاسی مکافات سے بچ نکلا تھا اور قصبے ہی میں مقیم تھا۔ "شکریہ، دوست،" کہہ کر کرنل اس کی چھتری کے نیچے آ گیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بینڈ ماتمی دھن بجانے لگا۔ کرنل نے بینڈ میں بگل بجانے والے کو موجود نہ پایا، اور تب پہلی بار مکمل طور پر یقین ہوا کہ مرنے والا واقعی مر چکا ہے۔

"بیچارہ!" اس نے آہستہ سے کہا۔

سباس نے اپنا گلا صاف کیا۔ وہ چھتری کو بائیں ہاتھ میں یوں تھامے ہوئے تھا کہ چھتری کا دستہ اس کے سر کے برابر پہنچ رہا تھا، کیونکہ اس کا قد کرنل سے چھوٹا تھا۔ جب جنازہ

چوک سے باہر آیا تو دونوں باتیں کرنے لگے۔ تب سباباس کرنل کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ اس نے کرنل سے پوچھا:

"دوست، مرغ کی کیا خبر ہے؟"

"ابھی تک موجود ہے۔" کرنل نے جواب دیا۔

عین اس وقت کسی کے زور سے بولنے کی آواز سنائی [illegible]۔

"یہ لوگ جنازے کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

کرنل نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اسے بیرک کی بالکنی پر قصبے کا میئر پھیل کر کھڑا نظر آیا۔ وہ اپنے فلالین کے سپے زیرجامے میں ملبوس تھا۔ اس کا ایک گال سوجا ہوا تھا اور اس نے اس گال کی حجامت نہیں بنوائی تھی۔ ایک لمحے بعد کرنل کو فادر اینجل کی چیخ کر میئر سے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ چہرے پر بارش کی ٹپ ٹپ کے باوجود کرنل نے گفتگو کی غایت سمجھ لی۔

[illegible] اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" کرنل نے جواب دیا۔ "جنازے کو پولیس کی بیرکوں کے سامنے سے گزرنے کی [illegible]"

"ہاں میں بھول گیا تھا۔" سباباس بولا۔ "میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ مارشل لا لگا ہوا ہے۔"

"[illegible] یہ کوئی سیاسی باغیوں کا جلوس ہے؟ ایک بے چارے غریب موسیقار کا جنازہ [illegible]"

جلوس نے راستہ تبدیل کر لیا۔ غریب محلوں میں عورتیں جنازے کو گزرتے خاموشی سے دیکھتی رہیں اور دانتوں سے ناخن کترتی رہیں، مگر تھوڑی دیر بعد وہ سڑک کے درمیان میں آ گئیں اور تحسین، تشکر اور الوداع کے نعرے لگانے لگیں، جیسے ان کے خیال میں مرنے والا تابوت کے اندر ان کی باتیں سن رہا ہو۔ قبرستان میں پہنچ کر کرنل نے خود کو بیمار محسوس کیا۔ جب سباباس نے اسے دیوار کی طرف دھکیل کر تابوت برداروں کے لیے راستا بنایا تو اس نے مسکرا کر کرنل کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر ایک جامد تاثر تھا۔

"کیا بات ہے دوست؟" سباباس نے پوچھا۔

کرنل نے آہ بھری۔

"وہی اکتوبر کی مصیبت"

وہ اسی سڑک سے واپس آئے جس سے قبرستان گئے تھے۔ مطلع اب صاف ہو چکا تھا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ اب شاید بارش نہیں ہو گی، کرنل نے سوچا اور اس کی طبیعت جیسے بحال ہو گئی۔ لیکن وہ اب تک افسردہ تھا۔ سباباس کی بات نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

"ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟"

"میں بیمار نہیں ہوں۔" کرنل نے کہا۔ "صرف اکتوبر میں ایسا لگتا ہے جیسے میری انتڑیوں میں جاندار پل رہے ہوں۔"

"آہ!" سباباس کے منہ سے نکلا۔ اس نے کرنل کو اپنے گھر کے دروازے پر خداحافظ کہا۔ اس کا مکان نیا اور دومنزلہ تھا، جس کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ کرنل اپنے سوٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن نکڑ کی دکان سے کافی کا ڈبا اور مرغ کے لیے آدھ پونڈ مکئی خریدنے کے لیے اسے ایک بار پھر گھر سے نکلنا پڑا۔

جمعرات کے روز وہ عموماً اپنے جھولے میں لیٹا رہتا تھا، لیکن اس جمعرات کو وہ سارا دن مرغ کی تواضع میں لگا رہا۔ بارش کئی دن سے ہو رہی تھی۔ پورے ہفتے اس کی انتڑیوں میں نباتات اگتے رہے تھے۔ اس کی کئی راتیں بیوی کے دمے کی سیٹیوں کے باعث بےخوابی میں گزری تھیں، لیکن جمعے کی سہ پہر کو اکتوبر نے اپنی معرکہ آرائی سے توقف کر لیا تھا۔ اگستین کے ساتھی — جو اس کے ساتھ درزی کی دکان پر کام کرتے رہے تھے اور مرغوں کی لڑائی کے رسیا تھے — موقعے سے فائدہ اٹھا کر مرغ کا معائنہ کرنے چلے آئے۔ وہ اچھی حالت میں تھا۔

لڑکوں کے رخصت ہونے کے بعد جب کرنل اکیلا رہ گیا تو خواب گاہ میں لوٹ آیا۔ اس کی بیوی کی طبیعت بھی آج قدرے بہتر تھی۔

"لڑکے کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت جوش وخروش دکھا رہے تھے۔" کرنل نے اسے اطلاع دی۔ "سب کے سب مرغ پر لگانے کے لیے پیسے بچا رہے ہیں۔"

"خدا جانے اس بدصورت مرغ میں سب کو کیا نظر آتا ہے؟" عورت بولی۔ "مجھے تو وہ عجیب الخلقت لگتا ہے۔ اس کا سر ٹانگوں کے لحاظ سے کتنا چھوٹا ہے۔"

"سب کہتے ہیں کہ ایسا مرغ سارے علاقے میں نہیں ہے۔" کرنل نے جواب دیا۔ "کم ازکم پچاس پیسو کے برابر قیمت ہے اس کی۔"

کرنل کو یقین تھا کہ اس دلیل میں، اس کے مرغ کی دیکھ بھال جاری رکھنے کے عزم کا مکمل جواز موجود ہے۔ مرغ ایک لحاظ سے ان کے بیٹے کی وراثت تھا۔ اگستین کو مرغوں کی لڑائی کے دن ہی آج سے نو ماہ قبل ممنوعہ لٹریچر بانٹتے ہوئے گولی مار دی گئی تھی۔ "یہ ایک مہنگی خام خیالی ہے۔" عورت نے کہا۔ "مکئی ختم ہونے کے بعد ہم اسے اپنا کلیجہ ہی کھلا کر پال سکیں گے۔" الماری میں اپنے کپڑے ڈھونڈنے کے دوران کرنل نے سوچنے کے لیے کافی وقت لیا۔

"چند مہینوں کی بات ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "جنوری میں مرغوں کی لڑائی ہے۔ اس کے بعد ہم اسے زیادہ قیمت پر فروخت کر سکیں گے۔"

کرنل نے جو پتلون صندوق سے نکالی اسے استری کی ضرورت تھی۔ عورت نے پتلون کو چولھے کے اوپر پھیلا دیا، جہاں دو استریاں دہکتے ہوئے کوئلوں پر گرم ہو رہی تھیں۔

"باہر جانے کی کیا جلدی ہے تمھیں؟" اس نے پوچھا۔

"ڈاک کا دن ہے۔"

"ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آج جمعہ ہے۔" اس نے سونے کے کمرے میں واپس جاتے

ہوئے تبصرہ کیا۔ کرنل نے پتلون کے سوا باقی سب کپڑے پہن لیے تھے۔ اس کی بیوی نے اس کے جوتوں کی طرف دیکھا۔

"یہ تو اب پھینکنے کے لائق ہیں،" وہ بولی۔ "بہتر ہے کہ وہی نقلی چمڑے کے جوتے پہنے رہو۔"

کرنل کو سخت ناامیدی محسوس ہوئی۔

"وہ کسی یتیم کے جوتے دکھائی دیتے ہیں" اس نے احتجاج کیا۔ "میں جب بھی انھیں پہنتا ہوں کسی پاگل خانے سے بھاگا ہوا لگتا ہوں۔"

"ہم اپنے بیٹے کے یتیم ہی تو ہیں،" عورت نے کہا۔

اس بار بھی اس نے کرنل کو قائل کر لیا۔ لانچوں کے سیٹیاں بجانے سے قبل ہی کرنل بندرگاہ تک پیدل پہنچ گیا۔ وہ نقلی چمڑے کے جوتوں، بغیر پیٹی کی تنگ موری والی سفید پتلون اور بغیر کالر کی قمیص میں ملبوس تھا جو گردن پر تانبے کے بٹن سے بند کی گئی تھی۔ موسی شامی کی دکان پر سے وہ لانچوں کو یکے بعد دیگرے ساحل تک آتے دیکھتا رہا۔ آٹھ گھنٹوں کی بےحرکتی سے اکڑے ہوئے مسافر اترے۔ اترنے والے وہی تھے جو ہمیشہ اترا کرتے تھے؛ یعنی گھر گھر جا کر چیزیں بیچنے والے اور وہ لوگ جو پچھلے جمعے کو قصبے سے گئے تھے اور اب واپس آ رہے تھے۔

آخری لانچ ڈاک والی لانچ تھی۔ کرنل نے اذیت ناک بےچینی سے اسے کنارے پر لگتے دیکھا۔ اسی لانچ کی چھت پر چمنی سے بندھا ہوا، روغنی کپڑے میں لپٹا ڈاک کا تھیلا دکھائی دیا۔ پندرہ برس کے انتظار نے اس کے وجدان کو تیز کر دیا تھا۔ مرغ نے اس کی بےچینی میں اضافہ کر دیا تھا۔ جب پوسٹ ماسٹر لانچ پر گیا اور تھیلے کو کھول کر اپنے کندھے پر رکھا، کرنل اس پر مستقل نظریں جمائے رہا۔

پھر وہ بندرگاہ کے متوازی سڑک پر، جو دکانوں اور اسٹالوں کی ایک بھول بھلیّاں تھی جس میں رنگ برنگی چیزیں سجی ہوئی تھیں، پوسٹ ماسٹر کے پیچھے چلنے لگا۔ ہر بار اس مرحلے سے گزرتے ہوئے اسے خوف سے مختلف، مگر اتنی ہی جابرانہ، بےچینی کا احساس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ڈاک خانے میں اپنے اخباروں کا منتظر تھا۔

"میری بیوی نے کہا ہے کہ میں تم سے دریافت کروں کہ کیا تم ہی، جب تم ہمارے مہمان تھے، تمھارے سر پر گھومتا ہوا پانی پھینکا تھا؟" کرنل نے کہا۔

ڈاکٹر جوان آدمی تھا اور اس کا سر کالے اور چمکدار بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے دانتوں کی ہمواری میں کوئی ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس نے کرنل سے دمے کی مریضہ کا حال پوچھا۔ کرنل نے اپنی بیوی کے دمے کی مکمل رپورٹ دی لیکن اس دوران میں پوسٹ ماسٹر پر مستقل نظریں جمائے رہا جو تھیلے میں سے خط نکال کر لکڑی کے چوکور ڈبوں میں رکھ رہا تھا۔ اس کی آہستہ روی سے کرنل برانگیختہ ہوتا رہا۔

ڈاکٹر نے اپنے خط اور اخبار وصول کیے۔ دواؤں کے اشتہار اس نے ایک جانب رکھ دیے۔ پھر وہ اپنے ذاتی خطوط دیکھنے لگا۔ اس عرصے میں پوسٹ ماسٹر ان لوگوں میں جو ڈاک خانے میں موجود تھے، ڈاک بانٹتا رہا۔ کرنل نے اس خانے کو دیکھا جس پر اس کے نام کا پہلا حرف

درج تھا۔ اس میں نیلے کناروں والا ہوائی ڈاک کا ایک لفافہ پڑا تھا جسے دیکھ کر کرنل کے اعصابی تناؤ میں اضافہ ہونے لگا۔

ڈاکٹر نے اخباروں کے بنڈل پر لگی مہر کو توڑا۔ وہ اخبار کی سرخیاں پڑھنے لگا، جبکہ کرنل، اپنے نام والے خانے پر نظریں جمائے پوسٹ ماسٹر کے اس خانے کے آگے رکنے کا منتظر رہا۔ مگر پوسٹ ماسٹر اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔ ڈاکٹر نے اخبار کا مطالعہ روک کر کرنل کو، اور پھر پوسٹ ماسٹر کو دیکھا جو اب ٹیلیگراف کے آلے کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے پھر کرنل کو دیکھا۔

"ہم جا رہے ہیں،" وہ بولا۔

پوسٹ ماسٹر نے سر اٹھائے بغیر کہا:

"کرنل کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

کرنل کو خفّت کا احساس ہوا۔

"مجھے ڈاک کی توقع بھی نہیں تھی،" اس نے جھوٹ بولا۔ پھر ڈاکٹر کی طرف مڑ کر وہ بالکل بچوں کے سے لہجے میں بولا: "مجھے کوئی خط نہیں لکھتا۔"

وہ دونوں خاموشی سے لوٹ گئے۔ ڈاکٹر کی توجہ ابھی اخبار ہی پر تھی۔ کرنل اپنے مخصوص انداز میں چل رہا تھا، کسی ایسے شخص کے انداز میں جو زمین پر کھویا ہوا سکہ ڈھونڈنے کے لیے اپنے راستے پر واپس آ رہا ہو۔ یہ ایک دھوپ بھری روشن سہ پہر تھی۔ چوک میں بادام کے درختوں سے آخری گلےسڑے پتے گر رہے تھے۔ جب وہ دونوں ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے پر پہنچے تو اندھیرا چھانے لگا تھا۔

"خبروں میں کیا ہے؟" کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں چند اخبار تھما دیے۔

"کوئی نہیں جانتا،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "جو خبریں سنسر کی زد سے بچ جاتی ہیں، ان کے بین السطور پڑھنے سے بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔"

کرنل نے اخبار کی سرخیاں پڑھیں جو سب بین الاقوامی خبروں کی تھیں۔ اوپر چار کالم میں نہر سویز پر رپورٹ تھی۔ پہلا صفحہ تقریباً سارے کا سارا مرگ اور جنازوں کے اشتہاری اعلانات سے بھرا ہوا تھا۔

"الیکشن ہونے تو ناممکن ہیں،" کرنل نے کہا۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو کرنل" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہماری زندگی میں تو کسی مسیحا کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے۔"

کرنل نے ڈاکٹر کو اخبار واپس کرنے چاہے، مگر ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔

"گھر لے جاؤ" اس نے کہا۔ "پڑھ کر کل صبح واپس کر دینا۔"

سات بجے کے بعد فلم سنسر کی درجہ بندی کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ فادر اینجل کا دستور تھا کہ گرجے کے مینار سے گھنٹیوں کے ذریعے، ڈاک سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق، فلموں کی اخلاقی درجہ بندی کا اعلان کیا کرتا تھا۔ اس شام کرنل کی بیوی نے بارہ گھنٹیاں سنیں۔

"سنیما کے لیے نامناسب،" اس نے کہا۔ "سال ہو چلا ہے کوئی فلم ایسی نہیں آئی جسے لوگ دیکھ سکیں۔"

مچھردانی گراتے ہوئے اس نے منہ ہی منہ میں کہا، "ساری دنیا کا اخلاق خراب ہو گیا ہے۔" کرنل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے اس نے مرغ کو بستر کے پائے سے باندھ دیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور خواب گاہ میں کیڑے‌مار دوا چھڑکی۔ پھر لیمپ فرش پر رکھا، اپنا جھولنا لٹکایا اور لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

اس نے سب اخبار ترتیب وار، پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھے۔ حتیٰ کہ اشتہار بھی پڑھ ڈالے۔ گیارہ بجے کرفیو کا بگل بجا۔ آدھ گھنٹے بعد کرنل نے اخبارات کا مطالعہ ختم کیا، اٹھ کر صحن کا دروازہ کھولا اور گھپ اندھیری رات میں باہر نکل کر دیوار کے ساتھ لگ کر پیشاب کیا۔ مچھر اس کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ جب وہ خواب گاہ میں واپس آیا تو اس کی بیوی جاگ رہی تھی۔

"ریٹائرڈ جنگی سپاہیوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" کرنل نے اپنے بستر میں دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "پہلے کم از کم نئے پنشن حاصل کرنے والوں کی فہرست ہی شائع کر دیا کرتے تھے۔ پانچ سال سے وہ بھی چھپنی بند ہو گئی ہے۔"

آدھی رات کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ کرنل تھوڑی دیر تو سویا مگر پھر اپنی انتڑیوں کے خوف سے جاگ گیا۔ کمرے کی چھت کہیں سے ٹپک رہی تھی۔ وہ اپنے‌آپ کو اونی کمبل میں کانوں تک لپیٹ کر ادھر ادھر ٹپکاؤ کے مقام کو ڈھونڈتا رہا۔ ٹھنڈے پسینے کی ایک لکیر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بہنے لگی۔ اسے بخار تھا۔ اسے لگا جیسے وہ جیلی کے تالاب میں چکر کھا رہا ہو۔ کوئی بولا۔ اپنے انقلابی بستر سے کرنل نے اسے جواب دیا۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"اس انگریز سے جو چیتے کا بھیس بدل کر کرنل اوریلیانو بوئندیا کے کیمپ میں آ گیا تھا۔" کرنل نے جواب دیا۔ اس نے بخار میں تپتے ہوئے، اپنے بستر میں کروٹ لی۔ "وہ ڈیوک آف مارلبرو تھا۔"

صبح تک آسمان صاف ہو گیا تھا۔ گرجے کی عبادت کی دوسری گھنٹی بجنے پر وہ جھولنے سے کود کر اتر آیا، اور ایک الجھی ہوئی حقیقی دنیا میں پاؤں جمانے لگا جسے مرغ کی بانگ اور الجھا رہی تھی۔ اس کا سر اب تک چکرا رہا تھا۔ اسے متلی ہو رہی تھی۔ وہ صحن میں چلا گیا اور موسم سرما کی دھیمی سرگوشیوں اور گہری خوشبوؤں میں سے گزر کر غسل خانے کی طرف لپکا۔ جستے کی چھت والے، لکڑی کے تختوں کے بنے غسل خانے کے اندر اَمونیا کی بُو سے ہوا لطیف ہو گئی تھی۔ کرنل نے پیشاب کی نالی کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں سے ہزاروں مکھیاں ایک تکونے بادل کی صورت میں برآمد ہوئیں۔

اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ کھردرے تختوں پر اکڑوں بیٹھے ہوئے، اسے کسی خواہش میں ناکامی کا احساس ہوا۔ اس کے اعصابی‌تناؤ میں اب گند سے درد نے جگہ پا لی تھی۔ "یہ اکتوبر میں ہی ہوتا ہے،" وہ بڑبڑایا۔ لیکن جب تک اس کی انتڑیوں میں اگنے والی کھمبیوں کو سکون نہ آیا، وہ پُراعتماد اور معصوم توقع کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ آخرکار مرغ کو دیکھنے کی

خاطر وہ واپس خواب گاہ میں لوٹ آیا۔

"کل رات بخار سے تمہیں ہذیان ہو رہا تھا،" اس کی بیوی نے کہا۔

ہفتے بھر کے دمے کے دورے کے ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کر کمرے کی صفائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ کرنل نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"بخار نہیں تھا،" اس نے جھوٹ بولا۔ "مجھے دوبارہ مکڑی کے جالوں کے خواب آ رہے تھے۔"

ہمیشہ کی طرح عورت دمے کے دورے کے اختتام پر اعصابی قوت اور جوش سے بھرپور تھی۔ پوری صبح وہ سارے مکان کو الٹ پلٹ کرتی رہی۔ گھڑی اور نوجوان لڑکی کی تصویر کے علاوہ اس نے ہر چیز کی جگہ تبدیل کر دی۔ وہ اتنی دبلی اور کھنچی ہوئی بدن کی تھی کہ جب اپنے کپڑے کے چپلوں اور ہر سمت سے بند کالے لباس میں چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے اس میں دیواروں کے پار نکل جانے کی قوت ہو۔ لیکن بارہ بجنے سے پہلے اس کے وجود نے، جو بستر میں چند انچ سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتا تھا، اپنا تن وتوش اور انسانی وزن دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اب، بیگونیا اور فرن کے گملوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی موجودگی سے پورا گھر معمور معلوم ہوتا تھا۔ "اگر آگسٹین کے سوگ کا برس پورا ہو گیا ہوتا تو آج میں گانا گاتی،" اس نے ہنڈیا میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا، جس میں منطقہ حارہ میں اگنے والی ہر سبزی کٹی ہوئی تھی اور پک رہی تھی۔

"گانے کو جی چاہ رہا ہے تو ضرور گاؤ،" کرنل نے کہا۔ "یہ تمہاری تلّی کے لیے بھی مفید ہو گا۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد ڈاکٹر آیا۔ کرنل اور اس کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے، جب اس نے دھکیل کر گلی والا دروازہ کھولا اور آواز لگائی،

"کیا سب فوت ہو چکے ہیں؟"

کرنل اسے خوش‌آمدید کہنے کو اٹھا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے،" بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم نے بھی اپنی گھڑی گدھوں سے ملا رکھی ہے۔"

عورت معائنے کے لیے تیار ہونے خواب گاہ میں چلی گئی۔ ڈاکٹر کرنل کے ساتھ بیٹھک ہی میں رہا۔ گرمی کے باوجود ڈاکٹر کے لنن کے کپڑوں میں تازگی کی مہک تھی۔ جب عورت نے اعلان کیا کہ وہ تیار ہے تو ڈاکٹر نے کرنل کو کاغذ کے تین پرچے دیے جو ایک لفافے میں بند تھے۔ "یہ وہ خبریں ہیں جو کل اخباروں نے شائع نہیں کی تھیں،" اس نے کہا، اور خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

کرنل کو اندازہ تھا۔ ان میں ملکی حالات کا خلاصہ تھا جو خفیہ ترسیل کی خاطر میمیوگراف کیا گیا تھا۔ ملک کے اندرونی حصوں میں مسلح بغاوت کے بارے میں چند نئے انکشافات۔ اس نے خود کو نہایت شکست خوردہ آدمی محسوس کیا۔ دس سال تک خفیہ خبریں پڑھنے کے باوجود وہ یہ سمجھنے کے قابل نہ ہوا تھا کہ ہر نئی خبر گزشتہ خبروں سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ جب تک ڈاکٹر واپس آیا وہ کاغذات پڑھنا ختم کر چکا تھا۔

"میری یہ مریضہ تو مجھ سے بھی زیادہ صحت مند ہے،" اس نے کہا۔ "مجھے ایسا دمہ ہو

تو سو برس تک جی سکتا ہوں۔"

کرنل پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہے بغیر لفافہ اسے واپس کرنا چاہا، مگر ڈاکٹر نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔

"آگے بڑھا دینا۔" اس نے کہا۔

کرنل نے لفافے کو پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ عورت خواب گاہ سے باہر آئی، اور بولی، "مجھے پتا ہے کسی روز میں بیٹھے بیٹھے مر جاؤں گی، اور تمھیں بھی ساتھ لے کر جہنم میں جاؤں گی، ڈاکٹر۔" ڈاکٹر نے حسب معمول اپنی بتّیسی دکھا کر خاموشی سے بات کی داد دی۔ پھر وہ کرسی گھسیٹ کر میز کے نزدیک بیٹھ گیا، اور اپنے چرمی تھیلے میں سے دواؤں کے مفت نمونوں کی بہت سی شیشیاں نکال لیں۔ عورت باورچی خانے میں چلی گئی۔

"کافی گرم کر رہی ہوں۔ پی کر جانا۔" اس نے وہاں سے کہا۔

"نہیں، بہت بہت شکریہ۔" ڈاکٹر بولا۔ وہ ایک کاغذ پر دواؤں کی ترکیب استعمال لکھ رہا تھا۔ "میں تمھیں موقع نہیں دوں گا کہ تم مجھے زہر پلاؤ۔"

وہ باورچی خانے میں بیٹھی ہنستی رہی۔ ڈاکٹر نے لکھنا بند کیا اور بلند آواز سے اپنی لکھی کو پڑھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا لکھا کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ کرنل نے غور سے ڈاکٹر کی ہدایات سننے کی کوشش کی۔ باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے عورت کو اس کے چہرے پر گزشتہ رات کی ذہنی کیفیت کے اثرات دکھائی دیے۔

"آج صبح اسے بخار تھا۔" اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "رات میں دو گھنٹے تک یہ خانہ جنگی کے بارے میں الٹی سیدھی بانکتا رہا۔"

کرنل یہ سن کر چونکا۔

"نہیں بخار نہیں تھا۔" اس نے اپنی بڑبڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اصرار کیا۔ "جس دن بیمار ہوں گا، خود ہی اپنے آپ کو کوڑےدان میں ڈال دوں گا۔"

وہ اٹھ کر خواب گاہ میں سے اخبار لانے چلا گیا

"تعریف کا شکریہ۔" ڈاکٹر نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے نکل کر چوک کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج ہوا میں خشکی تھی۔ گرمی سے سڑکوں پر بچھا تارکول پگھلنے لگا تھا۔ جب ڈاکٹر نے کرنل کو الوداع کہا تو کرنل نے اس سے اس کی فیس کے بارے میں پوچھا۔

"فی الحال کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔" اس نے کرنل کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مرغ جیت جائے گا تو بڑا سا بل بھیج دوں گا۔"

کرنل اگستین کے ساتھیوں کو خفیہ اخبار پہنچانے درزی کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب سے کرنل کے اپنے رفیق اور حامی جنگی کے شریک کار مارے گئے یا ملک بدر کر دیے گئے تھے اور اس کا اپناکام جمعے کے جمعے خط کا انتظار کرنا رہ گیا تھا، درزی کی دکان ہی اس کی واحد پناہ گاہ تھی۔

سہ پہر کی گرمی کے باعث کرنل کی بیوی کی قوت بحال ہو گئی تھی۔ برامدے میں بیگونیا کے گملوں کے پاس بیٹھے پرانے کپڑوں کا صندوقچہ سامنے رکھے، وہ پھر کسی سامان کی مدد کے

نئے لباس تیار کرنے کے ابدی معجزے میں مستغرق تھی۔ وہ پرانی قمیصوں کی آستینوں میں سے کالر، اور چھوٹی چھوٹی، کو مختلف رنگوں کی، کترنوں میں سے پیوند بنا رہی تھی۔ ایک جھینگر نے دالان میں اپنا راگ الاپنا شروع کیا۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ مگر اس نے اسے بیگونیا کے پودوں کے پیچھے غروب ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جب شام ڈھلے کرنل گھر واپس آیا تب اس نے اپنا سلائی کا شغل بند کیا۔ اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں اور بولی،

"میری گردن تختےکی طرح اکڑ گئی ہے۔"

"تمھاری گردن ہمیشہ سے ایسی ہی ہے۔" کرنل نے کہا، مگر جب اس نے اپنی بیوی کے کپڑوں اور جسم پر چاروں طرف چھوٹی چھوٹی رنگ دار کترنیں دیکھیں تو اضافہ کیا، "تم نیل کنٹھ کے گھونسلے میں سے نکلی لگتی ہو۔"

"تمھارا لباس تیار کرنے کے لیے آدھا نیل کنٹھ تو بننا ہی پڑتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اس نے تین مختلف رنگوں کے کپڑوں سے تیار کی ہوئی کرنل کی قمیص اسے دکھائی؛ صرف قمیص کے کالر اور آستین کے لیے ایک ہی رنگ کا کپڑا استعمال کیا گیا تھا۔ "کارنیوال میں مسخرہ بننے کے لیے تمھیں صرف اپنا کوٹ اتارنے کی ضرورت ہو گی۔"

گرجے سے چھ بجے شام کی گھنٹیاں اس کی بات میں دخل انداز ہوئیں۔ "خداوند خدا کے فرشتے نے مریم کو خبر دی۔" اس نے بلند آواز میں دعا پڑھنی شروع کی اور خواب گاہ کی جانب چلی گئی۔ کرنل دالان میں بیٹھا بچوں سے باتیں کرتا رہا جو اسکول کی چھٹی ہونے پر مرغ کو دیکھنے پھر آ گئے تھے۔ تب اسے یاد آیا مرغ کے لیے اگلے روز کی مکئی نہیں تھی، اور وہ اپنی بیوی سے پیسے لینے اندر چلا گیا۔

"میرا خیال ہے صرف پچاس سینٹ باقی ہیں۔" وہ بولی۔

وہ پیسے گدے کے نیچے، رومال کے کونے میں باندھ کر رکھتی تھی۔ یہ اگستین کی سلائی مشین بیچ کر حاصل کی ہوئی رقم تھی۔ اسی سے وہ پچھلے نو مہینوں سے، پائی پائی کر کے اپنی اور مرغ کی ضرورتیں پوری کر رہے تھے۔اب بیس سینٹ کے دو اور دس سینٹ کا ایک سکہ باقی بچا تھا۔

"آدھا سیر مکئی خرید لو۔" عورت نے کہا، "اور باقی کے پیسوں سے کل کے لیے کافی اور چار اونس پنیر لے آنا۔"

"ہاں، اور دروازے میں لٹکانے کے لیے سونے کا ہاتھی بھی لے آؤں گا۔" کرنل نے جواب دیا۔ "بیالیس سینٹ کی تو مکئی ہی آئے گی۔"

دونوں کچھ دیر سوچتے رہے۔ "مرغ ایک آدھ روز بھوکا بھی رہ سکتا ہے، آخر جانور ہی تو ہے۔" عورت نے بات شروع کی۔ مگر کرنل کے چہرے کی کیفیت نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ کرنل اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے بستر پر بیٹھا، سکّوں کو اپنے ہاتھوں میں کھنکھنا رہا تھا۔ "یہ سب میں اپنے لیے نہیں کر رہا ہوں۔" وہ ایک لمحے بعد بولا۔ "صرف اپنی بات ہوتی تو آج ہی سے بُھون کر کھا گیا ہوتا۔ پچاس پیسو کی بدہضمی بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔" وہ بات کرتےکرتے اپنی گردن پر بیٹھے ایک مچھر کو مارنے کے لیے رکا۔ پھر

اس کی نگاہیں کمرے میں عورت کا تعاقب کرنے لگیں۔

"اپنے سے زیادہ مجھے ان بچوں کا خیال ہے جو پیسے جوڑ رہے ہیں۔"

عورت نے اس کی بات پر تھوڑی دیر غور کیا۔ پھر ہاتھ میں کیڑے‌مار دوا کا اسپرے لیے ہوئے پوری گھوم گئی۔ کرنل کو اس کا انداز کچھ غیرحقیقی سا لگا، جیسے وہ گھر کی نگہبان روحوں سے صلاح مشورہ کر رہی ہو۔ بالآخر اس نے اسپرے کو چھوٹے کارنس پر رکھ دیا جہاں تصویریں رکھی تھیں اور اپنی شربتی رنگ کی آنکھیں کرنل کی شربتی رنگ کی آنکھوں پر جما دیں۔

"لے اڑ مکئی،" اس نے کہا۔ "خدا ہی جانتا ہے ہمارا گزارا کیسے ہو گا۔"

"یہ روٹیوں کی افزائش کا معجزہ ہے،" اگلے ہفتے کے دوران ہر روز دوپہر کو میز پر کھانے کو موجود پا کر کرنل یہی دوہراتا رہا۔ اپنی رفوگری اور سلائی کڑھائی کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ، شاید اس کی بیوی نے پیسے کی مدد کے بغیر گھر چلانے کا گر بھی دریافت کر لیا تھا۔ کرنل کے ساتھ اکتوبر کی عارضی صلح ابھی جاری تھی۔ ہوا میں سی کی جگہ غنودگی نے لے لی تھی۔ تانبئی دھوپ کی آسودگی میں عورت نے تین سہ پہریں اپنے بالوں کی آرائش کے پیچیدہ عمل میں صرف کیں۔ "بڑی عبادت شروع ہو چکی ہے،" کرنل نے اسے ٹوٹے کنگروں والی کنگھی سے اپنی لمبی نیلگوں بالوں کی گرہیں سلجھاتے دیکھ کر کہا۔ دوسرے روز وہ دالان میں بیٹھی، گود میں سفید چادر بچھائے باریک کنگھی سے جوئیں نکالنے میں لگی رہی، جو اس کی بیماری کے دنوں میں چوکس ہو گئی تھیں۔ آخرکار اس نے سنبل کے عرق سے اپنے بال دھوئے اور، ان کے سوکھنے کے انتظار میں، انہیں دو دفعہ گول کر کے بولے کے ساتھ گردن کے اوپر باندھے رکھا۔ کرنل انتظار کرتا رہا۔ رات کو اپنے جھولنے میں بےخواب لیٹا وہ مرغ کے بارے میں فکرمند رہا۔ لیکن بدھ کے روز جب مرغ کا وزن کیا گیا تو وہ ٹھیک ٹھاک نکلا۔

اسی سہ پہر کو جب آگسٹین کے ساتھی، مرغ کی فتح سے ہونے والی اپنی موہومہ منافعوں کا حساب لگاتے ہوئے اس کے گھر سے رخصت ہوئے تو کرنل بھی خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے بال تراشے۔ "تم نے میری عمر کے بیس سال کم کر دیے ہیں،" کرنل نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی بیوی کو لگا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔

"جب میری صحت ٹھیک ہو تو میں مُردوں کو بھی زندہ کر سکتی ہوں،" اس نے کہا۔

لیکن اس کی خوداعتمادی صرف چند گھنٹے قائم رہ سکی۔ گھر میں اب دیوارگھڑی اور تصویر کے سوا بیچنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ جمعرات کی شام تک، جب وہ اپنے وسائل کی آخری حد کو پہنچ چکے تھے، عورت نے صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا۔

"فکر مت کرو،" کرنل نے اسے تسلی دی۔ "کل ڈاک کا دن ہے۔"

دوسرے روز وہ ڈاکٹر کے دفتر کے سامنے کھڑا لانچوں کا انتظار کر رہا تھا۔

"ہوائی جہاز کمال شے ہے،" کرنل ڈاک کے تھیلے پر نظریں جمائے جمائے بولا۔ "سنا ہے ایک ہی رات میں آدمی یورپ پہنچ سکتا ہے؟"

"درست ہے،" ڈاکٹر نے ایک باتصویر رسالے سے اپنے آپ کو پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔ کرنل نے ان بہت سے لڑکوں کے درمیان پوسٹ ماسٹر کو ڈھونڈ لیا جو لانچ کے گودی پر لگنے کے منتظر تھے تاکہ اس کے لگتے ہی کود کر چڑھ جائیں۔ لانچ پر چڑھنے والا سب سے پہلا شخص پوسٹ ماسٹر تھا۔ اس نے لانچ کے کپتان سے ایک مہر لگا لفافہ وصول کیا۔ پھر وہ لانچ کی چھت پر پہنچ گیا۔ ڈاک کا تھیلا تیل کے دو کنستروں کے درمیان بندھا ہوا تھا۔

"مگر ہوائی سفر میں خطرہ تو ضرور ہوتا ہو گا،" کرنل نے کہا۔ کچھ دیر کو پوسٹ ماسٹر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا، لیکن جلد ہی وہ اسے شربت والے ریڑھے پر سجی ہوئی رنگ برنگی بوتلوں کے درمیان کھڑا نظر آ گیا۔ "انسانیت کو ترقی کی کچھ قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"حالانکہ ہوائی سفر نئی ایجاد ہے مگر لانچوں کے مقابلے میں اب بھی محفوظ ہے،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "آدمی بیس ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہا ہو تو موسم کے اثرات سے اوپر ہوتا ہے۔"

"بیس ہزار فٹ!" کرنل نے پریشان ہو کر دوہرایا۔ اس کا ذہن اس ہندسے کے معنی سے ناآشنا تھا۔

ڈاکٹر کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے باتصویر رسالے کو پھیلا کر اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹکایا۔

"یہ مکمل سکوت اور توازن ہے،" اس نے کہا۔

لیکن کرنل کی توجہ پوسٹ ماسٹر پر مرکوز تھی۔ اس نے اسے بائیں ہاتھ میں گلاس تھامے گلابی رنگ کا شربت پیتے دیکھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا۔

"سنتے ہیں کہ رات کو پرواز کرنے والے جہاز سمندر میں لنگر ڈالے ہوئے ہر جہاز سے رابطہ قائم رکھتے ہیں،" ڈاکٹر بولتا رہا۔ "ان احتیاطی تدابیر کی وجہ سے ہوائی جہاز لانچ سے کہیں زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔"

کرنل نے اس کی طرف دیکھا۔

"ظاہر ہے،" وہ بولا۔ "جہاز کا سفر یقیناً اڑنے والے قالین پر سفر کی طرح ہوتا ہو گا۔"

پوسٹ ماسٹر سیدھا ان کی طرف آیا۔ کرنل بےتابی سے ایک قدم پیچھے ہٹا، اور مہر لگے لفافے پر لکھا ہوا نام پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پوسٹ ماسٹر نے ڈاک کا تھیلا کھولا۔ اس نے اخباروں کا پلندا نکال کر ڈاکٹر کے حوالے کیا۔ پھر اس نے لوگوں کے ذاتی خطوط والا پیکٹ کھولا اور رسید کی صحت جانچنے کے بعد خطوں پر لکھے نام بلند آواز میں پکارنے شروع کیے۔ ڈاکٹر نے اخباروں کا پلندا کھولا۔

"سویز میں جنگ ابھی جاری ہے،" اس نے سرخیاں پڑھتے ہوئے کہا۔ "مغرب کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔"

کرنل نے سرخیاں نہیں پڑھیں۔ وہ اپنی انتڑیوں پر قابو پانے کی کوشش میں لگا رہا۔ "جب

سے سنسر لگ رہا ہے، اخباروں میں صرف یورپ کی خبریں آتی ہیں۔" وہ بولا۔ "بہتر یہ ہو گا کہ یورپ کے لوگ یہاں آ جائیں اور یہاں کے سب لوگ یورپ میں جا بسیں۔ اس طرح ہر ایک کو معلوم ہوتا رہے گا کہ اس کے اپنے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔"

"یورپ کے لوگوں کی نظر میں لاطینی امریکہ ایک مونچھوں والا شخص ہے جس کے ایک ہاتھ میں گٹار اور دوسرے میں پستول ہے۔" ڈاکٹر اخبار کے عقب سے ہنستے ہوئے بولا۔ "انھیں مسئلے کا کچھ پتا نہیں۔"

پوسٹ ماسٹر نے ڈاکٹر کی ڈاک اس کے حوالے کی۔ باقی خط تھیلے میں رکھے اور اسے بند کر دیا۔ ڈاکٹر نے اپنے ذاتی خط کھول کر پڑھنے سے قبل کرنل کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا، "کرنل کے لیے کچھ نہیں ہے؟"

کرنل کا دل دہل گیا۔ پوسٹ ماسٹر تھیلا اپنے کندھے پر ڈال کر پلیٹ فارم سے اترا اور ان کی طرف رخ کیے بغیر بولا

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"

اپنی عادت کے برخلاف، کرنل سیدھا گھر واپس نہیں گیا۔ اس نے درزی کی دکان پر بیٹھ کر کافی پی۔ اس دوران آگسٹین کے ساتھی اخبار کے صفحے الٹتے رہے۔ کرنل خود کو فریب خوردہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ خالی ہاتھ اپنی بیوی کے سامنے جانے کی بجائے اگلے جمعے تک وہیں بیٹھا رہے۔ لیکن جب درزی کی دکان بند ہونے لگی تو اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہی پڑا۔ اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔

"کچھ نہیں آیا؟" اس نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔" کرنل نے جواب دیا۔

اس سے اگلے جمعے کو وہ پھر لانچوں کو دیکھنے گیا۔ اور ہر جمعے کی طرح خط کے بغیر لوٹ آیا۔ "ہم نے کافی انتظار کر لیا۔" اس رات اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ "پندرہ سال تک کسی خط کا انتظار کرنے کے لیے بیل کا سا صبر چاہیے، جیسا تم میں ہے۔" کرنل اخبار پڑھنے کی غرض سے اپنے جھولنے میں لیٹ گیا۔

"ہمارا نمبر ۱۸۲۳ ہے۔" اس نے کہا۔ "باری آتے آتے وقت لگے گا۔"

"جب سے ہم انتظار کر رہے ہیں، لاٹری میں بھی یہ نمبر دو دفعہ نکل چکا ہے۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

کرنل نے حسب معمول اخبار پہلے صفحے سے آخری صفحے تک، اشتہاروں سمیت پڑھا۔ لیکن آج وہ پڑھتے وقت خبروں پر دھیان دینے کی بجائے پرانے سپاہیوں کی پنشن کے بارے میں سوچتا رہا۔ انیس برس قبل، جب کانگریس نے قانون بنایا تھا، آٹھ برس اسے اپنا دعوا منوانے میں لگے تھے۔ مزید چھ سال بعد اس کا نام پنشن کے حقداروں کی فہرست میں درج کیا گیا تھا۔ وہ آخری خط تھا جو اسے موصول ہوا۔

کرفیو کے بگل کے بعد کرنل نے اخبار پڑھنا بند کیا۔ جب وہ بتی بجھانے لگا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی ہے۔

"تمھارے پاس وہ اخبار کا تراشہ ابھی تک ہے؟"

عورت سوچنے لگی۔

"ہاں، باقی تمام کاغذات کے ساتھ ہی پڑا ہو گا۔" اس نے جواب دیا۔

وہ مچھردانی میں سے باہر آئی اور الماری میں سے لکڑی کا صندوقچہ نکالا، جس میں خطوں کا ایک ترتیب وار بنڈل ربڑ کے فیتے سے بندھا رکھا تھا۔ بنڈل میں سے اس نے وکلا کی ایک فرم کا اشتہار ڈھونڈ نکالا جس میں سپاہیوں کی پنشن پر جلدازجلد کارروائی کرنے کا یقین دلایا گیا تھا۔

"جتنا وقت میں نے تمھیں وکیل تبدیل کرنے پر آمادہ کرنے میں لگایا ہے، اتنے عرصے میں ہم رقم وصول کر کے خرچ بھی کر چکے ہوتے۔" عورت نے اشتہار اپنے خاوند کو تھماتے ہوئے کہا۔ "جان بوجھ کر اپنے مقدمے کو انڈین لوگوں کے مقدموں کی طرح طاق پر رکھوائے رہنے سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟"

کرنل نے تراشے پر نظر ڈالی جو دو برس پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ دیا جو دروازے کے پیچھے لٹکی ہوئی تھی۔

"مصیبت یہ ہے کہ وکیل تبدیل کرنے میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔"

"بالکل بھی نہیں۔" عورت فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "تم انھیں لکھو کہ وہ اپنی فیس جتنی بھی ہو پنشن ملنے پر اس میں سے کاٹ لیں۔ صرف اسی شرط پر وہ مقدمہ لیں گے۔"

چنانچہ ہفتے کی سہ پہر کو کرنل اپنے وکیل سے ملنے گیا۔ اس نے اسے کاہلی کے ساتھ اپنے جھولنے میں دراز پایا۔ وہ ایک عظیم الجثہ نیگرو تھا جس کے صرف اوپر کے دو دانت سلامت تھے۔ کرنل کو دیکھ کر اس نے اٹھ کر اپنی کھڑاویں پہنیں، اور پیانولا کے پیچھے والی کھڑکی کھول دی۔ پیانولا گردآلود تھا اور اس کے مختلف خانوں میں، جہاں پہلے موسیقی کے کاغذات کے گول بنڈل ہوتے تھے، اب رجسٹروں میں چسپاں سرکاری گزٹ کے تراشے اور حساب کتاب کے بہی کھاتے بےترتیب حالت میں رکھے ہوئے تھے۔ یوں بغیر کنجیوں کا پیانولا ڈیسک کا کام بھی دیتا تھا۔ وکیل اپنی گھومنے والی کرسی میں بیٹھ گیا۔ ملاقات کا مقصد بیان کرنے سے قبل کرنل کے چہرے پر بےاطمینانی اور گھبراہٹ کے آثار تھے۔

"میں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس مقدمے میں وقت لگے گا۔" کرنل کی بات ختم ہونے پر اس نے کہا۔ گرمی کے باعث وکیل کا جسم پسینے سے تر تھا۔ کرسی کو پیچھے دھکیل اس نے اسے متوازن کیا اور ایک رسالے سے اپنے آپ کو پنکھا جھلنے لگا۔ "میرے کارندے اکثر مجھے خط لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں بےصبری سے کام نہیں چلے گا۔"

"پندرہ سال ہو گئے ہیں۔" کرنل نے کہا۔ "اب تو یہ مقدمہ خصّی مرغ کی کہانی کی طرح لگنے لگا ہے۔"

وکیل نے کرنل کی اطلاع کے لیے انتظامی امور کی جزئیات کی تفصیلی نقشہ کشی کی۔ کرسی اس کے کولہوں کے پھیلاؤ کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ "پندرہ سال پہلے معاملہ پھر بھی آسان تھا۔" وہ بولا۔ "اس وقت شہر کے پرانے سپاہیوں کی انجمن موجود تھی جس میں دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے۔" اس کے پھیپھڑےکمرے کی دم گھونٹنے والی ہوا سے بھر گئے، اور اس نے اگلا فقرہ یوں ادا کیا جیسے اسے ابھی ابھی ایجاد کیا ہو

"معاملات میں مدت ہوتی ہے۔"

"اس معاملے میں تو نہیں تھی" کرنل نے کہا۔ پہلی بار اسے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ "میرے تو سارے ساتھی ڈاک کا انتظار کرتے کرتے مر گئے۔"

وکیل کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

"درحقیقت قانون بہت دیر سے جاری ہوا تھا" اس نے کہا۔ "ہر کوئی تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوتا کہ بیس سال کی عمر میں کرنل کا عہدہ حاصل کر لے۔ مزید یہ کہ پنشنوں کے لیے کوئی رقم تو مختص کی نہیں گئی تھی، اس لیے حکومت کو بجٹ میں گنجائش نکالنی پڑی ہے۔"

یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ کرنل کو وکیل کی گفتگو سن کر ہر بار ایک ہی طرح کی بےجا سی رنجیدگی کا احساس ہوتا تھا۔ "ہم خیرات تو نہیں مانگ رہے" اس نے کہا۔ "اور نہ حکومت ہم پر کوئی احسان کر رہی ہے۔ ریپبلک کو بچانے میں ہم نے اپنا ستیاناس کر لیا تھا۔"

"یہی ہوتا آیا ہے،" وکیل نے جواب دیا۔ "انسان کی ناشکرگزاری کی کوئی حد نہیں ہے۔"

اس منطق سے بھی کرنل کی پرانی شناسائی تھی۔ نیرلاندیا کے معاہدے کے، جس کی رو سے حکومت نے دو سو انقلابی افسروں کو قانونی تحفظ اور سفر خرچ کی ضمانت دی تھی، دوسرے ہی دن لوگ اس انداز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ نیرلاندیا میں سیبل کے عظیم درخت کے نیچے ڈیرہ ڈالے انقلابی افسروں کی ایک بٹالین نے، جو زیادہ تر اسکول سے فارغ ہوئے نوجوان تھے، تین ماہ تک انتظار کیا تھا۔ پھر وہ اپنے اپنے وسائل سے گھر پہنچ کر وہاں انتظار کرتے رہے تھے۔ اس واقعے کے تقریباً ساٹھ سال بعد، کرنل آج بھی منتظر تھا۔

پرانے واقعات کی یادوں سے جوش میں آ کر اس نے ایک ماورائی رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی ران پر رکھ لیا، جو اب صرف ریشے جڑھی ہڈی رہ گئی تھی، اور بڑبڑایا،

"خیر، اب مجھے اس کا بندوبست کرنا ہے۔"

وکیل بات پوری ہونے کا منتظر رہا۔

"کیسا بندوبست؟"

"میں وکیل تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک بطخ اپنے متعدد چوزوں کے ساتھ دفتر میں گھس آئی۔ وکیل انہیں باہر نکالنے کے لیے اٹھا۔ "جیسی تمہاری مرضی، کرنل" اس نے جانوروں کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "جیسے تم چاہو۔ میں اگر کرامت کر سکتا تو آج اس غلے کی کوٹھری میں نہ رہ رہا ہوتا۔" لکڑی کا ایک جنگلا اٹھا کر اس نے دروازے کے آگے اڑا دیا، اور واپس آ کر اپنی کرسی میں دھنس گیا۔

"میرا بیٹا ساری زندگی کام کرتا رہا،" کرنل بولا۔ "میرا گھر رہن ہے۔ اس ریٹائرمنٹ کے قانون سے وکیلوں کی زندگی بھر کی پنشن کا انتظام ہو گیا ہے۔" کرنل نے کہا۔

"غلط ہے،" وکیل نے احتجاج کیا۔ "مجھے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میرے تو مقدمے کے اخراجات بھی مشکل سے پورے ہوئے۔"

کرنل یہ سوچ کر پشیمان ہوا کہ شاید اس نے ناانصافی سے کام لیا ہے۔

"میرا بھی یہی مطلب تھا" اس نے اپنے بیان کی تصحیح کی۔ اس نے قمیص کی آستین سے

ماتھے کا پسینا پونچھا۔ "گرمی سے میرے دماغ کے پرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں وکیل مختارنامہ ڈھونڈنے میں سارے دفتر کو تلپٹ کر چکا تھا۔ لکڑی کے کھردرے تختوں سے بنے اس چھوٹے سے کمرے میں دھوپ درمیان تک آ چکی تھی۔ چیزوں کے ڈھیر چاروں طرف ڈھونڈنے اور مختارنامہ نہ پانے کے بعد وکیل ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل، ہانپ کانپ پیانولا کے نیچے گھس گیا اور تھوڑی دیر بعد کاغذوں کا ایک گول بنڈل نکال لایا۔

"یہ رہا تمہارا مختارنامہ!"

اس نے کرنل کے ہاتھ میں ایک کاغذ، جس پر مہر ثبت تھی، پکڑا دیا۔ "میں اپنے کارندوں کو لکھ دوں گا کہ وہ اس مختارنامے کی نقلوں کی تنسیخ کر دیں۔" وکیل نے اپنی بات مکمل کی۔ کرنل نے کاغذ سے گرد جھاڑی اور اسے تہ کر کے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

"اسے خود پھاڑ دینا،" وکیل نے کہا۔

"نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔ "یہ بیس برس کی یادیں ہیں۔" اور وہ منتظر رہا کہ وکیل باقی کاغذات بھی اس کے حوالے کر دے۔ مگر وکیل نے جھولنے کے پاس جا کر پسینا پونچھنے لگا۔ وہاں سے اس نے چمچماتی روشنی میں سے کرنل کی طرف دیکھا۔

"مجھے باقی دستاویزات بھی چاہییں،" کرنل نے کہا۔

"کون سی؟"

"میرے دعوے کے ثبوت کے کاغذ۔"

وکیل نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔

"انہیں تلاش کرنا تو ناممکن ہے کرنل۔"

کرنل یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ ماکوندو کے علاقے میں انقلابی فوجوں کے خزانچی کی حیثیت سے اس نے خانہ جنگی کا تمام سرمایہ دو ٹرنکوں میں خچر کی پیٹھ پر لاد کر چھ دن کا صبر آزما سفر طے کیا تھا۔ وہ معاہدے پر دستخط ہونے سے آدھے گھنٹے قبل قریب المرگ خچر کو کھینچتا ہوا نیرلاندیا کے خیمے میں پہنچا تھا۔ کرنل اوریلیانو بوئندیا نے، جو بحر اوقیانوس کے ساحل پر انقلابی فوجوں کا کوارٹرماسٹر جنرل تھا، دونوں ٹرنکوں کی رسید دی تھی اور دستبرداری کے لیے تیار کی گئی فہرست میں انہیں شامل کرایا تھا۔

"ان دستاویزات کی قیمت کا تو اندازہ لگانا ہی ناممکن ہے،" کرنل نے کہا۔ "اور ان میں کرنل اوریلیانو بوئندیا کے ہاتھ کی لکھی رسید بھی ہے۔"

"درست ہے،" وکیل نے کہا۔ "مگر سینکڑوں ہاتھوں اور ہزاروں دفتروں سے گزر کر اب وہ کاغذات خدا جانے محکمۂ جنگ کے کس شعبے میں ہوں گے۔"

"کوئی سرکاری افسر ان کاغذات کی اہمیت سے بےخبر نہیں رہ سکتا،" کرنل نے کہا۔

"لیکن پچھلے پندرہ برسوں میں کتنے سرکاری افسر تبدیل کیے جا چکے ہوں گے؟" وکیل نے کہا۔ "حساب لگا لو۔ اب تک سات صدر حکومت کی باگ ڈور سنبھال چکے ہیں اور ہر صدر نے کم از کم دس دفعہ اپنی کابینہ بدلی ہے اور ہر وزیر نے کم از کم سو دفعہ اپنے اہلکار بدلے ہیں۔"

"لیکن کوئی ان کاغذات کو گھر تو نہیں لے گیا ہو گا" کرنل نے کہا۔ "ہر نئے افسر کو وہ

مخصوص فائل میں نظر آئے ہوں گے۔"

وکیل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"اور اگر اب یہ کاغذات محکمۂ جنگ سے نکال لے گئے، تو ان کو نئے سرے سے رجسٹروں پر چڑھانے کے لیے مزید انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" کرنل نے جواب دیا۔

"اس میں صدیاں لگ جائیں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر آدمی بڑے مسائل کے حل ہونے کا انتظار کر سکتا ہے تو چھوٹے مسائل کے حل ہونے کا بھی کر سکتا ہے۔"

کرنل نے لکیروں والے کاغذوں کا پیڈ، قلم، دوات اور سیاہی چوس اٹھا کر بیٹھک کی چھوٹی میز پر رکھے۔ خواب گاہ کا دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا، تاکہ اگر اپنی بیوی سے کچھ پوچھنا چاہے تو پوچھ سکے۔ وہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔

"آج کیا تاریخ ہے؟"

"ستائیس اکتوبر۔"

کرنل کا خط ستھرا تھا اور وہ نہایت صحت اور اہتمام سے لکھتا تھا۔ لکھتے وقت اس کا قلم والا ہاتھ سیاہی چوس کے اوپر ٹکا ہوتا تھا، اور وہ سیدھا بیٹھتا تھا تاکہ اس کے سانس کی آمدورفت یکساں رہے، جیسے کہ اسے اسکول میں سکھایا گیا تھا۔ چھوٹے سے بند کمرے میں گرمی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ پسینے کا ایک قطرہ خط کے اوپر گرا۔ کرنل نے سیاہی چوس سے اسے خشک کر لیا۔ جو لفظ مٹی سے پھیل گئے تھے، انہیں مٹانے میں کرنل نے خط پر مزید دھبّے ڈال لیے۔ لیکن وہ اس بات سے چنداں پریشان نہ ہوا۔ مسخ تحریر کے نزدیک ستارے کا نشان لگا کر اس نے حاشیے پر وہی الفاظ دوبارہ لکھ دیے، اور پورے پیرے کو پڑھا۔

"میرا نام حقداروں کی فہرست پر کب چڑھا تھا؟"

عورت نے اپنی عبادت کا تسلسل توڑے بغیر جواب دیا، "بارہ اگست انیس سو انچاس کو۔"

تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔ کرنل نے بچکانہ سے انداز میں صفحے کے حاشیوں کو بھی لیڑھی خطوط سے خاک کشی کر کے بھر دیا، جو اس نے مانورے کے پبلک سکول ہی میں سیکھی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوسرے صفحے کے نصف تک لکھا اور اپنے دستخط کر دیے۔

پھر اس نے اپنی بیوی کو خط پڑھ کر سنایا۔ بیوی نے ہر فقرے کی سر ہلا کر توثیق کی۔ خط پڑھنے کے بعد کرنل نے لفافہ بند کر دیا، اور لیمپ بجھا دیا۔

"کسی سے کہہ کر اسے ٹائپ کرا لو۔"

"نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔ "میں لوگوں کے احسان اٹھا اٹھا کر تنگ آ چکا ہوں۔"

آدھ گھنٹے تک وہ کھجور کے پتوں کی چھت پر بارش کی آواز سنتا رہا۔ قصبہ بارش کے

طوفان میں غرق ہو رہا تھا۔ کرفیو کے بگل کے بعد کہیں سے چھت کے ٹپکنے کی آواز آنے لگی۔

"یہ قدم تمہیں بہت پہلے اٹھا لینا چاہیے تھا،" عورت نے کہا۔ "آدمی اپنے معاملات کو خود ہی نپٹائے تو ٹھیک رہتا ہے۔"

کرنل کے کان چھت کے ٹپکنے کی طرف لگے ہوئے تھے۔ "خیر زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے مکان کے رہن کی ادائیگی کی تاریخ سے پہلے پہلے یہ معاملہ طے ہو ہی جائے۔"

"دو سال میں۔" عورت نے کہا۔

چھت کا سوراخ ڈھونڈنے کے لیے کرنل نے لیمپ روشن کیا۔ مرغ کا پانی والا ڈبا ٹپکاؤ کے نیچے رکھ کر وہ خواب گاہ میں واپس آ گیا۔ خالی ڈبے میں بوندوں کے ٹپکنے کی کرخت آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت اپنی رقم پر سود بچانے کی خاطر مقدمے کا فیصلہ جنوری سے قبل ہی کر دے،" وہ بولا، اور خود ہی قائل ہو کر کہا۔ "تب تک اگستین کے سوگ کا برس بھی پورا ہو چکا ہو گا، اور ہم فلم دیکھنے جا سکیں گے۔"

عورت دبی دبی ہنسی ہنسنے لگی۔ "مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کارٹون کیسے ہوا کرتے تھے،" اس نے کہا۔ کرنل نے مچھردانی میں سے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔

"آخری دفعہ تم نے کب فلم دیکھی تھی؟"

"انیس سو اکتیس میں،" اس نے جواب دیا۔ "مردے کی وصیت' دکھائی جا رہی تھی۔"

"اس میں کوئی لڑائی بھی تھی؟"

"پتا ہی نہیں چلا۔ بھوت لڑکی کا نیکلس چرانے والا تھا کہ طوفان آ گیا، اور فلم بند کر دی گئی۔"

بارش کی آواز نے دونوں کو رفتہ رفتہ سلا دیا۔ کرنل نے انتڑیوں میں بےچینی سی محسوس کی۔ لیکن وہ خوف زدہ نہ ہوا۔ ایک اور اکتوبر ختم ہونے کو تھا۔ اس نے خود کو اونی کمبل میں لپیٹ لیا، اور ایک لمحے کو دور سے اپنی بیوی کے سانسوں کی پتھریلی آواز کو کسی اور خواب کی رو پر بہتے ہوئے سنتا رہا۔

تب اس نے بات کی، بولتے وقت وہ پورے ہوش میں تھا۔

عورت جاگ گئی۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

"کسی سے نہیں،" کرنل نے کہا۔ "میں یہ سوچ رہا تھا کہ ماکوندو کی جلسے میں جب ہم نے کرنل اوریلیانو بوئندیا سے کہا تھا کہ ہتھیار نہ ڈالے، تو ہم نے اسے غلط مشورہ نہیں دیا تھا۔ ساری تباہی اسی سے شروع ہوئی۔"

بارش پورے ہفتے ہوتی رہی۔ نومبر کی دو تاریخ کو، کرنل کی خواہش کے برعکس، عورت اگستین کی قبر پر پھول چڑھانے گئی۔ قبرستان سے واپس آتے ہی اس پر دمے کا حملہ ہو گیا۔ یہ ایک کٹھن ہفتہ تھا۔ اکتوبر کے ان چار ہفتوں سے بھی زیادہ کٹھن جنھیں جھیل جانے کی کرنل کو امید نہیں تھی۔ ڈاکٹر مریضہ کو دیکھنے آیا اور کمرے سے چلاتا ہوا باہر نکلا "مجھے ایسا دمہ ہو تو سارے قصبے کو دفن کرنے کے بعد بھی زندہ رہوں۔" لیکن اس نے علیحدگی میں کرنل

سے بات کی، اور مریض کے لیے خاص خوراک تجویز کی۔

کرنل کا اپنا مرض پھر عود کر آیا۔ وہ دیر تک پاخانے میں بیٹھا زور لگاتا رہا، اسے ٹھنڈے پسینے آتے رہے اور یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ گل سڑ رہا ہو اور اس کی انتڑیوں میں اگی زہریلی نباتات ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہوں۔ "اب تو سردی آ گئی ہے،" اس نے خود کو اطمینان دلایا۔ "بارش رک جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور اسے واقعی یقین آ گیا کہ جب پنشن کا خط آئے گا تو وہ اسے وصول کرنے کے لیے زندہ ہو گا۔

اس بار کرنل کو گھریلو اخراجات میں پیوند لگانے پڑے۔ اردگرد کی دکانوں سے اسے کئی مرتبہ دانت کچکچا کر ادھار مانگنا پڑا۔ "صرف ایک ہفتے کی بات ہے،" وہ دکان داروں سے کہتا رہا، حالاں کہ اسے خود بھی یقین نہ تھا کہ یہ سچ ہے، "پچھلے جمعے کو مجھے رقم مل جانی چاہیے تھی۔" دورے کے گزر جانے کے بعد، عورت اسے غور سے دیکھنے پر دہشت زدہ رہ گئی۔

"تم تو ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئے ہو،" اس نے کہا۔

"نہیں، میں اپنا خاص خیال رکھ رہا ہوں تاکہ اپنے آپ کو فروخت کر سکوں،" کرنل نے جواب دیا۔ "مجھے ایک کلارینیٹ فیکٹری والوں نے پہلے ہی رکھ لیا ہے۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ خط کی امید نے اسے معمولی سا سہارا دے رکھا تھا۔ تھکن اور بےخوابی سے چور، وہ اپنی اور مرغ کی ضرورتوں کی خبرگیری ایک وقت نہیں کر پا رہا تھا۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں اسے خیال ہوا کہ مرغ کو دو دن اور مکئی نہ ملی تو وہ چل بسے گا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس نے جولائی کے مہینے میں چمنی کے اندر مٹھی بھر لوبیا سنبھال کر رکھا تھا۔ لوبیے کی پھلیوں سے دانے نکال کر اس نے پیتل کے ڈبے میں ڈالے اور مرغ کے آگے رکھ دیے۔

"ادھر آؤ،" اس کی بیوی نے اسے آواز دی۔

"ایک منٹ ٹھہرو،" کرنل نے جواب دیا، اور لوبیا کے دانوں کے بارے میں مرغ کے ردعمل کا جائزہ لینے لگا۔ "بھوک مٹانے کو انتخاب کا حق نہیں ہوتا۔"

اس نے اپنی بیوی کو بستر میں اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ اس کے بیماری سے لاغر جسم میں سے دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی بو آ رہی تھی۔ اس نے ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر اور جچے تلے انداز میں ادا کیا:

"اس مرغ سے بھی فوراً چھٹکارا حاصل کرو۔"

کرنل اس لمحے کی توقع کرتا رہا تھا۔ وہ اس کا اُس سہ پہر سے منتظر تھا جب اس کے بیٹے کو گولی مار دی گئی تھی اور اس نے مرغ کی نگہداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس موضوع پر سوچ بچار کا اسے خاصا وقت مل چکا تھا۔

"ابھی کیا فائدہ؟" اس نے کہا۔ "دو مہینوں میں مرغوں کی لڑائی ہے، اس کے بعد ہم اس کے اچھے پیسے حاصل کر سکیں گے۔"

"پیسوں کا سوال نہیں ہے،" عورت نے کہا۔ "آج جب لڑکے آئیں تو انہیں کہو کہ مرغ کو لے جائیں اور اس کے ساتھ جو کرنا ہو کریں۔"

"یہ آگسٹین کی خاطر ہے،" کرنل نے پہلے سے سوچی ہوئی دلیل پیش کی۔ "اس کی شکل

یاد کرو جب وہ ہمیں بتانے آیا تھا کہ مرغ جیت گیا ہے۔"

دراصل کرنل کی بیوی نے اسی بیٹے کے بارے میں سوچا تھا۔

"ان بدبخت مرغوں ہی کی وجہ سے اس کی جان گئی،" اس نے چیخ کر کہا۔ "تین جنوری کو وہ اگر گھر میں ٹکا رہتا تو اس پر برا وقت کبھی نہ آتا۔" وہ اپنی سوکھی ہوئی شہادت کی انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولی،

"مجھے یاد ہے جب وہ مرغ کو بغل میں دبا کر گھر سے باہر نکلا تھا میں نے اسے کہا تھا کہ مرغوں کی لڑائیوں میں شامل ہو کر خواہ مخواہ اپنے لیے عذاب مول نہ لے، مگر اس نے ہنس کر اور ڈانٹ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا، اور کہا تھا کہ شام تک ہم دولت میں لوٹیں لگا رہے ہوں گے۔"

وہ نڈھال ہو کر پیچھے کو گر گئی۔ کرنل نے نرمی سے کھینچ کر اسے تکیے کے قریب کر دیا۔ اپنی جیسی شربتی رنگ کی آنکھوں پر اس کی نظر پڑی۔ "ہلنے کی کوشش نہ کرو،" وہ بولا، اور اسے یوں لگا جیسے اس کی بیوی کی سانس کی سیٹیاں اس کے اپنے سینے سے برآمد ہو رہی ہیں۔ عورت تھوڑی دیر کے لیے بےسُدھ سی ہو گئی۔ اس نے آنکھیں مُوند لیں۔ جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اس کا سانس کچھ کچھ ہموار ہو گیا تھا۔

"یہ سب ہماری حالت کی وجہ سے ہے،" وہ بولی۔ "اپنے منہ کا نوالا چھین کر ایک مرغ کو ڈال دینا گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟"

کرنل نے چادر سے اس کے ماتھے کا پسینا خشک کیا۔

"تین مہینوں میں کوئی نہیں مرتا۔"

"اور ان مہینوں میں ہم کھائیں گے کیا؟" عورت نے پوچھا۔

"پتا نہیں،" کرنل نے کہا۔ "لیکن ہمیں اگر بھوک کے ہاتھوں مرنا ہوتا تو بہت پہلے مر گئے ہوتے۔"

مرغ زندہ اور بھلا چنگا اپنے پیتل کے خالی ڈبے کے پاس موجود تھا۔ کرنل کو دیکھ کر وہ گلے سے تقریباً انسانی آواز نکالتے ہوئے خودکلامی سی کرنے لگا، اور اس نے اپنا سر پیچھے کو جھٹکا۔ کرنل سازباز کے انداز میں مسکرایا، اور بولا:

"زندہ رہنا آسان نہیں ہے، دوست۔"

کرنل باہر گلی میں نکل آیا۔ جس وقت لوگ قیلولہ کر رہے تھے، وہ بےمقصد ادھرادھر گھومتا رہا۔ اس دوران میں اس نے کچھ سوچنے کی کوشش نہ کی، حتیٰ کہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے سے بھی باز رہا کہ اس کی مشکلات کا کوئی حل نہیں ہے۔ وہ بھولی ہوئی گلیوں اور سڑکوں پر پھرتا رہا یہاں تک کہ چل چل کر نڈھال ہو گیا۔ تب وہ گھر لوٹ آیا۔ عورت نے اس کے گھر میں داخل ہونے کی آواز سنی اور اسے اندر خواب گاہ میں بلایا۔

"کیا بات ہے؟"

عورت نے اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔

"ہم گھڑی بیچ سکتے ہیں۔"

کرنل کو بھی یہ خیال آ چکا تھا۔ "مجھے یقین ہے الوارو تمھیں اس کے چالیس پیسو تو

ہاتھ کیوں دے دے گا،" عورت بولی۔ "یاد ہے اس نے سلائی مشین ہم سے کتنی جلدی خرید لی تھی۔" الوارو وہ درزی تھا جس کی دکان میں آگستین سلائی کا کام کیا کرتا تھا۔

"کل صبح اس سے بات کروں گا،" کرنل نے ہامی بھری۔

"کل صبح کا کیا مطلب؟ اسے ابھی اس کے پاس لےجاؤ، اسے اس کے کاؤنٹر پر رکھو، اور کہو، الوارو، میں یہ گھڑی تمھارے ہاتھ بیچنا چاہتا ہوں۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا۔"

کرنل کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

"اسے قصبے میں لے کر پھرنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی حضرت عیسیٰ کے مزار کا کتبہ لیے پھر رہا ہو،" اس نے احتجاج کیا۔ "رافیل ایسکالونا نے مجھے اس گھڑی کے ساتھ دیکھ لیا تو میرے بارے میں گانے ایجاد کر لے گا۔"

لیکن اس بار بھی اسے اپنی بیوی کی بات ماننا پڑی۔ عورت نے خود گھڑی دیوار سے اتاری، اخبار میں لپیٹی اور کرنل کے حوالے کی۔ "چالیس پیسو کے بغیر گھر مت واپس آنا،" اس نے کہا۔ کرنل بنڈل کو بغل میں لیے درزی کی دکان کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس نے آگستین کے ساتھیوں کو دکان کی دہلیز کے باہر بیٹھے ہوئے پایا۔

ان میں سے ایک نے کرنل کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ "شکریہ،" وہ بولا۔ "میں جلدی میں ہوں۔" الوارو دکان سے باہر آیا۔ دکان کے اندر ایک تار پر لنن کا ایک گیلا ٹکڑا سکھانے کے لیے لٹکا ہوا تھا۔ وہ دبلے، بےلوچ جسم والا لڑکا تھا جس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ اس نے بھی کرنل کو بیٹھنے کو کہا۔ کرنل کے دل کو تھوڑا سا قرار آیا۔ اسٹول کو تھوڑا سا جھکا کر دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا، اور منتظر رہا کہ الوارو کو فرصت ہو تاکہ وہ علیحدگی میں اس سے بات کر سکے۔ یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ بہت سارے بےتاثر چہروں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔

"میں تمھارے کام میں مخل تو نہیں ہو رہا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

انھوں نے جواب دیا "نہیں"۔ ان میں سے ایک لڑکا اس کی طرف جھکا۔ اس نے دھیمی، تقریباً ناقابلِ سماعت آواز میں کہا:

"آگستین کا خط آیا ہے۔"

کرنل نے سنسان سڑک پر نظر دوڑائی۔

"کیا لکھا ہے؟"

"کوئی نئی بات نہیں۔"

انھوں نے اسے خفیہ اخبار تھما دیا۔ کرنل نے اسے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ خاموش بیٹھا انگلیوں سے بنڈل کو کھٹکھٹاتا رہا حتیٰ کہ ایک کارندے کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی۔ مشوش ہو کر کرنل نے بنڈل سے کھیلنا بند کر دیا۔

"اس میں کیا ہے کرنل؟" ایرنان نے پوچھا۔

کرنل نے ہرنان کی تیز عقاب کی سی آنکھوں سے آنکھیں ملانے سے گریز کیا۔

"کچھ نہیں،" اس نے جھوٹ بولا۔ "جرمن کے پاس گھڑی مرمت کرانے لے جا رہا تھا۔"

"دیوانے ہوئے ہو کرنل؟" ایرنان نے بنڈل اس کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے دو، میں دیکھتا ہوں۔"

لیکن کرنل نے بنڈل پکڑے رکھا۔ وہ بولا کچھ نہیں، مگر اس کے پپوٹے عنابی ہو گئے۔ باقیوں نے بھی اصرار کیا۔

"اسے دیکھ لینے دو، کرنل۔ ایرنان پُرزوں مشینوں کا ماہر ہے۔"

"میں اسے خواہ مخواہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

"تکلیف کیسی؟" ایرنان نے حجت کی۔ اس نے گھڑی اٹھا لی۔ "جرمن تم سے دس پیسو دھروا لے گا اور گھڑی ویسے کی ویسی رہے گی۔"

گھڑی کو اٹھائے ایرنان دکان کے اندر چلا گیا۔ الوارو مشین پر سلائی میں مصروف تھا۔ دکان کے عقب میں دیوار پر ٹنگے ہوئے گٹار کے نیچے ایک لڑکی بٹن ٹانک رہی تھی۔ گٹار کے اوپر سائن چسپاں تھا: "سیاسی گفتگو کرنا منع ہے" باہر بیٹھے کرنل کو اپنا جسم بالکل بےمصرف لگا۔ اس نے اپنے پاؤں اٹھا کر اسٹول میں لگی سلاخ پر رکھ لیے۔

"خدا تمھیں غارت کرے، کرنل۔"

وہ چونک پڑا۔ "گالی دینے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے کہا۔

الفانسو نے ناک پر اپنی عینک ٹھیک سے جمائی اور کرنل کے جوتوں کا معائنہ کرنے لگا۔

"تمھارے جوتوں کے بارے میں کہا ہے،" وہ بولا۔ "یہ مردود جوتے کہاں سے لے لیے تم نے؟"

"یہ بات تم گالی دیے بغیر بھی کہہ سکتے ہو،" کرنل نے کہا، اور اپنے نقلی چمڑے کے جوتوں کے تلے دکھائے۔ "یہ عجوبہ روزگار جوتے چالیس سال پرانے ہیں، لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار گالیاں کھائی ہیں۔"

"ٹھیک ہو گیا،" دکان کے اندر سے ایرنان نے نعرہ لگایا، اور ساتھ ہی گھڑی نے گھنٹا بجایا۔ برابر والے گھر سے ایک عورت نے دیوار پر مکے مارے، اور چلا کر کہا:

"گٹار کا پیچھا چھوڑ دو! آگستین کے سوگ کا برس ابھی پورا نہیں ہوا۔"

درزی کے کارندوں میں سے ایک نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"یہ گھڑی ہے گٹار نہیں۔"

ایرنان بنڈل لے کر دکان سے باہر آیا۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی،" اس نے کہا۔ "اگر چاہو تو تمھارے گھر چل کر اس کی سطح بھی برابر کر دوں؟"

کرنل نے ایرنان کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔

"کتنے پیسے دوں؟"

"فکر مت کرو کرنل،" ایرنان نے باقیوں کی صف میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ "تمھارا مرغ جنوری میں سب قرضوں کی ادائیگیاں کر دے گا۔"

کرنل کو اب وہ موقع ملا جس کی اسے تلاش تھی۔

"میں تمھارے ساتھ ایک سودا کرتا ہوں،" اس نے کہا۔

"کیسا سودا؟"

"میں مرغ تمھیں دے دیتا ہوں،" کرنل نے چہروں کے نیم دائرے کو دیکھا۔ "میں اسے تم

سب کو دے دیتا ہوں۔"

ایرماں ہونچکا ہو کر کرنل کو دیکھنے لگا۔

"میری عمر اب مرغ لڑانے کی نہیں رہی،" کرنل نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس نے اپنی آواز میں وثوق اور سنجیدگی کا تاثر پیدا کیا۔ "یہ بہت کڑی ذمے‌داری ہے۔ کئی روز سے مجھے لگ رہا ہے کہ مرغ قریب المرگ ہے۔"

"کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں، کرنل۔" الفانسو نے کہا۔ "اس کے پر جھڑ رہے ہیں۔ اس کے پروں میں بخار ہو گیا ہو گا۔"

"اگلے مہینے تک ٹھیک ہو جائے گا۔" ایرماں نے کہا۔

"بہرحال میں اب اس کی رکھوالی نہیں کرنا چاہتا۔" کرنل بولا۔

ایرماں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنل کو دیکھا۔

"معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرو، کرنل۔" اس نے اصرار کیا۔ "تمھارا فرض ہے کہ اگستین کے مرغ کو تم اپنے ہاتھ سے پالی میں اتارو۔"

کرنل نے اس بات پر غور کیا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "اسی لیے میں اب تک اسے رکھے ہوئے ہوں۔" اس نے دانت بھینچے، اور سوچا کہ اس موضوع پر مزید بات کی جا سکتی ہے۔

"دقّت یہ ہے کہ لڑائی میں ابھی دو مہینے باقی ہیں۔"

ایرماں اصل بات سمجھ گیا۔

"اگر صرف یہی دقّت ہے تو اس کا حل تو آسانی سے مل سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

اور اس نے یہی ترکیب بتائی۔ اس کے ساتھیوں نے اسے قبول کر لیا۔ شام کو جب کرنل بغل تھامے گھر واپس آیا تو اس کی بیوی اسے دیکھ کر طیش میں آ گئی۔

"کچھ نہیں ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔ "لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ لڑکوں نے مرغ کی خوراک کا ذمہ لے لیا ہے۔"

"ٹھہرو دوست، میں تمھیں اپنی چھتری دے دیتا ہوں۔"

سابا‌س نے دفتر کی دیوار میں نصب الماری کھولی۔ اندر بےترتیب چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ گھڑسواری کے جوتے، رکابیں، لگامیں اور المونیم کی بالٹی میں پڑی مہمیزیں۔ اوپر کے حصے میں ایک رسالہ، اور آدھی درجن مردانہ چھتریاں لٹک رہی تھیں۔ کرنل کے ذہن میں آسمانی آفت کے بعد کسی شہر کے ملبے کا نقشہ ابھرا۔

"شکریہ دوست،" کرنل نے کھڑکی میں جھک کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بارش کے تھمنے کا انتظار کروں گا۔" سابا‌س نے الماری کے پٹ کھلے رہنے دیے۔ وہ جا کر میز کے پاس، بجلی کے پنکھے کی ہوا کے نیچے بیٹھ گیا۔ تب اس نے دراز میں سے روئی میں لپٹی ہوئی ایک

سرنج نکالی۔ کرنل بارش میں بھیگتے ہوئے بادام کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک سنسان سہ پہر تھی۔

"اس کھڑکی سے بارش مختلف لگتی ہے،" اس نے کہا، "جیسے کسی اور شہر میں ہو رہی ہو۔"

"بارش ہر جگہ سے بارش ہی لگتی ہے،" سابا‌س نے جواب دیا۔ اس نے سرنج کو میز کے اوپر لگے شیشے پر ابلنے کو رکھ دیا۔ "یہ قصبہ ہی متعفن ہے۔" اس نے اضافہ کیا۔

کرنل نے اپنے کندھے اچکائے۔ وہ چلتا ہوا دفتر کے درمیان تک آیا۔ کمرے کے فرش پر سبز ٹائلیں لگی تھیں اور فرنیچر کے غلاف شوخ رنگ کے تھے۔ کمرے کے عقب میں نمک کے تھیلے، شہد کے چھتے اور کاٹھیاں بےترتیبی کے عالم میں پڑی تھیں۔ سابا‌س بالکل خالی نگاہوں سے کرنل کا معائنہ کر رہا تھا۔

"اگر میں تمھاری جگہ ہوں تو اس قصبے کے بارے میں یوں نہ سوچوں،" کرنل نے کہا۔

وہ بیٹھ گیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سکون کے ساتھ میز پر جھکے شخص کو گھورنے لگا۔ سابا‌س چھوٹے سے قد کا، بہت موٹا آدمی تھا، اس کا گوشت پلپلا تھا اور متحمل ٹھل کرتا تھا، اور آنکھوں سے مینڈک جیسی اداسی جھلکتی تھی۔

"کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرا لو، دوست۔" سابا‌س نے کہا۔ "جنازے کے دن کے بعد سے تم کچھ اداس لگ رہے ہو۔"

کرنل نے اپنا چہرہ اٹھایا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

سابا‌س سرنج کے ابلنے کا منتظر تھا۔ "کاش میں بھی اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا،" اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "تم خوش قسمت آدمی ہو کیوں‌کہ تمھارا معدہ فولاد کا ہے۔" وہ اپنے ہاتھوں کی پشت کی بالوں بھری کھال کو دیکھنے لگا جس پر جگہ جگہ کالے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ شادی کی چھلے والی انگلی میں اس نے چھلے کے ساتھ ایک کالے نگ والی انگوٹھی بھی پہن رکھی تھی۔

"ہاں وہ تو ہے،" کرنل نے تسلیم کیا۔

دفتر اور گھر کے درمیانی دروازے میں سے سابا‌س نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ پھر وہ کرنل کو اپنی غذا کی تفصیلات کی پُردرد داستان سنانے لگا۔ اپنی جیب سے اس نے ایک بوتل نکالی اور اس میں سے مٹر کے دانے جتنی سفید گولی نکال کر میز پر رکھ دی۔

"ہر جگہ اسے ساتھ لیے پھرنا بہت بیزاری کا کام ہے،" سابا‌س نے کہا، "جیسے آدمی موت کو اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہو۔"

کرنل میز کے قریب آیا اور گولی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ سابا‌س نے اسے گولی چکھنے کی دعوت دی۔

"یہ کافی کو میٹھا کرنے کے لیے ہے،" اس نے وضاحت کی۔ "یہ تو یہ شکر، مگر شکر کے بغیر۔"

"واقعی،" کرنل نے کہا۔ اس کے منہ میں اداس سی مٹھاس کا مزہ تھا۔ "یہ ایسا ہی ہے

جیسے آدمی گھنٹیوں کے بغیر گھنٹیوں کی آواز پیدا کر لے۔"

بیوی سے ٹیکا لگوانے کے بعد ساباس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکا لیں اور ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ کر بیٹھ گیا۔ کرنل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کا کیا کرے۔ ساباس کی بیوی نے پنکھے کا سوئچ نکال کر پنکھے کو تجوری کے اوپر رکھ دیا اور الماری کی طرف چل دی۔

"چھتریوں کا موت سے کچھ نہ کچھ تعلق ہوتا ہے" اس نے کہا۔

کرنل نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہ ڈاک دیکھنے کے لیے چار بجے گھر سے نکلا تھا مگر بارش نے اسے ساباس کے دفتر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے لانچوں کی سیٹی کی آواز سنائی دی مگر بارش بدستور جاری تھی۔

"ہر ایک کا خیال ہے کہ موت ایک عورت ہے" ساباس کی بیوی نے بات جاری رکھی۔ وہ فربہ عورت تھی۔ اس کا قد اپنے خاوند کے قد سے نکلتا ہوا تھا اور اوپر کے ہونٹ پر ایک موٹا سا مسّا تھا جس پر بال اگے ہوئے تھے۔ اس کی گفتگو کے انداز سے آدمی کو بجلی کے پنکھے کی گھرگھراہٹ کا دھوکا ہوتا تھا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتی کہ موت عورت ہے۔" اس نے الماری کے پٹ بند کر دیے اور کرنل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میرے خیال میں موت ایک پنجوں والا جانور ہے۔"

"ممکن ہے" کرنل نے اعتراف کیا۔ "بعض اوقات بہت عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔"

اس نے پوسٹ ماسٹر کے بارے میں سوچا جو موم جامے کا لبادہ پہنے لانچ پر کودنے والا ہو گا۔ کرنل کو اپنا وکیل تبدیل کیے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اب تک وہ جواب کا مستحق ہو گیا تھا۔ ساباس کی بیوی موت کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ حتیٰ کہ اسے اندازہ ہوا کہ کرنل کے چہرے پر غائب دماغی کا تاثر ہے۔

"دوست!" وہ بولی۔ "تم پریشان لگتے ہو۔"

کرنل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"درست ہے، دوست!" اس نے جھوٹ بولا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ پانچ بج رہے ہیں اور مرغ کے ٹیکے کا اب تک انتظام نہیں ہو سکا۔"

ساباس کی بیوی حیران ہو گئی۔

"مرغ کا ٹیکا! جیسے وہ کوئی انسان ہو؟" وہ چلائی۔ "سخت بے دینی کی بات ہے!"

ساباس اب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اپنا غصے سے تمتمایا ہوا چہرہ اٹھا کر بولا،

"تم ایک منٹ کے لیے اپنا منہ بند رکھ سکتی ہو؟" اس حکم سے ڈر کر اس کی بیوی نے واقعتاً اپنا منہ ڈھانپنے کو ہاتھ اٹھا لیا۔ "پچھلے آدھے گھنٹے سے تم میرے دوست کا دماغ چاٹ رہی ہو۔"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں" کرنل نے احتجاج کیا۔

ساباس کی بیوی گھر کے اندر چلی گئی اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ ساباس نے لیونڈر میں تر رومال سے اپنی گردن کا پسینا پونچھا۔ کرنل اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ لمبی ٹانگوں والا ایک مرغ خالی چوک میں ایک طرف سے چلتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔

"کیا مرغ کو واقعی ٹیکے لگ رہے ہیں؟"

"ہاں" کرنل نے کہا۔ "اس کی مشق اگلے ہفتے سے شروع ہو گی۔"

"پاگل پن ہے" ساباس نے کہا۔ "یہ سب کچھ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"صحیح ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرغ کی گردن مروڑ دی جائے۔"

"تمہاری خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی ہے" ساباس نے کھڑکی کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ کرنل نے اسے دھونکنی کی طرح آہ بھرتے ہوئے سنا۔ اپنے دوست کی آنکھوں پر اسے بے حد رحم آیا۔

"ابھی میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں" کرنل نے کہا۔

"ناسمجھی کی بات نہ کرو" ساباس نے زور دیا۔ "اگر مرغ کو بیچ دو تو تمہارا دوہرا فائدہ ہے۔ ایک تو اس سردردی سے نجات ملے گی اور دوسرے نو سو پیسو جیب میں آئیں گے۔"

"نو سو پیسو!" کرنل چلایا۔

"نو سو پیسو!"

کرنل نے اپنے ذہن میں نو سو پیسو کا تصور باندھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ ایک مرغ کی خاطر لوگ اتنی دولت خرچ کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں؟"

"خیال ہی نہیں" ساباس نے جواب دیا۔ "مکمل یقین ہے۔"

انقلاب کا خزانہ واپس کرنے کے بعد سے کرنل کے ذہن میں آنے والی یہ سب سے بڑی رقم تھی۔ ساباس کے دفتر سے نکلتے وقت اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھا، مگر اسے یقین تھا کہ اس بار اس کی وجہ موسم نہیں۔ ڈاک گھر پہنچ کر وہ سیدھا پوسٹ ماسٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"مجھے ایک بہت ارجنٹ خط کی توقع ہے" کرنل نے کہا۔ "ایئرمیل سے آیا ہو گا۔"

پوسٹ ماسٹر نے خانوں میں دیکھا۔ خطوں کے نام پتے پڑھ کر اس نے انہیں مناسب خانوں میں واپس رکھ دیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ اپنے ہاتھ جھاڑ کر اس نے معنی خیز نظروں سے کرنل کو دیکھا۔

"آج اس خط کو یقیناً آنا چاہیے تھا" کرنل نے کہا۔

پوسٹ ماسٹر نے کندھے اچکائے۔

"صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو یقیناً آتی ہے، کرنل۔"

کرنل گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے مکئی کے دلیے کی رکابی اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ رک رک کر خاموشی سے کھاتا رہا۔ اس کے مقابل بیٹھی عورت کو احساس ہوا کہ کرنل کے چہرے پر کوئی تبدیلی آ چکی ہے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس ملازم کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا کام پنشن کے کاغذ تیار کرنا ہے"

کرنل نے جھوٹ بولا۔ "اگلے پچاس برس میں ہم تو اطمینان سے چھ فٹ مٹی کے نیچے سو رہے ہوں گے، مگر وہ غریب آدمی اپنی ریٹائرمنٹ کی پنشن کے انتظار میں ہر جمعے کو ہلکان ہوتا رہے گا۔"

"یہ تو برا شگون ہے۔" عورت نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قسمت پر قناعت کرتے جا رہے ہو۔" وہ دلیا کھاتی رہی۔ لیکن ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند اب تک اس سے بہت دور سوچوں میں کھویا ہوا ہے۔

"کم از کم کھانا تو اطمینان سے کھاؤ۔"

"ہاں، بہت مزے کا ہے۔" کرنل نے کہا۔ "مکئی کہاں سے آئی تھی؟"

"مرغ سے۔" عورت نے جواب دیا۔ "لڑکے اس کے لیے اتنی زیادہ لے آئے تھے کہ اس نے زائد مکئی میں ہمیں بھی شریک کر لیا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" کرنل نے آہ بھری۔ "تمام ایجادوں میں زندگی بہترین ایجاد ہے۔"

اس نے چولھے کے پائے سے بندھے مرغ کو دیکھا۔ اس بار وہ اسے پہلے سے مختلف لگا۔ عورت بھی مرغ کو دیکھ رہی تھی۔

"آج دوپہر کو مجھے بچوں کو ڈنڈے مار کر گھر سے بھگانا پڑا۔" اس نے کہا۔ "وہ ایک بوڑھی مرغی کو مرغ سے میل کرانے لائے تھے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔" کرنل نے کہا۔ "کرنل اوریلیانو بوئندیا کے ساتھ بھی ان قصبوں میں یہی ہوتا تھا۔ لوگ کمسن لڑکیوں کو اس سے میل کرانے لایا کرتے تھے۔"

وہ اس مذاق سے بہت محظوظ ہوئی۔ مرغ نے اپنے گلے سے آواز نکالی جو کمرے میں انسانی کلام کی طرح سنائی دی۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے یہ جانور ابھی باتیں کرنا شروع کر دے گا۔" عورت نے کہا۔ کرنل نے دوبارہ مرغ کی جانب دیکھا۔

"سونے میں تولنے کے لائق ہے۔" اس نے کہا۔ اس نے چمچے سے دلیا کھاتے ہوئے دل ہی دل میں کچھ حساب جوڑ لیا تھا۔ "مجھے توقع ہے کہ یہ مرغ ہمارے تین سال کی خوراک کا بندوبست کر دے گا۔"

"توقع سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔" عورت نے کہا۔

"نہ سہی، مگر آدمی کی ہمت تو قائم رہتی ہے۔" کرنل نے جواب دیا۔ "میرے دوست سابابس کی حیرت انگیز گولیوں کا بھی یہی حال ہے۔"

اس رات بدہضمی کو ذہن سے نکالنے کی کشمکش میں کرنل کو ٹھیک سے نیند نہ آ سکی۔ دوسرے روز دوپہر کو عورت نے مکئی کا دلیا دو رکابیوں میں ڈالا، اور اپنے حصے کے دلیے کو سر جھکا کر کھانے لگی۔ کرنل کو اس کی غمناک کیفیت کا سایہ خود پر پڑتا محسوس ہوا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" عورت نے کہا۔

کرنل کو لگا کہ اب اس کی بیوی کی جھوٹ بولنے کی باری ہے۔ اس نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ مگر اس کی کیفیت میں تبدیلی نہ آ سکی۔

"کوئی ایسی خاص بات نہیں۔" وہ بولی۔ "میں سوچ رہی تھی کہ موسیقار کو مرے دو ماہ ہو چکے ہیں اور میں ابھی تک اس کے خاندان کے پاس تعزیت کے لیے نہیں گئی۔"

لہٰذا اس رات وہ اس کے گھر گئی۔ کرنل اسے وہاں چھوڑ کر خود لاؤڈ سپیکر سے سنائی دینے والی موسیقی کی جانب کھنچا ہوا سینما گھر کی طرف چل دیا۔ پادری اینجل اپنے دفتر کے باہر بیٹھا سینما گھر کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ بستی میں سے کون کون گھنٹے کی بارہ ضربوں کی تنبیہ کے باوجود فلم دیکھنے سے باز نہیں رہ سکا۔ روشنی کے سیلاب، کرخت موسیقی اور بچوں کے شوروغل نے اس علاقے کی فضا میں ایک باقاعدہ رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے اپنی لکڑی کی بندوق سے کرنل کو دھمکایا۔

"مرغ کے بارے میں کیا خبر ہے کرنل؟" اس نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

کرنل نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"ابھی موجود ہے۔"

سینما گھر کے سامنے کی پوری دیوار پر چار رنگوں میں "آدھی رات کی دوشیزہ" کا اشتہار چسپاں تھا۔ اشتہار میں ایک عورت نے شام کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہن رکھا تھا، اور اس کی ایک ٹانگ ران تک ننگی تھی۔ کرنل اس علاقے میں گھومتا پھرتا رہا حتیٰ کہ کہیں دور گرج چمک شروع ہو گئی۔ تب وہ اپنی بیوی کو لینے چلا گیا۔

اس کی بیوی مرنے والے کے گھر پر نہ تھی۔ نہ وہ اپنے گھر پر تھی۔ کرنل نے اندازہ لگایا کہ کرفیو شروع ہونے میں تھوڑا ہی وقت باقی ہو گا، مگر گھڑی بند تھی۔ بارش کے طوفان کو آہستہ آہستہ قصبے کی جانب بڑھتا محسوس کرتے ہوئے وہ انتظار کرتا رہا۔ وہ تیار ہو کر دوبارہ باہر جانے والا ہی تھا کہ اس کی بیوی گھر میں داخل ہوئی۔

وہ مرغ کو خواب گاہ میں لے گیا۔ اس کی بیوی نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور بیٹھک میں پانی پینے گئی۔ کرنل نے اسی وقت گھڑی کو چابی دی تھی اور اب کرفیو کے بگل کا منتظر تھا تاکہ وقت ملا سکے۔

"تم کہاں تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہیں کہیں۔" عورت نے جواب دیا۔ اس نے گلاس کو گھڑونچی پر رکھ دیا، اور اپنے خاوند کی طرف دیکھے بغیر خواب گاہ میں چلی گئی۔ "کسے توقع تھی کہ بارشیں اتنی جلدی پھر شروع ہو جائیں گی۔" کرنل نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ جب کرفیو کا بگل بجا تو کرنل نے گھڑی میں گیارہ بجے کا وقت ملایا، اس کے تختے بند کیے اور کرسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی تسبیح پڑھنے میں مصروف ہے۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" کرنل نے کہا۔

"کیا؟"

"تم کہاں تھیں؟"

"وہیں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔" اس نے کہا۔ "اتنے عرصے بعد تو گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔"

کرنل نے اپنا جھولنا لٹکایا۔ اس نے گھر کی کنڈیاں لگائیں اور کمرے میں دوا چھڑکی۔ پھر

وہ لیمپ کو فرش پر رکھ کر بستر میں لیٹ گیا۔

"مجھے معلوم ہے،" وہ اداس لہجے میں بولا۔ "بُرے حالات کی بدترین بات یہ ہے کہ انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

کرنل کی بیوی نے لمبی آہ بھری۔

"میں پادری اینجل کے پاس گئی تھی،" اس نے کہا۔ "اس سے اپنی شادی کی انگوٹھی کے بدلے قرض مانگنے۔"

"کیا کہا اس نے؟"

"مقدس چیزوں کا لین دین کرنا گناہ ہے۔"

مچھردانی کے اندر سے اس نے بات جاری رکھی۔ "دو روز ہوئے میں نے گھڑی بیچنے کی کوشش کی تھی،" وہ بولی۔ "مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ سب لوگ قسطوں پر نئے چمکتے ہندسوں اور سوئیوں والے کلاک خرید رہے ہیں۔ ان میں اندھیرے میں بھی وقت نظر آتا ہے۔" کرنل کو احساس ہوا کہ چالیس برس کی رفاقت، اور بھوک اور تکلیف میں حصے داری نے بھی اپنی بیوی کو پوری طرح سمجھنے میں اس کی مدد نہیں کی۔ اسے لگا جیسے ان کی محبت میں بھی کوئی شے سالخوردہ ہو چکی ہے۔

"تصویر خریدنے کو بھی کوئی تیار نہیں ہے،" عورت نے کہا۔ "ہر ایک کے پاس وہی تصویر پہلے سے موجود ہے۔ حتیٰ کہ ترک نے بھی انکار کر دیا۔"

کرنل کو تلخی محسوس ہوئی۔

"تو اب ہر ایک کو پتا چل گیا ہے کہ ہم فاقے کر رہے ہیں۔"

"میں تھک گئی ہوں،" عورت نے کہا۔ "مردوں کو گھرداری کے مسائل کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ کئی بار مجھے پتھر ابالنے کو رکھنے پڑے ہیں تاکہ ہمسایوں کو یہ پتا نہ چل سکے کہ ہم کئی کئی دن ہانڈی چڑھائے بغیر رہتے ہیں۔"

[illegible] ری لگی۔

"یہ تو واقعی ذلت ہے۔"

اس کی بیوی مچھردانی سے نکلی اور کرنل کے بستر کے پاس گئی۔ "میں اس گھر کی وضعداری اور ساکھ سے دستبردار ہو رہی ہوں،" اس نے کہا۔ اس کی آواز غصے سے تیرہ ہونے لگی۔ "میں قناعت اور رکھ رکھاؤ سے عاجز آ چکی ہوں۔"

کرنل نے مطلق جنبش نہ کی۔

"بیس سال تک ان رنگین پرندوں کا انتظار کرتا جن کے وعدے ہر الیکشن پر کیے جاتے ہیں۔" اس نے یہی بات جاری رکھی۔ "اس سے ہمیں کیا ملا ہے؟ ایک مردہ بیٹے کے سوا کیا ملا ہے؟"

کرنل اس قسم کے طعنوں کا عادی تھا۔

"ہم نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔"

"اور انھوں نے اپنا فرض پورا کیا، بیس سال تک سینیٹ سے ہر مہینے ہزار پیسو کی تنخواہ وصول کر کے،" عورت نے جواب دیا۔ "عزیز دوست سباس کا حال دیکھ لو۔ اس کا گھر

دومنزلہ ہے لیکن اس کی ساری دولت رکھنے کے لیے پھر بھی ناکافی ہے۔ جب اس قصبے میں آیا تھا تو گلے میں سانپ لپیٹے دوائیں بیچا کرتا تھا۔"

"بیچارہ ذیابیطس کے ہاتھوں مر رہا ہے،" کرنل نے کہا۔

"اور تم بھوک کے ہاتھوں مر رہے ہو،" عورت نے کہا۔ "اب تک تمھیں علم ہو جانا چاہیے تھا کہ اپنی شان سے تم اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔"

بجلی کی کڑک نے اس کا سلسلۂ کلام منقطع کیا۔ سڑک پر دھماکا ہوا اور بجلی کمرے میں داخل ہو کر بستر کے نیچے سے یوں گزری جیسے پتھر لڑھک رہے ہوں۔ کرنل کی بیوی اپنی تسبیح اٹھانے کے لیے مچھردانی کی طرف لپکی۔

کرنل مسکرایا۔

"اپنی زبان قابو میں نہیں رکھو گی تو تمھارے ساتھ یہی ہو گا،" اس نے کہا۔ "میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ خدا میرے ساتھ ہے۔"

لیکن حقیقت میں وہ شدید تلخی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے لیمپ بجھا دیا، اور اس اندھیرے میں جو بجلی کی چمک سے بار بار چاک ہو رہا تھا، گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے ماکوندو یاد آیا۔ نیرلانڈیا کے مقام پر کیے ہوئے وعدوں کے پورا ہونے کے انتظار میں کرنل کو دس برس گزر چکے تھے۔ ایک سہ پہر نیند کی غنودگی میں اس نے ایک پیلی گرد آلود ریل گاڑی کو قصبے میں داخل ہوتے دیکھا۔ گاڑی کے ڈبوں کے اندر باہر حتیٰ کہ چھتوں پر بھی مرد عورتیں اور جانور لدے ہوئے تھے۔ یہ کیلوں کی فصل سے کمائی کی دیوانگی تھی۔

چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر نوواردوں نے قصبے کی کایاکلپ کر دی تھی۔ "میں یہاں سے جا رہا ہوں،" کرنل نے اس وقت کہا تھا۔ "کیلوں کی بُو میری انتڑیاں چاٹ رہی ہے۔" اور اس نے ماکوندو کو، واپسی کی گاڑی پر، بدھ ۲۷ جون ۱۹۰۶ کو دوپہر دو بج کر اٹھارہ منٹ پر ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں تقریباً نصف صدی لگی کہ نیرلانڈیا میں اطاعت قبول کرنے کے وقت سے لے کر اب تک اسے سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا۔

کرنل نے آنکھیں کھولیں۔

"اب اس بارے میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے،" وہ بولا۔

"کس بارے میں؟"

"مرغ کے بارے میں،" کرنل نے کہا۔ "کل میں اسے سباس کے ہاتھ نو سو پیسو میں فروخت کر دوں گا۔"

خصّی جانوروں کی چیخیں سباس کی چیخ پکار میں شامل ہو کر دفتر کی کھڑکی میں سے اندر آ رہی تھیں۔ اگر سباس اگلے دس منٹوں میں اندر نہ آیا تو میں یہاں سے چل دوں گا، کرنل نے دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اپنےآپ سے عہد کیا۔ لیکن اس نے مزید بیس منٹ انتظار کیا۔ وہ

اٹھ کر چلنے کو تھا جب ساباس کارکنوں کے غول کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ کئی بار وہ کرنل کی طرف دیکھے بغیر اس کے سامنے آتا جاتا رہا۔

"میرا انتظار کر رہے ہو دوست؟"

"ہاں دوست،" کرنل نے کہا۔ "لیکن اگر تم بہت مصروف ہو تو میں کسی اور وقت آ جاؤں گی۔"

دروازے کے عقب سے ساباس کو اس کی بات سنائی نہ دی۔

"میں ابھی آتا ہوں،" ساباس نے کہا۔

دوپہر کی گرمی دم گھونٹے دیتی تھی۔ سڑک کی روشنی سے دفتر تمتما رہا تھا۔ گرمی کی کسالت سے کرنل نے بلاارادہ آنکھیں بند کر لیں، اور یکدم اپنی بیوی کے بارے میں خواب دیکھنے لگا۔ ساباس کی بیوی دبےپاؤں دفتر میں داخل ہوئی۔

"جاگو مت، دوست،" وہ بولی۔ "میں کھڑکی کے پردے گرانے آئی تھی۔ دفتر جہنم کی طرح تپ رہا ہے۔"

کرنل خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پردے گرانے کے بعد، ساباس کی بیوی کمرے کے اندھیرے میں بولی۔

"کیا تم اکثر خواب دیکھتے ہو؟"

"کبھی کبھی،" کرنل نے اپنے اونگھنے پر پشیمان سا ہو کر جواب دیا۔ "مجھے تقریباً ہمیشہ یہی خواب آتا ہے کہ میں مکڑی کے جالوں میں پھنستا جا رہا ہوں۔"

"مجھے ہر رات ڈراؤنے خواب آتے ہیں،" ساباس کی بیوی نے کہا۔ "اب میرے دماغ میں یہی بات سمائی ہوئی ہے کہ کسی طرح خواب میں آنے والے لوگوں کے بارے میں پتا کیا جائے کہ وہ کون ہیں۔"

اس نے پنکھا چلا دیا۔ "پچھلے ہفتے میں نے ایک عورت کو دیکھا جو میرے سرہانے کھڑی تھی،" وہ بولی۔ "میں نے پوچھ ہی لیا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا میں وہ عورت ہوں جو بارہ برس پہلے اسی کمرے میں فوت ہوئی تھی۔"

"لیکن اس گھر کو بنے تو مشکل سے دو برس ہوئے ہوں گے" کرنل نے کہا۔

"درست ہے" سابس کی بیوی نے جواب دیا۔ "اس سے پتا چلتا ہے کہ مردے بھی حساب میں غلطی کر جاتے ہیں۔"

پنکھے کی گھوں‌گھوں سے کمرے کا اندھیرا اور گہرا لگنے لگا۔ سباس کی بیوی خوابوں سے ہٹ کر اب اواگون کے مسئلے پر اظہار خیال کر رہی تھی۔ اپنی خودگی اور اس عورت کی بےتکی گفتگو سے کرنل بےچین ہونے لگا۔ وہ گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ پڑنے کا منتظر تھا تاکہ رخصت چاہے، کہ سباس اپنے فورمین کے ہمراہ دفتر میں داخل ہوا۔

"میں تمہارا سوپ چار دفعہ گرم کر چکی ہوں،" اس کی بیوی نے کہا۔

"چاہے دس دفعہ گرم کر لو،" سباس نے کہا، "لیکن اس وقت میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

سباس نے تجوری کھول کر فورمین کو نوٹوں کی ایک گڈی اور کاغذ پر لکھی ہدایات کی فہرست تھمائی۔ فورمین نے نوٹ گننے کے لیے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ سباس نے دفتر کے عقبی

حصے میں کرنل کو بیٹھے دیکھا مگر کوئی تاثر ظاہر نہ کیا۔ وہ فورمین سے باتوں میں مصروف رہا۔ جس وقت سباس اور فورمین دوبارہ دفتر سے باہر جانے والے تھے، کرنل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھولنے سے قبل سباس رکا۔

"میں تمہاری کیا خدمت کروں دوست؟"

کرنل نے دیکھا کہ فورمین اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں دوست،" وہ بولا۔ "میں تم سے صرف بات کرنا چاہتا تھا۔"

"جو کہنا ہے جلدی سے کہو،" سباس نے کہا۔ "مجھے ایک منٹ کی فرصت نہیں ہے۔"

وہ دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھ کر ذرا رکا۔ کرنل کو اپنی زندگی کے پانچ طویل ترین سیکنڈ گزرنے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے دانت بھینچ لیے۔

"مرغ کے بارے میں،" وہ بڑبڑایا۔

اب تک سباس دروازہ کھول چکا تھا۔ "مرغ کے بارے میں،" اس نے دوہرایا، مسکرا کر فورمین کو ہال کی طرف دھکیلا۔ "یہاں آسمان گرنے والا ہے اور میرے دوست کو مرغ کی پڑی ہے۔"

اور پھر کرنل سے مخاطب ہو کر بولا،

"ٹھیک ہے دوست، میں ابھی آتا ہوں۔"

کرنل دفتر کے وسط میں ساکت کھڑا رہا یہاں‌تک کہ اسے دونوں آدمیوں کے پیروں کی چاپ ہال کے سرے پر پہنچ کر سنائی دینی بند ہو گئی۔ تب وہ دفتر سے باہر نکلا اور قصبے میں گشت کرنے لگا جو اتوار کے قیلولے میں مفلوج پڑا تھا۔ درزی کی دکان پر کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر کا دفتر بند تھا۔ شامی کی دکان کے تختوں پر پڑے مال کی حفاظت کرنے کو بھی کوئی موجود نہ تھا۔ دریا فولاد کی چادر جیسا لگ رہا تھا۔ کنارے پر ایک آدمی تیل کے چار پیپوں پر لیٹا، اپنا چہرہ ہیٹ سے ڈھانپے سو رہا تھا۔ کرنل کو لگا جیسے سارے شہر میں وہی متحرک ہے۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اس کی بیوی دوپہر کا باقاعدہ کھانا سامنے رکھے اس کی منتظر تھی۔

"یہ سب میں نے ادھار لیا ہے، کل پیسے دینے کا وعدہ کر کے،" اس نے وضاحت کی۔

کھانا کھانے کے دوران کرنل نے اسے پچھلے تین گھنٹوں کا ماجرا سنایا۔ وہ بےچینی کے ساتھ اس کی بات سنتی رہی۔

"تمہارے ساتھ دقت یہ ہے کہ تم میں کردار نام کو بھی نہیں ہے،" وہ آخرکار بولی۔ "تم اپنےآپ کو یوں پیش کرتے ہو جیسے خیرات مانگ رہے ہو جب کہ تمہیں وہاں سر اٹھا کر جانا چاہیے تھا، اور ہمارے دوست کو ایک طرف لے جا کر اس سے صاف صاف کہنا چاہیے تھا کہ دوست، میں نے مرغ تمہارے ہاتھ بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تمہارے حساب سے تو زندگی ہوا کی طرح سبک ہے،" کرنل نے کہا۔

عورت کے رویے سے بیحد چستی کا اظہار ہوتا تھا۔ صبح صبح اس نے گھر کو صاف کیا تھا اور اپنا حلیہ عجیب وغریب بنا رکھا تھا۔ اس نے کرنل کے پرانے جوتے پہن رکھے تھے، کمر کے گرد موم جامے کا ایپرن باندھ رکھا تھا، اور بالوں پر کپڑے کی دھجی، جس میں کانوں کے

اوپر دونوں جانب کرہیں تھیں۔ "تم میں کاروبار کی ذرا سوجھ بوجھ نہیں ہے،" وہ بولی۔ "کوئی چیز بیچتے وقت آدمی کے چہرے پر وہی کیفیت ہونی چاہیے جو خریدتے وقت ہوتی ہے۔"

کرنل اس کے حلیے سے خاصا محظوظ ہوا۔

"تم نے ابھی جو شکل بنا رکھی ہے اسے قائم رکھنا،" کرنل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔ "تم کویکر اوٹس کے ڈبے پر بنے ہوئے آدمی کی طرح لگ رہی ہو۔"

اس نے سر سے کپڑے کی دھجی اتار پھینکی۔

"میں سنجیدگی سے بات کر رہی ہوں،" اس نے کہا۔ "میں مرغ کو ابھی سباباس کے پاس لے جا رہی ہوں، اور تم جتنی رقم کی چاہو شرط لگا لو، آدھ گھنٹے میں نو سو پیسو کے ساتھ واپس آ جاؤں گی۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے،" کرنل نے کہا۔ "ابھی سے تم مرغ کی رقم سے شرطیں بدنے لگی ہو۔"

بہت مشکل سے کرنل نے اسے سباباس کے ہاں جانے سے باز رکھا۔ عورت نے ساری صبح یہ دیکھنے میں ہر جمعے کی مسلسل کوفت کے بغیر، اگلے تین برس کے اخراجات کا تخمینہ لگانے میں صرف کی تھی۔ اس نے گھر کے لیے ضرورت کی چیزوں کی فہرست بنائی تھی جس میں اس نے کرنل کے لیے جوتوں کے نئے جوڑے کو فراموش نہیں کیا تھا۔ خواب گاہ میں نیا آئینہ لگانے کے لیے اس نے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ اپنے منصوبوں کی وقتی شکست نے اسے پشیمان اور رنجیدہ کر دیا۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ جا کر سو رہی۔ جب وہ اٹھی تو کرنل انگنی میں بیٹھا تھا۔

"اب تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں،" کرنل نے جواب دیا۔

"تب تو مسئلہ حل ہو گیا۔ اگلے پچاس برس تک ہم مرغ کی رقم حاصل کرنے کی توقع رکھ سکتے ہیں۔"

لیکن حقیقت میں کرنل اسی شام مرغ فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے سباباس کا خیال آیا، جو اس وقت دفتر میں اکیلا پنکھے کے آگے بیٹھا اپنا روز کا ٹیکا لگوانے کی تیاری کر رہا ہو گا۔ اس کا جواب تیار تھا۔

"مرغ کو ساتھ لے جاؤ،" باہر نکلتے ہوئے کرنل کی بیوی نے اسے مشورہ دیا۔ "اسے جیتاجاگتا پیش سامنے دیکھ کر سباباس پر حیرت انگیز اثر ہو گا۔"

کرنل کو مرغ کو اپنے ساتھ لے جانے پر اعتراض تھا۔ وہ مایوس اضطراب میں اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آئی۔

"دفتر میں پوری فوج بھی موجود ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں،" اس نے کہا۔ "تم سباباس کو بازو سے پکڑ لینا اور اس وقت تک نہ چھوڑنا جب تک وہ نو سو پیسو تمہارے حوالے نہ کر دے۔"

"وہ سمجھیں گے کہ ہم نے ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

کرنل کی بیوی نے اس فقرے پر دھیان نہ دیا۔

"یہ یاد رکھنا کہ تم مرغ کے مالک ہو،" اس نے اصرار کیا۔ "اور اس پر احسان کر رہے ہو۔"

"اچھا۔"

سباباس ڈاکٹر کے ہمراہ خواب گاہ میں تھا۔ "اب موقع ہے،" اس کی بیوی نے کرنل سے کہا۔ "ڈاکٹر اسے تین چار روز کے سفر کے لیے تیار کر رہا ہے۔ سباباس اب کی جمعرات کو جائے گا۔" کرنل دو متضاد قوتوں سے نبرد آزما تھا: مرغ کو بیچ دینے کے عزم کے باوجود وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوتا اگر وہ ایک گھنٹے دیر سے آیا ہوتا، اور اس سے ملاقات نہ کر سکتا۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں،" وہ بولا۔

لیکن سباباس کی بیوی مصر رہی۔ وہ اسے خواب گاہ میں لے گئی، جہاں سباباس اپنے تخت جیسے بستر پر، زیر جامہ پہنے، اپنی بےرنگ آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر جمائے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے سباباس کے پیشاب کا نمونہ شیشے کی نالی میں گرم کیا، اس کی بُو سونگھی اور اثبات میں سر ہلایا۔ کرنل اس سارے عمل کے ختم ہونے کا منتظر رہا۔

"اسے گولی مارنی پڑے گی،" ڈاکٹر نے کرنل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ذیابیطس امیر آدمیوں کو ختم کرنے میں بہت دیر لگاتی ہے۔"

"تمہارے انسولین کے ملعون ٹیکوں نے خاصی کوشش کی ہے،" سباباس نے کہا اور اپنے کولہوں کے بل تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ "لیکن مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔" پھر وہ کرنل سے مخاطب ہوا:

"اندر آ جاؤ دوست۔ دوپہر کو جب میں تمہیں دیکھنے باہر نکلا ہوا تھا تب تمہاری ٹوپی بھی کہیں نظر نہیں آئی۔"

"میں پہنتا ہی نہیں تاکہ ہر ایک کے سامنے سر سے اتارنی نہ پڑے۔"

سباباس کپڑے پہننے لگا۔ ڈاکٹر نے خون کے نمونے والی شیشی کی نلکی اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ پھر اپنے بیگ میں چیزوں کو ترتیب سے رکھا۔ کرنل نے سوچا ڈاکٹر وہاں سے رخصت ہونے والا ہے۔

"میں تمہاری جگہ ہوں تو اپنے دوست کو ایک لاکھ پیسو کا بل بھیج دوں، ڈاکٹر،" کرنل نے کہا۔ "اتنی رقم جانے سے سباباس کی پریشانی بہت حد تک کم ہو جائے گی۔"

"میں پہلے ہی اسے ایک کروڑ پیسو کا بل بھیجنے کی تجویز دے چکا ہوں،" ڈاکٹر نے کہا۔ "غربت ذیابیطس کا بہترین علاج ہے۔"

"تجویز کا شکریہ،" سباباس نے اپنے ضخیم پیٹ گھڑسواری کی تنگ پتلون کے اندر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں امارت کے عذاب سے بچانے کی خاطر، میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر کو اپنے چرمی بیگ کے چمکدار تالے کی سطح پر اپنے دانتوں کا عکس دکھائی دیا۔ بےصبری دکھائے بغیر ڈاکٹر نے کلاک کی طرف دیکھا۔ سباباس بوٹ پہنتے پہنتے اچانک کرنل کی طرف مڑا۔

"تو پھر دوست، مرغ کا کیا بن رہا ہے؟"

کرنل نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بھی اس کے جواب کا منتظر ہے۔ اس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے۔

"کچھ نہیں بچ رہا، دوست" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "میں تمھارے پاس اس کا سودا کرنے آیا ہوں۔"

سابابس بوٹ پہن چکا تھا۔

"ٹھیک ہے، دوست،" اس نے کسی جذبے کے بغیر جواب دیا۔ "نہایت معقول بات ہے۔"

"میری عمر اب ان پیچیدگیوں میں پڑنے کی نہیں رہی،" کرنل نے ڈاکٹر کے چہرے پر مبہم قسم کا تاثر دیکھ کر توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میری عمر بیس سال کم ہوتی تو اور بات تھی۔"

"کرنل، تمھاری عمر ہمیشہ بیس سال کم ہی رہے گی،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

کرنل کی حواس کچھ بحال ہوئے۔ وہ سابابس کی مزید کچھ بات کرنے کا منتظر رہا، مگر وہ کچھ نہ بولا۔ وہ اپنی چمڑے کی زپ والی جیکٹ پہن کر کمرے سے باہر جانے کو تیار ہو گیا۔

"اگر تم چاہو تو ہم اگلے ہفتے اس بارے میں بات کر سکتے ہیں،" کرنل نے کہا۔

"ہاں میں بھی یہی کہنے والا تھا،" سابابس نے کہا۔ "ایک خریدار میری نظر میں ہے جو مرغ کے چار سو پیسو دے دے گا لیکن جمعرات تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کتنے پیسو؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"چار سو۔"

"مجھے تو پتا چلا تھا کہ مرغ کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے،" ڈاکٹر نے کہا۔

"تم نے خود نو سو پیسو کا ذکر کیا تھا،" کرنل نے ڈاکٹر کی حیرت سے حوصلہ پا کر کہا۔ "وہ سارے علاقے کا بہترین مرغ ہے۔"

سابابس نے ڈاکٹر کو جواب دیا۔

"کوئی اور وقت ہوتا تو اس کے ہزار پیسو بھی مل جاتے،" اس نے وضاحت کی۔ "مگر اتنے قیمتی مرغ کو کوئی نہیں لڑانے۔ ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ پالی سے زندہ باہر نہ نکلے [illegible]

"دوست، میں تمھیں یہی بتانا چاہتا تھا۔"

کرنل نے تائید میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے" وہ بولا۔

وہ سابابس کے پیچھے پیچھے ہال میں آ گیا۔ ڈاکٹر نشست کے کمرے میں سابابس کی بیوی سے مصروف گفتگو رہا جو اس سے ان کیفیتوں کا علاج دریافت کر رہی تھی جو بقول اس کے آدمی پر اچانک وارد ہو جاتی ہیں اور جن کے بارے میں آدمی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہیں۔ کرنل دفتر میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ سابابس نے تجوری کھولی، اپنی تمام جیبیں نوٹوں سے بھریں اور چار نوٹ کرنل کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لو یہ ساٹھ پیسو ہیں دوست،" اس نے کہا۔ "جب مرغ بک جائے گا تو حساب کر لیں گے۔"

کرنل ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے پر دکانوں کے پاس سے گزرے، جن پر بعد دوپہر کی خنکی کے باعث رونق ہونی شروع ہو گئی تھی۔ کشتی سے لدا ایک بجرا پانی کے بہاؤ کے

رخ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ کرنل نے ڈاکٹر کو غیرمعمولی طور پر اپنے خیالوں میں گم پایا۔

"اور تمھارا کیا حال ہے ڈاکٹر؟" کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔

"ویسا ہی جیسا پہلے تھا" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے بھی کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"اس کی وجہ سردی ہے،" کرنل نے کہا۔ "یہ مجھے بھی اندر سے کھاتی رہتی ہے۔"

ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ دلچسپی سے عاری نظر سے کرنل کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے دکانوں پر بیٹھے شامیوں سے یکے بعد دیگرے دعاسلام کی۔ ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے پر کرنل نے مرغ کی فروخت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا،" کرنل نے توضیح کی۔ "اس جانور کی غذا انسانی گوشت ہے۔"

"واحد جانور جس کی غذا انسانی گوشت ہے وہ سابابس ہے،" ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے وہ مرغ کو نو سو میں آگے بیچ دے گا۔"

"اچھا تمھارا یہ خیال ہے!"

"مجھے پکا یقین ہے،" ڈاکٹر بولا۔ "یہ اتنا ہی نفع بخش سودا ہے جتنا اس کا میئر کے ساتھ حب الوطنی کا مشہور معاہدہ تھا۔"

کرنل نے ڈاکٹر کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ "مگر میرے دوست نے وہ معاہدہ اپنی جان کے خوف سے کیا تھا،" کرنل نے کہا۔ "وہ اسی طرح اس قصبے میں رہ سکتا تھا۔"

"اور اسی طرح اپنے ساتھیوں کی جائیداد آدھی قیمت پر خرید سکتا تھا جنھیں میئر نے نکال باہر کیا تھا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا کیوں کہ اسے اپنی جیب میں چابیاں نہیں ملیں۔ تب اس نے کرنل کی بےیقینی کا سامنا کیا۔

"اتنے سادہ‌لوح مت بنو،" اس نے کہا۔ "سابابس کو اپنی جان کے مقابلے میں پیسے سے زیادہ دلچسپی ہے۔"

اس رات کرنل کی بیوی خریداری کرنے بازار گئی۔ شامیوں کی دکانوں تک وہ بھی اس کے ساتھ گیا، اور ڈاکٹر کے انکشافات پر غور کرتا رہا۔

"لڑکوں کو تلاش کر کے انھیں فوراً بتا دو کہ مرغ بک گیا ہے،" اس نے کرنل سے کہا۔ "انھیں خواہ مخواہ امید دلائے رکھنے سے کیا فائدہ؟"

"مرغ اس وقت تک نہیں بکے گا جب تک میرا دوست سابابس واپس نہیں آ جاتا،" کرنل نے جواب دیا۔

اس نے الوارو کو بلیرڈ ہال میں رُولیٹ کھیلتے پایا۔ اس اتوار کی رات بلیرڈ ہال تپ رہا تھا، اونچی آواز میں بجتے ریڈیو کی ارتعاش کی وجہ سے گرمی اور بھی شدید لگ رہی تھی۔ کرنل موم جامے کے بڑے سے میزپوش پر رنگے ہوئے اور میز کے درمیان ایک ڈبے پر رکھی تیل کی لالٹین کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے ہندسوں کو دیکھ دیکھ کر آپ ہی خوش کرتا رہا۔ الوارو باربار تیئس کے ہندسے پر پیسے لگا کر ہارنے پر مصر تھا۔ اس کے شانے پر سے کھیل کا

دائرہ بیٹھے ہوئے، کرنل نے مشاہدہ کیا کہ پچھلی نو دفعہ کے گھماؤ میں گیارہ کا ہندسہ چار بار ظاہر ہوا ہے۔

"گیارہ پر لگاؤ،" کرنل نے الوارو کے کان میں کہا۔ "یہی بار بار آ رہا ہے۔"

الوارو نے میز کو غور سے دیکھا۔ اگلی بار اس نے رقم نہیں لگائی۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے کچھ نقدی، اور کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ اس نے پرزہ میز کے نیچے سے کرنل کو دیا۔

"اگستین نے بھیجا ہے،" اس نے کہا۔

کرنل نے خفیہ تحریر اپنی جیب میں ڈال لی۔ الوارو نے گیارہ پر خاصی بڑی رقم لگا دی۔

"تھوڑے پیسوں سے شروع کرو،" کرنل نے کہا۔

"کیا پتا تمہارا قیاس درست ہو،" الوارو نے جواب دیا۔ پاس کھڑے چند جواریوں نے دوسرے ہندسوں سے رقمیں اٹھا کر گیارہ پر لگا دیں، حالانکہ رنگدار پہیے نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔ کرنل نے پیشاب کو مجبور محسوس کیا۔ اسے پہلی مرتبہ جوئے کی کشش، اضطراب اور تلخی کا احساس ہوا۔

اس بار پانچ نمبر آیا۔

"مجھے افسوس ہے،" کرنل نے احساسِ جرم اور شرمندگی سے بےاختیار ہو کر الوارو سے کہا۔ اس کی نظریں لکڑی کی اس جھاڑو پر لگی ہوئی تھیں جس سے میز پر سے الوارو کی لگائی ہوئی رقم سمیٹی جا رہی تھی۔ "جس بات سے میرا کوئی واسطہ نہیں اس میں مجھے ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے تھی۔"

الوارو کرنل کی طرف دیکھے بغیر مسکرایا۔

"کوئی پروا نہیں کرنل۔ سب چلتا ہے۔"

اچانک، مامبو بجاتے ہوئے بگل خاموش ہو گئے۔ کھلاڑی ہاتھ ہوا میں اٹھائے تتربتر ہو گئے۔ کرنل کو اپنے عقب میں بندوق کا گھوڑا چڑھائے جانے کی واضح، کرخت اور سرد آواز سنائی دی۔ اسے احساس ہو کہ وہ پولیس کے چھاپے میں پھنس گیا ہے، اور اس کی جیب میں خفیہ اخبار ہے۔ وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے بغیر تھوڑا سا مڑا۔ تب اس نے بہت قریب سے، زندگی میں پہلی بار، اس شخص کو دیکھا جس نے اس کے بیٹے کو گولی ماری تھی۔ وہ شخص کرنل کے بالکل سامنے تھا اور اس کی بندوق کی نالی کا رخ کرنل کے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ چھوٹے سے قد کا، انڈین خدوخال اور موسموں سے سنولائی جلد والا آدمی تھا جس کے سانس سے بچوں جیسی بو آ رہی تھی۔ کرنل نے اپنے دانت کچکچائے اور آہستگی سے بندوق کی نالی کا رخ اپنی انگلیوں سے موڑ کر دوسری جانب کر دیا۔

"گستاخی معاف،" اس نے کہا۔

اس نے چمگادڑ کی سی دو چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کا سامنا کیا۔ لمحے بھر میں اسے محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں اسے نگل رہی ہوں، اور پھر فوراً ہی انہوں نے اسے کچل کر ہضم کر کے باہر نکال دیا ہو۔

"تم جا سکتے ہو کرنل۔"

یہ بتانے کے لیے کہ یہ دسمبر آ گیا ہے، اسے کھڑکی کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ باورچی خانے میں مرغے کے ناشتے کے لیے پھل کاٹ رہا تھا، اس نے اسے اپنی ہڈیوں میں محسوس کیا۔ تب اس نے دروازہ کھولا اور صحن کی سمت ایک نظر نے اس کے احساس کی تصدیق کر دی۔ یہ ایک حیرت انگیز صحن تھا، جس میں گھاس اور درخت تھے اور ڈبے جیسا غسل خانہ جو زمین سے ایک ملی میٹر اوپر تیرتا لگتا تھا۔

عورت نو بجے تک بستر میں رہی۔ جس وقت وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی، اس وقت تک کرنل گھر کی صفائی کر چکا تھا، اور مرغ کے اردگرد دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے بچوں سے باتوں میں مشغول تھا۔ عورت کو چولھے تک پہنچنے کے لیے لمبا چکر کاٹنا پڑا۔

"راستے سے ہٹ جاؤ،" وہ چلائی۔ اس نے قہرآلود نظروں سے مرغ کی سمت دیکھا۔ "پتہ نہیں اس منحوس سے کب چھٹکارا حاصل ہو گا!"

کرنل نے مرغ کے اوپر سے اپنی بیوی کی کیفیت کا جائزہ لیا۔ مرغ سے خفگی بےوجہ تھی۔ وہ لڑائی کی مشق کے لیے تیار تھا۔ اس کی گردن اور جامنی پروں والی ٹانگیں، اس کی آری کے دندانوں والی کلغی؛ اس کا بدن چھریرا ہو گیا تھا، اس کا انداز بےمدافعت تھا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھو اور مرغ کو بھول جاؤ،" بچوں کے جانے کے بعد کرنل نے کہا۔ "ایسی صبح ہے کہ آدمی کا تصویر کھنچوانے کو جی چاہتا ہے۔"

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، مگر اس کے چہرے پر کوئی جذبہ ظاہر نہ ہوا۔ "میں گلاب لگانا چاہتی ہوں،" چولھے کی طرف لوٹتے ہوئے وہ بولی۔ کرنل نے شیو بنانے کے لیے آئینہ دیوار پر لٹکایا۔

"گلاب لگانے کو جی چاہ رہا ہے تو لگا لو،" اس نے کہا۔

وہ اپنی حرکات کو آئینے کے عکس کے مطابق رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مگر انہیں سؤر کھا جاتے ہیں،" وہ بولی۔

"اور بھی اچھی بات ہے،" کرنل نے کہا۔ "گلابوں پر پلے ہوئے سؤر زیادہ لذیذ ہونے چاہییں۔"

اس نے آئینے کے کونے میں اپنی بیوی کو دیکھنے کی کوشش کی، اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی سنجی برقرار ہے۔ چولھے کی آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ چولھے ہی کی طرح کے مادے کا بنا لگتا تھا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھے بغیر، اپنی بیوی پر نظریں جمائے، وہ ہمیشہ کی طرح چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر شیو بناتا رہا۔ عورت، ایک طویل خاموشی کے دوران، سوچ میں غرق رہی۔

"لیکن میں گلاب نہیں لگانا چاہتی،" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے،" کرنل نے کہا۔ "تو پھر مت لگاؤ۔"

کرنل کی طبیعت ٹھیک تھی۔ دسمبر کے آتے ہی اس کی انتڑیوں میں اگنے والے نباتات مرجھا گئے تھے۔ صبح صبح اسے نئے جوتے پہننے کی کوشش میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

کئی دفعہ کوشش کرنے کے بعد جب اسے احساس ہوا کہ یہ فضول ہے تو اس نے اپنے نئے چمڑے کے جوتے ہی پہن لیے۔ اس کی بیوی نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

"نئے جوتے نہیں پہنو گے تو وہ کبھی ڈھیلے نہیں پڑیں گے،" اس نے کہا۔

"یہ تو کسی معذور کے جوتے ہیں" کرنل نے احتجاج کیا۔ "لوگوں کو چاہیے کہ ایسے جوتے بیچا کریں جو ایک ماہ تک استعمال کیے جا چکے ہوں۔"

وہ دوپہر خط کی آمد کے احساس سے بےتاب ہو کر وہ گلی میں نکل آیا۔ چوں کہ لانچوں کے آنے میں ابھی دیر تھی، وہ سباس کے دفتر میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ سے بتایا گیا کہ سباس سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اس غیرمتوقع رکاوٹ کے باوجود کرنل نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ "جلد یا بدیر اسے واپس تو آنا ہی ہے،" اس نے اپنے آپ سے کہا اور بندرگاہ کی طرف چل پڑا۔ یہ ایک حیرت انگیز لمحہ تھا جس میں اس کی ہوشمندی سالم اور بےداغ تھی۔

"دسمبر کا مہینا سارے سال چلنا چاہیے،" موسی شامی کی دکان میں بیٹھے ہوئے وہ منھ ہی منھ میں بولا۔ "آدمی کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کانچ کا بنا ہوا ہو۔"

موسی کو یہ تصوّر اپنی بھولی بسری عربی میں ترجمہ کرنے میں قدرے محنت کرنا پڑی۔ وہ ہموار، کھنچی ہوئی جلد میں اپنے کانوں تک لپٹا ایک حلیم الطبع مشرقی تھا۔ اس کی حرکت کسی ڈوبتے ہوئے شخص کی حرکات کی طرح بےڈھب نہیں، بلکہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے اسے ابھی کھینچ کر پانی سے باہر نکالا گیا ہو۔

"پہلے یوں ہی ہوتا تھا،" اس نے کہا۔ "وہی حال رہتا تو میری عمر اس وقت آٹھ سو ستاون سال کی ہوتی۔ اور تمھاری؟"

"پچھتّر سال" کرنل نے کہا، اس کی آنکھیں پوسٹ ماسٹر کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اس وقت اسے سرکس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ڈاک والی لانچ کی چھت پر بہت سی رنگ برنگی چیزوں کے درمیان سرکس کے پیوند لگے خیمے کو پہچان لیا۔ دوسری لانچوں پر اوپر نیچے رکھے ڈبوں میں جنگلی جانوروں کو ڈھونڈنے کی کوشش میں پوسٹ ماسٹر یک لمحے کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے جانور نظر نہ آئے۔

"یہ سرکس ہے!" وہ بولا۔ "یہ پہلا سرکس ہے جو پچھلے دس برس میں آیا ہے۔"

موسی شامی نے اس کی تصدیق کی۔ وہ ملی جلی عربی اور ہسپانوی میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ اس نے دکان کے عقبی حصے سے اسے جواب دیا۔ اس نے اپنے آپ سے کچھ کہا، اور پھر اپنی فکرمندی کا ترجمہ کر کے کرنل کو بتایا۔

"اپنی بلی کو چھپا دو، کرنل۔ ورنہ لڑکے اسے چرا کر سرکس میں بیچ دیں گے۔"

کرنل اٹھ کر پوسٹ ماسٹر کے پیچھے جانے کو تھا۔

"یہ جنگلی جانوروں کا تماشا نہیں ہے،" اس نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،" شامی نے جواب دیا۔ "رسے پر چلنے والے بلیاں کھاتے ہیں تاکہ اپنی ہڈیاں نہ توڑ بیٹھیں۔"

وہ پوسٹ ماسٹر کے پیچھے پیچھے ساحل پر دکانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا چوک تک آ

پہنچا۔ وہاں مرغوں کی لڑائی جیسے شور نے اسے تعجب میں ڈال دیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے اس کے مرغ کے بارے میں کچھ کہا۔ تب اسے یاد آیا کہ آج مرغوں کی جانچ پرکھ کا دن ہے۔

وہ ڈاک خانے کے سامنے سے گزر گیا۔ ایک لمحے بعد وہ مرغوں کی لڑائی کی پالی کے شوروغل میں گم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے مرغ کو پالی میں اکیلا اور بےمدافعت کھڑا دیکھا، اس کے پنجوں پر دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے کانپتے پیروں سے خوف جیسی کوئی شے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا حریف ایک اداس خاکستری مرغ تھا۔

کرنل کو کوئی جذبہ محسوس نہ ہوا۔ مرغ ایک دوسرے پر ایک ہی طریق سے حملہ آور ہوئے۔ لوگوں کی پرجوش داد و تحسین کے درمیان ان کے پر، پنجے اور گردنیں چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے میں گتھ گئیں۔ پالی کی باڑھ سے ٹکرا کر حریف مرغ نے قلابازی کھائی، اور لوٹ کر پھر حملہ آور ہوا۔ اس کے مرغ نے حملہ نہ کیا۔ بلکہ ہر حملے کی مدافعت کر کے اپنی جگہ واپس آتا رہا۔ مگر اب اس کے پاؤں نہیں کانپ رہے تھے۔

ایرنان نے باڑھ پھلانگی، اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا، اور تماشائیوں کے ہجوم کے سامنے اس کی نمائش کرنے لگا۔ لوگوں نے دیوانہ وار تحسین کے نعرے بلند کیے۔ کرنل نے لوگوں کی داد کے ولولے اور مرغوں کی لڑائی کی شدت میں عدم تناسب کو محسوس کر لیا۔ اسے یہ سب ایک سوانگ معلوم ہوا، جس میں دونوں مرغوں نے خود کو -- ارادی اور شعوری طور پر -- شریک ہو جانے دیا تھا۔

کچھ کچھ حقارت آمیز تجسس سے مجبور ہو کر اس نے لڑائی کی دائرہ نما پالی کا جائزہ لیا۔ پرجوش مجمع نشستوں سے ایک دوسرے کو دھکیلتا نیچے پالی کی طرف آ رہا تھا۔ کرنل نے پرجوش، بےتاب اور مکمل طور پر زندہ چہروں کے اس ہجوم کی ابتری کا مشاہدہ کیا۔ وہ سب نئے لوگ تھے۔ قصبے کے تمام نئے باشندے۔ اس نے -- ایک پیش آگہی کے ساتھ -- ایک ایسے لمحے کو ایک بار پھر بسر کیا جو اس کی یادداشت کے سرے پر محو ہو چکا تھا۔ تب وہ باڑھ پھلانگ کر ہجوم میں سے راستا بناتا ہو پالی کے وسط میں جا پہنچا اور ایرنان کی پرسکون آنکھوں کا سامنا کیا۔ وہ دونوں آنکھیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"سہ پہر بخیر، کرنل۔"

کرنل نے مرغ کو اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "سہ پہر بخیر،" وہ بڑبڑایا۔ وہ اور کچھ نہ بولا کیوں کہ اس جاندار کے گرم اور گہرے ارتعاش نے اس پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ زندہ شے اپنے ہاتھوں میں نہیں لی۔

"تم گھر پر نہیں تھے،" ایرنان نے گڑبڑا کر کہا۔

داد و تحسین کے ایک نئے شور نے اس کی بات کاٹ دی۔ کرنل کو ڈر سا محسوس ہوا۔ اس نے ہجوم میں سے، کسی کی طرف دیکھے بغیر، تحسین کے نعروں اور شوروغل سے سہمے ہوئے، ایک بار پھر راستا بنانا شروع کیا اور مرغ کو بغل میں دبائے گلی میں نکل آیا۔

سارا قصبہ -- نچلے طبقے کے لوگ -- اسے گزرتا دیکھنے کے لیے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اسکول کے بچے تھے۔ چوک کے کونے پر ایک دیوقامت نیگرو اپنی گردن کے گرد سانپ

تھیں، میز پر کھڑا لاؤڈ سپیکر کے بغیر دواشی بج رہا تھا۔ بندرگاہ سے واپس آتے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا مجمع اس کے اردگرد کھڑا اس کے قصے سن رہا تھا۔ لیکن جب کرنل مرغ اٹھائے اُن کے پاس سے گزرا تو سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ گھر کا راستہ کبھی اب طویل نہیں ہو تھا۔

اسے کوئی عجلت نہ تھی۔ ایک طویل عرصے تک یہ قصبہ، دس برس کی تاریخ کی دست بُرد کا شکار، بےہوشی کے عالم میں رہا تھا۔ اس سہ پہر — بغیر خط کے ایک اور جمعے کی سہ پہر — لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کرنل کو ایک اور زمانے کی یاد آئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایک بڑی چھتری کے نیچے بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے جو بارش کے باوجود جاری ہے۔ اس نے پارٹی کے رہنماؤں کو یاد کیا جو نہایت احتیاط کے ساتھ بیٹھے ہوئے، اس کے گھر کے دالان میں موسیقی کی تال پر اپنے پنکھے جھل رہے تھے۔ اس نے ڈھول کی اذیت ناک دھمک کو اپنی انتڑیوں میں تقریباً پھر سے بسر کیا۔

وہ گودی کے متوازی سڑک پر چلتا گیا اور وہاں بھی اس نے بہت پہلے کی الیکشن کی ایک اتوار کا پرشور ہجوم دیکھا۔ لوگ سرکس کو اترتے دیکھ رہے تھے۔ ایک خیمے کے اندر سے کسی عورت نے چیخ کر مرغ کے بارے میں کچھ کہا۔ وہ اپنے آپ میں گم گھر کی طرف چلتا رہا۔ اسے ابھی تک بکھری ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جیسے پارٹی کے نعروں کی باقیات اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔

دروازے پر وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا

"اب سب گھر جاؤ" اس نے کہا۔ "جو کوئی اندر آیا اس کی چمڑی ادھیڑ دی جائے گی۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور سیدھا باورچی خانے میں گیا۔ اس کی بیوی بےترتیب سانسوں [illegible] سے نکلی۔

"وہ اسے زبردستی لے گئے" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے ان سے کہا کہ جب تک [illegible] مرغ اس گھر سے باہر نہیں جائے گا۔" کرنل نے مرغ کو چولھے کے پائے سے [illegible] اس کی بیوی کو غصے [illegible] اور اس کا پیچھا کرتی رہی۔

"انہوں نے کہا وہ اسے ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی لے جائیں گے" وہ بولی۔ "انہوں نے کہا مرغ ہمارا نہیں، پورے قصبے کا ہے۔"

مرغ کے کاموں سے فارغ ہو کر ہی کرنل نے اپنی بیوی کے بگڑے ہوئے چہرے کی طرف توجہ دی۔ اس پر بغیر کسی تعجب کے انکشاف ہوا کہ اسے دیکھ کر نہ اسے افسوس ہوا اور [illegible]

"انہوں نے ٹھیک کیا" اس نے [illegible] سے کہا۔ اور پھر اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے وہ ایک قسم کی بےتھاہ شیرینی کے ساتھ بولا:

"مرغ بیچنے کے لیے نہیں ہے"

وہ اس کے پیچھے پیچھے خواب گاہ میں گئی۔ وہ اسے مکمل طور پر انسانی، لیکن رسائی سے باہر محسوس ہوا، جیسے وہ اسے سینما کے پردے پر دیکھ رہی ہو۔

کرنل نے الماری میں سے نکال کر رکھے ہوئے چند نوٹ نکالے، اپنی جیبوں میں موجود

رقم ان میں شامل کی، سارے نوٹوں کو گنا، اور الماری میں واپس رکھ دیا۔

"میرے دوست ساباس کو لوٹانے کے لیے انتیس پیسو ہیں۔" اس نے کہا۔ "باقی کی رقم اسے میری پنشن آنے پر ملے گی۔"

"لیکن اگر تمہیں پنشن نہ ملی تو؟" عورت نے پوچھا۔

"ملے گی۔"

"لیکن اگر نہ ملی تو؟"

"تو پھر، اسے باقی رقم کی ادائیگی نہیں ہو گی۔"

اس نے بستر کے نیچے سے جوتوں کا نیا جوڑا نکالا۔ پھر جوتوں کا خالی ڈبا لیتے الماری کے پاس گیا۔ جوتوں کے تلے ایک چیتھڑے سے صاف کیے، اور جوتوں کو ڈبے میں اسی طرح رکھ دیا جیسے اس کی بیوی انہیں اتوار کی رات کو لائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"جوتے واپس کیے جاتیں گے" کرنل نے کہا۔ "اس طرح میرے دوست سابس کے لیے تیرہ پیسو کا اور انتظام ہو گیا۔"

"وہ انہیں واپس نہیں لیں گے" وہ بولی۔

"انہیں لینے ہوں گے،" کرنل نے جواب دیا۔ "میں نے صرف دو بار پہنے ہیں۔"

"ترک ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے" عورت نے کہا۔

"انہیں سمجھنا ہو گا۔"

"اگر وہ نہ سمجھیں تو؟"

"تو پھر نہ سہی۔"

وہ کھانا کھائے بغیر بستر پر گئے۔ کرنل نے اپنی بیوی کی تسبیح کے ختم ہونے کا انتظار کیا تاکہ لیمپ بجھا سکے۔ لیکن وہ سو نہ سکا۔ اس نے فلم کے سنسر کی گھنٹیاں سنیں اور تقریباً اچانک — تین گھنٹے بعد — کرفیو کا بگل سنا۔ رات کی سرد ہوا سے اس کی بیوی کے سانس کا کرب اور بڑھ گیا تھا۔ کرنل کی آنکھیں کھلی تھیں جب وہ اس سے دھیمے، صلح جو لہجے میں مخاطب ہوئی

"تم جاگ رہے ہو۔"

"ہاں۔"

"سمجھ بوجھ سے کام لو۔" اس نے کہا۔ "کل جا کر سابس سے بات کر لو۔"

"وہ سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

"بہتر ہے۔" عورت بولی۔ "اس طرح تمہیں سوچنے کے لیے تین دن مل جائیں گے۔"

"سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے" کرنل نے کہا۔

کوہر کی چپچپاہٹ کی بجائے اب ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ پلوور پرندوں کی آمدورفت کے بندھے ٹکے معمول سے کرنل نے دسمبر کو ایک بار پھر پہچانا۔ رات دو بجے تک وہ نیند سے کوسوں دور تھا۔ لیکن اسے علم تھا کہ اس کی بیوی بھی جاگ رہی ہے۔ اس نے جھولنے میں کروٹ بدلنے کی کوشش کی۔

"تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے۔" عورت نے کہا۔

"نہیں۔"

وہ ایک لمحے سوچتی رہی۔

"ہم ایسا کرنے کی صورت حال میں نہیں ہیں" وہ بولی۔ "ذرا سوچو چار سو پیسو کی یک مشت رقم کتنی ہوتی ہے؟"

"اب پنشن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی،" کرنل نے کہا۔

"تم پندرہ سال سے یہی کہتے آ رہے ہو۔"

"اسی لیے تو،" کرنل نے کہا، "اب زیادہ دیر نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ لیکن جب اس نے دوبارہ بات کی تو کرنل کو کوئی وقفہ محسوس نہ ہوا۔

"مجھے لگتا ہے پنشن کبھی نہیں ملے گی،" عورت نے کہا۔

"ملے گی۔"

"اور اگر نہ ملی تو؟"

کرنل اس کا جواب نہ دے سکا۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ اسے حقیقت کا احساس ہوا، مگر وہ دوبارہ دبیز، محفوظ اور بےتاسف نیند میں ڈوب گیا۔ جب وہ اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ اس کی بیوی سو رہی تھی۔ کرنل نے باقاعدگی کے ساتھ صبح کے تمام فرائض ہر روز کی طرح، مگر دو گھنٹے دیر سے پورے کیے اور ناشتے کے لیے اپنی بیوی کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

جب وہ اٹھی تو بہت کم گو تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو صبح بخیر کہا، اور خاموشی سے ناشتے کے لیے بیٹھ گئے۔ کرنل نے پنیر اور میٹھا بن کھایا اور بغیر دودھ کی کافی کا پیالا پیا۔ صبح کا باقی تمام وقت اس نے درزی کی دکان پر بیٹھ کر گزارا۔ ایک بجے وہ گھر واپس آیا، اور اپنی بیوی کو بیگونیا کے گملوں کے درمیان کپڑے رفو کرتے ہوئے پایا۔

"دوپہر کے کھانے کا وقت ہے،" اس نے کہا۔

"کھانا نہیں ہے۔"

کرنل نے کندھے اچکائے۔ وہ صحن کی دیوار کے ان سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش کرنے لگا جن سے بچے باورچی خانے میں گھس آیا کرتے تھے۔ جب وہ دوبارہ دالان میں آیا تو کھانا میز پر رکھا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران کرنل کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی بہت کوشش سے رونے سے گریز کر رہی ہے۔ اس یقینی بات سے وہ چونک اٹھا۔ وہ اپنی بیوی کی طبیعت سے واقف تھا، جو فطری طور پر سخت تھی، اور تلخی کے چالیس برسوں نے اسے اور بھی سخت کر دیا تھا۔ اپنے بیٹے کی موت پر بھی اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا تھا۔

اس نے اپنی پرملامت نگاہ اپنی بیوی کی آنکھوں پر مرکوز کر دی۔ وہ اپنے ہونٹ کترتی، آستین سے اپنی پلکیں پونچھتی، کھانا کھاتی رہی۔

"تمھیں کسی کا کوئی خیال نہیں ہے،" اس نے کہا۔

کرنل کچھ نہ بولا۔

"تم خودسر، ضدی اور خودغرض ہو،" اس نے دوہرایا۔ اس نے اپنی چھری کانٹے رکابی میں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیے، مگر فوراً ہی اپنے توہم کے زیراثر انھیں سیدھا کر دیا۔ "ساری

عمر میں نے اس لیے بھاڑ جھونکا تھا کہ اب آ کر مجھے معلوم ہو کہ میری وقعت ایک مرغ سے بھی کم ہے۔"

"یہ اور معاملہ ہے،" کرنل نے کہا۔

"یہ ایک ہی معاملہ ہے،" عورت نے جواب دیا۔ "تمھیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے کہ میں مرنے والی ہوں۔ میرا یہ مرض دراصل آہستہ آہستہ آتی ہوئی موت ہے۔"

جب تک کرنل نے کھانا ختم نہیں کر لیا، کچھ نہ بولا۔

"اگر ڈاکٹر مجھے یہ ضمانت دے دے کہ مرغ کے بیچنے سے تمھارا دمہ ٹھیک ہو جائے گا، تو میں اسے ابھی بیچ دوں گا،" اس نے کہا۔ "ورنہ نہیں۔"

اس سہ پہر وہ مرغ کو لڑائی کی چال میں لے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی کو دمے کے دورے کے قریب پایا۔ وہ بازو پھیلائے، بال کھولے، بےچینی میں دالان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتی اپنے پھیپھڑوں کی سیٹیوں پر قابو پانے اور اپنا سانس درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شام تک وہ اسی حالت میں رہی۔ پھر اپنے خاوند سے بات کیے بغیر، وہ جا کر بستر میں لیٹ گئی۔

کرفیو شروع ہونے کے کچھ دیر بعد تک وہ دعائیں پڑھتی رہی۔ کرنل نے لیمپ بجھانا چاہا۔ مگر اس نے اعتراض کیا۔

"میں اندھیرے میں نہیں مرنا چاہتی،" اس نے کہا۔

کرنل نے جلتے ہوئے لیمپ کو فرش پر رہنے دیا۔ اسے تھکن محسوس ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ سب کچھ فراموش کر کے چوالیس دن کے لیے سو جائے، اور بیس جنوری کو سہ پہر تین بجے، چال میں جاگے تاکہ عین وقت پر مرغ کو لڑائی کے لیے اتار سکے۔ لیکن اسے اپنی بیوی کی متوقع بےخوابی سے ڈر محسوس ہوا۔

"وہی پرانی کہانی ہے،" ایک لمحے بعد وہ بولنے لگی۔ "ہم بھوکے رہتے ہیں تاکہ دوسروں کا پیٹ بھر سکے۔ چالیس برس سے یہی ہو رہا ہے۔"

کرنل خاموش رہا، یہاں تک کہ اس کی بیوی نے پوچھنے کو رکی کہ آیا وہ جاگ رہا ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تب عورت نے اطمینان اور روانی اور کٹھورپن سے اپنی بات جاری رکھی۔

"ہر شخص مرغ پر پیسا لگا کر جیت جائے گا، ہمارے سوا۔ صرف ہم ہی جن کے پاس مرغ پر لگانے کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

"مرغ کا مالک منافعے میں سے بیس فیصد کا حقدار ہوتا ہے۔"

"الیکشن میں جی جان سے کام کرنے کے بعد تم کسی عہدے کے بھی حقدار تھے،" عورت نے جواب دیا۔ "خانہ جنگی میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر سپاہیوں کی پنشن کے بھی حقدار تھے۔ اب سب کی زندگیاں بن گئی ہیں، اکیلے تم ہو جو بھوکے مر رہے ہو۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں،" کرنل نے کہا۔

اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی، مگر نیند نے اس پر غلبہ پا لیا۔ وہ یک آہنگی کے ساتھ دیر تک بولتی رہی یہاں تک کہ اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند سو چکا ہے۔ تب وہ

مچھردانی سے نکلی اور بیٹھک کے اندھیرے میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ وہاں بھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔ سورج ڈھلنے کے وقت کرنل نے اسے آواز دی۔

بجھتے ہوئے لیمپ کی بتی سے پڑتی ہوئی روشنی میں وہ ایک روح کی طرح دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس نے مچھردانی میں داخل ہونے سے پہلے لیمپ بجھا دیا۔ مگر وہ بولتی رہی۔

"ہم ایک کام کر سکتے ہیں،" کرنل نے اس کی بات کاٹی۔

"ہم صرف ایک کام کر سکتے ہیں کہ مرغے کو بیچ دیں۔" عورت نے کہا۔

"ہم گھڑی بھی تو بیچ سکتے ہیں۔"

"اسے کوئی نہیں خریدے گا۔"

"کل میں الوارو سے پوچھوں گا اگر وہ مجھے چالیس پیسو دے سکے۔"

"وہ نہیں دے گا۔"

"تب ہم تصویر بیچ سکتے ہیں۔"

اس بار کرنل کی بیوی بات کرنے کے لیے مچھردانی سے باہر نکل آئی۔ کرنل کو اپنی بیوی کی دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے آلودہ سانس کی بو آئی۔

"اسے کوئی نہیں خریدے گا۔" وہ بولی۔

"دیکھیں گے" کرنل نے نرمی سے اور اپنے لہجے میں کوئی تبدیلی لائے بغیر کہا۔ "اب جا کر سو جاؤ۔ کل اگر کوئی چیز بھی نہ بک سکی تو کوئی اور طریقہ سوچیں گے۔"

کرنل نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر نیند نے اس کے ارادے کو خاک میں ملا دیا۔ وہ وقت اور مقام کے احساس سے دور ایک بے حس کیفیت کی تہہ میں جا گرا جہاں اس کی بیوی کے الفاظ نے ایک مختلف مفہوم اختیار کر لیا۔ مگر ایک لمحہ بعد اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا کندھا ہلا رہا ہو۔

"میری بات کا جواب دو۔"

کرنل کو علم نہ ہو سکا کہ یہ الفاظ اس نے نیند میں جانے کے بعد سنے تھے یا اس سے پہلے۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ سنہری اور شفاف صبح کی سرسبزی میں کھڑکی کی شکل واضح تھی۔ اس نے سوچا شاید اسے بخار ہے۔ اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں اور اسے ذہن کو ابہام دور کرنے میں سے بہت دقت کا سامنا ہو۔

"اگر ہم کچھ بھی نہ بیچ سکے تو کیا کریں گے؟" اس کی بیوی نے اپنا سوال دہرایا۔

"تب تک بیس جنوری کا دن آ چکا ہو گا،" کرنل نے کہا۔ وہ اب پوری طرح بیدار تھا۔ "اور مرغوں کی لڑائی کے مقابلے میں سے بیس فیصد اسی شام مل جائے گا۔"

"اگر مرغ جیت گیا تو،" عورت نے کہا۔ "اور اگر وہ ہار گیا تو کیا ہو گا؟ تم نے یہ سوچا تک نہیں کہ وہ ہار بھی سکتا ہے۔"

"وہ ایسا مرغ ہے جو نہیں ہار سکتا۔"

"فرض کرو وہ ہار گیا تو؟"

"اس بارے میں سوچنے کو ابھی چوالیس دن پڑے ہیں۔" کرنل نے کہا۔

اس کی بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"اور اس عرصے میں ہم کھائیں گے کیا؟" اس نے پوچھا اور کرنل کو اس کی فلالین قمیص کے کالر سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔

اس ایک لمحے تک پہنچنے میں کرنل کو پچھتر برس لگے تھے، ایک ایک لمحہ کر کے بسر کیے ہوئے اس کی زندگی کے پچھتر برس۔ جواب دینے کے لمحے میں اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر پاک صاف، واضح اور ناقابل تسخیر محسوس کیا۔

"گو،" اس نے کہا۔

آج

سالانہ خریداری

اندرونِ ملک

چار شماروں کی قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

بی ۲۰، سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی

بیرونِ ملک

امریکہ اور کینیڈا کے لیے

چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۲۰ امریکی ڈالر

بھیجنے کا پتا :

Prof. Muhammad Umar Memon
5417 Regent Street
Madison, Wisconsin 53705
U.S.A.

انگلینڈ اور باقی ممالک کے لیے

چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۱۵ پاؤنڈ

بھیجنے کا پتا :

Ms. Shabana Mahmud
52 Queen's Road
Wimbledon
London SW19 8LR
England

انتخاب کے اس حصے میں مارکیز کے ناول Chronicle of a Death Foretold کا مکمل ترجمہ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ناول جو ہسپانوی زبان میں ۱۹۸۱ میں اور انگریزی میں ۱۹۸۲ میں شائع ہوا قدرت بیان کا ایک بے مثل شاہکار اور مارکیز کی منفرد تحریر ہے۔

[illegible]

گیبریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: افضل احمد سیّد

ایک پیش گفتہ موت کی روداد

جس دن وہ اسے قتل کرنے جا رہے تھے، سانتیاگو نصر ساڑھے پانچ بجے اس کشتی کا انتظار کرنے کے لیے بیدار ہوا جس پر بشپ آ رہا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ [illegible] والے درختوں کے جھنڈ سے گزر رہا ہے جہاں ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں، اور ایک لمحے کے لیے وہ اپنے خواب میں خوش تھا، مگر جب وہ جاگا، اس نے خود کو چڑیوں کی بیٹ سے مکمل طور پر لتھڑا ہوا پایا۔ "وہ ہمیشہ درختوں کے بارے میں خواب دیکھتا تھا،" پلاسیدا لینیرو، اس کی ماں نے ستائیس سال بعد اس ناخوش آئند سوموار کی تفصیلات یاد کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ "ایک ہفتے پہلے، اس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ ٹین کے ورق سے بنے ہوائی جہاز میں تنہا ہے اور بادام کے باغوں میں کسی درخت سے ٹکرائے بغیر اڑ رہا ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ پلاسیدا لینیرو کو دوسروں کے خوابوں کی، اگر وہ نہار منہ سنائے جاتے، درست تعبیر بتانے میں بجا طور پر ایک نیک نامی حاصل تھی، مگر وہ اپنے بیٹے کے ان دو خوابوں میں، یا درختوں کے دوسرے خوابوں میں، جو اس نے اپنے قتل سے پہلے والی صبحوں میں اسے سنائے تھے، کسی بدشگونی کو محسوس نہیں کر سکی تھی۔

نہ سانتیاگو نصر ہی پیش گوئی کو جان سکا۔ وہ کمزوری سمیت، کم اور بے حال سویا اور سردرد اور الوداعی جشن کی تلچھٹ اپنی زبان پر لیے نیند سے جاگا، اور اس نے انہیں شادی کی رنگ رلیوں کے، جو آدھی رات کے بعد تک مچتی رہی تھیں، قدرتی اثر سے وابستہ کیا۔ مزید برآں، بہت سے لوگوں کو [illegible] وہ چھ بج کر پانچ منٹ پر اپنے گھر چھوڑنے [illegible] کر ایک گھنٹے بعد تک، جب وہ سور کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا [illegible]

وہ ذرا خواب آلود مگر خوش مزاجی میں تھا، اور اس نے ان سب پر ایک مہربانانہ انداز میں حرف رسی کی تھی کہ یہ ایک بہت خوبصورت دن ہے۔ کوئی یقینی نہیں تھا کہ آیا اس کا اشارہ موسم کی کیفیت کی طرف تھا۔ دوبارہ یاد کرتے ہوئے بہت سے افراد نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ ایک روشن صبح تھی، کیلوں کے باغ سے سمندری ہوا آ رہی تھی، جیسا کہ اس وقت کی ایک پُرکیف فروری میں توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر زیادہ تر لوگ متفق تھے کہ ابرآلود سلیٹی آسمان اور رُکے ہوئے پانی کی درشت بُو کی وجہ سے موسم ماتم انگیز تھا، اور بدقسمتی کے اس لمحے میں ایک نم نم پھوار، جیسی کہ سانتیاگو نصر نے اپنے خواب کے باغیچے میں دیکھی تھی، پڑ رہی تھی۔ میں، شادی کی ہنگامہ خیزی سے چور، ماریا الیخاندرینا سروانتس کی خوابگاہی آغوش میں تدارک پذیر تھا، اور اطلاعی گھنٹوں کی فریاد سن، یہ سوچتے ہوئے بیدار ہوا کہ انہیں بشپ کے اعزاز میں بیدار کر دیا گیا ہے۔

سانتیاگو نصر بغیر کلف لگی سفید لنن کی قمیص اور پتلون میں، جیسی کہ اس نے گزشتہ دن شادی میں پہنی تھیں، ملبوس تھا۔ اگر بشپ نہ آ رہا ہوتا تو وہ اپنا خاص خاکی لباس اور نمدے سے اونچے گھڑسواری کے جوتے پہنتا جو وہ ہر سوموار کو ڈیوائن فیس میں مویشیوں کی اس پرورش گاہ کو جانے کے لیے پہنتا تھا جو اس نے اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی اور جس کا اس نے ہوشیاری سے، مگر زیادہ خوش طالعی کے بغیر، نظم و نسق چلایا تھا۔ قصبے سے باہر وہ پی بیلٹ پر میگنم ۳۵۷، باندھتا تھا، اور اس کی خود چرمی گولیاں، اس کے کہنے کے بموجب ایک گھوڑے کو درمیان سے کاٹ کر رکھ سکتی تھیں۔ تیتروں کے موسم میں وہ اپنے شکرے سے شکار کا سازوسامان بھی ساتھ لے جاتا۔ صندوق خانے میں ایک مالنچر شونااور ۳۰۰۶ رائفل، ایک ہالینڈ میگنم ۳۰۰ رائفل، دوہری طاقت کی دوربینی دیدبیش والی ہارنیٹ ۲۲، اور ونچسٹر ریپیٹر موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی طرح اسلحہ تکیے کے غلاف میں چھپا کر سوتا تھا، مگر اس دن گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے گولیاں نکال کر سائڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دی تھیں۔ "وہ کبھی اسے بھرا ہوا نہیں چھوڑتا تھا۔" اس کی ماں نے مجھے بتایا۔ میں یہ جانتا تھا، اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بندوقیں ایک جگہ رکھتا تھا اور گولیاں دوسری جگہ کافی فاصلے پر، تاکہ کوئی بےمقصد بھی انہیں گھر کے اندر بھرنے کی ترغیب کا شکار نہ ہو سکے۔

یہ ایک ہوش مندانہ روش تھی جو اس کے باپ نے اس صبح سے ہمیشہ کے لیے قائم کی جب ایک خدمتگار لڑکی نے تکیہ نکالنے کے لیے غلاف کو جھٹکا اور پستول فرش سے ٹکرا کر چل گیا، اور گولی کمرے کی الماری کو تباہ کرتی، نشست کے کمرے کی دیوار سے پڑوس کے مکان کے کھانے کے کمرے سے کسی گرج کے ساتھ گزری، اور ایک قدِ آدم ولی کو، چوک کے بالمقابل مرکزی محراب پر، پلاسٹر کے غبار میں تبدیل کر دیا۔ سانتیاگو نصر نے، جو اس وقت خوردسال تھا، کبھی اس حادثے کو فراموش نہیں کیا۔ اس کی ماں کے پاس اس کا آخری عکس اس کا شب خوابی کے کمرے سے تیزی کے ساتھ گزرنا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو جگا دیا تھا، جب وہ غسل خانے میں دواؤں کی چھوٹی الماری میں آہستگی سے اسپرین تلاش کر رہا تھا، اور اس کی ماں نے بتی جلائی اور اس کو، پانی کا ایک گلاس اپنے ہاتھ میں لیے، دہلیز سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا، جیسا کہ وہ اسے تاابد یاد رکھے گی۔ سانتیاگو نصر نے اسے خواب کے

متعلق بتایا، مگر اس نے درختوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

"پرندوں کا خواب میں نظر آنا اچھی صحت کی علامت ہے" اس نے کہا۔

اُس کی ماں نے، اِسی جھولے میں اِسی کروٹ سے لیٹے اُسے دیکھا تھا، جس میں مَیں نے اسے بڑھاپے کی آخری روشنیوں میں اُفتادہ پایا، جب میں نے حافظے کے شکستہ آئینے کے ان منتشر ٹکڑوں کو باہم پیوستہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس فراموش قصبے کو مراجعت کی۔ پوری روشنی میں وہ بمشکل شکلوں کا اندازہ کر پاتی تھی، اور اس کی کنپٹیوں پر چند شفابخش پتیاں اس جاوداں سردرد کے لیے رکھے ہوئے تھی جو اس کا بیٹا شب خوابی کے کمرے سے آخری بار گزرتے ہوئے اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں جھولے کے سرے کی رسیاں اپنی مٹھی میں جکڑے، وہ اپنی کروٹ پر تھی اور ادھ سایوں میں بپتسمے کے حوض کی وہی بُو تھی جس نے مجھے جرم کی صبح چونکا دیا تھا۔

ابھی میں چوکھٹ پر نمودار بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے مجھے سانتیاگو نصر کی یاد سے خلط ملط کر دیا۔ "وہ وہیں پر تھا۔" پلاسیدا لینیرو نے مجھے بتایا، "وہ سفید لنن کے لباس میں تھا جسے اس نے سادہ پانی میں دھویا تھا، کیونکہ اس کی جلد اتنی حساس تھی کہ کلف کے شور کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔" وہ جھولے میں دیر تک بیٹھی کاہو کے بیج چباتی رہی یہاں تک کہ اس کا یہ اشتباہ کہ اس کا بیٹا لوٹ آیا ہے، اس سے رفع ہو گیا۔ پھر اس نے آہ بھری: "وہی میری زندگی کا سہارا تھا۔"

میں نے سانتیاگو نصر کو اس کی ماں کے حافظے میں دیکھا۔ گزشتہ جنوری کے آخری ہفتے میں وہ اکیس سال کا ہو گیا تھا۔ وہ چھریرا اور پریدہ رنگ تھا، اور اس کے عرب پپوٹے اور گھنگریالے بال اپنے باپ پر تھے۔ وہ ایک غرض مندی کی شادی کی، جس میں مسرت کا کوئی موقع نہیں آیا، اکلوتی اولاد تھا۔ مگر وہ اپنے باپ کے ساتھ خوش نظر آتا تھا، تین سال پہلے تک جب موخرالذکر اچانک مر گیا، اور وہ اپنی تن تنہا ماں کے ساتھ ویسا ہی خوش نظر آنا جاری رکھے ہوئے تھا، یہاں تک کہ اس کی موت کا سوموار آ گیا۔ اس نے اپنی جبلّت اپنی ماں سے پائی تھی۔ اپنے باپ سے اس نے بہت ابتدائی عمر میں آتشیں اسلحے کا چابکدستی سے استعمال، اس کا گھوڑوں سے عشق اور اونچے اڑنے والے شکاری پرندوں پر پوری مہارت حاصل کی تھی مگر اس نے اپنے باپ سے دلیری اور تدبّر کا ارفع ہنر بھی سیکھا تھا۔ وہ آپس میں عربی بولتے تھے، مگر پلاسیدا لینیرو کے سامنے نہیں، تاکہ وہ اپنے آپ کو جدا محسوس نہ کرے۔ دونوں باپ بیٹے قصبے میں کبھی ہتھیاربند نہیں نظر آئے، اور صرف ایک بار وہ اپنے تربیت کردہ پرندے ایک بازار میں شکار کے مظاہرے کے لیے لائے تھے۔ اس کے باپ کی موت نے اسے اپنی تعلیم کو ثانوی اسکول کے خاتمے پر ترک کرنے پر مجبور کر دیا تھا، تاکہ وہ موروثی پرورش گاہ کی ذمہداری اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر سنبھال سکے۔ اپنے اوصاف میں سانتیاگو نصر خوش و خرم، صلح جُو اور کشادہ دل تھا۔

جس دن وہ اسے قتل کرنے جا رہے تھے، اس کی ماں نے اسے سفید کپڑوں میں دیکھ کر سوچا کہ وہ اپنے دنوں کے اندازے میں غلطی کر گیا ہے۔ "میں نے اسے یاد دلا دیا کہ آج سوموار ہے،" پلاسیدا لینیرو نے مجھے بتایا۔ مگر اس نے اپنی ماں سے وضاحت کی کہ وہ کلیسائی وضع

میں اس لیے ملبوس ہے کہ شاید اسے بشپ کی انگشتری کا بوسہ لینے کا موقع مل جائے۔ اس کی ماں نے دل چسپی کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ "وہ تو کشتی سے اترے گا بھی نہیں" اس نے اس سے کہا۔ "وہ انہیں حسبِ دستور فرض برکتیں دے گا، اور جس راستے سے آیا ہے اسی پر لوٹ جائے گا۔ اسے اس قصبے سے نفرت ہے۔"

سانتیاگو نصر جانتا تھا کہ یہ حقیقت ہے، مگر کلیسا کا جاہ و جلال اس کے لیے ایک ناقابلِ مزاحمت سحر تھا۔ "یہ فلموں کی طرح ہے،" اس نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ بشپ کی آمد سے متعلق واحد شے جس سے اس کی ماں غرض رکھتی تھی، وہ سانتیاگو نصر کا بارش میں بھیگنے سے بچنا تھا، کیوں کہ اس نے اسے سوتے میں چھینکتے ہوئے سنا تھا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ ایک چھتری لے جانے کا مشورہ دیا، مگر اس نے الوداع کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ یہ آخری موقع تھا جب اس کی ماں نے اسے دیکھا۔

وکتوریا گزمان، باورچن، غیرمتذبذب تھی کہ اس دن، بلکہ فروری کے پورے مہینے میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ "اس کے برخلاف،" اس نے مجھے بتایا، جب میں اس کی موت سے تھوڑے عرصے پہلے اس سے ملنے گیا، "دھوپ سے ہر چیز اگست سے پہلے ہی تپنے لگتی ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے کتوں کے درمیان، دوپہر کے کھانے کے لیے خرگوشوں کے ٹکڑے کر رہی تھی، جب سانتیاگو نصر باورچی خانے میں داخل ہوا۔ "وہ ہمیشہ ایک فاسد رات کے چہرے کے ساتھ اٹھتا تھا،" وکتوریا گزمان نے کسی تاثر کے بغیر یاد کیا۔ دیوینا فلور، اس کی لڑکی، جو بلوغت کو پہنچ رہی تھی، سانتیاگو نصر کو گنے کی شراب ملی کوہستانی کافی کا ایک مگ پیش کیا تاکہ وہ پچھلی رات کا بوجھ برداشت کر سکے۔ وسیع و عریض باورچی خانہ، آگ کی سرگوشیوں اور اپنے بسیروں میں سوئی ہوئی مرغیوں کے ساتھ ایک پرسرار فضا رکھتا تھا۔ سانتیاگو نصر نے ایک اور اسپرین نگلی اور خاموشی سے سوچتے ہوئے اپنی نظریں ان دو عورتوں سے ہٹائے بغیر، جو اسٹوو پر خرگوشوں کے شکم چاک کر رہی تھیں، چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے ساتھ کافی پینے بیٹھ گیا۔ اپنی عمر کے باوجود، وکتوریا گزمان ابھی تک اچھی صحت میں تھی۔ لڑکی بھی ذرا شوریدہ سر، اپنے غدود کی سرگرمی میں مستغرق نظر آتی تھی۔ سانتیاگو نصر نے اسے کلائی سے پکڑا جب وہ خالی مگ اس سے لینے آئی۔

"تمہارے ہل نکلنے کا وقت آ رہا ہے،" اس نے دیوینا فلور سے کہا۔ وکتوریا گزمان نے اسے خون آلود چھری دکھائی۔

"اسے چھوڑ دو" اس نے سانتیاگو نصر کو سختی سے حکم دیا۔ "جب تک میں زندہ ہوں تم اس چشمے کی ایک بوند بھی نہیں چکھ سکو گے۔"

وہ ابراہیم نصر سے اپنے عنفوانِ شباب میں گمراہ ہوئی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ پرورش گاہ کے اصطبلوں میں کئی سال تک درپردہ اختلاط جاری رکھا تھا۔ جب مہر و محبت ختم ہوئی تو وہ وکتوریا گزمان کو ایک گھریلو خادمہ بنانے کے لیے لے آیا۔ دیوینا فلور، جو کسی بعد کے مرد سے تھی، جانتی تھی کہ وہ سانتیاگو نصر کے دزدانہ بستر کے لیے مقدّر تھی، اور یہ خیال اسے ایک پیش از وقت ذہنیت میں ڈال دیتا تھا۔ "اس جیسا آدمی پھر کبھی پیدا نہیں ہوا،" فربہ اور پژمردہ، دوسری یاریوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے بچوں میں گھری ہوئی دیوینا فلور نے مجھے

بتایا۔ "وہ بالکل اپنے باپ پر تھا،" وکتوریا گزمان نے اسے جواب دیا۔ "لعنتی۔" مگر وہ سانتیاگو نصر کی اس وقت کی دہشت زدگی، جب اس نے خرگوش کی انتڑیوں کو جڑ سے نکال باہر کیا تھا اور ابلتی ہوئی اوجھڑی کتوں کے آگے پھینک دی تھی، یاد کرتے ہوئے خوف کی لہر سے نہیں بچ سکی۔

"جنگلی مت بنو" اس نے کہا تھا، "سمجھ لو کہ یہ ایک انسانی وجود تھا۔" وکتوریا گزمان کو تقریباً بیس سال یہ سمجھنے میں لگے کہ بےمدافعت جانوروں کو شکار کرنے کا عادی شخص بھی اچانک ایسے خوف کا اظہار کر سکتا تھا۔ "میرے خدا،" اس نے حیرت سے کہا، "یہ سب کچھ ایک ایسا انکشاف تھا۔" مگر اس کے باوجود، جرم کی صبح اس کے پاس اتنے ملتوی شدہ غصے جمع تھے کہ وہ سانتیاگو نصر کے ناشتے کو تلخ کرنے کے لیے کتوں کو دوسرے خرگوشوں کی انتڑیاں کھلاتی چلی گئی۔ وہ اسی عمل میں تھے جب تمام قصبہ اس دُخانی کشتی کے، جس پر بشپ آ رہا تھا، زمین کو کپکپا دینے والے شور سے جاگ اٹھا۔

ان کا گھر ایک سابقہ گودام تھا، جس میں دو منزلیں، تختوں کی دیواریں اور ٹین کی نوک دار چھت تھی جس پر گدھ بیٹھے گودی کے آخور کی نگہبانی کیا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں میں تعمیر ہوا تھا جب دریا اتنا قابلِ استعمال تھا کہ سمندر کو جانے والے بہت سے بجروں، بلکہ چند بڑے جہازوں نے بھی دہانے کی دلدلوں سے وہاں تک اپنا راستہ بنایا تھا۔ ابراہیم نصر جب خانہ جنگیوں کے خاتمے پر آخری عربوں کے ساتھ آیا، دریا کی گزرگاہ بدل جانے کی وجہ سے جہاز آنے بند ہو گئے تھے اور گودام متروک ہو چکا تھا۔ ابراہیم نصر نے اسے ارزاں قیمت، پر ایک برآمدی مخزن بنانے کے خیال سے خریدا تھا، جو اس نے کبھی قائم نہیں کیا اور جب وہ شادی کرنے جا رہا تھا، اس نے اسے رہنے کے لیے ایک مکان میں تبدیل کر دیا۔ زمینی منزل پر اس نے ایک پارلر بنایا جو ہر کام کے لیے تھا اور عقب میں اس نے چار جانوروں کا اصطبل نوکروں کی کوٹھریاں اور ایک دیہاتی باورچی خانہ بنایا جس کی گودی کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے پانی کی سڑاند ہر وقت آتی رہتی تھی۔ واحد شے جو اس نے پارلر میں صحیح و سالم چھوڑی تھی کسی تباہ شدہ جہاز سے بازیاب ہوا چکردار سیڑھیوں کا زینہ تھا۔ اوپر کی منزل پر، جہاں پہلے کسٹم کے دفاتر تھے، اس نے شب خوابی کے دو بڑے کمرے، اور پانچ چھوٹے چھوٹے کمرے ان بہت سے بچوں کے لیے بنائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا تھا، اور اس نے ایک چوبی بالکنی بنائی جو چوک میں بادام کے درختوں پر کھلتی تھی، جہاں پلاسیدا لینیرو مارچ کی سہ پہروں میں اپنے آپ کو تنہائیوں پر دلاسا دینے کے لیے بیٹھی رہتی تھی۔ سامنے کی طرف اس نے صدر دروازہ رکھا تھا اور خراد کی ہوئی سلاخوں والی دو تمام قد کھڑکیاں بنائی تھیں۔ اس نے گھوڑے کے نکلنے کے قابل، ذرا اونچائی کے ساتھ، ایک عقبی دروازہ بھی بنایا تھا، اور اس نے گودی کے پرانے پل کا ایک حصہ بھی زیرِ استعمال رکھا تھا۔ عقبی دروازہ شروع ہی سے زیادہ مستعمل تھا، نہ صرف اس بنا پر کہ یہ جانوروں کی ناندوں اور باورچی خانے کے لیے قدرتی داخلہ تھا، بلکہ اس بنا پر بھی کہ یہ چوک کا چکر لگائے بغیر گودی کو جانے والی سڑک پر کھلتا تھا۔ بیرونی دروازہ، تقریبات کے سوا، بند اور اگل چڑھا رہتا تھا۔ تاہم کسی اور دروازے کے بجائے، جو لوگ اسے قتل کرنے جا رہے تھے، اسی پر سانتیاگو نصر کا انتظار کر رہے

تھی، اور وہیں سے سانتیاگو نصر بشپ کا خیرمقدم کرنے باہر نکلا، اس امر کے باوجود کہ اس طرح اسے گودی تک پہنچنے کے لیے گھر کے گرد پورا چکر لگانا پڑا تھا۔

کوئی بھی ایسے مہلک اتفاقات کو نہیں سمجھ سکا۔ تفتیشی جج نے، جو ریوہاچا سے آیا تھا، تسلیم کرنے کی جرأت کیے بغیر اسے ضرور محسوس کیا ہو گا، کیوں‌کہ اس کی معقول وضاحت پیش کرنے میں اس کی دلچسپی رپورٹ سے عیاں تھی۔ چوک کی طرف کھلنے والے دروازے کا، چوٹی والے ناولوں کے سے "خونی دروازے" کے نام سے کئی بار تذکرہ آیا۔ اصل میں صرف پلاسیدا لینیرو کی تشریح قابل قبول معلوم ہوتی تھی، جس نے اس سوال کا مدرانہ حکمت سے جواب دیا تھا، "میرا بیٹا جب اچھا لباس پہنے ہوتا کبھی عقبی دروازہ استعمال نہیں کرتا تھا۔" یہ ایک ایسی پامال حقیقت معلوم ہوتی کہ تفتیش کرنے والے نے اسے رپورٹ سے جدا، حاشیے کے طور پر درج کیا۔

وکٹوریہ گزمان پہلے طور پر جواب میں قطعی تھی کہ نہ وہ، اور نہ اس کی بیٹی یہ جانتی تھی کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر اپنی عمر کے ایک دور میں اس نے اعتراف کیا کہ وہ دونوں اس بات سے، جب سانتیاگو نصر باورچی خانے میں کافی پینے آیا تھا واقف ہو چکی تھیں۔ یہ اطلاع انھیں ایک عورت سے ملی تھی جو پانچ بجے تھوڑا سا دودھ مانگنے آئی، اس نے اس کے ساتھ ساتھ اس کا سبب، اور وہ جگہ بھی جہاں وہ انتظار کر رہے تھے بتا دی تھی۔ "میں نے اسے خبردار نہیں کیا، کیوں‌کہ میں سمجھی کہ یہ بدمستوں کی باتیں ہیں" اس نے مجھے بتایا۔ یہ اس وصف، دیوینا فلور نے ایک بعد کی ملاقات میں، جب اس کی ماں کو گزرے ہوئے مدت ہو چکی تھی مجھ سے اعتراف کیا کہ موخرالذکر نے سانتیاگو نصر کو اس لیے کچھ نہیں بتایا تھا کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ اور خود میں نے سانتیاگو نصر کو اس لیے متنبہ نہیں کیا کہ اس وقت وہ خودمختارانہ فیصلہ کرنے کی اہلیت سے عاری، ایک سہمی ہوئی بچی سے زیادہ نہیں تھی، اور سمے سے بوڑھ کر اس پر خوف غالب آ گیا جب سانتیاگو نصر نے اس کی کلائی ایک ایسے تخ اور سنگلاخ ہاتھ سے پکڑ لی جو کسی مرے ہوئے آدمی کا ہاتھ محسوس ہوا تھا۔

سانتیاگو نصر سایہ دار گھر سے، بشپ کی کشتی سے نکلنے ہوئے شادمانی کے شور میں تیزقدم نکلا۔ دیوینا فلور اس کوشش میں کہ کہیں وہ کھانے کے کمرے میں خوابیدہ پرندوں کے پنجروں کے درمیان یا نشست کے کمرے میں بید کے فرنیچر اور فرن کے آویزاں گملوں تک اس سے پہلے نہ پہنچ جائے، اس سے آگے بھاگی، مگر اگلی اترتے ہوئے اس بار وہ سفّاک شکرے کے پنجے سے نہیں بچ سکی۔ "اس نے میری سموچی فرج دبوچ لی تھی" دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "جب وہ مجھے گھر کے کسی کونے میں پکڑ لیتا، ہمیشہ یہی کیا کرتا تھا مگر اس دن میں نے غیرمعمولی حیرت نہیں بلکہ رو پڑنے کی ایک ترسناک طلب محسوس کی۔" وہ ہٹ گئی تاکہ سانتیاگو نصر باہر نکل جائے۔ نیم وا دروازے سے اس نے صبح کی برف سی روشنی میں چوک کے بادام کے درختوں کو دیکھا، مگر اس میں کسی اور چیز کو دیکھنے کی جرأت نہیں تھی۔ "پھر کشتی نے ترم ترم کرنا بند کر دیا اور مرغوں نے بانگیں دینی شروع کیں،" دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "ہنگامہ اتنا تھا کہ مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ قصبے میں اتنے مرغے ہو

سکتے ہیں، اور میں نے سمجھا کہ وہ بشپ کی کشتی پر آ رہے ہیں۔" صرف ایک چیز جو وہ اس آدمی کے لیے کر سکتی تھی، جو کبھی اس کا نہیں تھا، کہ دروازہ، پلاسیدا لینیرو کے احکام کے خلاف، اس کی ہنگامی واپسی کے لیے اگل چڑھائے بغیر رہنے دیتی۔ کسی نے، جس کی کبھی شناخت نہیں ہو سکی، ایک لفافہ دروازے کے اندر ڈال دیا تھا، جس میں کاغذ کے ایک پُرزے پر سانتیاگو نصر کو انتباہ کیا گیا تھا کہ وہ اس کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، اور اس تحریر میں مقام، محرک، اور سازش کی دیگر تفصیلوں کا بےکم وکاست انکشاف تھا۔ پیغام فرش پر تھا جب سانتیاگو نصر اپنے گھر سے نکلا، مگر اس نے اسے نہیں دیکھا، دیوینا فلور، یا اور کسی نے بھی، اسے بہت بعد میں دیکھا، جب جرم پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

چھ بجے تھے اور سڑک پر بتّیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ بادام کے درختوں کی شاخوں اور چند بالکنیوں میں عروسی آرائشی سوز آویزاں تھیں، اور بیرونی زینوں تک، جہاں بینڈ اسٹینڈ تھا، سنگ فرش کیا ہوا چوک خالی بوتلوں اور عوامی جشن کے ہر نوع کے ملبے کی وجہ سے بیہودگی کا انبار نظر آ رہا تھا۔ جب سانتیاگو نصر گھر سے نکلا کئی آدمی کشتی کے شور سے سُرعت پذیر ہو کر گودی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

صرف اس مقام پر، جہاں چوک میں کلیسا کی ایک طرف دودھ کی دکان تھی، دو آدمی تھے جو سانتیاگو نصر کا اسے قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ کلوتیلدے ارمنتا، دکان کی مالک، طلوع آفتاب کی تمتماہٹ میں اسے دیکھنے والی پہلی ہستی تھی، اور اس کو یہ خیال سا آیا کہ سانتیاگو نصر المونیم کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ "وہ پیشتر ہی سے ایک عفریت لگ رہا تھا،" کلوتیلدے ارمنتا نے مجھے بتایا۔ وہ لوگ جو اسے قتل کرنے جا رہے تھے، اخبار میں لپٹے ہوئے چھُروں کو اپنے سینے سے جکڑے، بنچوں پر سوئے ہوئے تھے، اور کلوتیلدے ارمنتا ان کی نیند ٹوٹ جانے کے خوف سے اپنی سانس روکے ہوئے تھی۔

وہ دونوں جڑواں تھے، پیدرو اور پابلو ویکاریو۔ وہ چوبیس سال کے تھے، اور اس حد تک مماثل کہ انھیں بیدا گانہ شناخت کرنا دشوار تھا۔ "ان کے چہرے کے نقوش بےڈھب مگر خوشگوار تھے،" رپورٹ میں لکھا تھا۔ میں نے بھی، جو انھیں گرامر اسکول سے جانتا تھا، یہی لکھا ہوتا۔ اس صبح وہ اس وقت تک عروسی تقریب کے سیاہ سوٹوں میں تھے جو کریبئین کے لیے بہت بوجھل اور پرتکلف تھے، اور وہ خراب گستگی کی تنی ساعتوں کے بعد ویران سے لگ رہے تھے، مگر وہ شیو بنا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اگرچہ انھوں نے شادی کی شام سے شراب نوشی جاری رکھی تھی، تیسرے دن کے اختتام پر وہ نشے میں نہیں تھے، بلکہ وہ کسی حد تک اجڑی ہوئی نیند کے ساتھ خواب میں چلتے نظر آ رہے تھے۔ کلوتیلدے ارمنتا کی دکان پر تین گھنٹے کے انتظار کے بعد، وہ صبح کی باد اوّلیں کے ساتھ سو گئے، اور یہ پہلی نیند تھی جو جمعے کے دن سے انھیں نصیب ہوئی۔ کشتی کی پہلی آواز پر وہ برسمت جاگے تھے، مگر جب سانتیاگو نصر اپنے گھر سے نکلا، وجدان نے انھیں مکمل بیدار کر دیا۔ اس وقت ان دونوں نے مڑے ہوئے اخبار کو سنبھالا اور پیدرو ویکاریو کھڑا ہونے لگا۔

"خدا کے لیے،" کلوتیلدے ارمنتا نے بہت آہستہ سے کہا، "اسے کسی اور وقت پر چھوڑ دو حضور بشپ کے احترام ہی میں سہی۔"

"یہ روح القدس کا ایک نقش تھا،" وہ اکثر دوہرایا کرتی۔ بےشک یہ ایک امرِ ربّانی تھا، مگر اس کی فضیلت صرف لمحاتی تھی۔

جب انہوں نے اس کی آواز سنی، وینکاریو بھائیوں نے ردعمل کیا، اور وہ جو کھڑا ہو چکا تھا، پھر سے بیٹھ گیا۔ دونوں نے سانتیاگو نصر کا، جب وہ چوک کو طے کر رہا تھا، اپنی نگاہوں سے تعاقب کیا۔ "انہوں نے اسے تاسف سے زیادہ دیکھا،" کونتیلدے آرمنتا نے کہا۔ راہباؤں کے اسکول کی لڑکیوں نے اپنی یتیموں کی وردی میں چوک کو اسی لمحے بےنظمی سے اچھلتے دوڑ کر پار کیا۔

پلاسیدا لینیرو کی بات درست تھی: بشپ کشتی سے نہیں اترا۔ گودی پر حکام اور اسکول کے بچوں کے علاوہ بہت سے لوگ اور تھے، ہر طرف خوب پھولے ہوئے مرغوں کے ٹوکرے نظر آ رہے تھے جو بشپ کے لیے تحفے کے طور پر لائے گئے تھے، کیونکہ مرغ کی کلغیوں کا شوربہ اس کی مرغوب خوراک تھی۔ پار کرنے کے پل پر اتنی سوختنی لکڑیاں جمع تھیں کہ کشتی میں انہیں بھرنے کے لیے کم از کم دو گھنٹے درکار ہوتے۔ مگر وہ رکی نہیں۔ وہ دریا کے موڑ پر ایک اژدہے کی طرح ستھے پھلاتی نمودار ہوئی، اور موسیقاروں کے بینڈ نے بشپ کا ترانہ شروع کیا، اور مرغوں نے اپنی ٹوکریوں میں بانگیں دے دے کر قصبے کے دوسرے سارے مرغوں کو برانگیختہ کر دیا۔

ان دنوں افسانوی اسٹیم بوٹس، جن میں لکڑیاں جلائی جاتی تھیں، معدوم ہونے کے قریب تھیں، اور جو خدمت میں باقی رہ گئی تھیں، ان میں خودنواز پیانو یا عروسی خاص کمرے نہیں تھے اور وہ بمشکل بہاؤ کے خلاف سفر کی اہل تھیں۔ مگر یہ نئی تھی اور اس میں ایک کی بجائے دو چمنیاں تھیں جن پر آرم بینڈوں کی طرح پرچم رنگے گئے تھے، اور پشت پر تختوں سے بنے ہوئے پہیے نے سے ایک بحری جہاز کی سی کارکردگی عطا کر دی تھی۔ بالائی عرشے پر کپتان کے کیبن سے متصل، بشپ اپنی سفید عبا اور اپنے اسپانوی خدم و حشم کے ساتھ موجود تھا۔ "یہ کرسمس کا زمانہ تھا،" میری بہن مارگوت نے کہا۔ اس کے بقول ہوا یہ کہ گودی سے گزرتے ہوئے کشتی کی سیٹی نے دبائی ہوئی بھاپ کی ایک بوچھاڑ چھوڑی اور انہیں جو کنارے کے قریب تھے، شرابور کر دیا۔ یہ ایک بےثبات فریبِ نظر تھا۔ بشپ نے گودی کے پل پر جمع ہجوم کے مقابل، ہوا میں صلیب کا نشان بنانا شروع کیا اور اس کے بعد کسی جوروشر کے بغیر کٹھ پتلی کی طرح ایسا کرتا چلا گیا یہاں تک کہ کشتی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، اور جو کچھ بچ رہا وہ مرغوں کا شور تھا۔

سانتیاگو نصر کے لیے خود کو فریب خوردہ محسوس کرنے کی معقول وجہ تھی۔ اس نے لکڑیوں کے کئی گٹھر فادر کارمین امادور کی سلامتیِ عام کو نذر کیے تھے، اور اس کے علاوہ اس نے خود نہایت اشتہا انگیز کلغیوں والے فربہ اخذ مرغوں کا انتخاب کیا تھا۔ میری بہن مارگوت کو، جو گودی کے پل پر سانتیاگو نصر کے ساتھ تھی، وہ جشن کو جاری رکھنے کی خواہش کے ساتھ خوش نظر آ رہا تھا، ہرچند کہ اسپرین نے اسے تسکین نہیں دی تھی۔ "وہ پژمردہ نہیں نظر آ رہا تھا، اور صرف یہ سوچ رہا تھا کہ شادی پر کیا خرچ ہوا ہو گا" اس نے مجھے بتایا۔ کرستو بیدویا نے، جو ان کے ساتھ تھا، رقم کا انکشاف کیا، جس سے اس کی حیرت اور بڑھ

گئی۔ وہ میرے اور سانتیاگو نصر کے ساتھ چار بجے سے ذرا پہلے تک کھل کر شراب پیتا رہا تھا۔ شب بسری کے لیے وہ اپنے والدین کے پاس نہیں گیا، بلکہ اس نے اپنے دادا کے ہاں محفل جمائی۔ وہاں اسے اعداد کا وہ خوشہ ملا جس کی اسے تقریب کے اخراجات کا اندازہ لگانے کے لیے ضرورت تھی۔ اس نے شمار کیا کہ مہمانوں کے لیے اس نے چالیس ترکی مرغیاں اور گیارہ خنّی سؤر ذبح کیے تھے، اور چار بچھڑے بھی، جو دولہے نے عوامی چوک پر لوگوں کی تواضع میں بھونے جانے کے لیے مخصوص کیے تھے۔ اس نے شمار کیا کہ غیرقانونی طور پر درآمدکردہ الکحل کے ۲۰۵ صندوق خالی ہوئے تھے اور گنّے کی شراب کی تقریباً دو ہزار بوتلیں ہجوم میں بانٹی گئی تھیں۔ امیر و غریب، ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے کسی نہ کسی طرح اس بےنظیر پُرآشوب ضیافت میں شرکت نہ کی ہو۔ سانتیاگو نصر بہ آوازِ بلند خواب دیکھ رہا تھا۔

"میری شادی بھی اسی طرح ہو گی،" اس نے کہا۔ "لوگوں کی زندگیاں اسے بیان کرنے میں ناکافی پڑ جائیں گی۔"

میری بہن نے فرشتے کو پاس سے گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے ایک بار پھر فلورا میگل کی خوش نصیبی کے بارے میں سوچا، جسے زندگی میں اتنا کچھ حاصل تھا اور جو سانتیاگو نصر کو بھی اس سال کرسمس میں حاصل کرنے جا رہی تھی۔ "مجھے اچانک خیال آیا کہ اس سے بہتر شکار نہیں مل سکتا تھا" اس نے مجھے بتایا۔ "ذرا سوچو: خوش شکل، وعدہ وفا اور اکیس سال کی عمر میں ذاتی جائیداد کا مالک۔" جب ہمارے یہاں کساوا کے کلوچے بنے ہوتے وہ اسے ہمارے گھر پر ناشتے کے لیے بلایا کرتی تھی، اور اس صبح میری ماں وہی تیار کر رہی تھی۔ سانتیاگو نصر نے اشتیاق کے ساتھ دعوت قبول کی۔

"میں کپڑے بدل کر تمھارے ہاں آتا ہوں،" اس نے کہا، اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنی گھڑی نائٹ ٹیبل پر چھوڑ آیا ہے۔ "کیا وقت ہوا ہو گا؟"

اس وقت چھ بج کر پچیس ہوئے تھے۔ سانتیاگو نصر نے کرستو بیدویا کو بازو سے پکڑا اور چوک کی طرف لے جانے لگا۔

"میں پندرہ منٹ کے اندر تمھارے گھر پر ہوں گا" اس نے میری بہن سے کہا۔

میری بہن نے ضد کی کہ وہ اسی وقت ساتھ چلے کیونکہ ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ "یہ عجیب اصرار تھا،" کرستو بیدویا نے مجھے بتایا۔ "یہاں تک کہ کئی بار مجھے گمان ہوا کہ مارگوت جانتی تھی کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں، اور وہ اسے تمھارے گھر میں چھپا لینا چاہتی تھی۔" سانتیاگو نصر نے بہرحال اسے رضامند کر لیا۔ وہ اتنی دیر میں ڈیوٹی لیس پر بچھڑوں کو خصّی کرنے کے لیے جانے کو گھڑسواری کا لباس پہننا چاہتا تھا۔ اس نے میری بہن سے اسی موج میں اجازت لی جس میں اس نے اپنی ماں کو الوداع کہا تھا، اور کرستو بیدویا کے ہمدوش چوک کی طرف بڑھ گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ میری بہن نے اس کو دیکھا۔

گودی میں کئی لوگ جانتے تھے کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔ دون لزارو اپونتے نے، جو اکادمی کرنل کی حیثیت سے سبکدوشی کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ گیارہ سال سے قصبے کا میئر تھا، اسے اپنا ہاتھ لہرا کر خوش آمدید کہا۔ "میں نے واقعی یقین کر لیا تھا کہ اب وہ کسی خطرے کی زد میں نہیں ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ فادر کارمین امادور بھی پریشان

نہیں تھا۔ "جب میں نے اسے بحفاظت دیکھا، میں نے سمجھا کہ سب کچھ ایک پرسرور افواہ تھی۔" اس نے مجھے بتایا۔ کسی نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ کیا سانتیاگو نصر کو متنبہ کر دیا گیا ہے کیوں کہ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ اسے خبر نہ پہنچائی گئی ہو۔

میری بہن مارگوت، سچ مچ اُن چند لوگوں میں سے تھی جو اس وقت تک نہیں جانتے تھے کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا میں اسے گھر لے جاتی، چاہے مجھے اس کو ایک سؤر کی طرح باندھ کر لے جانا پڑتا۔" اس نے تفتیشی افسر کو بیان دیا۔ حیرت یہ تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا، مگر اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر تھا کہ میری ماں بھی نہیں جانتی تھی جو ہر بات کو گھر کے کسی اور فرد سے پہلے جان جاتی تھی، اس امر کے باوجود کہ اسے کلیسا کے اجتماع کے لیے بھی گھر سے باہر نکلے برسوں گزر چکے تھے۔ میں اُس کی اس صلاحیت سے اس وقت جب میں نے اسکول جانے کے لیے جلد اٹھنا شروع کیا، آگاہ ہوا تھا۔ صبح کی خاکستری روشنی میں، زرد اور پرسرار جیسی کہ وہ ان دنوں ہوا کرتی تھی، صحن کو ایک خاص سار جھاڑو سے صاف کرتے اور کافی کے گھونٹوں کے درمیان وہ ہمیں بتانا شروع کرتی کہ دنیا میں کیا ہوا جب ہم سو رہے تھے۔ وہ قصبے کے دوسرے لوگوں، خاص طور پر اپنے ہم عمروں سے خبررسانی کے خفیہ سلسلے باندھے ہوئے معلوم ہوتی تھی، اور کبھی کبھی وہ ہمیں ان واقعوں کی اطلاع سے حیرت زدہ کر دیتی جو اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہوئے تھے اور جنھیں وہ صرف اپنی غیب دانی کی استطاعت ہی سے جان سکتی تھی۔ اس صبح مگر اس نے اُس سانحے کی دھڑکن نہیں سنی جو رات کے تین بجے سے پرورش پا رہا تھا۔ اس نے صحن میں جھاڑو دینا ختم کیا تھا، اور جب میری بہن مارگوت بشپ کا استقبال کرنے باہر نکلی، اس نے اسے کسّاوا پیستے ہوئے دیکھا۔ "مرغوں کی بانگیں سنی جا سکتی تھیں۔" میری ماں اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہنے کی عادی ہے۔ اس نے کبھی دور سے آتی ہوئی ان آوازوں کو بشپ کی آمد سے منسوب نہیں کیا، وہ انھیں شادی کی باقیات سمجھتی رہی۔

ہمارا گھر خاص چوک سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے آموں کے باغ میں تھا۔ میری بہن مارگوت گودی کو دریا کے کنارے کنارے چلتی ہوئی گئی تھی، اور لوگ بشپ کی آمد پر اتنے پرجوش تھے کہ وہ کسی اور بات پر توجہ نہیں دے سکے۔ انھوں نے بیماروں کو خدا سے شفا حاصل کرنے کے لیے محرابی دروازوں میں کھڑا کیا تھا، اور عورتیں اپنے آنگنوں سے ترکی مرغ اور شیرخوار سؤر اور ہر طرح کی خوردنی اشیا لیے دوڑی چلی آ رہی تھیں، اور دوسرے کنارے سے پھولوں سے سجی ڈونگیاں پہنچ رہی تھیں۔ مگر جب بشپ زمین پر قدم رکھے بغیر چلا گیا، دوسری دبی ہوئی خبر اپنی رسوائی کے درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔ تب میری بہن مارگوت نے اس کے بارے میں مفصل اور سفاک انداز میں جانا۔ انجلا ویکاریو، وہ خوش شکل لڑکی جو ایک دن پہلے بیاہی گئی تھی، اپنے والدین کے گھر لوٹا دی گئی، کیوں کہ اس کے شوہر نے دریافت کیا تھا کہ وہ کنواری نہیں ہے۔ "مجھے ایسا لگا کہ میں مرنے والی ہوں۔" میری بہن نے کہا۔ مگر جو بھی ہو، انھوں نے اس داستان کو جتنا الٹ پلٹ، کوئی مجھے یہ نہیں بتا سکا کہ غریب سانتیاگو نصر کس طرح اس بکھیڑے میں پڑ کر اپنی جان سے گیا۔ صرف ایک بات جو سب قطعی طور پر جانتے تھے، یہ تھی کہ انجلا ویکاریو کے بھائی اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار

کر رہے ہیں۔

میری بہن اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتی ہوئی گھر واپس آئی۔ اس نے میری ماں کو اتوار کے نیلے پھولوں والے کرتے میں، کہ کہیں بشپ ہم سے ملنے آ ہی جائے، ملبوس دیکھا، وہ میز لگاتے ہوئے غیرمرئی محبت کے بارے میں ایک فادو گا رہی تھی۔ میری بہن نے غور کیا کہ معمول سے ایک پلیٹ زیادہ ہے۔

"یہ سانتیاگو نصر کے لیے ہے۔" میری ماں نے کہا۔ "انھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم نے اسے ناشتے پر بلایا ہے۔"

"اسے ہٹا لیں۔" میری بہن نے کہا۔

پھر اس نے میری ماں کو بتایا۔ "مگر ایسا لگتا تھا کہ اسے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔" اس نے مجھے بتایا۔ "یہ ہمیشہ کی طرح تھا؛ آپ اسے کچھ بتانا شروع کریں اور اس سے پہلے کہ کہانی آدھی بھی ہو، وہ جان جاتی تھی کہ آخر میں کیا ہوا۔" وہ بری خبر میری ماں کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ بپتسمہ دیتے وقت سانتیاگو نصر کا نام اس کے نام پر رکھا گیا تھا اور وہ اس کی دینی ماں تھی، مگر وہ پیورا ویکاریو، واپس کی گئی دلھن کی ماں کی قرابت دار بھی تھی۔ اس کے باوجود خبر سنتے ہی میری ماں نے اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اور کلیسائی شال اوڑھی جو وہ صرف عزاداری کے لیے نکلتے وقت اوڑھتی تھی۔ میرا باپ، جس نے بستر سے ہر بات سن لی تھی، شب خوابی کے لباس میں نمودار ہوا اور متوحش ہو کر پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ "اپنی عزیز دوست پلاسیدا کو اطلاع دینے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ نامناسب ہے کہ ہر آدمی جان لے کہ وہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے جا رہے ہیں اور ماں ہو کہ اسے معلوم ہی نہ ہو۔"

"ہمارے ویکاریو سے بھی برابر کے تعلقات ہیں۔" میرے باپ نے کہا۔

"آدمی کو ہمیشہ مرنے والوں کا ساتھ دینا چاہیے۔" اس نے کہا۔

میرے چھوٹے بھائی شب خوابی کے دوسرے کمروں سے نکل کر آنے لگے۔ سب سے چھوٹے نے المیے کی فضا سے متاثر ہو کر رونا شروع کر دیا۔ میری ماں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی؛ زندگی میں ایک بار اس نے اپنے شوہر کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

"ایک منٹ رکو، میں کپڑے بدل لوں۔" میرے باپ نے کہا۔

وہ سڑک پر نکل آئی۔ صرف میرا بھائی جیمی، جو اس وقت سات برس سے زیادہ کا نہیں ہو گا، اسکول جانے کے لیے کپڑے بدل چکا تھا۔

"تم اس کے ساتھ جاؤ۔" میرے باپ نے حکم دیا۔

جیمی اس کے پیچھے بھاگا، یہ جانے بغیر کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کہاں جا رہی ہیں، اور ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ "وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔" جیمی نے مجھے بتایا۔ "بدمعاش،" وہ زیرلب کہہ رہی تھی، "گندے جانور جو کوئی کام نہیں کرتے جس میں کچھ نہ کچھ شرارت نہ ہو۔" اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ "انھوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔" اس نے مجھے بتایا۔ "ایک ہی بات یاد ہے کہ دور سے بہت سے لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں، جیسے شادی کی تقریب پھر سے شروع ہو گئی ہو

اور ہر کوئی چوک کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔" اس نے اپنے قدم تیز کر دیے، ایک عزم کے ساتھ جس کی، جب کوئی زندگی خطرے میں ہو، وہ اہل تھی، یہاں تک مخالف سمت سے آتے ہوئے کسی آدمی نے اس کی ڈبو بکی پر ترس کھایا۔

"زحمت مت کرو، لوئیزا سانتیاگا،" وہ گزرتے ہوئے چلایا، "انھوں نے اسے قتل کر دیا ہے۔"

بیاردو سان رومان، وہ آدمی جس نے دلھن لوٹائی، پہلی بار گزشتہ اگست میں، شادی سے چھ مہینے پہلے آیا تھا۔ وہ ہفتہ وار کشتی پر چاندی سے جڑی چند خورجینیں لیے ہوئے آیا جو اس کی بیلٹ کی بکسوؤں اور اس کے جوتے کے چھلّوں سے میل کھا رہی تھیں۔ وہ تقریباً تیس برسوں کا تھا، جو اس کی نوآموز بُل فائٹر کی سی کمر، سنہری آنکھوں، اور قلمی شورے سے رفتہ رفتہ جلی ہوئی جلد کی بدولت حرص اسلوبی سے مخفی تھی۔ وہ [illegible] چھوٹی جیکٹ اور بہت تنگ پتلون پہنے ہوئے آیا، دونوں بچھڑے کی کھال کے نرم چمڑے سے بنی تھیں، اور اس نے اسی رنگ کی مینڈھے کی کھال کا دستانہ بھی رکھا تھا۔ ماگدالینا اولیوَر، جو کشتی میں اس کے ساتھ تھی، سارے سفر میں اس پر سے نگاہیں نہیں ہٹا سکی۔ "وہ ایک پریزاد کی طرح نظر آ رہا تھا،" اس نے مجھے بتایا، "اور اس پر افسوس کیا جانا چاہیے، کیوں‌کہ میں مکھن لگا اسے چٹ کر سکتی تھی۔" اکیلی وہ ایسا سوچنے والی نہیں تھی نہ یہ محسوس کرنے میں سب سے پیچھے، کہ بیاردو سان رومان پہلی نظر پر کھل جانے والا آدمی نہیں تھا۔

میری ماں نے مجھے اسکول میں اگست کے اختتام کے قریب ایک خط بھیجا اور ایک بلامقصد انداز میں لکھا: "ایک بہت عجیب آدمی یہاں آیا ہوا ہے۔" اس کے بعد کے خط میں اس نے مجھے لکھا: "اس عجیب آدمی کا نام بیاردو سان رومان ہے اور ہر شخص کہتا ہے کہ وہ پُرکشش ہے، مگر میں نے اسے خود ابھی نہیں دیکھا ہے۔" کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ کچھ لوگوں کو، جو پوچھنے کی ترغیب سے خود کو نہیں روک سکے تھے، جواب ملا: "میں کسی کی تلاش میں، جس سے شادی کر سکوں، شہر در شہر گھوم رہا ہوں۔" یہ درست بھی

ہو سکتا ہے، مگر وہ کسی اور سوال کا جواب بھی اسی انداز میں دے سکتا تھا، کیوں‌کہ اس کا طرزِ گفتگو انکشاف کی بہ نسبت اخفا میں زیادہ معاون تھا۔

جس رات وہ آیا اس نے انھیں یہ باور کرایا کہ وہ ریل کی پٹریوں کا انجینئر ہے، اور اندرونی علاقوں میں ریل کی پٹری بچھانے کی سخت اہمیت کے بارے میں بتایا جس کے بعد ہم لوگ دریا کے انہدی متغیر ہونے والے راستوں سے ہوشیار ہو جاتے۔ اس کے بعد والے دن اسے ایک ٹیلیگرام بھیجنا تھا اور اس نے اسے ہرم پر خود روانہ کیا اور اس کے ساتھ اس نے ٹیلیگراف کے کارندے کو اپنا نسخہ بتایا جس کی مدد سے وہ خستہ بیٹریوں کا استعمال جاری رکھ سکتا تھا۔ اسی دن اس نے ایک سرحدی بیماری کا ملٹری ڈاکٹر سے ذکر کیا جو جبری بھرتی کے تحت ان مہینوں میں وہاں آیا ہو تھا۔ اسے پرشور اور دیر تک جاری رکھنے والی خوش وقتیاں پسند تھیں۔ مگر وہ بہتریں بلانوش، تنازعوں کا ثالث اور پتے‌بازوں کا دشمن تھا۔ ایک اتوار عبادت کے بعد اس نے سب مشتاق پیراکوں کو جو بہت سے تھے مقابلے کی دعوت دی اور اول تریں کو دریا کے پار جانے اور لوٹنے میں بیس ہاتھ پیچھے چھوڑ دیا۔ میری ماں نے اس کے متعلق مجھے ایک خط میں بتایا اور آخر میں اس نے ایک تبصرہ کیا جو اسی کا حق تھا، "یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سونے میں تیر رہا ہے۔" یہ اس قبل از وقت روایت کے جواب میں تھا کہ بیاردو سان رومان نہ صرف ہر کام باکمال طریقے سے کرنے کا اہل ہے، بلکہ اس کی رسائی کبھی نہ ختم ہونے والے خزانوں تک ہے۔

میری ماں نے اس کے حق میں آخری حرفِ خیر اکتوبر کے ایک خط میں لکھا تھا۔ "لوگ اسے بہت زیادہ چاہتے ہیں،" اس نے مجھے لکھا، "کیوں‌کہ وہ دیانت دار اور دل کا اچھا ہے، اور گزشتہ اتوار اس نے عشائے‌ربانی دوزانو ہو کر وصول کیا اور دعا پڑھنے والوں کی لاطینی میں مدد کی۔" اس زمانے میں عشائے‌ربانی کو کھڑے ہو کر وصول کرنے کی اجازت نہیں تھی اور ہر دعا لاطینی میں ہوتی تھی، مگر میری ماں اس طرح کی تفصیلوں کو، جب وہ معاملے کی تہ کو پہنچنا چاہتی، یاد رکھنے کی عادی ہے۔ پھر بھی، اس مقدس فتوے کے بعد، اس نے مجھے دو خطوط بھیجے جن میں اس نے بیاردو سان رومان کے متعلق کچھ نہیں لکھا، اس وقت بھی نہیں جب یہ اچھی طرح آشکار ہو گیا تھا کہ وہ انجلا ویکاریو کا خواستگار ہے۔ صرف اس بدبخت شادی کے بہت عرصے بعد اس نے مجھ سے اعتراف کیا کہ وہ بیاردو سان رومان کو سمجھ گئی تھی، مگر اس وقت تک اکتوبر کے خط کو درست کرنا بےمعنی تھا اور یہ کہ اس کی سنہری آنکھیں میری ماں کو ہراساں کر دیتی تھیں۔

"وہ مجھے ابلیس کی طرح لگتا تھا،" اس نے مجھے بتایا، "مگر تم نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ اس نوعیت کی باتیں تحریر میں نہیں آنی چاہییں۔"

میں بیاردو سان رومان سے، اپنی ماں کی اس سے ملاقات کے تھوڑے دنوں بعد، کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آنے پر ملا، اور میں نے اسے اتنا ہی عجیب پایا جتنا کہ کہا جاتا تھا۔ بےشک وہ پرکشش نظر آتا تھا، مگر ماگدالینا اولیور کے سادہ و دلکش تصور سے بہت دور۔ مجھے اس میں اس سے زیادہ سنجیدگی نظر آئی جتنی کہ اس کی بےپروایانہ وضع نشاندہی کر سکتی تھی؛ اس میں ایک پوشیدہ کشمکش تھی جو اس کے حد سے زیادہ شائستہ اطوار میں

بڑھمت ہی چھپ سکتی تھی۔ مگر ان سب کے باوجود وہ مجھے ایک بہت غم زدہ آدمی لگا۔ اس وقت وہ انجلا ویکاریو سے اپنی محبت کے پیمان کا پابند ہو چکا تھا۔

یہ کبھی اچھی طرح ثابت نہیں ہو سکا کہ وہ دونوں کس طرح ملے تھے۔ غیرشادی شدہ افراد کی جس اقامت گاہ میں بیاردو سان رومان فروکش تھا، اس کی مالکہ نے بتایا کہ ستمبر کے آخری دنوں میں کس طرح وہ پارلر میں ایک جھولنے والی کرسی میں جھپکی لے رہا تھا کہ انجلا ویکاریو اور اس کی ماں چوک سے مصنوعی پھولوں کی دو ٹوکریاں لیے ہوئے گزریں۔ بیاردو سان رومان نے نیم بیداری کے عالم میں دونوں خواتین کو، جو دو بجے دوپہر کے سناٹے میں تنہا زندہ مخلوق تھیں، ظاہراً سیاہ رنگ میں ملبوس دیکھا، اور سوال کیا کہ نوجوان لڑکی کون ہے۔ اقامت گاہ کی مالکہ نے جواب دیا کہ وہ اپنی ہم راہ عورت کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے، اور اس کا نام انجلا ویکاریو ہے۔ بیاردو سان رومان نے اپنی نگاہوں سے ان کا چوک کے دوسرے سرے تک تعاقب کیا۔

"وہ خوش نام ہے،" اس نے کہا۔

پھر اس نے اپنا سر کرسی پر رکھا اور دوبارہ آنکھیں مُوند لیں۔

"جب میں اٹھوں،" اس نے کہا، "مجھے یاد دلانا کہ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔"

انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا کہ اقامت گاہ کی مالکہ نے اسے اس ضمنی واقعے کے متعلق اس سے پہلے بتا دیا تھا، جب بیاردو سان رومان نے اس سے خواستگاری شروع کی۔ اقامت گاہ میں تین افراد نے تصدیق کی کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا، مگر دوسرے چار متذبذب تھے۔ ساتھ ہی تمام روایتیں اس امر میں موافقت کرتی تھیں کہ انجلا ویکاریو اور بیاردو سان رومان نے ایک دوسرے کو پہلی بار قومی تعطیل کے دن ایک مینابازار میں دیکھا تھا جہاں وہ گیت گا کر ایک لاٹری فروخت کرنے کی ذمےدار تھی۔ بیاردو سان رومان مینابازار میں آیا اور سیدھا اس بوتھ پر گیا جو جسے سوگواری میں آخری حد تک ملبوس بےحس بحث رما چلا رہی تھی۔ [illegible] کہ ایک شخص میوزک بکس کی قیمت دریافت کی جو میلے کی ایک اہم کشش رہا ہو گا۔ انجلا ویکاریو نے اسے جواب دیا کہ وہ فروخت کے لیے نہیں بلکہ لاٹری کے انعام میں دیے جانے کے لیے ہے۔

"خوب،" اس نے کہا۔ "اس سے تو اس کا ملنا سہل ہو گیا، اور ارزاں بھی۔"

انجلا ویکاریو نے مجھ سے اعتراف کیا کہ وہ اسے متاثر کرنے میں کارگزاری دکھا گیا تھا مگر اس کے نتائج محبت کے برخلاف تھے۔ "میں خودپسند مردوں سے متنفر تھی اور میں نے کبھی اتنا مغرور آدمی نہیں دیکھا تھا،" اس نے مجھ سے اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ میں نے سوچا کہ وہ ایک اُجڈ پہاڑیا ہے۔" اس کی برافروختگی عروج پر تھی جب اس نے میوزک بکس کے لیے گانا گایا، اور تمام لوگوں کو حیرت ہوئی جب اسے سچ مچ بیاردو سان رومان نے جیت لیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے صرف اسے متاثر کرنے کے لیے لاٹری کے تمام ٹکٹ خرید لیے تھے۔

اس رات، جب وہ گھر لوٹی، انجلا ویکاریو نے اس میوزک بکس کو تحفے کے طور پر عمدگی سے ملفوف اور ایک مارک ارگنڈی ہو سے بندھا ہوا پایا۔ "میں کبھی نہیں معلوم کر

سکی کہ وہ کس طرح جانتا تھا کہ وہ میری سالگرہ کا دن ہے؟" اس نے مجھے بتایا۔ یہ اس کے لیے دشوار تھا کہ وہ اپنے والدین کو یقین دلا سکے کہ اس نے بیاردو سان رومان کو اس طرح کا تحفہ، اور اس سے بدتر، اتنے واشگاف انداز میں کہ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر نہ رہ سکے، بھیجنے کے لیے کوئی وجہ فراہم نہیں کی تھی۔ اس لیے اس کے بڑے بھائی، پیدرو اور پابلو، میوزک بکس کو اس کے مالک کو واپس کرنے ہوٹل لے گئے اور انھوں نے یہ کام اتنی شتابی سے کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے نہیں گھر میں آتے دیکھا ہو اور باہر نکلتے نہ دیکھ پایا ہو۔ چوں کہ جس بات کا اس خاندان نے خیال نہیں رکھا تھا وہ بیاردو سان رومان کا ناقابلِ مزاحمت طلسم تھا۔ جڑواں بھائی دوسرے دن صبح سے پہلے نمودار نہیں ہوئے، وہ شراب میں دُھت، میوزک بکس کو دوبارہ اٹھائے اور بیاردو سان رومان کو ساتھ لیے گھر پر ہنگامہ جاری رکھنے کے لیے لوٹ آئے تھے۔

انجلا ویکاریو ایک محدود آمدنی والے گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ اس کا باپ پونسیو ویکاریو غریبوں کا سنار تھا اور اس نے گھر کی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے سونے کا ازحد باریک کام کرتے ہوئے اپنی بینائی گنوا دی تھی۔ پُوریسیما دیل کارمین، اس کی ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شادی شدہ ہو جانے سے پہلے، یک اسکول میں معلمہ تھی۔ اس کے بُردبار، اور کسی حد تک زخم خوردہ نظر آنے نے اس کے کردار کے استحکام کو اچھی طرح چھپا لیا تھا۔ "وہ ایک راہبہ معلوم ہوتی تھی" مرسیدس یاد کرتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو، قربانی کے اتنے شدید جذبے کے ساتھ اپنے شوہر کی اطاعت اور بچوں کی پرورش کے لیے وقف کر دیا تھا کہ کبھی کبھی یہ بھی فراموش ہو جاتا کہ اس کا بھی کوئی وجود ہے۔ بڑی دو لڑکیاں بہت دیر سے بیاہی گئی تھیں۔ جڑواں بھائیوں کے علاوہ ایک منجھلی بہن تھی جو شبینہ بخار میں مر گئی تھی، اور وہ لوگ دو سال بعد بھی ایک سوگ کو برقرار رکھے ہوئے تھے، جو گھر میں سکوں اور باہر شدّت سے منایا جاتا تھا۔ بھائیوں کو مرد بننے کے لیے پالا گیا تھا۔ لڑکیوں کی پرورش بیاہے جانے کے لیے کی گئی تھی۔ انھیں جالی دار کشیدہ کاری، سلائی سے سیتا، جھالر بُننا، کپڑے دھونا اور استری کرنا، مصنوعی پھول اور رنگ برنگی مٹھائیاں بنانا آتا تھا، اور وہ تقریبات کے دعوت نامے لکھ لیتی تھیں۔ اس وقت کی لڑکیوں سے بالکل مختلف، جو موت کی رسوم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں، وہ چاروں بیماروں کے سرہانے بیٹھنے کے قدیم علم، مرتے ہوؤں کی دلجوئی اور مرے ہوؤں کو کفن دینے میں تصور سے بڑھ کر ماہر تھیں۔ صرف ایک بات جس پر میری ماں انھیں ٹوکتی تھی، وہ ان کا سونے سے پہلے اپنے بالوں میں کنگھی کرنا تھا۔ "لڑکیو،" وہ انھیں کہتی، "رات کو بالوں میں کنگھی نہ کرو، تم سمندر میں جانے والوں کی سفر موخر کر دو گی۔" اس کے سوا میں کہ جہاں تک کہ ان سے بڑھ کر اچھی پرورش پانے والی لڑکیاں اور کوئی نہیں۔ "وہ بے عیب ہیں،" اکثر اسے کہتے سنا گیا، "اور کوئی شخص بھی ان کے ساتھ خوش رہ سکے گا، کیوں کہ انھیں دکھ اٹھانے کے لیے پالا گیا ہے۔" یہ اس لیے، جنھوں نے بڑی دو سے شادیاں کی تھیں ان کے لیے ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ ہمیشہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتیں، اور صرف خواتین کے لیے رقص کا اہتمام کرتیں، ور مردوں کے منصوبوں میں چھپی ہوئی غرض کو بھانپ لینے میں بہت تیز تھیں۔

انجلا ویکاریو چاروں میں سب سے خوش شکل تھی، اور، میری ماں کہتی تھی، وہ تاریخ کی ایک عظیم ملکہ کی طرح، گردن کے گرد لپٹی ہوئی نال کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ مگر وہ بیچارگی اور روح کی کسمپرسی کا شکار تھی، جو اس کے غیریقینی مستقبل کا شگون معلوم ہوتی تھی۔ میں اسے ہر سال اپنی کرسمس کی تعطیل میں دوبارہ دیکھا کرتا، اور وہ دوپہر میں اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھی کپڑوں کے پھول بناتی اور تنہا عورتوں کے والز اپنی پڑوسنوں کے ساتھ گاتی ہوئی، اور زیادہ بےحوصلہ نظر آیا کرتی۔ "یہ تمھاری احمق عم زاد،" سانتیاگو نصر مجھ سے کہا کرتا، "کانٹا نکلنے کے لیے مچل رہی ہے۔" ایک روز جب اس کی بہن کے سوگ سے ذرا پہلے، میں سڑک پر اس کے پاس سے گزرا، وہ پہلی بار ایک جواں عورت کی طرح ملبوس تھی اور اس کے بال تاب دیے ہوئے تھے، اور میں بمشکل یقین کر سکا کہ یہ وہی ہے۔ مگر یہ ایک ناپائیدار عکس تھا؛ اس کی روح کی ناداری عمر کے ساتھ ساتھ زیادہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب یہ انکشاف ہوا کہ بیاردو سان رومان اس سے شادی کا خواستگار ہے، بہت سے لوگوں نے سوچا کہ اس بیگانے شخص نے ان کی توقعات کو جان بوجھ کر مجروح کیا ہے۔

خاندان والوں نے اس کی درخواست پر نہ صرف سنجیدگی سے، بلکہ پُرجوش انداز میں ردعمل کیا، سوائے پُورا ویکاریو کے، جس نے یہ شرط رکھی کہ بیاردو سان رومان اپنے آپ کو بطورِ مناسب شناخت کرائے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ درحقیقت کون ہے۔ وہ اس دوپہر سے آگے نہیں بڑھا تھا جب وہ ایک اداکار کے سوانگ میں کشتی سے اترا تھا، اور وہ اپنے ماخذ کے بارے میں اس کم گو تھا کہ آخری حد تک بعید از عقل اختراع بھی درست ہو سکتی تھی۔ یہ سننے میں آیا تھا کہ اس نے کسمارے میں، ٹروپ کمانڈر کی حیثیت سے دہشت گردی مچائی تھی اور دیہاتوں کو نیست و نابود کیا تھا، وہ ڈیویل آئی لینڈ سے فرار ہو کر آیا تھا، اسے پرنامبوکو میں ریچھوں کے ایک جوڑے کو نچا کر روزی کماتے دیکھا گیا تھا اور اس نے ونڈورڈ میں سونے سے لدی ہوئی ایک اسپانوی جنگی کشتی کے باقیات کو سمندر سے نکالا تھا۔ بیاردو سان رومان نے ان تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ ایک سیدھے سادے عمل سے کیا؛ وہ اپنے خاندان کو لے آیا۔

وہ چار تھے؛ باپ، ماں، اور دو عشق انگیز بہنیں۔ وہ سرکاری نمبر پلیٹ کی ٹی ماڈل فورڈ میں آئے، جس کے بطخ کی آواز والے ہارن نے گیارہ بجے سڑک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی ماں آلبیرتا سموندس، کیوراساؤ کی ایک طویل قامت ملاٹو خاتون جو اسپانوی کو پاپیامینتو کی آمیزش کے ساتھ بولتی تھی، انتیلس کی دو سو حسین ترین عورتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت مانی گئی تھی۔ نوشگفتہ بہنیں، دو بےقرار بچھیریوں کی طرح تھیں۔ مگر توجہ کا اصل مرکز ان کا باپ جنرل پیترونیو سان رومان تھا، گزشتہ صدی کی خانہ جنگیوں کا مردِ میداں، اور کنزرویٹو عہد کی اہم رفعتوں میں سے ایک، جس نے کرنل اوریلیانو بوئندیا کو تُوکورینکا کی تباہ کن جنگ میں پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ صرف میری ماں ایک تھی جو اسے خوش آمدید کہنے نہیں گئی، جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کون ہے۔ "یہ مجھے ٹھیک لگتا ہے کہ وہ شادی کر لیں،" اس نے مجھے بتایا، "مگر یہ اور بات ہے کہ اس آدمی سے ہاتھ ملایا جائے

جس نے جیری سیلدو مارکیز کو پشت میں گولی مارنے کا حکم دیا تھا۔" جیسے ہی وہ اپنی آٹوموبیل کی کھڑکی سے اپنا سفید ہیٹ لہراتا ہوا نمودار ہوا، ہر شخص نے اس کو اس کی مشہور تصویروں کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ سفید لنن کے کوٹ اور کلابتوں والے اونچے قرطبائی جوتوں میں تھا، اور سونے کی رم کی عینک، جس کی زنجیر اس کی واسکٹ کے کاج سے بندھی تھی، اس کی ناک کے بانسے پر ایک قبضے کی مدد سے ٹکی تھی۔ وہ اپنے کوٹ کے کالر پر شجاعت کا تمغا سجائے اور ایک چھڑی لیے ہوئے تھا جس کے دستے پر قومی شیلڈ کھدی تھی۔ ہمارے خستہ راستوں کی بھتی دھول میں پوری طرح اٹا، آٹوموبیل سے اترنے والا وہ پہلا شخص تھا، اور اسے صرف یہ کرنا تھا کہ وہ رننگ بورڈ پر کھڑا ہو جائے، کہ سب جان لیں کہ بیاردو سان رومان جس کا خواستگار ہے اس سے شادی کرنے جا رہا ہے۔

یہ انجلا ویکاریو تھی جو اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "وہ مجھ سے بہت فزوں تھا" اس نے مجھے بتایا۔ اس کے علاوہ بیاردو سان رومان نے کبھی اسے شادی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی بلکہ خاندان کو اپنے جادو سے مسحور کر لیا تھا۔ انجلا ویکاریو اس رات کی سراسیمگی کبھی فراموش نہیں کر سکی جب اس کے والدین اور اس کی بڑی بہنیں اپنے خاوندوں سمیت پارلر میں جمع ہو کر اس پر اس کے اس فرض کو عائد کر رہے تھے کہ وہ ایک ایسے آدمی سے شادی کے لیے رضامند ہو جائے جسے اس نے ٹھیک سے دیکھا تک نہیں تھا۔ جڑواں بھائی اس معاملے میں نہیں پڑے۔ "یہ ہمیں عورتوں کا بکھیڑا لگا" پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ والدین کی حتمی دلیل یہ تھی کہ نسبتاً کم ذرائع سے اپنا بھرم قائم رکھنے والے ایک خاندان کو قسمت کے اس انعام کی اہانت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انجلا ویکاریو نے ہمت کر کے عدم محبت کی ناسازگاری کی طرف اشارہ کیا، مگر اس کی ماں نے اسے ایک فقرہ سے ڈھا دیا:

"محبت بھی سیکھی جا سکتی ہے۔"

اس وقت کی منگنیوں کے برخلاف، جو سرپرستوں کی زیر نگرانی مدتوں چلتی تھیں، ان کی منگنی بیاردو سان رومان کے پرزور اصرار پر صرف چار مہینے جاری رہی۔ یہ مدت اور کم نہیں ہو سکی کیونکہ پورا ویکاریو نے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خاندانی سوگ کے اختتام تک انتظار کریں۔ مگر یہ عرصہ، اس ناقابل مزاحمت وضع کی بدولت جس میں بیاردو سان رومان نے معاملات کو طے کیا، کسی دشواری کے بغیر گزر گیا۔ "ایک شام اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کون سا مکان سب سے زیادہ پسند ہے" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا "اور میں نے، بغیر یہ جانے کہ کیوں، جواب دیا کہ قصبے کا سب سے خوبصورت مکان رنڈوے زیوس کا فارم ہاؤس ہے۔" میں نے بھی یہی جواب دیا ہوتا۔ وہ ایک پہاڑی پر، ہوا کے رخ پر واقع تھا اور ٹیرس سے کوئی شخص قرمزی شقائق نعمان سے ڈھکی ہوئی دلدلوں کی لامتناہی بہشت، اور گرمیوں کے صاف دنوں میں کریبین کا شفاف افق اور کارتاجینا دے انڈیاز سے آتے ہوئے سیاحوں کے جہاز دیکھ سکتا تھا۔ اسی شام بیاردو سان رومان سوشل کلب گیا اور زیوس کی میز پر ڈومینو کی ایک بازی کھیلنے بیٹھا۔

"زیوس،" اس نے کہا، "میں تمہارا مکان خریدنے والا ہوں۔"

"وہ بکنے کے لیے نہیں ہے،" زیوس نے جواب دیا۔

"میں اسے اس میں موجود تمام چیزوں کے ساتھ خرید لوں گا۔"

زیوس نے اسے پرانے زمانے کی صحیح النّسبی کے ساتھ سمجھایا کہ مکان کی اشیا اس کی بیوی نے تمام عمر کی قربانیوں کے بعد جوڑی تھیں، اور وہ اب تک اس کے لیے اس کی بیوی کا ایک حصہ ہیں۔ "وہ اپنا دل اپنے ہاتھ میں لے کر بات کر رہا تھا،" مجھے ڈاکٹر ڈیونیسیو اگواران نے بتایا، جو ان کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ "مجھے یقین تھا کہ اس مکان کو، جس میں وہ تیس سال سے زیادہ عرصے تک خوش وخرم رہا تھا، بیچنے سے پہلے مر جائے گا۔" مگر بیاردو سان رومان بھی اس کی دلیل کو سمجھتا تھا۔

"منظور،" اس نے کہا۔ "بس مجھے خالی مکان بیچ دو۔"

مگر زیوس نے کھیل ختم ہونے تک اپنی مدافعت کی۔

تین شاموں کے بعد، بیاردو سان رومان بہتر پیش بندیوں کے ساتھ ڈومینو کی میز پر واپس آیا۔

"زیوس،" اس نے پھر شروع کیا "مکان کی قیمت کیا ہے؟"

"اس کی کوئی قیمت نہیں۔"

"کوئی بھی قیمت، جو تم چاہو لگا لو۔"

"بیاردو، مجھے افسوس ہے،" زیوس نے کہا، "مگر تم نوجوان لوگ، دل کے محرکات کو نہیں سمجھتے۔"

بیاردو سان رومان سوچنے کے لیے ٹھہرا نہیں۔

"اگر ہم پانچ ہزار پیسو کہیں؟" اس نے کہا۔

"اپنا وقت ضائع مت کرو،" زیوس نے جواب دیا۔ اس کی خودداری عروج پر تھی، "وہ مکان اس سے کہیں زیادہ کا ہے۔"

"دس ہزار،" بیاردو سان رومان نے کہا، "اسی وقت، نقد۔"

زیوس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ "وہ غصّے سے رو رہا تھا،" مجھے ڈاکٹر ڈیونیسیو اگواران نے بتایا، جو معالج ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی تھا۔ "تصوّر تو کرو! اتنی بڑی رقم سامنے ہو اور صرف روح کی ایک کمزوری کی بنا پر انکار کرنا۔" زیوس کی آواز نہیں نکل پائی، مگر بغیر تردّد کیے اس نے سر کی جنبش سے "نہیں" کہا۔

"پھر اتنی مہربانی کرو،" بیاردو سان رومان نے کہا، "یہاں پانچ منٹ کے لیے میرا انتظار کرو۔"

پانچ منٹ بعد وہ سوشل کلب میں اپنی چاندی جڑی خورجینیں لیے واپس آیا، اور اس نے اسٹیٹ بینک کے چھپے ہوئے فیتوں سے بندھی ہزار پیسوؤں کی دس گڈیاں میز پر رکھ دیں۔ رنڈوا زیوس دو ماہ بعد مر گیا۔ "وہ اسی وجہ سے مرا،" ڈاکٹر ڈیونیسیو اگواران نے کہا۔ "وہ ہم سب سے زیادہ تندرست تھا، مگر جب تم اسٹیتھوسکوپ سے سننے کی کوشش کرتے، اس کے دل کے اندر آنسوؤں کو غلغل کرتے سن سکتے تھے۔" مگر نہ صرف یہ کہ اس نے مکان اندر کی تمام اشیا کے ساتھ فروخت کیا، بلکہ اس نے بیاردو سان رومان سے درخواست کی کہ وہ اسے

قسطوں میں ادائیگی کرے، کیوں کہ اس کے پاس ایک صندوق بھی نہیں بچا تھا جس میں وہ نعم البدل کی اتنی زیادہ رقم رکھ سکتا۔

کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ انجلا ویکاریو دوشیزہ نہیں ہے۔ اس کا کوئی پچھلا منگیتر بھی نہیں تھا، اور وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اپنی ماں کی سخت نگرانی میں جوان ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب ان کی شادی میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے، پیورا ویکاریو نے اسے بیاردو سان رومان کے ساتھ، اس مکان کو دیکھنے کے لیے، جہاں وہ رہنے جا رہے تھے، جانے کی اجازت نہ دی۔ مگر وہ خود اور نابینا باپ، اس کی عصمت کی نگہبانی کے لیے ہمراہ گئے۔ "میں خدا سے صرف یہ دعا کرتی تھی کہ وہ مجھے اپنے آپ کو ختم کرنے کی جرأت عطا کرے،" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ "مگر اس نے مجھے یہ جرأت عطا نہیں کی۔" وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے اپنی ماں کو سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا، تاکہ اپنے آپ کو اس شہادت سے بچا سکے، مگر اس کی دونوں رازداروں نے، جو کپڑوں سے پھول بنانے میں اس کی معاون تھیں، اسے اس کے نیک ارادوں سے باز رکھا۔ "میں نے آنکھ بند کر کے ان کا کہا مانا،" اس نے مجھے بتایا، "کیوں کہ انھوں نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ مردوں کو فریب دینے میں ماہر ہیں۔" انھوں نے اسے یقین دلایا کہ تقریباً تمام لڑکیاں اپنی دوشیزگی بچپن کے حادثات میں کھو بیٹھتی ہیں۔ انھوں نے بصد اصرار اسے آگاہ کیا کہ سخت سے سخت شوہر بھی خود کو ہر بات برداشت کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے، بشرطیکہ کوئی اور اس کے بارے میں نہ جان جائے۔ انھوں نے آخرالامر اسے قائل کر لیا کہ زیادہ تر مرد اپنے حجلۂ عروسی میں اتنے سہمے ہوئے آتے ہیں کہ وہ عورت کے تعاون کے بغیر کسی عمل کے اہل نہیں رہ جاتے اور لمحۂ صدق میں اپنی حرکات تک یاد نہیں رکھتے۔ "وہ صرف اس پر یقین کرتے ہیں جو وہ بعد میں چادر پر دیکھتے ہیں،" انھوں نے اس سے کہا۔ اور انھوں نے اسے دوشیزگی کا تصنع کرنے میں تجربہ کار بیویوں کی چالبازیاں سکھائیں تاکہ وہ نوعروسی حیثیت میں، اپنی پہلی صبح کو اپنے مکان کے صحن میں اپنی لنن کی چادر کو دوشیزگی کی حسب الرد علامت سمیت، عام نمائش کے لیے رکھ سکے۔

وہ اس بہلاوے کے ساتھ بیاہی گئی۔ بیاردو سان رومان نے، اپنی طور پر، ضرور اس التباس کے ساتھ شادی کی ہو گی کہ وہ اپنی طاقت اور دولت کے بل پر خوشیاں خرید رہا ہے، کیوں کہ تقریب کا منصوبہ جتنا پھیلتا گیا اس کو اتنے ہی بےخود کر دینے والے خیالات اسے اور زیادہ طول دینے کے لیے آتے رہے۔ جب بشپ کی آمد کا اعلان ہوا، اس نے تقریب کو ایک دن کے لیے روکنا چاہا تاکہ وہ ان کی شادی کی رسم ادا کر سکے، مگر انجلا ویکاریو اس کے خلاف تھی۔ "درحقیقت،" اس نے مجھے بتایا، "میں ایسے شخص کی معرفت خدا کی بخشش نہیں چاہتی تھی جو سُوپ کے لیے کلغی کاٹ کر باقی مرغ کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیتا ہے۔" مگر بشپ کی مقدس دعاؤں کے بغیر بھی جشن نے اتنا زور پکڑ لیا کہ اسے قابو میں رکھنا دشوار ہو گیا، اور وہ بیاردو سان رومان کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر، ایک عوامی ہنگامے پر ختم ہوا۔

جنرل پیٹرونیو سان رومان اور اس کا خاندان اس بار قومی کانگریس کی پُرتکلف کشتی پر آیا، جو تقریب کے اختتام تک گودی پر لنگرانداز رہی۔ اور ان کے ساتھ بہت سے نام ور لوگ آئے، جو اپنی نام وری کے باوصف، نئے چہروں کے ہنگامے میں بےملاحظہ گزر گئے۔ اتنے تحفے

لائے گئے تھے کہ یہ ضروری ہو گیا کہ ان میں سے زیادہ لائقِ تحسین تحفوں کی نمائش کے لیے برقی توانائی کے اولین کارخانے کی فراموش شدہ عمارت کو بحال کیا جائے، بقیہ فوراً رینڈوے ریوس کے سابقہ مکان پر پہنچا دیے گئے جو نوعروسوں کے لیے پیشتر ہی آراستہ کیا جا چکا تھا۔ نوشے کو ایک کنورٹیبل ملی جس پر اس کا نام کمپنی کے مونوگرام کے نیچے کندہ تھا۔ دلھن کو چوبیس مہمانوں کی تواضع کے لیے خالص طلائی ظروف سے بھری ایک الماری ملی۔ وہ بیلے کا ایک طائفہ اور والز کے دو آرکسٹرا بھی لائے تھے، جو شادمانیوں کے شور سے برانگیخت مقامی بینڈ اور دوسرے آئے ہوئے سازوں اور اکورڈین کا ساتھ دیتے دیتے بےسُرے ہو گئے۔

ویکاریو خاندان ایک حجن مکان میں رہتا تھا جس کی دیواریں اینٹوں کی اور چھت تاڑپول کی تھی، مع دو عدد دوچھتیوں کے جہاں ابابیلیں جنوری میں افزائش نسل کرتیں۔ بیرونی رخ پر اس میں پھولوں کے گملوں سے تقریباً پورا بھرا ہوا ایک چبوترہ تھا، اور ایک طویل صحن جس میں آزاد دوڑتی ہوئی مرغیاں اور پھل دار درخت تھے۔ صحن کے پچھواڑے، قربانی کی سل اور انتڑیاں صاف کرنے کی میز سمیت، جڑواں بھائیوں کا سؤروں کا باڑا تھا، جو پونسیو ویکاریو کی بینائی کے جاتے رہنے کے بعد خاندانی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھا۔ پیدرو ویکاریو نے یہ کاروبار شروع کیا تھا اور جب وہ فوجی خدمت کے لیے چلا گیا، اس کے جڑواں بھائی نے بھی ذبح کرنے کا کسب اختیار کر لیا۔

مکان کے اندر رہنے کے لیے حسبِ ضرورت کمرے بمشکل ہی تھے، اس لیے بڑی بہنوں نے جب جشن کے پھیلاؤ کا اندازہ کیا تو کرائے پر ایک مکان لینا چاہا۔ "دیکھو تو،" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا "انھوں نے پلاسیدا لینیرو کے مکان کے بارے میں سوچا، مگر خوش قسمتی سے ہمارے والدین اپنی پرانی ضد پر اڑے رہے کہ ہماری لڑکیاں ہمارے اسی خنزیرخانے میں بیاہی جائیں گی یا کبھی نہیں بیاہی جائیں گی۔" اس لیے انھوں نے مکان کو اصلی زرد رنگ میں رنگا، دروازے ٹھیک کیے، فرش ٹھکوایا، اور جہاں تک بن پڑا اسے ایسی پُرشور شادی کا اہل کر کے چھوڑا۔ جڑواں بھائی سؤروں کو کہیں اور لے گئے، اور باڑے کی ان بجھے چونے سے صحت افزائی کی گئی، مگر اس کے باوجود یہ واضح تھا کہ مکان میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ بالآخر، بیاردو سان رومان کی کوششوں سے انھوں نے صحن کی باڑیں گرائیں، پڑوس کے گھر کو رقص کے لیے مستعار لیا، اور ثمرہند کے درختوں کی شاخوں کے نیچے بیٹھنے اور کھانے کے لیے ترکھان بنچیں نصب کیں۔

صرف ایک غیرمتوقع سراسیمگی نوشے نے شادی کی صبح پھیلائی، جب اس نے انجلا ویکاریو کے ہاں آنے میں دو گھنٹے کی تاخیر کی، اور اس نے عروسی جوڑا پہننے سے انکار کر دیا جب تک کہ اسے گھر میں دیکھ نہیں لیا۔ "سوچو تو،" اس نے مجھے بتایا، "میں خوش ہوتی اگر وہ بالکل نہ آتا، مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے دلھن کی طرح سجنے کے بعد ترک کر دے۔" اس کی احتیاط بجا نظر آتی تھی کیوں کہ کوئی بھی عام ابتلا ایک عورت کے لیے اس سے زیادہ رسواکن نہیں ہو سکتی تھی جتنی یہ کہ کوئی اس کے عروسی جوڑا پہننے کے بعد شادی کے اقرار سے پھر جائے۔ دوسری طرف، یہ امر کہ انجلا ویکاریو نے دوشیزہ نہ ہوتے ہوئے بھی نقاب اور اورینج بلاسم پہننے کی جرأت کی، بعد ازاں، پاک دامنی کی علامت کی بےحرمتی

سے تعبیر کیا گیا۔ میری ماں وہ واحد شخصیت تھی، جس نے اس حقیقت کو کہ اُس نے اپنے مثنٰی رہ جانے آخری باری تک کھیلی، ایک جراثت مندانہ قدم کی طرح قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ "اِن دنوں" اس نے مجھے بتایا، "خدا اس طرح کی باتیں سمجھتا تھا۔" ادھر، کوئی نہیں جانتا تھا کہ بیاردو سان رومان کن پتّوں سے کھیل رہا ہے۔ اُس لمحے سے لے کر جب وہ نہایت لامر، فراک کوٹ اور اونچی ریشمی ہیٹ میں حاضر ہوا تھا، اپنے اُزار کی تحقیق کو رقص گاہ سے لے اڑنے تک، وہ ایک خوش نصیب دولہے کی مکمل تصویر بنا رہا

یہ معلوم تھا کہ سانتیاگو نصر کن پتّوں سے کھیل رہا ہے۔ کلیسا اور جشن میں تمام وقت، میں، کرستو بیدویا اور اپنے بھائی اینریک کے ہمراہ، اس کے ساتھ ہی رہا تھا، اور ہم میں سے کسی نے اس کے رویّہ میں کسی تبدیلی کی جھلک نہیں دیکھی۔ مجھے یہ بات کئی بار دوہرانی پڑی، کیوں کہ ہم چاروں اسکول تک ایک ساتھ پڑھے تھے اور بعد میں تعطیل کے دوران ایک ہی ٹولی میں ہوتے تھے، اور کوئی بھی یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ ہم کوئی راز، اور خصوصاً اتنا بڑا راز، ایک دوسرے سے چھپا سکتے ہیں۔

سانتیاگو نصر تقریبات کا آدمی تھا، اور اس نے اپنا بہترین وقت، اپنی موت سے پیشتر کی شام، شادی کے اخراجات کا تخمینہ لگاتے ہوئے گزارا۔ کلیسا میں اس نے اندازہ لگایا کہ انھوں نے پھولوں کی اتنی رنگینیں کھڑی کی ہیں کہ ان پر چودہ اول درجے کے جنازوں کے برابر خرچ آیا ہو گا۔ یہ تشبیہ مجھے برسوں تک تنگ کرتی رہنے والی تھی، کیوں کہ سانتیاگو نصر نے مجھ سے اکثر کہا تھا کہ بند عمارتوں میں پھولوں کی خوشبو اس کے لیے موت سے ایک قریبی ربط رکھتی ہے، اور اُس دن جب وہ کلیسا کے اندر گیا، اس نے مجھ سے اس بات کو دوہرایا۔ "میں اپنے جنازے پر کوئی پھول نہیں چاہتا۔" اس نے مجھ سے کہا، یہ جانے بغیر کہ اگلے دن، میں نے اس کا اہتمام کیا کہ پھول نہ رکھے جائیں۔ کلیسا سے ویکاریو کے گھر تک اس نے رنگین پھولوں کے دستوں کی قیمت کا تعین کیا جو سڑک کو سجا رہے تھے، اس نے موسیقی اور ہوائیوں، یہاں تک کہ کچے چاولوں کی نچھاور کی لاگت کا بھی اندازہ لگایا جس سے انھوں نے ہمارا خیرمقدم کیا۔ دوپہر کی خواب آلودگی میں نوعروس صحن میں آ جا رہے تھے۔ بیاردو سان رومان ہمارا بہت اچھا دوست بن گیا "چند جام کا دوست"، جیسا کہ اُن دنوں کا محاورہ تھا۔ اسے ہماری میز پر بہت زیادہ مزہ آیا۔ انجلا ویکاریو نے نقاب اور عروسی گلدستے اور پسینے سے داغ دار ساٹن کے لباس میں، جلد ہی ایک شادی شدہ عورت کی شبیہ اختیار کر لی تھی۔ سانتیاگو نصر نے حساب لگایا اور بیاردو سان رومان سے کہا کہ اس وقت تک شادی پر لگ بھگ نو ہزار پیسو خرچ ہو چکے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انجلا ویکاریو نے اس بات کو گستاخی سمجھا تھا۔ "میری ماں نے مجھے تربیت دی ہے کہ دوسروں کے سامنے کبھی پیسوں کا ذکر نہیں کرتے۔" اس نے مجھے بتایا۔ بیاردو سان رومان نے، اپنے طور پر اس بات کو ایک خاص خودستائی کے ساتھ، بہت مؤدبانہ لیا۔

"تقریباً" اس نے کہا۔ "مگر یہ تو صرف شروعات ہیں، خاتمے تک، اس سے دگنا خرچ ہو چکا ہو گا۔"

سانتیاگو نصر نے اسے آخری پائی تک ثابت کرنے کو کہا، اور اس کی زندگی نے وہیں تک

وقت کی۔ آخری اعداد سے، جو کرستو بیدویا نے اسے دوسرے دن گودی پر، اس کے مرنے سے پینتالیس منٹ پہلے، فراہم کیے۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بیاردو سان رومان کا دعوا درست تھا۔

اس سے پہلے، جب میں نے دوسروں کی یادداشتوں سے اسے بحال کرنا شروع کیا، میرے پاس تقریب کا ایک دھندلا سا خیال باقی رہ گیا تھا۔ برسوں تک ہمارے گھر میں اسی کا ذکر ہوتا رہا۔ مثلاً میرے باپ نے، نوعروسوں کے اعزاز میں، اپنے ایامِ طفلی کا وائلن دوبارہ اٹھا لیا تھا۔ میری راہبہ بہن دربان کے سوانگ میں ایک میرنگو ناچی تھی، اور یہ کہ ڈاکٹر ڈیونیسیو اگواران نے، جو میری ماں کا عم زاد تھا، صرف اس کی خاطر باضابطہ سرکاری کشتی سے آنے کا بندوبست کیا تھا، تاکہ وہ یہاں دوسرے دن، جب بشپ کو آنا تھا، نہ پہنچے۔ ان وقائع کی تفتیش کے دوران میں کئی حسی تجربوں سے دوبارہ گزرا جن میں بیاردو سان رومان کی بہنوں کا بےاختیار تصور بھی تھا جن کے مخمل کے لباس پر، جس میں ایک بڑی تتلی کے پر پشت کی جانب ایک طلائی سنجاق سے اٹکے تھے، اُن کے باپ کے پروں والے ہیٹ اور جنگی تمغوں کی قدر سے زیادہ پذیرائی حاصل کی تھی۔ کئی لوگ جانتے تھے کہ شادی کی اس ہنگامے کے دوران میں نے مرسیدس بارچا کو، جیسے ہی وہ پرائمری اسکول ختم کرتی، شادی کرنے کی تجویز پیش کر دی تھی، جیسا کہ اس نے خود چودہ سال بعد، جب ہم نے شادی کی، مجھے یاد دلایا۔ فی الواقع اس ناخوش اتوار کی سب سے شکیب دہ تصویر جسے میں کبھی نہیں بھول سکا، صحن کے بیچ ایک اسٹول پر تنہا بیٹھے بوڑھے پونسیو ویکاریو کی تھی۔ انھوں نے سے یہ سوچ کر وہاں بٹھا دیا تھا کہ احترام کی نشست یہی ہے، اور مہمان اس سے ٹھوکر کھاتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ اس پر کسی اور کا گمان کر رہے تھے، اسے ہٹا رہے تھے تاکہ وہ ان کی رکاوٹ نہ بنے، اور وہ کلف سے کتے کی طرح اکڑی قمیص میں اپنی ورنی چھڑی کے سہارے جو اس کے لیے خاص اس تقریب کے واسطے لائی گئی تھی، ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے جو اس سے نہیں پوچھے گئے، اور ہاتھ کی ان گریزآمیز اشاروں پر ردعمل کرتے ہوئے جو اسے نہیں کیے جا رہے تھے، کسی ایسے شخص کے نادرست تاثر کے ساتھ جس کی بینائی ضائع ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو، اپنے برف جیسے سفید سر کو ہر سمت میں ہلاتے ہوئے، اپنی خودفراموشی کے دائرے میں خوش تھا۔

چھ بجے شام کو جب مہمان رخصت ہوئے، رسم کی سرگرمیاں اپنے اختتام کو پہنچیں۔ کشتی، اپنی تمام بتیاں روشن کیے، پیانو پر بجتے والز کے آہنگ کے ساتھ چلی، اور کچھ دیر تک ایک موہوم گرداب میں بھٹکنے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو ازسرنو دریافت کیا اور تقریب کے دائرے میں واپس آ گئے۔ نوعروس تھوڑی دیر بعد کھلی ہوئی کار میں تقریب کے ہنگاموں کے درمیان سے اپنا راستا بہ دشواری بناتے ہوئے نمودار ہوئے۔ بیاردو سان رومان نے ہوائیاں چھوڑیں، ہجوم کی پیش کردہ بوتلوں سے گنّے کی شراب پی، اور کمبیامبا رقص کے دور میں شریک ہونے کے لیے انجلا ویکاریو کے ساتھ باہر نکلا۔ آخر میں، اس نے ہمیں اپنی طرف سے جہاں تک ہماری زندگیاں پہنچ سکیں، رقص جاری رکھنے کو کہا، اور اپنی وحشت زدہ دلہن کو اپنے خوابوں کے گھر لے گیا، جہاں کبھی ریوس خوش رہا تھا۔

آدھی رات کے قریب عام رنگ رلیاں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر اختتام پذیر ہوئیں، اور باقی رہ جانے والی صرف چوک کے پاس کلوتیلدے آرمنتا کی دکان تھی۔ میں اور سانتیاگو نصر میرے بھائی لوئس اینریک اور کرستو بیدویا کے ساتھ ماریا الیخاندرینا سروانتس کے دارالامان پہنچے۔ دوسرے بہت سے لوگوں کے علاوہ ویکاریو برادران بھی وہاں موجود تھے، اور وہ ہمارے ہم نشینی میں شراب پیتے رہے اور، اس کو قتل کرنے سے پانچ گھنٹے پہلے تک سانتیاگو نصر کے ساتھ مل کر نغمہ سرائی کرتے رہے۔ اصل تقریب سے چند منتشر چنگاریاں سرور باقی رہ گئی ہوں گی، کیونکہ بشپ کی کشتی کے نعرہ زن ہونے سے پہلے تک ہر طرف سے موسیقی کی لہریں اور رزم آرائیوں کی خشکیں تر ہوتی ہوئی آوازیں ہم تک پہنچتی رہی تھیں۔

پورا ویکاریو نے میری ماں کو بتایا کہ وہ اپنی بڑی لڑکیوں کی مدد سے تقریب کی تباہ کاریوں کو ایک ذرا سمیٹنے کے بعد، گیارہ بجے رات کو بستر پر گئی۔ دس بجے کے آس پاس، جب چوک میں چند بدمست ابھی نغمہ سرائی جاری رکھے ہوئے تھے، انجلا ویکاریو نے اپنے شب خوابی کے کمرے کی الماری سے اپنی ذاتی اشیا سمیٹنے کے لیے ایک چھوٹا سوٹ کیس بھیجا، اور اس نے اس کے علاوہ اپنے روزمرہ کے کپڑوں کا ایک سوٹ کیس بھی بھیجنے کو کہا مگر قاصد جلدی میں تھا۔ پورا ویکاریو پر گہری نیند کا غلبہ تھا، جب دروازے پر دستک ہوئی۔ "وہ تین بہت آہستہ دستکیں تھیں،" اس نے میری ماں سے کہا، "مگر ان میں بدفالی کا ایک نامعلوم عنصر تھا۔" پورا ویکاریو نے میری ماں کو بتایا کہ اس نے روشنی کیے بغیر تاکہ کوئی اور نہ جاگ اٹھے، دروازہ کھولا اور سڑک سے آتی ہوئی روشنی میں بیاردو سان رومان کو دیکھا۔ اس کی ریشمی قمیص کے بٹن کھلے تھے اور اس کی زرق برق پتلون لاسٹک کی گیلس سے رکی ہوئی تھی۔ "اس کا رنگ خوابوں کی طرح سبز ہو رہا تھا۔" پورا ویکاریو نے میری ماں سے کہا۔ انجلا ویکاریو تاریکی میں تھی، اس لیے اس کی ماں نے اسے صرف اس وقت دیکھا جب بیاردو سان رومان نے بازو سے پکڑ کر روشنی میں کھینچ لیا۔ اس کا ساٹن کا لباس چیتھڑے ہو چکا تھا اور وہ کمر تک ایک تولیے میں لپٹی تھی۔ پورا ویکاریو نے سوچا کہ وہ سڑک پر گاڑی میں دھماکے سے ختم ہو چکے، اور اب ایک گہری کھائی میں مردہ پڑے ہیں۔

"مقدس مریم،" اس نے ڈر کر کہا۔ "تم لوگ اب تک ابھی دنیا میں ہو؟"

بیاردو سان رومان اندر نہیں آیا، مگر اس نے، ایک لفظ کہے بغیر اپنی بیوی کو گھر میں دھکیل کر داخل کر دیا۔ پھر اس نے پورا ویکاریو کے رخسار پر بوسہ دیا اور بہت گہری غم زدہ آواز میں کمال ملائمت کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا۔ "امی، آپ کی بہت نوازش،" اس نے کہا، "آپ نہایت مقدس ہیں۔"

صرف پورا ویکاریو ہی جانتی تھی کہ اس نے بعد کے دو گھنٹوں میں کیا کیا، اور وہ یہ راز اپنی قبر میں لے گئی۔ "مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے میرے بال پکڑ کر دوسرے سے اتنے غصے میں مجھے پیٹ رہی تھی کہ میں سمجھی کہ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گی،" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ مگر یہ عمل بھی اس نے اتنی رازداری سے کیا کہ اس کا شوہر اور بڑی لڑکیاں جو دوسرے کمروں میں محوِخواب تھیں، صبح تک، جب سانحہ پایۂ تکمیل کو

نہ پہنچ گیا، کسی بات کو نہیں جان سکیں۔

جڑواں بھائی تین بجے سے کچھ پہلے، اپنی ماں کے ہنگامی طور پر طلب کرنے پر واپس آئے۔ انھوں نے انجلا ویکاریو کو کھانے کے کمرے کی کوچ پر اوندھے منہ پڑے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خراشیں پڑ گئی تھیں، مگر وہ رونا موقوف کر چکی تھی۔ "اس وقت میں بالکل خوفزدہ نہیں تھی،" اس نے مجھے بتایا، "اس کے برعکس مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ موت کی غنودگی آخرکار مجھ پر سے زائل ہو گئی ہے، اور میں صرف یہ چاہ رہی تھی کہ یہ سب کچھ جلدی سے ختم ہو تاکہ میں گر پڑوں اور سو جاؤں۔"

بھائیوں میں زیادہ زورآور پیدرو ویکاریو نے اسے کمر سے پکڑ کر ہوا میں بلند کیا اور کھانے کی میز پر بٹھا دیا۔

"کون تھا وہ؟" اس نے غصے میں لرزتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نام بتانے میں ضروری وقت لگایا۔ بہت سے عکس اس کے سامنے آئے، اور اس نے پہلی نظر میں، اس دنیا اور دوسری کے باآسانی غلط ملط ہوجانے والے بہت سے ناموں میں اسے تلاش کر لیا، اور اپنے خوش ہدف تیر سے، ایک بےمدافعت تتلی کی طرح جس کی تقدیر ہمیشہ دوسروں نے لکھی، اسے دیوار پر پیوست کر دیا۔

"سانتیاگو نصر،" اس نے کہا۔

وکیل عرب کی جانب دفاع کے تحت قتل کے موقف میں قائم رہا، جو حسنِ ظن کی عدالت نے تسلیم کر لیا۔ اور جڑواں بھائیوں نے پہلے مقدمے کے خاتمے پر اعلان کیا کہ وہ ہزار بار اس طرح کی صورتِ حال میں ایسا ہی کریں گے۔ جرم کے چند منٹوں کے بعد اپنے آپ کو کلیسا کے حوالے کرتے ہوئے انھوں نے خود اس پہلو کی طرف اشارہ کیا تھا جو بعد میں وکیلِ صفائی نے اپنایا۔ مشتعل عربوں کے ایک گروہ کے خطرناک تعاقب سے بچ کر وہ ہانپتے ہوئے، کلیسا کے احاطے میں گھس آئے اور انھوں نے بے داغ چھرے فادر امادور کی رحل پر رکھ دیے۔ دونوں قتل کی سفاکانہ عمل کے بعد تھکے ہوئے تھے اور ان کے کپڑے اور بازو تر بتر اور ان کے چہرے پسینے اور ابھی زندہ خون سے آلودہ تھے، مگر کلیسا کے پادری نے اس سپردگی کو نہایت باوقار عمل کے طور پر یاد رکھا۔

"ہم نے اسے علانیہ قتل کیا ہے" پیدرو ویکاریو نے کہا "مگر ہم بےگناہ ہیں۔"

"شاید خدا کی نظروں میں" فادر امادور نے کہا۔

"خدا اور اس کے بندوں کی نظروں میں" پابلو ویکاریو نے کہا۔ "یہ عزت کا معاملہ تھا۔"

مزید برآں، واقعات کی ازسرنو درستی کے دوران، انھوں نے، جتنی کہ فی الواقع روا تھی اس سے کہیں زیادہ سخت جنون آشامی کا تصنع کیا، اس انتہا تک کہ یہ ضروری ہو گیا کہ پلاسیدا لینیرو کے گھر کے صدر دروازے کی مرمت میں، جو چھروں کی ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، سرکاری وسائل استعمال کیے جائیں۔

ریوہاچا کی مدور جیل میں، جہاں انھوں نے مقدمے کی سماعت کے انتظار میں تین سال

گزارے، کیونکہ وہ ضمانت کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، پرانے قیدیوں نے انھیں ان کے اچھے کردار اور ان کی خوش خلقی کی وجہ سے یاد رکھا اور انھوں نے ان میں کبھی پچھتاوے کا کوئی شوق نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود، حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ویکاریو برادران نے سانتیاگو نصر کو فی الفور، اور تماشا بنائے بغیر، قتل کرنے کے لیے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا، بلکہ انھوں نے، اس سے کہیں زیادہ جتنی تصور میں آ سکتی ہے، کاوش کی کہ کوئی انھیں اس کو قتل کرنے سے باز رکھ سکے، اور وہ اس میں ناکام رہے۔

اس کے مطابق جو انھوں نے مجھے کئی برسوں کے بعد بتایا، انھوں نے اس کی تلاش ماریا الیخاندرینا سروانتس کے ہاں سے شروع کی، جہاں وہ اس کے ساتھ دو بجے تک رہے تھے۔ یہ واقعہ، بہت سے اور واقعوں کی طرح مسل میں درج نہیں ہوا۔ اصل میں، سانتیاگو نصر اس وقت وہاں نہیں تھا جب وہ دونوں اپنے کہنے کے مطابق اسے تلاش کرنے آئے تھے، کیونکہ ہم سیرینیڈوں کا گشت کرنے نکل پڑے تھے، مگر کسی بھی صورت میں یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی وہاں گئے تھے۔ "وہ یہاں آنے کے بعد جا نہیں سکتے تھے،" ماریا الیخاندرینا سروانتس نے مجھے بتایا، اور، اسے بخوبی جانتے ہوئے، میں نے کبھی اس کی بات پر شک نہیں کیا۔ اس کے برخلاف، وہ اس کا انتظار کرنے کلوتیلدے ارمنتا کی دکان پر گئے، جہاں وہ جانتے تھے کہ سانتیاگو نصر کے سوا تقریباً ہر شخص تھوڑی دیر کے لیے رکے گا۔ "صرف وہی دکان کھلی ہوئی تھی،" انھوں نے تفتیش کرنے والے سے کہا۔ "جلد یا بدیر اسے گھر سے نکلنا تھا،" انھوں نے، بری ہو جانے کے بعد، مجھے بتایا۔ پھر بھی ہر شخص جانتا تھا کہ پلاسیدا لینیرو کا صدر دروازہ ہمیشہ، حتیٰ کہ دن کے وقت بھی، اندر سے اگلی چڑھا رہتا تھا، اور یہ کہ سانتیاگو نصر ہمیشہ عقبی دروازے کی چابیاں اپنے پاس رکھتا تھا۔ درحقیقت جب ویکاریو برادران کو دوسری طرف اس کا انتظار کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا، وہ اپنے گھر میں اسی دروازے سے داخل ہوا، اور اگر وہ بعد میں بشپ کا استقبال کرنے کے لیے چوک کی طرف کے دروازے سے نکلا تو یہ کسی ایسے ناگہانی امر کی وجہ سے تھا جسے تفتیش کرنے والا، جس نے مسل کو مرتب کیا تھا، کبھی دریافت نہ کر سکا۔

کوئی موت اس سے زیادہ پیش گفتہ نہیں تھی۔ جب ان کی بہن نے ان پر نام منکشف کر دیا، ویکاریو برادران سؤروں کے باڑے میں اس صندوق تک گئے جس میں وہ ذبح کرنے کے اوزار رکھتے تھے، اور انھوں نے دو عمدہ ترین چھرے منتخب کیے۔ ایک چہار قاش، دس انچ لمبا اور ڈھائی انچ چوڑا اور دوسرا پارچہ بنانے والا، سات انچ لمبا اور ڈیڑھ انچ چوڑا۔ انھوں نے ان کو چیتھڑوں میں لپیٹا اور گوشت بازار لے گئے۔ اتنی صبح کو وہاں زیادہ گاہک نہیں تھے، مگر بائیس آدمیوں نے بتایا کہ انھوں نے ہر بات سنی تھی اور ان تمام نے اس تاثر پر اتفاق کیا کہ انھوں نے وہ باتیں صرف سنانے کے لیے کی تھیں۔ تین بیس پر، جب فاؤستینو سانتوس، ان کے ایک قصائی دوست نے اپنی دراز کھولی ہی تھی، انھیں آتے دیکھا، اور سمجھ نہیں پایا کہ وہ سوموار کو اتنی جلدی کیوں آ رہے ہیں اور اس وقت تک شادی کے لیے پہنے گئے سیاہ سوٹوں میں کیوں ہیں۔ وہ انھیں جمعے کو آتے دیکھنے کا عادی تھا، مگر ذرا دیر سے، اور چمڑے کے ایپرن میں، جو وہ ذبح کرتے وقت باندھتے تھے۔ "میں سمجھا کہ وہ نشے میں ہیں،"

فاؤستینو سانتوس نے مجھے بتایا، "کہ وہ نہ صرف یہ بھول گئے ہیں کہ کیا بجا ہے، بلکہ یہ بھی کہ کون سا دن ہے۔" اس نے انھیں یاد دلایا کہ آج سوموار ہے۔

"یہ سب کو معلوم ہے، بے وقوف،" پابلو ویکاریو نے اسے خوش طبعی سے جواب دیا۔ "ہم صرف یہ چھرے تیز کرنے آئے ہیں۔"

انھوں نے چھروں کو سان پر چڑھایا، ہمیشہ کی طرح پیدرو چھریوں کو پکڑے ہوئے تھا اور انھیں پتھر پر تیز کر رہا تھا اور پابلو پہیے کو گھما رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دوسرے قسائیوں سے شادی کی شان و شوکت کے متعلق باتیں کرتے جا رہے تھے۔ چند ایک نے، ان کے کام کے ساتھی ہونے کے باوجود اپنے حصے کا کیک نہ ملنے کی شکایت کی، اور انھوں نے بعد میں بھجوانے کا وعدہ کیا۔ آخرکار، انھوں نے چھریوں کو پتھر پر صاف کر دیا، اور پابلو نے اپنا چھرا لیمپ کے مقابل رکھا تاکہ سٹیل چمکا سکے۔

"ہم سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں،" اس نے کہا۔

نیک آدمیوں کی حیثیت سے ان کی شہرت اتنی مستحکم تھی کہ کسی نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی۔ "ہم نے سمجھا یہ شرابیوں کی بکواس ہے،" کئی قسائیوں نے بیان دیا، جیسے وکٹوریا گزمان اور کئی اور لوگوں کا بیان تھا، جنھوں نے انھیں بعد میں دیکھا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے قسائیوں سے پوچھنا ہی تھا کہ آیا ذبح کرنے کا کسب ایسی روح کی نشاندہی نہیں کرتا جو کسی انسان کے قتل پر پہلے سے مائل ہو۔ انھوں نے احتجاج کیا، "کسی بچھڑے کو ذبح کرنے والا اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت نہیں کرتا۔" ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ ایک اور نے بتایا کہ وہ جس گائے کو پہلے سے جانتا ہو اسے ذبح کرنے کا دل نہیں ہو سکتا، اور اگر اس نے اس کا دودھ بھی پیا ہو تو ذبح کرنے کا امکان اور بھی کم ہو گا۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ ویکاریو برادران اپنے پالے ہوئے سؤروں کو ذبح کرتے تھے جن سے وہ اتنے مانوس تھے کہ انھیں ان کے ناموں سے پکارتے تھے۔ "یہ سچ ہے،" ان میں سے ایک نے کہا، "مگر یہ بھی یاد رہے کہ انھوں نے سؤروں کو انسانوں کے نہیں بلکہ پھولوں کے نام دیے تھے۔" بس ایک فاؤستینو سانتوس تھا جس نے پابلو ویکاریو کی دھمکی میں سچائی کی ایک جھلک محسوس کی تھی، اور اس نے ان سے مذاق میں پوچھا تھا کہ انھیں سانتیاگو نصر کو کیوں قتل کرنا پڑ رہا ہے، جب کہ کئی اور دولتمند موجود ہیں جو پہلے مارے جانے کے مستحق ہیں۔

"سانتیاگو نصر جانتا ہے کیوں،" پیدرو نے اسے جواب دیا۔

فاؤستینو سانتوس نے مجھے بتایا کہ اس وقت اسے شک پڑ گیا تھا، اور اس نے ایک پولیس والے کو، جو میئر کے ناشتے کے لیے ایک پونڈ کلیجی لینے آیا تھا، یہ اطلاع دے دی تھی۔ مسل کے مطابق اس پولیس والے کا نام لیاندرو پورنوئے تھا، اور وہ اس کے ایک سال بعد، قومی میلے کے دوران، گردن کی رگ میں بیل کا سینگ لگ جانے سے ہلاک ہو گیا تھا، اس لیے میں کبھی اس سے بات کرنے کا موقع نہیں حاصل کر سکا۔ مگر کلوتیلدے آرمنتا نے تصدیق کی کہ وہ اس کی دکان پر، جہاں ویکاریو برادران انتظار کر رہے تھے، آنے والا پہلا آدمی تھا۔

کلوتیلدے آرمنتا نے اسی وقت کاؤنٹر کے پیچھے اپنے شوہر کی جگہ سنبھالی تھی۔ یہ ان کا

طریقِ کار تھا۔ دکان صبح کو دودھ اور دن کو سودا سلف بیچتی، اور شام کے چھ بجے کے بعد شراب خانہ ہو جاتی۔ کلوتیلدے آرمنتا صبح ساڑھے تین بجے اسے کھولتی تھی۔ اس کا نیک شوہر، دون روخیلیو دے لا فلور، بند ہونے کے وقت تک شراب خانے کی ذمہ داری سنبھالتا۔ مگر اس رات شادی کی وجہ سے اتنے زیادہ غیرمتوقع خریدار آ گئے کہ وہ اسے بند کیے بغیر تین بجے سونے چلا گیا، اور کلوتیلدے آرمنتا معمول سے پیشتر اٹھ گئی تھی کیونکہ وہ بشپ کے آنے سے پہلے کام ختم کرنا چاہتی تھی۔

ویکاریو برادران چار بج کر دس منٹ پر آئے۔ اس وقت کھانے کی آخری چیز بھی بک چکی تھی، مگر کلوتیلدے آرمنتا نے انھیں گنے کی شراب کی ایک بوتل پیش کی، نہ صرف یوں کہ وہ ان کے لیے زیادہ احترام رکھتی تھی، بلکہ اس لیے بھی کہ وہ شادی کے کیک کے اس حصے کے لیے جو انھوں نے اسے بھجوایا تھا، بہت ممنون تھی۔ وہ پوری بوتل دو لمبے گھونٹوں میں پی گئے مگر ان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ "وہ حواس باختہ تھے،" کلوتیلدے آرمنتا نے مجھے بتایا، "وہ لیمپ آئل پی کر بھی اپنے اعصاب میں ولولہ پیدا نہ کر پاتے۔" انھوں نے اپنی سوتی جیکٹیں اتاریں، انھیں احتیاط سے کرسی کی پشت پر لٹکایا اور ان میں سے ایک اور بوتل منگائی۔ ان کی قمیصیں سوکھے پسینے سے داغدار تھیں اور ایک دن کی بڑھی ہوئی داڑھی نے ان کو جنگل نشینوں کی سی شان عطا کر دی تھی۔ انھوں نے دوسری بوتل، سڑک کے پار پلاسیدا لینیرو کے مکان کی طرف، جہاں کھڑکیوں میں تاریکی تھی، غور سے دیکھتے ہوئے، زیادہ سکون سے بیٹھ کر پی۔ بالکنی پر سب سے بڑی کھڑکی سانتیاگو نصر کی خواب گاہ کی تھی۔ پیدرو ویکاریو نے کلوتیلدے آرمنتا سے پوچھا کہ کیا اس نے اس کھڑکی میں کوئی روشنی دیکھی ہے، اور اس نے نفی میں جواب دیا، مگر یہ سوال اسے غیرمانوس معلوم ہوا۔

"کیا اسے کچھ ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں،" پیدرو ویکاریو نے جواب دیا۔ "بس ہم لوگ اسے قتل کرنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

یہ اتنا بےساختہ جواب تھا کہ اسے یقین نہیں آیا کہ اس نے صحیح سنا ہے، مگر اس نے دیکھا کہ وہ دونوں باورچی خانے کی صافی میں لپٹے دو قصابی چھرے لیے ہوئے تھے۔

"اور کیا کوئی جان سکتا ہے کہ تم لوگ کیوں اسے صبح سویرے قتل کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"اسے معلوم ہے کیوں،" پیدرو ویکاریو نے جواب دیا۔

کلوتیلدے آرمنتا نے سنجیدگی سے ان کا جائزہ لیا، وہ انھیں اتنی اچھی طرح جانتی تھی کہ ایک ایک کو پہچان سکتی تھی، خاص طور پر جب سے پیدرو ویکاریو فوج سے لوٹا تھا۔ "وہ دو بچوں کی طرح لگ رہے تھے،" اس نے مجھے بتایا۔ اور یہ بات اسے لرزا گئی، کیونکہ ہمیشہ سے اس کا خیال تھا بچے ہی سب کچھ کر گزرنے کے اہل ہیں۔ اس لیے اس نے دودھ کے جگ تیار کرنے ختم کیے اور اپنے شوہر کو جگانے چلی گئی تاکہ اسے بتا سکے کہ دکان پر کیا ہو رہا ہے۔ دون روخیلیو دے لا فلور نے نیم بیداری کی حالت میں اس کی بات سنی۔

"بےوقوف مت بنو،" اس نے کلوتیلدے آرمنتا سے کہا۔ "وہ دونوں کسی کو بھی قتل نہیں کرنے والے ہیں، اور کسی دولتمند کو تو بالکل بھی نہیں۔"

جب کلوتیلدے ارمنتا دکان پر لوٹی، وہ دونوں افسر لیاندرو پورنوئے سے، جو میئر کے لیے دودھ لینے آیا تھا، بےتکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ یہ معلوم نہ کر سکی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، مگر جس طرح سے لیاندرو پورنوئے نے جاتے ہوئے چھُروں پر نظر ڈالی، اس کا خیال تھا کہ انھوں نے اسے اپنے ارادے سے کچھ نہ کچھ آگاہ کر دیا تھا۔

کرنل لزارو اپونتے چار سے ذرا پہلے اٹھا تھا۔ وہ ڈاڑھی بنانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ افسر لیاندرو پورنوئے نے اس پر ویکاریو برادران کے عزائم کا انکشاف کیا۔ کرنل لزارو اپونتے نے گزشتہ رات دوستوں کے درمیان اتنے جھگڑوں کا تصفیہ کرایا تھا کہ ایک اور کے تصفیے کے لیے عجلت میں نہیں تھا۔ اس نے آرام سے لباس تبدیل کیا، اور اپنی نکٹائی کئی بار باندھی یہاں تک کہ وہ بالکل درست بندھ گئی، اور بشپ کی پذیرائی کے لیے اپنی گردن کے گرد مریم کی اجتماع کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں والی عبا لٹکائی۔ جب وہ قیمہ بھری پیاز کے حلقوں کے ساتھ بھنی ہوئی کلیجی کا ناشتہ کر رہا تھا، اس کی بیوی نے اس کو بہت ہیجان کے ساتھ بتایا کہ بیاردو سان رومان انجلا ویکاریو کو اس کے گھر واپس کر آیا ہے، مگر اس نے اس بات کو ڈرامائی انداز میں نہیں دیکھا۔

"خدا وندا!" اس نے مسخرےپن سے کہا۔ "بشپ کیا سوچے گا؟"

مگر اس کے باوجود ناشتہ ختم کرنے سے پہلے اسے یاد آ گیا کہ اردلی نے اسے کیا بتایا تھا: اس نے خبر کے دونوں اجزا کو ساتھ ساتھ رکھا، اور فوراً دیکھ لیا کہ وہ چیستان کے دو ٹکڑوں کی طرح جڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ نئی گودی کے ساتھ کی شاہراہ پر چلتا ہوا چوک پر پہنچا جہاں مکانات بشپ کی آمد کے لیے روشن ہونے شروع ہو گئے تھے۔ "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تقریباً پانچ بجے تھے اور بارش شروع ہو گئی تھی،" کرنل لزارو اپونتے نے مجھے بتایا۔ راستے میں تین آدمیوں نے اسے واردات یہ بتانے کے لیے روکا کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، مگر صرف ایک شخص نے اسے بتایا کہ وہ کس جگہ ہیں۔

اس نے انھیں کلوتیلدے ارمنتا کی دکان پر پایا۔ "جب میں نے انھیں دیکھا تو میں نے سوچا کہ وہ شیخی خوروں کے جوڑے کے سوا کچھ نہیں،" اس نے مجھ سے اپنی ذاتی منطق کے تحت کہا۔ "کیوں کہ وہ اتنے مدہوش نہیں تھے جتنا میرا خیال تھا۔" نہ ہی اس نے ان سے ان کے ارادوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس نے انھیں اسی خوش دلی سے برتا جس سے اس نے اپنی بیوی کے شبہے کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

"ذرا سوچو،" اس نے ان سے کہا، "بشپ نے اگر تمھیں اس حالت میں دیکھا تو کیا کہے گا!"

وہ چلے گئے۔ کلوتیلدے ارمنتا نے میئر کی سرسری روش کی وجہ سے ایک اور دل شکستگی سہی کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ حقیقت کے واضح ہونے تک اسے ضرور ان کو حراست میں لے لینا چاہیے تھا۔ کرنل اپونتے نے آخری دلیل کے طور پر چھُرے اس کے سامنے رکھ دیے۔

"اب ان کے پاس کسی کو قتل کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے،" اس نے کہا۔

"یہ وجہ نہیں،" کلوتیلدے ارمنتا نے کہا۔ "یہ ان غریب لڑکوں کو اس مہیب فرض سے آزاد

کرنے کے لیے ضروری ہے جو ان پر عائد ہو گیا ہے۔"

اس نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ویکاریو برادران حکم کو بجا لانے میں اتنے پُرجوش نہیں ہیں جتنا کہ کسی کو تلاش کرنے میں، جو انھیں روک دینے کی ان پر نوازش کر سکے۔ مگر کرنل اپونتے کی روح بےسکون نہیں تھی۔

"کوئی بھی صرف شبہے میں گرفتار نہیں کیا جاتا،" اس نے کہا۔ "مگر اب سانتیاگو نصر کو آگاہ کرنے کا معاملہ ہے، اور نیا سال مبارک۔"

کلوتیلدے ارمنتا ہمیشہ یاد رکھنے والی تھی کہ کرنل اپونتے کی گول مٹول وضع دیکھ کر وہ ایک عجیب سے تاسف میں مبتلا ہو گئی تھی، مگر اس کے برعکس مجھے یاد ہے کہ وہ ایک خوش طبع آدمی تھا، ان تنہائی میں روحانی مشقیں جو اس نے ڈاک کے ذریعے سیکھی تھیں جاری رکھنے کی وجہ سے ذرا کھسکا ہوا تھا۔ اس سوموار کو اس کا طرز عمل اس کی حماقت کا آخری ثبوت تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے سانتیاگو نصر کے بارے میں جب تک اسے گودی پر نہیں دیکھا، دوبارہ سوچا تک نہیں، اور تب اس نے اپنے آپ کو صحیح فیصلہ کرنے پر مبارکباد دی۔

ویکاریو برادران نے دودھ خریدنے کے لیے آنے والی ایک درجن سے زیادہ لوگوں کو اپنا منصوبہ بتایا، اور انھوں نے اسے سب میں چھ بجے سے پہلے پھیلا دیا۔ کلوتیلدے ارمنتا کو ناممکن لگتا تھا کہ سڑک کے پار مکان میں یہ خبر نہ پہنچی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ سانتیاگو نصر وہاں نہیں تھا کیوں کہ اس نے شب خوابی کے کمرے میں روشنی ہوتے نہیں دیکھی تھی اور اس نے جس سے بھی ممکن ہوا درخواست کی کہ وہ اسے دیکھتے ہی انتباہ کر دیں۔ اس نے فادر اماڈور تک کو سرِخدمت نوآموز کے ذریعے، جو راہباؤں کے لیے دودھ لینے آئی تھی، اطلاع بھجوائی۔ چار بجے کے بعد جب اس نے پلاسیدا لینیرو کے باورچی خانے میں روشنی دیکھی، آخری ہنگامی پیغام وکتوریا گزمان کو گداگر عورت کے ذریعے بھیجا جو ہر روز اس سے خدا کے نام پر تھوڑا سا دودھ مانگنے آتی تھی۔ جب بشپ کی کشتی نعرہ زن ہوئی، تقریباً ہر آدمی اس کا استقبال کرنے کے لیے بیدار تھا اور ہم میں سے بہت کم ایسے تھے جو نہ جانتے ہوں کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کا اس کو قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے ہیں، اور اس کے علاوہ ان کے ایسا کرنے کی وجہ بھی آخری جزئیات کے ساتھ مشہور ہو چکی تھی۔

کلوتیلدے ارمنتا نے دودھ تقسیم کرنا ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ ویکاریو برادران اخباروں میں لپٹے ہوئے دوسرے چھُروں کے ساتھ لوٹ آئے۔ ایک زنگ آلود لمبے پھل والا چھرقاش، بارہ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا، جو پیدرو ویکاریو نے جنگ کے زمانے میں جب جرمن چھرے جنگ کی وجہ سے دستیاب نہیں ہو رہے تھے، مشین کاری کی آرے کی دھات سے بنایا تھا۔ دوسرا چھوٹا تھا مگر چوڑا اور خم دار۔ تفتیش کرنے والے نے اپنی مسل میں اس کا خاکہ بنایا تھا، شاید اسے ان کو لفظوں میں بیان کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس نے بس اتنا لکھنے کی جسارت کی تھی کہ یہ چھوٹی سی تلوار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ چھُرا تھا جس سے جرم پایہ تکمیل کو پہنچا۔ دونوں چھرے بھدے اور کثرت سے استعمال شدہ تھے۔

فاؤستینو سانتوس سمجھ نہیں پایا کہ انھیں کیا ہو گیا ہے۔ "وہ اپنے چھُرے دوسری بار تیز

کرتے آئے تھے،" اس نے مجھے بتایا، "اور ایک بار پھر لوگوں کو سنانے کے لیے چیخ رہے تھے کہ وہ سانتیاگو نصر کی انتڑیاں باہر نکالنے جا رہے ہیں، اس لیے میں نے سمجھا کہ وہ چھیڑچھاڑ کر رہے ہیں، خاص طور پر یوں بھی کہ میں نے چھُروں پر توجہ نہیں دی تھی اور فرض کر لیا تھا کہ وہ پہلے والے ہی ہیں۔" اس بار بہرحال کلوتیلدے آرمنتا نے انھیں آتے دیکھ کر محسوس کر لیا کہ ان میں پہلے جیسا عزم نہیں ہے۔

دراصل ان میں پہلا اختلاف ہو چکا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ باطن میں اس سے کہیں زیادہ مختلف تھے جتنے ظاہر میں نظر آتے تھے، بلکہ ہنگامی صورتِ حال میں وہ متضاد ردِعمل کا اظہار کرتے تھے۔ ہم، ان کے دوست، یہ بات گرامر اسکول سے نشان زد کر چکے تھے۔ پابلو ویکاریو اپنے بھائی سے چھ منٹ بڑا تھا اور عنفوانِ شباب تک وہ زیادہ پُرتخیّل اور راسخ ارادوں والا تھا۔ پیدرو ویکاریو مجھے ہمیشہ زیادہ جذباتی اور اسی حوالے سے زیادہ پرتحکّم لگتا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ بیس سال کی عمر میں خود کو فوجی خدمت کے لیے پیش کیا تھا۔ پابلو ویکاریو کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا تاکہ وہ گھر پر رہ کر خاندان کی پرورش کر سکے۔ پیدرو ویکاریو نے گیارہ ماہ گشتی پولیس میں خدمت انجام دی تھی۔ فوجی ضابطگی نے، موت کے خوف سے اور زیادہ شدید ہو کر، اس کی حکم دینے، اور اپنے بھائی کے لیے بھی خود فیصلہ کرنے کی عادات کو پختہ کر دیا تھا۔ وہ سارجنٹس بلنوریاجیا کے مرض کے ساتھ لوٹا جس نے فوجی معالجے کے انتہائی بہیمانہ طریقوں اور ڈاکٹر ڈیونیسیو اگواران کے آرسینک کے انجکشنوں اور تطہیری پرمینگنیٹ کی خوراکوں کا مقابلہ کیا تھا۔ صرف جیل میں اس کا علاج کرنے میں کامیابی ہو سکی۔ ہم، ان کے دوستوں، نے اتفاق کیا کہ پابلو ویکاریو نے اچانک ایک چھوٹے بھائی کی سی تابعداری پیدا کر لی، جب پیدرو ویکاریو عسکری ترنگ، اور ہر اس شخص کے لیے جسے اس کے بائیں پہلو میں گولی کا زخم اور اس کے نیچے بندھی فیتے کو دیکھنے کی خواہش ہو اپنی قمیص اٹھانے کی نئی شعبدہ بازی کے ساتھ واپس آیا۔ پابلو ویکاریو نے اس عظیم شخص کے بلنوریاجیا تک کے لیے، جسے وہ ایک جنگی تمغے کی طرح سجائے پھر رہا تھا، ایک اشتیاق محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

پیدرو ویکاریو کے اعتراف کے مطابق سانتیاگو نصر کے قتل کا فیصلہ اس نے کیا تھا اور شروع میں اس کے بھائی نے صرف اس کی تقلید کی تھی، مگر یہ سوچنے والا بھی وہی تھا کہ میئر کے ان کو غیرمسلح کر دینے کے بعد ان کا فرض پورا ہو گیا ہے، اور اس کے بعد پابلو ویکاریو نے کمان سنبھال لی تھی۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اس اختلاف کا تفتیش کرنے والے سے، اپنے جدا جدا بیانات میں، ذکر نہیں کیا۔ مگر پابلو ویکاریو نے مجھ سے کئی بار تصدیق کی کہ اپنے بھائی کو آخری حل پر آمادہ کرنا اس کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اصل میں یہ دہشت زدگی کی ایک لہر سے زیادہ نہ رہا ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ پابلو ویکاریو باڑے میں دوسرے دو چھروں کو لانے اکیلا گیا۔ جب کہ اس کا بھائی تمر ہند کے درختوں کے نیچے پیشاب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، قطرہ بہ قطرہ، بڑی اذیت میں تھا۔ "میرا بھائی کبھی نہ جان سکا کہ وہ کیسا عذاب تھا،" پیدرو ویکاریو نے مجھ سے اپنی واحد ملاقات میں کہا۔ "ایسا لگتا تھا جیسے پیشاب کی جگہ شیشے کی کرچیاں نکل رہی ہوں۔" پابلو

ویکاریو نے جب وہ چھروں کو لے کر واپس ہوا، اسے درخت سے لپٹے ہوئے پایا۔ "اسے تکلیف سے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے،" اس نے مجھے بتایا، "اور اس نے مجھے تب جانے کو کہا۔ چونکہ وہ کسی کو قتل کرنے کی صورتِ حال میں نہیں تھا۔" وہ ان درختوں کے نیچے ان ترکھانی سٹولوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا جو انھوں نے شادی کی دعوت کے لیے رکھی تھیں، اور اس کی پتلون گھٹنوں تک گری ہوئی تھی۔ "اس نے تقریباً آدھ گھنٹہ اس پٹی کو تبدیل کرنے میں لگایا جس میں اس نے اپنا عضوِتناسل لپیٹا ہوا تھا،" پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ اصل میں اس نے دس منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی، مگر پابلو ویکاریو کے لیے یہ حرکت اس قدر دشوار اور معمہ خیز تھی کہ اس نے اسے اپنے بھائی کی، وقت کو صبح ہونے تک ضائع کرنے کے لیے کسی نئی شعبدہ بازی سے تعبیر کیا۔ اسی لیے اس نے چھرا ہاتھ میں پکڑا اور تقریباً بزور اسے بہن کی کھوئی ہوئی عزت کی تلاش میں کھینچ لے گیا۔

"اس سے گریز کا کوئی راستہ نہیں،" اس نے اس سے کہا۔ "یہ تو اب طے ہو چکا ہے۔"

وہ سؤروں کے باڑے کے دروازے سے ننگے چھرے لیے، صحن میں [illegible] کرتے ہوئے کتوں کے شور کے ساتھ نکلے۔ روشنی ہونے لگی تھی۔ "بارش نہیں ہو رہی تھی،" پابلو ویکاریو کو یاد تھا۔ "ہو رہی تھی،" پیدرو نے یاد کیا۔ "سمندری ہوا چل رہی تھی اور کوئی ستاروں کو اس وقت بھی اپنی انگلیوں سے گن سکتا تھا۔" خبر اس وقت تک اتنی اچھی طرح پھیل چکی تھی کہ اورتنسیا باؤتے نے اپنا دروازہ عین اس وقت کھولا جب وہ اس کے مکان کے سامنے سے گزر رہے تھے، اور وہ سانتیاگو نصر کے لیے رونے والوں میں پہلی تھی۔ "میں سمجھی کہ انھوں نے اسے قتل کر دیا ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ "کیوں کہ میں نے چھروں کو اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں دیکھا اور مجھے یوں لگا کہ ان سے خون ٹپک رہا ہے۔" اس بےصحن شاہراہ پر کھلنے والے چند مکانوں میں سے ایک پابلو ویکاریو کی منگیتر پرودنسیا کوتیس کا تھا۔ جب بھی وہ دونوں وہاں سے گزرتے، خاص طور پر جمعے کے دن بازار جاتے ہوئے، وہ اندر جا کر دن کا پہلا کافی کا پیالہ پیتے تھے۔ وہ دروازے کو دھکا دے کر صحن میں داخل ہوئے اور کتّوں کے محاصرے میں، جنھوں نے صبح کی مدھم روشنی میں انھیں پہچان لیا تھا، پرودنسیا کوتیس کی ماں کو باورچی خانے میں سلام کیا۔ کافی ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔

"بعد میں سہی،" پابلو ویکاریو نے کہا۔ "ابھی ہم جلدی میں ہیں۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں میرے بچّو،" وہ بولی۔ "عزّت انتظار نہیں کرتی۔"

بہرصورت، انھوں نے انتظار کیا، اور اس بار یہ پیدرو ویکاریو تھا جس نے سوچا کہ اس کا بھائی عمداً وقت ضائع کر رہا ہے۔ جب وہ کافی پی رہے تھے، پرودنسیا کوتیس عنفوانِ شباب کی پوری رعنائی میں پرانے اخباروں کا ایک ڈھیر اسٹوو کی آگ کو تیز کرنے کے لیے ساتھ لے کر باورچی میں آئی۔ "مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں،" اس نے مجھے بتایا۔ "اور میں نے نہ صرف اتفاق کیا، بلکہ میں کبھی اس سے شادی نہ کرتی، اگر اس نے وہ نہ کیا ہوتا جو ایک مرد پر لازم تھا۔" باورچی خانے سے جاتے ہوئے پابلو ویکاریو نے اس سے اخباروں کے دو صفحے لیے، اور ان میں سے ایک اپنے بھائی کو چھرے لپیٹنے کے لیے دیا۔ پرودنسیا کوتیس باورچی خانے کے دروازے کے پاس کھڑی، صحن کے دروازے سے باہر چلے جانے تک انھیں دیکھتی

رہی، اور اس نے تیس سال تک، حوصلہ شکنی کے ایک لمحے کے بغیر، انتظار کیا، یہاں تک کہ پابلو ویکاریو جیل سے باہر آیا اور زندگی بھر کے لیے اس کا شوہر بن گیا۔

"اچھا ٹھیک سے خیال رکھنا" اس نے اس سے کہا۔

اس طرح کلوتیلدے آرمنتا کے پاس یہ محسوس کرنے کی معقول وجہ تھی کہ وہ دونوں پہلے جیسے پُرعزم نہیں رہ گئے تھے، اور اس نے انھیں رالنگٹ رم کی ایک بوتل اس امید میں پیش کی کہ وہ ان کو مکمل مدہوش کر دے گی۔ "اس دن" اس نے مجھے بتایا، "مجھے اندازہ ہوا کہ ہم عورتیں دنیا میں کتنی تنہا ہیں۔" پیدرو ویکاریو نے اس سے کہا کہ وہ اپنے شوہر سے ڈاڑھی بنانے کا سامان مانگ لائے، اور وہ اس کے لیے برش، صابن، دیوار آئینہ اور نئے بلیڈ والا سیفٹی ریزر لے آئی، مگر اس نے اپنے قصابی چھرے سے ڈاڑھی بنائی۔ کلوتیلدے آرمنتا نے سوچا کہ یہ جوہرِ مردانگی کی انتہا ہے۔ "وہ کسی فلم کے قاتل کی طرح لگ رہا تھا" اس نے مجھے بتایا۔ مگر جیسا کہ اس نے مجھے بعد میں بتایا اور یہ درست بھی تھا، فوج میں اس نے سیدھے استرے سے ڈاڑھی بنانا سیکھ لیا تھا اور اس کے بعد وہ کسی اور طرح سے ڈاڑھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے بھائی نے، اس کے برعکس زیادہ انکسار کے ساتھ، ڈون روجیلیو دے لا فلور سے مستعار لیے ہوئے سیفٹی ریزر سے ڈاڑھی بنائی۔ آخر میں انھوں نے خاموشی سے سحرزدوں کی سی سادہ لوحی کے ساتھ سڑک کے پار مکان کی تاریک کھڑکی کو تکتے ہوئے بہت دھیرے دھیرے رم کی بوتل ختم کی، جس کے دوران فرضی گاہک، اس دودھ کو خریدنے جو انھیں درکار نہیں تھا اور ان خوردنی اشیا کو طلب کرتے ہوئے جو وہاں موجود نہیں تھیں، دکان میں یہ دیکھنے کی غرض سے آتے رہے کہ آیا یہ صحیح ہے کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

ویکاریو برادران کبھی اس کھڑکی کو روشن نہیں دیکھنے والے تھے۔ سانتیاگو نصر چار بجے گھر آیا، مگر اسے خواب گاہ کے کمرے تک پہنچنے کے لیے کسی بتی کو جلانے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ جابیدار کا بلب تمام رات جلتا رہا تھا۔ اس نے خود کو تاریکی میں کپڑوں سمیت، بستر پر گرا دیا کیونکہ اس کے پاس سونے کے لیے صرف ایک گھنٹا بچا تھا، اور وکٹوریا گزمان نے اسے اسی حالت میں پایا جب وہ اسے بشپ کے استقبال کو جانے کے لیے جگانے گئی۔ ہم ماریا الیخاندرینا سروانتس کے ہاں تین بجے کے بعد تک ساتھ تھے۔ جب اس نے خود موسیقاروں کو رخصت کیا اور رقص کے صحن کی بتیاں بجھائیں تاکہ اس کی عیش آفریں ملاتو لڑکیاں تنہا بستر پر جا سکیں اور تھوڑا سا آرام کر لیں۔ وہ تین دن سے رکے بغیر، پہلے مہمانانِ تقریب کی درپردہ دلگیری، اور پھر ہم میں سے ان کی جو اس وقت تک شادی کی ہنگامہ خیزیوں کے باوجود ناآسودہ تھے، واشگاف دل بستگی میں مصروف تھیں۔ ماریا الیخاندرینا سروانتس، جس کے بارے میں ہم کہا کرتے تھے کہ وہ صرف ایک بار سوئے گی اور یہ مرنے کے لیے ہو گا، ان تمام عورتوں میں جن سے میں اپنی زندگی میں واقف ہوا، سب سے زیادہ خوش ادا اور سب سے زیادہ نرم و نازک عورت تھی، اور بستر میں سب سے زیادہ قابلِ استفادہ، مگر وہ سب سے زیادہ سخت گیر بھی تھی۔ وہ یہیں پلی بڑھی اور یہیں کھلے دروازوں والے ایک مکان میں رہتی تھی جس میں کئی عاریتی کمرے، اور پارامارِیبو کے

چینی بازار سے لائی ہوئی تونبی لالٹینوں سے آراستہ، رقص کا ایک وسیع صحن بھی تھا۔ یہ وہی تھی جس نے میرے ہم عصروں کو کنوارپن سے آزاد کیا۔ اس نے ہمیں اس سے کہیں زیادہ سکھایا، جتنا ہمیں سیکھنا چاہیے تھا، مگر اس نے ہمیں سب سے بڑھ کر یہ سکھا دیا کہ زندگی میں خالی بستر سے زیادہ اداس کوئی جگہ نہیں۔ سانتیاگو نصر اسے پہلی بار دیکھتے ہی حواس کھو بیٹھا۔ میں نے اسے خبردار کیا۔ "وہ شاہین جو کسی مبارزطلب کونج کا تعاقب کرے اسے صرف ایک اندوہناک زندگی کی امید رکھنی چاہیے۔" مگر، ماریا الیخاندرینا سروانتس کی پُرفریب پیش رفت سے مسحور ہو کر، اس نے میری نہیں سنی تھی۔ وہ اس کا جنون تھی، پندرہ سال کی عمر میں اس کے آنسوؤں کی معشوق تھی، یہاں تک کہ ابراہیم نصر نے اسے ایک چابک کی مدد سے بستر سے باہر نکالا اور ایک سال سے زیادہ کے لیے ڈیوائن فیس میں بند کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان میں، محبت کے اختلال کے بغیر ایک مضبوط ربط تھا، اور وہ اس کا اتنا پاس رکھتی تھی کہ اس کی موجودگی میں کسی اور کے ساتھ کبھی بستر پر نہیں گئی۔ ان آخری تعطیلات میں وہ تھکن کا بہانہ کر کے ہمیں جلدی بھگا دیا کرتی، مگر دالان کو روشن، اور دروازے کو آگل چڑھائے بغیر چھوڑ دیتی تاکہ میں چھپ کر آ سکوں۔

سانتیاگو نصر میں بھیس بدلنے کا ایک سحرانگیز جوہر تھا، اور اس کا دل پسند مشغلہ ملاتو لڑکیوں کی شناخت تبدیل کر دینا تھا۔ وہ ایک کی کپڑوں کی الماری کو اجاڑ کر دوسری کا بھیس بدل دیتا، اور وہ تمام خود کو اپنے آپ سے مختلف، اور ان کی طرح جو وہ نہیں تھیں محسوس کرنے لگتیں۔ ایک خاص موقعے پر ان میں سے ایک لڑکی نے خود کو ایک اور میں سے مکمل طور پر دوہرایا ہوا پایا کہ اس پر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ "مجھے لگا کہ میں آئینے سے نکل کر آ گئی ہوں،" اس نے کہا۔ مگر اس رات ماریا الیخاندرینا سروانتس نے سانتیاگو نصر کو آخری بار بھیس تبدیل کرنے والے کی حیثیت سے شعبدہ بازی میں مشغول ہونے نہیں دیا، اور یہ اس نے اتنے فاش بہانے سے کیا کہ اس کی یاد کی چھوڑی ہوئی تلخی نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ اس لیے ہم نے سیریناڈوں کا گشت کرنے کے لیے موسیقاروں کو اپنے ساتھ لیا اور تقریب کو اپنے طور پر جاری رکھا جب کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ خیال اسی کو آیا تھا کہ زیوس کی پہاڑی پر جا کر نوعروسوں کے لیے گیت گایا جائے۔

نہ صرف ہم نے کھڑکی کے نیچے گیت گایا بلکہ باغوں میں آتش بازیاں بھی چھوڑیں، اس کے باوجود ہمیں فارم ہاؤس میں زندگی کی کوئی علامت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ ہمارے تصور میں بھی نہیں آیا کہ وہاں کوئی نہیں ہو گا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ کھلی ہوئی چھت والی، اور جشن کے لیے ساٹن کے ربن اور موم اور اورنج بلاسم کے گلدستوں سے آراستہ نئی کار اس وقت دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ میرے بھائی لوئس اینریک نے، جو اس وقت ایک پیشہ ور کی طرح گٹار بجاتا تھا، نوعروسوں کے اعزاز میں فی البدیہہ ایک دومعنی نغمہ بنایا۔ اس وقت تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس، چاند آسمان پر بلند تھا، اور ہوا شفاف تھی، اور پہاڑی کے قدموں میں قبرستان سے آتی ہوئی ولِ ہمو کی آگ کی جھلملاہٹ دیکھی جا سکتی تھی۔ دوسری جانب چاندنی میں کیلے کے نیلگوں باغات، نمی آلود دلدلیں اور کریبین کے

سے پاش افق کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ سانتیاگو نصر نے سمندر میں ایک جلتی بجھتی روشنی کی طرف اشارہ کیا اور ہمیں بتایا کہ وہ ایک غلام بردار جہاز کی اذیت میں گرفتار روح ہے جو سینیگال سے سیاہ فاموں کی بار کے ساتھ کارتاخینا دے اندیاس کی مرکزی بندرگاہ کے دہانے کے بالمقابل غرق ہو گیا تھا۔ یہ سوچنا ناممکن تھا کہ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا ہو گا، ہرچند کہ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ انجلا ویکاریو کی یک روزہ عروسانہ زندگی دو گھنٹے پہلے ہی اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ بیاردو سان رومان اسے اس کے والدین کے ہاں پیدل لے گیا تھا تاکہ موٹر کی آواز اس کی بدقسمتی کو قبل از وقت افشا نہ کر دے، اور وہ وہاں سے ریوس کے پرمسرت فارم ہاوس کی تاریکی تک تنہا واپس آیا تھا۔

جب ہم پہاڑی سے اترے تو میرے بھائی نے ہمیں بازار میں ایک دکان پر تلی ہوئی مچھلیوں کا ناشتہ کرنے کی دعوت دی، مگر سانتیاگو نصر نے اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ بشپ کی آمد سے پہلے ایک گھنٹہ کی نیند لینا چاہتا تھا۔ وہ کرستو بیدویا کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے، پرانی بندرگاہ کے پاس ناداروں کی طعام گاہوں سے گزرتا ہوا گیا جن کی اب روشنی ہونے لگی تھی، اور کونے پر مڑنے سے پہلے اس نے ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔ یہ آخری موقع تھا کہ ہم نے اسے دیکھا۔

کرستو بیدویا نے، جس سے اس نے بعد میں گودی پر ملنے کا وعدہ کیا تھا، اس سے اس کے گھر کے عقبی دروازے پر اجازت لی۔ کتے حسب معمول اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اس پر بھونکے، مگر اس نے انہیں نیم روشنی میں اپنی چابیوں کی جھنکار سے چپ کرا دیا۔ وکتوریا گزمان کافی کی کیتلی پر نظر رکھے ہوئے تھی جب وہ باورچی خانے کے پاس سے گزرا۔
"سانتیاگو نصر" اس نے اسے پکارا۔ "کافی تیار ہونے والی ہے۔"

سانتیاگو نصر نے اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر بعد کافی پیے گا، اور اسے ہدایت کی کہ وہ دیوینا فلور کو کہے کہ پانچ بجے اٹھانے کو کہہ دے اور اس کے لیے صاف لباس بھجوا دے، بالکل ویسا ہی جیسا وہ پہنے ہوئے تھا۔ ایک لمحے بعد، جب وہ بستر پر جا چکا تھا، وکتوریا گزمان نے کلوتیلدے ارمنتا کا بھیجا ہوا پیغام دودھ مانگنے والی عورت کے ذریعے وصول کیا۔ پانچ بج کر تیس پر اس نے اسے جگا دینے کے حکم پر عمل کیا، مگر اس نے دیوینا فلور کو نہیں بھیجا اور شب خوابی کے کمرے میں اصلی لنن کے کپڑے لے کر خود گئی کیونکہ وہ اپنی لڑکی کو نوابزادے کے چنگل سے دور رکھنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتی تھی۔

ماریا الیخاندرینا سروانتس نے اپنے گھر کا دروازہ آکل چڑھائے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنے بھائی سے رخصت لی، برآمدے کو لانگھا، جس میں ملاتو لڑکیاں گل لالہ کے درمیان مست مست کر سو رہی تھیں، اور شب خوابی کے کمرے کا دروازہ دستک دیے بغیر کھولا۔ بتیاں بجھ چکی تھیں مگر جیسے ہی میں داخل ہوا مجھے ایک گرم عورت کی خوشبو محسوس ہوئی اور تاریکی میں ایک بے خواب چیتے کی آنکھیں نظر آئیں، اور پھر میں نے اپنے بارے میں گھنٹوں کا شور شروع ہونے سے پہلے کچھ نہیں جانا۔

گھر جاتے ہوئے میرا بھائی کلوتیلدے ارمنتا کی دکان پر سگریٹ لینے رکا۔ وہ اتنی پی چکا تھا کہ اس کی یادداشت اس ملاقات کے بارے میں ہمیشہ بہت پراگندہ رہی، مگر وہ اس قاتل

شراب کو فراموش نہیں کر سکا جو پیدرو ویکاریو نے اسے پیش کی۔ "وہ پگھلی ہوئی آگ تھی،" اس نے مجھے بتایا۔ پابلو ویکاریو، جو سو چکا تھا، اس کے آنے کی آواز سن کر جاگ اٹھا، اور اسے چھرا دکھایا۔

"ہم سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں،" اس نے اسے بتایا۔

میرے بھائی کو یہ بات یاد نہیں۔ "اگر مجھے یاد بھی ہوتا، میں کبھی اس پر اعتبار نہ کرتا،" اس نے مجھ سے کئی بار کہا۔ "کون حرامزادہ کبھی سوچے گا کہ وہ دونوں کسی کو قتل کر دیں گے، اور وہ بھی سؤروں کے چھرے سے۔" پھر انہوں نے اس سے پوچھا کہ سانتیاگو نصر کہاں ہے، کیونکہ انہوں نے ان دونوں کو ساتھ دیکھا تھا، اور میرے بھائی کو اپنا جواب بھی یاد نہیں۔ مگر کلوتیلدے ارمنتا اور ویکاریو برادران اسے سن کر اتنے بدحواس ہوئے تھے کہ مسل میں اسے دو الگ الگ بیانوں میں برقرار رکھا گیا۔ بقول ان کے میرے بھائی نے کہا تھا، "سانتیاگو نصر مر چکا ہے۔" پھر اس نے انہیں ایک کلیسائی دعا دی، چوکھٹ سے ٹکرایا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ چوک کے درمیان اس نے فادر امادور کو دیکھ کر صلیب کا نشان بنایا۔ وہ اپنی جبہ میں ملبوس، گھنٹیاں بجاتے ہوئے ملتمست، اور بشپ کے میدانی وعظ کے لیے محراب اٹھائے ہوئے کئی مددگاروں کے آگے آگے، گودی کی طرف جا رہا تھا۔ ویکاریو برادران نے بھی انہیں گزرتا دیکھ کر صلیب کے نشانات بنائے۔

کلوتیلدے ارمنتا نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اپنی آخری امیدیں ہار دیں جب فادر امادور اس کی دکان کے پاس سے گزرا۔ "میں نے سمجھا کہ اسے میرا پیغام نہیں ملا،" اس نے کہا۔ اس کے باوجود فادر امادور نے برسوں بعد، کالافل کے اداس آرام گھر میں دنیا سے کنارہ کشی کے زمانے میں، مجھ سے اعتراف کیا کہ درحقیقت اسے کلوتیلدے ارمنتا کا پیغام اور دوسروں کے زیادہ قطعی پیغامات، جب وہ گودی پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، مل گئے تھے۔ "سچ بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیے،" اس نے مجھے بتایا۔ "میرا پہلا خیال یہ تھا کہ یہ میرا نہیں بلکہ شہری حکام کا مسئلہ ہے، مگر پھر میں نے ارادہ کیا کہ گزرتے ہوئے پلاسیدا لینیرو کو بتاتا جاؤں۔" اس کے باوجود جب اس نے چوک کو پار کیا وہ بالکل بھول چکا تھا۔ "تمہیں سمجھنا پڑے گا،" اس نے مجھے بتایا، "کہ اس بدقسمت دن بشپ آ رہا تھا۔" جرم کے لمحے میں اسے اتنی ناامیدی محسوس ہوئی، اور وہ اپنے آپ سے اتنا متنفر ہوا کہ واحد چیز جو وہ سوچ سکا، آگ لگنے کی اطلاع دینے والی گھنٹی کا بجانا تھا۔

میرا بھائی لوئس اینریک باورچی خانے کے دروازے سے گھر میں داخل ہوا، جو میری ماں نے کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ میرا باپ ہمیں اندر آتے ہوئے نہ سن سکے۔ وہ بستر پر جانے سے پہلے غسل خانے میں گیا مگر ٹوائلٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا، اور جب میرا بھائی خائمے اسکول جانے کے لیے اٹھا، اس نے اس کو فرش پر منہ کے بل پڑے نیند میں گانا گاتے ہوئے پایا۔ میری راہبہ بہن، جو بشپ کا انتظار نہیں کر رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے جذب کے لیے اس کی محتاج نہیں تھی، اسے جاگنے پر آمادہ نہیں کر سکی۔ "پانچ بج رہے تھے جب میں غسل خانے میں گئی،" اس نے مجھے بتایا۔ بعد میں جب میری بہن مارگوت گودی پر جانے سے پہلے، نہانے کے لیے غسل خانے میں گئی، بڑی جدوجہد کے بعد اسے شب خوابی کے کمرے میں گھسیٹ لائی

میں کامیاب ہو سکی۔ نیند کی دوسری جانب سے اس نے بشپ کی کشتی کے اولیں شور کو جاگے بغیر سنا۔ مےگساری سے چُور وہ پھر گہری نیند میں چلا گیا، یہاں تک کہ میری راہبہ بہن شب خوابی کے کمرے میں آئی اور بھاگتے ہوئے اپنا کلیسائی لباس پہننے کی کوششوں کے دوران اسے اپنی پاکر چیخ سے جگا دیا۔

"انھوں نے سانتیاگو نصر کو قتل کر دیا ہے۔"

لاش کو چاقوؤں سے مجروح کرنا پس مرگ معائنے کی محض ابتدا تھی جسے انجام دینے پر فادر امادور نے ڈاکٹر دیونیسیو اگواران کی عدم موجودگی میں خود کو مجبور پایا۔ "یہ ایسا تھا کہ گویا ہم نے اس کے مر جانے کے بعد اسے ازسرِنو قتل کیا،" عمررسیدہ فادر امادور نے مجھے کالافل میں اپنی کنارہ کشی کے زمانے میں بتایا۔ "مگر یہ حکم میئر کے پاس سے آیا تھا اور اس وحشی کے حکم چاہے کیسے ہی احمقانہ کیوں [illegible] پورے طور پر درست نہیں تھا۔ اس بےسروپا سوموار کو کرنل اپونتے نے صوبے کے گورنر سے ٹیلیگراف پر ایک ہنگامی گفتگو کی تھی اور موخرالذکر نے اسے تفتیشی مجسٹریٹ کی آمد تک ابتدائی اقدامات کی اجازت دے دی تھی۔ میئر قانونی امور سے بےبہرہ ایک سابق فوجی کمانڈر تھا جس کے غرور نے اسے اجازت نہیں دی کہ وہ کسی سے پوچھ لیتا کہ اسے کہاں سے آغاز کرنا چاہیے۔

پہلا خیال جو اسے آیا وہ پس مرگ معائنے کا تھا۔ کرستو بیدویا نے، جو میڈیکل کا طالب علم تھا، سانتیاگو نصر سے اپنی قریبی دوستی کی وجہ سے، کسی نہ کسی طرح اس میں ملوث نہ ہونے کا بندوبست کر لیا۔ میئر کا خیال تھا کہ ڈاکٹر دیونیسیو اگواران کی واپسی تک لاش کو ریفریجریشن میں رکھا جاتا، مگر اسے قد دم فریزر نہیں مل سکا، اور بازار میں واحد فریزر جس سے کام چل سکتا، خراب پڑا تھا۔ لاش لوہے کی ایک تنگ چارپائی پر عوامی دیدار کے لیے رہنے کے کمرے کے وسط میں رکھی گئی تھی۔ [illegible] کے دوران اس کے لیے ایک رئیسانہ تابوت بنایا جا رہا تھا۔ وہ شب خوابی کے کمروں، اور چند پڑوسیوں کے کمروں سے

پنکھے لے آئے تھے، مگر اتنے لوگ اسے دیکھنے کو بیتاب تھے کہ ہمیں فرنیچر کو پیچھے کھسکانا، اور چڑیوں کے پنجروں اور فرن کے گملوں کو بیچھے لے جانا پڑا۔ مگر اس کے بعد بھی وہاں گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کے علاوہ، موت کی بُو سے بھڑک اٹھے ہوئے کتوں نے وحشت کو اور بڑھا دیا تھا۔ انھوں نے اس وقت سے واویلا کرنا بند نہیں کیا تھا جب میں اس گھر میں داخل ہوا تھا؛ اس لمحے تک سانتیاگو نصر باورچی خانے میں جاں‌کنی کی حالت میں پڑا تھا، اور میں نے دیوینا فلور کو وحشی چیخوں کے ساتھ روتے اور انھیں ایک ڈنڈے سے پرے ہٹاتے دیکھا۔

"میری مدد کرو،" اس نے چلا کر مجھ سے کہا۔ "یہ اس کی انتڑیاں کھانا چاہتے ہیں۔"

ہم نے انھیں اصطبل میں بند کر دیا۔ پلاسیدا لینیرو نے بعد میں حکم دیا کہ تدفین ہو جانے تک انھیں کسی بہت دور جگہ پر لے جایا جائے۔ مگر دوپہر کے قریب کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح وہ وہاں سے نکل آئے اور پاگل ہوتے ہوئے گھر میں گھس آئے۔ پلاسیدا لینیرو صرف یک بار ہی گرفت کھو بیٹھی۔

"یہ غلیظ کتّے!" وہ چیخی۔ "انھیں جان سے مار دو۔"

حکم پر فوری عمل درآمد کیا گیا، اور گھر پھر خاموش ہو گیا۔ اس وقت تک کسی کو لاش کی حالت کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ چہرہ صحیح سالم تھا، انھیں تاثرات کے ساتھ جو اس پر گانا گاتے وقت تھے، اور کرسٹو بیدویا نے انتڑیوں کو واپس اندر ڈال دیا تھا اور لاش کو لنن کی چادر سے لپیٹ دیا تھا۔ اس کے باوجود، سہ پہر میں زخموں سے شیرے کی رنگ کا سیّال بہنا شروع ہو گیا جس پر مکھیاں جمع ہو رہی تھیں، اور ایک اُودا دھبّا اوپری ہونٹ پر ابھر آیا اور بہت آہستہ سے، پانی پر بادل کے سائے کی طرح اس کی پیشانی تک پھیل گیا۔ اس کے چہرے نے، جو ہمیشہ سے دوستانہ تھا، ایک معاندانہ تاثر اختیار کر لیا، اور اس کی ماں نے اسے ایک رومال سے ڈھانک دیا۔ کرنل آپونتے نے سمجھ لیا کہ مزید تاخیر نہیں کی جا سکتی، اور اس نے فادر امادور کو عملِ جراحی کا حکم دیا۔ "ایک ہفتے بعد قبر کھود کر نکالنا اور بھی بدتر ہو گا،" اس نے کہا۔ فادر امادور نے سالامانکا میں میڈیسن اور سرجری پڑھی تھی، مگر فارغ التحصیل ہونے سے پہلے وہ پادریوں کی درس گاہ میں داخل ہو گیا تھا، میئر کو علم تھا کہ اس کے کیے ہوئے معائنے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ اس کے باوجود اس نے یہی حکم پر عمل کروایا۔

یہ پبلک اسکول میں، ایک دواساز جس نے تفصیلات درج کیں، اور تعطیلات پر آئے ہوئے میڈیکل کے ایک طالب علم کی مدد سے انجام دی گئی ایک خوں‌ریزی تھی۔ جراحی کے صرف چند معمولی آلات دستیاب تھے، باقی اوزار بڑھئی کے ہاں سے آئے۔ مگر لاش پر برپا کی ہوئی تباہی سے قطع نظر، فادر امادور کی رپورٹ درست معلوم ہوتی تھی، اور تفتیش کرنے والے نے اسے مسل میں ایک کارآمد دستاویز کے طور پر شامل کیا۔

متعدد زخموں میں سے سات مہلک تھے۔ سامنے کی دو شگافوں کی وجہ سے جگر تقریباً ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اس کا پیٹ چار جگہوں پر چاک ہو تھا، اور ان میں سے ایک وار اتنا گہرا تھا کہ اس نے معدے کے آرپار نکل کر لبلبے کو تباہ کر دیا تھا۔ چھ کم تر شگاف

بڑی آنت کے زیریں حصے کے چوڑے رخ پر، اور کئی چھوٹی آنت پر تھے۔ صرف ایک وار، جو پشت کے تیسرے مُہرے کی سطح پر تھا، اس کے دائیں گردے کو چھید دیا تھا۔ شکمی جُوف خون کے بڑے لوتھڑوں سے بھر گیا تھا، اور معدے کے ملغوبے کے درمیان مریم کرمیں کا یک تمغہ نکلا جو سانتیاگو نصر نے چار سال کی عمر میں نگل لیا تھا۔ صدری جُوف میں دو شگاف ظاہر ہوئے؛ ایک دائیں پہلو کے درمیانی حصے میں، جس نے پھیپھڑوں کو زخمی کیا، اور دوسرا بائیں بغل کے بالکل ساتھ۔ اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر بھی چھ کم تر زخم تھے، اور دو افقی شگاف تھے؛ ایک دائیں ران پر اور دوسرا معدے کے عضلات میں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک گہرا زخم تھا۔ رپورٹ میں درج ہے؛ "لاش مسیح مصلوب کے زخموں کا ایک نقش نظر آ رہی تھی۔" مغز کا وزن ایک اوسط انگریز کے مغز سے ساٹھ گرام زیادہ نکلا اور فادر امادور نے رپورٹ میں درج کیا کہ وہ اعلا ذہانت اور شاندار مستقبل رکھتا تھا۔ پھر بھی، آخری حاشیہ میں اس نے جگر کے معمول سے زیادہ بڑے ہونے کی طرف اشارہ کیا جس کا اس نے یرقان کے ناقص علاج کو مورد ٹھہرایا۔ "کہنا یہ چاہیے،" اس نے مجھے بتایا، "کہ اس کے پاس، ہر حال میں، زندگی کے چند ہی سال رہ گئے تھے۔" ڈاکٹر ڈیونیسیو اِگواران نے، جس نے درحقیقت سانتیاگو نصر کے یرقان کا بارہ سال کی عمر میں علاج کیا تھا، اس معائنے کو برہمی سے یاد کیا۔ "صرف ایک راہب ہی اتنا احمق ہو سکتا ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ "ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اسے سمجھایا جا سکے کہ ہم منطقۂ حارہ کے باشندے ان خام گلیشیائی اسپانویوں سے بڑے جگر رکھتے ہیں۔" رپورٹ اس نتیجے پر پہنچی کہ موت کا سبب خون کا کثیر اخراج تھا جو سات بڑے زخموں میں سے کسی ایک کی وجہ سے عمل میں آیا۔

انھوں نے ہمیں ایک بالکل مختلف لاش لوٹائی۔ کاسۂ سر کا آدھا حصہ سوراخ کرنے سے ضائع ہو چکا تھا، اور عورتوں کو بہ آسانی اپنا شیفتہ بنا لینے والا چہرہ، جسے موت تک نے محفوظ رکھا تھا، اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔ مزید یہ کہ فادر امادور نے کٹی ہوئی انتڑیوں کو جڑ سے کھینچ لیا تھا، مگر آخر میں اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کا کیا کرے، سو اس نے ان کے لیے مغفرت کی دعا کی اور انھیں کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیا۔ پبلک اسکول کی کھڑکیوں سے لگے آخری تماشائیوں نے اپنی دلچسپی کھو دی، مددگار بےہوش ہو گیا، اور کرنل آپونتے جس نے بہت سے ظالمانہ قتلِ عام دیکھے اور کیے تھے، ایک نباتات خور اور ارواح پرست ثابت ہوا۔ چیتھڑوں اور اَن بُجھے چونے سے بھرا، اور بےدردی کے ساتھ موٹی ڈوری اور سوئی سے سیا ہوا خالی پوست بکھر جانے کی نوبت پر تھا جب ہم نے اسے ریشمی لحاف کی تہوں والے نئے تابوت میں لٹایا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ اس طرح زیادہ دیر تک محفوظ رہے گا،" فادر امادور نے مجھے بتایا۔ اس کے بالکل برخلاف ہوا، اور ہمیں صبح کو اسے عجلت میں دفن کرنا پڑا کیونکہ لاش اتنی بُری حالت میں تھی کہ گھر میں اسے رکھنا ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

ایک ابرآلود منگل کا دن طلوع ہو رہا تھا۔ میں اس افسردہ ساعت کے خاتمے پر سونے کی جرأت نہیں رکھتا تھا، اور میں نے جا کر ماریا الیخاندرینا سروانتس کے دروازے کو دھکا دیا مبادا اس نے اگل نہ چڑھائی ہو۔ روشنی تو بی لالٹینیں درختوں سے آویزاں تھیں اور رقص کے صحن میں کئی الاؤ جل رہے تھے جن پر رکھے بھاپ اگلتے برتنوں کے پاس ملاتو لڑکیاں اپنے

مرسیدت کے لباسوں پر سوگ کے رنگ لگ رہی تھیں۔ میں نے ماریا الیخاندرینا سروانتس کو علی الصباح بیدار پایا، اور مکمل برہنہ، جیسی کہ وہ ہمیشہ جب کوئی اجنبی موجود نہ ہوتا، رہا کرتی تھی۔ وہ ترکی حور کی طرح اپنے پرشکوہ بستر پر ایک بابلی خوان کے سامنے اکڑوں بیٹھی تھی جس میں بچھڑے کے گوشت کے کباب، ابلی ہوئی مرغی، سؤر کے پٹھے اور کیلوں اور سبزیوں کا ایک ڈھیر تھا جو پانچ افراد کے لیے کافی ہوتا۔ غیرمتناسب خوراک ہمیشہ سے اس کے ماتم کرنے کا واحد طریقہ تھا اور میں نے کبھی اس کو یہ فعل اتنے سخت رنج کے ساتھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں خاموشی سے اور خود اپنے طور پر ماتم کرتے ہوئے اس کے پہلو میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔ میں سانتیاگو نصر کی تقدیر کی سفاکی پر غور کر رہا تھا، جس نے خوشیوں کے بیس سال کی عوض نہ صرف اس کی زندگی بلکہ اس کے اعضا کا جدا ہونا، بکھر جانا اور مکمل تباہ ہونا بھی طلب کیا۔ میں نے خواب میں ایک عورت کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا جو اپنے بازوؤں میں ایک بچی کو لیے ہوئے تھی اور وہ بچی سانس لیے کو رکے بغیر منہ چلا رہی تھی اور مکئی کے آدھے چبے دانے عورت کی بریزیئر میں گر رہے تھے۔ عورت بچی کے منہ چلانے کے انداز کی کسی پرندے سے مماثلت کے بارے میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ چانک میں نے بےقرار انگلیوں کو محسوس کیا جو میری قمیص کے بٹن کھول رہی تھیں اور میں نے محبت کے درندے کی خطرناک بو اپنے پہلو میں محسوس کی اور خود کو اس کی نعمت کی گرداب کی لذت میں ڈوبتا پایا۔ مگر فوراً وہ رک گئی، پھر اس کی سانسوں کی آواز دور سے آئی اور وہ میری زندگی سے نکل گئی۔

"مجھ سے نہیں ہو گا" اس نے کہا۔ "تم میں سے اُس کی سی بو آتی ہے۔"

صرف میں ہی نہیں۔ اس دن ہر شے سانتیاگو نصر کی طرح مہکتی رہی۔ ویکاریو برادران نے اس کو جیل کی کوٹھری میں محسوس کیا جہاں میئر نے انھیں اس وقت تک کے لیے جب وہ ان کی بابت کوئی فیصلہ کر سکیں، مقفل کر رکھا تھا۔ "جب بھی میں نے صابن اور تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا، اس بو سے نجات نہیں پا سکا۔" پیدرو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ وہ تین راتیں سوئے بغیر گزار چکے تھے مگر نہیں لیٹ سکتے تھے کیونکہ وہ سوتے ہی اپنے خواب میں جرم کا پھر سے ارتکاب کرنا شروع کر دیتے۔ اب، جب کہ وہ بڑھاپے میں ہے، یہی دیکھی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے پابلو ویکاریو نے مجھے کسی کوشش کے بغیر بتایا: "یہ دوہرا بیداری کی طرح تھا۔" اس فقرے نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا کہ جیل میں جو چیز ان کے لیے سب سے زیادہ ناقابل برداشت رہی ہو گی وہ ان کی ہوشمندی کی شدت تھی۔

کمرہ دس فیٹ مربع تھا اور اس میں لوہے کی سلاخوں والا ایک بہت اونچا روشندان پیشاب کا ایک برتن، ایک منجی مع پانی کے بیسن اور ایک جگ کے، اور پتوں کے گدوں کے دو عارضی بستر تھے۔ کرنل اپونتے کا، جس کے احکامات کے تحت یہ کمرہ تعمیر کیا گیا تھا، کہنا تھا کہ کوئی ہوٹل اس سے زیادہ موزوں نہیں تھا۔ میرے بھائی لوئس انریک نے اتفاق کیا، کیونکہ ایک رات انھوں نے موسیقاروں کے درمیان جھگڑے کے بعد اسے وہاں بند کیا تھا اور میئر نے انسانی ہمدردی کے تحت اسے ملانو لڑکیوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دی تھی۔ ویکاریو برادران بھی صبح آٹھ بجے شاید یہی سوچ سکتے تھے جب انھوں نے

خود کو عربوں کی زد سے محفوظ محسوس کیا۔ اس لمحے وہ اپنے فرض کو بجا لانے کے اعزاز سے آسودہ خاطر تھے، اور ایک ہی چیز جو انھیں تنگ کر رہی تھی وہ بُو کا جم نہ ہونا تھا۔ انھوں نے ڈھیر سارا پانی، کپڑے دھونے کا صابن اور تولیے طلب کیے، اور اپنے بازوؤں اور چہرے سے خون کو دھویا۔ انھوں نے اپنی قمیصیں بھی دھوئیں، مگر وہ سکون نہ پا سکے۔

پیدرو ویکاریو نے اپنی قبض کشا اور پیشاب آور دوائیں منگوائیں، اور جراثیم سے پاک پٹیاں بھی طلب کیں تاکہ وہ انھیں تبدیل کر سکے، اور وہ صبح کے عرصے میں دو مرتبہ پیشاب خارج کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے باوجود دن چڑھتے چڑھتے، زندگی اس کے لیے اتنی دشوار ہو گئی کہ بو کی اہمیت ثانوی رہ گئی۔ دوپہر کے دو بجے جب گرمی کی شدت انھیں پگھلا چکی ہوتی، پیدرو ویکاریو سے بستر پر پڑا رہنا ناممکن ہو گیا مگر اس کی تھکن اسے کھڑا ہونے سے روکے رہی۔ اس کے پھوڑے کا درد اس کے حلق تک پہنچ گیا، اس کا پیشاب رک گیا تھا اور وہ اس دہشت انگیز یقین کے ساتھ عذاب کھینچ رہا تھا کہ وہ اب زندگی بھر نہیں سو سکے گا۔ "میں گیارہ مہینوں تک جاگتا رہا۔" اس نے مجھے بتایا، اور میں، اس سے اچھی طرح مانوس ہونے کے سبب، جانتا تھا کہ یہ سچ ہے۔ وہ دن کا کھانا نہیں کھا سکا۔ جہاں تک پابلو ویکاریو کا تعلق ہے، اس نے ہر چیز کو جو وہ اس کے لیے لائے تھے، تھوڑی بہت چکھا، اور پندرہ منٹ کے بعد ایک طاعونی اسہال میں مبتلا ہو گیا۔ شام کو چھ بجے، جب سانتیاگو نصر کی لاش کا معائنہ کیا جا رہا تھا، میئر کو ہنگامی طور پر طلب کیا گیا کیونکہ پیدرو ویکاریو کو یقین تھا کہ اس کے بھائی کو زہر دیا گیا ہے۔ "وہ میرے سامنے پانی میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔" پیدرو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ "اور ہم اس خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے کہ یہ ترکوں کی کوئی شیطنت ہے۔" اس تک وہ برتن کو دو مرتبہ لبالب بھر چکا تھا اور نگرانی پر موجود پہرےدار اس کو ٹاؤن ہال کے پاخانے میں چھ مرتبہ لے جا چکا تھا۔ وہاں میئر دروازے کے سنتری پر کرنل اپونتے نے سب پہرےداروں میں گھرے، اور اتنی تیزی سے سیال خارج کرتے دیکھا کہ زہر کے متعلق سوچنا بالکل بےمعنی بھی نہیں رہ گیا۔ مگر اس خیال کو فوراً ہی ترک کر دیا گیا، جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انھوں نے صرف پانی پیا تھا اور وہی کچھ کھایا تھا جو پورا ویکاریو نے انھیں بھجوایا۔ اس کے باوجود میئر اتنا فکرمند ہوا کہ وہ قیدی کو خصوصی پہرےدار [illegible] [illegible] کے [illegible] و [illegible] ریوہاچا کی مدور جیل میں منتقل کیے جانے تک وہیں رہے۔

جڑواں بھائیوں کا خوف باہر کی صورت حال کے پیش نظر تھا۔ عربوں کے انتقام کا خطرہ دور نہیں ہوا تھا، مگر کسی نے بھی سوائے ویکاریو برادران کے زہر کے بارے میں نہیں سوچا۔ بلکہ خیال یہ تھا کہ وہ روشن دان سے پٹرول چھڑکنے کے لیے رات ہونے کا انتظار کریں گے، اور قیدیوں کو ان کی کوٹھری میں زندہ جلا دیں گے۔ مگر یہ بھی آسان مفروضہ تھا۔ عرب ایک پُرامن جماعت تھے جو صدی کے آغاز میں کیریبین کے شہروں اور قصبوں [illegible] انتہائی غریب اور دورافتادہ مقامات تک پہنچے، اور وہیں آباد ہو گئے اور رنگین کپڑے اور سستے زیور بیچنے لگے۔ وہ قبائلی، سخت کوش اور کیتھولک تھے۔ وہ آپس میں شادیاں کرتے، اپنی گندم درآمد کرتے، اپنے صحنوں میں بھیڑیں پالتے، اوریگانو اور بینگن اگاتے اور تاش کھیلتے

ہی ان کا سرگرم مشغلہ تھا۔ متقدمین نے دیہاتی عربی بولنا جاری رکھا تھا جو وہ اپنے وطن سے ساتھ لائے تھے اور اسے دوسری نسل تک تغیّر سے محفوظ رکھے ہوئے تھے، مگر تیسری نسل، سانتیاگو نصر کی استثنیٰ کے ساتھ، اپنے والدین کی بات عربی میں سنتی اور ہسپانوی میں جواب دیتی تھی۔ اس لیے یہ ناقابلِ یقین تھا کہ ایک ایسی موت کے انتقام کے لیے جس کا الزام ہم سب پر عائد کیا جا سکتا تھا، وہ اپنی راہبانہ خُو تبدیل کر دیتے۔ دوسری طرف، کسی نے بھی پلاسیدا لینیرو کے خاندان کی جانب سے انتقامی کارروائی کے متعلق نہیں سوچا، جو اپنی دولتمندی کے خاتمے تک طاقتور اور جنگجو لوگ رہے تھے، اور ان میں دو سے زیادہ، میخانے کے قاتل پیدا ہوئے تھے، جنہیں، ان کے نام کے نمک سے، محفوظ رکھا گیا تھا۔

کرنل اپونٹے نے افواہوں سے پریشان ہو کر، عربوں کی آبادی کا دورہ کیا اور اس وقت ان پر، حرفِ آخر صحیح نتیجہ اخذ کیا۔ اس نے انہیں اپنی محرابوں پر ماتمی نشانات کے درمیان حیران اور سوگوار پایا، اور ان میں سے چند زمین پر بیٹھے بین کر رہے تھے، مگر کسی نے بھی منتقم کے خیال کو دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ اس صبح ان کا ردِعمل جرم کی شدت سے پیدا ہوا تھا، اور ان کے سرکردہ لوگوں نے اعتراف کیا کہ کسی بھی صورت میں وہ ردوکوب سے تجاوز نہ کرتے۔ مزید برآں، یہ سیفیے کی صدسالہ سردار، سوزانہ ابدالہ ہی تھی جس نے گل سنجت کا حیرت انگیز جوشاندہ اور عرق افسنتین تجویز کیا، جس سے پابلو ویکاریو کا اسہال بند اور اس کے بھائی کا گلگوں پیشاب جاری ہو گیا۔ پیدرو ویکاریو اس کے بعد ایک بےخواب غنودگی میں چلا گیا اور اس کے شفایافتہ بھائی کو پہلی بار کسی پشیمانی کے بغیر نیند آئی۔ اسی حالت میں پوریسیما ویکاریو نے انہیں منگل کی صبح کو تین بجے دیکھا، جب میئر انہیں الوداع کہنے کے لیے اس کو وہاں لایا۔

کرنل اپونٹے کی پہل پر تمام خاندان، یہاں تک کہ بڑی بہنیں بھی اپنے شوہروں سمیت واپس چلی گئیں۔ وہ لوگوں کی بھنک کے زیرِحفاظت نظر میں آئے بغیر وہاں سے رخصت ہوئے، [illegible] سانتیاگو نصر کو دفن کر رہے تھے۔

میئر کے فیصلے کے مطابق، وہ اس وقت تک کے لیے رخصت ہو رہے تھے جب تک کہ معاملہ ٹھنڈا نہ پڑ جاتا، مگر وہ پھر کبھی نہیں لوٹے۔ پورا ویکاریو نے ردکردہ بیٹی کا چہرہ ایک کپڑے سے چھپا دیا تھا کہ کوئی حرشوں کو نہ دیکھ سکے، اور اس نے اس کو شوخ سرخ رنگ میں ملبوس کیا تھا تاکہ کوئی یہ نہ سوچ سکے کہ وہ اپنے عاشق کے ماتم میں بھی واپسی سے پہلے اس نے فادر امادور سے درخواست کی کہ وہ اس کے بیٹوں سے جیل میں گناہوں کا اعتراف سنے، مگر پابلو ویکاریو نے انکار کر دیا اور اپنے بھائی کو قائل کر لیا کہ ان کے پاس متعمل ہونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انہیں تنہا رکھا گیا اور اپنی ریوہاچا منتقلی کے دن تک وہ اتنے بحال ہو چکے تھے، اور اپنے حق پر ہونے میں اتنے پُراعتماد تھے، کہ انہوں نے رات کو لے جانا جانا پسند نہیں کیا جیسا کہ خاندان والوں کے ساتھ کیا گیا تھا، بلکہ وہ دن کی پوری روشنی میں، اور اپنے چہروں کی باقاعدہ نمائش کرتے ہوئے گئے۔ پونسیو ویکاریو، ان کا باپ، تھوڑے عرصے کے بعد مر گیا۔ "اس کا صدمہ اسے لے گیا،" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ جب ویکاریو

برادران بری ہوئے، وہ ماناورے سے، جہاں خاندان رہ رہا تھا، ایک دن کی مسافت پر، ریوہاچا میں ٹھہرے۔ پروداسیا کوئیسس نے وہیں جا کر پابلو ویکاریو سے شادی کی، جس نے اپنے باپ کی دکان پر قیمتی دھاتوں کا کام سیکھ رکھا تھا اور ایک ہنرمند سنار ثابت ہوا۔ محبت اور روزگار سے محروم، پیدرو ویکاریو نے تین سال بعد دوبارہ فوج میں شمولیت اختیار کر لی، فرسٹ سارجنٹ کا عہدہ حاصل کیا اور ایک خوشگوار صبح اس کا گشتی دستہ قحبہ خانوں کے ترانے گاتا ہوا گریلا علاقے میں پہنچ کر مفقودالخبر ہو گیا۔

لوگوں کی بڑی اکثریت کے نزدیک ستم رسیدہ صرف ایک تھا: بیاردو سان رومان۔ یہ بات مصدّقہ طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ المیے کے دوسرے اہم کردار اپنا حصہ باوقار طور پر بلکہ ایک عظمت کے ساتھ ادا کر رہے تھے۔ سانتیاگو نصر تہمت کی حدود سے نکل چکا تھا، ویکاریو برادران مرد کی حیثیت سے اپنا مرتبہ منوا چکے تھے، اور گم راہ بہن کی عزت بحال ہو چکی تھی۔ صرف بیاردو سان رومان ایک تھا جس نے سب کچھ گنوا دیا تھا: "غریب بیاردو" جیسے کہ وہ ان برسوں میں یاد کیا جاتا تھا۔ پھر بھی، کسی کو اس کا خیال دوسرے سنیچر کو چاند گہن کے بعد تک نہیں آیا، جب رنڈوے زیوس نے میئر کو بتایا کہ اس نے ایک روشن پرندے کو اپنے فارم کے اوپر پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کے خیال میں وہ اس کی بیوی کی روح ہے، جو اپنی ملکیت کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میئر نے اپنا ماتھا پیٹا، مگر اس کا زیوس کے واہمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"لعنت ہو!" وہ زور سے بولا "میں اس غریب کو بھول ہی گیا تھا۔"

وہ ایک گشتی دستے کے ساتھ پہاڑی پر گیا اور گاڑی کو کھلی چھت کے ساتھ فارم ہاؤس کے سامنے پایا، اور اس نے شب خوابی کے کمرے میں ایک روشنی دیکھی، مگر کسی نے اس کی دستکوں کا جواب نہیں دیا، اس لیے وہ ایک بغلی دروازے کو توڑ کر اندر داخل ہوا اور کمروں کی تلاشی لی، جو چاندگہن میں نیم روشن تھے۔ "چیزیں پانی میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھیں" میئر نے مجھے بتایا۔ بیاردو سان رومان بستر پر بےہوش پڑا تھا، اسی طرح جیسے کہ پورا ویکاریو نے اسے منگل کی صبح کو دیکھا تھا، پرتکلف پتلون اور ریشمیں قمیص میں ملبوس مگر اس نے اپنے جوتے اتار رکھے تھے۔ فرش پر خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں اور بہت سی سربمہر بوتلیں بستر کے قریب تھیں، مگر وہاں کھانے کی کسی چیز کا کوئی نشان نہیں تھا۔

"وہ ایتھلک نشے کی آخری منزلوں میں تھا،" مجھے ڈاکٹر ڈیونیسیو اگواران نے معلوم ہوا جس نے اسے ہنگامی امداد دی تھی۔ مگر وہ چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو گیا، اور جیسے ہی اس کا ذہن صاف ہوا اس نے، جتنی شائستگی اس سے ممکن ہوئی استعمال کرتے ہوئے، انہیں گھر سے نکال باہر کیا۔

"کوئی میری فکر نہ کرے،" اس نے کہا۔ "میرے باپ تک کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اس کی شان میں ایک فحش فقرہ کہا۔

میئر نے جنرل پیتروینو سان رومان کو واقعے کی اطلاع آخری فقرے سمیت ایک پُرشور ٹیلیگرام کے ذریعے پہنچائی۔ جنرل سان رومان نے ضرور اپنے بیٹے کی خواہش پر حرف بہ حرف عمل کیا ہو گا، کیونکہ وہ اس کے پاس نہیں آیا، بلکہ اس نے اپنی بیوی کو لڑکیوں اور دو

عمر رسیدہ خوشی کے ساتھ روانہ کیا جو اس کی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ وہ بیاردو سان رومان کی بدقسمتی پر گردنوں تک ماتمی لباس میں ملبوس، اور غم میں اپنے بال بکھرائے ہوئے ایک مال بردار کشتی میں آئیں۔ زمین پر قدم رکھنے سے پہلے انھوں نے اپنے جوتے اتارے اور سڑک پر دوپہر کی جلتی ہوئی دھول میں ننگے پاؤں اپنے بالوں کی لٹیں کھینچتی اور اتنی بلند چیخوں کے ساتھ بین کرتی پہاڑی کے آخری سرے تک گئیں کہ وہ خوشی کے عالم میں مسرور ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے ماگدالینا اولیور کی بالکنی سے انھیں گزرتے ہوئے دیکھا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے سوچا تھا کہ اس طرح کا ماتم صرف دوسری زیادہ اہم شرمساریوں کو چھپانے کے لیے ہی کیا جا سکتا ہے۔

کرنل لزارو اپونتے ان کے ساتھ فارم ہاؤس تک گیا، اور پھر سورج ڈوبنے سے پہلے، ڈاکٹر دیونیسیو اِگوران اپنے خچر پر جو اس نے ہنگامی حالات کے لیے رکھا ہوا تھا، وہاں پہنچے۔ حکومت کی دونوں سماعتیں گزرنے تک ایک کمبل میں لپٹے ہوئے بیاردو سان رومان کو اٹھا کر دو رکھوالوں کے جلو میں، ایک ڈنڈے سے لٹکے ہوئے جھولے پر نیچے لائے۔ ماگدالینا اولیور سمجھی کہ وہ مر چکا ہے۔

"خدا کی پناہ!" وہ بول اٹھی، "کیسی مصیبت ہے۔"

اس نے الکحل سے خود کو دوبارہ جاں بہ لب کر لیا تھا، مگر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی زندہ آدمی کو لے جا رہے ہیں، کیوں کہ اس کا داہنا بازو زمین پر گھسٹ رہا تھا، اور جب اس کی ماں اسے جھولے میں ڈال دیتی وہ پھر باہر نکل آتا، اس لیے اس کے ہاتھ سے پہاڑی کے دامن سے لے کر کشتی کے عرشے تک زمین پر ایک لکیر بنتی چلی گئی۔ ہمارے لیے اس کی طرف سے یہی باقی بچی: ایک ستم رسیدہ کی یاد۔

انھوں نے فارم ہاؤس کو اسی حالت میں چھوڑ دیا۔ میرا بھائی اور میں جب تعطیلات میں گھر آتے، آوارہ گردی کی راتوں میں اسے دریافت کرنے جایا کرتے اور ہر بار ہم نے متروک کمروں میں قیمتی اشیا کی تعداد پچھلی بار سے کم پائی۔ ایک موقعے پر ہمیں وہ چھوٹا سوٹ کیس نظر آیا جو انجیلا ویکاریو نے اپنی ماں کے ہاں سے شادی کی رات کو منگوایا تھا، مگر ہم نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ہم نے اس کے اندر جو کچھ پایا وہ ایک عورت کے حفظِ حسن و صحت کی عام اشیا معلوم ہوئیں، اور مجھ پر ان کا اصل استعمال صرف اس وقت کھلا جب انجیلا ویکاریو نے بہت برسوں کے بعد مجھے بتایا کہ کون سی زنانہ شعبدہ بازیاں اسے اپنے شوہر کو فریب دینے کے لیے سکھائی گئی تھیں۔ یہ واحد یادگار تھی جو اس نے اس گھر میں چھوڑی جو پانچ گھنٹوں تک شادی شدہ عورت کی حیثیت سے اس کا گھر تھا۔

برسوں بعد جب میں ان وقائع کے لیے شہادتوں کی آخری جزئیات تلاش کرنے آیا، یولاندا زیوس کی مسرتوں کی خاک تک باقی نہیں بچی تھی۔ کرنل لزارو اپونتے کے مقررکردہ پہرے کے باوجود چیزیں تھوڑی تھوڑی کر کے غائب ہو رہی تھیں، حتیٰ کہ چھ آئینوں والی تمام قد الماری بھی، جو مومپوکس کے ماہر دستکار کو مکان کے اندر کھڑی کرنی پڑی تھی کیوں کہ وہ دروازے سے نہیں گزر سکتی تھی۔ شروع شروع میں رنڈوا زیوس یہ سوچتے ہوئے بہت خوش تھا کہ اس کی بیوی، پس از مرگ، اپنی چیزوں کو لے جانے کے لیے واپس آیا کرتی ہے۔ کرنل

اپونتے نے اس کا مذاق اڑایا، مگر ایک رات اسے اس راز کو معلوم کرنے کے لیے ارواح کی محفل کا خیال آیا اور یولاندا زیوس کی روح نے اپنی تحریر میں تصدیق کی کہ وہی اپنی مسرتوں کی معمولی اشیا کو اپنے خانۂ مرگ میں لے جا رہی ہے۔ مکان ڈھنے شروع ہو گیا۔ شادی کی گاڑی دروازے پر پڑے پڑے گل گئی اور آخر میں صرف اس کا بوسیدہ ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ کئی برسوں تک اس کے مالک کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی۔ مسل میں اس کا ایک بیان ہے مگر وہ اتنا مختصر اور عامیانہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آخری لمحے میں کسی ناگزیر ضرورت کے تحت درج کیا گیا تھا۔ ایک ہی بار جب میں نے اس سے، تیئس سال بعد، بات کرنے کی کوشش کی وہ مجھ سے ایک خاص جارحانہ انداز میں پیش آیا اور انتہائی غیراہم حقائق کو بیان کرنے سے بھی انکار کیا جو ڈرامے میں اس کی شرکت کی تھوڑی سی بھی وضاحت کر سکتے۔ بہرصورت اس کا خاندان بھی اس کے بارے میں، جو ہمیں علم تھا اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا، اور ان کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کے سوا جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہیں تھا، وہ ایک غلط افتادہ قصبے میں کیوں پہنچا تھا۔

انجیلا ویکاریو کے متعلق اس کے برعکس مجھے وقفے وقفے سے خبریں ملتی رہی تھیں جن سے میرے ذہن میں اس کی ایک مثالی تصویر بن گئی تھی۔ میری راہبہ بہن بالائی گواہیرا میں آخری بت پرستوں کو مشرف بہ کلیسا کرنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کی عادت تھی کہ وہ کریبیئن نمک سے پختہ قریے میں، جہاں اس کی ماں اسے زندہ دفن کرنے کو لے گئی تھی، اس کے پاس رکتی اور اس سے باتیں کرتی۔ "تمھاری عم زاد تمھیں سلام کہتی ہے۔" وہ مجھے ہمیشہ لکھا کرتی۔ میری بہن مارگوت نے بھی، جو ابتدائی برسوں میں اس سے ملنے جاتی رہی تھی، مجھے بتایا کہ انھوں نے ایک ہوادار صحن والا مضبوط مکان خرید لیا تھا، جس میں صرف ایک نقص تھا کہ مد کامل کی راتوں کو غسل خانے ابل پڑتے اور مچھلیاں صبح کو شب خوابی کے کمروں میں شپ شپ کرتی نظر آتیں۔ جس کسی نے بھی اسے ان دنوں دیکھا تھا متفق تھا کہ وہ ان دنوں کشیدہ کاری کی مشین پر ہر وقت مشاقانہ جھکی رہتی تھی، اور اسی مصروفیت کی وجہ سے اس نے واقعات کو فراموش کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

بہت بعد کے ایک غیریقینی زمانے میں، جب میں اپنے آپ کو تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے گواہیرا کے قصبوں میں انسائیکلوپیڈیا اور طب کی کتابیں بیچتا پھر رہا تھا اتفاقاً بت پرستوں کے اس قریۂ مرگ میں جا نکلا۔ اس مکان کی کھڑکی پر جس کا رخ سمندر کی طرف تھا، دن کی سب سے زیادہ تپتی ہوئی ساعت میں، اسٹیل رِم کی عینک اور زردی مائل سفید بالوں والی ایک عورت نصف ماتمی لباس میں کشیدہ کاری کی مشین پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے اوپر ایک زرد بلبل کا پنجرہ تھا جو مسلسل چہکتی رہی۔ جب میں نے اسے کھڑکی کے سادہ چوکھٹے میں سے اس طرح دیکھا تو یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ وہی عورت ہے جس کا تصور میرے پاس تھا، کیوں کہ میں خود کو اس اعتراف پر آمادہ نہیں کر سکا کہ زندگی حرب ادب کے اتنی مماثل ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر ڈرامے کے بیس سال بعد، یہ وہی تھی: انجیلا ویکاریو۔

اس نے مجھ سے ہمیشہ کی طرح ایک دور کی عم زاد کا سلوک کیا، اور میرے سوالوں کے

جواب عقل سلیم اور ایک حس مزاح کے ساتھ دیے۔ وہ اتنی بالغ نظر اور بذلہ سنج ہو گئی تھی کہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ وہی ہستی تھی۔ جس بات پر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی، وہ یہ کہ وہ انداز تھا جس میں وہ اپنی زندگی کے مفہوم تک پہنچی تھی۔ چند منٹوں کے بعد وہ مجھے اتنی بوڑھی نہیں لگی جتنی کہ پہلی نظر میں معلوم ہوئی تھی، بلکہ وہ تقریباً اتنی ہی جوان نظر آئی جتنی وہ میری یادداشت میں تھی، اور وہ اس شخص سے جو اس سے بیس سال کی عمر میں محبت کے بغیر شادی کرنے پر مجبور ہوا تھا، کوئی قدر مشترک نہیں رکھتی تھی۔ اس کی ماں نے، اپنے پُرشکایت بڑھاپے میں، مجھے ایک مشکل بدروح سمجھا۔ اس نے ماضی کے متعلق بات کرنے سے انکار کر دیا اور ان وقائع کے لیے مجھے اپنی ماں کے ساتھ اس کی گفتگو اور اپنی یادداشت سے کھنگالے ہوئے اس کے چند غیرمربوط فقروں پر اکتفا کرنا پڑا۔ وہ اس سے آگے جا چکی تھی جو انجلا ویکاریو کو جیتے جی مار ڈالنے کے لیے ممکن تھا، مگر بیٹی نے خود اس کی منصوبہ بندیوں کو صفر پر پہنچا دیا تھا کیوں کہ اس نے کبھی اپنی بدقسمتی سے کوئی پراسرار ہیئت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس، اس نے اسے، تمام تفصیلات سمیت، ہر اس شخص سے بیان کیا جو اسے سننے کا طالب ہوا، سوائے ایک رمز کے، جو کبھی نہیں کھل سکی، کہ اس کی تباہی کا اصل باعث کون، کیسے اور کیوں تھا۔ اس لیے کہ کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا کہ وہ سچ مچ سانتیاگو نصر ہی رہا ہو گا۔ وہ دونوں بالکل مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے کبھی انھیں ایک ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ پُرغرور سانتیاگو نصر اس پر کبھی توجہ نہ دیتا۔ "تمھاری بیوقوف عم زاد،" وہ مجھ سے کہا کرتا جب اسے اس کا تذکرہ کرنا ہوتا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم اس وقت کہا کرتے تھے، وہ چڑیوں کو اچک لینے والا شکرا تھا۔ وہ، اپنے باپ کی طرح کسی خودسر دوشیزہ کو زیر کرنے کی کوشش میں اکیلا پھرا کرتا جو ان جنگلوں میں نظر آنا شروع کر رہی ہوتی، مگر قصبے میں اس کا اور کوئی معلوم تعلق نہیں تھا سوائے فلورا میگل سے رسمی ملاقاتوں، اور ماریا الیخاندرینا سروانتس سے ہنگامہ خیز عشق کے جس نے اسے چودہ مہینوں تک پاگل کر رکھا تھا۔ زیادہ مشہور روایت، شاید اس لیے کہ اسی میں زیادہ کجروی تھی، یہ تھی کہ انجلا ویکاریو نے کسی اور کو جو وقتاً اس سے محبت کرتا تھا، بچانا چاہا تھا اور اس نے سانتیاگو نصر کے نام کا اس لیے انتخاب کیا کہ اس کا خیال تھا کہ اس کے بھائی اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ میں نے یہ حقیقت اس سے خود معلوم کرنے کی کوشش کی، جب میں اپنے تمام دلائل سے مسلح، اس کے پاس دوسری بار گیا، مگر اس نے ان کو شکست دینے کے لیے اپنی نظریں کشیدہ کاری سے بمشکل ہی ہٹائی ہوں گی۔ "اتنا تردد مت کرو،" اس نے مجھ سے کہا۔ "وہ وہی تھا۔"

اس کے علاوہ ہر بات کو، حتیٰ کہ اپنی شادی کی رات کی ابتلا کو بھی، اس نے بغیر کسی احتیاط کے بیان کر دیا۔ اس نے یاد کیا کہ کس طرح اس کی دوستوں نے اسے ہدایت دی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو بستر میں اتنی شراب پلائے کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھے، اس سے زیادہ شرم کا مظاہرہ کرے جتنی درحقیقت اس کو آ رہی ہو تاکہ وہ کمرے کی روشنی بجھا دے، دوشیزگی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے پھٹکری کے پانی کی ایک کارگر ڈوش لے، اور چادر پر

مرکیوروکروم سے دھبے ڈال دے تاکہ اسے دوسرے دن عروسی صحن میں نمائش کے لیے رکھ سکے۔ اس کی مشیروں نے دو باتوں پر انحصار نہیں کیا تھا: بایاردو سان رومان کی شراب کے اثر کی غیرمعمولی مدافعت اور انجلا ویکاریو کی اعلا شائستگی جو وہ اپنی ماں کی عائدکردہ غیرجذباتیت میں مستور رکھتی تھی۔ "میں نے وہ سب نہیں کیا جو انھوں نے بتایا تھا،" اس نے کہا، "کیوں کہ میں نے جس قدر سوچا، مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک پست حرکت ہے جو کسی کے ساتھ نہیں کی جانی چاہیے، اور وہ بھی اس بدبخت آدمی کے ساتھ جو مجھ سے شادی کر رہا تھا۔" اس لیے اس نے خود کو شب خوابی کے روشن کمرے میں بطور آشکار کپڑوں سے آزاد ہونے دیا، ان تمام کتابی خطروں سے بالاتر ہو کر جنھوں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ "یہ بہت آسان تھا،" اس نے مجھ سے کہا، "کیوں کہ میں نے مرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔"

سچ یہ ہے کہ اس نے اپنی بدقسمتی کا تذکرہ کسی شرم کے بغیر کیا، تاکہ وہ دوسری بدقسمتی کی پردہ پوشی کر سکے جو اسے ختم کیے دے رہی تھی۔ کسی کو اس کا شبہ تک نہ ہوا ہوتا، اگر اس نے مجھے یہ بتانے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ بایاردو سان رومان اس کی زندگی میں اس لمحے سے ہمیشہ کے لیے داخل ہو گیا تھا جب وہ اسے گھر واپس چھوڑ گیا۔ یہ فیصلہ کن وار تھا۔ "جب ماما نے مجھے مارنا شروع کیا، وہ مجھے اچانک یاد آنے لگا۔" اس نے مجھے بتایا۔ اسے مار سے کم تکلیف ہوئی کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے نام پر تھی۔ اس نے اس کے متعلق اس وقت ایک خاص حیرت کے ساتھ سوچنا شروع کیا جب وہ سسکیاں بھرتی ہوئی کھانے کے کمرے میں کوچ پر پڑی تھی۔ "میں مار کی کسی اور وجہ سے نہیں رو رہی تھی۔" اس نے اس کے متعلق سوچنا جاری رکھا جب اس کی ماں آرنیکا کی ٹھنڈی پٹیاں اس کے چہرے پر رکھ رہی تھی، اور اس سے بھی زیادہ اس وقت جب اس نے سڑک پر شور سنا اور آگ لگنے کی اطلاع دینے والی گھنٹیاں بجنے لگیں، اور اس کی ماں اس کو یہ بتانے آئی کہ اب وہ سو سکتی ہے کیوں کہ بدترین بات پیش آ چکی ہے۔

وہ اس کے بارے میں بہت طویل عرصے تک، بغیر کسی خوش فہمی کے، سوچتی رہی تھی جب اس کو اپنی ماں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے معائنے کے لیے ریوہاچا کے ہسپتال میں جانا پڑا۔ وہ راستے میں ہوٹل دل پوئرتو پر رکیں، جس کا مالک انھیں جانتا تھا، اور پورا ویکاریو نے بار پر جا کر پانی کا ایک گلاس طلب کیا۔ وہ اپنی بیٹی کی طرف پشت کیے پانی پی رہی تھی جب موخرالذکر نے اپنے تصور کو ان آئینوں میں منعکس پایا جو کمرے میں خود کو دوہرا رہے تھے۔ انجلا ویکاریو نے اپنا سر ایک آہ کے ساتھ پھیرا اور اسے ہوٹل سے باہر جاتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے دل زیر و زبر کے ساتھ اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پورا ویکاریو نے پانی پینا ختم کیا، اپنے ہونٹوں کو اپنی آستین پر صاف کیا اور بار کی جانب سے اپنی نئی عینک سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔ انجلا ویکاریو نے اپنی پیدائش کے بعد سے پہلی مرتبہ اس مسکراہٹ میں اپنی ماں کو اس طرح دیکھا جیسی وہ درحقیقت تھی: اپنے عیوب کی پرستش میں گرفتار ایک غریب عورت۔ "لعنت ہو،" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے گھر کو واپسی کا سارا سفر بلند آواز میں گاتے ہوئے طے کیا اور پھر خود کو بستر پر تین دن تک رونے دھونے کے لیے گرا دیا۔

وہ پھر سے زندہ ہو گئی تھی۔ "میں اس کے لیے دیوانی ہو رہی تھی" اس نے مجھے بتایا، "بالکل پاگل۔" اسے اس کو دیکھنے کے لیے صرف اپنی آنکھیں بند کرنی پڑتی تھیں؛ وہ اس کو سمندر میں سانس لیتا سنتی، بستر میں اس کے بدن کی شعلہ اسے آدھی رات کو جگا دیتا۔ ہفتے کے ختم ہونے تک، ایک لمحہ آرام پائے بغیر، اس نے اسے پہلا خط لکھا۔ یہ ایک رسمی مراسلہ تھا، جس میں اس نے بتایا کہ اس نے اسے ہوٹل سے باہر آتے دیکھا تھا اور یہ کہ وہ خوش ہوتی اگر وہ بھی اسے دیکھ پاتا۔ اس نے جواب کا ناکام انتظار کیا۔ دو مہینوں کے بعد، انتظار سے تھک کر، اس نے پہلے کی طرح ایک اور خط اسی مبہم اسلوب میں بھیجا، جس کا واحد مقصد اسے شائستگی کے فقدان پر سرزنش کرنا تھا۔ چھ مہینوں میں وہ جواب پائے بغیر چھ خطوط لکھ چکی تھی، مگر اس نے اس امر سے اپنے آپ کو تسلی دی کہ وہ انہیں موصول کر رہا ہے۔

پہلی بار اپنی قسمت کی خود مالک، انجیلا ویکاریو نے پھر جانا کہ محبت اور نفرت دوطرفہ جذبے ہیں۔ جتنے زیادہ خطوط اس نے بھیجے اتنا ہی اس کے اضطراب میں اضافہ ہوا، مگر اس میں اپنی ماں کے خلاف مسرت آمیز کینے کی آگ بھی اتنی ہی تیز ہوتی گئی۔ "مجھے اس کو دیکھتے ہی ابکائی آ جاتی،" اس نے مجھے بتایا، "لیکن میں اپنی ماں کو دیکھ کر اُس شخص کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔" اس کی زندگی ایک ردکردہ بیوی کی حیثیت سے جاری تھی جیسے ایک بوڑھی خادمہ کی سیدھی سادی زندگی ہوتی ہے؛ وہ مشین پر اپنی دوستوں کے ساتھ کشیدہ کاری میں مصروف رہتی، بالکل پہلے کی طرح جب وہ کپڑوں کے گلدستے اور کاغذی پرندے بنایا کرتی تھی، مگر جب اس کی ماں سونے چلی جاتی وہ صبح تک کے لیے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی، ان خطوط کو لکھنے کے لیے جن کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ دوبارہ باہوش ہو گئی، اپنے ذاتی ارادے کی مالک، اور صرف اُس کے لیے پھر سے ایک دوشیزہ بن گئی، اور اس نے اپنے سوا کسی اور کی حاکمیت اور نہ کوئی محکومی بجز اپنے جنون کی غلامی کے قبول کی۔

اس نے ہفتہ وار خط آدھی زندگی تک لکھے۔ "کبھی کبھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھا جائے،" ہنسی سے مرے جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا، "مگر میرے لیے یہی بہت تھا کہ وہ انہیں پا رہا ہے۔" شروع میں وہ ایک منگیتر کے رقعے تھے، پھر وہ ایک خفیہ معشوقہ کے مختصر پیغامات، شوخ محبوبہ کے خوشبودار کارڈ، کاروباری کاغذات، عشقیہ دستاویزات ہوتے گئے اور آخر میں ایک ترک کردہ بیوی کے تلخ خطوط ہو گئے، جن میں وہ اسے واپس آنے پر آمادہ کرنے کے لیے سفاک بیماریاں ایجاد کیا کرتی۔ ایک رات ایک اچھی کیفیت میں اس نے لکھے ہوئے خطوط پر دوات گرا دی اور اسے پھاڑنے کے بجائے اس نے ایک پس نوشت کا اضافہ کیا: "اپنی محبت کے ثبوت میں میں تمہیں اپنے آنسو بھیج رہی ہوں۔" کسی کسی موقع پر رونے سے تنگ آ کر وہ اپنی دیوانگی کا مذاق اڑاتی۔ چھ مرتبہ ڈاک خانے کی نگراں عورتیں تبدیل ہوئیں، اور چھ مرتبہ وہ ان کی اعانت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ صرف ایک بات جو اسے نہیں سوجھی، وہ خطوط نگاری کا ترک کرنا تھا۔ اس کے باوجود اس کے جنون کا اُس شخص پر کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان خطوط کا مخاطب کوئی تھا ہی نہیں۔

دسویں سال، ایک طوفانی حبز صبح، وہ جلد اٹھ گئی، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس کے بستر میں برہنہ موجود ہے۔ پھر اس نے اسے ایک بےقرار خط لکھا، بیس صفحات پر مشتمل جس میں اس نے وہ تلخ حقائق جو وہ اپنے دل میں اس زبوں‌بخت رات سے لیے پھر رہی تھی بےحجابانہ بیان کر ڈالے۔ اس نے اس کو ان ابدی نشانات، جو اس نے اس کے بدن پر چھوڑے تھے، اس کی زبان کے نمک، اس کے افریقی عضو کی آتشیں یاد کے بارے میں لکھا۔ جمعے کو اس نے اسے ڈاک خانے کی نگراں کو دیا جو سہ پہر کو اس کے ساتھ کشیدہ کاری کرنے اور خط لینے آتی، اور وہ پریقین تھی کہ یہ آخری مداوا اس کے عذاب کا خاتمہ ہو گا، مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کے بعد سے اسے ہوش نہیں تھا کہ اس نے کیا لکھا، اور نہ یہ کہ وہ درحقیقت کسے لکھ رہی تھی، مگر اس نے تعطل کے بغیر سترہ سال تک خط لکھنا جاری رکھا۔

اگست کی ایک سہ پہر، جب وہ اپنی دوستوں کے ساتھ کشیدہ کاری میں مشغول تھی، اس نے دروازے پر کسی کی آہٹ سنی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہاں کون ہے، اسے نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ "وہ فربہ اندام ہو چکا تھا، اس کے بال گرنے شروع ہو گئے تھے اور اسے چیزوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت پڑ چکی تھی،" اس نے مجھے بتایا، "مگر یہ وہی تھا۔" وہ خوفزدہ تھی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ بھی اسے اتنا ہی مختلف پا رہا ہوگا جتنا کہ وہ اسے نظر آ رہا تھا، اور اس کے خیال میں اسے اس سے اتنی محبت نہیں رہی ہو گی کہ وہ اس تغیر کی تاب لا سکے۔ اس کی قمیص پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور وہ وہی بیلٹ باندھے تھا اور وہی چاندی جڑی بغیر بخیوں کی چمڑے کی خورجیں لیے ہوئے تھا۔ دوسری متحیر کشیدہ کاروں سے بےنیاز، بیاردو سان رومان نے قدم آگے بڑھایا اور اپنی خورجینیں سلائی کی مشین پر رکھ دیں۔

"یہ میں ہوں،" اس نے کہا۔

وہ رہنے کے لیے کپڑوں کا ایک سوٹ کیس ساتھ لایا تھا، اور دوسرا بالکل پہلے والے کی طرح دو ہزار خطوط سے بھرا جو اس نے اسے لکھے تھے۔ وہ دنوں کی ترتیب سے رنگین ربن سے بندھے ہوئے تھے، اور انہیں کبھی نہیں کھولا گیا تھا۔

برسوں تک ہم کسی اور واقعے کے بارے میں بات ہی نہ کر سکے۔ ہمارے روزوشب نے، جو بہت سی یک رُخی عادتوں سے مغلوب تھے اچانک ایک واحد مشترک خلش کے محور پر گھومنا شروع کر دیا تھا۔ طلوعِ سحر ہمیں بہت سے اتفاقیہ واقعات کی زنجیر کو، جنھوں نے ایک امرِمحال کو ممکن بنایا تھا، ایک ترتیب دینے کی کوشش کرتے دیکھا کرتی۔ یہ واضح تھا کہ ہم ہمیشہ اسرار کو دریافت کرنے کی طلب میں نہیں لگ رہے تھے بلکہ اس لیے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس مقام اور مامورِیت کے درست علم کے بغیر، جس کی جستجو تقدیر کی طرف سے ہمارے حوالے ہوئی تھی، اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

کچھ لوگ کبھی نہیں جان سکے۔ کرسٹو بیدویا جو ایک مشہور سرجن بنا، کبھی خود کو یہ سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ کیوں وہ اس ترغیب کا شکار ہو گیا کہ بشپ کے آنے تک دو گھنٹے اپنے دادا کے ہاں گزارے، بجائے اس کے کہ آرام کرتے اپنے والدین کے گھر جاتا جو صبح ہی سے اطلاع دینے کے لیے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر ان میں سے بہت سوں نے، جو جرم کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتے تھے اور اس کے باوجود انھوں نے کچھ نہیں کیا، اپنے آپ کو اس عذر سے تسلی دی کہ عزت کے معاملات اجارۂ خداوندی ہیں اور ان میں صرف ان کا دخل ممکن ہے جو ڈرامے کا حصہ ہوں۔ "عزت ہی محبت ہے۔" میں نے اپنی ماں کو کہتے سنا۔ اورتنسیا باؤتے، جس کی شمولیت صرف دو خون آلود چھُروں کو دیکھنے کی حد تک تھی جو اس وقت تک درحقیقت خون

آلود بھی نہیں تھے اپنے واہمے سے اس حد تک متاثر ہوئی کہ وہ ایک ندامت آمیز ہیجان میں مبتلا ہو گئی اور ایک دن مزید برداشت کرنے کی اہل نہ رہ جانے پر، سڑک پر ننگی نکل آئی۔ فلورا میگل، سانتیاگو نصر کی منگیتر، عداوت کے مارے سرحدی گشت کے ایک لفٹیننٹ کے ساتھ بھاگ گئی جس نے اس سے ویچادا کے ربر مزدوروں کے درمیان جسم فروشی کروائی۔ آورا ویلروس، وہ دایہ جس کی مدد سے تین نسلیں اس دنیا میں آئیں، اس خبر کو سنتے ہی مثانے کے درد میں مبتلا ہو گئی اور اپنی موت کے دن تک اسے پیشاب کرنے کے لیے قاثطیر کا استعمال کرنا پڑا۔ دون روجیلو دے لا فلور، کلوتیلدے آرمنتا کا نیک شوہر جو چھیاسی سال کی عمر میں قوّتِ مردمی کا ایک شاہکار تھا، آخری بار یہ دیکھنے کو اٹھا کہ کس طرح انھوں نے سانتیاگو نصر کے اعضا، اس کے اپنے گھر کے بند دروازے کے سامنے، جدا کر دیے، اور اس صدمے کے بعد زندہ نہیں رہ سکا۔ پلاسیدا لینیرو نے آخری لمحے میں اس دروازے کو مقفّل کروا دیا تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو الزام سے بری کر دیا۔ "میں نے اسے اس لیے بند کروا دیا تھا کہ دیوینا فلور نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے میرے بیٹے کو اندر آتے دیکھا ہے،" اس نے مجھے بتایا، "مگر یہ سچ نہیں تھا۔" دوسری طرف اس نے خود کو درختوں کے سعد شگون اور پرندوں کے نحس شگون میں تمیز نہ کرنے پر کبھی معاف نہیں کیا، اور کاہُو کے بیج چبانے کی قبیح عادت کا شکار ہو گئی، جو اس کے زمانے میں عام تھی۔

جرم کے بارہ دنوں کے بعد تفتیشی مجسٹریٹ، اس قصبے میں جو ایک کھلے ہوئے زخم کی طرح تھا، وارد ہوا۔ ٹاؤن ہال کے خستہ حال چوبی دفتر میں شدید گرمی میں گنّے کی شراب سے دوآتشہ گرم کافی پیتے ہوئے، ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے جو طلب کیے بغیر ڈرامے میں اپنے اہم کردار کی نشاندہی کرنے کے لیے امڈ آیا تھا، اسے فوجی دستے کی کمک طلب کرنی پڑی۔ وہ نیا نیا فارغ التحصیل ہوا تھا اور ابھی تک قانون کی درس گاہ والا سیاہ لینن کا سوٹ اور سونے کی انگوٹھی پہنتا تھا، جس پر اس کی سند کا نشان کندہ تھا۔ اس میں ایک نئے نئے باپ بننے والے مسرور شخص کی سرمستی اور غنائیت تھی۔ مگر مَیں کبھی اس کا نام نہیں جان سکا۔ جو کچھ بھی ہمیں اس کے کردار کے بارے میں معلوم ہوا، مسل سے اخذ کیا گیا تھا، جسے چند لوگوں نے بیس سال بعد ریوہاچا کے ایوانِ انصاف میں تلاش کرنے میں میری اعانت کی۔ مسلوں کی کسی طرح کی کوئی درجہ بندی نہیں کی گئی تھی، اور ایک سو سے زیادہ مقدمات اس نوآبادیاتی عمارت کے بوسیدہ فرش پر انبار تھے، جو سر فرانسس ڈریک کا دو دن کے لیے مستقر رہ چکی تھی۔ زمینی منزل مدِ کامل سے پانی سے بھر جایا کرتی، اور غیرمجلد مسلیں ویران دفتر میں تیرتی پھرتیں۔ میں نے خود کئی بار اپنی تلاش ٹخنوں تک پانی میں گمشدہ مقدمات کے اس دریا میں جاری رکھی، اور صرف حسنِ اتفاق سے، پانچ سال کی جستجو کے بعد، میں ۵۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل مسل کے ۳۲۲ صفحات بازیاب کرنے میں کامیاب ہوا۔

جج کا نام ان میں سے کسی پر نہیں آتا، مگر یہ واضح ہے کہ وہ ادب کے جنون میں

مبتلا ایک شخص تھا۔ اس نے بلاشبہ ہسپانوی اور کچھ لاطینی ادبیات عالیہ پڑھ رکھی تھیں، اور وہ نیٹشے سے بخوبی واقف تھا جو ان دنوں کے مجسٹریٹوں میں رائج مصنف تھا۔ حاشیاتی شذرے، روشنائی کے رنگ سے قطع نظر بھی خون سے تحریرشدہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس چیستاں پر، جس کی زد میں وہ اتفاقاً آ گیا تھا، اتنا حیران تھا کہ کئی مرتبہ ایک غنائی تشتتِ خیال میں مبتلا ہو گیا، جو اس کے پیشے کے سخت گیر تقاضوں کے خلاف تھا۔ سب سے بڑھ کر، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ زندگی اتنے زیادہ اتفاقات کا استعمال کرے جو ادب میں بھی ممنوع ہیں، کہ اتنی صاف طور پر پیش گفتہ موت کو آزادانہ پایۂ تکمیل تک پہنچنے دے۔

اس کے باوجود اپنی جاں‌فشاں تفتیش کے اختتام پر جس بات نے اس کو سب سے زیادہ حیران کیا، وہ یہ تھی کہ کوئی سراغ، یہاں تک کہ کوئی ناممکن ترین اشارہ بھی موجود نہ تھا جو سانتیاگو نصر کو خطا کا مرتکب قرار دیتا۔ انجلا ویکاریو کی دوستوں نے، جو فریب دہی میں اس کی مشیر تھیں، عرصے تک یہی کہا کہ وہ شادی سے پہلے ہی اس کے راز میں شریک ہو گئی تھیں، مگر اس نے ان پر کسی نام کا انکشاف نہیں کیا تھا۔ مسل میں ان کا بیان تھا: "اس نے معجزے کے متعلق بتایا، مگر ولی کا نام نہیں لیا۔" لیکن انجلا ویکاریو اپنے بیان پر قائم رہی۔ جب تفتیشی مجسٹریٹ نے اس سے اپنے بالواسطہ انداز میں پوچھا کہ آیا وہ جانتی ہے کہ متوفی سانتیاگو نصر کون تھا تو اس نے جذبات سے عاری جواب دیا:

"وہ میرے ساتھ مرتکب ہوا تھا۔"

مسل میں اس کا بیان یہیں تک ہے، کیسے اور کہاں کی کسی تفصیل کے بغیر۔ سماعت کے دوران جو صرف تین دن جاری رہی وکیل سرکار نے اپنی تمام تر کوشش الزام کی کمزوری پر صرف کی۔ تفتیشی مجسٹریٹ کی پریشانی سانتیاگو نصر کے خلاف عدم ثبوت کی بنا پر اتنی زیادہ تھی کہ بعض مقامات پر یہ کارِخیر مایوسی کی وجہ سے تباہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ صفحہ ۴۱۶ پر اپنی تحریر اور دواساز کی سرخ روشنائی میں، اس نے ایک حاشیے پر لکھا: "مجھے ایک مفروضہ دے دو اور میں دنیا کو ہلا دوں گا۔" حوصلہ شکنی کی شرح کرتے ہوئے، اس نے ایک شوخ خاکے میں، اسی خون رنگ روشنائی میں، تیر سے چھدا ہوا ایک دل بنایا۔ اس کے نزدیک سانتیاگو نصر کے قریب ترین دوستوں کی طرح زندگی کی آخری چند ساعتوں میں ستم رسیدہ کا طرزِعمل اس کی بےگناہی کا ضرورت سے زیادہ ثبوت تھا۔

اپنی موت کی صبح، درحقیقت، سانتیاگو نصر کے پاس شک کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا، اس امر کے باوجود کہ وہ بخوبی آگاہ تھا کہ اس پر لگائی گئی تہمت کی اسے کیا قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے۔ وہ اس دنیا کی ظاہرداری کی روش سے واقف تھا اور ضرور جانتا رہا ہو گا کہ ویکاریو برادران کی سادہ مزاجی کسی بدنامی کو برداشت کر جانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کوئی بھی بیاردو سان رومان کو بہت اچھی طرح نہیں جانتا تھا، مگر سانتیاگو نصر اس سے اتنا ضرور آشنا تھا کہ سمجھ سکے کہ اپنے دنیادارات

مزاج کی گہرائیوں میں وہ اپنے فطری تعصبات کا اتنا ہی اسیر ہے جتنا کہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کا فکرمند نہ ہونا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس کے علاوہ، آخری لمحات میں، جب اسے علم ہو گیا کہ ویکاریو برادران اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، اس کا ردعمل سراسیمگی کا نہیں تھا، جیسا کہ متعدد موقعوں پر بیان کیا گیا، بلکہ بےگناہی کی پریشانی کی طرح تھا۔

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ وہ اپنی موت کو سمجھے بغیر مر گیا۔ میری بہن مارگوت سے وعدہ کرنے کے بعد، کہ وہ ہمارے گھر آ کر ناشتہ کرے گا، کرسٹو بیدویا اس کو بازو سے تھام کر گودی کی طرف لے گیا اور وہ دونوں اتنے بےفکر نظر آ رہے تھے کہ انھوں نے ایک غلط تاثر کو راہ دی۔ "وہ دونوں اتنے مطمئن چلے جا رہے تھے،" میمے لوئیزا نے مجھے بتایا، "کہ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کیوں‌کہ میں سمجھی کہ معاملہ صاف ہو گیا ہے۔" بلاشبہ ہر کوئی سانتیاگو نصر سے بےپناہ محبت نہیں رکھتا تھا۔ پولو کاریو، برقی کارخانے کے مالک، کا خیال تھا کہ اس کی پُرسکونی اس کی بےگناہی کا نہیں بلکہ کلبیت کا مظہر تھی۔ "وہ سوچتا تھا کہ اپنی دولت کی وجہ سے وہ ناقابلِ گرفت ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ فاؤستا لوپیز، اس کی بیوی، نے تبصرہ کیا: "بالکل ترکوں کی طرح۔" اندالیسیو پاردو کلوتیلدے آرمنتا کی دکان کے پاس سے ہو کر گزر رہا تھا کہ ویکاریو برادران نے اسے بتایا کہ جیسے ہی بشپ چلا جائے گا وہ سانتیاگو نصر کو قتل کر دیں گے۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح اس نے سمجھا کہ یہ صبح خیزوں کی خواب آرائی ہے، مگر کلوتیلدے آرمنتا نے اس سے سانتیاگو نصر کے پاس جانے اور اسے خبردار کرنے کی درخواست کی۔

"تکلیف مت کرو،" پیدرو ویکاریو نے اس سے کہا۔ "جو بھی ہو، اب اسے مردہ ہی سمجھو۔"

یہ بہت زیادہ واضح چیلنج تھا۔ وہ اندالیسیو پاردو اور سانتیاگو نصر کے درمیانی تعلق کو جانتے تھے اور انھوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ وہ جرم کو روکنے اور انھیں شرمندگی سے بچانے کے لیے نہایت موزوں شخص ہے۔ مگر اندالیسیو نے سانتیاگو نصر کو کرسٹو بیدویا کے ساتھ ان گروہوں میں پایا جو گودی سے لوٹ رہے تھے اور اسے اس کو انتباہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ "میرے اعصاب جواب دے گئے،" اس نے مجھے بتایا۔ اس نے دونوں کی پیٹھ تھپتھپائی اور انھیں ان کی راہ پر جانے دیا۔ انھوں نے شاید ہی اسے محسوس کیا ہو، کیوں‌کہ وہ ابھی تک شادی کے اخراجات کا تخمینہ لگانے میں منہمک تھے۔

اب لوگ منتشر ہو کر ان دونوں کی طرح، چوک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک کثیف ہجوم تھا مگر ایسکولاستیکا سیسنیروس کا خیال تھا کہ اس نے دونوں کو ہجوم کے وسط کے ایک خالی دائرے میں بہ آسانی چلتے ہوئے دیکھا تھا، کیوں‌کہ لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ سانتیاگو نصر مرنے جا رہا ہے، اور ان میں اس سے مَس ہونے کی جرأت نہیں تھی۔ کرسٹو بیدویا نے بھی اس غیرمعمولی طرزِعمل کی وجہ سے اس ہجوم کو یاد رکھا۔ "وہ ہماری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم نے اپنے چہرے پر رنگ مَل

رکھا ہوا" اس نے مجھے بتایا۔ سارا ہورینگ بھی اس وقت اپنی جوتوں کی دکان کھول رہی تھی اور جب وہ وہاں سے گزرے وہ سانتیاگو نصر کی زرد ہوتی رنگت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی، مگر اس نے اسے مطمئن کر دیا۔

"تم سمجھ سکتی ہو سارا،" اس نے ان سے رکے بغیر کہا۔ "رات بھر اتنے غل غپاڑے کے بعد تو ایسا ہی لگوں گا۔"

سیلیستے دانگوند اپنے گھر کے دروازے پر شب خوابی کے لباس میں بیٹھا ان لوگوں کا مضحکہ اڑا رہا تھا جو بشپ کے استقبال کو گئے تھے۔ اس نے سانتیاگو نصر کو کافی پینے کی دعوت دی۔ "مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ مگر سانتیاگو نصر نے تیزی سے جواب دیا کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لیے لباس تبدیل کرنے کی عجلت میں ہے۔ "میں بالکل گڑبڑا گیا،" سیلیستے دانگوند نے مجھے بتایا، "کیونکہ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اتنا پریقین ہے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے قتل کرنے والے ہوں۔" جمیل شیوم واحد شخص تھا جس نے وہی کیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے افواہ سنی، وہ اپنی بزازی کی دکان کے دروازے پر گیا اور سانتیاگو نصر کا انتظار کرنے لگا تاکہ اسے خبردار کر سکے۔ وہ ان آخری عربوں میں سے ایک تھا جو ابراہیم نصر کے ساتھ آئے تھے، اور اس کے دم واپسیں تک تاش کی بازی میں اس کا ساتھی رہا تھا، اور ابھی تک خاندان کا موروثی مشیر تھا۔ اس سے زیادہ کسی کو بھی سانتیاگو نصر سے بات کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود، اس نے سوچا کہ اگر افواہ بے بنیاد ہے تو وہ اس کو خوامخواہ پریشان کر دے گی، اور اس نے پہلے کرستو بیدویا سے مشورہ کرنے کو ترجیح دی کہ شاید وہ زیادہ بہتر طور پر کچھ خبر ہو۔ جب وہ پاس سے گزرا، اس نے اسے آواز دی۔ کرستو بیدویا نے سانتیاگو نصر کو تھپکی دی، جو چوک کے موڑ تک پہنچ چکا تھا، اور جمیل شیوم کے بلاوے کا جواب دیا۔ "سنیچر کو ملیں گے" اس نے کہا۔

سانتیاگو نصر نے اسے جواب نہیں دیا، مگر عربی میں جمیل شیوم سے کچھ کہا، جس نے عربی ہی میں، ہنسی سے بل کھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم میں ذومعنی گفتگو چلتی تھی،" جمیل شیوم نے مجھے بتایا۔ رکے بغیر، سانتیاگو نصر نے دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے الوداع کہا، اور چوک کے موڑ کی طرف چلا گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ انھوں نے اسے دیکھا۔

کرستو بیدویا نے سانتیاگو نصر کو پکڑنے کے لیے دوڑنے سے پہلے صرف جمیل شیوم کی اطلاع سننے کا وقت لیا۔ اس نے اس کو موڑ سے جاتے ہوئے دیکھا تھا، مگر وہ اسے ان گروہوں میں نظر نہیں آیا جو چوک تک پہنچ کر منتشر ہونے لگے تھے۔ اس نے جس سے بھی پوچھا اس کو ایک ہی جواب ملا:

"میں نے اسے ابھی تمھارے ساتھ دیکھا تھا۔"

یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ اتنے کم وقت میں گھر پہنچ گیا ہو، مگر بہرصورت وہ اس کے بارے میں معلوم کرنے اندر چلا گیا، کیونکہ اس نے بیرونی دروازہ اگلا چڑھے

بغیر اور ادھ کھلا پایا۔ وہ فرش پر پڑے کاغذ کو دیکھے بغیر اندر گیا۔ وہ زینے کے تاریک کمرے سے شور پیدا نہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گزرا، کیونکہ مہمانوں کے آنے کے لیے یہ وقت نامناسب تھا۔ مگر گھر کے عقبی حصے میں کتے ہوشیار ہو گئے اور اس سے ملنے کو آ گئے۔ اس نے انھیں چابیوں کی جھنکار سے چپ کرایا، جیسا کہ اس نے ان کے مالک سے سیکھا تھا، اور ان کے آگے آگے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں وہ دیوینا فلور سے ٹکرایا، جو پانی کی ایک بالٹی لیے زینے کے کمرے کا فرش صاف کرنے آ رہی تھی۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ سانتیاگو نصر واپس نہیں آیا۔ وکٹوریا گزمان نے خرگوشوں کا اسٹو چولھے پر رکھا ہی تھا، جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوا، وہ فوراً جان گئی۔ "اس کا دل اس کی زبان پر تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ کرستو بیدویا نے اس سے پوچھا کہ کیا سانتیاگو نصر گھر آیا ہے، اور اس نے بناوٹی معصومیت سے جواب دیا کہ وہ ابھی تک سونے کے لیے نہیں لوٹا۔

"دیکھو، بہت سنگین بات ہے،" کرستو بیدویا نے اس سے کہا۔ "وہ قتل کرنے کے لیے اس کو تلاش کر رہے ہیں۔"

وکٹوریا گزمان اپنی معصومیت بھول گئی۔

"وہ غریب لڑکے کسی کو قتل نہیں کریں گے،" اس نے کہا۔

"وہ ہفتے کے دن سے پیے چلے جا رہے ہیں،" کرستو بیدویا نے کہا۔

"اسی لیے تو،" اس نے جواب دیا۔ "دنیا میں کوئی شرابی اپنی مخروج پر مستی نہیں کرتا۔"

کرستو بیدویا دوبارہ زینے کے کمرے میں چلا گیا، جہاں دیوینا فلور نے کھڑکیوں کو کھولا ہی تھا۔ "بلاشبہ بارش نہیں ہو رہی تھی،" کرستو بیدویا نے مجھے بتایا۔ "اس وقت سات بجنے ہی والے تھے اور سنہری دھوپ کھڑکیوں سے آ رہی تھی۔" اس نے دیوینا فلور سے پوچھا کہ کیا وہ یقین سے کہہ سکتی ہے کہ سانتیاگو نصر زینے کے کمرے کے دروازے سے اندر نہیں آیا۔ اب کی بار وہ پہلے کی طرح پریقین نہیں تھی۔ اس نے اس سے پلاسیدہ لینیرو کے بارے میں پوچھا، اور اس نے جواب دیا کہ صرف ایک لمحے پہلے اس نے اس کی کافی نائٹ ٹیبل پر رکھی ہے، مگر اسے جگایا نہیں۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ وہ سات بجے اٹھتی، کافی پیتی اور دن کے کھانے کے لیے ہدایات دینے نیچے آتی۔ کرستو بیدویا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چھ بج کر چھپن ہوئے تھے۔ وہ دوسری منزل پر گیا اس بات کی تصدیق کرنے کہ سانتیاگو نصر گھر نہیں آیا۔

شب خوابی کا کمرہ اندر سے بند تھا، کیونکہ سانتیاگو نصر اپنی ماں کی شب خوابی کے کمرے کی طرف سے باہر گیا تھا۔ کرستو بیدویا نہ صرف اس گھر کو اپنے گھر کی طرح بخوبی جانتا تھا بلکہ وہ اس خاندان سے اتنا مانوس تھا کہ اس نے پلاسیدہ لینیرو کے شب خوابی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور وہاں سے متصل کمرے میں چلا گیا۔ روشندان سے ایک گردآلود روشنی کی لکیر آ رہی تھی اور خوبصورت عورت اپنی کروٹ پر جھولے میں سوئی ہوئی اپنا عروسی ہاتھ اپنے رخسار پر رکھے غیرحقیقی لگ رہی تھی۔

"وہ ایک خوبصورت روح کی طرح تھی۔" اس نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا، اس کے حسن سے مسحور ہوا، اور پھر خاموشی کے ساتھ غسل خانے سے ہوتا ہوا سانتیاگو نصر کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر ابھی تک بچھا ہوا تھا، اچھی طرح استری کیے ہوئے گھڑسواری کے کپڑے کرسی پر رکھے تھے اور کپڑوں کے اوپر اس کا ہیٹ اور فرش پر مہمیز والے جوتے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر سانتیاگو نصر کی کلائی کی گھڑی چھ بجا رہی تھی۔ "اچانک میں نے سوچا کہ وہ واپس آ چکا ہے تاکہ مسلح ہو کر باہر جا سکے۔" کرستو بیدویا نے مجھے بتایا۔ مگر اس نے میگنم سائڈ ٹیبل کی دراز میں پائی۔ "میں نے کبھی گولی نہیں چلائی،" کرستو بیدویا نے مجھے بتایا، "مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ریوالور رکھ لوں اور سانتیاگو نصر تک پہنچا دوں۔" اس نے اسے اپنی قمیص کے نیچے اپنی بیلٹ میں پھنسا لیا اور جرم کے بعد ہی اس کو احساس ہوا کہ وہ بھرا ہوا نہیں تھا۔ پلاسیدا لینیرو کافی کا مگ ہاتھ میں لیے دالان میں نمودار ہوئی، عین اس وقت جب وہ دروازہ بند کر رہا تھا۔

"خدا وند،" وہ چیخی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

کرستو بیدویا بھی گھبرا گیا تھا۔ اس نے اس کو پوری روشنی میں سنہری پرندوں والا ڈریسنگ گاؤن پہنے اور بال بکھرائے دیکھا، اس کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے بڑی حد تک بدحواسی میں اسے بتایا کہ وہ سانتیاگو نصر کی تلاش میں ہے۔

"وہ بشپ کا استقبال کرنے گیا ہے،" پلاسیدا لینیرو نے کہا۔

"وہ ابھی بھی گیا ہے؟" اس نے کہا۔

"ہاں، میرا خیال ہے،" اس نے کہا۔ "وہ سب سے خراب قسم کی ماں کا بیٹا ہے۔"

وہ وہاں سے گئی نہیں، کیوں کہ اس وقت تک اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کرستو بیدویا کو اپنی حرکات و سکنات پر اختیار نہیں رہا ہے۔ "میرا خیال ہے خدا نے مجھے معاف کر دیا ہو گا،" پلاسیدا لینیرو نے مجھے بتایا، "مگر مجھے وہ اتنا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اچانک مجھے لگا کہ وہ لوٹنے آیا ہے۔" اس نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنا بدحواس کیوں ہے۔ کرستو بیدویا کو معلوم تھا کہ وہ مشتبہ حالت میں ہے، مگر اس میں سچ بتانے کی ہمت نہیں تھی۔

"بس میں یک مشت بھی سو نہیں سکا ہوں،" اس نے کہا۔

وہ مزید توضیحات کے بغیر چلا گیا۔ "ویسے بھی،" اس نے مجھے بتایا، "وہ ہمیشہ اس وہم میں مبتلا رہا کرتی تھی کہ اسے لوٹا جا رہا ہے۔" چوک پر وہ فادر اماڈور سے ملا، جو نہ ہونے والے اجتماع کی عبا میں کلیسا کو واپس جا رہا تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ وہ سانتیاگو نصر کے لیے سوائے اس کی روح کو بچانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دوبارہ گودی کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے انہیں کلوتیلدے ارمنتا کی دکان سے پکارتے سنا۔ پیدرو ویکاریو دروازے پر تھا، زرد اور وحشت زدہ، اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں، اور اس کے ہاتھ میں ننگا چھرا تھا۔ اس کا انداز اتنا نامناسب تھا کہ فطری نہیں لگ سکتا تھا، مگر یہ صرف ان حربوں میں سے

ایک تھا جو اس نے اختیار کیا تھا تاکہ وہ اسے جرم کے ارتکاب سے روک سکیں۔

"کرستوبال،" وہ چیخا، "سانتیاگو نصر سے کہہ دو ہم اسے قتل کرنے کے لیے یہاں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

کرستو بیدویا اسے باز رکھنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ریوالور کس طرح چلایا جاتا ہے، تو سانتیاگو نصر آج زندہ ہوتا،" اس نے مجھے بتایا۔ مگر اس خیال نے اسے متاثر کیا کیوں کہ وہ خود چڑھی گولی کی تباہ کارانہ صلاحیت کے بارے میں سن چکا تھا۔

"میں تمھیں خبردار کرتا ہوں۔ وہ میگنم سے مسلح ہے جس کی گولی انجن ہلاک سے گزر سکتی ہے،" اس نے چیخ کر کہا۔

پیدرو ویکاریو جانتا تھا کہ یہ درست نہیں ہے۔ "وہ کبھی مسلح ہو کر نہیں نکلتا تھا، سوائے اس وقت کے جب وہ گھڑسواری کا لباس پہنے ہوئے ہوتا تھا۔" اس نے مجھے بتایا۔ مگر بہرحال اس نے اپنی بہن کی عزت کا داغ مٹانے کا فیصلہ کرتے وقت اس امکان کو مدنظر رکھا تھا کہ وہ مسلح بھی ہو سکتا ہے۔

"مرا ہوا آدمی گولیاں نہیں چلاتا،" اس نے چیخ کر کہا۔

پھر پابلو ویکاریو جائے در میں نمودار ہوا۔ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح زرد ہو رہا تھا، اور شادی کی جیکٹ پہنے اور اخبار میں لپٹا چھرا لیے ہوئے تھا۔ "اگر یہ نہ ہوتا،" کرستو بیدویا نے مجھے بتایا، "میں کبھی نہ جان سکتا کہ دونوں میں کون سا بھائی کون ہے۔" پھر کلوتیلدے ارمنتا پابلو ویکاریو کے پیچھے نمودار ہوئی اور اس نے چیخ کر کرستو بیدویا سے جلدی کرنے کو کہا، کیوں کہ اس جلا دینے جانے کے قابل قصبے میں صرف اس جیسا ایک مرد ہی المیے کو روک سکتا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے علم میں ہے۔ جو لوگ گودی سے واپس آ رہے تھے چیخوں سے ہوشیار ہو کر جرم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے چوک پر اپنی اپنی جگہ سنبھالنے لگے۔ کرستو بیدویا نے کئی لوگوں سے، جنھیں وہ جانتا تھا، پوچھا کہ کیا انھوں نے سانتیاگو نصر کو دیکھا ہے، مگر کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ سوشل کلب کے دروازے پر وہ کرنل لزارو اپونتے سے ملا اور اس نے اسے بتایا کہ کلوتیلدے ارمنتا کی دکان کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔

"یہ ناممکن ہے،" کرنل اپونتے نے کہا، "کیوں کہ میں نے انہیں گھر جا کر سو رہنے کا حکم دیا ہے۔"

"میں نے انھیں ابھی ابھی سوروں کو ذبح کرنے کے چھروں کے ساتھ دیکھا ہے،" کرستو بیدویا نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے، کیوں کہ وہ میں نے گھر جا کر سونے کا حکم دینے سے پہلے ہی ان سے لے لیے تھے،" میئر نے کہا۔ "ضرور تم نے انھیں اس سے پہلے دیکھا ہو گا۔"

"میں نے انھیں دو منٹ پہلے دیکھا ہے، اور دونوں کے پاس سوروں کو ذبح کرنے کے چھرے تھے،" کرستو بیدویا نے کہا۔

[illegible] میئر نے کہا۔ "وہ ضرور نئے چہروں کے ساتھ لوٹ آئے ہیں۔"

اس نے اس مسئلے پر فوری توجہ دینے کا وعدہ کیا، مگر وہ رات کے ڈومینو کی تاریخ کی تصدیق کرنے سوشل کلب کے اندر چلا گیا، اور جب باہر نکلا تو جرم کا ارتکاب ہو چکا تھا۔ کرسٹو بیدویا نے اس وقت اپنی واحد مہلک غلطی کی۔ اس نے سوچا کہ سانتیاگو نصر نے آخری لمحے میں فیصلہ کر لیا ہو گا کہ وہ لباس تبدیل کرنے سے پہلے ہی ہمارے گھر ناشتہ کرے گا اور وہ اسے تلاش کرنے کے لیے وہاں پہنچا۔ وہ دریا کے کنارے تیزی سے چلتا ہر ایک سے یہ پوچھتے ہوئے کہ کیا کسی نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا ہے، مگر کسی نے نہیں کہا کہ اس نے دیکھا ہے۔ اسے تشویش نہیں ہوئی، کیوں کہ ہمارے گھر پہنچنے کے کئی اور راستے بھی تھے۔ پروسپیرا ارانگو، پہاڑی لڑکی، نے اس سے اپنے باپ کی طبی امداد کرنے کو کہا جو بشپ کی گریزپا دعاؤں کے اثر سے باہر اپنے گھر کے چبوترے پر جاں‌کنی کے عالم میں پڑا تھا۔ "میں نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا تھا،" میری بہن مارگوت نے مجھے بتایا، "اور اس کا چہرہ اس وقت ہی مردوں جیسا ہو چکا تھا۔" کرسٹو بیدویا نے بیمار شخص کی حالت کا تجزیہ کرنے میں چار منٹ لگائے اور وعدہ کیا کہ وہ بعد میں آ کر ہنگامی امداد دے گا، مگر اس نے مزید تین منٹ [illegible]

[illegible]

[illegible] فلورا میکل کے گھر گیا تھا جو اس موڑ کے بالکل قریب تھا جہاں اس نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ "میرے تصور میں بھی نہیں [illegible] سکتا تھا کہ وہ وہاں ہو گا،" اس نے مجھے بتایا، "کیوں کہ وہ لوگ کبھی دوپہر سے پہلے سو کر نہیں اٹھتے تھے۔" مروجہ روایت یہ تھی کہ پورا خاندان قبیلے کے بزرگ نحیر میکل کی ہدایت پر بارہ بجے تک سوتا [illegible] مگر [illegible] موجود نہیں رہ گئی تھی۔ اس وقت تک گلاب کی طرح [illegible] یہ کہ وہ لوگ دوسرے بہت سے گھروں کی طرح اپنے گھر کو بہت دیر تک بند رکھتے تھے، مگر وہ صبح خیز اور جفاکش تھے۔ یہ رشتہ سانتیاگو نصر اور فلورا میکل کے والدین نے طے کیا تھا۔ سانتیاگو نصر نے اسے اپنے عنفوانِ شباب میں قبول کیا تھا اور وہ اسے قائم کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا، شاید وہ بھی اپنے باپ کی طرح شادی کے افادی پہلو کا زیادہ قائل تھا۔ فلورا میکل ایک خاص قسم کی ادائی کی حامل تھی، مگر اس میں ذہانت اور قوتِ فیصلہ کی کمی تھی، اور وہ اپنی تمام ہم عصروں کے لیے دلہن کی خاص سہیلی کی حیثیت سے خدمت انجام دے چکی تھی، اس لیے یہ رشتہ اس کے لیے ایک عطیۂ خداوندی تھا۔ اس کی منگنی، پرتکلف ملاقاتوں

اور دلوں کی بےقراریوں کے بغیر، آسانی سے عمل میں آئی تھی۔ شادی کی تاریخ کئی بار ملتوی ہونے کے بعد آخرکار کرسمس کے بعد مقرر ہوئی تھی۔

فلورا میکل اس سوموار کو بشپ کی کشتی کے پہلے شور پر بیدار ہوئی تھی، اور اٹھنے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے علم ہو گیا تھا کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے میری راہبہ بہن کو، جو واحد ہستی تھی جس سے اس نے بدبختی کے بعد گفتگو کی، بتایا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اسے کس نے یہ اطلاع دی تھی۔ "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ چھ بجے صبح ہر کوئی جانتا تھا،" اس نے میری بہن سے کہا۔ اس کے باوجود اسے یہ ناقابلِ یقین نظر آتا تھا کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس، اس کو یہ خیال آیا کہ وہ اسے انجلا ویکاریو سے شادی کرنے پر مجبور کریں گے تاکہ اس کی عزت اسے واپس مل سکے۔ وہ تذلیل کے ایک شدید بحران سے گزری۔ جب آدھا قصبہ بشپ کی آمد کی انتظار کر رہا تھا، وہ غصے میں روتی ہوئی اپنے شب خوابی کے کمرے میں تھی، اور اس صندوقچہ بھر خطوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی جو سانتیاگو نصر نے اسے اسکول سے لکھے تھے۔

جب بھی وہ فلورا میکل کے گھر کے پاس سے گزرتا حتیٰ کہ جب وہاں کوئی نہ بھی ہوتا سانتیاگو نصر اپنی چابیاں کھڑکی کی جالی سے رگڑتا تھا۔ اس سوموار کو وہ خطوں کا صندوقچہ اپنی گود میں لیے انتظار کر رہی تھی۔ سانتیاگو نصر سڑک سے اسے نہیں دیکھ سکا مگر اس نے بہرحال اسے چابی رگڑنے سے پہلے جالی کے اندر سے دیکھ لیا۔

"اندر آ جاؤ،" اس نے اس سے کہا۔

اس گھر میں کوئی بھی، حتیٰ کہ کوئی معالج بھی، صبح کے چھ بج کر پینتالیس منٹ پر داخل نہیں ہوا تھا۔ سانتیاگو نصر نے اسی وقت کرسٹو بیدویا کو جمیل شیوم کی دکان پر چھوڑا تھا، اور اس وقت چوک پر اتنے افراد اس کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھے کہ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ کسی نے اس کو اپنی منگیتر کے گھر جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔ تفتیشی مجسٹریٹ نے کسی ایک آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس نے اسے فلورا میکل کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھا ہو، اور اس نے بھی میری طرح اتنی ہی سخت کوشش کی تھی مگر ایک گواہ کو بھی تلاش کرنا ناممکن ثابت ہوا۔ مسل کے صفحہ ۳۸۲ پر ایک اور حاشیائی فیصلے میں، اس نے سرخ روشنائی سے لکھا "بدبختی ہمیں نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔" حقیقت یہ تھی کہ سانتیاگو نصر سب کی نظروں کے سامنے اور خود کو چھپانے کی کوئی کوشش کیے بغیر، صدر دروازے سے اندر گیا تھا۔ فلورا میکل ان لباسوں میں سے ایک بدنصیب چنٹ دار جھالروں والا لباس پہنے جو وہ یادگار موقع پر پہننے کی عادی تھی، غصے سے پاگل ہوئی ہوئی پارلر میں اس کا انتظار کر رہی تھی، اور اس نے صندوقچہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تو یہ تم ہو،" اس نے اسے بتایا۔ "مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں قتل کر دیں گے۔" سانتیاگو نصر اتنا بدحواس ہو کہ اس نے صندوقچہ گرا دیا اور اس کے بےمحبوب خط فرش پر بکھر گئے۔ اس نے فلورا میکل کو شب خوابی کے کمرے میں جا لینا چاہا مگر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے کئی بار دستک دی اور اس کو صبح کے وقت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے بہت

اصرار آمیز آواز میں پکارا، لہٰذا تمام خاندان جمع ہو گیا، اور وہ سب متوحش تھے۔ نسبی اور ازدواجی رشتہ داروں کو شمار کرتے ہوئے بڑے اور چھوٹے ملا کر وہ چودہ افراد تھے۔ نحیر میکل، فلورا میکل کا باپ، اپنی سرخ ڈاڑھی کے ساتھ اور بدوی کفتان میں ملبوس، جو وہ اپنے وطن سے لایا تھا اور گھر میں تمام وقت زیب تن کیے رہتا تھا، سب سے آخر میں نمودار ہوا۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا تھا اور وہ بہت بوڑھا اور نحیف تھا، مگر جو چیز مجھے متاثر کرتی تھی وہ اس کی مقتدرانہ تاب و تب تھی۔

"فلورا،" اس نے اپنی زبان میں پکارا۔ "دروازہ کھولو۔"

وہ اپنی بیٹی کے شب خوابی کے کمرے میں گیا، جب کہ سارا خاندان کھڑا سانتیاگو نصر کو گھورتا رہا۔ وہ پارلر میں جھکا خط اٹھا اٹھا کر صندوقچے میں رکھ رہا تھا۔ "یہ عمل توبہ کی ایک ریاضت معلوم ہوتا تھا۔" انھوں نے مجھے بتایا۔ نحیر میکل چند منٹوں میں شب خوابی کے کمرے سے باہر آیا، اپنے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا، اور تمام خاندان منتشر ہو گیا۔

اس نے سانتیاگو نصر سے عربی میں گفتگو جاری رکھی۔ "پہلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے اس کا خفیف سا گمان بھی نہیں ہے۔" اس نے مجھے بتایا۔ اس نے اس سے صاف صاف پوچھا کہ کیا وہ جانتا ہے کہ ویکاریو برادران قتل کرنے کے لیے اس کو تلاش کر رہے ہیں۔ "اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے اس طرح کھو بیٹھا کہ یہ سوچنا ناممکن تھا کہ وہ دکھاوے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔ اس نے اتفاق کیا کہ اس کا رویہ خوف سے زیادہ ایک پریشانی کا مظہر تھا۔

"صرف تم جان سکتے ہو کہ ان کا الزام درست ہے یا نہیں۔" اس نے اس سے کہا۔ "مگر بہرصورت اب تمھارے پاس دو راستے ہیں: یا تو تم یہیں چھپ جاؤ، اس گھر میں جو تمھارا ہے، یا تم میری رائفل لے کر باہر نکلو۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" سانتیاگو نصر نے کہا۔ وہ صرف اتنا ہی کہنے کے قابل ہو سکا، اور اس نے یہ ہسپانوی میں کہا۔ "وہ ایک بھیگے ہوئے پرندے کی طرح لگ رہا تھا۔" نحیر میکل نے مجھے بتایا۔ اس کو صندوقچہ اس کے ہاتھ سے لینا پڑا، کیوں کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کھولنے کے لیے اسے کہاں رکھے۔

"یہ دو کا ایک سے مقابلہ ہو گا۔" اس نے اسے بتایا۔

سانتیاگو نصر چلا گیا۔ لوگوں نے خود کو چوک پر اسی انداز میں مقرر کر لیا تھا جیسے وہ پریڈ کے دنوں میں کیا کرتے تھے۔ ہر ایک نے اسے باہر آتے دیکھا، اور وہ سب سمجھ گئے کہ اب وہ جانتا ہے کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں، اور وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اسے اپنے گھر جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بالکنی سے کسی نے چیخ کر کہا، "ابے ترک، اس راستے سے نہیں، پرانی گودی کی طرف سے۔" سانتیاگو نصر نے آواز دینے والے کو ڈھونڈنا چاہا۔ جمیل شعیوم نے اسے آواز دی کہ وہ اس کی دکان کے اندر آ جائے، اور اپنی شکاری بندوق لانے چلا گیا، مگر اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے کارتوس کہاں رکھے تھے۔ انھوں نے اسے ہر طرف سے آوازیں دینی شروع کر دیں، اور سانتیاگو نصر اتنی آوازوں سے بوکھلا کر کئی بار آگے بڑھا، اور پھر پیچھے لوٹا۔ یہ واضح تھا کہ اس کا رخ اپنے گھر کے باورچی خانے کی

دروازے کی طرف تھا، مگر یکدم اسے احساس ہوا ہو گا کہ صدر دروازہ کھلا ہے۔

"وہ آ رہا ہے،" پابلو ویکاریو نے کہا۔

دونوں نے اسے بیک وقت دیکھا۔ پابلو ویکاریو نے اپنی جیکٹ اتاری، اسے بنچ پر رکھا اور اپنا چھرا اخبار سے نکال کر اسے ایک تلوار کی طرح تھام لیا۔ دکان سے نکلنے سے پہلے، بغیر کسی مطابقت کے، دونوں نے اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنایا۔ پھر کلوتیلدے ارمنتا نے پابلو ویکاریو کی قمیص تھام لی اور سانتیاگو نصر سے چیخ کر کہا کہ وہ بھاگ جائے کیوں کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ یہ اتنی ہنگامی چیخ تھی کہ اس نے دوسروں کو چپ کرا دیا۔ "پہلے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔" کلوتیلدے ارمنتا نے مجھے بتایا، "کیوں کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کون آواز دے رہا ہے اور کہاں سے۔" مگر جب اس نے اسے دیکھا، اس نے پیدرو ویکاریو کو بھی دیکھ لیا، جس نے کلوتیلدے ارمنتا کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور اپنے بھائی سے جا ملا۔ سانتیاگو نصر اپنے گھر سے پچاس گز سے کم فاصلے پر تھا، اور وہ صدر دروازے کی طرف دوڑا۔

پانچ منٹ پہلے وکتوریا گزمان نے پلاسیدا لینیرو کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ پلاسیدا لینیرو ایک مضبوط اعصاب کی عورت تھی، اور اس نے فکرمندی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے وکتوریا گزمان سے پوچھا کہ کیا اس نے اس کے بیٹے کو کچھ بتایا ہے، اور اس نے ایمانداری سے جھوٹ بولا، کیوں کہ اس نے اسے جواب دیا کہ جب وہ کافی کے لیے نیچے آیا تھا، اس وقت تک وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ رہنے کے کمرے میں جہاں وہ ابھی تک فرش صاف کر رہی تھی، دیوینا فلور نے اسی وقت سانتیاگو نصر کو چوک کی طرف والے دروازے سے اندر آتے، اور کھلی سیڑھیوں سے شب خوابی کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ "یہ ایک بہت واضح فریبِ نظر تھا،" دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھا، اور اپنے ہاتھ میں کچھ لیے تھا جس کا میں ٹھیک سے اندازہ نہیں کر سکی، مگر وہ گلابوں کے ایک گلدستے کی طرح لگ رہا تھا۔" اس لیے جب پلاسیدا لینیرو نے اس کے بارے میں پوچھا، دیوینا فلور نے اسے پُرسکون کر دیا۔

"وہ ایک منٹ پہلے اپنے کمرے میں گیا ہے۔" اس نے اسے بتایا۔

تب پلاسیدا لینیرو نے کاغذ کو فرش پر دیکھا، مگر اس کو اسے اٹھانے کا خیال نہیں آیا اور اسے صرف اس وقت معلوم ہوا کہ اس میں کیا لکھا تھا جب کسی نے بعد میں المیے کی افراتفری کے دوران اسے وہ خط دکھایا۔ دروازے سے اس نے دیکھا کہ ویکاریو برادران اپنے چھرے بلند کیے اس کے گھر کی طرف دوڑتے آ رہے ہیں۔ اس جگہ سے جہاں وہ تھی، وہ انھیں دیکھ سکتی تھی، مگر اپنے بیٹے کو جو ایک دوسری سمت سے دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ "میں سمجھی کہ وہ اسے قتل کرنے کے لیے مکان کے اندر داخل ہونا چاہتے ہیں۔" اس نے مجھے بتایا۔ پھر وہ بھاگی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ آگل چڑھا رہی تھی جب اس نے سانتیاگو نصر کی چیخیں سنیں، اور دروازے پر کسی کے سخت خوفزدگی کے عالم میں زور زور سے ہاتھ مارنے کی آواز آئی، مگر اس نے سوچا کہ وہ اوپر اپنے کمرے کی بالکنی سے ویکاریو برادران پر چلّا رہا ہے۔ وہ اس کی مدد کرنے اوپر گئی۔

سانتیاگو نصر کو اندر آنے میں چند ثانیے رہ گئے تھے جب دروازہ بند ہوا۔ اس نے اپنی

انھوں نے کئی مرتبہ دروازہ پیٹا اور پھر فوراً اپنے دشمنوں کا اپنے خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کو مڑا۔ "میں اسے روبرو دیکھ کر ڈر گیا،" پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا، "کیوں کہ وہ اپنے قد سے دگنا لگ رہا تھا۔" سانتیاگو نصر نے پیدرو ویکاریو کا پہلا وار روکنے کے لیے، جس نے اس پر سیدھے تھامے ہوئے چھرے سے دائیں جانب سے حملہ کیا تھا، اپنا ہاتھ بلند کیا۔

"سؤر کے بچو!" وہ چیخا۔

چھرا اس کی دائیں ہتھیلی سے گزر کر اس کے پہلو میں دستے تک اتر گیا۔ ہر شخص نے اس کی دردناک چیخ سنی۔

"اوہ میری ماں۔"

پیدرو ویکاریو نے چھرا اپنی قصائیوں والی فولادی کلائی سے باہر کھینچا اور دوسرا وار تقریباً اسی مقام پر کیا۔ "عجیب بات ہے کہ چھرا ہر بار صاف باہر آتا رہا،" پیدرو ویکاریو نے تفتیش کرنے والے کو بیان دیا۔ "میں نے اسے کم از کم تین بار اس کے جسم میں اتارا مگر اس پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔" سانتیاگو نصر تیسرے وار کے بعد خم کھا گیا، اس کے بازو اس کے پیٹ پر تھے، اس نے ایک ذبح ہوتے ہوئے بچھڑے کی کراہ نکالی، اور اپنی پشت ان کی طرف کرنے کی کوشش کی۔ پابلو ویکاریو نے، جو اس کے بائیں طرف تھا، پھر اسے پشت کا واحد زخم لگایا، اور خون کی ایک دھار بہت زیادہ فشار سے اس کی قمیص تر کر گئی۔ "اس میں اس کی مہک تھی،" اس نے مجھے بتایا۔ تین بار مہلک طور پر زخمی ہو کر، سانتیاگو نصر پھر سامنے کی طرف مڑا اور مزاحمت کیے بغیر اپنی پشت اپنی ماں کے دروازے سے ٹیکی، جیسے انھیں قتل کرنے میں برابر کی شرکت کا موقع دے رہا ہو۔ "وہ پھر نہیں چیخا،" پیدرو ویکاریو نے تفتیش کرنے والے کو بتایا۔ "اس کے برعکس، مجھے ایسا لگا کہ وہ قہقہہ لگا رہا ہے۔" پھر ان دونوں نے، دہشت کی اس پار کی حیرگی میں، دروازے سے لگے ہوئے سانتیاگو نصر پر باری باری، بے آسانی وار کرتے ہوئے، اپنی خنجرزنی جاری رکھی۔ انھوں نے پورے قصبے کی آوازیں نہیں سنیں، جو اپنے جرم سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے سرپٹ دوڑاتے ہوئے محسوس ہوتا ہے،" پابلو ویکاریو نے بیان کیا۔ مگر وہ دونوں فوراً ہی حقیقت کی دنیا میں آ گئے، کیونکہ وہ تھک چکے تھے؛ اس کے باوجود انھوں نے سوچا کہ سانتیاگو نصر کبھی نہیں گرے گا۔ "لعنت ہو،" پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا، "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی انسان کو قتل کرنا کتنا دشوار ہے۔" اسے ایک وار میں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، پیدرو ویکاریو نے اس کے دل کا نشانہ لینا چاہا مگر اس نے اسے بغل کے قریب تلاش کیا، جہاں سؤروں کا دل ہوتا ہے۔ درحقیقت سانتیاگو نصر کے نہ گرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے وار اسے دروازے کے ساتھ کھڑا کیے ہوئے تھے۔ مایوس ہو کر پیدرو ویکاریو نے اس کے پیٹ پر ایک افقی چاک لگایا، اور اس کی تمام انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ پابلو ویکاریو بھی یہی عمل دوہرانے جا رہا تھا مگر خوف سے اس کی کلائی مڑ گئی اور اس کا تیر وار ران پر پڑا۔ سانتیاگو نصر دروازے کی ٹیک لگائے ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا پھر اس نے اپنی صاف اور نیلگوں انتڑیوں کو سورج کی روشنی میں دیکھا اور پھر گھٹنوں پر گر گیا۔

پلاسیدا لینیرو، شب خوابی کے کمرے میں تلاش کرنے اور آواز دینے کے بعد، دوسری چیخوں کو سن کر جو اس کی اپنی نہیں تھیں، اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کہاں سے آ رہی ہیں، چوک کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر گئی اور ویکاریو برادران کو گرجا کی طرف بھاگتے دیکھا۔ جمیل شیوم اپنی چکوار بندوق لیے ہوئے، اور چند دوسرے عرب غیرمسلح، ان کے تعاقب میں تھے، اور پلاسیدا لینیرو نے سوچا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ پھر وہ شب خوابی کے کمرے کی بالکنی پر آئی اور اس نے سانتیاگو نصر کو دروازے کے سامنے، خاک پر منہ کے بل پڑے اور اپنے ہی خون میں تر، اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک طرف کو جھک کر کھڑا ہوا اور اس نے، اپنی لٹکتی ہوئی انتڑیوں کو ہاتھوں میں تھامے، کابوس زدگی کے عالم میں چلنا شروع کیا۔

وہ گھر کے گرد دائرہ مکمل کرتے ہوئے سو گز سے زیادہ دور تک چلا، اور باورچی خانے کے دروازے سے اندر پہنچا۔ اس کو اس وقت بھی سڑک سے ہو کر لمبے راستے سے نہ جانے کا ہوش تھا، اور وہ پڑوس کے مکان کے راستے اندر گیا۔ پونچو لاناؤ، اس کی بیوی، اور ان کے پانچ بچے نہیں جانتے تھے کہ ان کے دروازے سے بیس قدم کے فاصلے پر کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ "ہم نے چیخیں سنی تھیں،" اس کی بیوی نے مجھے بتایا، "مگر ہم سمجھے یہ بشپ کے جشن کا ایک حصہ ہیں۔" وہ ناشتہ کرنے بیٹھے ہی تھے جب انھوں نے سانتیاگو نصر کو خون میں تر اور اپنی انتڑیاں ہاتھوں میں لیے، اندر آتے دیکھا۔ پونچو لاناؤ نے مجھے بتایا، "میں غلاظت کی ہولناک بدبو کبھی نہیں بھولوں گا۔" مگر ارخینیدا لاناؤ، سب سے بڑی لڑکی، نے کہا کہ سانتیاگو نصر حسب عادت اپنے قدموں کو بخوبی ناپتے ہوئے، اپنی اعلا بردباری کے ساتھ چل رہا تھا اور یہ کہ اپنے سرکش کاکلوں کے ساتھ اس کا عرب چہرہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ میز کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا، اور شب خوابی کے کمروں سے ہوتا ہوا گھر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ "ہم خوف سے مفلوج ہو گئے تھے،" ارخینیدا لاناؤ نے مجھے بتایا۔ میری خالہ ویننفریدا مارکیز، دریا کی دوسری طرف اپنے صحن میں ایک چشم سیاہ مچھلی کے فلس اتار رہی تھی کہ اس نے اسے پرانی گودی کی سیڑھیوں سے اترتے اور استوار قدموں کے ساتھ اپنے گھر کا راستا تلاش کرتے دیکھا۔

"سانتیاگو نصر، میرے بچے،" اس نے اس سے چیخ کر کہا، "تمھیں کیا ہوا!"

"انھوں نے مجھے قتل کر دیا ہے،" اس نے کہا

آخری سیڑھی پر وہ لڑکھڑا کر گرا، مگر فوراً ہی اٹھ گیا۔ "اس نے اس خاک کو بھی صاف کرنے کا خیال رکھا جو اس کی انتڑیوں پر لگ گئی تھی،" میری خالہ نے مجھے بتایا۔ پھر وہ اپنے گھر میں عقبی دروازے سے داخل ہوا، جو چھ بجے سے کھلا ہوا تھا، اور باورچی خانے میں منہ کے بل گر گیا۔

آج

خزاں ۱۹۸۹

ذر شکر سرحی   حسن حسن زاده   سید محمد خان   محمد خالد اختر

دوست داریهیه   ولیم سیدون   قیصر احمد سید   دگ شان ساحل

نسرین محمد بهی   محمد عدس   نیر مسعود   فروغ فرخ زاد   باب مقدم

سرما ۱۹۹۰

محبت محمود   ... تاسسانی   تیم موترو   مظهر علی سید

فهمیده ریاض   عذرا عباس   احمد فواد   محمد خالد اختر

کرم نه

بهار ۱۹۹۰

دنو کوینو   میں ناتوف   محمد عمر میمن   محمد سلیم الرحمن

جیک بدن   محمد نور خالد   ریتا لپاس   محمد خالد اختر

تادیوش روزه‌ویچ   زبگنیو هربرت   ویسلاو شیمبورسکا   لیکوند روب

گرما ۱۹۹۰

وجیه‌الدین ...   نور خان   حسن منظر

محمد سلیم الرحمن   شمس الرحمن   شمس الحق

فهمیده ریاض

خزاں ۱۹۹۰

منوچهر خسروشاهی   باب مقدم*   حسن میرعابدینی   ثروت حسین

دی شان ساحل   وکتاویو پاز   بیبود میهایی   جولین بارنز

فاروق خالد   محمد خالد اختر   علی امام نقوی

خورخه لوئیس بورخس

سرما ۱۹۹۱

فرهاد بهبهانی   صلاح الدین محمود   فهمیده ریاض   نیر مسعود

یانیس ریتسوس   یعقوب شماس   سعد رجب   ولاس سارنگ

انتخاب کا یہ حصہ مارکیز کے دو اہم ترین ناولوں ...Solitude اور Love in the Time of Cholera کے منتخب ابواب پر مشتمل ہے۔

"تنہائی کے سو سال" مارکیز کا سب سے معروف ناول ہے، اور درحقیقت یہی وہ کتاب ہے جس نے مارکیز کو بین الاقوامی طور پر متعارف کرایا۔ یہ ناول پہلی بار ہسپانوی زبان میں ۱۹۶۷ میں شائع ہوا، اور تب سے دنیا کی ستائیس زبانوں میں مجموعی طور پر سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس ناول میں مارکیز نے ایسی منفرد بیانیہ تکنیک برتی ہے جو دنیا بھر کے فکشن پر بے حد عمیق اثر ڈال رہی ہے۔ چیکوسلواکیہ کے معروف ناول نگار میلان کنڈیرا (Milan Kundera) نے کہا ہے کہ "تنہائی کے سو سال" کی موجودگی میں ناول کی روح یا خاتمے کی بات کرنا محض لغویت ہے۔ اس ناول کے پہلے تین ابواب اس حصے میں شامل ہیں۔

"وبا کے دنوں میں محبت" ہسپانوی زبان میں ۱۹۸۵ میں شائع ہوا، اور اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ اس عظیم لکھنے والے کی پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈالنے اور ان کی توقعات سے بلند ہونے کی کس قدر بے پناہ صلاحیت ہے۔ یہ ناول جو اپنے اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے "تنہائی کے سو سال" سے بہت مختلف ہے، مارکیز کی اس خواہش کا ثمر ہے کہ وہ محبت کی ایسی کہانی لکھنا چاہتا تھا جس کا اختتام خوش گوار ہو، کیونکہ "یہ میں خوشی کی بہت قلت ہے۔" اس ناول کا دوسرا باب اس حصے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

گابرئیل گارسیا مارکیز

ترجمہ: زینت حسام

تنہائی کے سو سال

بہت برسوں بعد، فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرتے ہوئے، کرنل اوریلیانو بوئندیا ماضی کی اُس دوردراز سہ پہر کو یاد کرنے والا تھا جب اس کا باپ زندگی میں پہلی بار اسے برف دکھانے لے گیا تھا۔ اس وقت ماکوندو مٹی کے بیس گھروں پر مشتمل گاؤں تھا، جو ایک ایسے دریا کے کنارے بنائے گئے تھے جس کا شفاف پانی چکنے پتھروں کے پاٹ پر بہتا تھا۔ یہ پتھر ماقبل تاریخ کے انڈوں کی مانند سفید اور عظیم الجثہ تھے۔ دنیا اتنی تازہ تھی کہ بہت سی چیزوں کے کوئی نام نہ تھے، اور ان کا ذکر کرتے وقت اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہوتا۔ ہر سال مارچ کے مہینے میں مفلوک الحال خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ گاؤں کے قریب اپنے خیمے لگاتا، اور نقاروں اور بانسریوں کے شوروغل کے ساتھ نت نئی ایجادات کا مظاہرہ کرتا۔ پہلے وہ مقناطیس لائے۔ بےترتیب ڈاڑھی اور چڑیا کے سے ہاتھوں والے ایک بھاری بھرکم خانہ بدوش نے، جس نے اپنا تعارف ملکیادیس کے نام سے کرایا، لوگوں کے سامنے، بقول اس کے، مقدونیہ کے عالم کیمیاگروں کے آٹھویں عجوبے کا ایک جدّ مظاہرہ پیش کیا، اور لوگ ششدر ہو کر، اپنی اپنی جگہوں سے گر کر دھات کے پیچھے لڑھکتی دیگچیوں، کڑھائیوں، چمٹوں اور انگیٹھیوں کو، کیلوں اور پیچوں کی بیقراری سے تڑختے شہتیروں کو، اور ان اشیا کو جنہیں گم ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں، انہی کونوں کھدروں سے، جہاں انہیں سب سے زیادہ تلاش کیا گیا تھا، نمودار ہوتے دیکھتے رہ گئے، جو ایک ہنگامہ خیز افراتفری میں ملکیادیس کے طلسمی ڈلوں کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی تھیں۔ "اشیا کی اپنی زندگی ہوتی ہے،" خانہ بدوش نے کرخت لہجے میں اعلان کیا، "صرف ان کی روحوں کو بیدار کرنے کی بات ہے۔" حوزے آرکادیو بوئندیا نے، جس

کا تخیل ہمیشہ فطرت کی قوتوں سے، بلکہ معجزوں اور طلسمات سے بھی پرے جاتا تھا، سوچا کہ اس بے مقصد ایجاد کے ذریعے زمین کے پیٹ سے سونا نکالا جا سکتا ہے۔ ملکیادیس نے جو ایک دیانت دار انسان تھا، اس کو خبردار کیا: "اس سے یہ کام نہیں لیا جا سکتا۔" لیکن خوزے آرکادیو بوئندیا اُن دنوں خانہ بدوشوں کی دیانت پر ایمان نہ رکھتا تھا، لہٰذا اس نے اپنے خچر اور دو بکریوں کے عوض مقناطیسی ڈلے خرید لیے۔ اس کی بیوی اُرسلا اِگواران، جو اپنے مختصر گھریلو مال و اسباب میں اضافے کے لیے ان جانوروں پر انحصار کرتی تھی، خوزے آرکادیو کو اس حرکت سے باز نہ رکھ سکی۔ "بہت جلد ہمارے پاس کافی سونا ہو گا اور ہم گھر کا فرش پکّا کروا سکیں گے،" اس کے شوہر نے کہا۔ وہ کئی مہینوں تک اس خیال کو سچ ثابت کرنے میں لگ رہا۔ مقناطیسی ڈلوں کو گھسیٹتے ہوئے اور ملکیادیس کے منتر بآواز بلند پڑھتے ہوئے خوزے آرکادیو بوئندیا نے اس خطے کا ایک ایک انچ کھوج لیا، یہاں تک کہ دریا کی تہہ بھی کھنگال ڈالی۔ جو کچھ وہ کھود نکالنے میں کامیاب ہو وہ پندرہویں صدی کا ایک زرہ بکتر تھا، جو زنگ خوردگی سے جڑا ہو تھا اور جس کے اندر پتھروں سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے لوٹے کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جب خوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کی مہم کے چار آدمی زرہ بکتر کو کھولنے میں کامیاب ہوئے تو اس کے اندر سے ایک ٹھٹھرایا ہوا انسانی ڈھانچا برآمد ہوا، جس کے گلے میں تانبے کا ایک لاکٹ جھول رہا تھا۔ لاکٹ کے اندر کسی عورت کے بالوں کی ایک لٹ تھی۔

مارچ میں خانہ بدوش واپس آئے۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ دوربین، اور طبل برابر محدب عدسہ لائے جسے انھوں نے ایمسٹرڈیم کے یہودیوں کی ایجاد کہہ کر متعارف کرایا۔ انھوں نے ایک خانہ بدوش عورت کو گاؤں کے ایک سرے پر بٹھا دیا اور خیمے کے سامنے دوربین لگا کر بیٹھ گئے۔ پانچ سکوں کے عوض لوگ دوربین میں جھانک کر عورت کو ہاتھ بھر فاصلے پر بیٹھا دیکھ سکتے تھے۔ "سائنس نے فاصلے مٹا دیے ہیں،" ملکیادیس نے اعلان کیا۔ "بہت جلد کوئی بھی شخص گھر بیٹھے دیکھ سکے گا کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کیا ہو رہا ہے۔" دوپہر کے جلتے سورج نے محدب عدسے کے ساتھ ایک حیرت انگیز تماشا کیا۔ انھوں نے گلی کے بیچ خشک گھاس کی ایک ڈھیری لگائی اور شعاعوں کو مرتکز کر کے اس میں آگ بھڑکا دی۔ خوزے آرکادیو بوئندیا کو، جس کی اپنے مقناطیسوں کی ناکامی کے بعد سے اب تک دل جوئی نہ ہو سکی تھی، عدسے کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ملکیادیس نے ایک بار پھر اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن بالآخر دو مقناطیسی ڈلوں اور نو آبادیاتی زمانے کے تین سکوں کے عوض خوزے آرکادیو بوئندیا کو محدب عدسہ دے دیا۔ اُرسلا پریشانی سے رو دی۔ وہ پیسے سونے کے سکوں سے بھرے صندوق سے نکالے گئے تھے جو اس کے باپ نے عمر بھر روکھی سوکھی کھا کر جوڑے تھے اور جو اُرسلا نے کسی مناسب وقت پر استعمال میں لانے کے لیے پلنگ کے نیچے زمین میں دبا رکھے تھے۔ خوزے آرکادیو بوئندیا نے اُرسلا کو تسلی دینے کی کوئی کوشش نہ کی، اور کسی سائنس دان کی سی نفس کُشی کے ساتھ، خود اپنی سلامتی کی بھی پروا کیے بغیر حربی تجربات میں محو ہو گیا۔ دشمنوں کی فوج پر عدسے کے اثرات کے مظاہرے کی ایک کوشش میں وہ سورج کی شعاعوں کے ارتکاز کا خود شکار ہو کر

اپنا جسم کئی جگہ سے جلا بیٹھا، اور ان زخموں کے بھرنے میں طویل عرصہ لگا۔ بیوی کے احتجاج پر، جس کو اس خطرناک ایجاد پر بے حد تشویش تھی، ایک موقعے پر خوزے آرکادیو بوئندیا جھنجھلا کر گھر کو آگ دکھانے لگا تھا۔ وہ مسلسل کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے میں بند اس انوکھے ہتھیار کے حربی امکانات کا جائزہ لیتا رہتا، یہاں تک کہ وہ ایک ایسا ہدایت نامہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا جو حیرت انگیز طور پر ابلاغی صراحت اور ناقابل تعرض یقین کامل کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ یہ کتابچہ اس نے اپنے لاتعداد تجربوں کی تفصیلات اور خاکوں کے ساتھ نتھی کر کے، ایک قاصد کے ہاتھ حکومت کو روانہ کیا جو پہاڑوں کو عبور کرتا، لامتناہی دلدلوں میں گم ہوتا، سرکش دریاؤں کو پار کرتا، وباؤں، خونخوار جانوروں اور ناامیدیوں سے قریب المرگ تھا کہ اس نے ایک ایسا راستا پا لیا جسے ڈاک لے جانے والے خچر استعمال کیا کرتے تھے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ دارالحکومت تک پہنچ ناممکن حد تک مشکل تھا، خوزے آرکادیو بوئندیا نے ٹھان لی کہ جیسے ہی حکومت اسے فوج کے سامنے اس ایجاد کا عملی ثبوت دینے اور فوجیوں کو پیچیدہ شمسی جنگ کے رموز سکھانے کا حکم دے گی، وہ اس مہم پر نکل کھڑا ہو گا۔ کئی سال تک اس نے جواب کا انتظار کیا۔ آخرکار انتظار سے تھک کر اس نے ملکیادیس کے سامنے اپنے منصوبوں کی ناکامی کا رونا رویا، خانہ بدوش نے دیانت داری کا مسحور کن ثبوت دیتے ہوئے محدب عدسہ واپس لے کر خوزے آرکادیو بوئندیا کو مقناطیسی ڈلے لوٹا دیے اور اس کے ساتھ کچھ پرتگالی نقشے اور جہازرانی کے چند آلات بھی اس کے پاس چھوڑ دیے۔ اس نے راہب ہرمن کی تحقیقات کا مختصر خلاصہ خود تحریر کر کے خوزے آرکادیو کو دیا تاکہ وہ اسطرلاب، قطب نما اور زاویہ پیما کو کام میں لا سکے۔ خوزے آرکادیو بوئندیا نے برسات کے طویل ماہ اس چھوٹے سے کمرے میں بند ہو کر تجربات کرنے میں گزار دیے جسے اس نے مکان کے عقب میں تعمیر کیا تھا تاکہ کوئی اس کے تجربات میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ اپنی خانگی ذمہ داریوں سے یکسر بے نیاز ہو کر، وہ تمام رات صحن میں بیٹھا ستاروں کی چالیں دیکھا کرتا، اور دوپہر کے درست وقت کا تعین کرنے کے چکر میں اسے لو لگتے لگتے بچی۔ جب وہ اپنے آلات کے استعمال میں طاق ہو گیا تو اس کے ذہن میں خلا کا ایسا تصور آیا جس کی مدد سے وہ اپنے کتب خانے سے نکلے بغیر انجانے سمندروں کا سفر، غیرآباد خطوں کی سیر اور شاندار ہستیوں سے تعلق قائم کر سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب اس نے خود سے باتیں کرنے اور گھر میں کسی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر چلنے کی عادتیں اپنا لی تھیں۔ اس دوران اُرسلا اور بچوں کی، باغ میں کیلے اور کلادیئم، شکرقند، اروی اور بینگن اُگا اُگا کر، کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ پھر اچانک کسی اطلاع کے بغیر، خوزے آرکادیو بوئندیا کی بدحواس سرگرمی کی جگہ ایک فسوں کی سی کیفیت نے لے لی۔ اس نے کئی دن یوں گزارے جیسے کسی سحر میں ہو، اپنی سمجھ پر اعتبار کیے بغیر وہ سرگوشیوں میں خوفناک قیاسات بڑبڑاتا رہتا۔ بالآخر دسمبر کے مہینے میں، منگل کے روز، دوپہر کے کھانے کے وقت، اس نے اپنی اذیت کا تمام بوجھ اچانک اتار پھینکا۔ بچے اپنے باپ کی، جو طویل بے خوابی اور اپنے تخیل کے قہر سے تباہ ہو چکا تھا، اس جلیل القدر متانت کو عمر بھر یاد رکھنے والے تھے جس کے ساتھ اس نے اپنی دریافت ان پر

منکشف کی:

"دنیا گول ہے نارنگی کی طرح۔"

ارسلا سے ضبط نہ ہو سکا۔ "اگر تم کو پاگل ہونا ہی ہے تو براہِ کرم صرف خود پاگل ہو" وہ چلائی، "اپنے خانہ بدوشوں کے سے خیالات بچوں کے سروں میں نہ گھساؤ۔" بےحس خوزے آرکادیو بوئندیا اپنی بیوی کی مایوسی سے خوفزدہ نہ ہوا، جس نے طیش میں آ کر اسطرلاب فرش پر دے مارا۔ اس نے اسطرلاب دوبارہ بنا لیا، گاؤں کے مردوں کو تنگ کمرے میں جمع کیا اور ایسے نظریات کی مدد سے، جنہیں کوئی نہ سمجھ سکا، اس امکان کو ثابت کرنے میں لگ گیا کہ مسلسل مشرق کی سمت سفر کرنے پر کوئی بھی شخص اسی جگہ واپس پہنچ سکتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا ہو۔ گاؤں بھر کو یقین ہو چلا تھا کہ خوزے آرکادیو بوئندیا کا دماغ چل گیا ہے۔ تب ملکیادیس نے آ کر معاملہ سلجھایا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اس شخص کی ذہانت کو سراہا جس نے حاسّتاً علم ہیئت کے قیاس پر مبنی ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو پہلے ہی عملی طور پر ثابت کیا جا چکا تھا گو کہ ماکوندو میں اب تک کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ تحسین کے ثبوت طور پر اس نے خوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک ایسا تحفہ دیا جو گاؤں کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالنے والا تھا، ایک کیمیاگر کی تجربہ گاہ۔

تب تک ملکیادیس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بوڑھا ہو گیا تھا۔ ابتدائی پھیروں میں وہ خوزے آرکادیو بوئندیا کا ہم عمر نظر آتا تھا۔ لیکن جبکہ موخرالذکر نے اپنی غیرمعمولی قوت کو برقرار رکھا تھا، جس کے ذریعے وہ گھوڑے کو کانوں سے پکڑ کر روک سکتا تھا، خانہ بدوش لگتا تھا کسی بیماری سے اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہے۔ درحقیقت اس کی یہ حالت ان متعدد اور غیرمعمولی بیماریوں کی وجہ سے ہوا تھی جن کا وہ دنیا کے گرد بےشمار چکر لگاتے ہوئے شکار ہو چکا تھا۔ جیسا کہ تجربہ گاہ میں آلات ترتیب سے رکھنے میں خوزے آرکادیو بوئندیا کی مدد کرتے وقت بات چیت کے دوران خود اس نے کہا، موت اس کے تعاقب میں تھی، اس کے پائنچوں کو سونگھتی پھرتی، مگر ابھی تک اس پر گرفت کا فیصلہ نہ کر پاتی۔ ملکیادیس ان تمام طاعونوں اور ناگہانی آفتوں سے بچ کر آیا تھا جو نوعِ انسان پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ وہ فارس میں پیلاگرا، ملایا کے جزائر میں اسقربوط، اسکندریہ میں کوڑھ، جاپان میں بیری بیری، مدغاسکر میں گلٹی دار طاعون، سسلی میں زلزلے اور آبنائے ماگیلان میں سمندری طوفان سے بچ نکلا تھا۔ ملکیادیس ایک دل گیر شخص تھا، اداسی کے ہالے میں گھرا ہوا ایک ایسا انوکھا بشر جس کے پاس کہا جاتا تھا ناستراداموس کی پیش گوئیوں کی شرحیں تھیں، ایک ایسی نگاہ کا حامل جو اشیا کے پار دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک بڑا سا کالا ہیٹ پہنے رہتا جو بڑے بڑے پر پھیلائے پہاڑی کوے کی مانند لگتا، اور ایک مخملی واسکٹ جس پر صدیوں کی چکنی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے علم و فراست، اور اس کی پُراسرار وسعتِ نگاہ کے باوجود، اس کا ایک انسانی وجود تھا، ایک بوجھ، ایک دنیاوی کیفیت، جو اس کو روزمرّہ کے مسائل میں الجھائے رکھتی۔ وہ ضعیفی میں لاحق ہونے والی بیماریوں کا رونا روتا، اور معمولی پریشانیوں سے دوچار رہتا۔ ہنسنا وہ ایک عرصہ ہوا ترک کر چکا تھا کیونکہ اس کے دانت اسقربوط کی بیماری میں گر گئے تھے۔ اس حبس زدہ دوپہر کو، جب خانہ بدوش اپنے راز اس پر آشکار کر

رہا تھا، خوزے آرکادیو بوئندیا کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان دونوں کے درمیان ایک عظیم دوستی کا آغاز ہو رہا ہے۔ بچے اس کی عجیب وغریب داستانیں حیرت زدہ ہو کر سن رہے تھے۔ اوریلیانو، جو اس وقت پانچ سال سے زیادہ کا نہ ہو گا، زندگی بھر ملکیادیس کو اسی طرح یاد رکھنے والا تھا جیسا اس نے اس دوپہر کو دیکھا تھا، دھات کی سی چمکیلی اور مُرتعش روشنی میں بیٹھا تخیّل کی تاریک ترین گپھاؤں کو اپنی بھاری گونج دار آواز سے روشن کرتا ہوا، جبکہ گرمی کی حدّت سے اس کی کنپٹیوں پر چکنائی پگھل کر بہہ رہی تھی۔ خوزے آرکادیو اس کا بڑا بھائی، اس زبردست لمحے کا نقش موروثی یاد کا حصّہ بنا کر اپنی آل اولاد کے لیے چھوڑ جانے والا تھا۔ البتہ ارسلا کے لیے ملکیادیس کی اس ملاقات کی ناخوشگوار یاد باقی رہی کیونکہ جس لمحے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، ملکیادیس نے بےاحتیاطی سے پارے کا فلاسک توڑا تھا۔

"اس میں سے شیطانی بُو آ رہی ہے،" ارسلا نے کہا۔

"ہرگز نہیں،" ملکیادیس نے اس کی اصلاح کی۔ "یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ شیطان میں گندھک کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پارہ تو محض جوہر ہے۔"

ہمیشہ کی طرح پندآمیز ملکیادیس ارسلا کو شنگرف کی شیطانی خصوصیات پر لیکچر دینے لگا۔ ارسلا نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی، اور بچوں کو لے کر عبادت کے لیے چلی گئی۔ اس کاٹنے والی تیز بُو کو اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ملکیادیس کی یاد سے وابستہ ہو جانا تھا۔

وہ ابتدائی تجربہ گاہ، طرح طرح کے برتنوں، کُپّیوں، مقاطیر اور چھلنیوں کے علاوہ پانی کی ایک بھدّی سی نلکی، پتلی لمبی گردن والے کانچ کے پیالے، پارس پتھر کی ایک نقل اور مریم یہودن کے تین بازوؤں والے انبیق پر مشتمل تھی جسے خانہ بدوشوں نے جدید تفصیلات کی روشنی میں بنایا تھا۔ ان اشیا کے ساتھ، ملکیادیس سات سیّاروں سے مطابقت رکھنے والی سات دھاتوں کے نمونے، سونے کی مقدار دگنی کرنے والے موسیٰ اور زوسیمس کے نسخے، جن تشریحات اور خاکوں سے مرصّع ان عظیم تعلیمات پر مبنی ایک جامع کلّیات، ان لوگوں کے لیے چھوڑ گیا تھا جو ان کی تفسیر کی صلاحیت رکھتے ہوں اور پارس پتھر تیار کرنے کا بیڑا اٹھا سکیں۔ سونے کی مقدار دگنی کرنے کے اس نسخے کے جھانسے میں آ کر خوزے آرکادیو بوئندیا ہفتوں ارسلا کی طرف ملتفت رہا، تاکہ وہ زمین میں دبائے ہوئے سونے کے سکے نکالنے دے اور وہ ان کو اتنی دفعہ دگنا کر سکے جتنا کہ پارے کو تقسیم در تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ارسلا ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اپنے شوہر کی اٹل ضد کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ اور پھر خوزے آرکادیو بوئندیا نے تین سکوں کو ایک کڑھائی میں ڈالا، ان کو تانبے کے ذرّات، زرنیخ، گندھک اور جست کے ساتھ پگھلایا، اور پھر اس آمیزے کو ارنڈی کے تیل میں اُبلنے کو رکھ دیا، یہاں تک کہ وہ ایک گاڑھے، طاعونی سیّال میں بدل گیا، جو سونے سے زیادہ عام سا شکر کا شیرہ معلوم ہوتا تھا۔ ارسلا کو ورثے میں ملا ہوا قیمتی اثاثہ ان پُرخطر اور سخت مراحل سے گزرنے، سات سیّاروں کی دھاتوں کے ساتھ پگھلنے، ہوابند پارے اور جوہر نمک کے ساتھ ملائے جانے اور خنزیر کے تیل میں پکنے کے بعد (کہ مُولی کا تیل اس وقت دستیاب نہ تھا) سوز کر نہیں

ہوئی خستہ کھال کے ایک بڑے سے ٹکڑے میں تبدیل ہو گیا جو کڑھائی کے پیندے سے مضبوطی کے ساتھ چپک گیا تھا۔

جب خانہ بدوش واپس آئے تو ارسلا پورے گاؤں کو ان کے خلاف کر چکی تھی۔ لیکن تجسس خوف پر غالب آیا، کیونکہ اس دفعہ خانہ بدوش طرح طرح کے ساز بجاتے گاؤں میں گھوم رہے تھے، گاؤں پکار آواز سنائی دیتی تھی اور ایک نقارچی ناسیانزینز کی سب سے حیران کن ایجاد کے مظاہرے کا اعلان کر رہا تھا۔ لہذا ہر شخص خیمے کی طرف چل پڑا اور ایک ایک سکّہ دے کر جوان ملکیادیس کا دیدار کرنے لگا، جس کی جھریاں غائب ہو چکی تھیں اور نئے سفید دانت چمچما رہے تھے۔ جن لوگوں کو ملکیادیس کے اسقربوط سے گلے ہوئے مسوڑھے، اندر کو پچکے ہوئے گال اور پھٹے ہوئے ہونٹ یاد تھے، خانہ بدوش کی مافوق الفطرت قوت کا مظاہرہ دیکھ کر خوف سے کانپنے لگے اور وہ خوف اس وقت شدید ہراس میں بدل گیا جب ملکیادیس نے اپنی بتیسی ایک لمحے کے لیے نکال کر دکھائی — وہ لمحہ جس میں ملکیادیس دوبارہ وہی پیر فرتوت بن گیا — اور پھر کھول کر اسے پھر سے جمایا، اور اعادۂ شباب کے پورے اعتماد کے ساتھ مسکرایا۔ خوزے آرکادیو بوئندیا تک نے یہ سوچا کہ ملکیادیس کا علم اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن جب ملکیادیس نے اسے نقلی دانتوں کے بارے میں سمجھایا تو خوزے آرکادیو بوئندیا پر ایک مثبت جوش کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ بات اس کو اتنی معمولی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی انوکھی لگی کہ راتوں رات وہ کیمیاگری سے اپنی تمام تر دلچسپی کھو بیٹھا۔ وہ بدمزاجی کے ایک نئے بحران سے گزرا۔ اس نے وقت پر کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تمام دن وہ گھر میں ٹہلا کرتا۔ "دنیا میں ناقابلِ یقین چیزیں ہو رہی ہیں،" اس نے ارسلا سے کہا، "دریا کے اُس پار ہر طرح کے طلسمی آلات موجود ہیں، اور ہم یہاں گدھوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔" جو لوگ خوزے آرکادیو بوئندیا کو ماکوندو کی بنیاد پڑنے کے وقت سے دیکھتے چلے آئے تھے، وہ حیران رہ گئے کہ وہ ملکیادیس کے اثر میں آ کر کتنا بدل گیا ہے۔

ابتدا میں خوزے آرکادیو بوئندیا گھر کا پُرشباب سربراہ تھا جو کاشت کاری کی ہدایتیں جاری کرتا، بچوں کی پرورش اور جانوروں کی افزائشِ نسل کے بارے میں مشورے دیتا، اور سب کے ساتھ مل کر ہر طرح کے کام کرتا یہاں تک کہ گاؤں کی بہبود کے لیے جسمانی مشقت میں بھی لوگوں کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کا گھر شروع ہی سے گاؤں کا بہترین گھر تھا لہذا دوسرے گھر اسی طور پر بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں ایک چھوٹی سی روشن بیٹھک تھی، چبوترے پر کھانے کا کمرہ بنایا گیا تھا جس میں خوش رنگ پھول تھے، دو خواب گاہیں تھیں، ایک آنگن جس میں شاہ بلوط کا ایک دیوقامت درخت تھا، ایک صاف ستھرا باغیچہ، اور ایک باڑا جہاں بکریاں، سؤر اور مرغیاں پرسکون سنگت میں رہتی تھیں۔ صرف لڑاکا مرغ ہی ایک ایسا جانور تھا جس کا نہ صرف اس گھر میں بلکہ پوری آبادی میں داخلہ ممنوع تھا۔

ارسلا کام کرنے کی اسی ہی استعداد رکھتی تھی جتنی اس کا شوہر۔ وہ پھرتیلی، چھوٹی سی، سخت گیر، مضبوط اعصاب والی عورت، جس کو آج تک کسی نے گنگناتے نہ سنا تھا، پوپھٹنے سے رات گئے تک اپنی سخت کلف دار پیٹی کوٹ کی نرم سرگوشیوں کے ساتھ ہر جگہ

دکھائی دیتی۔ اسی کی بدولت کُٹ ہوا کچّا فرش، مٹی کی دیواریں، لکڑی کا پرانا فرنیچر، جو انھوں نے خود بنایا تھا، ہمیشہ صاف ستھرا رہتا، اور پرانی الماریوں کے خانوں میں، جہاں وہ اپنے کپڑے رکھتے تھے، کالی تُلسی کی گرم مہک اٹھا کرتی۔

خوزے آرکادیو بوئندیا نے، جو گاؤں کا سب سے زیادہ پُرعزم مرد تھا، بستی کے تمام گھر ایسے وقوع پر بنائے تھے کہ ہر گھر سے یکساں محنت کے ساتھ دریا پر جا کر پانی لایا جا سکتا تھا اور گلیوں کی ترتیب ایسی سوجھ بوجھ سے رکھی تھی کہ کسی گھر کو دوسرے گھر سے زیادہ دھوپ کی حدّت نہ پہنچتی۔ چند ہی برسوں میں ماکوندو جیسا باترتیب اور محنتی گاؤں اس کی تین سو کی آبادی میں سے کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ حقیقتاً ایک ایسا خوش وخرم گاؤں تھا جہاں کوئی تیس سال سے زیادہ کا نہ تھا، اور جہاں کوئی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔

گاؤں کی بنیاد پڑنے کے زمانے ہی سے خوزے آرکادیو بوئندیا نے پنجرے اور دام بنائے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں نہ صرف اس نے اپنے گھر کو، بلکہ گاؤں کے ہر گھر کو مینوں، بلبلوں اور خوش رنگ کلغی دار پرندوں سے بھر دیا۔ انواع واقسام کے پرندوں کی چہچہاہٹیں اور نغمے ارسلا کو اتنا پریشان کرتے کہ وہ اپنے کانوں میں موم ڈال لیتی کہ کہیں شور سے پاگل نہ ہو جائے۔ جب ملکیادیس کا قبیلہ پہلی دفعہ سردرد کے علاج کے لیے شیشے کی گولیاں بیچتا گاؤں پہنچا تھا تو سب کو حیرت ہوئی تھی کہ انھیں خوابیدہ دلدلوں میں گم یہ گاؤں کیونکر ملا، اور خانہ بدوشوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ پرندوں کے نغموں کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے ہیں۔

اجتماعی پیش قدمی کا یہ جذبہ جلد ہی غائب ہو گیا مقناطیس کی ذُھن، علمِ نجوم کے حساب کتاب، کیمیاگری کے خوابوں اور دنیا کے نوادرات دریافت کرنے کی تمنا نے اس رویے کو پس پشت ڈال دیا۔ ایک صاف ستھرے، چاق و چوبند انسان سے، خوزے آرکادیو بوئندیا ایک کاہل الوجود، لباس کے معاملے میں بےپروا شخص میں تبدیل ہو گیا جس کی وحشیانہ ڈاڑھی ارسلا بڑی کوششوں اور باورچی خانے کی چھُری کی مدد سے تراشتی۔ کئی لوگ اسے آسیب کا شکار سمجھتے۔ لیکن وہ لوگ بھی جنھیں اس کے پاگل پن کا یقین ہو چکا تھا، اپنے کام کاج اور گھربار چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے، جب وہ اوزار سنبھالتا ہوا نکلا، اور لوگوں سے ایک ایسی راہ کھولنے کے لیے کہا جس کے ذریعے ماکوندو کی رسائی دنیا کی عظیم ایجادات تک ہو سکے۔

خوزے آرکادیو بوئندیا خطے کے جغرافیے سے قطعی نابلد تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ مشرق میں سنگلاخ پہاڑی سلسلہ ہے اور پہاڑوں کے دوسری طرف ریوہاچا کا قدیم شہر، جہاں، اس کے دادا اوریلیانو بوئندیا اوّل کے بقول، سر فرانسس ڈریک نے توپوں سے مگرمچھوں کا شکار کیا تھا، اور پھر ان کے ٹکڑے اکٹھا کر کے اور ان میں بھُس بھروا کے ملکہ الزبتھ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ جوانی میں خوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے آدمیوں نے بیوی بچوں، مویشیوں اور ساز وسامان کے ساتھ ان پہاڑوں کو عبور کیا تھا تاکہ سمندر تک نکلنے والی راہ کا پتا لگا سکیں اور چھبیس ماہ کے بعد اس مہم کو خیرباد کہہ کر

ماکوندو کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ انہیں واپس نہ جانا پڑے۔ لہذا وہ ایک ایسا راستا تھا جس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی جو صرف ماضی کو جاتا تھا۔ جنوب میں دلدل تھی، جو دائمی خودرو نباتاتی کیچڑ سے ڈھکی ہوئی تھی، اور دلدلی سلسلے کی وسیع کائنات تھی۔ جس کی، خانہ بدوشوں کے بقول، کوئی حدیں نہ تھیں۔ مغرب کی سمت وہ وسیع دلدل ایک لامتناہی آبی سلسلے سے جا ملتی تھی جہاں نرم جلد والی، دودھ پلانے والی مچھلیاں تھیں، جن کے سر اور دھڑ عورتوں کے سے تھے اور جن کے غیرمعمولی پستانوں کی کشش ملاحوں کو برباد کر دیتی تھی۔ خانہ بدوش زمین کے اس ٹکڑے تک پہنچنے سے پہلے، جہاں سے ڈاک لے جانے والے خچر گزر کرتے تھے، اس دلدلی راستے پر چھ ماہ تک کشتیوں میں رواں رہے تھے۔ خوزے آرکادیو بوئندیا کے حساب کے مطابق تہذیب سے اتصال کا راستا شمال کی سمت سے نکل سکتا تھا۔ بہ اس نے زمین صاف کرنے کے اوزار اور شکار کرنے کے ہتھیار ان لوگوں کو تھمائے جو ماکوندو بساتے وقت اس کے ساتھ تھے، قطب نما اور نقشے اپنے تھیلے میں ڈالے، اور اس پُرخطر مہم پر نکل پڑا۔

پہلے چند روز نہیں کوئی مشکل نہ پیش آئی۔ وہ دریا کے پتھریلے کنارے کے ساتھ ساتھ اس جگہ تک اترتے چلے گئے جہاں انہیں برسوں پہلے سپاہی کا زرہ بکتر ملا تھا، اور وہاں سے جنگلی نارنگی کے درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی سے گزر کر بن میں داخل ہو گئے۔ پہلے ہفتے کے اختتام پر انہوں نے ایک ہرن شکار کر کے بھونا، لیکن وہ اس بات پر متفق ہوئے کہ اس کا آدھا حصہ ہی کھایا جائے اور باقی نمک لگا کر آئندہ کے لیے رکھ لیا جائے۔ اس تیاری کے ذریعے انہوں نے کوشش کی کہ مکاؤوں کو پکڑ کر نہ کھانا پڑے، جن کا نیلا گوشت سخت اور بدمزہ ہوتا تھا۔ پھر دس دن سے زیادہ عرصے تک انہوں نے سورج نہ دیکھا۔ زمین آتش فشاں کی راکھ کی طرح نرم اور گیلی ہوتی گئی، نباتات دبیزتر اور پرندوں کی چیخیں اور بندروں کا شور دورتر ہوتا گیا اور کائنات پر دائمی اداسی چھا گئی۔ اپنے جوتے کھولتے ہوئے تیل کے جوہڑوں میں دھنساتے کلہاڑیوں سے خون رنگ سوسن کے پھولوں کو کاٹتے اور سنہرے سلامندر مارتے ہوئے، مہم کے لوگ اس نم اور ساکت جنت کے اندر قدیم یادوں میں ڈوبتے چلے گئے وہ یادیں جو گناہ آدم کے وقت سے بھی پرے کی تھیں۔ ایک ہفتے تک، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر خوابناک کیفیت میں سرشار، نیند میں چلنے والوں کی مانند، وہ اس غمگین کائنات میں اترتے چلے گئے، وہ کائنات جو صرف جگمگاتے ہوئے کیڑوں کی لطیف پرچھائیوں سے روشن تھی، اور ان کے پھیپھڑے خون کی دم گھونٹنے والی بو سے پھٹنے لگے۔ وہ واپس نہ جا سکتے تھے کیونکہ وہ جو راستہ کھولتے جلد ہی نباتات دوبارہ اگنے سے بند ہونے لگتا، وہ نباتات جو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اگ آتی تھیں۔ "ٹھیک ہے،" خوزے آرکادیو بوئندیا کہتا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہم سمت نہ بھول جائیں۔" قطب نما کی مدد سے وہ اپنے آدمیوں کو ان دیکھے شمال کی جانب راستا دکھاتا رہا تاکہ وہ اس پُرطلسم خطے سے نکل سکیں۔ وہ ایک گہری رات تھی، بےستارہ لیکن اندھیرا تازہ اور صاف ہوا سے بارور ہوتا جا رہا تھا۔ طویل مسافت کی تھکن سے چُور انہوں نے اپنی اپنی جھولیاں درختوں کے تنوں سے تانیں اور دو ہفتوں کے مسلسل سفر کے بعد گہری نیند سوئے۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو سورج آسمان

پر چمک رہا تھا۔ منظر کے فسوں نے انہیں گنگ کر دیا۔ ان کے سامنے فرن اور کھجور کے درختوں میں گھرا، صبح کی روشنی میں سفید اور سفوف کی طرح بھربھرایا ہوا ایک بڑا سا قدیم ہسپانوی جہاز، دائیں رخ پر ہلکا سا جھک ہوا کھڑا تھا۔ اس کے مستولوں پر بادبان کے چیتھڑے جھول رہے تھے۔ جہاز کے رسّے گیاہ سے مزیّن تھے، اور اس کا پیندا نرم کائی اور پتھرائی ہوئی سیپ مچھلیوں سے پٹا ہوا، مضبوطی سے پتھریلی زمین پر جما کھڑا تھا۔ تمام ڈھانچہ یوں لگتا تھا جیسے اپنی مخصوص جگہ گھیرے ہوئے ہو، جو تنہائی اور گمنامی کی دنیا تھی، وقت کی تباہ کاری اور پرندوں کی دست بُرد سے محفوظ۔ جہاز کے اندرونی حصے میں جس کا مہم کے ارکان نے احتیاط کے ساتھ جائزہ لیا، پھولوں کے ایک گھنے جنگل کے سوا کچھ نہ نکلا۔

جہاز کی دریافت نے، جو سمندر کے نزدیک ہونے کی نشان دہی کرتی تھی، خوزے آرکادیو بوئندیا کی ہمت توڑ دی۔ وہ اسے اپنی متلوّن مزاج قسمت کی ایک چال سمجھا، کہ وہ سمندر جس کو وہ بارہا قربانیوں اور دشواریوں کے باوجود تلاش نہ کر پایا تھا، اب اچانک، کسی تلاش کے بغیر، ایک ناقابل تسخیر شے کی طرح اس کے راستے میں حائل تھا۔ بہت برسوں بعد، جب وہ خطہ ڈاک کی باقاعدہ ترسیل کے راستے کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا، اسے ایک بار پھر کرنل اوریلیانو بوئندیا نے عبور کیا اور اسے جہاز کا صرف جلا ہوا ڈھانچا الیوں کے کھیت میں نظر آیا۔ اس وقت جب اسے یقین ہو گیا کہ باپ کی سنائی ہوئی کہانی اس کے ذہن کی اختراع نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھی، اس کو تعجب ہوا کہ جہاز خشکی کے اس حصے میں کس طرح آ کر پھنسا ہو گا۔ لیکن خوزے آرکادیو بوئندیا کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جہاز کو پیچھے چھوڑ کر، مزید چار دن کے سفر کے بعد، جب اس نے راکھ کے رنگ کا گندا، جھاگ اڑاتا سمندر دیکھا تو اس کے سارے خواب ڈھے گئے۔ وہ سمندر اتنی قربانیوں اور مہم جوئیوں کے قابل نہ تھا۔

"خدا غارت کرے!" وہ چلایا، "ماکوندو چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔"

جزیرہ نما ماکوندو کا خیال جو خوزے آرکادیو بوئندیا کے بنائے ہوئے بےطور، بےڈھنگے نقشے کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا، طویل عرصے تک قائم رہا۔ وہ نقشہ اس نے مہم سے واپسی پر طیش میں آ کر بنایا تھا، بدنیتی سے راستے کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر، گویا خود کو اس بات کی سزا دے رہا ہو کہ اس نے عقل سے کس قدر بالاتر ہو کر وہ جگہ چنی تھی۔ "ہم کہیں نہیں پہنچ سکتے،" اس نے ارسلا سے واویلا کیا "ہم یہیں سڑ کر مر جائیں گے، سائنس کے فائدے اٹھائے بغیر۔" یہ یقین، جس پر تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیے جانے والے تنگ کمرے میں بند خوزے آرکادیو بوئندیا بہت دنوں تک سوچ بچار کرتا رہا، ماکوندو کو کسی بہتر مقام پر منتقل کرنے کے منصوبے کا سبب بنا۔ اس وقت تک ارسلا کو اس ہذیانی منصوبے کی ہوا لگ چکی تھی۔ ایک چیونٹی کی سی رازداری اور مشقت کے ساتھ، اس نے گاؤں کی عورتوں کو اپنے شوہروں کی متلوّن مزاجی کی مخالفت پر مائل کر لیا تھا، جو منتقلی کی تیاریوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ خوزے آرکادیو بوئندیا کو معلوم نہ ہوا کہ کس لمحے یا کن مخالف قوتوں کے سبب، اس کا منصوبہ عذر، ٹال مٹول، ناامیدیوں اور حیلہ سازیوں کے جالوں میں لپٹ کر ایک

قریب میں بدل گیا۔ ارسلا نے ایک معصوم توجہ کے ساتھ اس پر نظر رکھی، بلکہ اس صبح جب وہ نقل مکانی کے بارے میں بڑبڑاتا ہوا عقبی کمرے میں تجربہ گاہ کا سامان ڈبوں میں رکھ رہا تھا، ارسلا کو اس پر ترس بھی آیا۔ لیکن اس نے خوزے آرکادیو بوئندیا کو یہ کام ختم کرنے دیا، اور کچھ کہے بغیر اسے ڈبے بند کر کے ان میں کیلیں ٹھونکتے اور سیاہی میں برش ڈبو کر پتے نام لکھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ خوزے آرکادیو بوئندیا کو معلوم ہے (کیونکہ ارسلا نے اسے خود سے دھیمی دھیمی سرگوشیاں کرتے سن لیا تھا) کہ گاؤں کے لوگ اس مہم میں اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ البتہ جب خوزے آرکادیو بوئندیا کمرے کا دروازہ اکھاڑنے لگا تو ارسلا نے ہمت کر کے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس نے کسی قدر تلخی کے ساتھ جواب دیا۔ "چونکہ کوئی ہمارا ساتھ دینے کو تیار نہیں، لہٰذا ہم لوگ اکیلے ہی جائیں گے۔" ارسلا پریشان نہ ہوئی۔

"ہم نہیں جائیں گے،" اس نے کہا، "کیونکہ ہمارا بیٹا یہاں پیدا ہوا تھا۔"

"یہاں ابھی تک ہم میں سے کوئی نہیں مرا ہے۔ جب تک کسی جگہ کوئی اپنا دفن نہ ہو وہ جگہ اپنی نہیں ہوتی۔"

ارسلا نے ایک نرم استقامت سے جواب دیا، "اگر ہم سب لوگوں کے یہاں ٹھہرنے کی خاطر مجھے مرنا پڑا تو میں مر جاؤں گی۔"

خوزے آرکادیو بوئندیا نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اس کی بیوی عزم کی اتنی پکی ہے۔ اس نے ارسلا کو اپنے پرکشش تخیلات سے لبھانے کی کوشش کی۔ ایک سحرکی دنیا کا وعدہ کیا جہاں انسان کی جب خواہش ہوتی اسے صرف زمین پر ایک طلسم چھڑکنا ہوتا اور درخت پھل دینے لگتے۔ جہاں درد رفع کرنے کے لیے انواع واقسام کے آلات سستی قیمت پر دستیاب ہوتے۔ لیکن ارسلا اس کی بصیرت سے قطعی متاثر نہ ہوئی۔

"بجائے اس کے کہ تم اپنی احمقانہ ایجادات کے بارے میں سوچتے رہو، تمہیں اپنے لڑکوں کی فکر کرنی چاہیے،" ارسلا نے کہا۔ "دیکھو وہ کس حالت میں ہیں۔ گدھوں کی طرح وحشی بنتے جا رہے ہیں۔"

خوزے آرکادیو بوئندیا نے اپنی بیوی کی بات کو لفظاً لیا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ بچے دھوپ میں ننگے پاؤں باغ میں دوڑتے پھر رہے تھے، اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے بچے اسی لمحے، جب کہ ارسلا کے جادو پھونکنے سے وجود میں آئے ہوں۔ خوزے آرکادیو بوئندیا کے اندر ہی اندر کچھ ہوا، کوئی قطعی اور پراسرار کیفیت جو اسے اس کے اپنے زمانے سے اکھاڑ کر یادوں کے نامعلوم گوشوں میں لے گئی۔ ارسلا نے جھاڑو دینا جاری رکھا۔ اس گھر میں جو اب خالی چھوڑ دیے جانے کے خطرے کی زد سے باہر آ چکا تھا۔ خوزے آرکادیو بوئندیا خیالوں میں گم کھڑا بچوں کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کی نمی صاف کی، اور تسلیم ورضا کا ایک گہرا سانس کھینچا۔

"ٹھیک ہے،" خوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا، "لڑکوں سے کہو ڈبوں سے سامان نکلوانے میں میری مدد کریں۔"

سب سے بڑا لڑکا خوزے آرکادیو، چودہ سال کا تھا۔ اس کا سر چوکور، بال گھنے اور

فطرت باپ کی سی تھی۔ گو کہ اس کی قوت اور جسمانی نشوونما کی رفتار باپ پر گئی تھی، یہ بات ابتدا ہی سے واضح تھی کہ اس میں تخیل کی کمی ہے۔ وہ ماکوندو بسانے سے پہلے دشوارگزار پہاڑوں کو عبور کرنے کے دوران پیٹ میں آیا اور پیدا ہوا تھا، اور اس کے والدین نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کے خدوخال جانوروں جیسے نہ تھے۔ اوریلیانو، جو ماکوندو میں پیدا ہونے والا پہلا انسان تھا، مارچ میں چھ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع اور اپنے آپ میں گم بچہ تھا۔ وہ ماں کے پیٹ میں رویا تھا، اور پیدائش کے وقت اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جب نال کاٹی جا رہی تھی تو اس نے اپنا سر ادھر اُدھر گھما کر گردوپیش کا جائزہ لیا تھا، اور کمرے میں موجود چیزوں اور چہروں کا بےخوف تجسس کے ساتھ معائنہ کیا تھا۔ اور پھر ان لوگوں سے لاتعلق، جو اسے قریب سے دیکھنے آئے، کھجور کی چھال کی سی چھت کو تکتا رہا تھا جو لگتا تھا مسلسل بارش کے دباؤ سے کسی وقت بھی ڈھے سکتی ہے۔ ارسلا کو بچے کی نگاہ کی شدت اس لمحے تک یاد نہ آئی جب تین سالہ اوریلیانو باورچی خانے میں داخل ہوا، جس وقت وہ ابلتے ہوئے سوپ کو چولھے سے اتار کر میز پر رکھ رہی تھی۔ باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑے بچے نے متحیر ہو کر کہا تھا، 'سوپ گرنے والا ہے۔' سوپ کا برتن، حفاظت سے میز کے بیچوں بیچ رکھا تھا، لیکن بچے کے منہ سے یہ لفظ نکلتے ہی میز کے کنارے کی جانب حرکت کرنے لگا گویا کسی اندرونی قوت سے کھنچا چلا جا رہا ہو، اور زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ گھبرائی ہوئی ارسلا نے اپنے شوہر سے اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ لیکن خوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے فطری عمل سے تعبیر کیا۔ خوزے آرکادیو بوئندیا کا ہمیشہ سے یہی حال تھا۔ وہ اپنے لڑکوں کے وجود سے یکسر بیگانہ تھا، کچھ اس وجہ سے کہ وہ بچپن کو ذہنی کم مائیگی کا دور سمجھتا تھا اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تخیلاتی مفروضوں میں کھویا رہتا۔

لیکن اس دوپہر کے بعد سے، جب اس نے لڑکوں کو بلا کر ڈبوں سے تجربہ گاہ کی چیزیں نکلوانے میں مدد لی تھی، اس نے انہیں اپنا بہترین وقت دیا۔ اس چھوٹے سے ایک تھلگ کمرے میں، جس کی دیواریں رفتہ رفتہ عجیب وغریب نقشوں اور حیران کن خاکوں سے بھر گئی تھیں، اس نے ان کو پڑھنا لکھنا اور حساب کرنا سکھایا، اور دنیا کے عجوبوں کے بارے میں بتایا۔ اس عمل میں وہ نہ صرف اپنا حاصل کردہ علم استعمال میں لاتا بلکہ اپنے تخیل کو اس کی انتہائی حدود تک کھینچ لے جاتا۔ اس طرح لڑکوں کو معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ کی سرحدوں پر بسنے والے لوگ اتنے ذہین اور شائستہ ہوتے ہیں کہ فرصت کے لمحات میں ان کی ایک ہی سرگرمی ہوتی ہے، بیٹھ کر سوچنا، اور یہ کہ بحر ایجیئن کو پیدل ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے پر چھلانگ لگاتے ہوئے عبور کر کے سالونیکا کی بندرگاہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ سحرانگیز نشستیں لڑکوں کے ذہنوں پر اس طرح نقش ہوئیں کہ، بہت برسوں بعد، فوجی افسر کے فائرنگ اسکواڈ کو گولی چلانے کا حکم دینے سے ایک سیکنڈ پہلے، کرنل اوریلیانو بوئندیا کو مارچ کی وہ گرم سہ پہر دوبارہ دکھائی دی جب اس کا باپ دور سے ہی سیٹیوں، نقاروں، نفیریوں اور خانہ بدوشوں کے گیتوں کی آوازیں سن کر جو میلقیادیس کے ساتھیوں کی تازہ ترین اور سب سے حیران کن ایجاد کی منادی کرتے ہوئے گاؤں میں ایک بار پھر داخل ہو

رہے تھے، طبیعیات کا سبق ادھورا چھوڑ کر، ساکت آنکھوں اور ہوا میں بلند ہاتھوں کے ساتھ سحرزدہ کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ خانہ بدوش تھے، جوان مرد اور عورتیں، جو صرف اپنی زبان جانتے تھے، چکنی جلدوں اور ذہین ہاتھوں والے خوبصورت لوگ، جن کے رقص اور موسیقی نے ماکوندو کی گلیوں میں مسرت آمیز ہنگامہ برپا کر دیا۔ رنگارنگ توتے لیے، جو اطالوی گیت گاتے، اور ایک مرغی جو طنبورے کی آواز پر سونے کے سو انڈے دیتی، اور ایک سدھا ہوا بندر جو لوگوں کے خیالات پڑھ لیتا، اور ایک ایسی مشین جس کے کئی استعمال تھے، جو بٹن ٹانکنے اور بخار کم کرنے کا کام ساتھ ساتھ انجام دیتی، اور ایک ایسا آلہ جس سے انسان اپنی ناخوشگوار یادیں فراموش کر سکتا تھا، اور ایک پلستر جس سے وقت زائل ہو جاتا، اور مزید ایک ہزار ایجادات، جو اتنی عجیب وغریب اور انوکھی تھیں کہ خوزے آرکادیو بوئندیا کا یقیناً دل چاہا ہو گا کہ وہ ایک ایسی مشین ایجاد کرے جس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو یاد رکھا جا سکے۔ ایک لمحے میں خانہ بدوشوں نے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔ ماکوندو کے باشندوں نے خود کو اپنی ہی گلیوں میں گم میلے کی بھیڑ میں حیران و سرگرداں پایا۔

دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے، تاکہ وہ اس ہنگامے میں گم نہ ہو جائیں، سونے کے دانتوں والے مسخروں سے ٹکراتا، چھ بازوؤں والے جادوگروں سے لڑھکتا، ہجوم سے اٹھتی ہوئی صندل اور کھاد کی ملی جلی بو سے گھٹتے ہوئے دم کے ساتھ، خوزے آرکادیو بوئندیا ایک جنونی کی طرح میلے میں ملکیادیس کو ڈھونڈتا پھرا تاکہ وہ اس کے عجیب وغریب، داستانی انگیز، ڈراؤنے خواب کے بھیدیاں رموز اس پر کھول سکے۔ اس نے کئی خانہ بدوشوں سے دریافت کیا جو اس کی زبان نہ جانتے تھے۔ آخرکار وہ اس جگہ جا پہنچا جہاں ملکیادیس اپنا خیمہ لگایا کرتا تھا اور وہاں اس کو ایک کم گو آرمینی نظر آیا، جو ہسپانوی زبان میں ایک ایسا شربت بیچ رہا تھا جسے پی کر انسان نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ جب خوزے آرکادیو بوئندیا کھڑے مجمعے کو چیرتا اس سے سوال کرنے پہنچا، آرمینی گلاس بھر عنبریں مائع ایک گھونٹ میں چڑھا چکا تھا۔ خوفناک طاعونی دھوئیں کے بادل میں غائب ہونے سے پیشتر، خانہ بدوش نے خوزے آرکادیو بوئندیا کو اپنی نگاہ کی مہیب فضا میں بہت پیاد۔ دھوئیں کے اوپر اس کے جواب کی گونج سنائی دی: "ملکیادیس مر چکا ہے۔" یہ خبر سن کر خوزے آرکادیو بوئندیا سکتے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور اس بپتا سے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا یہاں تک کہ مجمع دوسرے کرشموں کی طرف متوجہ ہو کر چھٹنے لگا اور کم گو آرمینی کا گدلا کیچڑ بخارات بن کر اڑ گیا۔ دوسرے خانہ بدوشوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ ملکیادیس سنگاپور کے ساحل پر بخار کا شکار ہو کر مر چکا ہے، اور یہ کہ اس کی لاش کو جاوا کے سمندر کے سب سے گہرے حصے میں پھینکا جا چکا ہے۔ لڑکوں کو اس خبر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے باپ سے ضد کرنے لگے کہ میمفس کے سیانوں کی انوکھی شے دکھانے لے چلے، جس کی خیمے کے باہر منادی کی جا رہی تھی، اور جو بقول مشتہر کے، سلیمان بادشاہ کی ملکیت تھی۔ بچوں نے اتنی ضد کی کہ خوزے آرکادیو بوئندیا تیس سکّے دے کر بچوں کو خیمے کے وسط میں لے گیا، جہاں بالوں سے ڈھکے جسم اور گنجے سر والا ایک عظیم الجثہ آدمی ناک

میں تانبے کی بالی لٹکائے اور ٹخنے پر لوہے کی زنجیر پہنے، ایک صندوق کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اس دیو نے صندوق کھولا تو اس میں سے ایک سرد بھبکا اٹھا۔ صندوق کے اندر ایک بےحد بڑی شفاف سِل دھری تھی جس کے اندر لاتعداد سوئیاں بسی ہوئی تھیں، جن سے ٹکرا کر سورج کی شعاعیں دھنک کے رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ مضطرب خوزے آرکادیو بوئندیا، جو جانتا تھا کہ بچے اس شے کی وضاحت سننے کے لیے بیتاب ہیں، آہستہ سے بڑبڑایا،

"یہ دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے۔"

"نہیں" خانہ بدوش نے اس کی تصحیح کی۔ "یہ برف ہے۔"

خوزے آرکادیو بوئندیا نے کچھ سمجھے بغیر سل کی جانب ہاتھ بڑھایا، لیکن دیوہیکل شخص نے اسے روک دیا۔ "پانچ سکّے اور، اسے چھونے کے۔" خوزے آرکادیو بوئندیا نے سکّے دیے اور اپنا ہاتھ برف پر رکھ دیا، اور کئی منٹ تک رکھے رہا، یہاں تک کہ اس کا دل اسرار سے اتصال پر خوف اور مسرت سے پھٹنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس نے دس سکّے اور دیے، تاکہ اس کے بیٹے بھی اس عظیم تجربے سے گزر سکیں۔ ننھے خوزے آرکادیو نے برف کو چھونے سے انکار کر دیا، جبکہ اوریلیانو نے قدم آگے بڑھا کر اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور فوراً کھینچ لیا۔ "یہ تو ابل رہا ہے۔" اس نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ لیکن اس کے باپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ معجزے کی شہادت سے سرشار، وہ اس لمحے اپنی مایوسیوں کو بھول گیا جو اس کی بدبخت مہمات اور ملکیادیس کی لاش کے سمندری ہشت پایوں کی خوراک کے حوالے کر دیے جانے سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نے پانچ سکّے اور بڑھائے، اور اپنا ہاتھ سل پر رکھ کر، گویا کسی مقدس صحیفے پر شہادت دے رہا ہو، بولا،

"یہ ہمارے وقتوں کی عظیم ایجاد ہے۔"

جب قزاق سر فرانسس ڈریک نے سولہویں صدی میں ریوہاچا پر حملہ کیا تو ارسلا کی سکڑدادی خطرے کی گھنٹیوں اور توپوں کی گھن گرج سے اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ سراسیمگی کی حالت میں جلتے ہوئے چولہے پر جا بیٹھی۔ جلنے کے سبب وہ تمام عمر کے لیے ایک ناکارہ بیوی بن کے رہ گئی۔ وہ تکیے کے سہارے صرف ایک پہلو پر بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی چال میں کوئی عجیب وغریب چیز واقع ہوئی تھی کیونکہ اس حادثے کے بعد وہ کبھی لوگوں کے سامنے نہ چلی۔ اس نے تمام معاشرتی سرگرمیاں ترک کر دیں، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ وسوسہ سما گیا تھا کہ اس کے جسم سے جلے ہوئے گوشت کی بُو آتی ہے۔ پو پھٹے وہ آنگن میں بیٹھی پائی جاتی اس خوف سے سو نہ پاتی کہ کہیں خواب میں اسے انگریز اور ان کے خونخوار حملہ آور کتے نظر نہ آ جائیں، جو اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر اندر آئے تھے اور اسے جلتے ہوئے لوہے کی شرمناک اذیت سے دوچار کیا تھا۔ اس کا شوہر، ایک آراگونیر تاجر جس سے اس کے دو بچے تھے، اپنی دکان کی نصف مالیت اس کی دوائیوں اور دلجوئیوں میں لگا بیٹھا تھا اس کوشش میں کہ اس کی دہشت کسی صورت جاتی رہے۔ آخرکار اس نے اپنا کاروبار بیچ کر سمندر سے دور پہاڑیوں کے دامن میں مقامی انڈین لوگوں کی ایک پرسکون بستی میں اپنی بیوی کے لیے ایک ایسا گھر بنایا جس کی خواب گاہ میں کوئی کھڑکی نہ تھی تاکہ اس کے خوابوں کے قزاقوں کو اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ملے۔

اس پوشیدہ گاؤں میں تمباکو کا ایک مقامی کاشت کار حوزے آرکادیو بوئندیا کچھ عرصے سے مقیم تھا۔ ارسلا کے سکڑدادا نے اس کے ساتھ مل کر ایک مشترک کاروبار شروع کیا جو

اتنا منافع بخش ثابت ہوا کہ ان کی قسمت بدل گئی۔ چند صدیوں بعد تمباکو کے مقامی کاشت کار کے پڑپوتے نے آراگونیر تاجر کی پڑنواسی سے شادی کر لی۔ لہٰذا ہر دفعہ جب ارسلا کو اپنے شوہر کے پاگل پن کے خیالات پر طیش آتا، تو وہ ایک ہی جست میں قسمت کے تین سو سال طے کرتی، اور اُس دن کو کوستی جب سر فرانسس ڈریک نے ریوہاچا پر حملہ کیا تھا۔ یہ صرف اپنے آپ کو تسلی دینے کا ایک بہانہ تھا، کیونکہ وہ دونوں درحقیقت ایک ایسے بندھن میں بندھے ہوئے تھے جو محبت سے زیادہ مستحکم تھا، اور وہ بندھن تھا ضمیر کی مشترک چبھن۔ وہ عم زاد تھے۔ دونوں اُس پرانے گاؤں میں اکٹھے پلے بڑھے تھے جس کو ان کے آباواجداد کی محنت اور اچھی عادتوں نے تمام صوبے کا ایک عمدہ ترین قصبہ بنا دیا تھا۔ گو کہ ان دونوں کی شادی کی پیش گوئی ان کے دنیا میں آتے ہی کر دی گئی تھی، جب انھوں نے آپس میں شادی کرنے کی خواہش کا خود اظہار کیا تو ان کے رشتےداروں نے ان کو روکنے کی کوشش کی۔ انھیں خوف تھا کہ دو صحت مند جوڑوں کو، جو دو نسلوں کے صدیوں تک اختلاط سے پیدا ہوئے تھے، اگوانا جننے کی ذلت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ان کے سامنے اس سے پہلے کی ایک ہولناک مثال موجود تھی۔ ارسلا کی ایک خالہ کا، جس کی حوزے آرکادیو بوئندیا کے چچا سے شادی ہوئی تھی، ایک ایسا بیٹا تھا جو زندگی بھر ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنتا رہا، اور جو بیالیس برس کنوارا رہنے کے بعد، زیادہ مقدار میں خون بہہ جانے کے سبب جاں بحق ہوا، کیونکہ اس کی، بوتل کا کارک نکالنے والے اوزار کی مانند، ایک کرکری ہڈی دار دُم تھی، جس کے سرے پر بالوں کا گچھا تھا۔ سؤر کی دم، جسے دیکھنے کی کسی عورت کو اجازت نہ تھی، اور جس کی وجہ سے اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے جب اس کے ایک قصاب دوست نے بُغدے سے وہ دُم اڑا دی۔ اُنیس سالہ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس مسئلے کو جوانی کے جوش میں صرف ایک جملے سے حل کر ڈالا تھا: "مجھے پروا نہیں اگر میرے ہاں سؤر پیدا ہوں، بشرطیکہ وہ بول سکتے ہوں۔" لہٰذا ان کی دھوم دھام سے آتش بازی اور بینڈ باجے کے ساتھ شادی ہو گئی۔ وہ اس کے بعد ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے تھے، اگر ارسلا کی ماں نے ان کی اولاد کے بارے میں منحوس پیش گوئیاں کر کے انھیں ڈرا نہ دیا ہوتا یہاں تک کہ اس نے ارسلا کو مشورہ دیا کہ شادی کے باوجود مباشرت سے احتراز کرے۔ اس خوف سے کہ اس کا تنومند اور پُرعزم شوہر کہیں سوتے میں اس کے ساتھ زبردستی اختلاط نہ کر بیٹھے، وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے ایک بھدا سا زیرجامہ پہن لیتی جو اس کی ماں نے مضبوط بادبانی کپڑے کا سیا تھا، جس پر چمڑے کی پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں اور جو سامنے سے لوہے کے بکسوئے سے کھلتا تھا۔ اس طرح انھوں نے چند ماہ گزارے۔ دن کے وقت حوزے آرکادیو بوئندیا اپنے لڑاکا مرغوں کی دیکھ بھال کرتا، اور ارسلا ماں کے ساتھ بیٹھی کشیدہ کاری کیا کرتی۔ رات وہ گھنٹوں ایک دکھ بھری دھینگامشتی میں گزارتے جو اختلاط کا بدل معلوم ہوتی، یہاں تک کہ لوگوں کو کوئی غیرمعمولی بات محسوس ہونے لگی، اور افواہ اُڑ گئی کہ ارسلا شادی کا ایک سال پورا ہو جانے پر بھی کنواری کی کنواری ہے، کیونکہ اس کا شوہر نامرد ہے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو سب سے آخر میں اس بات کا علم ہوا۔

"دیکھو، لوگ کس قسم کی باتیں کرتے پھر رہے ہیں ارسلا" اس نے اپنی بیوی سے

پرسکون لہجے میں کہا۔

"ابھی بکنے دو" ارسلا نے جواب دیا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔"

سو یہ صورت حال چھ ماہ مزید، اس دردناک اتوار تک برقرار رہی جب حوزے آرکادیو بوئندیا نے پروڈانسیو اگیلار سے مرغوں کی لڑائی جیتی۔ پروڈانسیو اگیلار خون میں لتھڑے اپنے مرغ کو دیکھ کر طیش میں آ گیا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا سے دور ہٹ کر، تاکہ پالی کے گرد موجود لوگ سن لیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، چیخ کر بولا، "مبارک ہو! شاید تمھارا مرغ تمھاری بیوی کا بھی کچھ بھلا کر سکے۔"

حوزے آکادیو بوئندیا نے تحمل کے ساتھ اپنے مرغ کو اٹھایا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں،" اس نے مجمعے سے کہا۔ اور پھر پروڈانسیو اگیلار سے مخاطب ہوا:

"تم گھر جاؤ اور ایک ہتھیار لے آؤ، کیونکہ میں تمھیں قتل کرنے جا رہا ہوں۔"

دس منٹ بعد وہ ہاتھ میں اپنے دادا کا دندانےدار بھالا لیے لوٹا۔ میدان میں، جہاں آدھے سے زیادہ گاؤں جمع ہو چکا تھا، پروڈانسیو اگیلار اس کا منتظر تھا۔ اسے اپنا دفاع کرنے کا موقع نہ ملا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بیل کی سی طاقت سے، اس صحیح نشانے کے ساتھ جس سے اوریلیانو بوئندیا اول نے علاقے کے چیتوں کا خاتمہ کیا تھا، بھالے سے اس کا گلا چیر ڈالا۔ اس رات، جو گاؤں کے لوگوں نے میدان میں پڑی لاش کے ساتھ جاگ کر گزاری، حوزے آرکادیو بوئندیا اپنی خواب گاہ میں گیا جہاں اس کی بیوی اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے زیرجامہ چڑھا رہی تھی۔ بھالے کی نوک اس کی جانب کر کے حوزے آرکادیو بوئندیا نے حکم دیا: "اتارو اسے!" ارسلا کو اپنے شوہر کے فیصلے کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ "جو کچھ ہو گا اس کے تم ہی ذمےدار ہو گے" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بھالا کچی زمین میں گاڑ دیا۔

"اگر تم نے اگواؤں کو جنم دیا تو ہم اگوانے پال لیں گے،" وہ بولا۔ "لیکن اس گاؤں میں تمھاری وجہ سے مزید کوئی قتل نہیں ہو گا۔"

وہ جون کی ایک خوش گوار رات تھی، خنک اور چاندنی میں ڈوبی ہوئی۔ اور وہ صبح تک بستر میں پڑے سرمستیاں کرتے رہے، پروڈانسیو اگیلار کے اقربا کے بین سے بوجھل ہوا کے ان جھونکوں سے لاتعلق، جو ان کی خواب گاہ میں آتے جاتے رہے۔

اس معاملے کو عزت کی خاطر ڈوئل کہہ کر دبایا گیا، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا اور ارسلا دونوں کے ضمیر میں پھانس لگ چکی تھی۔ ایک رات نیند نہ آنے پر ارسلا بستر سے اٹھ کر آنگن میں رکھے مٹکے سے پانی لینے گئی تو اس نے پروڈانسیو اگیلار کو مٹکے کے قریب کھڑا دیکھا۔ وہ نیلا ہو رہا تھا، اس کے چہرے پر اداسی تھی اور وہ اپنی گردن کے سوراخ کو ایسپارتو گھاس سے بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ارسلا کو بجائے خوف کے اس پر رحم آیا۔ وہ الٹے پاؤں کمرے میں واپس گئی اور اپنے شوہر کو بتایا کہ اس نے کیا دیکھا ہے، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ "اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمارے ضمیر کا بوجھ ہمیں پریشان کر رہا ہے۔"

دو راتوں بعد ارسلا نے پروڈانسیو اگیلار کو پھر دیکھا۔ اس دفعہ وہ غسل خانے میں،

ایسپارتو گھاس کی مدد سے، گردن پر جما خون صاف کر رہا تھا۔ ایک اور رات وہ بارش میں ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا، جو بیوی کے فریبِ نظر سے تنگ آ چکا تھا، بھالے سے لیس ہو کر آنگن میں گیا۔ مقتول اپنے چہرے پر اداسی کے تاثرات لیے کھڑا تھا۔

"جہنم میں جاؤ" حوزے آرکادیو بوئندیا چلایا۔ "جتنی مرتبہ تم آؤ گے میں اتنی دفعہ تمھاری جان لوں گا۔" پروڈانسیو اگیلار وہیں کھڑا رہا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کی ہمت نہ ہوئی کہ اس پر بھالا پھینکے۔ اس رات کے بعد وہ کبھی چین سے نہ سو سکا۔ جس ویرانی کے ساتھ بارش میں کھڑے پروڈانسیو اگیلار نے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کی زندوں میں لوٹنے کی وہ شدید آرزو، اور وہ تفکر جس کے ساتھ وہ پانی کی تلاش میں پورے گھر میں بھٹکتا پھرتا تاکہ گھاس کو گیلا کر کے زخم پر پھاہا رکھ سکے، اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو عذاب میں ڈال دیا۔ "وہ سخت اذیت سے دوچار ہے،" اس نے ارسلا سے کہا۔ "تم دیکھ سکتی ہو وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہا ہے۔" ارسلا نے جب اگلی دفعہ اس کو چولھے پر رکھی پتیلیوں کے ڈھکن کھولتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ پانی تلاش کر رہا ہے۔ اسے پروڈانسیو اگیلار پر اتنا ترس آیا کہ اس نے گھر میں جگہ جگہ پانی سے بھرے جگ رکھ دیے۔ ایک رات جب حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے اپنے کمرے میں زخم دھوتے دیکھا تو اس سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔

"ٹھیک ہے، پروڈانسیو،" حوزے آرکادیو بوئندیا اس سے مخاطب ہوا۔ "ہم یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں، اتنی دور جتنا کہ ہم جا سکتے ہیں۔ اور اب ہم کبھی نہ لوٹ کر آئیں گے۔ اب تم سکون سے واپس جا سکتے ہو۔"

تو اس طرح انھوں نے پہاڑ عبور کرنے کی ٹھانی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کے چند دوستوں نے، جن کو اس مہم نے اکسایا، اپنے اپنے گھروں کا ساز و سامان لپیٹا، بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور انجانی سرزمین کی طرف چل پڑے۔

روانگی سے پیشتر حوزے آرکادیو بوئندیا نے بھالا آنگن میں دفن کیا اور اپنے شاندار مرغوں کی ایک ایک کر کے گردن کاٹی، اس یقین کے ساتھ کہ اس عمل سے پروڈانسیو اگیلار کو سکون پہنچے گا۔ جو کچھ ارسلا نے ساتھ لیا وہ اس کی شادی کے چند جوڑے، کچھ برتن اور ایک چھوٹا سا صندوق تھا، جس میں سونے کے سکے تھے جو اس کے باپ نے اس کے لیے چھوڑے تھے۔ انھوں نے سفر کا کوئی قطعی منصوبہ نہیں بنایا۔ صرف اتنا کیا کہ ریوہاچا کی مخالف سمت راہ پکڑنے کی کوشش کی، تاکہ انھیں راستے میں کوئی شناسا نہ نظر آئے، اور وہ اپنا کوئی نام ونشان نہ چھوڑیں۔ وہ ایک مضحکہ خیز سفر تھا۔ چودہ ماہ بعد ارسلا نے، جس کا پیٹ بندر اور سانپ کا گوشت کھا کھا کر بگڑ چکا تھا، ایک لڑکے کو جنم دیا جس کے تمام خدوخال انسانوں جیسے تھے۔ ارسلا نے نصف سفر جھولے میں لیٹے لیٹے طے کیا جسے دو مرد اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلتے تھے، کیونکہ ورم سے اس کی ٹانگیں بدہیئت ہو گئی تھیں اور ان میں بلبلوں کی مانند نیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔ گو کہ ان کے دھنسے ہوئے پیٹ اور ویران آنکھیں دیکھ کر ترس آتا تھا، بچوں نے والدین کی بہ نسبت سفر کو بہتر طور پر سہا تھا۔ زیادہ تر وقت انھوں نے سفر سے مزہ ہی اٹھایا تھا۔ ایک صبح، تقریباً دو سال کے طویل سفر کے بعد،

پہاڑی سلسلے کے مغربی دامن کو دیکھنے والے وہ پہلے انسان تھے۔ بادلوں میں ڈھکی چوٹی سے نیچے، دنیا کے دوسری طرف، عظیم دلدل کی اپنی وسعت پھیلی نظر آئی۔ لیکن انہیں کبھی سمندر نہ ملا۔ اس دلدلی علاقے میں کئی ماہ بھٹکنے کے بعد، ان آخری مقامی انڈین لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر جو انہیں راستے میں نظر آئے تھے، ایک رات انہوں نے ایک پتھریلے دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالا جس کا پانی شیشے کے جمے ہوئے دھارے کی طرح تھا۔ برسوں بعد، دوسری خانہ جنگی کے دوران، کرنل اوریلیانو بوئندیا نے اسی راستے سے گزرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ریوہاچا پر اچانک حملہ کر کے قبضہ جما سکے، اور چھ دن بعد وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ پاگل پن ہے۔ بہرحال، اس رات جب انہوں نے دریا کے کنارے خیمے گاڑے، اس کے باپ کے ساتھیوں کے چہروں پر ایسے تاثرات تھے گویا ان کا جہاز تباہ ہو چکا ہو اور اب واپسی کی کوئی راہ نہ ہو۔ لیکن ان کی تعداد میں سفر کے آغاز سے اب تک اضافہ ہو چکا تھا اور وہ طویل عمر پا کر مرنے کے لیے تیار تھے۔ اس رات حوزے آرکادیو بوئندیا نے خواب میں دیکھا کہ اس جگہ ایک آباد اور پُرصدا شہر کھڑا ہے جس کے گھروں کی دیواریں آئینے کی ہیں۔ اس نے لوگوں سے پوچھا یہ کون سا شہر ہے، اور انہوں نے جواب میں ایک ایسا نام لیا جو اس نے پہلے کبھی نہ سنا تھا، جس کے کوئی معنی نہ تھے، لیکن اس نام نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے خواب میں ایک ماورائے طبیعی بازگشت پیدا کر دی: ماکوندو۔ دوسرے دن اس نے اپنے ساتھیوں کو قائل کر لیا کہ وہ سمندر کبھی نہ تلاش کر پائیں گے، اور ان سے دریا کے کنارے سب سے ٹھنڈے مقام پر زمین کو درختوں سے صاف کرنے کو کہا، اور وہاں انہوں نے گاؤں کی بنیاد ڈالی۔

حوزے آرکادیو بوئندیا کو خواب میں آئینے کی دیواروں والے گھروں کا مطلب اس وقت تک سمجھ میں نہ آیا جب تک اس نے زندگی میں برف نہ دیکھی۔ برف دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ خواب کے عمیق معنی کو پا گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ مستقبل قریب میں وہ پانی جیسی معمولی چیز سے برف کی سلیں بنا سکیں گے اور پھر گاؤں میں ان سلوں سے نئے گھر تعمیر کریں گے۔ پھر ماکوندو جھلستی ہوئی جگہ نہ رہے گی جہاں دروازوں کے قبضے اور کنڈیاں تپش سے بل کھا جاتی تھیں بلکہ ایک سرد، پرفضا مقام میں بدل جائے گی۔ اگر وہ برف کا کارخانہ بنانے میں ثابت قدم نہ رہ سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان دنوں اپنے بیٹوں کی تعلیم کے سلسلے میں بےحد پرجوش تھا، خاص طور پر اوریلیانو کی تعلیم کے سلسلے میں، جس نے شروع ہی سے کیمیاگری کی طرف وجدان ظاہر کیا تھا۔ تجربہ گاہ پر جمی گرد صاف کی گئی۔ ملکیادیس کی دستاویزات کو سنجیدگی کے ساتھ، اس کے ارکھیں کی تعریف و توصیف کے بغیر، ازسرنو پڑھا گیا اور کئی پرتحمل اور طویل نشستوں میں انہوں نے ارسلا کے سونے کو اس ملبوسے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جو کڑھائی کے پیندے سے چپک گیا تھا۔ چھوٹے حوزے آرکادیو نے اس عمل میں برائے نام ہی حصہ لیا۔ جس عرصے میں اس کا باپ دل وجان کے ساتھ پانی کی ٹنکیوں میں الجھا رہا، وہ سرکش پہلوٹا، جو ہمیشہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا، ایک عظیم شحیم نوبالغ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آواز بدل گئی تھی۔ اس کے بالائی لب کے اوپر ابتدائی روئیدگی نمودار ہو چلی تھی۔ ایک رات جب ارسلا اس کے کمرے میں داخل ہوئی

تو وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے کپڑے اتار رہا تھا۔ ارسلا کو شرم اور رحم کا ملا جلا احساس ہوا۔ شوہر کے بعد وہ پہلا مرد تھا جس کو اس نے عریاں دیکھا۔ وہ زندگی کے لیے اتنے بھرپور طریقے سے لیس تھا کہ غیرمعمولی نظر آتا تھا۔ ارسلا کو، جو تیسری دفعہ حمل سے تھی، شادی کے ابتدائی دنوں کی دہشت یاد آ گئی۔

ان دنوں ایک چنچل، منہ پھٹ اور اشتعال انگیز عورت گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے آئی۔ وہ تاش کے پتّے دیکھ کر مستقبل بتا سکتی تھی۔ ارسلا نے اپنے بیٹے کے بارے میں اس سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے کا عضو غیرمعمولی طور پر بڑا ہے، اور اتنا ہی غیرفطری جتنا کہ اس کے عم زاد کی دُم تھی۔ عورت نے ایک انبساط پذیر قہقہہ لگایا جو پورے گھر میں میں ٹوٹتے ہوئے شیشے کے چھناکے کی طرح گونجتا رہا۔ "تمہارے اندیشے کے برعکس وہ بےحد خوش قسمت ثابت ہو گا۔" اپنی پیش گوئی کو ثابت کرنے کے لیے وہ تاش کے پتّے ان کے گھر لے کر آئی اور حوزے آرکادیو کے ساتھ باورچی خانے سے پرے گودام میں بند ہو گئی۔ اس نے خاموشی سے تاش کے پتّے ایک پرانے بڑھئی کے تختے پر رکھے، اور جو کچھ اس کے دماغ میں آیا، منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ لڑکا اس کے قریب منتظر کھڑا رہا۔ وہ تجسس کے بجائے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اچانک عورت نے ہاتھ بڑھا کر اس کو چھو لیا۔ "اوہ خدایا!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی، وہ حقیقتاً تعجب میں آ گئی تھی۔ حوزے آرکادیو کو اپنی ہڈیوں میں جھاگ سا بھرتا محسوس ہوا، ایک مضمحل خوف اور رونے کی شدید خواہش نے اسے آ لیا۔ عورت نے کوئی اشارہ نہ کیا تھا، لیکن حوزے آرکادیو تمام رات اس کے لیے بےچین رہا۔ اس کی بغلوں سے اٹھنے والی دھوئیں کی بُو حوزے آرکادیو کی کھال میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا تمام وقت اس عورت کے ساتھ رہے، وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی ماں ہوتی اور وہ دونوں گودام سے کبھی نہ نکلتے، اور وہ کہتی، "اوہ خدایا!" ایک دن حوزے آرکادیو سے برداشت نہ ہو سکا، اور وہ اس کو تلاش کرتا ہوا اس کے گھر تک جا پہنچا۔ وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا اور بیٹھک میں بےخود سا، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر بیٹھا رہا۔ اس لمحے حوزے آرکادیو کو اس عورت کی کوئی طلب نہ تھی۔ اس کو وہ مختلف لگی، اس تصوّر سے یکسر مختلف جو اس کی خوشبو نے جگایا تھا، گویا وہ کوئی اور ہو۔ اس نے کافی پی، اور پژمردگی کے عالم میں باہر نکل آیا۔ اس رات نیند نہ آنے کے مہیب لمحے میں، حوزے آرکادیو نے ایک وحشیانہ اضطراب کے ساتھ اس کی آرزو کی۔ لیکن اس دفعہ اسے اس عورت کی طلب نہ ہوئی جیسی وہ اس دن گودام میں تھی، بلکہ اس عورت کی جیسا اسے حوزے آرکادیو نے اس سہ پہر پایا تھا۔

کئی دنوں بعد اس نے اچانک حوزے آرکادیو کو اپنے گھر بلوایا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ تنہا تھی، اور اسے تاش کے پتّے دکھانے کے بہانے اپنے کمرے میں لے گئی، اور پھر اس نے حوزے آرکادیو کو اتنی آزادی سے چھوا کہ اسے ابتدائی جھرجھری کے بعد مغالطہ ہونے لگا، اور اس نے لذت سے زیادہ خوف محسوس کیا۔ عورت نے اسے رات کے وقت آنے کی دعوت دی۔ حوزے آرکادیو نے ہامی بھر لی تاکہ وہاں سے نکل سکے، گو کہ وہ جانتا تھا کہ وہ جانے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اس رات حوزے آرکادیو نے جان لیا کہ اسے اس عورت کے پاس بہرصورت جانا ہے

مگر وہ اس قابل نہ ہو تب بھی۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر کپڑے پہنے اور اپنے بھائی کی پرسکون سانسوں کی آواز دوسرے کمرے میں اپنے باپ کی اٹھنے والی خشک کھانسی، انگنائی میں مرغیوں کا دمہ، مچھروں کی بھنبھناہٹ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکن، اور دنیا کی بےترتیب ہلچل، جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، سنتے ہوئے وہ خوابیدہ گلی میں نکل گیا۔ دل ہی دل میں اس نے تمنا کی کہ دروازے کے نہ صرف پٹ بند ہوں، بلکہ ان میں اندر سے چٹخنی بھی چڑھی ہو۔ لیکن دروازہ کھلا تھا۔ اس نے انگلیوں کے سروں سے جیسے ہی دھکیلا پٹ کھل گیا، ایک دردبھری لیکن واضح سسکی کے ساتھ، جس کی گونج اس کی روح میں منجمد ہو کے رہ گئی۔ جس لمحے وہ دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتا ہوا اندر داخل ہوا، اسے وہی خوشبو آئی، وہ ابھی تک دالان میں تھا جہاں عورت کے تینوں بھائیوں نے اپنی جھولیاں تان رکھی تھیں جو نہ اس کو دکھائی دے رہی تھیں اور نہ جن کے وقوع کا وہ اندھیرے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا دالان سے گزر کر عورت کے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا تاکہ اسے اندازہ ہو سکے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ جھولیوں کی رسیوں سے، جو اس کے اندازے سے نیچی تھیں، اور ایک خراٹے لیتے ہوئے مرد سے ٹکرایا، جس نے سوتے میں کروٹ بدلی اور خواب میں بڑبڑایا "وہ بدھ کا دن تھا۔" کمرے کے دروازے کا پٹ کھولتے وقت وہ اندھیرے فرش پر گرنے سے بچا۔ اس گھپ اندھیرے میں گرتے ہوئے لمحے کی مرض آرزو میں اس کو اچانک احساس ہوا کہ وہ قطعی طور پر ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔ اس تنگ سے کمرے میں اس کی ماں، اس کی دوسری بیٹی اپنے بچے، اور شوہر کے ساتھ اور وہ عورت جو شاید وہاں تھی ہی نہیں سو رہی تھی۔ وہ اس کو خوشبو کے ذریعے اس تک جا پہنچتا اگر وہ خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی نہ ہوتی۔ وہ خوشبو اتنی بھرپور اور اتنی کمزور تھی جیسے ہمیشہ سے اس کی جلد میں بسی ہوئی ہو۔ وہ کافی دیر تک ساکت کھڑا رہا۔ اس کو تعجب ہوا کہ وہ بےخودی کی اس پاتال میں کیونکر جا گرا۔ اسی دوران ایک ہاتھ پوری انگلیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اس کے چہرے کو چھوا۔ اسے تعجب نہ ہوا، انجانے میں وہ اس کی توقع کر رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو اس ہاتھ کے سپرد کر دیا اور ایک مہیب تھکن کی کیفیت میں خود کو ایک بےہیئت جگہ پر لے جانے دیا جہاں اس کے کپڑے اتارے گئے اور اسے آلوؤں کی بوری کی طرح لتھیڑا گیا اور ایک طرف سے دوسری طرف لڑھکایا گیا ایک گھپ اندھیرے میں جہاں بازو کسی کام کے نہ تھے اور جہاں عورت کی خوشبو کے بجائے امونیا کی مہک تھی، اور جہاں اس نے عورت کے چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی اور نظروں کے سامنے ارسلا کا چہرہ پایا، اس مبہم آگہی میں کہ وہ وہی کر رہا ہے جس کو کرنے کی اسے عرصہ دراز سے آرزو تھی اور جو اس کا خیال تھا وہ کبھی نہ کر سکے گا یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے کیونکہ اسے ہوش نہ تھا کہ اس کے پیر کہاں ہیں اور سر کس طرف ہے یا کس کا سر اور کس کے پیر، اور اس احساس کے ساتھ کہ اب وہ مزید اپنے گردوں کی سرد سنسناہٹ کو برداشت نہ کر سکے گا اور نہ اپنی انتڑیوں کی ہوا کو، اور اس سراسیمگی کو کہ فرار ہو جائے اور ساتھ ساتھ اس آرزو کو کہ اس پراسرار خاموشی اور مہیب تنہائی میں ہمیشہ کے لیے ٹھہر جائے۔

اس کا نام پیلار ترنیرا تھا۔ وہ اس خروج کا حصہ تھی جو ماکوندو کی بنیاد پڑنے پر اختتام کو پہنچا تھا۔ گھر والے گھسیٹ کر اسے اپنے ساتھ لائے تھے، تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے اس شخص سے جدا کر سکیں جس نے اس کے ساتھ اس وقت دست درازی کی تھی جب وہ چودہ سال کی تھی، اور اس سے محبت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ بائیس برس کی ہو گئی۔ لیکن وہ اس صورت حال کو گاؤں پر ظاہر کرنے کا فیصلہ نہ کر پایا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں سے الگ تھا۔ اس نے دنیا کے آخری کونے تک پیلار ترنیرا کا پیچھا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اپنے معاملات کو سلجھانے کے بعد اور وہ اس کے انتظار سے تھک چکی تھی۔ وہ ان تمام لمبے یا پست قد گورے یا کالے مردوں پر اس کا گمان کرتی رہی جو اس کے تاش کے پتوں کے خوش آئند وعدوں کے مطابق سمندر یا خشکی کے راستے تین دن، تین ماہ یا تین سال کے اندراندر آنے والے تھے۔ انتظار میں وہ اپنی رانوں کی مضبوطی، اپنے سینوں کی اٹھان اور اپنی نرم خوئی کھو بیٹھی تھی۔ اس نے صرف اپنے دل کا پاگل پن برقرار رکھا تھا۔ اس مولکھے کھلونے نے خوزے آرکادیو کو پاگل کر دیا۔ وہ ہر رات اس کے کمرے کی بھول بھلیوں سے گزر کر اس تک پہنچتا۔ ایک رات اس نے دروازہ بند پایا اور کئی دفعہ دستک دی، یہ سوچ کر کہ جب وہ پہلی دفعہ دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت کر چکا ہے تو اسے آخری سانس تک دستک دیتے رہنی ہو گی یہاں تک کہ ایک ختم نہ ہونے والے انتظار کے بعد پیلار نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ دن بھر لیٹ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے چپکے چپکے گزشتہ رات کی یادوں کا مزہ لیتا۔ لیکن جب وہ گھر آتی شادماں، لاتعلق، بےہودہ تو خوزے آرکادیو کو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی چنداں ضرورت نہ پڑتی، کیونکہ اس عورت کا جس کے گونج دار قہقہے فاختاؤں کو خوفزدہ کر دیا کرتے، اس نادیدنی قوت سے کوئی واسطہ نہ تھا جس نے خوزے آرکادیو کو اپنی روح میں سانس لینا اور اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانا سکھایا تھا، اور اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ سمجھ سکے کہ مردوں کو موت سے خوف کیوں آتا ہے۔ خوزے آرکادیو اپنے آپ میں اتنا مگن تھا کہ جب اس کے باپ اور بھائی نے یہ مژدہ سنایا کہ وہ دھاتوں کے اس ملغوبے کو توڑنے اور ارسلا کا سونا الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، تو وہ سمجھ نہ پایا کہ گھر والے آخر کیوں اتنے خوش ہو رہے ہیں۔

وہ درحقیقت کئی دنوں کی پیچیدہ اور انتھک محنت کی وجہ سے کامیاب ہوئے تھے۔ ارسلا خوش تھی، یہاں تک کہ اس نے علم کیمیاگری کی ایجاد کے لیے خدا کا شکر ادا کیا جبکہ گاؤں کے لوگوں نے تجربہ گاہ پر یلغار کر دی اور گھر والوں نے بسکٹوں پر امرود کی جیلی لگا کر ان کی خاطر تواضع کی۔ اس شاندار کامیابی کا جشن منایا اور خوزے آرکادیو بوئندیا نے الگ کیا ہوا سونا لوگوں کو اس طرح دکھایا گویا وہ اس نے ایجاد کیا ہو۔ سب کو دکھانے کے بعد وہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس گیا جو گزشتہ چند دنوں سے تجربہ گاہ میں شاذونادر ہی نمودار ہوا تھا۔ خوزے آرکادیو بوئندیا نے پیلی خشک ڈھیری بیٹے کی آنکھوں کے سامنے لا کر پوچھا، "تمہیں یہ کیا نظر آتا ہے؟" خوزے آرکادیو سچائی سے بولا۔

"کتے کا پاخانہ"

خوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کو ایسا تماچہ رسید کیا کہ اس کے منہ سے خون اور

آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس رات پیلار نے اندھیرے میں روشنی اور ہوتل ٹٹول ٹٹول کر حوزے ارکادیو کے سوتے ہوئے منھ کی ارنیکا سے سکائی کی، اور ساتھ ساتھ وہ سب کچھ کیا جو وہ کرنا چاہتی تھی، اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ دونوں آپس میں قربت کی اس کیفیت کو پہنچ گئے کہ انھیں پتا ہی نہ چلا کہ کب انھوں نے آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کیں۔

"میں تمھارے ساتھ تنہا ہونا چاہتا ہوں،" اس نے کہا۔ "میں آج کل میں سب کو بتانے جا رہا ہوں۔ اور پھر ہم چوری چھپے رات کے اندھیرے میں ملنا بند کر دیں گے۔"

پیلار نے اس کو تسلی دینے کی کوشش نہ کی۔

"یہ بہت اچھا ہو گا،" وہ بولی۔ "اگر ہم تنہا رہیں تو میں لیمپ روشن رکھا کروں گی تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں، اور میں دل کھول کر شور مچا سکوں گی اور کوئی ٹوکنے والا نہ ہو گا، اور تم میرے کانوں میں جو بھی بکواس کرنا چاہو کر سکو گے۔"

اس گفتگو نے، اس چبھتی ہوئی عداوت نے جو اس کو اپنے باپ کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی اور ایک غیرتابع محبت کے امکان نے، حوزے ارکادیو کے اندر ایک بُردبار جرأت پیدا کر دی تھی۔ بےساختگی میں، بغیر کسی تیاری کے، حوزے ارکادیو نے اپنے بھائی کو سب کچھ بتا دیا۔

شروع میں چھوٹا اوریلیانو صرف خطرے کو سمجھ سکا، خطرے کے بےپناہ امکان کو جو اس کے بھائی کے کارنامے سے نتھی تھا، اور وہ اس شے کے طلسم کو نہ سمجھ پایا۔ رفتہ رفتہ فکر نے اسے آ جکڑا۔ خطروں کی تفصیلات کے بارے میں سوچ کر، اپنے بھائی کی اذیتوں اور لذتوں کا گمان کر کے، اس کو بیک وقت خوف اور مسرت محسوس ہوئی۔ وہ اس کے انتظار میں صبح تک آنکھیں کھولے بستر میں پڑا رہتا، اس تنہا بستر میں جس کے نیچے لٹکتا تھا کوئلے دہک رہے ہیں، اور پھر وہ لیٹے باتیں کیا کرتے، یہاں تک کہ بستر سے اٹھنے کا وقت آ جاتا؛ لہذا جلد ہی دونوں لڑکے دن میں غنودگی کا شکار رہنے لگے، ان کو کیمیاگری، اور باپ کے علم ودانش سے کوئی دلچسپی نہ رہی، اور دونوں تنہائی میں پناہ ڈھونڈتے۔ "یہ بچے پاگل ہو گئے ہیں،" ارسلا نے کہا۔ "یقیناً ان کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔" اس نے ایک بدذائقہ، کڑوا، کسیلا مشروب پیٹ کے کیڑے نکالنے والی جڑی بوٹی کو کچل کر بنایا، جسے ان دونوں نے غیرمتوقع آمادگی کے ساتھ پی لیا، اور وہ دونوں ایک ساتھ دن میں گیارہ دفعہ پاخانے گئے، اور سرخ رنگ کے کچھ کیڑے خارج کیے جو انھوں نے مسرت کے ساتھ سب کو دکھائے، تاکہ اس طرح وہ ارسلا کو اپنی لاتعلقی اور غنودگی کی اصل وجہ کی جانب سے فریب میں مبتلا رکھ سکیں۔ چھوٹے اوریلیانو کو نہ صرف اب سب کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا، بلکہ وہ اپنے بھائی کے تجربات کو اپنا سمجھ کر تصور ہی تصور میں ان تمام کیفیات سے گزرنے لگا کیونکہ ایک موقعے پر جب حوزے ارکادیو تفصیل کے ساتھ محبت کی ترکیبیں اسے سمجھا رہا تھا، اوریلیانو نے بات روک کر پوچھا، "کیسا محسوس ہوتا ہے؟" حوزے ارکادیو نے فوراً جواب دیا،

"یہ زلزلے کی طرح ہوتا ہے۔"

جنوری کی ایک جمعرات کو دو بجے رات امارانتا پیدا ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ لوگ کمرے

میں داخل ہوتے، ارسلا نے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا۔ وہ ہلکی پھلکی ریگ ماہی کی طرح تھی، لیکن اس کے تمام اعضا انسانی تھے۔ اوریلیانو اس نئی چیز کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوا جب تک گھر لوگوں سے بھر نہ گیا۔ افراتفری کے پردے میں وہ اپنے بھائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو گیارہ بجے رات سے غائب تھا، یہ ایک اتنا اضطراری فیصلہ تھا کہ اسے خود سے یہ بھی پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ وہ اپنے بھائی کو پیلار ترنیرا کے کمرے سے کیسے نکالے گا۔ اس نے اس کے گھر کے کئی چکر لگاتے سیٹیاں بجائیں، یہاں تک کہ پو پھٹنے لگی، اور اسے مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ ماں کے کمرے میں اس نے دیکھا کہ حوزے ارکادیو معصوم سا چہرہ لیے نومولود بہن سے کھیل رہا ہے۔

ارسلا نے ابھی چلّہ بھی ختم نہ کیا تھا کہ خانہ بدوش پھر وارد ہو گئے۔ اور یہ وہی شعبدہ باز اور جادوگر تھے جو برف لے کر آئے تھے۔ ملکیادیس کے قبیلے کے برعکس، انھوں نے یہ بات جلد ہی واضح کر دی کہ وہ ترقی کے پیامبر نہیں، بلکہ تفریح کے میرساماں ہیں۔ یہاں تک کہ جب انھوں نے برف ان کے سامنے پیش کی تھی تب بھی انسانی زندگی کے لیے اس کے فوائد کی تشہیر نہیں کی تھی بلکہ اسے صرف سرکس کے ایک عجوبے کے طور پر دکھایا تھا۔ اس دفعہ، دوسری بہت سی صنعتی اشیا کے ساتھ، وہ اڑنے والا قالین بھی لائے۔ لیکن انھوں نے اسے حمل ونقل کی ترقی کی ایک مظہر کے بجائے ایک تفریحی شے کے طور پر پیش کیا۔ لوگوں نے فوراً اپنے آخری سکوں کو کھود کر نکالا، تاکہ گاؤں کے گھروں کے اوپر اڑنے کا مزہ لوٹ سکیں۔ ایک اجتماعی افراتفری کے مسرت آمیز پردے میں، حوزے ارکادیو اور پیلار نے کئی خوش گوار گھنٹے ایک دوسرے کی قربت میں گزارے۔ وہ ہجوم میں ایک خوش وخرم، محبت میں گرفتار جوڑے کی مانند گھومتے رہے یہاں تک کہ خود انھیں بھی شبہ ہونے لگا کہ محبت ایک ایسا احساس بھی ہو سکتی ہے جو ان کی خفیہ ملاقاتوں کی بےلگام لیکن لمحاتی مسرت سے زیادہ گمبھیر اور فرحت بخش ہو۔ پیلار نے البتّہ اس طلسم کو توڑ دیا۔ حوزے ارکادیو کے جوش وخروش سے جو اس میں اس کی قربت سے پیدا ہوا تھا، متاثر ہو کر، پیلار نے موقعے اور دستور کو خلط ملط کر کے اچانک حوزے ارکادیو کے سر پر آسمان ڈھا دیا۔ "تم اب واقعی ایک مرد ہو چکے ہو،" اس نے کہا۔ اور چونکہ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ پیلار کی بات کا کیا مطلب ہے، اس نے وضاحت کی۔

"تم باپ بننے والے ہو۔"

چند روز تک حوزے ارکادیو کو گھر سے نکلنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ باورچی خانے میں پیلار کے گونجتے ہوئے قہقہے سن کر وہ بھاگ کر تجربہ گاہ میں پناہ لیتا، جہاں ارسلا کی رضامندی سے کیمیاگری کے آلات میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اپنے گمراہ بیٹے کو مسرت کے ساتھ تجربہ گاہ میں خوش آمدید کہا، اور اسے پارس پتھر کی تلاش سے روشناس کرایا جو اس نے بالآخر شروع کر دی تھی۔ ایک سہ پہر لڑکے تجربہ گاہ کی کھڑکی کے قریب سے تیزی سے اڑتے ہوئے قالین کو دیکھ کر، جس پر خانہ بدوش اور گاؤں کے بچے بیٹھے ہاتھ ہلا رہے تھے، جوش میں آ گئے لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ "انھیں خواب دیکھنے دو،" اس نے کہا۔ "ہم ان سے بہتر طریقے پر پرواز کریں گے۔ ایک

کھیت سی بستر کی چادر میں کہیں بہتر سائنسی وسائل کے ساتھ۔" گو کہ اس نے دلچسپی کا ڈھونگ رچایا، حوزے آرکادیو پارس پتھر کی قوتوں کو سمجھ نہ پایا جو اسے ایک بے ڈھنگی بوتل کی مانند نظر آتا تھا۔ وہ اپنی فکروں سے آزاد ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس کی بھوک، چڑچڑاپن اور آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ وہ بدمزاجی کا شکار ہو گیا بالکل اسی طرح جس طرح اس کا باپ اپنے تجربات کی ناکامی پر ہو جایا کرتا تھا، اور اس کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کو تجربہ گاہ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا یہ سوچ کر کہ … وہ کیمیاگری کو دل پر لے گیا ہے۔ اوریلیانو بیٹا سمجھ چکا تھا کہ اس کے بھائی کی پریشانی کا سبب پارس پتھر کی تلاش نہیں لیکن وہ اس کا اعتماد حاصل نہ کر سکا۔ حوزے آرکادیو اپنی پوری بے تکلفی کھو بیٹھا تھا۔ وہ ایک زندہ دل اور بے تکلف شخص سے اپنی ذات میں سمٹے ہوئے بدمزاج انسان میں بدل گیا تھا۔ دنیا سے منہ پھیر کر تنہائی کی تلاش میں ایک رات وہ حسب معمول گھر سے نکلا، لیکن پیلار ترنیرا کے گھر نہ گیا بلکہ میلے کی گہما گہمی میں جا کر گم ہو گیا۔ سب تماشوں کو بغیر کسی دلچسپی کے دیکھنے کے بعد اس کو ایک ایسی شے نظر آئی جو اس میلے کا حصہ نہ لگتی تھی وہ ایک بے حد نوعمر خانہ بدوش لڑکی تھی، تقریباً ایک بچی، جو سنکوں موتیوں کے بوجھ تلے جھکی جاتی تھی اور اس سے زیادہ حسین لڑکی حوزے آرکادیو نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ وہ اس مجمعے میں کھڑی تھی جو والدین کی نافرمانی کرنے کے سبب ایک شخص کے سانپ کے قالب میں ڈھل جانے کا مغموم تماشا دیکھ رہا تھا۔

حوزے آرکادیو نے تماشے پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب سانپ نما آدمی سے تکلیف دہ پوچھ گچھ ہو رہی تھی، وہ مجمعے کو چیرتا ہوا قطار تک جا پہنچا جہاں وہ لڑکی کھڑی تھی، اور اس کے پیچھے جا کر رک گیا۔ اس نے لڑکی کی پشت پر دباؤ ڈالا۔ لڑکی نے ہٹنے کی کوشش کی لیکن وہ زیادہ قوت کے ساتھ اس کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تب لڑکی نے اسے محسوس کیا۔ وہ ساکت کھڑی رہی، سہمی اور خوف سے لرزتی، … اس کے لمس کا یقین نہیں … اور بالآخر اس نے ایک لرزتی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے مڑ کر حوزے آرکادیو کو دیکھا۔ اسی لمحے دو خانہ بدوشوں نے سانپ نما آدمی کو پنجرے میں ڈالا اور خیمے کے اندر لے گئے۔ ایک خانہ بدوش نے جو تماشا پیش کر رہا تھا اعلان کیا:

"اور اب خواتین و حضرات، ہم آپ کے سامنے اس عورت کی خوفناک آزمائش کا تماشا پیش کرتے ہیں، جس کا سر ڈیڑھ سو سال سے قلم کیا جا رہا ہے یہ سزا اسے اس بات کی مل رہی ہے کہ اس نے وہ دیکھ لیا جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔"

حوزے آرکادیو اور خانہ بدوش لڑکی نے عورت کا سر قلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مجمعے سے نکل کر لڑکی کے خیمے میں چلے گئے، جہاں انہوں نے کپڑے اتارتے ہوئے ایک بے خوف اشتیاق کی کیفیت میں ایک دوسرے کو بوسے دیے۔ خانہ بدوش لڑکی نے کلف دار لیس کی قمیص اور انگیا اتاری۔ اب اس کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ اپنی ابتدائی پستانوں اور پتلی پتلی ٹانگوں کے ساتھ جو حوزے آرکادیو کے بازوؤں سے بھی پتلی تھیں، وہ ایک چھوٹے سے کمزور مینڈک کی مانند لگ رہی تھی لیکن اس کی قوت فیصلہ اور حرارت نے اس کی کمزوری چھپ

لی تھی۔ لیکن پھر بھی حوزے آرکادیو پر اس کی گرمی کا اثر نہ ہوا، کیوں کہ وہ ایک خیمۂ عام تھا جہاں خانہ بدوش کھیل تماشوں کی اشیا لیے آ جا رہے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف تھے، یہاں تک کہ وہ بستر کے قریب پانسہ کھیلنے کے لیے توقف بھی کرتے۔ لیمپ نے، جو وسط میں ایک کھمبے سے لٹک رہا تھا، تمام خیمے کو روشن کر رکھا تھا۔ گرمجوشیوں کے ایک وقفے میں حوزے آرکادیو، یہ جانے بغیر کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے، بستر میں دراز ہو گیا، جبکہ لڑکی اس کے جذبات جگانے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد ایک بھرپور جسم والی خانہ بدوش عورت ایک آدمی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوئی، جو نہ خانہ بدوشوں میں سے تھا اور نہ گاؤں کا باسی تھا اور وہ دونوں بستر کے قریب آ کر کپڑے اتارنے لگے۔ عورت نے لیٹے ہوئے آرکادیو پر یونہی ایک نظر ڈالی اور ایک جاں گداز شوق کے ساتھ اس کے شاندار آسودہ عضو کا معائنہ کیا۔

"میرے بیٹے،" اس نے کہا "خدا تم کو سلامت رکھے، اسی طرح جیسے کہ تم ہو۔"

حوزے آرکادیو کی ساتھی نے ان سے کہا کہ وہ ان کو تنہا چھوڑ دیں اور وہ جوڑا بستر کے قریب فرش پر لیٹ گیا۔ ان کے شہوانی اختلاط سے حوزے آرکادیو کے جذبات جاگ اٹھے۔ پہلے لمس کے ساتھ ہی لڑکی کے جسم کی ہڈیوں کا ایک ایک جوڑ چٹخ کر گوٹیوں کے ڈبے کی طرح کھل گیا، اس کی جلد پر پسینے کے قطرے ابھر آئے، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، اور اس کے جسم سے مٹی کی موہوم سی خوشبو اور ایک غمگین صدا پھوٹنے لگی۔ لیکن اس نے اس امتحان کو اپنی مضبوط خاصیت اور ایک قابل تحسین بہادری کے ساتھ برداشت کیا۔ حوزے آرکادیو نے خود کو فضا میں، ایک ملکوتی تاثر کی کیفیت کی جانب بلند ہوتے ہوئے محسوس کیا اور اس کا دل محبت بھرے فحش فقروں سے بھر گیا جو اس نے لڑکی کے کانوں میں انڈیل دیے اور جو لڑکی کے منہ سے اس کی اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر نکلے۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ سنیچر کے روز حوزے آرکادیو نے ایک سرخ کپڑا سر پر پہنا اور خانہ بدوشوں کے ساتھ نکل گیا۔

جب ارسلا کو اس کی غیرموجودگی کا علم ہوا تو اس نے حوزے آرکادیو کو پورے گاؤں میں تلاش کیا۔ جس مقام پر خانہ بدوشوں نے اپنے خیمے لگائے تھے وہاں کوڑے کے ڈھیر اور بجھے ہوئے الاؤ سے دھواں دیتی راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی نے جو کوڑے پر سے منکے چن رہا تھا ارسلا کو بتایا کہ ایک رات پہلے اس نے ارسلا کے بیٹے کو کاروان کی ہنگامہ آرائی میں سانپ نما آدمی کا پنجرہ دھکیلتے دیکھا تھا۔ "وہ خانہ بدوش ہو گیا ہے" ارسلا نے چیخ کر اپنے شوہر کو اطلاع دی، جس نے بیٹے کی گمشدگی پر ذرا بھی تشویش کا اظہار نہ کیا تھا۔

"کاش یہ بات سچ ہو،" حوزے آرکادیو بوئندیا نے ہاون دستے میں اس شے کو کوٹتے ہوئے کہا جسے وہ ہزاروں دفعہ پیس کر گرم کرنے کے بعد دوبارہ کوٹ رہا تھا۔ "اس طرح وہ مرد بننا سیکھ لے گا۔"

ارسلا نے لوگوں سے پوچھا کہ خانہ بدوش کس سمت گئے ہیں۔ وہ اس راستے پر پوچھتی پوچھتی آگے نکلتی چلی گئی، اس خیال میں کہ خانہ بدوشوں کو جا پکڑے گی۔ وہ … سے دور ہوتی گئی یہاں تک کہ اس نے اتنی مسافت طے کر لی کہ واپس پہنچنے کا خیال ہی نہ رہا۔ حوزے

ارکادیو بوئندیا کو رات کے آٹھ بجے اس وقت اپنی بیوی کے لاپتا ہو جانے کا علم ہوا جب وہ اس ملغوبے کو گوبر کی کیاری میں گرم ہونے کے لیے رکھ کر، ننھی امارانتا کے رونے کی آواز سن کر یہ دیکھنے کے لیے اندر گیا کہ بچی کو کیا ہوا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس نے سازوسامان سے لیس لوگوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا، اور امارانتا کو ایک عورت کے حوالے کر کے، جس نے اس کو دودھ پلانے کی ذمےداری لی، ارسلا کی تلاش میں ان دیکھی راہوں پر نکل کھڑا ہوا۔ اوریلیانو ان کے ساتھ تھا۔ چند مقامی مچھیروں نے، جن کی زبان وہ نہ سمجھ سکے اشاروں کی مدد سے بتایا کہ انھوں نے اس راستے سے کسی کو گزرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تین دن کی ناکام تلاش کے بعد وہ گاؤں لوٹ آئے۔

خوزے ارکادیو بوئندیا کئی ہفتے پریشانی کے عالم میں رہا۔ اس نے ننھی امارانتا کا ایک ماں کی طرح خیال رکھا۔ وہ اس کو نہلاتا کپڑے بدلاتا، دن میں چار دفعہ عورت کے گھر دودھ پلوانے لے جاتا، یہاں تک کہ رات کو اسے لوریاں بھی دیتا جو ارسلا کو کبھی سنانی نہ آئی تھیں۔ ایک دن پیلار نے گھر کا کام کاج اپنے ذمے لینے کی پیشکش کی۔ اوریلیانو کو، جس کی پراسرار حس اس افتاد کے بعد اور تیز ہوگئی تھی، پیلار کو آتے دیکھ کر ایک الہام سا ہوا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ پیلار کسی ناقابلِ بیان طریقے سے اس کے بھائی کے فرار اور اس کی ماں کی گمشدگی کی ذمےدار ہے اور اس نے پیلار کو ایک خاموش اور کٹھور عداوت کے ساتھ اس طرح دیکھا کہ وہ اس گھر میں پھر کبھی داخل نہ ہوئی۔

وقت نے سب کچھ معمول کے مطابق کر دیا۔ خوزے ارکادیو بوئندیا اور اس کے بیٹے کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ کب وہ تجربہ گاہ میں واپس لوٹے، گردوغبار صاف کیا، پانی کی ٹنکیاں سلگائیں اور دوبارہ دھات کے اس ملغوبے کو گوبر سے نکالا جہاں وہ مہینوں سے پڑا سو رہا تھا۔ ننھی امارانتا بید کی ٹوکری میں لیٹی تجسس سے اپنے باپ اور بھائی کو تجربوں میں ڈوبا ہوا دیکھا کرتی، اس چھوٹے سے کمرے میں جس کی فضا پارے کے بخارات کی موجودگی سے لطیف ہو گئی تھی۔ ارسلا کے جانے کے چند ماہ بعد، ایک خاص موقعے پر عجیب وغریب واقعات رونما ہونے لگے۔ ایک خالی فلاسک جو الماری میں مدتوں سے رکھا ہوا تھا اتنا بھاری ہو گیا کہ اسے ہلانا مشکل ہو گیا، برتن میں رکھا پانی بغیر آگ پر چڑھے ابلنے لگتا یہاں تک کہ بخارات بن کر اڑ جاتا۔ خوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے بیٹے نے یہ عجیب وغریب کرشمے حیرانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھے۔ ایک دن امارانتا کی ٹوکری نے خودبخود ہلنا شروع کر دیا اور کمرے میں گردش کرنے لگی اور اوریلیانو نے پریشانی کے عالم میں اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا باپ اس واقعے سے مضطرب نہ ہوا۔ اس نے ٹوکری کو اس کی جگہ پر رکھ کر میز کے پائے سے باندھ دیا، اس یقین کے ساتھ کہ جس واقعے کا اسے مدتوں سے انتظار تھا، وہ رونما ہونے والا ہے۔ یہی وہ موقع تھا جب اوریلیانو نے اپنے باپ کو کہتے سنا:

"اگر تمھیں خدا کا خوف نہیں، تو دھاتوں کے ذریعے اس سے ڈرو۔"

ارسلا تقریباً پانچ ماہ بعد اچانک واپس آ گئی۔ وہ ہشاش بشاش، تجدیدِ شباب کے ساتھ جوش میں مست، اور نئے کپڑوں میں ملبوس لوٹی جن کی وضع قطع گاؤں میں پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔ ارسلا کی واپسی کا خوزے آرکادیو بوئندیا پر اتنا اثر ہوا کہ اس سے کھڑا نہ ہوا

جاتا تھا۔ "تو یہ بات تھی؟" وہ چلایا۔ "مجھے معلوم تھا یہ ہونے والا ہے۔" اور اسے واقعی اس کا یقین تھا، کیونکہ اس طویل قید کے دوران، جب وہ دھاتوں کے تجربات میں مصروف تھا، اس نے دل کی گہرائیوں سے تمنا کی تھی کہ وہ معجزہ جو ظہور میں آنے والا ہے، پارس پتھر کی دریافت، اس سانس کی آزادی جس سے خوابیدہ دھاتیں جی اٹھیں، یا وہ قوت جس سے گھر کے تالے اور چوکھٹیں سونے میں بدل جاتیں، نہ ہو، بلکہ وہی ہو جو ہوا؛ ارسلا کی واپسی۔ لیکن ارسلا اس گرم جوشی میں شریک نہ ہوئی۔ اس نے خوزے ارکادیو بوئندیا کو ایک روایتی بوسہ دیا، گویا وہ محض ایک گھنٹے بعد گھر لوٹی ہو، اور کہا:

"دروازے کے باہر تو دیکھنا۔"

خوزے آرکادیو بوئندیا نے جب باہر جا کر گلی میں مجمعے کو دیکھا تو شش وپنج سے نکلنے میں اسے کافی وقت لگا۔ وہ خانہ بدوش نہ تھے۔ وہ انھی جیسے مرد اور عورتیں تھیں، سیدھے بالوں اور سانولی رنگت والے لوگ، جو انھی کی زبان بولتے اور انھی تکلیفوں کا رونا روتے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کی اشیا سے لدے خچر تھے، اور بیل گاڑیاں جن پر گھریلو استعمال کے برتن لدے ہوئے تھے۔ سیدھی سادی دنیاوی اشیا جنھیں روزمرہ کی دنیا کے خوانچہ فروش بغیر کسی شوروشرابے کے بیچ رہے تھے۔ وہ دلدلی علاقے کے اُس پار سے آئے تھے جو صرف دو دن کے فاصلے پر تھا، جہاں ایسے قصبے تھے جن میں سال کے ہر ماہ ڈاک پہنچا کرتی تھی اور جن کے باشندے عمدہ رہن سہن کے طورطریقوں سے واقف تھے۔ ارسلا کو خانہ بدوش تو نہ ملے تھے، لیکن اس نے وہ راستا پا لیا تھا جو اس کا شوہر اپنی شاندار ایجادات کی بےنتیجہ جستجو کے دوران دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

پیلار ترنیرا کے بیٹے کو اس کی پیدائش کے دو ہفتے بعد دادا دادی کے گھر لے آیا گیا۔ ارسلا نے بے ناخوشی سے گھر میں داخل کیا، اپنے شوہر کی ضد کے آگے ایک بار پھر بے بس ہو کر، جو یہ خیال برداشت نہ کر سکتا تھا کہ اس کا خون اس سے دور رہے، لیکن اس نے یہ شرط عائد کی کہ بچے کو اس کے اصل حسب نسب کا کبھی پتا نہ چلے۔ گو کہ بچے کو حوزے ارکادیو کا نام دیا گیا، سب لوگ صرف ارکادیو کہہ کر پکارتے تاکہ الجھن نہ ہو۔ اُن دنوں گاؤں میں اتنی گہماگہمی اور گھر میں اتنی چہل پہل تھی کہ بچوں کی دیکھ بھال کا کام ثانوی سطح پر چلا گیا تھا۔ بچوں کو ویزیتاسیون، ایک مقامی گواہیرو عورت، کے حوالے کر دیا گیا تھا، جو اپنے بھائی کے ساتھ قصبے پہنچی تھی بے خوابی کی وبا سے فرار ہو کر جو اُن کے قبیلے میں کئی سالوں سے پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اتنے اطاعت گزار اور مدد کے لیے تیار تھے کہ ارسلا نے انھیں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے رکھ لیا۔ اس طرح ارکادیو اور اماراننا ہسپانوی زبان سیکھنے سے پہلے گواہیرو بولنے لگے تھے، اور انھوں نے چھپکلی کا شوربا اور مکڑیوں کے انڈے کھانا سیکھ لیے جس کا علم ارسلا کو نہ ہوا، جو اپنے شکر کے جانوروں کے بڑھتے ہوئے کاروبار میں بے حد مصروف رہنے لگی تھی۔ ماکوندو میں تبدیلی آ گئی تھی۔ جو لوگ ارسلا کے ساتھ آئے تھے انھوں نے یہ خبر پھیلا دی کہ یہاں کی زمین بہت عمدہ ہے اور دلدلی علاقے کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ لہٰذا ماکوندو پرانے وقتوں کے چھوٹے سے گاؤں سے یک دم قصبے میں بدل گیا، دکانوں، کارگاہوں اور ایک باقاعدہ تجارتی راستے والا قصبہ، جس سے عرب ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنے اور کانوں میں بالے لٹکائے آتے، اور کانچ کے منکوں کے

عوض طوطے لیا کرتے۔ حوزے ارکادیو بوئندیا کو ایک لمحے کا آرام نہ ملتا۔ سامنے کی حقیقت کے سحر میں آ کر، جو اس کے تخیل کی وسیع کائنات سے زیادہ انوکھی تھی، وہ کیمیاگری میں تمام دلچسپی کھو بیٹھا، اس نے وہ مادہ اٹھا کر رکھ دیا جو مہینوں کے جوڑتوڑ سے رقیق ہو چلا تھا، اور دوبارہ پرانے دنوں والا ایک پُرعزم آدمی بن گیا، جب اس نے گاؤں کا نقشہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ کوئی شخص ایسی مراعات نہ پا سکے جو سب کو حاصل نہ ہوں۔ نئے آنے والوں میں اس کو اتنا استناد حاصل ہو گیا کہ اس سے مشورہ کیے بغیر نہ گھر کی بنیاد ڈالی جاتی اور نہ دیواریں کھڑی کی جاتیں، اور فیصلہ کیا گیا کہ زمین کی تقسیم کا نگران اسے بنایا جائے۔ جب کرتب دکھانے والے خانہ بدوش واپس آئے، جن کا آوارہ کارنیوال تقدیر اور اتفاقات کے کھیلوں کے ایک عظیم الشان ادارے میں بدل گیا تھا، تو ان کا بے حد مسرت کے ساتھ استقبال کیا گیا کیوں کہ خیال یہ تھا کہ حوزے ارکادیو ان کے ساتھ واپس آیا ہو گا لیکن حوزے ارکادیو واپس نہ آیا تھا، اور نہ ہی وہ سانپ نما آدمی ان کے ساتھ تھا جو ارسلا کے خیال میں واحد شخص تھا جو حوزے ارکادیو کے بارے میں ان کو کچھ بتا سکتا تھا، لہٰذا خانہ بدوشوں کو قصبے میں پڑاؤ ڈالنے کی اجازت نہ ملی اور انھیں آئندہ وہاں قدم نہ رکھنے کی تنبیہ کی گئی، کیوں کہ انھیں شہوت پرستی اور جنسی کجروی کا پیامبر سمجھا جاتا تھا۔ حوزے ارکادیو بوئندیا نے البتہ صاف لفظوں میں واضح کر دیا کہ ملکیادیس کے پرانے قبیلے کے لیے گاؤں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے، جس نے گاؤں کی ترقی اور خوشحالی میں اپنے علم ودانش اور شاندار ایجادات کے ذریعے معاونت کی تھی۔ لیکن ملکیادیس کا قبیلہ، بقول ان خانہ بدوشوں کے، روئے زمین سے فنا ہو چکا تھا، کیوں کہ وہ انسانی علم کی حدوں سے پرے نکل گیا تھا۔

تخیل کے عذاب سے کم از کم کچھ عرصے کے لیے آزاد ہو کر، حوزے ارکادیو بوئندیا نے مختصر سی مدت میں نظم و ضبط اور کام کا ایک نظام ترتیب دیا جس میں صرف ایک آزادی کی گنجائش رکھی گئی: ان پرندوں کی آزادی جنھوں نے ماکوندو کی بنیاد پڑنے سے اب تک وقت کی گزراں کو خوش لحان نغموں سے پُرمسرت کیا تھا، اور ان کی جگہ ہر گھر میں موسیقی والی گھڑیاں نصب کی گئیں۔ وہ شاندار گھڑیاں منقش لکڑی کی بنی ہوئی تھیں جو عربوں نے طوطوں کے عوض انھیں دی تھیں، اور جنھیں حوزے ارکادیو بوئندیا نے اس صراحت سے ہم وقت کیا تھا کہ پورا گاؤں ہر آدھ گھنٹے بعد ایک ہی نغمے کے اٹھتے ہوئے سروں سے جھوم اٹھتا، وہ نغمہ جو عین دوپہر کے وقت اپنے عروج پر پہنچتا، ایک مکمل والز کی طرح درست اور ہم آواز۔ یہ حوزے ارکادیو بوئندیا ہی تھا جس نے ان برسوں میں یہ فیصلہ کیا کہ انھیں کیکر کی جگہ گلیوں میں بادام کے درخت لگانے چاہییں، اور اسی نے ایسا طریقہ دریافت کیا، جو اس نے کسی کو نہ بتایا، جس سے وہ درخت ہمیشہ ہرے بھرے رہتے۔ بہت برسوں بعد، جب ماکوندو جست کی چادروں والے لکڑی کے گھروں کے ایک میدان میں تبدیل ہو گیا تھا، بادام کے شکستہ اور گردآلود درخت قدیم ترین گلیوں میں اب بھی کھڑے تھے، جو کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس نے لگائے تھے۔ جن دنوں اس کا باپ گاؤں کا نظام درست کر رہا تھا اور اس کی ماں شکر کی مچھلیوں اور مرغیوں کے شاندار کاروبار سے گھر کی دولت میں اضافہ کر رہی تھی جس کی

وجہ سے گھر میں دن میں دو دفعہ سالسا لکڑی کی ڈنڈیاں لٹکائی جاتیں، اوریلیانو کھنڈروں اس ترک کردہ تجربہ گاہ میں گزارتا اور خود تجربے کر کر کے چاندی کا کام سیکھتا۔ مختصر سی مدت میں اس نے اتنی تیزی سے قد نکالا کہ بڑے بھائی کے چھوڑے ہوئے کپڑے اس پر تنگ ہونے لگے اور وہ اپنے باپ کے کپڑے پہننے لگا۔ لیکن وسیتاسیون کو قمیصوں اور پتلونوں میں چنٹیں ڈالنی پڑتی تھیں کیونکہ اوریلیانو پر دوسرے لوگوں جیسا مٹاپا نہ چڑھا تھا۔ بلوغت نے اس کی آواز کی نرمی ختم کر دی تھی اور اس کو خاموش طبع اور قطعی طور پر تنہا کر دیا تھا، لیکن دوسری طرف اس کی آنکھوں میں تاثرات کی وہ شدت دوبارہ عود کر آئی تھی جو پیدائش کے وقت تھی۔ وہ چاندی کے کام پر اتنی توجہ مرکوز رکھتا کہ بمشکل کھانا کھانے کے لیے تجربہ گاہ سے نکلتا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا اس کی اندر ہی اندر سمٹنے سے اتنا متفکر ہوا کہ اس نے یہ سوچ کر کہ شاید اسے عورت کے پاس جانے کی ضرورت ہے اسے گھر کی چابیاں اور کچھ پیسے دیے لیکن اوریلیانو نے وہ پیسے اپ شاہی تیار کرنے کے لیے جوہر نمک خریدنے میں لگا دیے، اور چابیوں پر سونے کا پانی چڑھا کر انہیں خوبصورت بنا دیا۔ اس کی بےاعتدالی کا ارکادیو اور امارنت کی حرکتوں سے مقابلہ نہ ہو سکتا تھا، جن کے دودھ کے دانت ٹوٹ چکے تھے اور نئے دانت نمودار ہو رہے تھے اور جو مقامی انڈین لوگوں کی سی عبائیں گھسیٹتے پھرتے۔ اس بات پر اڑے رہتے کہ ہسپانوی نہیں بلکہ گواجیرو ہی بولیں گے۔ "تمھیں شکایت نہیں کرنی چاہیے،" ارسلا نے اپنے شوہر سے کہا۔ "بچوں کو والدین کا پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔" اور جب وہ اپنی قسمت کو کوس رہی تھی اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بچوں کی وحشیانہ حرکتیں اتنی ہی خوفناک ہیں جتنی کہ سؤر کی دم، اوریلیانو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا کہ وہ مذبذب میں مبتلا ہو گئی۔

"کوئی آ رہا ہے،" اس نے ارسلا کو بتایا۔

ارسلا نے اس پیش گوئی کو گھریلو عورت کی منطق سے سمجھنا چاہا، جیسا کہ وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی جب بھی اوریلیانو اس قسم کی بات کرتا۔ کسی کا آنا عام بات تھی۔ روزانہ درجنوں اجنبی، بغیر شکوک وشبہات ابھرے اور بغیر کسی اسرار کے، ماکوندو آیا کرتے۔ بہرحال ہر منطق سے بالاتر اوریلیانو کو اپنی پیش گوئی پر پورا یقین تھا۔

"میں نہیں جانتا وہ کون ہو گا،" اس نے اصرار کیا، "لیکن وہ جو کوئی بھی ہے، روانہ ہو چکا ہے۔"

اس اتوار درحقیقت ربیکا پہنچی۔ وہ صرف گیارہ سال کی تھی۔ اس نے مانورے سے ماکوندو تک کا کٹھن سفر چمڑے کے چند تاجروں کے ہمراہ طے کیا تھا، جنھوں نے ربیکا کو ایک خط سمیت حوزے ارکادیو بوئندیا تک پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی لیکن وہ ٹھیک سے سمجھا نہ پائے کہ آخر وہ کون شخص تھا جس نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا۔ ربیکا کا سازوسامان صرف ایک چھوٹے سے صندوق، رنگ دار پھولوں سے مزین ایک جھولنے والی کرسی اور ایک ٹاٹ کی بوری پر مشتمل تھا، جس سے کلاک کلاک کی آواز نکلتی، اور جس میں وہ اپنے والدین کی ہڈیاں لیے پھرتی تھی۔ وہ گرم جوش خط جو حوزے آرکادیو بوئندیا کے نام تھا، کسی ایسے شخص کی طرف سے لکھا گیا تھا، جو اب تک، زمان ومکان کے فاصلوں کے

باوجود، اس سے محبت کرتا تھا، اور جس نے ایک بنیادی انسانی ہمدردی کے تحت اس بےسہارا یتیم بچی کو اس کے پاس بھیجا تھا وہ ارسلا کی رشتے کی بہن تھی اور اس طرح اس کا حوزے آرکادیو بوئندیا سے بھی دور کا رشتہ نکلتا تھا، اس لیے کہ وہ اس کے کبھی نہ بھلائے جانے والے دوست نکانور اُلویا اور اس کی نیک بیوی ربیکا مونتیئل کی بیٹی تھی، خدا ان دونوں روحوں کو اپنی امان میں رکھے، اور ان کی ہڈیاں ساتھ لے کر آئی تھی تاکہ عیسائی طریقے سے ان کو دفنایا جا سکے۔ خط میں دیے گئے نام اور دستخط صاف صاف پڑھے جاتے تھے، لیکن نہ حوزے ارکادیو بوئندیا کو اور نہ ارسلا کو اس نام کے کسی رشتےدار کا علم تھا، اور نہ ہی انھوں نے آج تک مانورے گاؤں کا نام سنا تھا۔ لڑکی سے کوئی مزید معلومات حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جس وقت سے وہ آئی تھی، جھولنے والی کرسی میں انگوٹھا چوستی ہوئی، ہر ایک کو اپنی بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے اور حرکات سے اس سے کیے جانے والے سوالات کے سمجھنے کے کوئی آثار نہ پائے جاتے تھے۔ وہ آڑی دھاریوں والا، کالے رنگ میں رنگا ہوا لباس پہنے تھی جو پرانا نظر آتا تھا۔ اس نے پٹی دار چمڑے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال کانوں کے پیچھے کالے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی جس پر بنی شبیہیں پسینے سے مٹ چکی تھیں اور دائیں کلائی میں نظر بد کے حفاظتی تعویذ کے طور پر گوشت خور جانور کے دانتوں سے منڈھا ہوا ایک تانبے کا کڑا تھا۔ اس کی سبزی مائل جلد اور ڈھول کی طرح تنا ہوا گول پیٹ اس کی خرابیِ صحت اور بھوک کی نشان دہی کرتا تھا، جس کی عمر اس کی عمر سے زیادہ تھی، لیکن جب انھوں نے اسے کچھ کھانے کو دیا تو وہ پلیٹ کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھی رہی اور کچھ نہ چکھا۔ ان لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ وہ گونگی بہری ہے، یہاں تک کہ مقامی لوگوں نے اپنی زبان میں اس سے پوچھا کہ آیا اسے پانی چاہیے، اور اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں، جیسے انھیں پہچان رہی ہو، اور سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

انھوں نے بچی کو رکھ لیا، کیونکہ اس کے سوا وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے اسے ربیکا پکارنے کا فیصلہ کیا جو خط کے مطابق اس کی ماں کا نام تھا، کیونکہ اوریلیانو نے انتہائی تحمل کے ساتھ تمام ولیوں کے نام لیے اور کسی بھی نام پر اس نے ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ چونکہ اس وقت تک ماکوندو میں قبرستان نہ تھا، انھوں نے ہڈیوں کی بوری کو تدفین کے مناسب مقام کی تلاش کے انتظار میں رکھا رہنے دیا اور ایک طویل عرصے تک وہ بوری ہر جگہ نظر آتی اور مرغی کی کڑکڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ ایسی جگہ پائی جاتی جہاں اس کے ہونے کی کوئی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ ربیکا کو اس خاندان کی زندگی کا حصہ بننے میں طویل عرصہ لگا۔ وہ گھر کے کسی دوردراز کونے میں اپنی چھوٹی سی جھولنے والی کرسی پر بیٹھی انگوٹھا چوسا کرتی۔ اسے کوئی چیز متوجہ نہ کرتی سوائے گھڑیوں کی موسیقی کے، جس کے بعد وہ ہر آدھ گھنٹے بعد اپنی خوفزدہ آنکھیں اٹھا کر یوں دیکھتی گویا وہ ہوا میں دکھائی دینے والی ہو۔ وہ اسے کئی دنوں تک کھانے پر مائل نہ کر سکے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اب تک بھوک سے مر کیوں نہیں گئی، یہاں تک کہ مقامی انڈین لوگوں نے، جو کئی باتوں سے باخبر تھے، اور جو گھر میں دبےپاؤں بغیر کسی آہٹ کے آیا جایا کرتے، دریافت کیا کہ ربیکا

صرف آنگن کی گیلی مٹی اور دیواروں کا چونا کھانا پسند کرتی ہے، جو وہ اپنے ناخونوں سے کھرچ کر نکالا کرتی۔ یہ بات واضح تھی کہ اس کے والدین نے، یا جس کسی نے اس کی پرورش کی، اس کی اس عادت پر خاصی سرزنش کی تھی، کیوں کہ وہ یہ کام چھپ کر اور ایک احساسِ جرم کے ساتھ کرتی اور اس کوشش میں رہتی کہ کچھ مٹی چوری چھپے رکھے اور جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو، چپکے چپکے کھائے۔ تب سے انھوں نے اس کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ انھوں نے آنگن میں گائے کا گوبر پھیلا دیا اور دیواروں پر تیز مرچیں مل دیں، اس امید پر کہ اس طرح وہ اس کی مہلک عادت کو شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن اس نے مٹی حاصل کرنے میں نئی ہوشیاری اور چترائی دکھائی کہ ارسلا کو مجبوراً سخت اقدامات کرنے پڑے۔ اس نے ایک برتن میں موسمبی کا عرق اور ریوند چینی ملا کر رات بھر کے لیے اوس میں چھوڑ دیا تاکہ اس میں شبنم پڑ سکے اور یہ دوا اس نے دوسرے دن ربیکا کو خالی پیٹ پلائی۔ گو کہ ارسلا کو کسی نے نہ بتایا تھا کہ یہ مٹی کھانے کی عادت کا علاج ہے، اس کا خیال تھا کہ کوئی بھی تلخ مائع خالی پیٹ میں جائے گا تو جگر میں ردعمل پیدا کرے گا۔ ربیکا اپنے نازک جسم کے باوجود اتنی مضبوط اور سرکش تھی کہ انھیں اس کو ایک بچھڑے کی طرح باندھ کر دوا پلانی پڑی، اور انھوں نے بہ مشکل خود کو اس کی لاتوں سے بچایا اور ان عجیب وغریب آوازوں کو برداشت کیا جو وہ دانتوں سے کاٹنے اور تھوکنے کے دوران نکالتی رہی۔ صدمے سے حیرت زدہ مقامی لوگوں کے مطابق یہ غلیظ ترین گالیاں تھیں جو کوئی ان کی زبان میں سوچ سکتا تھا۔ جب ارسلا کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے دوا پلانے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب پٹائی بھی کی۔ یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ریوند چینی کا اثر تھا یا پٹائی کا یا دونوں کا لیکن سچ یہ ہے کہ چند ہی ہفتوں میں ربیکا کے سدھرنے کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ آرکادیو اور امارانتا کے ساتھ کھیلا کرتی جو اس سے بڑی بہن کی سی برتاؤ کرتے اور برتنوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے جی بھر کے کھانا کھاتی۔ جلد ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ وہ ہسپانوی زبان بھی اتنی ہی روانی سے بولتی ہے جتنی کہ مقامی، اور جسمانی مشقوں کی اس میں حیرت انگیز استعداد ہے اور گھریلو کام کاج کو وہ خود سے سنائے ہوئے مزاحیہ بولوں کے ساتھ گا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو اسے گھر کا فرد سمجھنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا۔ وہ ارسلا سے اتنی محبت کرنے لگی تھی کہ اس کی حقیقی اولاد میں نہ کرتی ہو گی۔ وہ آرکادیو اور امارانتا کو بھائی بہن، ویسینتو کو چاچا اور خوزے آرکادیو بوئندیا کو دادا کہہ کر پکارتی۔ اور اس طرح بالآخر دوسروں کی طرح وہ ربیکا بوئندیا کے نام کی مستحق ہوئی، وہ نام جس کو اس نے اپنی موت تک وقار کے ساتھ برقرار رکھا۔

ان دنوں جب ربیکا کو مٹی کھانے کی عادت سے چھٹکارا دلا کر اسے دوسرے بچوں کے کمرے میں لایا جانے لگا تھا، ایک رات مقامی انڈین عورت کی، جو بچوں کے ساتھ سوتی تھی، اتفاق سے آنکھ کھل گئی اور اسے کونے سے ایک عجیب وغریب آواز وقفے وقفے سے اٹھتی سنائی دی۔ وہ تشویش سے اٹھ بیٹھی، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید کمرے میں کوئی جانور گھس آیا ہے اور تب اس نے ربیکا کو آرام کرسی میں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ انگوٹھا چوس رہی تھی اور اندھیرے میں اس کی آنکھیں بلی کی آنکھوں طرح چمک رہی تھیں۔ دہشت زدہ، اپنی تقدیر سے

ہار کر ویسیتاسیون نے ان آنکھوں میں اس بیماری کی علامات پہچان لیں جس کے اندیشے نے اسے اور اس کے بھائی کو ہمیشہ کے لیے اس قدیم سلطنت سے، جس کے وہ شہزادہ شہزادی تھے، جلاوطنی ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بےخوابی کی وبا تھی۔

مقامی انڈین، کتاورے، صبح تک گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کی بہن وہیں رہی، کیوں کہ اس کے تقدیرپرست دل نے اس کو بتا دیا تھا کہ وہ جان لیوا بیماری دنیا کے آخری کونے تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ کوئی ویسیتاسیون کے خوف کو نہ سمجھ پایا۔ "اگر ہم کبھی نہ سو سکیں تو بہت اچھا ہو،" خوزے آرکادیو بوئندیا نے ازراہ مذاق کہا، "اس طرح ہم زندگی سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں۔" لیکن مقامی عورت نے سمجھایا کہ اس بیماری کا سب سے خوفناک پہلو یہ نہیں کہ نیند کا آنا ناممکن ہو جاتا ہے، کیوں کہ جسم کو تھکن کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا رفتہ رفتہ، بےرحمی سے، ایک خطرناک مظہر کی جانب بڑھنا ہے، اور وہ ہے، یادداشت کی گم شدگی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب اس بیماری میں مبتلا آدمی اپنی بےخوابی کا عادی ہو جاتا، تو بچپن کی وقعت کی یادیں اس کے ذہن سے مٹنے لگتیں، اور پھر اشیا کے نام اور تصورات محو ہو جاتے، اور بالآخر لوگوں کی شناخت، یہاں تک کہ خود اپنی ذات کی آگہی بھی جاتی رہتی، یہاں تک کہ وہ حماقت کی ایک ایسی کیفیت میں ڈوب جاتا جس کا کوئی ماضی نہ ہوتا۔ خوزے آرکادیو بوئندیا نے، جس کا ہنستے ہنستے دم نکلنے لگا، سوچا کہ یہ مقامی لوگوں کے توہمات کی ایجادکردہ بیماریوں میں سے ایک ہے، لیکن ارسلا نے احتیاط کے طور پر ربیکا کو بچوں سے علیحدہ کر دیا۔

چند ہفتوں بعد جب ویسیتاسیون کی دہشت کم ہو چلی تھی، خوزے آرکادیو بوئندیا نے خود کو بستر پر کروٹیں بدلتے پایا۔ اس کو کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔ ارسلا نے، جو خود بھی جاگ اٹھی تھی، اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے، اور اس نے جواب دیا "میں پھر پروڈنسیو اگیلار کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوئے، لیکن دوسرے دن خود کو اتنا ہشاش بشاش محسوس کر رہے تھے کہ انھیں یاد ہی نہ رہا کہ ان کی رات کتنی بُری طرح گزری ہے۔ اوریلیانو نے دوپہر کے کھانے کے وقت اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا ہے، اس کے باوجود کہ اس نے پوری رات تجربہ گاہ میں ایک بروچ پر سونے کا پانی چڑھانے میں گزاری تھی جو وہ ارسلا کی سالگرہ پر دینا چاہتا تھا۔ انھیں کوئی تشویش نہ ہوئی حتیٰ کہ تیسرے دن جب کسی کو رات میں نیند نہ آئی تو انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ پچاس گھنٹوں سے زیادہ وقت سونے بغیر گزار چکے ہیں۔

"بچے بھی جاگ رہے ہیں۔" مقامی عورت نے تقدیرپرستانہ وثوق سے کہا۔ "ایک دفعہ یہ گھر میں داخل ہو جائے تو اس وبا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔"

وہ واقعی بےخوابی کی وبا کا شکار ہو گئے تھے۔ ارسلا نے، جس نے اپنی ماں سے جڑی بوٹیوں کی طبی خاصیتوں کے بارے سیکھا تھا، گل تاج ملک کشید کر کے سب کو پلایا لیکن انھیں پھر بھی نیند نہ آئی اور وہ تمام رات کھڑے خواب دیکھتے رہے۔ فریبِ نظر کی اس تابندگی میں انھیں نہ صرف اپنے خوابوں کی شبیہیں نظر آئیں، بلکہ ان میں سے کچھ کو وہ

شبیہیں بھی دکھائی دیں، جو دوسروں نے خواب میں دیکھی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گھر مہمانوں سے بھر گیا ہو۔ باورچی خانہ کے ایک کونے میں، اپنی جھولنے والی کرسی میں بیٹھے بیٹھے ریبیکا نے دیکھا کہ ایک آدمی جو بالکل اس کا ہم شکل نظر آتا ہے، سفید کپڑوں میں ملبوس ہے اور جس کی قمیص کا کالر سونے کے بٹن سے بند ہے، اس کے لیے گلابوں کا ایک گلدستہ لیے آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ نازک ہاتھوں والی ایک عورت تھی جس نے گلدستے سے ایک گلاب نکال کر بچی کے بالوں میں لگایا۔ ارسلا سمجھ گئی کہ وہ مرد اور عورت ریبیکا کے والدین ہیں، گو کہ ریبیکا نے انھیں پہچاننے کی بڑی کوشش کی، وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نے ان لوگوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس دوران، ایک لغزش کے تحت جس کے لیے خوزے آرکادیو بوئندیا نے خود کو کبھی معاف نہ کیا، گھر میں بننے والے شکر کے جانور قصبے بھر میں اسی طرح بکتے رہے۔ بچے اور بڑے مزے لے لے کر بےخوابی کے سبز ننھے مرغ، بےخوابی کی لطیف گلابی مچھلیاں، اور بےخوابی کے نازک پیلے گھوڑے چوستے رہے، لہٰذا سوموار کی صبح پورے قصبے کو جاگتے پایا گیا۔ شروع شروع میں کسی کو تردد نہ ہوا۔ بلکہ وہ نیند نہ آنے پر خوش تھے، کیوں‌کہ ان دنوں ماکوندو میں اتنا کچھ کرنے کو تھا کہ وقت بمشکل ہی بچتا۔ وہ اتنی محنت کرتے تھے کہ جلد ہی کرنے کو کچھ نہ رہ گیا اور وہ صبح تین بجے ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھڑیوں کا والز سنتے پائے جاتے۔ وہ لوگ جو سونا چاہتے تھے، تھکن کی وجہ سے نہیں بلکہ خوابوں کی آرزو میں، انھوں نے خود کو تھکانے کے تمام حربے استعمال کر ڈالے۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے، ایک ہی لطیفہ بار بار دوہراتے، خصّی مرغ کی کہانی کو ابتری کی آخری حدوں تک کھینچ کرتے، جو ایک کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل تھا، اور جس میں کہانی سنانے والا پوچھتا کہ آیا انھیں خصّی مرغ کی کہانی سننی ہے، اگر وہ کہتے "ہاں"، تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے ہاں کہنے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ وہ خصی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں یا نہیں، اگر وہ کہتے "نہیں"، تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے نہیں کہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ سوال کیا تھا کہ آیا وہ چاہتے ہیں کہ انھیں خصّی مرغ کی کہانی سنائی جائے، اور اگر وہ خاموش ہو جاتے تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے خاموش رہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ پوچھا تھا کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ انھیں خصی مرغ کی کہانی سنائی جائے، اور کوئی اٹھ کر نہ جا سکتا تھا کیوں‌کہ داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے جانے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ اب وہ خصی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ اس طرح وہ ایک لاحاصل دائرے میں تمام رات گھومتے رہتے۔

جب خوزے آرکادیو بوئندیا کو احساس ہوا کہ قصبے پر وبا کا حملہ ہو چکا ہے تو اس نے خاندانوں کے سربراہوں کو اکٹھا کیا، اور جو کچھ وہ بےخوابی کے مرض کے بارے میں جانتا تھا انھیں بتایا، اور انھوں نے وبا کو دلدلی علاقے کے دوسرے قصبوں میں پھیلنے سے روکنے کے لیے اقدامات طے کیے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بکریوں کے گلے سے گھنٹیاں اتار لیں جو عربوں نے انھیں توتوں کے مول دی تھیں اور ان گھنٹیوں کو قصبے میں داخل ہونے والی راہگزر پر ان لوگوں کے لیے رکھ دیا جو سنتریوں کی منت سماجت سے باز نہ آئے، اور قصبے میں داخل ہونے کے لیے بضد رہتے۔ تمام اجنبیوں کو، جو ان دنوں ماکوندو کی گلیوں سے گزرتے، یہ گھنٹیاں

بجانی پڑتیں، تاکہ بیماروں کو علم ہو سکے کہ وہ صحت مند لوگ ہیں۔ اپنے قیام کے دوران انھیں کھانے پینے کی اجازت نہ تھی کیوں‌کہ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ بیماری کے جراثیم منھ کے ذریعے پھیلتے ہیں، اور تمام کھانے پینے کی اشیا بےخوابی کے اثرات کی زد میں آ چکی ہیں۔ اس طرح انھوں نے وبا کو قصبے تک محدود رکھا۔ یہ قرنطینہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ ان ناگہانی حالات کو ایک فطری چیز سمجھ کر قبول کر لیا گیا، اور زندگی کو اس طرح منظّم کیا گیا کہ کام کاج کی رفتار معمول پر آ گئی، اور لوگوں نے نیند کی بیکار عادت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

یہ اوریلیانو تھا جس نے وہ نسخہ دریافت کیا جو ان کی یادداشت کو گم ہونے سے کئی مہینے تک محفوظ رکھنے والا تھا۔ اس کو یہ نسخہ اتفاق سے معلوم ہوا۔ ایک ماہر بےخواب ہونے کی وجہ سے، کیوں‌کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھیں سب سے پہلے یہ بیماری لاحق ہوئی تھی، اس نے چاندی کے کام میں تکمیل کی حد تک مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایک دن وہ چھوٹا سندان تلاش کر رہا تھا جسے وہ دھات پر ملمّع چڑھانے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا، اور اسے اس اوزار کا نام یاد نہ آ سکا۔ اس کے باپ نے اسے بتایا: "دستہ"۔ اوریلیانو نے کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر یہ نام لکھا اور اسے سندان کے پیندے سے چپکا دیا: "دستہ"۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ آئندہ یہ لفظ نہ بھولے گا۔ اس کو اس بات کا خیال نہ آیا، کیوں‌کہ اس شے کا نام کافی مشکل تھا، کہ یہ یادداشت گم ہونے کی پہلی علامت ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اسے احساس ہوا کہ تجربہ گاہ میں رکھی ہوئی تقریباً تمام چیزوں کے نام یاد رکھنے میں اسے دشواری ہو رہی ہے۔ تب اس نے تمام اشیا پر ان کے نام لکھ کر لگا دیے، تاکہ وہ لکھے ہوئے نام پڑھ کر انھیں شناخت کر سکے۔ جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے قابلِ ذکر ترین واقعات بھی ذہن سے جاتے رہنے پر تشویش کا اظہار کیا، تو اوریلیانو نے اسے اپنا طریقہ بتایا، اور خوزے آرکادیو بوئندیا نے پہلے اسے گھر بھر میں رائج کیا اور پھر تمام گاؤں میں نافذ کر دیا۔ برش کو سیاہی میں ڈبو کر اس نے تمام شے پر ان کے نام لکھ دیے: میز، کرسی، گھڑی، دروازہ، دیوار، بستر، برتن۔ وہ جانوروں کے باڑے میں گیا، اور جانوروں اور پودوں پر نام لکھے: گائے، بکری، سؤر، مرغی، کساوا، کلادیئم، کیلا۔ رفتہ رفتہ مٹتی ہوئی یادداشت کے لامتناہی امکانات پر غور کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ دن آ سکتا ہے جب لوگ چیزوں کو ان پر لکھے ناموں کی مدد سے پہچان لیں، لیکن ان کا استعمال انھیں یاد نہ رہے۔ تب وہ زیادہ وضاحت سے کام لینے لگا۔ وہ تختی جو اس نے گائے کی گردن میں لٹکائی، اس تدبیر کی عمدہ مثال تھی جس سے ماکوندو کے باشندوں نے حافظے کے زوال کے خلاف جنگ کے لیے خود کو لیس کیا: "یہ گائے ہے۔ اس کو ہر صبح دوہنا ہے تاکہ یہ دودھ پیدا کرتی رہے، اور دودھ کو اُبالنا ہے تاکہ کافی میں ملا کر دودھ کافی بنائی جا سکے۔" اس طرح وہ ایسی حقیقت میں رہا کیے جو ان کے ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی، وقتی طور پر الفاظ کے ذریعے گرفت میں لائی ہوئی حقیقت، لیکن جسے لکھے الفاظ کی قدر فراموش ہونے پر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جانا تھا۔

اس راہگزر کے آغاز پر، جو دلدلی علاقے کو نکلتی تھی، انھوں نے "ماکوندو" کی تختی لگا دی، اور ایک بڑی سی تختی شاہراہِ عام پر نصب کر دی، جس پر لکھا تھا: "خدا ہے"۔ تمام

کمروں میں اشیا اور احساسات کو یاد رکھنے کے لیے شرحیں تیار کر لی گئی تھیں۔ لیکن وہ نظام اتنی ہوشیاری اور اخلاقی قوت کا متقاضی تھا کہ بہت سے لوگ خیالی حقیقت کے طلسم سے زیر ہو گئے اپنی گھڑی ہوئی حقیقت جو ان کے لیے عملی کم، لیکن آرام دہ زیادہ تھی۔ پیلار ترنیرا وہ ہستی تھی جس کا اس پہچان‌سازی کو مقبول کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ اس کو تاش کے پتوں سے ماضی پڑھنے کی ترکیب سوجھی، جس طرح وہ پہلے مستقبل دیکھا کرتی تھی۔ اس ترکیب کی بدولت بےخوابی کے شکار لوگ ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جس کی بنیاد تاش کے پتوں کے غیریقینی متبادل پر تھی، جہاں ایک باپ کو مبہم طور پر ایک ایسے سانولے آدمی کی صورت یاد کیا جاتا جو اپریل کے اوائل میں آیا تھا اور ماں کو صرف ایک ایسی سانولی عورت کے روپ میں جس نے اپنے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی، اور جہاں جنم دن اس پچھلے منگل تک محدود ہو گیا جب برگ غار کے درخت پر چکاوک چہچہایا تھا۔ دل بہلانے کے ان طریقوں سے شکست کھا کر حوزے آرکادیو بوئندیا نے یادداشت کی مشین بنانے کی ٹھانی جس کی اس نے کبھی تمنا کی تھی تاکہ خانہ بدوشوں کی شاندار ایجادات کو یاد رکھ سکے۔ یہ کل انسان کی تمام زندگی میں حاصل کیے گئے علم پر ہر صبح شروع سے آخر تک نظر ڈالنے کے امکان پر مبنی تھی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کا تصور ایک چرخی نما نشست کے طور پر کیا تھا جس کو محور پر رکھ کر دستے کے ذریعے چلایا جا سکے اور اس طرح زندگی کی سب سے ضروری معلومات پر چند گھنٹوں بعد اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرے۔ وہ تقریباً چودہ سو اندراجات کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، جب دلدلی علاقے والی راہگزر سے ایک عجیب وغریب حلیے کا آدمی بےخوابی سے محفوظ لوگوں کی غمناک گھنٹی کے ساتھ نمودار ہوا جس نے رسی سے بندھا ایک پھولا ہوا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا اور کالے کپڑے سے ڈھکی ایک ٹھیلی کو کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔ وہ سیدھا حوزے آرکادیو بوئندیا کے گھر پہنچا۔

ویزیتاسیون نے اسے نہ پہچانا جب اس نے دروازہ کھولا اور اس نے سوچا شاید وہ کچھ بیچنے کے ارادے سے آیا ہے اس بات سے بےخبر کہ اس قصبے میں جو فراموشی کی دلدل میں ہمیشہ کے لیے دھنستا جا رہا ہے کوئی چیز نہیں بیچی جا سکتی۔ وہ ایک پیر فرتوت تھا۔ اس کی آواز بےاعتباری سے شکستہ تھی اور اس کے ہاتھ لگتا تھا جیسے شے کے وجود پر شبہ کرنے لگے ہوں مگر یہ بات واضح تھی کہ وہ ایک ایسی دنیا سے آ رہا ہے جہاں لوگ اب تک سو سکتے ہیں اور یاد رکھ سکتے ہیں۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے بیٹھک میں پایا، جہاں وہ بیٹھا پیوند لگے کالے ہیٹ سے ہوا جھل رہا تھا، اور ایک دردمند توجہ کے ساتھ دیوار پر چسپاں ناموں اور علامتوں کو پڑھ رہا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے گرم جوشی کے کھلے مظاہرے کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اس بات پر فکرمند کہ وہ کسی زمانے میں اسے جانتا تھا اور اب پہچان نہیں پا رہا۔ لیکن ملاقاتی کو اس بناوٹی شیفتگی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے بھلایا جا چکا ہے، دل کی ناقابل علاج نسیان سے نہیں بلکہ ایک مختلف فراموشی سے جو زیادہ ظالمانہ اور کبھی نہ ختم ہونے والی تھی اور جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا کیونکہ وہ موت کی فراموشی تھی۔ تب وہ جان گیا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا جو

سمجھ میں نہ آنے والی اشیا سے بھرا ہوا تھا، اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پیٹی نکالی جس میں بہت ساری بوتلیں تھیں۔ اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک ہلکی رنگت والا مائع پینے کو دیا، اور اس کی یادداشت کی قمقمے جل اٹھے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو ایک احمقانہ بیٹھک میں پاتا جہاں اشیا پر نشان لگے ہوئے تھے، اس سے پہلے کہ وہ دیواروں پر لکھی سنجیدہ بکواس پر شرمندہ ہوتا، اور اس سے پہلے کہ وہ نئے آنے والے کو ایک تابناک مسرت کے ساتھ پہچانتا اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ آنے والا ملکیادیس تھا۔

جب تمام ماکوندو یادداشت کی واپسی کا جشن منا رہا تھا حوزے آرکادیو بوئندیا اور ملکیادیس نے اپنی پرانی دوستی پر پڑی گرد جھاڑی۔ خانہ بدوش قصبے میں ٹھہرنے پر مائل تھا۔ وہ حقیقتاً موت کے منہ میں جا چکا تھا لیکن اس لیے واپس آ گیا کہ اس سے تنہائی برداشت نہ ہوئی۔ قبیلے سے باہر نکال دیے جانے کے بعد اپنی تمام مافوق الفطرت صلاحیتوں کو زندگی سے وفاداری کے سبب کھو دینے کے بعد، اس نے دنیا کے اس کونے میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا جسے موت اب تک نہ ڈھونڈ پائی تھی، اور خود کو ڈگیروٹائپ سے تصویر اتارنے کی ایک تجربہ گاہ کے کام پر مامور کر دیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس ایجاد کے بارے میں اب تک نہ سنا تھا۔ لیکن جب اس نے خود کو اور پورے خاندان کو قوس قزح رنگی دھات کے پترے پر ابد تک کے لیے نقش کیا ہوا پایا وہ بدحواسی سے گنگ رہ گیا۔ وہ تاریخ تھی اس زنگ آلود ڈگیروٹائپ تصویر کی، جس میں حوزے آرکادیو بوئندیا اپنے سرمئی کھڑے بالوں کے ساتھ نظر آتا تھا اس کے کلف دار کالر کاسنی کے بٹن سے قمیص سے جڑے ہوئے تھے اور چہرے پر ایک حیرانی کی سنجیدگی تھی، جس پر ارسلا نے ہنسی سے دوہرا ہوتے ہوئے اسے "خوفزدہ جرنیل" کا نام دیا تھا۔ دسمبر کی اس نکھری ہوئی صبح، جب تصویر اتاری گئی، حوزے آرکادیو بوئندیا واقعی خوفزدہ تھا، کیونکہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ لوگ رفتہ رفتہ بوڑھے ہوتے جاتے ہیں جبکہ ان کی شبیہہ دھات کے اس پترے پر ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جاتی ہے۔ روح کی ایک انوکھی کایاکلپ میں یہ ارسلا تھی جس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے ذہن سے یہ خیال نکالا، اور وہی تھی جس نے پرانی تلخی کو بھلا کر یہ فیصلہ کیا کہ ملکیادیس اس گھر میں ٹھہرے گو کہ اس نے کبھی اپنی تصویر اتارنے کی اجازت نہ دی، کیونکہ (بقول خود اس کے) وہ اپنے پڑپوتوں کی ہنسی کا سامان بننا نہ چاہتی تھی۔ اس صبح اس نے بچوں کو بہترین لباس پہنائے چہروں پر پوڈر لگایا، اور ہر بچے کو ایک ایک چمچ شربت مغز پلایا تاکہ وہ تصویر اتروانے کے لیے ملکیادیس کے انوکھے کیمرے کے سامنے دو منٹ بالکل ساکت رہیں۔ اس خاندانی ڈگیروٹائپ میں، جو اپنی نوعیت کی واحد تصویر تھی اوریلیانو سیاہ مخمل میں ملبوس امارانتا اور ریبیکا کے درمیان نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی افسردگی اور روشن بینی کی کیفیت تھی، جس کے ساتھ وہ بہت برسوں بعد فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرنے والا تھا۔ لیکن اس وقت تک اسے اپنی تقدیر کے بارے میں پیش آگہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک ماہر نقرہ کار تھا، جس کے کام کی نزاکت کی تعریف تمام دلدلی خطے میں ہوتی تھی۔ اس کارگاہ میں، جس میں ملکیادیس کی جنونی تجربہ گاہ بھی واقع تھی اس کے سانس لینے کی آواز بھی بمشکل سنائی دیتی۔ یوں لگتا جیسے اوریلیانو نے کسی دوسرے زمانے میں پناہ لے رکھی ہو، جب کہ اس کا باپ اور

ملکیادیس، بوتلوں اور طشتوں کے شور، شراب چھلکنے اور پارے کے ہر لمحے ملکی کے ہر خم ور ہر بل پر گم ہونے کے حادثات کے درمیان، چلا چلا کر ناستراداموس کی پیش گوئیوں کی تشریح کیا کرتے۔ اس سپردگی اور فیصلے کی شدت کی بنا جس سے وہ یہی توجہ کام پر مرکوز رکھتا، اوریلیانو کو اس قابل کر دیا کہ کم وقت میں وہ اس سے کہیں زیادہ پیسہ کما لے جتنا کہ ارسلا اپنے لذیذ شکر کے جانور بنا کر کمایا کرتی تھی، لیکن ہر ایک کو یہ بات عجیب لگتی تھی کہ بالغ ہونے کے باوجود اس نے آج تک کسی عورت کو نہ جانا تھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ کبھی کسی عورت کے پاس نہ گیا تھا۔

چند ماہ بعد مردیچے فرانسسکو کی واپسی دیکھی گئی، ایک آوارہ گرد جو تقریباً دو سو سال کا بوڑھا تھا اور جو اکثر اپنے بنائے ہوئے نغمے گاتا ہوا ماکوندو سے گزرتا۔ ان نغموں میں مردیچے فرانسسکو بڑی تفصیل کے ساتھ ان تمام گاؤں میں ہونے والے واقعات سناتا جو ماناورے سے لے کر دلدل کے حدی سرے تک واقع تھے تاکہ اگر کسی کو کہیں کوئی پیغام بھیجنا ہو، یا کسی واقعے کی تشہیر کرنی ہو، تو وہ اس کو دو سکے دے کر اس کے نغموں کی پٹاری میں شامل کروا دے۔ اسی طریقے سے ارسلا کو اپنی ماں کی موت کا علم ہوا کیوں کہ وہ یہ نغمے اس امید میں سنا کرتی تھی کہ شاید ان میں اس کے بیٹے خوزے آرکادیو کی کوئی خبر ملے۔ مردیچے فرانسسکو جسے یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ ایک دفعہ اس نے شیطان کو بدیہہ گوئی کے مقابلے میں شکست دی تھی، اور جس کا اصل نام کسی کو معلوم نہ تھا، بے خوابی کی وبا کے دنوں میں ماکوندو سے غائب ہو گیا تھا اور ایک رات اچانک کاتارینو کی دکان میں پھر نمودار ہوا۔ پورے گاؤں کے لوگ اس کے نغمے سننے کے لیے گئے، یہ جاننے کے لیے کہ دنیا میں کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی آئی تھی، جو اتنی فربہ تھی کہ چار مقامی ملازم اس کو ایک جھولنے والی کرسی میں اٹھا کر چلتے تھے، اور اس کے ساتھ کھوئی کھوئی سی آنکھوں والی ایک نوخیز ملاٹو لڑکی تھی جو ایک چھتری اٹھائے عورت کو دھوپ سے بچائے رکھتی تھی۔ اوریلیانو اس رات کاتارینو کی دکان پر گیا۔ اس نے مردیچے فرانسسکو کو تماشائیوں کے دائرے کے بیچ ایک عظیم شحیم گرگٹ کی مانند بیٹھا پایا۔ وہ اپنی پرانی بےسری آواز میں خبروں بھرے نغمے گا رہا تھا اس کے پاس وہی قدیم اکارڈین تھا جو سر والٹر ریلے نے اسے گیانا میں دیا تھا اور وہ اپنے اسٹھک چلنے والے پیروں سے، جو شورے سے جھلس گئے تھے، تال دے رہا تھا۔ دکان کے عقب میں ایک دروازہ تھا جس میں سے لوگ آ جا رہے تھے اور جس کے سامنے جھولنے والی کرسی میں رئیسہ خاموشی سے بیٹھی خود کو پنکھا جھل رہی تھی۔ کاتارینو کان کے پیچھے ایک مصنوعی گلاب ٹکائے مجمع میں گنے کی شراب مگ میں بیچ رہا تھا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مردوں کے قریب جاتا اور ان پر وہاں ہاتھ رکھتا جہاں نہیں رکھنا چاہیے۔ آدھی رات تک گرمی ناقابل برداشت ہو گئی۔ اوریلیانو نے بغیر دلچسپی کے آخر تک خبریں سنیں اور اسے کوئی ایسی خبر نہ ملی جو اس کے خاندان کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ گھر جانے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا کہ فربہ رئیسہ نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"تم بھی اندر جاؤ" اس نے اوریلیانو سے کہا۔ "صرف بیس پیسو لگیں گے۔"

اوریلیانو نے رئیسہ کی گود میں دھری ٹوکری میں ایک سکہ پھینکا، اور بغیر سوچے سمجھے کمرے میں چلا گیا۔ نوبالغ ملاٹو لڑکی، جس کے چھوٹے چھوٹے پستان کتیا کے جیسے تھے، بستر پر عریاں بیٹھی تھی۔ اوریلیانو سے پہلے تریسٹھ آدمی اس رات اس کمرے سے گزرے تھے۔ کمرے کی کثیف فضا، پسینے اور آہوں میں گندھی ہوئی، کیچڑ میں بدلنے لگی تھی۔ لڑکی نے تر چادر اٹھائی، اور اوریلیانو سے اسے ایک طرف سے پکڑنے کو کہا۔ چادر کینوس کے ٹکڑے کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس کے سرے مروڑ کر اسے نچوڑا، یہاں تک کہ وہ اپنی اصل حالت پر واپس آ گئی۔ انھوں نے دری کو الٹایا اور دوسری طرف سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اوریلیانو فکرمند تھا، اس کی خواہش تھی کہ یہ کام کبھی ختم نہ ہو۔ وہ نظریاتی طور پر محبت کے عمل سے واقف تھا، لیکن اس کے گھٹنے جواب دے رہے تھے، اور گو کہ اس کی جلتی ہوئی کھال کا ایک ایک رواں کھڑا ہو چکا تھا وہ اپنی آنتوں کے بوجھ کو خارج کرنے کی فوری طلب کی مزاحمت نہ کر پا رہا تھا۔ جب لڑکی بستر درست کر چکی اور اس نے اوریلیانو سے کپڑے اتارنے کو کہا اس نے ایک بوکھلائی ہوئی توجیہہ پیش کی: "انھوں نے مجھے اندر بھیجا تھا۔ انھوں نے مجھ سے بیس پیسو پھینکنے کو اور جلدی کرنے کو کہا تھا۔" لڑکی اس کی سراسیمگی کو سمجھ گئی۔ "اگر تم جاتے وقت بیس پیسو اور ڈالتے جاؤ تو تم کچھ دیر اور یہاں ٹھہر سکتے ہو" اس نے نرمی سے کہا۔ اوریلیانو نے کپڑے اتار دیے، شرم کی اذیت میں گرفتار، وہ اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام رہا کہ اس کی برہنگی اس کے بھائی کے مقابلے کی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی کی کوششوں کے باوجود اس نے خود کو بےحد تنہا اور لاتعلق محسوس کیا۔ "میں بیس پیسو اور ڈال دوں گا" اس نے منمنی آواز میں کہا۔ لڑکی نے خاموشی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی پیٹھ ناپختہ تھی۔ اس کی کھال ہڈیوں سے منڈھی ہوئی تھی، اور وہ کوشش کر کے سانس کھینچتی تھی، کیوں کہ وہ ناقابل بیان حد تک نڈھال تھی۔ دو سال پہلے، وہاں سے بہت دور، وہ شمع بجھائے بغیر سو گئی تھی، اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو شعلوں میں گھرا پایا تھا۔ وہ گھر جہاں وہ اپنی دادی کے ساتھ رہتی تھی، جس نے اسے پالا تھا، جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی دادی اسے قصبے قصبے لیے پھر رہی تھی، بیس بیس پیسو کے عوض اسے بستر پر لٹاتی تاکہ جلے ہوئے گھر کی مالیت کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ لڑکی کے حساب کے مطابق اس کو دس سال مزید ہر رات ستر مردوں کے ساتھ لیٹنا تھا کیوں کہ اسے اپنے اور دادی کے سفر اور کھانے کا خرچ بھی اٹھانا تھا اور ان چار ملازموں کی تنخواہ بھی دینی تھی جو کرسی اٹھا کر چلنے کے کام پر مامور تھے۔ جب رئیسہ نے دوسری دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تو اوریلیانو بغیر کچھ کیے، رونے کی شدید خواہش سے پریشان، کمرے سے نکل آیا۔ اس رات وہ سو نہ سکا، آرزو اور رحم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ لڑکی کے متعلق سوچتا رہا۔ اسے لڑکی سے محبت کرنے، اور اس کی حفاظت کرنے کی ایک ناقابل رد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ صبح کے وقت، بےخوابی اور بخار کی تھکن میں چور، اس نے خاموشی سے فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کر لے گا، تاکہ اس کو دادی کے چنگل سے آزاد کرا سکے، اور ان تمام راتوں کی لذتوں سے محظوظ ہو سکے جو وہ ستر مردوں کو بخشتی تھی۔ لیکن جب دس بجے صبح وہ کاتارینو کی دکان پر

پہنچا تو لڑکی قصبہ چھوڑ کر جا چکی تھی۔

وقت نے رفتہ رفتہ اس دیوانگی کے خیال کو مندمل کر دیا، لیکن اس کا احساس محرومی بڑھتا گیا۔ اس نے کام میں پناہ لی۔ اس نے زندگی بھر بغیر عورت کے زندگی گزارنے کی قسمت پر رضا اختیار کر لی، تاکہ اپنے بیکار وجود کی شرم چھپا سکے۔ اس دوران ملکیادیس دہات کے پیروں پر ماکوندو کی ان تمام چیزوں کے عکس اتار چکا تھا جو عکس اتارنے کے قابل تھیں، اور اس نے ڈگیوروٹائپ کی تجربہ گاہ حوزے آرکادیو بوئندیا کے تخیلات کے لیے چھوڑ دی تھی، جس نے اسے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے استعمال میں لانے کی ٹھان لی تھی۔ گھر کے مختلف حصوں میں اتاری گئی تصویروں کو ایک دوسرے پر اتارنے کے پیچیدہ عمل سے اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ خدا کی تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو جائے گا، اگر اس کا وجود ہے یا پھر ہمیشہ کے لیے خدا کے وجود کے مفروضے کا خاتمہ کر دے گا۔ ملکیادیس ناستر دیمس کی پیش گوئیوں کی شرحوں کی گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ وہ رات دیر تک جاگتا، اپنی بوسیدہ مخملی واسکٹ میں ملبوس، اپنے چھوٹے چھوٹے چڑیا جیسے ہاتھوں سے لکھتا رہتا جن کی انگوٹھیوں سے پرانے دنوں کی چمک کم ہو چکی تھی۔ ایک رات اس نے سوچا کہ اس نے ماکوندو کے مستقبل کی پیش گوئی پا لی ہے۔ یہ ایک روشن شہر ہو گا شیشے کے بڑے بڑے گھروں پر مشتمل جہاں بوئندیا نسل کا نام و نشان تک باقی نہ ہو گا۔

"یہ غلط ہے" حوزے آرکادیو بوئندیا گرجا۔ "وہ شیشے کے نہیں بلکہ برف کے گھر ہوں گے، جیسا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا اور یہاں ایک بوئندیا ہمیشہ رہے گا۔" ارسلا اس بے عقل گھر میں ہوش وحواس اور شعور کی فضا قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہی، شکر کی ڈلیوں کے کاروبار کو ایک تنور کے ذریعے وسیع کر کے جو تمام رات گرم رہتا، اور جس میں سے ٹوکریوں بھر ڈبل روٹیاں اور انوکھی انواع واقسام کی پڈنگ اور بسکٹ نکلتے رہتے، جو چند گھنٹوں کے اندر اندر دلدلی حصے میں پیچ وخم کھاتی گلیوں میں بک جاتے۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ گئی تھی جب سے آرام کرنے کا حق پہنچتا تھا، لیکن وہ مزید فعال ہو گئی تھی۔ وہ اپنے پھلتے پھولتے کاروبار میں اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ ایک دوپہر جب اس نے بےخیالی میں آنگن کی طرف نگاہ اٹھائی جب مقامی انڈین عورت گندھے ہوئے آٹے میں شکر ملا رہی تھی، تو اس نے دو اجنبی خوبصورت نوعمر لڑکیوں کو ڈوبتے سورج کی روشنی میں کشیدہ کاری کرتے پایا۔ وہ ریبیکا اور امرانتا تھیں۔ جب سے انھوں نے ماتمی لباس اتارے تھے جو وہ نانی کی موت کے بعد سال بعد تک تین دن سے پہنتی رہی تھیں ان کے شوخ رنگارنگ کپڑوں نے لگتا تھا انھیں دنیا میں ایک خاص مقام دے دیا ہے۔ ریبیکا توقعات کے برخلاف، زیادہ خوبصورت نکلی تھی۔ اس کی رنگت گوری تھی، آنکھیں بڑی اور پرسکون اور جادوئی ہاتھ جو کشیدہ کاری کے نمونے لگتا تھا نظر نہ آنے والے دھاگوں سے کاڑھ رہے ہیں۔ امرانتا جو اس سے چھوٹی تھی، نسبتاً کم پروقار تھی، لیکن اسے اپنی مرحوم نانی کا فطری امتیاز اور اندرونی استحکام حاصل تھا۔ آرکادیو، جو اگرچہ ابھی سے اپنے باپ کی سی جسمانی نشوونما کا مظہر تھا ان کے سامنے بچہ سا نظر آتا تھا۔ وہ اوریلیانو سے چاندی کا کام سیکھنے میں جٹ گیا تھا جس نے اسے پڑھنا لکھنا بھی سکھایا تھا۔

ارسلا نے اچانک محسوس کیا کہ گھر لوگوں سے بھر گیا ہے، اور اس کے بچے شادی کرنے اور اپنے بچے پیدا کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، اور ان کو جگہ کی کمی کے باعث تتربتر ہونا پڑے گا۔ پھر اس نے وہ پیسے نکالے جو اس نے طویل سالوں میں کڑی محنت سے جمع کیے تھے اور اپنے کچھ گاہکوں کے ساتھ انتظامات کر کے گھر کو بڑا کرنے کے کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑا دیوان خانہ بنوایا، اور روزمرہ کے استعمال کے لیے ایک اور بیٹھک جو زیادہ آرام دہ اور ٹھنڈی تھی، ایک کھانے کا کمرہ، جس میں بارہ کرسیوں والی میز لگوائی تاکہ گھر کے تمام افراد اپنے مہمانوں سمیت اکٹھے بیٹھ سکیں، نو کمرے، جن کی کھڑکیاں آنگن میں کھلتی تھیں، اور ایک لمبی سی ڈیوڑھی جسے گلاب کے ایک باغ کے ذریعے دوپہر کی گرمی سے محفوظ کیا گیا تھا، باغ میں فرن اور بیگونیا کے گملے رکھنے کے لیے احاطہ نکالا گیا۔ ارسلا نے باورچی خانہ بڑا کروایا تاکہ اس میں دو تنور آ سکیں۔ وہ گودام جہاں پیلار ترنیرا نے حوزے آرکادیو کا مستقبل پڑھا تھا توڑا گیا اور اس سے دگنا بڑا گودام تعمیر کرایا گیا، تاکہ گھر میں کھانے پینے کی اشیا کی کبھی قلت نہ ہو۔ اس نے آنگن میں شاہ بلوط کے درخت کی چھاؤں میں غسل خانے بنوائے، ایک عورتوں کے لیے، دوسرا مردوں کے لیے، اور گھر کے عقب میں ایک بڑا سا اصطبل، باڑھ لگا ہوا مرغی خانہ، بھینسوں کا باڑا اور ایک چڑیا خانہ، جو چاروں سمت کی ہوا کے لیے کھلا تھا تاکہ گھومتے ہوئے پرندے وہاں اپنی خوشی سے انڈے بچے دے سکیں۔ درجنوں مستریوں اور بڑھئیوں کو ساتھ لیے ہوئے گویا اسے اپنے شوہر کا سا ہذیانی بخار چڑھ گیا ہو ارسلا روشنی اور دھوپ کے مقام طے کرتی اور حدود کی پروا کیے بغیر جگہ کی تقسیم کرتی پھرتی۔ پرانی عمارت، جو بانیوں نے بنائی تھی، اوزاروں اور سامان تعمیر اور پسینے میں شرابور، تھکے ہوئے مزدوروں سے بھر گئی، جو ہر ایک سے درخواست کرتے کہ براہ مہربانی ان کے کام میں مداخلت نہ کریں، اور ہڈیوں کی اس بوری سے پریشان رہتے جو ایک غمگین کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ان کا پیچھا کرتی۔ اس بےآرامی میں، چونے اور کولتار کی دھوئیں میں سانس لیتے ہوئے، کوئی درست طور پر نہ دیکھ سکتا تھا کہ زمین کے پیٹ سے یہ گھر کیونکر ابھر رہا ہے، جو نہ صرف قصبے کا سب سے بڑا گھر تھا بلکہ سب سے زیادہ مہمان نواز اور ٹھنڈا گھر جو اس دلدلی حصے میں کبھی پایا گیا ہو۔

حوزے آرکادیو بوئندیا جو اس تمام ہنگامے کے دوران خدا کی قدرت کو حیرت میں ڈالنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا واحد شخص تھا جو اس بات کو بالکل نہ سمجھ پایا۔ نیا گھر تقریباً مکمل ہو چکا تھا جب ارسلا نے اسے اس کی خیالی دنیا سے کھینچ کر باہر لاتے ہوئے بتانے کے لیے کہ اسے گھر کے باہر نیلا رنگ کرانے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ وہ سفید رنگ کرانا چاہتی ہے، اسے ایک سرکاری کاغذ نکال کر دکھایا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بغیر سمجھے کہ اس کی بیوی کیا کہہ رہی ہے کاغذ میں کیے گئے دستخط کو پڑھا۔

"یہ کون شخص ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجسٹریٹ،" ارسلا نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے بھیجا گیا با اختیار اہلکار ہے۔"

ڈون اپولینار موسکوتے، مجسٹریٹ، بےحد خاموشی کے ساتھ ماکوندو آیا تھا۔ وہ سو

باکوب میں ٹھہرا، جو توتوں کی عوض اشیا دینے والے پہلے عربوں میں سے ایک نے بنایا تھا، اور دوسرے دن اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے گھر سے دو بلاک دور ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے لیا، جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور اس نے ایک میز اور کرسی، جو اس نے ہوٹل باکوب سے خریدی تھی، اس کمرے میں لگائی، کیل سے دیوار پر جمہوریہ کی مہر ٹھونک دی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور دروازے کے باہر ایک تختی لگا دی: "مجسٹریٹ"۔ اس کا پہلا حکم یہ تھا کہ ملک کے یوم آزادی کا جشن منانے کے لیے تمام گھروں کو نیلا رنگ دیا جائے۔

حکم نامے کی نقل ہاتھ میں لیے حوزے آرکادیو بوئندیا نے مجسٹریٹ کو ایک جھولنی میں قیلولہ کرتے پایا جو اس نے اپنے ٹنگ سے دفتر میں تان رکھی تھی۔ "کیا تم نے یہ لکھا ہے؟" اس نے مجسٹریٹ سے پوچھا۔ دون اپولینار موسکوتے نے، جو ایک پختہ، شرمیلا، سرخی مائل رنگت والا شخص تھا، اثبات میں جواب دیا۔ "کس حق کے تحت؟" حوزے آرکادیو بوئندیا نے پھر پوچھا۔ دون اپولینار موسکوتے نے میز کی درز سے ایک کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ "مجھے اس قصبے کا مجسٹریٹ نامزد کیا گیا ہے۔" حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کی تقرری کے کاغذ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

"اس قصبے میں ہم کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر حکم نہیں دیتے ہیں،" وہ تحمل سے بولا۔ "اور تم یہ جان لو اس وقت اور ہمیشہ کے لیے کہ ہمیں کسی جج کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر فیصلہ کرنا پڑے۔"

دون اپولینار موسکوتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اور آواز اونچی کیے بغیر، حوزے آرکادیو بوئندیا نے تفصیل کے ساتھ ماکوندو بسانے کی روداد سنائی، کس طرح انھوں نے زمین تقسیم کی تھی، سڑکیں بنائی تھیں اور ضرورت کے تحت بغیر حکومت کو تکلیف دیے اور بغیر کسی دخل اندازی کے ان کی بہتری کے کام کیے تھے۔ "ہم اتنے امن پسند ہیں کہ اب تک ہم میں سے کوئی طبعی موت بھی نہیں مرا ہے۔" کوئی اس بات سے پریشان نہ تھا کہ حکومت نے اب تک ان کی مدد نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ خوش تھے کہ اب تک حکومت نے ماکوندو کو سکون کے ساتھ پھلنے پھولنے دیا ہے اور انھیں امید تھی کہ حکومت ان کو اسی طرح رہنے دے گی، کیونکہ انھوں نے یہ قصبہ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ پہلا نیا نواب جو یہاں آئے وہ انھیں بتائے کہ کیا کرنا ہے۔ دون اپولینار موسکوتے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی جینسوں کا وقار کھوئے بغیر، جو ڈینم کی جیکٹ پہن چکا تھا جو اس کی پتلون کی طرح سفید تھی۔

"اس لیے اگر تم کسی بھی عام شہری کی طرح یہاں ٹھہرنا چاہو، تو تمھیں خوش آمدید کہا جائے گا،" حوزے آرکادیو بوئندیا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم یہاں لوگوں کو اپنے گھر نیلے رنگنے پر مجبور کر کے بدامنی پھیلانے آئے ہو تو تم اپنا کباڑ اٹھا کر اس جگہ واپس جا سکتے ہو جہاں سے تم آئے ہو۔ کیونکہ میرا گھر فاختہ کی طرح سفید ہوتے جا رہا ہے۔"

دون اپولینار موسکوتے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور جبڑے سکیڑ کر ایک خاص غضب کے ساتھ کہا:

"میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ میں مسلح ہوں۔"

حوزے آرکادیو بوئندیا کو پتہ نہ چلا کہ کس لمحے اس کے ہاتھوں میں وہ کارآمد قوت پھر لوٹ آئی جس سے وہ گھوڑوں کو کانوں سے پکڑ کر روک لیا کرتا تھا۔ اس نے دون اپولینار موسکوتے کو کوٹ کے کالر سے پکڑ کر اپنی آنکھوں کی سطح تک اٹھا لیا۔

"میں یہ اس لیے کر رہا ہوں،" اس نے کہا "کیونکہ میں تمھیں زندہ اٹھائے پھرنا چاہتا ہوں، بجائے اس کے کہ تمھیں زندگی بھر کے لیے مردہ اٹھائے پھروں۔"

اور وہ اسی طرح دون اپولینار موسکوتے کو کالر سے اٹھائے سڑک کے وسط میں چلتا گیا یہاں تک کہ دلدلی سڑک پر لا کر اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ ایک ہفتے بعد وہ چھ عدد ننگے پاؤں پھٹی وردیوں میں ملبوس، اور بندوقوں سے مسلح سپاہیوں، اور ایک بیل گاڑی کے ساتھ، جس میں اس کی بیوی اور سات بیٹیاں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھیں، واپس آیا۔ دو اور بیل گاڑیاں بعد میں فرنیچر، گھر کا سامان اور برتن لے پہنچیں۔ اس نے اپنے خاندان کو گھر تلاش کرنے کے دوران ہوٹل باکوب میں ٹھہرایا، اور خود سپاہیوں کے پہرے میں اپنا دفتر کھولنے چل دیا۔ ماکوندو کے بانی، جنھوں نے حملہ آوروں کو قصبے سے نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا، اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ حوزے آرکادیو بوئندیا کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن وہ اس کے خلاف تھا جیسا کہ اس نے وضاحت کی، کیونکہ کسی کو اس کے بیوی بچوں کے سامنے پریشان کرنا مردانگی نہیں ہے، اور دون اپولینار موسکوتے بیوی بچوں کے ساتھ واپس آیا تھا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کو خوشگوار طریقے سے حل کیا جائے۔

اوریلیانو اس کے ساتھ گیا۔ ان دنوں اس نے سیاہ مونچھیں رکھنا شروع کر دی تھیں، جن کی نوکوں پر تیل چپڑا ہوتا اور اس کی آواز کچھ کچھ بلند ہو چلی تھی، وہی خصوصیت جو آئندہ جنگ میں اس کو ممیز کرنے والی تھی۔ مسلح محافظوں کی پروا کیے بغیر، نہتے وہ مجسٹریٹ کے دفتر میں پہنچے۔ دون اپولینار موسکوتے نے اپنا تحمل برقرار رکھا۔ اس نے اپنی دو بیٹیوں کا، جو اس وقت وہاں موجود تھیں، تعارف کرایا، امپارو، سولہ سالہ، اپنی ماں کی طرح سانولی، اور ریمیدیوس، صرف نو سال کی، ایک خوبصورت چھوٹی سی بچی، جس کی جلد گلِ سوسن کی طرح سفید اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ دونوں پُروقار اور شائستہ تھیں۔ جیسے ہی مرد داخل ہوئے، ان سے متعارف کرائے جانے سے پیشتر ہی، لڑکیوں نے ان کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں۔ لیکن وہ دونوں کھڑے رہے۔

"بہت خوب، میرے دوست،" حوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا، "تم اگر چاہو تو یہاں ٹھہر سکتے ہو اس لیے نہیں کہ تم نے دروازے پر مسلح ڈاکوؤں کو لا رکھا ہے بلکہ تمھاری بیوی اور بچوں کے احترام میں۔"

دون اپولینار موسکوتے پریشان ہو گیا، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے جواب دینے کی مہلت نہ دی۔ "ہماری صرف دو شرائط ہیں،" اس نے بات جاری رکھی، "اول: جو جس رنگ میں اپنا گھر رنگنا چاہے، رنگ سکتا ہے۔ دوم: سپاہی فوراً یہاں سے واپس چلے جائیں۔ ہم امن و امان اور نظم و ضبط کی ضمانت دیتے ہیں۔" مجسٹریٹ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

"تم اپنی زبان دیتے ہو؟"

"تمھارے دشمن کی زبان،" حوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا۔ اور تلخ لہجے میں وضاحت کی:

کیوں کہ میں ایک بات تم پر واضح کر دوں، تم اور میں اب تک دشمن ہیں۔"

سپاہی اسی سہ پہر واپس چلے گئے۔ چند دنوں بعد حوزے آرکادیو بوئندیا نے مجسٹریٹ کے خاندان کے لیے ایک گھر تلاش کر دیا۔ سوائے اوریلیانو کے سب سکون سے ہو گئے۔ ریمیدیوس، مجسٹریٹ کی چھوٹی بیٹی جو ابھی عمر کے لحاظ سے خود اس کی بیٹی ہو سکتی تھی اس کے جسم کے کسی حصے میں درد جگاتی رہی۔ وہ ایک جسمانی ہیجان تھا جو اس کو چلنے میں اس طرح تنگ کیا کرتا جیسے کہ جوتے کا کنکر۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ اجمل کمال

وبا کے دنوں میں محبت

دوسری طرف فلورنتینو آریزا نے اکاون سال، نو ماہ اور چار دن قبل، ایک طویل اور دشوار عشق کے اختتام پر فرمینا داثا کی جانب سے رد کر دیے جانے کے بعد سے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے بارے میں سوچنا ترک نہیں کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے، کسی کوٹھڑی کی دیوار پر ہر دن کے لیے ایک نشان ڈالتے ہوئے گزرتے وقت کا حساب رکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب فرمینا داثا کی یاد دلانے والی کوئی نہ کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ جس وقت ان میں جدائی ہوئی، وہ اپنی ماں ترانسیتو آریزا کے ساتھ دریچوں والی گلی میں کرائے کے ایک نصف مکان میں رہ رہا تھا، جہاں اس کی ماں نے بہت جوانی کے دنوں سے چھوٹی موٹی کم قیمت چیزوں کی ایک دکان کھول رکھی تھی، جس میں اس نے ادھڑی ہوئی قمیصیں اور پرانے چیتھڑے بھی رکھ چھوڑے تھے تاکہ خانہ جنگی میں زخمی ہونے والوں کے ہاتھ پٹیوں کے طور پر فروخت کر سکے۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا، اور معروف جہازراں دون پیئس ویلوئیرا سے اس کے اتفاقی معاشقے کی یادگار تھا۔ ویلوئیرا ان تین بھائیوں میں سے ایک تھا جنھوں نے کریبیئن ریور کمپنی قائم کر کے دریائے ماگدالینا میں نقل و حمل کے لیے دُخانی کشتیوں کے استعمال میں ایک نئی تحریک پیدا کی تھی۔

جب دون پیئس ویلوئیرا فوت ہوا تو اس کا بیٹا دس سال کا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے اخراجات کا بار چوری چھپے اٹھاتا رہا تھا، لیکن اس نے کبھی اسے قانونی طور پر اپنے بیٹے کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ اس کے مستقبل کے تحفظ کے لیے اس کے نام کوئی ورثہ چھوڑا تھا، اس لیے فلورنتینو آریزا اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ ماں کا نام استعمال کرتا تھا، اگرچہ

س کی ولدیت کی بابت سب کو علم تھا۔ اپنے باپ کے مرنے کے بعد فلورنتینو اریزا کو اسکول میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی اور اس نے محکمۂ ڈاک میں کام سیکھنے کی غرض سے ملازمت کر لی جہاں اس کا کام ڈاک کے تھیلے کھولنا، خط چھانٹنا اور لوگوں کو جہاز کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے دفتر کے دروازے پر اُس ملک کا جھنڈا لہرانا تھا جہاں کا جہاز آیا ہو۔

اس کی ہوشیاری نے جرمن تارکِ وطن لوتاریو تھگت کی توجہ حاصل کر لی، جو ٹیلیگراف آپریٹر تھا اور ساتھ ہی کلیسا میں اہم تقریبات کے موقعوں پر آرگن بجانے اور گھر پر موسیقی کی تعلیم دینے کا کام بھی کرتا تھا۔ لوتاریو تھگت نے اسے مورس کوڈ سکھایا، اور بتایا کہ ٹیلیگراف کا نظام کس طرح کام کرتا ہے، اور اس سے وائلن بجانے کے چند سبق لینے کے بعد فلورنتینو اریزا نے اس میں اتنی پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر لی کہ وہ محض سن کر کوئی بھی دھن بجا سکتا تھا۔ جب اس کی فرمینا ڈازا سے ملاقات ہوئی وہ اپنے سماجی حلقے میں سب سے مقبول نوجوان تھا جو رقص کی تازہ ترین طرزوں سے واقف تھا اور جذباتی شاعری زبانی سنا سکتا تھا، اور جو اپنے دوستوں کی محبوباؤں کے لیے وائلن پر عشقیہ سرینادے بجانے کے لیے ہمیشہ مستعد رہتا تھا۔ وہ بہت دبلا تھا، انڈین باشندوں جیسے اس کے بال خوشبودار تیل سے ہمیشہ چپڑے رہتے اور آنکھوں پر دور کی نگاہ کی عینک لگی ہوتی، جس سے اس کی بیچارگی کی ویرانی اور بڑھ جاتی۔ نگاہ کی کمزوری کے علاوہ اسے قبض کی بھی مستقل شکایت تھی، اور وہ ساری زندگی جلاب لینے پر مجبور رہا۔ اس کے پاس ایک اکلوتا سیاہ سوٹ تھا، جسے ترانسیتو اریزا اتنی احتیاط سے رکھتی تھی کہ وہ ہر اتوار کو نیا معلوم ہوتا۔ اس کے دبلے پن کے تاثر، لیے دیے رہنے کے انداز اور ماتمی لباس کے باوجود، اس کے حلقے کی لڑکیاں اس پر قرعہ ڈالا کرتی تھیں کہ کون لڑکی اس کے ساتھ وقت گزارے گی، اور وہ بھی ان لڑکیوں کے ساتھ وقت گزاری کا جوا کھیلا کیا، یہاں تک کہ ایک دن وہ فرمینا ڈازا سے ملا اور اس کی معصومیت ختم کو پہنچی۔

اس نے پہلی بار اسے اس موقع پر دیکھا تھا جب لوتاریو تھگت نے اسے کسی لورینزو ڈازا کے نام آیا ہوا ٹیلیگرام پہنچانے کے لیے کہا، جس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ اس نے اسے باغِ اناجیل کے پاس بنے ہوئے قدیم ترین مکانوں میں سے ایک میں پایا، یہ آدھا کھنڈر ہو چکا تھا اور اس کا اندرونی صحن، گملوں کی خس و خاشاک اور خشک سنگی فوارے کے ساتھ، کسی کلیسائی خانقاہ کی شباہت رکھتا تھا۔ فلورنتینو اریزا کو کوئی انسانی آواز سنائی نہ دی جب وہ ننگے پاؤں خادمہ کے پیچھے پیچھے محراب دار برآمدے کو عبور کر رہا تھا، جہاں بچے ہوئے چونے کے ڈھیروں اور سیمنٹ کی خالی تھیلیوں کے درمیان سامان کے ان کھلے صندوق اور راج مزدوروں کے اوزار بکھرے پڑے تھے، کیوں کہ مکان تقریباً ازسرِنو تعمیر کے عمل سے گزر رہا تھا۔ برآمدے کے آخری سرے پر ایک عارضی دفتر تھا جس میں ایک بہت فربہ شخص، جس کے گل مچھوں کے گھنگھریالے بال اس کی مونچھوں کے بالوں میں مل گئے تھے، ایک میز کے عقب میں بیٹھا قیلولہ کر رہا تھا۔ درحقیقت اس کا نام لورینزو ڈازا تھا، اور وہ شہر میں زیادہ معروف نہ تھا کیوں کہ اسے یہاں آئے ہوئے دو سال سے کم عرصہ گزرا تھا اور وہ کثیرالاحباب نہ تھا۔

اس نے ٹیلیگرام یوں وصول کیا گویا یہ کسی منحوس خواب کا تسلسل ہو۔ فلورنتینو اریزا نے اس کی آنکھوں کے متغیّر رنگ، اور لفافے کی مہر توڑتی ہوئی اس کی کپکپاتی انگلیوں کو ایک سرکاری قسم کی ہم دردی سے دیکھا کیوں کہ اپنے کام کے دوران وہ بےشمار بار ٹیلیگرام وصول کرنے والے ان بےشمار لوگوں کو اس دلی خوف کا شکار دیکھ چکا تھا جو اب تک ٹیلیگرام کی آمد کا رشتہ موت کی اطلاع سے جوڑے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ٹیلیگرام پڑھنے کے بعد البتہ اس کا اطمینان بحال ہو گیا۔ اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا، "اچھی خبر ہے"۔ اور فلورنتینو اریزا کو وہ پانچ سکّے تھما دیے جو ٹیلیگرام پانے پر ادا کرنے لازم آتے تھے، لیکن پُرسکون مسکراہٹ کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ وہ یہ رقم ہرگز ادا نہ کرتا اگر ٹیلیگرام بری خبر کا ہوتا۔ پھر اس نے فلورنتینو اریزا سے ہاتھ ملا کر اسے الوداع کہا، جو ٹیلیگرام لانے والے قاصد کو رخصت کرنے کا مروّجہ طریقہ نہیں تھا، اور خادمہ گلی میں کھلنے والے دروازے تک اس کے ساتھ ساتھ گئی، جس کا مقصد راستہ بتانے سے زیادہ اس پر نگاہ رکھنا تھا۔ وہ واپس اسی راستے پر محراب دار برآمدے میں چلنے لگی، لیکن اس بار فلورنتینو اریزا کو علم تھا کہ مکان میں کوئی اور بھی موجود ہے، کیوں کہ صحن کا اجالا سبق دوہراتی ہوئی ایک نسوانی آواز سے معمور تھا۔ جب وہ سلائی کے کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا، اس نے کھڑکی سے اندر نگاہ ڈالی اور ایک عمررسیدہ عورت اور ایک نوعمر لڑکی کو دو کرسیوں پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھے دیکھا، جو ایک کتاب میں سے ساتھ ساتھ پڑھ رہی تھیں جو عمررسیدہ عورت کی گود میں کھلی ہوئی رکھی تھی۔ یہ عجیب سا منظر لگتا تھا؛ بیٹی ماں کو پڑھنا سکھا رہی تھی۔ اس کا یہ خیال صرف جزوی طور پر غلط تھا، کیوں کہ عورت لڑکی کی ماں نہیں بلکہ پھوپھی تھی، اگرچہ اس نے اسے اپنی بیٹی ہی کی طرح پالا تھا۔ پڑھائی میں کوئی خلل نہ آیا، بس لڑکی نے یہ دیکھنے کو نگاہ اٹھائی کہ کھڑکی کے پاس سے کون گزر رہا ہے، اور یہ سرسری نگاہ محبت کے اس طوفان کی ابتدا ہوئی جو اب تک، نصف صدی کا عرصہ گزر جانے پر بھی، ختم نہ ہوا تھا۔

فلورنتینو اریزا لورینزو ڈازا کے بارے میں صرف اتنا جان سکا کہ وہ ہیضے کی وبا کے کچھ ہی عرصے بعد، سان جوان دلا سیناگا سے، اپنی اکلوتی بیٹی اور ناکتخدا بہن کو ہمراہ لیے آیا تھا، اور جن لوگوں نے اُسے جہاز سے اترتے دیکھا تھا، انھیں اس بات میں ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ وہ مستقل رہنے کی غرض سے آیا ہے، کیوں کہ اس کے اسباب میں وہ تمام چیزیں شامل تھیں جو ایک مکمل طور پر آراستہ مکان کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ اس کی بیوی اس وقت فوت ہو گئی تھی جب بچّی بہت خوردسال تھی۔ اس کی بہن، جس کا نام ایسکولاستیکا تھا، چالیس برس کی تھی، اور ایک منّت کی پاسداری میں، گھر سے باہر نکلتے وقت سینٹ فرانسس کی عبا پہنتی تھی اور گھر کے اندر کمر میں اعمال کی ڈوری باندھے رکھتی تھی۔ لڑکی کی عمر تیرہ برس کی تھی اور نام وہی تھا جو اس کی مرحومہ ماں کا تھا: فرمینا۔

لورینزو ڈازا کو خاصا متموّل باور کیا جاتا تھا، کیوں کہ وہ کسی معلوم پیشے سے بےنیاز ٹھاٹ سے رہتا تھا، اور اس نے باغِ اناجیل کا مکان نقد رقم دے کر خریدا تھا، جس کی تجدید میں اسے اس کی قیمت یعنی دو سو طلائی پیسو سے دگنی رقم خرچ کرنی پڑی ہو گی۔ اس کی

بیٹی مریم عذرا کی تقدیم کی اکادمی میں پڑھ رہی تھی، جہاں پچھلی دو صدیوں سے اعلا طبقے کی نوعمر خواتین مستعد اور اطاعت گزار بیویاں بننے کا فن اور قواعد سیکھتی رہی تھیں۔ نوآبادیاتی دور میں، اور جمہوریہ کے ابتدائی برسوں میں، یہ اسکول صرف ان طالبات کو داخلہ دیا کرتا تھا جو مشہور ناموں والے ارفع خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن آزادی کی اکھاڑپچھاڑ کی زد میں آئے ہوئے قدیم گھرانوں کو ایک نئے زمانے کی حقیقتوں کے سامنے سر جھکانا پڑا، اور اکادمی نے خاندانی وجاہت سے قطع نظر، صرف اس بنیادی شرط پر کہ وہ کیتھولک شادیوں کی باقاعدہ جائز اولاد ہوں، ان تمام درخواست گزاروں کے لیے اپنے دروازے کھول دیے جو تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کی اہل تھیں۔ بہرکیف، یہ ایک گراں اسکول تھا، اور یہ حقیقت کہ فرمینا دازا اس میں پڑھتی تھی، اس کے خاندان کے سماجی رتبے کا نہ سہی مالی خوشحالی کا بہرحال کافی ثبوت تھی۔ اس اطلاع نے فلورنتینو اریزا کو خاصی امید بخشی، کیونکہ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ بادام کی سی آنکھوں والی یہ حسین اور نوخیز لڑکی اس کے خوابوں کی رسائی میں ہے۔ لیکن اس کے باپ کی کڑی نگرانی نے بہت جلد ایک بےمداوا دشواری پیدا کر دی۔ دوسری طالبات کے برعکس جو ٹولیوں میں یا کسی معمّر ملازمہ کی ہمراہی میں اسکول جاتی تھیں، فرمینا دازا ہمیشہ اپنی ناکتخدا پھوپھی کے ساتھ ہوتی تھی اور اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کسی اور طرف دھیان بٹانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

اسی سادگی کے ساتھ فلورنتینو اریزا نے اکیلے شکاری کے طور پر اپنی پوشیدہ زندگی کا آغاز کیا۔ صبح سات بجے سے وہ باغِ اناجیل کی سب سے اوجھل بنچ پر بادام کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر بظاہر شاعری کی کوئی کتاب کھول کر پڑھنے لگتا یہاں تک کہ دھاری دار نیلی یونیفارم، گھٹنوں تک پہنچتی ہوئی اسٹاکنگز اور مردانہ وضع کے ڈوری دار جوتوں میں، اس محال دوشیزہ کو گزرتے ہوئے دیکھ لیتا۔ اس کی موٹی سی چوٹی، سرے پر بندھی ہو کے ساتھ، اس کی کمر تک پہنچ رہی ہوتی۔ وہ ایک فطری تمکنت کے ساتھ، سر اٹھائے، ایک نقطہ پر نگاہ جمائے، کتابوں کا بستہ سینے پر دونوں ہاتھوں سے تھامے، تیز تیز قدموں سے ناک کی سیدھ میں چلتی جاتی۔ اس کی ہرنی کی سی سبک رفتار سے یوں لگتا جیسے وہ زمین کی کشش سے آزاد ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ، قدم سے قدم ملانے کی کوشش کرتی، کتھئی عبا میں ملبوس اس کی پھوپھی فلورنتینو اریزا کو خفیف سا موقع بھی نہ دیتی کہ وہ نزدیک آنے کی کوشش کرے۔ فلورنتینو اریزا ہر روز چار مرتبہ ان دونوں کو آتے اور جاتے دیکھتا، اور اتوار کے دن ایک بار، جب وہ ہفتہ وار عبادت کے بعد گرجا سے باہر آ رہی ہوتیں، اور اس لڑکی کو صرف دیکھ لینا اس کے لیے کافی تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس میں غیرواقعی خوبیوں اور خیالی جذبات کا اضافہ کر کر کے اسے مثالی صورت دیتا گیا، اور دو ہفتے بعد اس کے ذہن میں اس لڑکی کے خیال کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔ تب اس نے فرمینا دازا کو، اپنے خوش نویسی کے سے نفیس خط میں کاغذ کے دونوں طرف لکھا ہوا ایک سادہ رقعہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن وہ اسے کئی روز تک اپنی جیب میں ڈالے، اس کو تھمانے کا طریقہ سوچتا رہا، اور یہ سوچتے سوچتے ہر رات سونے سے پہلے اس میں اضافہ کرتا گیا، یہاں تک کہ اصل خط اب مدحیہ الفاظ کی ایک ضخیم

لغت کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، جو تمام ان کتابوں سے مستعار تھے جنھیں وہ باغ میں اپنی نگہداریوں کے دوران پڑھا کرتا تھا اور جن کے اشعار اب اسے زبانی یاد ہو گئے تھے۔

خط اُس تک پہنچانے کے کسی ذریعے کی تلاش میں اس نے اکادمی کی چند اور طالبات سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کی دنیا سے بہت دور تھیں۔ اس کے علاوہ، بہت سوچنے کے بعد، اسے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ کسی اور کو اپنے ارادوں کا رازدار کرے۔ پھر بھی وہ اتنا جاننے میں کامیاب ہوا کہ شہر میں آنے کے چند روز بعد فرمینا دازا کو سنیچر کے رقص میں شرکت کی دعوت ملی تھی، لیکن اس کے باپ نے اسے جانے کی اجازت نہ دیتے ہوئے فیصلہ کن انداز سے کہہ دیا تھا، "ہر چیز اپنےوقت پر۔" جب خط کی ضخامت دونوں طرف لکھے ہوئے ساٹھ صفحوں سے تجاوز کر گئی تو فلورنتینو اریزا اپنے اس راز کا بوجھ مزید نہ سہار سکا اور اس نے اپنی ماں کو اس میں شریک کر لیا جو واحد ہستی تھی جس پر اعتماد کرنے کی وہ خود کو اجازت دیتا تھا۔ محبت کے معاملات میں اپنے بیٹے کی سادگی نے ترانزیتو آریزا کو اتنا متاثر کیا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں، اور اس نے اپنی دانائی سے اس کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے تو اس نے اسے کاغذوں کے اس غنائی پلندے کو خط کے طور پر بھیجنے سے باز رہنے پر آمادہ کیا، کہ یہ اس کے خوابوں پر چھائی ہوئی لڑکی کو صرف خوف میں مبتلا کر سکتا تھا، جو اس کے خیال میں دل کے معاملات میں اتنی ہی تازہ کار تھی جتنا اس کا بیٹا۔ پہلا قدم یہ ہے، اس نے سمجھایا، کہ وہ اسے اپنی دل چسپی سے آگاہ کرے تاکہ اس کے اعلان پر وہ حیرت کا شکار نہ ہو جائے اور اسے غور کرنے کا وقت مل سکے۔

"اور سب سے اہم بات یہ ہے"، وہ بولی، "کہ تم لڑکی سے پہلے اس کی پھوپھی کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔"

یہ دونوں نصیحتیں، بلاشبہ، دانائی سے بھرپور تھیں، لیکن دونوں بعد از وقت تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اُس روز، جب اپنی پھوپھی کو سبق دینے سے ایک لمحے کو دھیان ہٹا کر اس نے یہ دیکھنے کے لیے نگاہ اٹھائی تھی کہ برآمدے سے کون گزر رہا ہے، فلورنتینو اریزا نے اپنے بےمدافعت انداز کے باعث اسے متاثر کر لیا تھا۔ اس رات، کھانے کے دوران، اس کے باپ نے ٹیلیگرام کا ذکر کیا جس سے اس نے جانا کہ فلورنتینو اریزا کے اس کے گھر آنے کا مقصد کیا تھا، اور یہ کہ وہ معاش کے لیے کیا کرتا ہے۔ اس اطلاع نے اس کی دل چسپی اور بڑھا دی، کیونکہ اس زمانے کے اور لوگوں کی طرح اس کے لیے بھی ٹیلیگراف کی ایجاد اپنے اندر جادو کا سا عنصر رکھتی تھی۔ سو اس نے باغِ اناجیل میں بادام کے درختوں کے نیچے بیٹھے دیکھ کر پہلی مرتبہ ہی میں اسے پہچان لیا تھا، لیکن اسے کوئی اضطراب نہیں ہوا جب تک اس کی پھوپھی نے اسے یہ نہ بتایا کہ وہ کئی ہفتوں سے وہاں نظر آ رہا ہے۔ جب انھوں نے اتوار کو عبادت کے بعد باہر نکلتے ہوئے، اسے ایک بار پھر دیکھا تو اس کی پھوپھی کو یقین ہو گیا کہ یہ تمام ملاقاتیں اتفاقی نہیں ہو سکتیں۔ اس نے کہا، "ظاہر ہے وہ یہ تمام مشقّت میرے لیے تو نہیں اٹھا رہا ہے۔" اپنے راہبانہ انداز اور استغفار کی عادت کے باوجود پھوپھی اسکولسٹیکا میں زندگی سے شغف اور سروکار کی طلب موجود تھی جو اس کی سب سے بڑی خوبی تھی، اور صرف اس خیال سے، کہ کوئی شخص اس کی بھتیجی میں دل چسپی لے رہا ہے، اس میں ایک

ناقابل مزاحمت جذب پیدا کر دیا۔ البتہ فرمینا دارا محبت کے سادہ ترین تجسّس سے بھی محفوظ تھی اور فلورنتینو آریزا کو دیکھ کر اس میں جو واحد جذبہ پیدا ہوتا وہ ایک طرح کے ترحّم کا تھا، کیوں‌کہ وہ اسے بیمار دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس کی پھوپھی نے اسے بتایا کہ کسی مرد کی اصل فطرت کا پتا چلانے کے لیے ایک طویل عمر درکار ہے، اور اسے یقین ہے کہ جو نوجوان کو جو باغ میں بیٹھا انھیں آتے جاتے دیکھا کرتا ہے، صرف عشق کا مرض لاحق ہے۔

پھوپھی ایسکولستیکا بےمحبت کی شادی کی اکلوتی یادگار اس موحیر لڑکی کے لیے ہمدردی اور اُنس کی ایک پناہ گاہ تھی۔ ماں کی موت کے بعد سے اسی نے اسے پالا تھا اور اس کے لورینزو دارا کے ساتھ معاملات میں اس کا طرزِعمل پھوپھی سے زیادہ محرم راز کا سا ہوتا تھا۔ اس طرح فلورنتینو اریزا کی آمد ان دونوں کے لیے ان کے بہت سے رازدارانہ مشغلوں میں سے ایک تھی جو وہ وقت گزارنے کے لیے ایجاد کیا کرتی تھیں۔ دن میں چار مرتبہ جب وہ باغ اسماعیل کے پاس سے گزرتیں تو اس دبلے، سہمے ہوئے، غیرمتاثرکن پاسدار پر جلدی سے ایک تیز نگاہ ڈالتیں جو شدید گرمی میں بھی سیاہ لباس پہنے بیٹھا درختوں کے نیچے پڑھنے کی اداکاری کر رہا ہوتا تھا۔ "وہ رہا!" ان میں سے جس کی نگاہ اس پر پہلے پڑتی وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے دوسری کو بتاتی اور جب وہ نظر اٹھاتا تو اسے اپنی زندگی کی دو سنجیدہ اور الگ تھلگ خواتین اس کی طرف توجہ کیے بغیر باغ کا راستا طے کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔

"بےچارہ" اس کی پھوپھی نے کہا تھا، "میں ساتھ ہوں اس لیے اسے تم سے مخاطب ہونے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر وہ واقعی سنجیدہ ہے تو ایک دن تم سے بات کرے گا اور پھر تمھیں ایک خط دے گا۔"

آنے والی تمام دشواریوں کا اندازہ کر کے اس کی پھوپھی نے اسے اشاروں کی زبان سکھائی جو ممنوعہ محبت میں ایک ناگزیر حربہ ہے۔ ان غیرمتوقع اور تقریباً بچکانہ حرکتوں نے فرمینا دارا میں ایک نامانوس تجسّس جگا دیا لیکن کئی ماہ تک اسے یہ خیال نہ ہوا کہ معاملہ اس سے آگے بھی جا سکتا ہے۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب یہ مشغلہ رفتہ رفتہ ایک محویت میں بدل گیا اور اسے دیکھنے کی طلب میں اس کے خون کی گردش تیز ہونے لگی، اور ایک رات وہ دہشت میں جاگ اٹھی جب وہ اندھیرے میں اسے مسہری کی پائینتی کی طرف سے اس پر نظریں جمائے ہوئے دکھائی دیا۔ تب اس نے اپنی پوری جان سے اپنی پھوپھی کی پیش گوئیوں کے سچ ہونے کی آرزو کی اور اپنی دعاؤں میں اس نے خدا سے اس کو حوصلہ عطا کرنے کی التجا کی کہ وہ خط اسے تھما دے اور وہ دیکھ سکے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

لیکن اس کی دعاؤں کا کوئی جواب نہ آیا۔ بلکہ جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب فلورنتینو اریزا نے اپنی ماں کے سامنے اعتراف کیا تھا اور اس نے اسے ستّر صفحوں کا توصیفی پلندا فرمینا دارا کو تھمانے سے باز رہنے پر آمادہ کر لیا تھا، سو وہ اس سال کے اختتام تک انتظار کرتی رہی۔ اس کی محویت ناامیدی میں بدلتی جا رہی تھی کیوں‌کہ دسمبر کی چھٹیاں آ رہی تھیں اور وہ باربار خود سے سوال کر رہی تھی کہ ان تین مہینوں میں جب وہ اسکول نہیں جایا کرے گی تو اسے کس طرح دیکھے گی اور کس طرح اسے خود کو

دیکھنے کاموقع دے گی۔ اس کے یہ سوال ابھی تک بےجواب تھے کہ کرسمس سے پہلے کی رات وہ اس احساس سے لرز اٹھی کہ وہ نصف شب کی عبادت کے ہجوم میں موجود ہے اور اسے دیکھ رہا ہے، اور اس کا دل بےتابی کے طوفان کی زد میں آ گیا۔ وہ گردن گھمانے کی ہمّت نہ کر سکی، کیوں‌کہ وہ اپنے باپ اور اپنی پھوپھی کے بیچ میں بیٹھی تھی اور خود پر قابو پانے کی شدید کوشش کر رہی تھی تاکہ وہ دونوں اس کے ہیجان سے باخبر نہ ہو جائیں۔ لیکن گرجاگھر سے باہر نکلتے ہوئے ہجوم کے درمیان اسے وہ اتنے واضح طور پر، اتنا قریب محسوس ہوا کہ گرجاگھر کے وسطی حصے سے گزرتے ہوئے وہ ایک ناقابل مزاحمت قوت کے زیراثر اپنے شانے کے اوپر سے دیکھے بغیر نہ رہ سکی، اور تب اس نے اپنی آنکھوں سے بالشت بھر کے فاصلے پر ان سرد آنکھوں، اس بےرنگ چہرے اور محبت کی دہشت سے پتھر بنے ہوئے ان ہونٹوں کو دیکھا۔ اپنی بےباکی سے خوفزدہ ہو کر اس نے پھوپھی ایسکولستیکا کا بازو تھام لیا کہ گر نہ پڑے اور اس کی پھوپھی نے جالی دار دستانوں میں سے اس کی ہتھیلیوں کے برف جیسے ٹھنڈے پسینے کو محسوس کر لیا اور اپنی غیرمشروط رازداری کے بےحد موہوم اشارے سے اسے تسلی دی۔ آتش بازی اور مقامیوں کے طنبوروں کے شور، دروازوں کی رنگین روشنیوں اور سکون کے طالب ہجوم کی ہاوہو کے درمیان فلورنتینو اریزا نیند میں چلنے والوں کی طرح صبح تک پھرتا رہا، اپنے آنسوؤں کے درمیان سے اس جشن کو دیکھتے ہوئے وہ اس احساس کے اثر میں تھا کہ یہ خداوند کی نہیں بلکہ خود اس کی پیدائش کی رات ہے۔

کل بھتے اس کا جنون اور بڑھ گیا جب وہ سہ پہر کو قیلولے کے وقت مایوسی کے عالم میں فرمینا دارا کے مکان کے پاس سے گزرا اور اس نے دیکھا کہ وہ اور اس کی پھوپھی دروازے کے باہر باغیچے میں بادام کے درختوں کے نیچے بیٹھی ہیں۔ وہی منظر جو اس نے پہلی سہ پہر کو مکان کے اندر سلائی والے کمرے میں دیکھا تھا اب بیروں در دوہرایا جا رہا تھا: لڑکی اپنی پھوپھی کو پڑھنا سکھا رہی تھی۔ لیکن فرمینا دارا اسکول کی یونیفارم کے بغیر مختلف نظر آ رہی تھی، کیوں‌کہ اس نے ایک تنگ سی قبا پہن رکھی تھی جس کی بہت ساری تہیں اس کے کاندھوں سے یونانی انداز میں نیچے گرتی تھیں، اور سر پر اس نے گارڈینیا کے تازہ پھولوں سے بنا ایک ہار لپیٹ رکھا تھا جس سے وہ کوئی تاج دار دیوی دکھائی دے رہی تھی۔ فلورنتینو اریزا باغ میں ایسی جگہ جا بیٹھا جہاں سے یقین تھا کہ اسے دیکھ لیا جائے گا۔ وہ خود کو پڑھنے کی ناٹک کرنے پر آمادہ نہ کر سکا، بلکہ کتاب گود میں کھلی چھوڑ کر نظریں جمائے اس خیالی دوشیزہ کو دیکھتا رہا جس نے جواب میں اس پر ایک ترس بھری نگاہ تک نہ ڈالی۔

پہلےپہل اسے خیال ہوا کہ ان دونوں کا باہر باغیچے میں آ بیٹھنا شاید مکان کی نہ ختم ہونے والی مرمّت کے باعث ایک اتفاقی انتظام تھا لیکن آنے والے چند دنوں میں وہ سمجھ گیا کہ فرمینا دارا چھٹیوں کے تین مہینوں کی ہر سہ پہر وہاں اس کی نظروں کے سامنے ہو گی۔ بلاشبہ اس بات سے اس کا دل ایک نئی امید سے بھر گیا۔ اسے یہ تاثر نہیں ملا تھا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے، اور نہ وہ کسی دلچسپی یا تنفر کا سراغ لگ پایا تھا، مگر فرمینا دارا کی بےنیازی سے ایسی روشنی پھوٹتی معلوم ہوتی تھی جو ثابت قدم رہنے میں اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ تب، جنوری کے اواخر کی ایک سہ پہر پھوپھی نے اپنی چیزیں کرسی پر رکھیں اور

اسی بھیجی کو بادام کے درختوں سے گرتے زرد پتّوں کے بیچ تنہا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ اس فوری خیال سے حوصلہ پا کر کہ یہ موقع التزاماً پیدا کیا گیا ہے، فلورنتینو اریزا نے سڑک پار کی اور فرمینا دازا کے مقابل جا کھڑا ہوا، اس کے اتنے قریب کہ اس کی سانسوں کے خفیف زیروبم اور پھولوں کے عطر کی اس خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا جو اس کے ذہن میں عمر بھر کے لیے فرمینا دازا کی ذات سے وابستہ ہو جانے والی تھی۔ اس سے مخاطب ہوتے وقت فلورنتینو اریزا کا سر اٹھا ہوا تھا اور اس میں ایک ایسا عزم تھا جو اس موقعے کے پچاس برس بعد اس میں، اسی سبب سے، دوبارہ بیدار ہونے والا تھا۔

"میں صرف تمھیں ایک خط دینا چاہتا ہوں،" وہ بولا۔

یہ وہ آواز نہیں تھی جس کی فرمینا دازا کو اس سے توقع تھی؛ یہ ایک تیز اور صاف آواز تھی اور اس میں ایسا ضبط تھا جو اس کے ماتمی انداز سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اپنی کڑھائی کے کام سے نظریں ہٹائے بغیر وہ جواب میں بولی: "میں اپنے ابّا کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتی۔" فلورنتینو اریزا اس آواز کی گرمی سے لرز اٹھا، جس کا دبا دبا لہجہ وہ ساری زندگی فراموش نہیں کرنے والا تھا۔ لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور کسی جھجھک کے بغیر بولا، "تو اجازت لے لو۔" پھر اس حکم میں التجا کی شیرینی گھولنے کے لیے اس نے کہا، "یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔" فرمینا دازا نے اس پر نظر نہیں ڈالی، نہ اپنا کڑھائی کا کام ایک سمت کے لیے بند کیا، پھر بھی اس کے فیصلے نے دروازے کو اتنا کھول دیا کہ اس میں سے تمام دنیا گزر سکتی تھی۔

"روزانہ سہ پہر کو آتے رہو،" اس نے کہا، "اور اس وقت تک انتظار کرو جب تک میں اپنی جگہ تبدیل نہ کروں۔"

فلورنتینو اریزا کو اس کی بات اگلے سوموار تک سمجھ میں نہ آئی جب اس نے باغ میں سنگِ پر سے بیٹھے بیٹھے وہی پرانا منظر ایک تبدیلی کے ساتھ دیکھا۔ جب پھوپھی ایسکولاستیکا اندر گھر میں چلی گئی تو فرمینا دازا اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ فلورنتینو اریزا، جس نے اپنے کالر میں کیمیلیا کا ایک پھول لگا رکھا تھا، سڑک پار کر کے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کہا "یہ میری زندگی کا سب سے عظیم لمحہ ہے۔" فرمینا دازا نے اس کی جانب نگاہیں نہ اٹھائیں لیکن اپنے دائیں بائیں نظر ڈال کر خشک موسم کی حدّت میں ویران سڑک اور ہوا میں اڑتے سوکھے پتّوں کو دیکھا۔

"لاؤ دے دو،" وہ بولی۔

پہلے تو فلورنتینو اریزا نے ارادہ کیا تھا کہ وہ ستّر صفحات اسے دے دے جو باربار پڑھنے سے اسے زبانی یاد ہو چکے تھے لیکن پھر اس نے صرف آدھے صفحے کا ایک سنجیدہ اور سیدھا سادہ خط اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا جس میں اس نے صرف اسی شے کا عہد کیا تھا جو ضروری تھی، یعنی اپنی مکمل وفاداری اور دوامی محبت کا۔ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے خط نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا جو کڑھائی پر مستقل نظریں جمائے ہوئے تھی اور اب بھی اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی۔ اس نے خوف سے زرد ہاتھ میں کپکپاتے ہوئے خط کو دیکھا اور کڑھائی کا فریم خط وصول کرنے کے لیے اوپر اٹھا دیا،

کیوں‌کہ وہ یہ اقرار کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس نے اس کی انگلیوں کی کپکپاہٹ کو محسوس کر لیا ہے۔ تب ایسا ہوا کہ بادام کے درختوں کے پتّوں میں کسی پرندے نے پر پھڑپھڑائے اور اس کی بیٹ سیدھی کڑھائی کے فریم پر آ گری۔ فرمینا دازا نے فریم جلدی سے ہٹا کر اپنے پیچھے کر لیا تاکہ اسے معلوم نہ ہونے پائے، اور پہلی بار اپنا جلتا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔ فلورنتینو اریزا اس کا اثر لیے بغیر خط ہاتھ میں لیے کھڑا رہا اور بولا "یہ اچھا شگون ہے۔" وہ شکریے کے طور پر پہلی بار مسکرائی اور خط اس کے ہاتھ سے تقریباً جھپٹ لیا اور تہہ کر کے اپنے گریبان میں رکھ لیا۔ پھر اس نے کیمیلیا کا پھول اپنے کالر سے نکال کر اسے پیش کیا، لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا: "یہ وعدوں کا پھول ہے۔" تب، یہ احساس ہونے پر کہ ان کی ملاقات کا وقت ختم ہو رہا ہے، اس نے دوبارہ اپنے سنجیدہ انداز میں پناہ لی۔

"اب تم جاؤ،" اس نے کہا، "اور اس وقت تک دوبارہ نہ آنا جب تک میں نہ کہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اس پہلی ملاقات کا حال اپنی ماں کو بتاتا وہ اس کے بارے میں جان گئی، کیوں‌کہ فلورنتینو اریزا کی آواز مدھم پڑنے لگی، بھوک کم ہونے لگی اور وہ پوری پوری رات بستر پر کروٹیں بدل کر گزارنے لگا۔ لیکن جب اس نے اپنے پہلے خط کے جواب کا انتظار شروع کیا تو اس کی اذیت اسہال اور سبز الٹیوں کی وجہ سے اور زیادہ پیچیدہ ہونے لگی۔ وہ کھویا کھویا رہنے لگا اور اسے غشی کے دورے پڑنے لگے۔ اس کی ماں اس کی حالت دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی کیوں‌کہ اس کی علامات محبت کے اضطراب سے زیادہ ہیضے کی غارت گری سے مشابہت رکھتی تھیں۔ فلورنتینو اریزا کا دینی باپ بھی، جو ہومیوپیتھی کا پرانا معالج اور ترانسیتو اریزا کا اس وقت سے رازداں تھا جب وہ درپردہ ایک داشتہ کی حیثیت سے رہتی تھی، پہلے اپنے مریض کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا، کیوں‌کہ اس کی نبض سست تھی، سانس بھاری تھا اور زرد پسینا کسی ایسے شخص کی طرح تھا جو مرنے کے قریب ہو۔ لیکن اس کے تفصیلی معائنے سے معلوم ہوا کہ اسے بخار یا درد کی کوئی شکایت نہیں، اور اس کا واحد شعوری احساس مر جانے کی ایک شدید خواہش کا تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے اسے پہلے مریض سے اور پھر اس کی ماں سے ہوشیاری کے ساتھ پوچھ گچھ کرنی پڑی، کہ محبت اور ہیضے کی علامات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اس نے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے زیزفون کے شگوفوں کا خیساندہ تجویز کیا اور آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا تاکہ دور جا کر اسے کچھ قرار مل سکے، لیکن فلورنتینو اریزا کی خواہش اس کے برعکس تھی: وہ اپنی اذیت سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

ترانسیتو اریزا ایک آزاد کردہ مخلوط النسل تھی جس کی شادکامی کی جبلّت کو افلاس نے دم گھونٹ دیا تھا، اور وہ اپنے بیٹے کی بےکلی میں اسی طرح لذّت محسوس کر رہی تھی گویا یہ خود اسی کی ہو۔ جب اس کا جنون بڑھا تو اس نے فلورنتینو اریزا کو خیساندے پلائے اور سردی سے بچاؤ کے لیے اسے کمبلوں میں لپیٹ دیا، لیکن ساتھ ہی وہ اسے اپنی اس حالت سے لذت اٹھانے پر بھی اکساتی رہی۔

"اس کی قدر کرو کیوں‌کہ ابھی تم جوان ہو اور اسے سہار سکتے ہو،" وہ اس سے بولی، "یہ چیزیں ساری زندگی ساتھ نہیں رہتیں۔"

لیکن محکمۂ ڈاک اس خیال سے متفق نہ تھا۔ فلورنتینو اریزا اپنے کام سے غفلت برتنے لگا تھا اور اتنا گم شدہ رہنے لگا تھا کہ ڈاک کے جہاز کی آمد پر لہرائے جانے والے جھنڈوں میں تمیز نہ کر پاتا تھا۔ ایک بدھ کے روز اس نے جرمنی کا جھنڈا لہرا دیا جبکہ جہاز لیلینڈ کمپنی کا تھا اور لیورپول سے ڈاک لایا تھا، اور ایک اور دن سان‌نزیر سے آنے والے کمپنی ژنرال ٹرانس اٹلانٹیک کے جہاز کی آمد پر ریاستہائے متحدہ کا جھنڈا لہرا دیا۔ محبت کی اس غائب دماغی نے ڈاک کی تقسیم میں اس قدر بےترتیبی پیدا کی اور لوگوں کو اتنا چراغ پا کیا کہ اگر لوتاریو تگت نے اسے ٹیلیگراف کے دفتر میں نہ رکھ دیا ہوتا اور کلیسا کی سرود خوانی میں وہ اس کے ساتھ وائلن بجانے نہ جایا کرتا تو وہ یقیناً ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ ان میں ایسی دوستی تھی جو ان کی عمروں کے فرق کے باعث ناقابلِ فہم تھی، یہ فرق اتنا تھا کہ ان دونوں میں دادا اور پوتے کا رشتہ بھی ہو سکتا تھا، لیکن وہ صرف کام کی جگہ پر ہی نہیں بلکہ وقفے کے اوقات میں بےحد خوشگوار رفاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شام کو وہ بندرگاہ کے اس پاس کے ان سرائے خانوں میں بھی ساتھ جایا کرتے تھے جو معاشرے کی ہر سطح کے لوگوں سے بھری رہتی تھیں اور جن کی محبوب آماج گاہ تھیں، جہاں وہ سستے کھانے کے ساتھ تلی ہوئی مچھلی اور میٹھے چاول کھانے آیا کرتے تھے۔ یہاں سوشل کلب کے بارونق ضیافتوں سے بھاگ نکلنے والے خوش پوش دولت مند نوجوان بھی آتے تھے۔ لوتاریو تگت ٹیلیگراف کی آخری شفٹ کے بعد وہاں جانے کا عادی تھا اور صبح اکثر اسے جمیکا کی رم پیتے اور اسپلی جہازوں کے دیوانے ملاحوں کے ساتھ اکارڈین بجانے میں مشغول پاتی۔ وہ بیل کی سی گردن اور سنہری ڈاڑھی والا ایک فربہ بدن شخص تھا۔ رات کو باہر نکلتے وقت وہ ایک لبرٹی کیپ پہن لیتا اور اس کے بعد اس کی سینٹ نکولس سے مشابہت مکمل ہونے میں صرف گلے میں گھنٹیوں کی کسر رہ جاتی۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار وہ ان عورتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ رات گزارتا جنہیں وہ رات کے پرندے کہا کرتا تھا، اور جو ملاحوں کے لیے ہوئے شب بسری کے ایک ہوٹل میں فوری ضرورت کے لیے محبت فروخت کیا کرتی تھیں۔ فلورنتینو اریزا سے ملنے پر اس نے ایک شگفتہ مسرت کے ساتھ اسے بھی اس بہشت کے اسرار سے متعارف کرایا۔ اس نے فلورنتینو اریزا کے لیے اپنے خیال میں بہترین نوعمر پرندوں کا انتخاب کیا، ان کی قیمت اور طور طریق کے بارے میں بات طے کی اور انہیں ان کی خدمات سے قبل اپنی جیب سے ادائیگی کی پیشکش کی۔ لیکن فلورنتینو اریزا راضی نہ ہوا: وہ کنوارا تھا اور اس نے اپنے کنوارپن سے محبت کے سوا کسی اور شے کے عوض دستبردار نہ ہونے کا عہد کر رکھا تھا۔

ہوٹل کی عمارت ایک نوآبادیاتی حویلی تھی جو اپنے عروج کے دن گزار چکی تھی اور اس کے وسیع و عریض دیوان خانوں اور کمروں کو لکڑی کے تختوں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن کے دروازوں میں اندر جھانکنے کے لیے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ ان کو نہ صرف ہم بستری کے لیے بلکہ جھانکنے کے لیے بھی کرائے پر دیا جاتا تھا۔ وہاں بہت سے قصے مشہور تھے، بعض دخل اندازوں نے بُنائی کی سلائیوں سے اپنی آنکھیں پھوڑ لی تھیں، ایک شخص نے سوراخ میں سے جھانک کر اپنی بیوی کو پہچان لیا تھا، بعض خاندانی شرفا نے اپنی اصل کو فراموش کرنے کے لیے چہروں پر آئے ہوئے سربگلوں کے ساتھ فاحشاؤں کے

بھیس میں وہاں آیا کرتے تھے۔ ان قصّوں، اور جھانکنے والوں اور دیکھے جانے والوں کی بدبختی کی بہت سی اور داستانوں کی وجہ سے فلورنتینو اریزا کو ان میں سے کسی کوٹھری میں جانے کا خیال ہی دہشت زدہ کر دیتا تھا۔ اور اس طرح لوتاریو تگت اسے اس بات پر کبھی قائل نہ کر سکا کہ ان سوراخوں سے جھانکنا اور اس جھانکنے کا ہدف بننا یورپی شہزادوں کے نفیس ذوق کا آئینہ دار ہے۔

اپنے بھاری بھرکم جثّے کے برعکس لوتاریو تگت کے اعضائے تناسل کسی کمسن بچے کی طرح نوخیز تھے، لیکن یہ ضرور ایک بابرکت نقص رہا ہو گا کیونکہ انتہائی تجربہ کار طوائفیں میں بھی اس کے ساتھ سونے کا موقع حاصل کرنے کے لیے تکرار ہوتی تھی، اور پھر کوٹھری میں سے ان کی چیخیں بلند ہوا کرتیں، جیسے انہیں ذبح کیا جا رہا ہو، جن سے عمارت کی بنیادیں لرزنے لگتیں اور اس میں بسے ہوئے عفریت تک خوف سے کانپنے لگتے۔ کہا جاتا تھا کہ لوتاریو تگت کے پاس سانپ کے زہر سے بنایا ہوا ایک مرہم ہے جس کے ملنے سے عورتوں کے بدن جل اٹھتے ہیں، لیکن وہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ وہ خدا کے دیے ہوئے وسائل کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔ وہ ہنسی کے مارے بےحال ہوتے ہوئے کہتا، "یہ خالص محبت کا کرشمہ ہے۔" فلورنتینو اریزا کو اس کی بات کا یقین کرنے کے لیے ابھی کئی سال درکار تھے۔ بالآخر اپنی جذباتی تعلیم کے اعلا درجے پر پہنچ کر جب وہ ایک ایسے شخص سے ملا جو بیک وقت تین عورتوں کو تصرف میں لاتے ہوئے ایک شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا، تو اسے قائل ہونا پڑا۔ وہ تینوں عورتیں صبح اس کے قدموں میں گر کر اپنی بافت اس کی نذر کرتیں، اپنی کم مائیگی پر شرمندہ ہوتیں اور التجا کرتیں کہ ان تینوں میں سے جس نے اسے سب سے زیادہ رقم پیش کی ہو وہ اس کے ساتھ بستر پر جائے۔ فلورنتینو اریزا کا خیال تھا کہ ایسی تذلیل کا سبب صرف خوف ہی ہو سکتا ہے، لیکن ان میں سے ایک نے اس کے برعکس حقیقت کا اظہار کر کے اسے حیران کر دیا۔

"کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں،" وہ بولی، "جو صرف محبت کی خاطر کی جاتی ہیں۔"

لیکن لوتاریو تگت کے اس ہوٹل کا سب سے معزز گاہک بننے میں اس کی جنسی صلاحیتوں کا اتنا دخل نہ تھا جتنا اس کی شخصیت کی کشش کا۔ فلورنتینو اریزا نے بھی، اپنی کم گوئی اور گریزاں انداز کے سبب ہوٹل کے مالک کے دل میں جگہ بنا لی، اور اپنی شدید تنہائی اور یاس کے وقتوں میں وہ ہوٹل کے کسی تنگ کمرے میں بند ہو کر شاعری اور آنسو بھری قسط وار کہانیاں پڑھا کرتا، اور اس کے خیالوں کی پرواز اسے دوپہر کے سکوت میں، بالکنی میں لگے ہوئے سیاہ ابابیلوں کے گھونسلوں اور بوس و کنار اور پر پھڑپھڑانے کی آوازوں سے دور لے جاتی۔ غروبِ آفتاب کے قریب جب موسم کی حدّت کم ہو جاتی تو دوسرے کمروں میں دن بھر کے کام کے بعد خود کو عاجلانہ محبت سے تسکین دینے کے لیے آئے ہوئے مردوں کی گفتگو سے توجہ ہٹانا ناممکن ہو جاتا۔ اس گفتگو کے کانوں میں پڑتے رہنے سے فلورنتینو اریزا کو نہ صرف بہت سی بےوفائیوں کا بلکہ چند سرکاری رازوں کا بھی علم ہو جو بعض بااثر گاہک، اور یہاں تک کہ مقامی اہلکار، اس بات سے بےپروا ہو کر کہ ان کی آواز دوسرے کمروں میں سنی جا سکتی ہے، اپنی لمحاتی محبوباؤں کو بتا رہے ہوتے تھے۔ اسی طرح اسے

اسے بات کا بھی پتا چلا کہ جزائر سوتاوینتو سے چار سمندری کوس کے فاصلے پر سمندر کی تہہ میں ایک ہسپانوی جہاز موجود ہے جو اٹھارویں صدی میں چار کھرب پیسو کی مالیت کے طلائی سکوں اور جواہرات سمیت غرقاب ہو گیا تھا۔ اس قصے نے اسے حیرت زدہ کر دیا، لیکن اس کا خیال اسے دوبارہ چند ماہ بعد آیا جب اس کے عشق نے اس کے دل میں اس غرقاب خزانے کے حصول کی ایک مہیب آرزو جگا دی تاکہ فرمینا دازا کو سر سے پاؤں تک سونے میں نہلایا جا سکے۔

برسوں بعد، جب وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا کہ شاعری کی کیمیاگری سے مثالی صورت اختیار کر لینے والی دوشیزہ اصل میں کیسی تھی تو وہ اسے ذہن میں اُن شاموں کی یاد سے جدا نہ کر سکتا تھا۔ اپنے پہلے خط کے جواب کے انتظار میں گزرتے ہوئے اُن دنوں میں بھی، جب وہ پسِ منظر میں اسے دیکھا کرتا تو وہ اسے ایک سدابہار اپریل کی سہ پہر میں دو بجے کی جھلملاہٹ کے درمیان بادام کے درختوں سے گرتے شگوفوں کے بیچ دکھائی دیتی۔ کلیسا کی سرود خوانیوں میں وائلن بجانے کے لیے اس کے لوتاریو تگٹ کے ساتھ جانے کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ اس مقام سے دیکھ سکتا تھا کہ مزامیر سے بہنے والی ہوا کے جھونکوں میں فرمینا دازا کا لباس کس طرح لہراتا ہے۔ لیکن اس کی بےخودی بالآخر اس لذت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی کیونکہ اسے کلیسا کی صوفیانہ موسیقی اپنی کیفیت سے اتنی معصوم اور اتنی بےروح محسوس ہونے لگی کہ اس میں جان ڈالنے کے لیے اس نے غیر ارادی طور پر عشقیہ والز بجانے کی کوشش کی، اور لوتاریو تگٹ کو اسے وہاں سے ہٹانا پڑا۔ یہ وہ وقت تھا جب گارڈینیا کے پھول کھانے کی خواہش نے اس پر غلبہ پایا جو ترانزیتو اریزا دالان میں رکھے گملوں میں اگایا کرتی تھی، وہ فرمینا دازا کا ذائقہ محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اور اسی زمانے میں ایک روز اسے اپنی ماں کے صندوق میں کولون کی ایک بوتل پڑی ملی جو ہیمبرگ امریکن لائن کے جہازی عملے کے سامان کے طور پر فروخت کیا کرتے تھے، اور وہ اپنی محبوبہ کے دیگر ذائقے دریافت کرنے کی خواہش میں اس خوشبو کو چکھنے کی ترغیب سے باز نہ رہ سکا۔ وہ صبح تک اس بوتل میں سے پیتا رہا، اور تیز جرعوں میں فرمینا دازا کے نشے میں مست ہوتا رہا، پہلے وہ بندرگاہ کے میخانوں میں گھومتا پھرا اور پھر بندرگاہ کی ان پشتوں پر سے جنہیں محبت کے مارے بےگھر جوڑے ہمبستری حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے، سمندر کو تکتا رہا یہاں تک کہ بےہوش ہو کر گر پڑا۔ ترانزیتو اریزا، جو صبح چھ بجے تک بےتابی سے اس کی راہ دیکھتی رہی تھی، سب سے غیر متوقع ٹھکانوں میں اسے ڈھونڈتی پھری اور اس نے بالآخر دوپہر کے قریب، ساحل کے اس مقام پر جہاں ڈوبنے والوں کی لاشیں سمندر سے باہر آیا کرتی تھیں، اسے خوشبودار الٹیوں کے تالاب میں پڑا پایا۔

فلورنتینو اریزا کی صحت یابی میں پڑنے والے اس رخنے سے اس کی ماں کو موقع مل گیا کہ خط کے انتظار میں اس کی بےبسی پر اسے ملامت کر سکے۔ اس نے اسے آگاہ کیا کہ محبت کی سلطنت میں، جو ایک سفاک اور دشوارگزار سرزمین ہے، ناتوانوں کے داخلے کی کوئی گنجائش نہیں اور عورتیں خود کو صرف مضبوط عزم کے مالک مردوں کے سپرد کرتی ہیں جو انہیں زندگی گزارنے کے لیے تحفظ فراہم کر سکیں۔ فلورنتینو اریزا اپنی ماں کی اس نصیحت سے شاید

کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا۔ ترانزیتو اریزا اپنے فخر کے احساس کو چھپا نہ سکی، جو مادرانہ سے زیادہ شہوانی تھا، جب اس نے فلورنتینو اریزا کو سیاہ سوٹ، نمدے کے کلف دار ہیٹ، رنگین بو اور سیلولائڈ کے کالر میں ملبوس دکان سے باہر نکلتے دیکھا، اور مذاق کے طور پر پوچھا کہ کیا وہ کسی تدفین میں جا رہا ہے۔ اس کے کانوں کی لویں جل اٹھیں، اور اس نے جواب دیا، "تقریباً ایسی ہی بات ہے۔" ترانزیتو اریزا نے محسوس کیا کہ خوف سے فلورنتینو اریزا کی سانس پھول رہی ہے، لیکن اس کا عزم ناقابلِ شکست ہے۔ اس نے ہنسی سے بےحال ہوتے ہوئے اسے آخری ہدایات اور دعائیں دیں، اور اس سے وعدہ کیا کہ اس کی فتح کے جشن کے لیے وہ کولون کی ایک بوتل مہیا کرے گی جسے وہ دونوں مل کر پئیں گے۔

اسے فرمینا دازا کو خط دیے ہوئے ایک مہینا گزر چکا تھا اور اس عرصے میں وہ باغ میں نہ جانے کا وعدہ کئی بار توڑ چکا تھا، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ فرمینا دازا اسے نہ دیکھ پائے۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ درختوں کے زیرِسایہ سبق دو بجے تک جاری رہتا جب شہر قیلولے سے بیدار ہو رہا ہوتا، اور پھر فرمینا دازا اپنی پھوپھی کے ساتھ شام تک کڑھائی میں مشغول رہتی۔ فلورنتینو اریزا نے پھوپھی کے اندر جانے کا انتظار نہ کیا اور اپنے گھٹنوں کی کمزوری پر قابو پانے کے لیے ایک عسکری انداز اختیار کر کے سڑک پار کر لی، لیکن اس بار وہ فرمینا دازا سے نہیں بلکہ اس کی پھوپھی سے مخاطب ہوا۔

"مہربانی کر کے مجھے نوجوان خاتون کے ساتھ تنہا چھوڑ دیجیے،" وہ بولا۔ "مجھے اس سے ایک اہم بات کرنی ہے۔"

"تم کتنے گستاخ ہو!" اس کی پھوپھی نے کہا۔ "اس سے کی جانے والی کوئی بات ایسی نہیں جو میں نہ سن سکوں۔"

"تب میں کوئی بات نہیں کروں گا،" وہ بولا۔ "لیکن میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔"

یہ انداز پھوپھی ایسکولاستیکا کے خیال میں ایک مثالی محبوب کے شایانِ شان نہ تھا، لیکن وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اسے پہلی بار شدید احساس ہوا کہ فلورنتینو اریزا روح القدس کے زیرِاثر بول رہا ہے۔ سو وہ سوئیاں تبدیل کرنے کے لیے مکان میں چلی گئی اور دونوں نوعمروں کو دروازے کے قریب بادام کے درختوں کے نیچے تنہا چھوڑ دیا۔

درحقیقت فرمینا دازا اس کم گو خواستگار کے بارے میں بہت ہی کم جانتی تھی جو موسمِ گرما کی ابابیل کی طرح اچانک اس کی زندگی میں در آیا تھا، اور جس کا نام بھی اسے معلوم نہ ہوتا اگر اس نے خط کے آخر میں اپنے دستخط نہ کیے ہوتے۔ اسے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ ایک غیرشادی شدہ ماں کا یتیم بیٹا ہے جو ایک محنتی اور سنجیدہ عورت ہے لیکن اپنی جوانی کی واحد غلطی کی بدنامی کا آتشیں داغ اب تک لیے ہوئے ہے۔ اسے پتا چلا تھا کہ وہ کوئی قاصد نہیں بلکہ ایک لائق اسسٹنٹ ہے جس کا مستقبل تابناک ہے، اور اس کا خیال تھا کہ اس کا اس کے باپ کو ٹیلیگرام پہنچانے کے لیے آنا دراصل اس کو دیکھنے کا بہانہ تھا۔ اس خیال سے وہ خاصی متاثر ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کلیسا کے موسیقاروں میں سے ایک ہے اور اگرچہ وہ کبھی عبادت کے دوران نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے کی ہمت نہ کر

پڑی۔ ایک اتوار کو اس پر انکشاف ہوا کہ دوسرے سارے لوگوں کے لیے بجتے ہیں لیکن والی کی آواز کی مخاطب صرف وہ ہوتی ہے۔ یہ شخص اس قسم کا نہ تھا جس کا اس نے انتخاب کیا ہوتا۔ اس کی پیمبروں کی سی عینک، پادریوں کے سے لباس اور اس کی پراسرار صلاحیتوں نے اس کے دل میں تجسس کو بیدار کر دیا تھا جس پر قابو پانا مشکل تھا، لیکن اس نے یہ کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ یہ تجسس محبت کی بہت سی نقابوں میں سے ایک ہے۔

وہ خود بھی یہ نہ بتا سکتی تھی کہ اس نے وہ خط کیوں وصول کیا۔ اس نے اس بات پر خود کو ملامت نہیں کی، لیکن جواب دینے کا بڑھتا ہوا دباؤ اس کی زندگی میں پیچیدگی پیدا کرنے لگا۔ اپنے باپ کی گفتگو کے ہر لفظ، اس کی اتفاقی نظروں، اس کی نہایت معمولی حرکات و سکنات میں اسے راز افشا کر دینے والے جال نظر آنے لگے تھے۔ اس کو مستقل کھٹکا لگا رہتا تھا اور وہ کھانے کی میز پر خاموش رہتی کہ کوئی غلطی اس کا راز فاش نہ کر دے۔ وہ پھوپھی ایسکولاستیکا سے بھی گریز کرنے لگی تھی لیکن وہ اس کے اضطراب میں اس طرح شریک تھی جیسے وہ خود اس سے گزر رہی ہو۔ فرمینا ڈازا معمول کے برخلاف کسی بھی وقت خود کو غسل خانے میں بند کر لیتی صرف اس خط کو ایک بار پھر پڑھنے کے لیے تاکہ اس کے تین سو چودہ حروف اور اٹھاون الفاظ میں اندر چھپا ہوا کوئی خفیہ رمز، کوئی طلسمی پیغام پائے جو ظاہری مفہوم سے زیادہ کوئی معنی اس پر آشکار کر دیں۔ لیکن اسے ہر بار وہی کچھ معلوم ہوا جو اس نے خط کو پہلی بار پڑھنے پر جانا تھا، جب وہ دوڑ کر غسل خانے میں چھپ گئی تھی اور بے قابو دھڑکنوں کے ساتھ ایک طویل ہیجان خیز خط کی امید میں لفافے کو کھولا تھا لیکن اسے خوشبو میں بسا ہوا ایک مختصر سا پیغام ملا جس کی قطعیت نے اسے خوف

شروع میں اس نے سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا کہ اسے خط کا جواب بھی دینا ہو گا، لیکن خط اتنا واضح تھا کہ اس سے گریز کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس دوران اپنے شکوک کی دھند میں اسے پتہ چلا کہ وہ اس سے زیادہ کثرت سے فلورنتینو اریزا کے بارے میں سوچنے لگی جتنا وہ شعوری طور پر خود کو اجازت دے سکتی تھی، اسے حیرت ہوئی۔ اور بعض اوقات اس نے شدید پریشانی کے عالم میں خود سے سوال بھی کیا کہ وہ اپنے مقررہ وقت پر باغ میں کیوں نظر نہیں آیا یہ فراموش کرتے ہوئے کہ خود اسی نے اسے وہاں نہ آنے کی تاکید کی تھی جب تک وہ خط کا جواب تیار نہ کر لے۔ اور یوں وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی جس طرح کسی کے بارے میں سوچنے کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا، وہ اسے وہاں دیکھتی جہاں وہ موجود نہیں تھا۔ اس کے ایسی جگہ پر ہونے کی خواہش کرتی جہاں اس کا ہونا ناممکن تھا، رات میں اس جسمانی احساس کے ساتھ جاگ اٹھتی کہ وہ اندھیرے میں سے اسے محو ہو کر دیکھ رہا ہے، یہاں تک کہ جب ایک سہ پہر اس نے باغ میں گرے ہوئے خشک پتوں پر اس کے پرعزم قدموں کی چاپ سنی تو اسے یہی لگا کہ یہ حقیقت نہیں بلکہ اس کے تخیل کی کارفرمائی ہے۔ لیکن جب اس نے ایک محکمانہ انداز میں، جو اس کی ناتوانی سے مطابقت نہ رکھتا تھا، اس سے خط کے جواب کا تقاضا کیا تو وہ اپنے خوف پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے اس موضوع سے کترانے کی کوشش میں سچ کا سہارا لیا۔ وہ نہیں

جانتی کہ خط کا کیا جواب دے۔ لیکن فلورنتینو اریزا نے وہ کھڑی خلیج اس لیے پار نہیں کی تھی کہ اس قسم کے بہانوں سے ٹل جاتا۔

"تم نے خط وصول کر لیا ہے،" وہ بولا، "تو اس کا جواب نہ دینا بداخلاقی ہے۔"

یہ بھول بھلیوں کا اختتام تھا۔ فرمینا ڈازا نے اپنی خوداعتمادی بحال کر لی، جواب دینے میں تاخیر پر معذرت کی اور اس سے وعدہ کیا کہ چھٹیوں کے ختم ہونے سے پہلے اسے خط کا جواب مل جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ فروری کے آخری جمعے کو، اسکول کھلنے سے تین دن قبل، پھوپھی ایسکولاستیکا یہ معلوم کرنے کے لیے تارگھر میں آئی کہ پیڈراس ڈمولیر نامی گاؤں کو تار بھیجنے پر کتنا خرچ آئے گا، جو ایک ایسا گاؤں تھا جس کا نام ٹیلیگراف کی فہرست تک میں نہ آتا تھا۔ اس نے فلورنتینو اریزا کی زبانی اپنے استفسار کا جواب اس طرح سنا گویا اسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو، لیکن جاتے ہوئے مگرمچھ کی کھال کا ایک چھوٹا سا بٹوا جان بوجھ کر کاؤنٹر پر بھول گئی جس میں دبیز کاغذ کا سنہری بیل بوٹوں سے مزین ایک لفافہ تھا۔ مسرت سے بےخود ہو کر فلورنتینو اریزا نے شام کا بقیہ حصہ گلاب کی پتیاں کھاتے اور خط کو حرف بہ حرف بار بار پڑھتے ہوئے گزارا۔ جتنا زیادہ وہ اس خط کو پڑھتا جاتا اتنے ہی زیادہ گلاب کھاتا جاتا، اور نصف شب تک وہ خط کو اتنی بار پڑھ چکا تھا اور اتنے گلاب کھا چکا تھا کہ اس کی ماں کو اس کا سر مضبوطی سے پکڑ کر، بچھڑے کی طرح اس کے حلق میں انجیر کا تیل زبردستی انڈیلنا پڑا۔

یہ وہ سال تھا جب وہ دونوں ایک غارت گر محبت میں مبتلا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے رہتے، خواب دیکھتے، بےصبری سے خطوں کا انتظار کرتے اور اتنی ہی بےصبری سے ان کا جواب دینے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس دیوانگی کی اس بہار میں، اور نہ اگلے سال انہیں ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھنے کے لمحے سے لے کر نصف صدی بعد کے اس لمحے تک جب فلورنتینو اریزا نے اپنی محبت کی استواری کا دوبارہ اظہار کیا، انہیں تنہائی میں ملنے یا اپنی محبت کے بارے میں گفتگو کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ لیکن پہلے تین ماہ میں کوئی دن ایسا نہ گیا جب انہوں نے ایک دوسرے کو خط نہ لکھا ہو، اور بعض دنوں میں وہ دو دو بار خط لکھا کرتے، یہاں تک کہ پھوپھی ایسکولاستیکا اس آگ کے شعلوں سے خوف زدہ ہو گئی جس کو بھڑکانے میں خود اس کی مدد شامل تھی۔

اس پہلے خط کے بعد سے، جسے وہ خود اس طرح تارگھر لے گئی تھی جیسے اپنی مقدر سے انتقام لے رہی ہو، اس نے سڑک پر بظاہر اتفاقی مڈبھیڑ کے بہانے خطوں کے اس روزانہ سلسلے کو جاری رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن وہ کسی قسم کی گفتگو کو روا رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، چاہے وہ کتنی ہی معمولی اور سرسری کیوں نہ ہو۔ تاہم تین ماہ گزرنے پر اسے احساس ہوا کہ اس کی بھتیجی کسی نوعمری کے مشغلے میں مبتلا نہیں ہے جیسا کہ اس نے پہلےپہل خیال کیا تھا، اور محبت کی ان شعلوں سے اس کی اپنی زندگی کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسکولاستیکا ڈازا کے پاس اپنے بھائی کے رحم و کرم کے سوا زندگی گزارنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا، اور یہ جانتی تھی کہ اس کے بھائی کی سخت گیر

فطرت اپنے اعتماد کو اس طرح ٹھیس پہنچائے جانے کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ لیکن جب آخری فیصلے کا وقت آیا تو وہ اپنی بھتیجی کو وہ صدمہ پہنچانے کا حوصلہ نہ کر سکی جو وہ خود اپنی جوانی کے دنوں سے اب تک برداشت کرتی چلی آئی تھی، اور اس نے فرمینا دازا کو ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنے کی اجازت دے دی جس سے اس کی معصومیت کا بھرم قائم رہے۔ یہ طریقہ بہت سادہ تھا۔ فرمینا دازا اپنے گھر سے اسکول جاتے ہوئے راستے میں کسی پوشیدہ جگہ اپنا خط چھوڑ دیتی اور خط میں فلورنتینو اریزا کو اشارہ دے دیتی کہ جواب کس جگہ چھپائے۔ وہ بھی ایسا ہی کیا کرتا۔ اس طرح سال کے بقیہ دنوں میں پھوپھی ایسکولاستیکا کے ضمیر میں ہونے والی کشمکش گرجاگھروں کی بپتسمہ گاہوں، درختوں کی درزوں اور پرانی اجاڑ نوآبادیاتی حویلیوں کے کونوں کھدروں میں منتقل ہو گئی۔ بعض موقعوں پر یہ خط بارش میں بھیگ جاتے، کیچڑ میں لتھڑ جاتے، بدقسمتی کے ہاتھوں پھٹ جاتے، یا کسی اور وجہ سے گم ہو جاتے، لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ رابطہ پیدا کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکال لیتے۔

فلورنتینو اریزا ہر روز رات میں خط لکھا کرتا۔ وہ دکان کے پچھلے کمرے میں متواتر خط لکھنے کے دوران چراغ کے دھوئیں سے خود کو رفتہ رفتہ بےرحمی کے ساتھ ہلاک کرتا رہا، اور جوں جوں وہ پاپولر لائبریری کے شائع کیے ہوئے اپنے پسندیدہ شاعروں کے مجموعوں کی، جن کی تعداد اب اسی تک پہنچ چکی تھی، نقالی کرتا گیا، اس کے خط زیادہ طویل اور زیادہ دیوانگی کے شکار ہوتے گئے۔ اس کی ماں، جس نے خود ہی اتنے شوق سے اسے عشق کا کرب سہنے کی نصیحت کی تھی، اب اس کی حالت کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ "تم اپنا دماغ ہلکان کر لو گے۔" صبح مرغ کی پہلی بانگ پر اس نے اپنی خواب گاہ سے چلا کر کہا۔ "کوئی عورت اس دیوانگی کی مستحق نہیں ہے۔" اسے یاد نہ تھا کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں کسی شخص کو اس بےپناہ جذبے کی حالت میں دیکھا ہو۔ لیکن فلورنتینو اریزا نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ کبھی کبھی تو وہ رات کو پلک جھپکائے بغیر صبح، راستے میں، اپنے پہلے سے طے کیے ہوئے مقام پر خط چھپانے کے بعد، کہ وہ فرمینا دازا کو اسکول جاتے ہوئے مل جائے، دفتر چلا جاتا۔ اس کے بال محبت کے طوفان کی زد میں آ کر بکھرے ہوئے ہوتے۔ دوسری طرف وہ گھر پر اپنے باپ کی، اور اسکول میں راہباؤں کی نگران آنکھوں سے بچ کر غسل خانے میں چھپ کر یا کلاس میں نوٹس لینے کے بہانے بمشکل آدھا صفحہ لکھ پاتی۔ لیکن یہ محض فرصت کی کمی یا پکڑے جانے کے خطرے کے باعث نہیں تھا، یہ اس کی اپنی طبیعت بھی تھی جو اسے خطوں میں جذباتیت کا شکار ہونے سے بچاتی اور کسی جہاز کی لاگ بک کے سے سیدھے سادے انداز میں اپنی روزمرہ زندگی کے واقعات تک محدود رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ درحقیقت یہ بڑے آشفتہ خطوط تھے جن سے اس کا مقصد آگ میں ہاتھ ڈالے بغیر انگاروں کو جلائے رکھنا تھا جبکہ فلورنتینو اریزا ایک ایک سطر میں خود کو زندہ جلا رہا ہوتا تھا۔

اسے بھی اپنی دیوانگی کے حصار میں کھینچ لانے کے لیے اس نے کمیلیا کی پتیوں پر اپنے ناخن سے بہت باریک خط میں شعر لکھ کر بھیجتا رہا تھا، نہ کہ فرمینا دازا، جس نے بیباکی سے اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر ایک خط میں رکھ بھیجی، لیکن اسے وہ جواب کبھی

نہ ملا جس کی اسے تمنا تھی، یعنی فرمینا دازا کی دراز زلفوں کا ایک تار۔ وہ اسے صرف ایک قدم آگے آنے پر آمادہ کر سکا، اور اس کے بعد سے فرمینا دازا ڈکشنریوں کے صفحات میں رکھی سوکھی پتیاں اور تتلیوں اور طلسمی پرندوں کے پر خطوں میں رکھ کر بھیجنے لگی اور فلورنتینو اریزا کی سالگرہ پر اس نے سینٹ پیٹر کلیویر کی عبا سے ایک مربع سنٹی میٹر کا ٹکڑا بھیجا، جسے ان دنوں خفیہ طور پر فروخت کیا جا رہا تھا اور جس کی قیمت اس عمر کی لڑکی کی پہنچ سے کہیں باہر تھی۔ ایک بار بغیر کسی پیشگی اطلاع کے فرمینا دازا کی آنکھ کھلی اور وہ ایک تنہا وائلن پر ایک ہی والز کی دھن باربار بجتے سن کر چونک اٹھی۔ وہ اس احساس سے کانپ گئی کہ اس دھن کا ایک ایک سُر اس کی بھیجی ہوئی پتیوں، کلاس میں خط لکھنے کے لیے چرائے ہوئے لمحوں اور امتحان سر پر ہونے کے باوجود نیچرل سائنس کے بجائے اس کے خیالات میں محو رہنے پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہے۔ لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ کر سکی کہ فلورنتینو اریزا اتنا بیباک بھی ہو سکتا ہے۔

صبح ناشتے کی میز پر لورینزو دازا اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ اس بات سے ناواقف تھا کہ سیرینادا کی زبان میں ایک ہی دھن کو باربار بجانے کے کیا معنی ہیں، اور دوسرے اس باعث کہ باوجود غور سے سننے کے وہ یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا کہ اس دھن کا مخاطب کون سا مکان ہے۔ پھوپھی ایسکولاستیکا نے، اتنے اطمینان سے جس سے اس کی بھتیجی کا سانس رک گیا، بتایا کہ وائلن بجانے والے کو اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باغ کی دوسری طرف کھڑے ہوئے دیکھا تھا، اور اس نے یہ بھی بتایا کہ بہرحال ایک ہی دھن کو باربار بجانا ٹوٹے ہوئے تعلق کی علامت ہے۔ اس دن کے خط میں فلورنتینو اریزا نے تصدیق کی کہ سیریناد بجانے والا وہی تھا، اور یہ کہ والز کی وہ دھن بھی اسی نے ترتیب دی تھی اور اس کا نام بھی وہی رکھا تھا جس سے وہ دل ہی دل میں فرمینا دازا کو پکارتا تھا: "تاج دار دیوی"۔ اس نے اس کے بعد باغ میں یہ دھن کبھی نہیں بجائی لیکن چاندنی راتوں میں وہ اس کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرتا جہاں سے فرمینا دازا اپنی خواب گاہ میں بغیر کسی خوف کے یہ دھن سن سکے۔ اس کی پسندیدہ جگہوں میں سے ایک، گداگروں کا قبرستان تھا جو کھلے آسمان تلے ایک مفلس پہاڑی کی ڈھلان پر تھا اور جس میں دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ وہاں گدھ بیٹھے اونگھا کرتے تھے اور موسیقی میں ایک اسراری گونج پیدا ہو جاتی تھی۔ بعد میں وہ ہوا کے رخ کا اندازہ لگانا سیکھ گیا اور اس طرح اسے یقین ہو گیا کہ اس کی دھن وہاں تک پہنچ رہی ہے جہاں وہ پہنچانا چاہتا ہے۔

اسی سال اگست میں ایک نئی خانہ جنگی شروع ہو گئی، جو ان بہت سی خانہ جنگیوں میں سے ایک تھی جنھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ملک میں تباہی مچا رکھی تھی۔ اس کے پھیلنے کے اندیشے سے حکومت نے کریبیئن کے ساحلی علاقوں میں مارشل لا اور چھ بجے کا کرفیو نافذ کر دیا۔ اگرچہ کچھ ناخوشگوار واقعات ہو چکے تھے اور فوجیوں نے جواب میں ہر طرح کی زیادتی روا رکھی تھی، لیکن فلورنتینو اریزا اتنا مدہوش تھا کہ اسے حالات کی کچھ خبر نہ تھی، اور ایک صبح، جب وہ اپنی عاشقانہ ہمہمی سے مُردوں کی نیند میں خلل ڈال رہا تھا، ایک گشتی دستے نے اسے گرفتار کر لیا۔ کسی معجزے کے تحت وہ فوری سزائے موت سے

بچ گیا جب سرسری مقدمے میں اس پر ایک جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا جو ساحل کے قریب کارروائیوں میں مصروف لبرل پارٹی کی کشتیوں کو "G" کے سُر میں سگنل بھیج رہا تھا۔

"جاسوس! کیا مطلب؟" فلورنتینو اریزا نے کہا۔ "میں تو صرف ایک عاشق ہوں۔"

تین راتوں تک اسے مقامی کچہری کی ایک کوٹھڑی میں پنڈلیوں کو جکڑی ہوئی آہنی سلاخوں کے ساتھ سونا پڑا۔ جب اسے رہا کیا گیا تو اس نے اپنی قید کے اتنا مختصر ہونے پر خود کو فریب خوردہ محسوس کیا، اور بعد میں اپنے بڑھاپے میں بھی وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ پورے شہر میں بلکہ شاید پورے ملک میں وہ واحد آدمی ہے جسے محبت کی خاطر پانچ پونڈ وزنی لوہے کی بیڑیاں گھسیٹنی پڑی ہیں۔

ان کی مجنونانہ خط وکتابت کو شروع ہوئے دو برس ہوئے تھے کہ فلورنتینو اریزا نے صرف ایک پیراگراف پر مشتمل خط میں فرمینا دازا سے شادی کی باقاعدہ درخواست کی۔ اس سے پہلے کے چھ مہینوں میں کئی بار اس نے فرمینا دازا کو کمیلیا کا سفید پھول خط میں رکھ کر بھیجا، اور اس نے ہر بار اگلے خط میں اسے واپس کر دیا، تاکہ فلورنتینو اریزا کو اس بات میں کوئی شبہ نہ رہے کہ وہ اس خط وکتابت کو جاری رکھنا چاہتی ہے لیکن کسی وابستگی کی شدت کے بغیر۔ سچ یہ ہے کہ کمیلیا کے پھولوں کی آمدورفت کو اس نے کبھی محبت کرنے والوں کے دلچسپ کھیل کے سوا کچھ نہ سمجھا تھا، اور اسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ یہ اس کی تقدیر کا ایک دوراہا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب شادی کی باقاعدہ درخواست آئی تو اس نے پہلی بار خود کو موت کے ہاتھوں سے زخمی ہوتا محسوس کیا۔ اس نے شدید اضطراب کے عالم میں یہ بات پھوپھی ایسکولاستیکا کو بتائی، جس نے اسے اس جرأت اور وضاحت کے ساتھ مشورہ دیا جو اسے بیس سال کی عمر میں اپنی تقدیر کا فیصلہ کرتے وقت میسر نہ تھی۔

"ہاں کہہ دو،" وہ بولی۔ "چاہے خوف کے مارے تمہارا دم ہی کیوں نہ نکل رہا ہو، اور چاہے تمہیں بعد میں اس پر پچھتاوا ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اگر تم نے انکار کر دیا تو پھر تم کچھ بھی کرو، تمہاری تمام عمر زندگی افسوس میں گزرے گی۔"

فرمینا دازا اس الجھن میں تھی کہ اس نے غور کرنے کا وقت طلب کیا۔ پہلے اس نے ایک مہینے کی مہلت مانگی، پھر دو، پھر تین، اور جب چوتھا مہینا بھی جواب کے بغیر گزر گیا تو اسے ایک بار پھر کمیلیا کا سفید پھول ملا لیکن پچھلے موقعوں کے برعکس ایک تاکیدی تحریر بھی ساتھ تھی کہ یہ آخری بار ہے: اب یا کبھی نہیں۔ اس سہ پہر، موت کی جھلک دیکھنے کی باری فلورنتینو اریزا کی تھی جب اسے لفافے میں اسکول کی نوٹ بک کے اوپر والے سادے حصے سے پھاڑا ہوا ایک لمبا سا پرزہ ملا جس پر پنسل سے اس کے سوال کا ایک سطری جواب تحریر تھا: "ٹھیک ہے، میں تم سے شادی کر لوں گی، بشرطیکہ تم مجھے بینگن نہ کھلانے کا وعدہ کرو۔"

فلورنتینو اریزا اس قسم کے جواب کے لیے تیار نہ تھا، لیکن اس کی ماں تیار تھی۔ چھ مہینے پہلے جب فلورنتینو اریزا نے اسے اپنے شادی کے ارادے سے آگاہ کیا تھا، اس نے پورا مکان کرائے پر لینے کے لیے بات چیت شروع کر دی تھی، جس میں اس وقت دو اور خاندان بھی آباد تھے۔ سترھویں صدی کا بنا ہوا یہ دومنزلہ مکان ہسپانوی حکومت کے دور میں تمباکو کا

کارخانہ رہ چکا تھا، اور اس کے تباہ حال مالکان اسے مختلف حصّوں میں کرائے پر چڑھانے کے لیے مجبور تھے، کیوں کہ وہ اس کی دیکھ بھال کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ اس کا ایک حصہ سڑک کے مقابل تھا جہاں کبھی تمباکو کی دکان رہ چکی تھی، دوسرا حصہ پتھریلے صحن کے پیچھے واقع تھا جہاں کارخانہ ہوا کرتا تھا، اور اس میں ایک بہت بڑا اصطبل تھا جسے مکان کے موجودہ کرایہ دار کپڑے دھونے اور سکھانے کے لیے مشترک طور پر استعمال کرتے تھے۔ ترانزیتو اریزا کے پاس سامنے والا حصہ تھا، جو سب سے بہتر حالت میں تھا، لیکن سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی دکان تمباکو والی پرانی دکان میں واقع تھی، جس کا بڑا سا دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا، اور اس کے پہلو میں سابقہ گودام تھا جس میں ہوا کی آمدورفت کے لیے صرف چھت کا روشندان تھا۔ اس میں ترانزیتو اریزا سویا کرتی تھی۔ آدھا رقبہ گودام نے گھیر رکھا تھا جسے لکڑی کی دیوار نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس میں ایک میز اور چار کرسیاں تھیں جو کھانے اور لکھنے پڑھنے دونوں کے کام آتی تھیں، اور یہیں، اگر اسے رات کو خط لکھنے سے فرصت ملتی، فلورنتینو اریزا اپنا جھولنا لٹکا لیتا تھا۔ یہ جگہ ان دونوں کے لیے کافی تھی لیکن اس میں کسی تیسرے کی گنجائش نہ تھی، مریم عذرا کی اکادمی کی پڑھی ہوئی ایک معزز نوجوان خاتون کا تو ذکر ہی کیا جس کے باپ نے الٹ زمانے میں ایک پرانی حویلی خرید کر اسے نیا کروایا تھا، جب کہ سات خطابات کے مالک خاندان ہر رات اس خوف کے عالم میں سویا کرتے تھے کہ ان کے محلوں کی چھت ان پر آ رہے گی۔ اس لیے ترانزیتو اریزا نے مکان کے مالکوں سے مل کر صحن کے سامنے کا حصہ بھی، پانچ سال تک مکان کی دیکھ بھال اور مرمت کا خرچ اٹھانے کے عوض اپنے تصرف میں لانے کا معاملہ طے کر لیا۔

اس کے پاس اس کے لیے وسائل تھے۔ دکان کی نقد آمدنی کے علاوہ، جو اس کی منکسر زندگی کے لیے کافی تھی، اس نے اپنی بچت کو نئے نئے مفلس ہونے والے شرمندہ معزز خاندانوں کو قرض دے دے کر بہت بڑھا لیا تھا۔ وہ لوگ اس کی اونچی شرح سود کو اس کی رازداری کے عوض قبول کر لیا کرتے تھے۔ ملکاؤں جیسی تمکنت والی خواتین ملازموں یا خادماؤں کے واسطے کے بغیر دکان کے سامنے اپنی گاڑیوں سے اترتیں، اور بظاہر ولندیزی بیلوں یا سنہری کناریوں کی خریداری کرتے ہوئے، سسکیوں کے درمیان اپنی گم گشتہ جنت کی یادگار، آخری دمکتے ہوئے زیور گروی رکھا کرتیں۔ ترانزیتو اریزا انہیں ان کی دشواریوں سے نجات دلانے میں ان کے خاندانی مقام کا اتنا پاس کرتی کہ وہ واپس جاتے ہوئے اپنی مشکل کے حل سے زیادہ اس کے احترام کے لیے ممنون ہوتیں۔ دس سال سے کم عرصے میں وہ ان معدوم زیورات کو، جو باربار چھڑائے اور پھر گروی رکھے جاتے تھے، یوں پہچاننے لگی تھی جیسے وہ اس کے اپنے ہوں، اور جب اس کے بیٹے نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا منافع سونے سے بھرے مرتبانوں کی صورت میں اس کی مسہری کے نیچے پوشیدہ تھا۔ تب اس کو حساب کتاب سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس مکان کو نہ صرف پانچ سال تک اچھی حالت میں رکھ سکتی ہے بلکہ، اپنی کاروباری سوجھ بوجھ اور تھوڑی سی خوش قسمتی کی مدد سے، مرنے سے پیشتر اسے خرید بھی سکتی ہے تاکہ اس میں اس کے بارہ پوتے پوتیاں رہ سکیں جن کی اسے آرزو تھی۔ دوسری طرف فلورنتینو اریزا کو تارگھر میں فرسٹ اسسٹنٹ کا عارضی عہدہ بھی مل چکا تھا اور لوتاریو تگٹ ایک سال

بعد اسے دفتر کا سربراہ دیکھنا چاہتا تھا جب وہ ریٹائر ہو کر ٹیلیگرافی اور مقناطیسیات کی ایک درس گاہ کھولنے والا تھا۔

اس طرح شادی کے عملی پہلوؤں کی تیاری مکمل تھی۔ پھر بھی ترانزیتو آریزا دو قسم کی شرائط عائد کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ ایک تو وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ لورینزو دازا درحقیقت کون تھا، گرچہ اس کے لہجے کی وجہ سے اس کے آبائی وطن کے بارے میں کسی شبہے کی گنجائش نہ تھی، لیکن کسی شخص کو اس کے پس منظر اور ذریعۂ آمدنی کے بارے میں یقینی طور پر کوئی علم نہ تھا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ منگنی کا عرصہ کافی طویل رکھا جائے تاکہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لیں اور منگنی کا اس وقت تک اعلان نہ کیا جائے جب تک دونوں اپنی محبت کے حقیقی ہونے کا یقین نہ کر لیں۔ اس نے تجویز پیش کی کہ شادی کی تاریخ کے لیے خانہ جنگی کے خاتمے کا انتظار کیا جائے۔ فلورنتینو اریزا رازداری کی تجویز سے متفق تھا نہ صرف اپنی ماں کے پیش کردہ اسباب کی بنا پر، بلکہ اپنی گوشہ نشین طبیعت کے باعث بھی۔ اسے شادی میں تاخیر پر بھی اعتراض نہ تھا لیکن اس تاخیر کی میعاد اسے حقیقت پسندانہ معلوم نہ ہوتی تھی، اس لیے کہ آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں ملک کو خانہ جنگیوں سے ایک دن کے لیے بھی نجات نہیں ملی تھی۔

"اس انتظار میں تو ہم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے" اس نے کہا۔

اس کے دینی باپ، ہومیوپیتھک معالج نے، جو اس گفتگو میں شریک تھا، یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ خانہ جنگی شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اس کے خیال میں خانہ جنگیاں کسانوں اور برہنہ پا سپاہیوں کے درمیان کش مکش کے سوا کچھ نہیں تھیں، کسانوں کو ان کے جاگیردار بیلوں کی طرح ہانک رہے تھے اور سپاہیوں کی پشت پناہی حکومت کر رہی تھی۔

"خانہ جنگی پہاڑوں میں ہو رہی ہے" اس نے کہا، "جب سے مجھے یاد ہے اس وقت سے شہروں میں ہمیں گولیوں سے نہیں بلکہ فرامین سے قتل کیا جاتا ہے۔"

بہرکیف اگلے چند ہفتوں کی خط وکتابت میں ان دونوں نے منگنی کی تمام تفصیلات طے کر لیں۔ فرمینا ڈازا نے پھوپھی ایسکولاستیکا کے مشورے پر دو سال کی تاخیر اور نسبت کی رازداری کی شرائط مان لیں، اور تجویز پیش کی کہ ثانوی اسکول کی تعلیم ختم ہونے کے بعد والی کرسمس کی تعطیلات میں فلورنتینو اریزا اس کے رشتے کی باقاعدہ درخواست کرے۔ جب وقت آئے گا تو وہ یہ تفصیلات بھی طے کر لیں گے کہ منگنی کی رسم کس طرح ادا کی جائے کیونکہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ فرمینا ڈازا کا باپ کس حد تک رضامند ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی خط وکتابت پہلے کی طرح جوش وخروش اور پابندی سے جاری رکھی لیکن اب وہ اس کرب سے آزاد تھے جو انھیں اس سے پہلے محسوس ہوتا تھا، اور اب ان کے خطوں میں وہ انداز پیدا ہو گیا تھا جو شوہر اور بیوی کے لیے مناسب معلوم ہوتا۔

فلورنتینو اریزا کی زندگی میں تبدیلی آ گئی تھی۔ محبت کا جواب ملنے سے اس میں وہ اعتماد اور قوت پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ پہلے واقف نہ تھا اور وہ دفتر کا کام بھی اتنی مستعدی سے کرنے لگا تھا کہ لوتاریو تھگت کو اس کی ملازمت کو مستقل کرانے میں کوئی دقت

نہ ہوئی۔ اس وقت تک لوتاریو تھگت کا ٹیلیگرافی اور مقناطیسیات کی درس گاہ کھولنے کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا، اور وہ اپنا فارغ وقت ان مشاغل میں گزارنے لگا تھا جن میں اسے سب سے زیادہ لطف آتا تھا: بندرگاہ پر جا کر اکارڈین بجانا اور ملاحوں کے ساتھ بیٹھ کر بیئر پینا اور شام ڈھلے ہوٹل میں پہنچ جانا۔ فلورنتینو اریزا کو یہ بات ایک طویل عرصے بعد معلوم ہوئی کہ عشرت کی اس آماج گاہ میں لوتاریو تھگت کے رسوخ کا اصل باعث یہ تھا کہ وہ نہ صرف اس کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار ہو گیا تھا بلکہ رات کے پرندوں کے لیے بندرگاہ میں گماشتے کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ اس کاروبار کو اس نے اپنی برسوں کی بچت سے خرید لیا تھا، اور اس نے اس کے انتظام کے لیے ایک دبلے پتلے، یک چشم، پست قد آدمی کو مقرر کیا تھا جس کا سر بالکل صاف تھا اور مزاج اتنا نرم اور مہربان کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح اچھا منتظم ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ واقعی بڑا اچھا منتظم تھا۔ کم از کم فلورنتینو اریزا کو ایسا ہی لگا جب اسے معلوم ہوا کہ درخواست کیے بغیر اس کے لیے ہوٹل میں ایک کمرہ مستقل طور پر مخصوص کر دیا گیا ہے، نہ صرف اس غرض سے کہ وہ جب چاہے اپنے زیرِناف مسائل کو حل کر لیا کرے بلکہ اس لیے بھی کہ اسے کتابیں پڑھنے اور عشقیہ خطوط لکھنے کے لیے ایک خاموش اور پرسکون جگہ ہمیشہ میسّر رہے۔ اور جوں جوں انتظار کے طویل مہینے ایک ایک کر کے گزرتے گئے، وہ اپنے دفتر اور گھر سے کہیں زیادہ وقت ہوٹل میں بسر کرنے لگا، اور بعض موقعے تو ایسے آتے تھے کہ ترانزیتو آریزا کو اس کی شکل صرف اس وقت نظر آتی جب وہ کپڑے بدلنے گھر آیا کرتا۔

کتابیں پڑھنے کے شغل نے اس کے لیے نہ بجھنے والی ہوس کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جب اس کی ماں نے اسے پڑھنا سکھایا تھا تو اسے نارڈک مصنفوں کی باتصویر کتابیں خرید کر دی تھیں، جنھیں بچوں کی کہانیوں کے طور پر فروخت کیا جاتا تھا لیکن جو دراصل کسی بھی عمر میں پڑھنے کے لیے نہایت ظالمانہ، پُرتشدد اور کج رو کتابیں تھیں۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچنے تک فلورنتینو اریزا کو یہ کتابیں، کلاس میں اور اسکول کی ادبی شاموں میں پڑھتے پڑھتے زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ لیکن اس آشنائی سے بھی اس دہشت میں کوئی فرق نہیں آیا جو انھیں پڑھ کر اس پر طاری ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔ لہٰذا جب اس نے شاعری کو دریافت کیا تو ان کتابوں کے مقابلے میں وہ اسے سکون کا ایک نخلستان لگی۔ اپنے لڑکپن میں بھی پاپولر لائبریری کے چھاپے ہوئے شعری مجموعے جس ترتیب سے اس کے ہاتھ لگتے وہ بیتابی سے پڑھتا جاتا۔ یہ مجموعے اس کے لیے ترانزیتو آریزا مسخروں کے چوک کے کتب فروشوں سے بھاؤ تاؤ کر کے خریدا کرتی تھی جن کے پاس ہومر سے لے کر غیر اہم ترین مقامی شاعروں تک کا کلام دستیاب تھا۔ لیکن وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرتا تھا: وہ ہاتھ لگنے والی ہر چیز کو، گویا اپنی تقدیر کا نوشتہ جان کر، پڑھا کرتا تھا اور اپنے برسوں کے مطالعے کے بعد بھی وہ تمیز نہ کر سکتا تھا کہ اس کی پڑھی ہوئی کتابوں میں کون سی اچھی تھیں اور کون سی نہیں۔ صرف ایک بات اس پر واضح تھی کہ اسے نثر کے مقابلے میں شاعری زیادہ پسند تھی اور شاعری میں بھی وہ محبت کی نظموں کو ترجیح دیتا تھا جو صرف دو بار پڑھ کر اسے بلاکوشش زبانی یاد ہو جایا کرتیں۔ ان کی بحریں اور قافیے جتنے زیادہ رواں، اور

مضامین جتنے زیادہ المناک ہوتے اتنی ہی آسانی سے وہ انھیں حفظ کر لیا کرتا تھا۔

یہ اس کے فرمینا ڈازا کے نام اوّلین خطوط کے مانند تھے، بسا اوقات رومانی پرستوں سے حرف بہ حرف نقل کیے ہوئے نیم پختہ اظہارِ عشق اور اس کے خطوط اسی رو میں جاری رہے یہاں تک کہ حقیقت کی دنیا نے اسے دردِ دل کی بہ نسبت پیش پا افتادہ معاملات پر زیادہ توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت تک وہ رقت انگیز قسط وار ناولوں، اور اس زمانے کی اس سے بھی زیادہ مبتذل نثر پر آ گیا تھا۔ اس نے مشترکہ مطالعے کے دوران اپنی ماں کے ساتھ مقامی شاعروں کے ان گلدستوں پر آنسو بہانا سیکھ لیا تھا، جو شہر کے ہر چوک پر دو دو سینٹوں میں فروخت ہوا کرتے تھے۔ لیکن اسی زمانے میں وہ عہدِ زریں کی کاستیلینی شاعری کو حفظ کرنے پر بھی قادر ہو چکا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی راہ میں آنے والی ہر شے، اسی ترتیب سے، پڑھنے کا عادی تھا، یہاں تک کہ پہلے پہلے عشق کے ان دشوار برسوں کے بہت بعد، جب اس کا شباب رخصت ہو چکا تھا، وہ گارنیئر برادران کی مکمل مطبوعات پر مشتمل بیس جلدیں، پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھنے والا تھا، ترجمہ شدہ ادبِ عالیہ سے لے کر سہل ترین تحریروں کے مقامی سستے ایڈیشنوں تک ہر چیز۔

تاہم اس ہوٹل میں اس کی نوعمری کی سرگرمیاں کتابیں پڑھنے اور دیوانگی کے خطوط لکھنے تک محدود نہ تھیں، بلکہ ان میں نامحبوب عاشقی کے اسرار سے اس کا تعارف بھی شامل تھا۔ اس عمارت میں زندگی دوپہر کے بعد شروع ہوتی تھی جب رات کے پرندوں کی، جن سے اب اس کی دوستی ہو چکی تھی، اسی حالت میں آنکھ کھلتی جس حالت میں وہ پیدا ہوئی تھیں۔ لہٰذا جب فلورنتینو اریزا کام کے بعد یہاں پہنچتا تو عمارت برہنہ حُوروں سے بھری ہوتی جو بلند آواز میں شہر کے ان رازوں پر تبصرہ کر رہی ہوتی تھیں جو خریداروں نے اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر ان تک پہنچائے تھے۔ ان کی برہنگی ان میں سے بہت سوں کے ماضی کے مشاہدات آشکار کر رہی ہوتی تھی: پیٹ میں چاقو کے وار کے نشان، بندوق کی گولی کے چھرّوں کے زخم، محبت میں لگے ہوئے بلیڈ کے زخموں کی لکیریں، قسائیوں کے کیے ہوئے اسقاط کی یادگاریں۔ ان میں سے بعض کے ساتھ ان کے کمسن بچے بھی تھے جو ان کی پُرشباب بغاوت یا بےاحتیاطی کی پیداوار تھے اور ان بچوں کے داخل ہوتے ہی ان کے بھی کپڑے اتار دیتیں تاکہ وہ برہنگی کی اس جنت میں خود کو الگ محسوس نہ کریں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا کھانا خود تیار کیا ہوتا تھا اور ان میں سب سے بہتر غذا فلورنتینو اریزا کو ملتی تھی، کیونکہ وہ ان کی دعوت پر ان میں سے ہر ایک کی پکائی ہوئی بہترین چیز منتخب کرتا تھا۔ یہ ضیافت دن ڈھلے تک جاری رہتی، اور پھر تمام برہنہ عورتیں گاتی ہوئی غسل خانوں کی طرف روانہ ہو جاتیں اور ایک دوسرے سے صابن، ٹوتھ برش اور قینچیاں ادھار مانگتیں، ایک دوسرے کے بال سنوارتیں، مانگے کے کپڑے پہنتیں، خود کو غم انگیز مسخروں کی طرح رنگوں سے پوت لیتیں، اور رات کے پہلے شکار کی تلاش میں نکل جاتیں۔ تب سے لے کر اس مکان میں زندگی غیرانسانی اور غیرشخصی شکل اختیار کر لیتی اور اس میں حصہ لینا رقم ادا کیے بغیر ممکن نہ رہتا۔

فرمینا ڈازا سے آشنا ہونے کے بعد سے فلورنتینو اریزا کا دل اس جگہ سے زیادہ کہیں نہ

لگتا تھا، کیونکہ یہاں اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ فرمینا ڈازا کے ساتھ ہے۔ شاید ایسے ہی کسی سبب سے ایک خوش شکل عمررسیدہ عورت نے بھی مستقل قیام کے لیے اس ہوٹل کو منتخب کر لیا تھا؛ وہ وہاں رہنے کے باوجود برہنہ عورتوں کی بےحجاب زندگی میں شریک نہ تھی، لیکن وہ تمام عورتیں اس کا کسی مذہبی پابندی کے ساتھ احترام کرتی تھیں۔ جوانی کی ناتجربہ کاری میں اس کا عاشق اسے یہاں لے آیا تھا، اور کچھ عرصے تک اس سے عشق کرنے کے بعد اسے اس کی تقدیر پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس صدمے اور بدنامی کے داغ کے باوجود، وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ جب وہ عمررسیدہ اور تنہا ہو گئی تو اس کے دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی خواہش تھی کہ وہ ان کے ساتھ رہے، لیکن اس نے رہنے کے لیے اپنی جوانی کی بےراہ روی کی یادگار اس ہوٹل ہی کو بہتر جانا۔ یہاں اس کا مستقل کمرہ ہی اس کا واحد گھر تھا، اور اس مشترکہ اقامت گاہ میں اس کی رسم و راہ فلورنتینو اریزا سے ہوئی، جو اس کا خیال تھا کہ آگے چل کر ایک نہایت دانا آدمی ثابت ہو گا اور اس کی شہرت دنیا بھر میں ہو گی کیونکہ وہ شہوت پرستی کی اس بہشت میں بھی اپنی روح کی کتاب خوانی سے آبیاری کرتا رہتا ہے۔ فلورنتینو اریزا بھی اس سے خاصا مانوس ہو گیا تھا اور سودا سلف لانے میں اس کی مدد کرنے کے علاوہ شاموں میں اس سے گفتگو بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ عورت محبت کے معاملات میں خاصی دانائی رکھتی تھی، کیونکہ اس نے، فلورنتینو اریزا کی جانب سے اسے اپنا شریک راز بنائے بغیر اپنی سوجھ بوجھ سے کئی بار اس کی رہنمائی کی۔

رہیں اس ہوٹل کی ترغیبات، تو ان کے سامنے فلورنتینو اریزا نے اس وقت بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے جب اسے فرمینا ڈازا کی محبت کا تجربہ حاصل نہ تھا، اب وہ ایسا کس طرح کر سکتا تھا جب فرمینا ڈازا اس سے باقاعدہ منسوب ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ ان لڑکیوں کے ساتھ رہتا رہا اور ان کے غموں اور خوشیوں میں شریک ہوتا رہا لیکن اس سے آگے بڑھنے کا اسے خیال تک نہ آیا۔ ایک غیرمتوقع واقعے نے اس کے عزم کی پختگی کو اور واضح کر دیا۔ ایک شام چھ بجے کے قریب، جب لڑکیاں شام کے گاہکوں کے خیرمقدم کے لیے تیار ہو رہی تھیں، اس کی منزل پر صفائی کرنے والی عورت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی عمر زیادہ نہ تھی لیکن وہ اپنے وقت سے پہلے ہی لاغر اور عمررسیدہ ہو گئی تھی، اور پُرشکوہ برہنگی کے درمیان ایک ملبوس شرمسار نظر آتی تھی۔ وہ اسے روز آتے جاتے دیکھتا تھا اور اسے یہ محسوس نہ ہوا تھا کہ وہ بھی اسے دیکھا کرتی ہے۔ وہ اپنی جھاڑو، کوڑا اٹھانے کی بالٹی اور فرش سے استعمال شدہ کنڈوم چننے کے لیے ایک مخصوص صافی اٹھائے کمروں میں آیا جایا کرتی تھی۔ وہ اس کمرے میں داخل ہوئی، جہاں فلورنتینو اریزا بستر پر دراز، مطالعے میں مگن تھا، اور ہمیشہ کی طرح احتیاط سے صفائی کرنے لگی تاکہ اس کی مصروفیت میں خلل نہ پڑے۔ پھر وہ بستر کے قریب آئی، اور فلورنتینو اریزا نے اپنے پیٹ کے قریب ایک گرم اور نرم ہاتھ کا لمس محسوس کیا، پھر اس نے اس ہاتھ کو آس پاس ٹٹولتے، اسے مراد تک پہنچتے، پتلون کے بٹن کھولتے محسوس کیا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ اسے نظرانداز کر کے پڑھنے میں مصروف رہا لیکن جب یہ عمل ناقابل برداشت ہو گیا تو اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

وہ بہت مایوس ہوئی کیونکہ اسے صفائی کرنے کی ملازمت دیتے ہوئے یہ بات صاف صاف بتا دی گئی تھی کہ وہ ہوٹل کے گاہکوں کے ساتھ بستر پر جانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ویسے یہ بات اس سے کہنے کی انہیں کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جن کے لیے طوائف ہونے کا مطلب پیسے کے عوض ہم بستری کرنا نہیں بلکہ کسی بھی اجنبی کے ساتھ ہم بستری کرنا ہوتا ہے۔ اس کے دو بچے تھے، دونوں کے باپ مختلف تھے اس لیے نہیں کہ وہ کوئی اتفاقی معاشقے تھے، بلکہ اس لیے کہ تیسری ملاقات کے بعد وہ کسی مرد سے محبت جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس وقت تک وہ ایک ایسی عورت رہی تھی جسے جلدی نہیں تھی اور جو مایوس ہوئے بغیر انتظار کرتے رہنے پر آمادہ تھی لیکن یہاں کے مکینوں کا طرز زندگی اس کے ضبط سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا۔ وہ شام چھ بجے کام پر آتی اور تمام رات کمروں میں آتی جاتی، فرش صاف کرتی، گندم جمع کرتی اور چادریں بدلتی رہتی۔ یہ تصور سے باہر تھا کہ مرد محبت کے بعد وہاں کتنی بے شمار چیزیں چھوڑ جایا کرتے تھے؛ الٹیاں اور آنسو، جو اس کے لیے قابل فہم تھے لیکن وہ اپنی قربت کی بہت سی اور نشانیاں بھی چھوڑ جاتے تھے؛ خون کے دھبے، گندگی کے تھکے، کانچ کی آنکھیں، سونے کی گھڑیاں، نقلی دانت، سنہری چھلوں والے لاکٹ، عشقیہ خطوط، کاروباری خطوط، تعزیتی خطوط، ہر طرح کے خطوط۔ ان میں سے بعض اپنی چھوڑی ہوئی چیزیں واپس لینے کے لیے آ جاتے لیکن زیادہ تر چیزیں وہیں ہوٹل میں رہ جاتی تھیں اور لوتاریو تھگٹ انہیں حفاظت سے تالے میں بند کر کے رکھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ جلد یا بدیر یہ عمارت جو اپنے جیسے دن گزار چکی ہے، ان بے شمار یادگاروں کی وجہ سے محبت کا ایک عجائب خانہ بن جائے گی۔

اس کا کام سخت اور معاوضہ بہت قلیل تھا پھر بھی وہ اسے دل لگا کر کرتی تھی۔ جو چیز اس کی برداشت سے باہر تھی وہ سسکیاں، آہیں اور مسہریوں کی چرچراہٹ تھی، جو اس کے لہو کو جذبے اور دکھ سے اس قدر بھر دیتی کہ صبح اپنی اس خواہش پر قابو رکھنا دشوار ہو جاتا کہ باہر نکل کر خود کو کسی بھی گداگر یا بھٹکتے شرابی کے سپرد کر دے جو کہ اس کی طلب پا کر سوال جواب کے بغیر اس کی مشکل آسان کر سکے۔ فلورنتینو اریزا کا نمودار ہونا جو جوان، صاف ستھرا اور کسی عورت کے بغیر تھا، اس کے لیے بہشت کے ایک تحفے سے کم نہ تھا کیونکہ اسے پہلی نظر دیکھتے ہی اس نے اس کے اور اپنے درمیان ایک قدر مشترک تلاش کر لی تھی: دونوں محبت کے ضرورت مند تھے۔ لیکن وہ اس کی پیشکش کو نہیں سمجھ سکا اور اس سے بے خبر تھا۔ اس نے اپنی کنوارگی فرمینا ڈازا کے لیے سنبھال رکھی تھی اور دنیا میں کوئی دلیل یا قوت ایسی نہ تھی جو اسے اس عہد سے ہٹا سکتی۔

سو اس کی زندگی اس طرح گزر رہی تھی جب فرمینا ڈازا اور اس کے درمیان طے شدہ منگنی کی تاریخ سے چار ماہ پہلے ایک صبح سات بجے لورینزو ڈازا تارگھر میں داخل ہوا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ چونکہ فلورنتینو اریزا ابھی دفتر نہیں پہنچا تھا وہ بنچ پر بیٹھ کر دس بجنے تک انتظار کرتا رہا اور اس دوران اپنی سونے کی انگوٹھی ایک انگلی سے دوسری انگلی میں منتقل کرتا رہا۔ جیسے ہی فلورنتینو اریزا دفتر میں داخل ہوا اس نے ٹیلیگرام پہنچانے والے قاصد کے طور پر اسے پہچان لیا اور بازو سے پکڑ لیا۔

"میرے ساتھ چلو بیٹے،" وہ بولا "مجھے تم سے پانچ منٹ صاف صاف بات کرنی ہے۔"

فلورنتینو اریزا نے، جس کا رنگ لاش کی طرح سبز ہو گیا تھا، خود کو اس کے ساتھ جانے دیا۔ وہ اس ملاقات کے لیے تیار نہ تھا، کیونکہ فرمینا ڈازا کو اسے پہلے سے آگاہ کرنے کا کوئی موقع یا ذریعہ نہ ملا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ گزشتہ سنیچر کے روز اسکول کی سپیریئر سسٹر فرانکا دلالوز "نظریات کائنات" کی کلاس کے دوران سانپ کی طرح چوری چھپے کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے طالبات کے کندھوں کے پیچھے سے ان کا خفیہ طور پر معائنہ کرنے کے دوران دریافت کیا کہ فرمینا ڈازا نوٹس لینے کے بہانے محبت نامہ لکھنے میں مصروف ہے۔ اسکول کے ضوابط کے مطابق یہ غلطی اسکول سے نکال دیے جانے کے لیے کافی تھی۔ لورینزو ڈازا کو فوری طور پر ریکٹر کے دفتر میں طلب کیا گیا جہاں اس پر منکشف ہوا کہ اس کی آہنی اقتدار کس شگاف کے راستے سے پگھل کر بہہ رہا ہے۔ فرمینا ڈازا نے اپنی جبلی استقامت کے ساتھ، خط لکھنے کے جرم کا اعتراف کر لیا لیکن اپنے خفیہ محبوب کا نام بتانے سے وہاں بھی انکار کیا اور ٹریبونل آف رولز کے روبرو بھی، جس نے اس کے اسکول سے نکالے جانے کے فیصلے پر مہر ثبت کر دی۔ اس کے باپ نے البتہ اس کے کمرے کی تلاشی لی، جو اب تک ایک محفوظ پناہ گاہ رہا تھا اور اس کے صندوق کی دوہری تہہ میں سے تین سال کی خط و کتابت کے بنڈل برآمد کر لیے۔ خطوں کے دستخط بالکل غیر مبہم تھے، لیکن لورینزو ڈازا کو نہ اس وقت یقین آیا اور نہ کبھی اس کے بعد کہ اس کی بیٹی اپنے عاشق کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ تارگھر میں کام کرتا ہے اور وائلن بجانے کا شوقین ہے۔

اسے یقین تھا کہ اتنی پیچیدہ راہ و رسم صرف اس کی بہن کی مدد ہی سے ممکن ہو سکی تھی اس لیے اس نے اسے عذر پیش کرنے یا رحم کی التجا کرنے کا موقع دیے بغیر سان جوان دلا سیناگا جانے والے جہاز پر سوار کر دیا۔ فرمینا ڈازا اپنی پھوپھی کی اس آخری اذیت ناک یاد سے کبھی سکون نہ پا سکی، جب وہ اپنی شب کے پیچھے بخار میں جلتے ہوئے سوکھے اور خاکستری جسم کے ساتھ الوداع کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور پھر زندگی بھر کی متاع، سونے کی چٹائی اور مہینے بھر کے خرچ کی رقم ایک رومال میں باندھے بھیگی بارش میں سامنے والے باغ میں اوجھل ہو گئی تھی۔ بعد میں اپنے باپ کے قبضے سے رہا ہوتے ہی فرمینا ڈازا نے کریبئین کے ساحلی علاقوں میں اس کی تلاش شروع کی اور ہر اس شخص سے اس کے بارے میں پوچھا جس پر اس سے جان پہچان کا گمان ہو سکتا تھا لیکن وہ اس کا کوئی سراغ نہ پا سکی۔ یہاں تک کہ تیس برس بعد اسے ایک خط ملا جو طویل عرصے تک بھٹکنے کے بعد مختلف لوگوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔ اس خط سے اسے پتا چلا کہ اس کی پھوپھی آب خداوند کے جذامی اسپتال میں مر چکی ہے۔ لورینزو ڈازا کو اس شدید ردعمل کا اندازہ نہ تھا جو اس کی پھوپھی کو ملنے والی ناحق سزا سے اس میں پیدا ہوا، کیونکہ اس نے ہمیشہ اسے اپنی ماں کی جگہ جانا تھا جو اسے یاد بھی نہ تھی۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں مقفل کر لیا، کھانے پینے سے قطعی انکار کر دیا اور جب لورینزو ڈازا کی دھمکیوں اور بے ڈھنگی ریاکارانہ التجاؤں سے قائل ہو کر اس نے دروازہ کھولا تو اس کے باپ کو ایک زخمی شیرنی نظر آئی جو دوبارہ کبھی پندرہ سال کی معصوم بچی نہیں بنے گی۔

اس نے ہر طرح کی خوشامد سے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ اسے سمجھایا کہ اس کی عمر میں محبت ایک التباس کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اس نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ یہ تمام خط واپس کر دے اور اسکول جا کر اپنی غلطی کی معافی مانگ لے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے جلد از جلد کوئی مناسب رشتہ تلاش کرے گا۔ لیکن یہ سب یوں تھا جیسے وہ کسی لاش سے مخاطب ہو۔ ناکام ہو کر وہ سوموار کو دوپہر کے کھانے پر طیش میں آ گیا، اور جب وہ اپنے غم و غصے کو دبانے کی کوشش میں تھا، فرمینا ڈازا نے گوشت کاٹنے والا چاقو اٹھا کر کسی ڈرامائی انداز کے بغیر اپنے گلے پر رکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کپکپاہٹ نہیں تھی اور آنکھیں ایسی پھٹی پھٹی تھیں کہ وہ کچھ نہ بول سکا۔ یہ وہ موقع تھا جب اس نے اس منحوس چھوکرے سے پانچ منٹ کے لیے روبرو بات کرنے کا فیصلہ کیا جس کی صورت اس کے ذہن میں نہیں تھی اور جس کی وجہ سے اس کی زندگی پر یہ مصیبت نازل ہوئی تھی۔

فلورنتینو اریزا بھی اپنے ہوش و حواس بحال نہ کر پایا تھا کہ لورینزو ڈازا اسے بازو سے پکڑے پکڑے گرجا کا چوک پار کر کے ٹریب کے کیفے کی محرابی دار گیلری میں لے گیا۔ تب صبح وہاں کوئی اور گاہک نہیں تھا۔ ایک سیاہ فام عورت گرد آلود دھندلے شیشوں کی کھڑکیوں والے ہال کا فرش دھو رہی تھی۔ فلورنتینو اریزا نے اسے اکثر بڑے بازار کے اندلسی دکانداروں کے ساتھ وہاں بیٹھے جوا کھیلتے اور شراب پیتے دیکھا تھا، وہ لوگ بلند آواز میں اپنی طویل جنگوں کا تذکرہ کر رہے ہوتے جن کا ہمارے ملک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ فلورنتینو اریزا محبت کے فانی ہونے کے احساس کے زیر اثر اکثر سوچا کرتا تھا کہ لورینزو ڈازا سے اس کی وہ ملاقات کیسی ہو گی جس کا جلد یا بہ دیر ہونا ناگزیر تھا، جسے ٹالنا کسی انسانی قوت کے بس میں نہ تھا، کیونکہ یہ ملاقات ان دونوں کی تقدیر میں لکھ دی گئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ ایک غیر مساوی مقابلہ ہو گا نہ صرف اس لیے کہ فرمینا ڈازا نے اپنے خطوں میں اسے اپنے باپ کی طوفانی فطرت سے آگاہ کر دیا تھا بلکہ اس نے خود بھی لورینزو ڈازا کو جوئے کی میز پر [illegible] اس کی آنکھیں غصے سے جل رہی ہوتی تھیں۔ اس کی ہر چیز وحشی پن کی گواہی دیتی تھی: اس کی مجسّم توند، وحشی آواز، جانوروں کے سے گل مچھے، بھدے ہاتھ، دودھیا پتھر سے جڑی ہوئی انگوٹھی والی انگلی۔ اس کی واحد پسندیدہ خصوصیت، جسے فلورنتینو اریزا نے پہلی بار دیکھ کر ہی پہچان لیا تھا، اس کی چال تھی جو اس کی بیٹی کی چال سے مشابہ تھی۔ تاہم جب لورینزو ڈازا نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ فلورنتینو اریزا کو اتنا سخت گیر معلوم نہ ہوا جتنا اس کا خیال تھا اور جب اس نے فلورنتینو اریزا کو سونف کی شراب کا ایک جام پینے کی دعوت دی تو اس کی ہمت بحال ہو گئی۔ فلورنتینو اریزا نے اس سے پہلے کبھی صبح آٹھ بجے شراب نہیں چکھی تھی لیکن اس نے اس دعوت کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا کیونکہ اس وقت اسے اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

لورینزو ڈازا نے اپنی بات کہنے میں واقعی پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ لگایا، اور اس نے یہ بات ایسے بے بس کر دینے والے خلوص کے ساتھ کی کہ فلورنتینو اریزا حیرت زدہ رہ گیا۔ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اس نے اپنی زندگی کا واحد مقصد یہ بنا لیا تھا کہ اپنی بیٹی کی اس طرح

پرورش کرے کہ وہ بڑی ہو کر ایک نہایت معزز خاتون بنے۔ خچروں کے ایک ان پڑھ تاجر کے لیے یہ راستہ بیحد طویل اور دشوار تھا، جس کی گھوڑے چرانے کی شہرت اتنی ثابت شدہ نہیں تھی جتنی سان خوان دلا سیناگا کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے خچر سواروں کا مخصوص سگار سلگایا اور تاسف سے کہنے لگا، "خراب شہرت خراب صحت سے بھی زیادہ بری چیز ہے۔" لیکن، اس نے کہا کہ، اس کی کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے خچروں سے بھی زیادہ محنت سے کام کیا، اور اس معمول میں خانہ جنگیوں کے اس تلخ ترین زمانے میں بھی فرق نہیں آنے دیا جب صبح ہوتے ہی گاؤں خود کو خاکستر اور کھیت خود کو تباہ حال پاتے تھے۔ اگرچہ فرمینا ڈازا کو اپنے باپ کے منصوبوں کا علم نہ تھا، لیکن اب تک اس نے ایسی اچھی کارکردگی دکھائی تھی جیسے وہ ان میں شریک ہو۔ وہ اتنی ذہین اور منظم تھی کہ اس نے خود پڑھنا سیکھتے ہی اپنے باپ کو بھی پڑھنا سکھا دیا، اور بارہ سال کی عمر میں اس میں معاملات کی ایسی سمجھ بوجھ آ گئی تھی کہ وہ اپنی پھوپھی کی مدد کے بغیر گھر کا سارا انتظام چلا سکتی تھی۔ وہ ایک آہ بھر کر بولا، "وہ ایک ایسی گھوڑی ہے جو سونے میں تولے جانے کے لائق ہے۔" جب اس کی بیٹی نے پرائمری اسکول کی تعلیم ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر اور تعریفی سند حاصل کر کے پوری کر لی تو وہ سمجھ گیا کہ سان خوان دلا سیناگا کا قصبہ اس کے خوابوں کے لیے بہت تنگ ہے۔ تب اس نے اپنی زمین اور مویشی بیچ ڈالے اور ستر ہزار پیسو کی رقم اور ایک نئے ولولے کے ساتھ بوسیدہ شان و شوکت والے اس تباہ شدہ شہر میں اٹھ آیا، جہاں روایتی انداز میں تربیت یافتہ ایک خوش شکل لڑکی کے لیے اچھے خاندان میں شادی کے توسط سے نئی زندگی شروع کرنے کا امکان موجود تھا۔ فلورنتینو اریزا کی اچانک آمد اس بیحد دشوار منصوبے میں ایک غیرمتوقع رکاوٹ تھی۔ "میں تم سے ایک درخواست کرنے آیا ہوں،" لورینزو ڈازا نے کہا۔ اس نے اپنے سگار کے سرے کو شراب میں ڈبو کر تر کیا، اس کا ایک طویل کش لیا اور دھواں باہر نکالے بغیر افسردہ آواز میں بولا،

"ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

فلورنتینو اریزا شراب کے گھونٹ لیتے ہوئے اس کی بات غور سے سن رہا تھا اور فرمینا ڈازا کے ماضی کے متعلق سننے میں اتنا محو تھا کہ اسے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی کہ اپنی باری پر اسے خود کیا کہنا ہے۔ لیکن جب یہ لمحہ آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ جو کچھ بھی کہے گا، اس کی تقدیر پر اثرانداز ہو گا۔

"کیا آپ نے اس سے بات کر لی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں،" لورینزو ڈازا نے کہا۔

"میں یہ سوال اس لیے کر رہا ہوں،" فلورنتینو اریزا نے کہا، "کہ میرے خیال میں یہ فیصلہ اسی کو کرنا ہے۔"

"ہرگز نہیں،" لورینزو ڈازا نے کہا، "یہ مردوں کا معاملہ ہے اور مردوں کے درمیان طے ہو گا۔"

اس کا لہجہ خوفناک ہوتا گیا تھا، اور ایک گاہک جو ابھی ابھی آ کر ایک قریبی میز پر بیٹھا تھا، چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ فلورنتینو اریزا نہایت دھیمی آواز میں، لیکن مقدور بھر

شدید عزم کے ساتھ بولا،

"کچھ بھی ہو، میں اس کی رائے معلوم کیے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ یہ اس کے ساتھ فریب ہو گا۔"

تب لورینزو دازا اپنی پشت کرسی سے لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے پپوٹے سرخ اور بھیگے ہوئے تھے اور اس کی بائیں آنکھ اپنے حلقے میں گھوم کر باہر کی جانب جم گئی۔ اس نے بھی اپنی آواز مدھم کر لی۔

"مجھے مجبور مت کرو کہ تمہیں گولی مار دوں،" وہ بولا۔

فلورنتینو اریزا کو اپنی آنتوں میں سرد جھاگ سا بھرتا محسوس ہوا۔ لیکن اس کی آواز میں کوئی لرزش نہ آئی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس پر روح القدس کا سایہ ہے۔

"میں تیار ہوں،" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "محبت کے لیے مارے جانے سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

لورینزو دازا کو اپنی ہوہے کی طرح گھومتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف ترچھا دیکھنا پڑا۔ اس نے تین الفاظ ایک ایک کر کے یوں ادا کیے جیسے انہیں تھوک رہا ہو

"کتے کی ولاد۔"

اسی ہفتے وہ اپنی بیٹی کو لے کر اس سفر پر روانہ ہو گیا جو اسے بھول جانے پر آمادہ کر سکے۔ اس نے سفر کے مقصد کی کوئی وضاحت نہ کی، صرف اس کی خواب گاہ میں طوفان کی طرح داخل ہوا، اور اس حالت میں کہ اس کی مونچھیں طیش اور چبائے ہوئے سگار سے سَنی ہوئی تھیں، فرمینا دازا کو سامان باندھنے کا حکم دیا۔ اس نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں تو وہ جواب میں بولا، "ہم اپنی موت کی طرف جا رہے ہیں۔" اس جواب سے گھبرا کر، جو سچ کے قریب تر محسوس ہوا، اس نے پہلے کی طرح جرأت سے اس کا سامنا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے اپنی چمڑے کی پیٹی اتاری جس کے سرے پر کوٹتے ہوئے تانبے کا بکسوا لگا ہوا تھا، اسے اپنے مٹھی کے گرد لپیٹا، اور اسے اتنے زور سے میز پر مارا کہ اس کی گونج رائفل کی گولی کی طرح پورے مکان میں دوڑ گئی۔ فرمینا دازا اپنی جرأت کی حد اور موقع محل سے واقف تھی، لہٰذا اس نے دو چٹائیاں اور ایک جھولنا بستربند میں باندھا، اپنے سارے کپڑے دو بکسوں میں ڈالے اور اس یقین کے ساتھ تیار ہو گئی کہ اس سفر سے واپسی کبھی نہیں ہو گی۔ کپڑے بدلنے سے پہلے وہ غسل خانے میں بند ہو گئی اور ٹوائلٹ پیپر کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر فلورنتینو اریزا کو ایک مختصر الوداعی خط لکھا۔ تب اس نے اپنی پوری چوٹی قینچی سے کاٹی اور اسے سنہرے بیل بوٹوں والے مخملی ڈبے میں رکھ کر خط کے ساتھ فلورنتینو اریزا کو بھجوا دیا۔

یہ ایک پاگل پن کا سفر تھا۔ اس کا پہلا حصہ، جو سیئرا نیوادا کی پہاڑی راستوں پر مشتمل تھا، انہوں نے اینڈینا کے خچرسواروں کے کاروان میں شامل ہو کر خچر کی پیٹھ پر گیارہ دن میں طے کیا، اور اس دوران تیز دھوپ، اکتوبر کی اٹھتی بارشوں اور گھاٹیوں سے اٹھنے والی دم گھونٹ دینے والے بخارات کی زد میں رہے۔ سفر کے تیسرے دن مکھیوں کے حملے سے بوکھلایا ہوا ایک خچر اپنے سوار سمیت نیچے گھاٹی میں جا گرا، اور اپنے ساتھ خچروں کی

پوری قطار کو کھینچ لے گیا۔ اس آدمی، اور ایک دوسرے سے رسیوں سے بندھے سات جانوروں کی چیخیں حادثے کے کئی گھنٹے بعد تک چٹانوں اور گھاٹیوں سے ٹکرا کر گونجتی رہیں، اور اس کے بعد سالہاسال تک یہ گونج فرمینا دازا کی یادداشت میں سنائی دیتی رہی۔ اس کا سامان گرنے والے خچروں کی پیٹھ پر تھا لیکن اس حادثے کے صدیوں جیسے طویل لمحے سے لے کر دہشت کی ان چیخوں کے گہری گھاٹی میں جا کر تھم جانے تک اس کے ذہن میں بدقسمت خچرسوار اور اس کے بندھے ہوئے جانوروں کا خیال نہ آیا، بلکہ وہ اپنی اس بدقسمتی کے بارے میں سوچتی رہی کہ اس کا خچر ان گرنے والے جانوروں کے ساتھ بندھا ہوا نہیں تھا۔

وہ پہلی بار خچر کی پیٹھ پر سفر کر رہی تھی، لیکن اس سفر کی دہشت اور ناقابل بیان صعوبتیں اسے اتنی تلخ محسوس نہ ہوتیں، اگر اسے اس کا یقین نہ ہوتا کہ اب زندگی بھر نہ وہ فلورنتینو اریزا کو دیکھ سکے گی اور نہ اس کے خطوں سے تسکین پا سکے گی۔ اس نے سفر کے آغاز سے اپنے باپ سے مخاطب ہو کر ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، اور وہ بھی اتنا حیرت زدہ تھا کہ انتہائی ضرورت کے وقت بھی وہ اس سے بات نہ کرتا بلکہ خچرسواروں کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا کرتا۔ کبھی کبھار خوش قسمتی سے انہیں سڑک کے کنارے کوئی سرائے مل جاتی جہاں دیہاتی کھانا دستیاب ہوتا، جسے وہ کھانے سے انکار کر دیتی اور بدبودار پسینے اور پیشاب سے آلودہ ترپال کی چارپائیاں کرائے پر ملتیں۔ مگر زیادہ تر راتیں انہیں انڈین بستیوں میں سڑک کے کنارے بنی ہوئی کھلی سرائے میں گزارنی پڑتیں جہاں لکڑی کی کھمبیوں پر کھجور کے پتوں کی چھت پڑی ہوتی اور جہاں ہر مسافر کو رات گزارنے کا حق تھا۔ فرمینا دازا ان میں سے ایک رات بھی سو کر نہ گزار سکی: وہ خوف کے عالم میں پڑی اندھیرے میں مسافروں کے آنے جانے کی آہٹ سنتی رہتی جو اپنے جانوروں کو کھمبوں سے باندھ کر اپنے جھولنے لٹکا رہے ہوتے تھے۔

غروب کے وقت جب پہلے مسافر وہاں پہنچتے تو یہ جگہ بھیڑبھاڑ کے بغیر خاصی پرسکون معلوم ہوتی، لیکن صبح ہونے تک یہ ایک میلے میں بدل جاتی، جہاں جھولنے مختلف بلندیوں پر اوپر تلے لٹک رہے ہوتے، پہاڑوں پر رہنے والے آرواک انڈین بیٹھے بیٹھے سو رہے ہوتے، اور بندھی ہوئی بکریاں، اور بکری نما صندوقوں میں بند مرغ مرغوں کی منمناہٹیں اور ککڑوں کوں جاری ہوتیں، اور پہاڑی کتوں کی خاموشی سے ہانپنے کی آوازیں اس ہنگامے میں شامل کر دیتیں جنہیں جنگ کے خطرے کے باعث بھونکنے سے باز رہنے کی تربیت دی گئی تھی۔ لورینزو دازا ان صعوبتوں کا عادی تھا کیونکہ اس کی آدھی زندگی انہی راستوں پر سفر کرتے ہوئے گزری تھی اور وہ ہر جگہ صبح بیدار ہونے پر ہجوم میں پرانے دوستوں کو پہچان لیتا تھا۔ اس کی بیٹی کے لیے یہ ایک مسلسل عذاب تھا۔ نمک لگی مچھلیوں کے ڈھیروں کے تعفن سے اس کی بھوک جو دکھ کے باعث پہلے ہی بہت کم ہو گئی تھی، یکسر ختم ہو گئی۔ اگر وہ ان تمام مصیبتوں کے باوجود پاگل ہونے سے بچ سکی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ فلورنتینو اریزا کی یاد سے تسکین حاصل کر لیتی تھی۔ اسے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ فراموشی کی سرزمین ہے۔

ایک اور مستقل خوف خانہ جنگی کا تھا۔ سفر کے آغاز ہی سے گھومتے ہوئے مسلح دستوں

سے سامنا ہونے کی حسرت کی باتیں ہونے لگی تھیں، اور خچرسواروں نے انھیں دونوں فریقوں میں تعمیر کرنے کی نشانیاں اچھی طرح یاد کرا دی تھیں تاکہ وہ انھیں پہچان کر مناسب طرزعمل اختیار کر سکیں۔ انھیں اکثر راستوں میں گھڑسوار دستے ملتے جو کسی افسر کی کمان میں نئے رنگروٹوں کی تلاش میں گھوم رہے ہوتے، وہ منتخب ہونے والوں کو مویشیوں کی طرح باندھ کر ساتھ لے جاتے تھے۔ بےشمار مصیبتوں میں گرفتار فرمینا ڈازا کو اس خطرے کا اندازہ نہیں تھا جو اسے حقیقی سے زیادہ قصہ کہانی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ایک رات ایک گشتی دستے نے جس کی وابستگی نامعلوم تھی، کارواں کے دو مسافروں کو قیدی بنا لیا، اور بستی سے دو فرسنگ باہر کیمپ کے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔ لوریسرو ڈازا ان کو جانتا تک نہ تھا پھر بھی اس نے ان کی لاشیں اتروائیں اور ان بدقسمتوں سے اپنے بچ نکلنے پر شکر کے طور پر ان کی مسیحی تدفین کروا دی۔ اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ حملہ آور سپاہیوں نے اسے بھی پیٹ پر رائفل کی نال رکھ کر جگایا تھا اور کمانڈر نے جس کے کپڑے بوسیدہ تھے اور چہرے پر کالک ملی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر روشنی ڈال کر اس سے پوچھا تھا کہ وہ لبرل ہے یا قدامت پسند۔

"دونوں میں سے کوئی نہیں،" لوریسرو نے کہا تھا۔ "میں ہسپانوی رعایا میں سے ہوں۔"

"خوش قسمت ہو،" کمانڈر نے کہا تھا اور پھر ہاتھ اٹھا کر بولا تھا، "زندہ باد شاہ ہسپانیہ!" اور آگے بڑھ گیا تھا۔

دو دن بعد وہ ڈھلوان راستے سے اتر کر اس روشن میدانی علاقے میں پہنچے جہاں ولیدوپار کا قصبہ واقع تھا۔ صحنوں میں مرغ لڑائے جا رہے تھے، گلیوں کے موڑ پر اکارڈین بجائے جا رہے تھے، عمدہ نسل کے گھوڑوں پر سوار لوگ تھے اور آتش بازیوں اور گھنٹیوں کی آوازیں تھیں۔ آتش بازی سے ہوا میں ایک قلعہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ فرمینا ڈازا کو جشن کے ان ہنگاموں کا پتہ بھی نہ چلا۔ وہ لیسیماکو سانچیز کے گھر میں ٹھہرے جو اس کی مرحوم ماں کا بھائی تھا اور جو اس علاقے کے عمدہ ترین نسل کے گھوڑوں پر سوار اپنے ہم عمر نوجوانوں کے ایک جلوس کے ساتھ شاہراہ تک آیا تھا۔ انھیں قصبے کی گلیوں میں سے آتش بازی کی روشنیوں کے درمیان سے لے جایا گیا۔ مکان مرکزی چوک میں کئی بار تعمیرشدہ نوآبادیاتی گرجا گھر سے متصل تھا اور اس جاگیر کی طرح کی عمارت معلوم ہوتا تھا۔ اس کے کمرے وسیع و عریض اور نیم تاریک تھے، اور اس کی گیلری کا رخ پھلوں کے باغ کی جانب تھا اور وہاں گنے کے رس کی گرم خوشبو تیرتی رہتی تھی۔

وہ ابھی اصطبل میں اتری ہی تھی کہ استقبالیہ کمروں میں سے بےشمار ناشناس رشتےدار نکل آئے، جن کا ناقابل برداشت ریلا فرمینا ڈازا کے لیے تاریکیوں سے کم نہ تھا کیونکہ وہ کسی اور سے محبت کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ گھوڑے کی رگڑ سے زخموں سے چور، تھکی اور بدہضمی سے جاں بہ لب تھی، اور صرف کسی تنہا اور خاموش جگہ جا کر رونا چاہتی تھی۔ صرف اس کی ہم زاد ہلدبراندا سانچیز، جو اس سے دو سال بڑی، اور شاہانہ تمکنت میں اس سے مشابہ تھی، اس پر نظر ڈالتے ہی اس کا حال سمجھ گئی کیونکہ وہ خود بھی بےاحتیاط محبت کے انگاروں میں جل رہی تھی۔ شام پڑتے ہی وہ اسے اپنی خواب گاہ میں لے گئی

جہاں ان دونوں کو ساتھ رہنا تھا اور اس کے کولھوں کے زخم دیکھ کر اسے یقین نہ آیا کہ وہ اب تک زندہ کس طرح ہے۔ اپنی ماں کی مدد سے جو ایک بےحد شفیق عورت تھی اور اپنے شوہر سے اس قدر مشابہت رکھتی تھی جیسے وہ جڑواں بھائی بہن ہوں، اس نے فرمینا ڈازا کے غسل کا بندوبست کیا اور اس کے جلتے ہوئے زخموں کو آرنیکا کے مرہم سے ٹھنڈک پہنچائی جب کہ باہر بارود کا قلعہ مکمل ہو چکا تھا اور اس سے اٹھتے ہوئے دھماکے مکان کی بنیادیں ہلا رہے تھے۔

نصف شب کے قریب مہمان رخصت ہوئے، جشن کے شعلے مدھم ہو گئے اور عم زاد ہلدبراندا نے اسے شب خوابی کا لباس پہنے کو دیا اور ہموار چادر اور پروں کے تکیے والے بستر پر لٹا دیا اور اچانک خوشی کے ہیجان سے بےقابو ہو گئی۔ خوش ہو کر دونوں سب بولتی ہلدبراندا نے سلاخ اٹکا کر دروازہ بند کر دیا اور اپنے بستر کے نیچے چھپی ہوئی چٹائی کے اندر سے دبیز کاغذ کا ایک لفافہ نکالا جس پر لگی موم کی سرخ مہر پر ٹیلیگراف کا نشان بنا ہوا تھا۔ اپنی عم زاد کے چہرے پر چمکتی ہوئی شرارت دیکھتے ہی فرمینا ڈازا کے دل میں گاردینیے کے سفید پھولوں کی اداس مہک پھر سے بھر گئی۔ اس نے سرخ مہر اپنے دانتوں سے توڑی اور ان گیارہ ممنوعہ ٹیلیگراموں کو رات بھر اپنے آنسوؤں سے تر کرتی رہی۔

تو وہ جانتا تھا! لوریسرو ڈازا سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنے برادرِ نسبتی لیسیماکو سانچیز کو ٹیلیگرام کے ذریعے خبر کی تھی اور اس نے یہ خبر اس علاقے کے تمام قصبوں اور گاؤں میں بسے ہوئے اپنے بےشمار رشتےداروں میں پھیلا دی تھی۔ لہذا فلورنتینو اریزا کو نہ صرف ان کے سفر کے راستے کا علم ہو گیا تھا بلکہ وہ علاقے کے تمام ٹیلیگراف آپریٹروں کو ایک برادری کی صورت میں اس بات پر آمادہ کر چکا تھا کہ وہ فرمینا ڈازا کے سفر کی کاہو دلا ویلا کی آخری بستی تک خبر رکھیں۔ اس طرح وہ فرمینا ڈازا کے والیدوپار پہنچتے ہی اس سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، اور یہ رابطہ اس کے پورے سفر کے دوران قائم رہا جو ڈیڑھ سال بعد [illegible] لوریسرو ڈازا نے یہ مطمئن ہونے پر کہ اس کی بیٹی اس قصے کو مکمل طور پر بھلا چکی ہے واپسی کا قصد کیا۔ وہ شاید اس امر سے بےخبر تھا کہ یہاں پہنچ کر اس نے اپنی نگرانی کو کس قدر نرم کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے سسرالی رشتےداروں کی خوشامد بازیوں میں گھرا رہتا جنھوں نے ان تمام برسوں میں اپنی پرانی بدگمانیوں کو خیرباد کہہ کر کھلے بازوؤں سے اسے اپنے خاندان کا ایک فرد تسلیم کر لیا تھا۔ درحقیقت فرمینا سانچیز کا خاندان اس کے ایک نادار وطن سے شادی کرنے کے سخت خلاف تھا جو کوئی پس منظر نہ رکھتا تھا اور ان کی نظر میں محض ایک شیخی خورا اور بدچلن شخص تھا جو ہمیشہ سفر میں رہتا اور اپنے سالم خچروں کی تجارت کیا کرتا جو اتنا سادہ پیشہ تھا کہ اس کی دیانتداری کا کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ لوریسرو ڈازا ایک بڑا جوا کھیل رہا تھا، کیونکہ اس کی محبوبہ علاقے کے ایک روایتی خاندان کی چشم وچراغ تھی، جو سرکش عورتوں اور مہربان مردوں پر مشتمل ایک پیچیدہ قبیلہ تھا جسے اپنی عزت کا احساس جنون کی حد تک تھا۔ لیکن فرمینا سانچیز اس محبت کے عزم کے ساتھ جسے مخالفت کا سامنا ہو، اپنی خواہش پر مُصر ہو گئی اور خاندان کی مخالفت کے

باوجود اسی قدر جلدبازی اور رازداری کے ساتھ اس سے شادی کر لی کہ شبہ ہوتا تھا کہ اس کا محرک عشق نہیں بلکہ کسی بےوقت غلطی پر تقدّس کا پردہ ڈالنا ہے۔

پچیس سال بعد لورینزو ڈازا کو احساس نہ تھا کہ اپنی بیٹی کے عشق پر اس کا ردعمل اسی ماضی کی تکرار ہے، اور وہ اپنی اس بدقسمتی کی انہیں سسرال والوں کے روبرو شکایت کر رہا تھا جنھوں نے کبھی اس کی مخالفت کی تھی اور اپنے رشتےداروں سے اسی قسم کی شکایتیں کی تھیں۔ تاہم جتنے وقت وہ اس ماتم میں مصروف رہا اس کی بیٹی اپنے عشق کی مصروفیت کے لیے آزاد رہی۔ اور جب وہ اپنے سسرالی رشتےداروں کی جاگیر پر بچھڑوں کو خصّی کرنے اور خچروں کو سدھانے میں مشغول ہوتا، فرمینا ڈازا اپنی عم زاد بہنوں کے ہجوم میں گھری رہتی۔ ان سب کی سردار ہلدبراندا سانچیز تھی جو ان سب میں حسین اور دل نواز بھی اور جو اپنے سے بیس سال بڑے، شادی شدہ صاحبِ اولاد مرد سے نامراد عشق میں دزدانہ نگاہوں تک محدود رہنے پر مجبور تھی۔

والدوپار میں طویل قیام کے بعد انھوں نے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کے تختوں اور خواب جیسے سرسبز میدانوں کو عبور کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ ہر گاؤں میں ان کا اسی طرح استقبال ہوا جس طرح پہلے گاؤں میں ہوا تھا۔ موسیقی، آتش بازی، رشتےداروں کا ہجوم اور ان کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے پابندی سے آنے والے ٹیلیگرام۔ فرمینا ڈازا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان کی والیدوپار آمد کی شام غیرمعمولی نہیں تھی بلکہ اس زرخیز علاقے میں ہفتے کے ہر روز کو اس طرح منایا جاتا تھا گویا وہ کوئی تہوار ہو۔ مسافر جہاں بھی رات پڑے سو سکتے تھے، جہاں بھوک لگے کھانا کھا سکتے تھے، کیوں‌کہ ان گھروں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور ایک زائد بستر ہمیشہ لٹکا رہتا تھا اور چولھے پر تین قسم کے گوشت کا سالن ہمیشہ چڑھا رہتا تھا، اس خیال سے کہ آنے والے مہمان شاید اپنی آمد کی اطلاع دینے والے ٹیلیگرام سے پہلے ہی آ پہنچیں، جو تقریباً ہمیشہ کا معمول تھا۔ ہلدبراندا اپنے باقی سفر میں اپنی عم زاد کے ساتھ رہی اور ایک پرمسرت جذبے کے ساتھ رشتےداریوں کے بےحد پیچیدہ گورکھ دھندے سلجھانے میں اس کی رہنمائی کرتی رہی۔ فرمینا ڈازا کو پہلی بار اپنے وجود کا احساس ہوا، اس نے خود کو بےفکر، محظوظ اور مہربانیوں کے درمیان محسوس کیا، پہلی بار آزادی کی فضا میں سانس لیا جس سے اس کی طبیعت کا سکون اور زندہ رہنے کی آرزو لوٹ آئی۔ اپنی زندگی کے آخری ایّام میں وہ اس سفر کو ایک بار پھر یاد کرنے والی تھی جب موستجیب کے عجیب و غریب عمل سے یہ سفر اس کی یادداشت میں قریب سے قریب تر ہونے لگا تھا۔

ایک روز وہ اپنی روزانہ سیر سے اس انکشاف پر حیرت زدہ واپس آئی کہ انسان نہ صرف محبت کے بغیر بلکہ اس کے باوجود بھی خوش رہ سکتا ہے۔ اس انکشاف نے اسے چونکا دیا، کیوں‌کہ اس کی ایک عم زاد نے بتایا تھا کہ اس کا باپ اپنے سسرالی رشتےداروں میں، کلیوفاس موسکوتے کی بےاندازہ جائیداد کے اکلوتے وارث سے اس کی شادی کے امکان کا ذکر کر رہا تھا۔ فرمینا ڈازا اس شخص کو جانتی تھی۔ اس نے اسے چوک میں کئی بار دیکھا تھا جہاں وہ اپنے بےمثال گھوڑوں کو ان کے رہائشی ساز پہنے رہا ہوتا تھا جو اپنی چمک دمک سے تقریبات میں

پہنے جانے والے زیوروں کی طرح لگتے تھے۔ وہ خوش وضع اور ہوشیار تھا اور اس کی پلکیں خواب دیکھنے والوں جیسی تھیں جنھیں دیکھ کر پتھر بھی آہیں بھرنے لگیں، لیکن جب وہ اس کا موازنہ باغ میں بادام کے درخت کے نیچے اپنے زانو پر شاعری کی کتاب رکھے مسکین اور لاغر فلورنتینو اریزا سے کرتی تو اسے اپنے دل میں کسی شک کی دھندلی سی پرچھائیں بھی محسوس نہ ہوتی۔

ان دنوں ہلدبراندا سانچیز امید سے بےحال تھی، کیوں‌کہ وہ ایک نجومی سے مل کر آئی تھی جس نے اپنی غیب دانی سے اسے حیران کر دیا تھا۔ اپنے باپ کے ارادوں سے مضطرب ہو کر فرمینا ڈازا بھی اس کے ساتھ اس نجومی سے ملنے گئی۔ قسمت کا حال بتانے والے پتّوں نے بتایا کہ اس کی طویل اور پُرمسرت شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس پیش گوئی نے اس کا حوصلہ بحال کر دیا کیوں‌کہ وہ اس خوش قسمتی کا اپنے محبوب کے سوا کسی اور کے ساتھ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس یقین سے سرشار ہو کر اس نے گویا اپنی تقدیر کی حکمرانی سنبھال لی۔ اس طرح اب اس کے اور فلورنتینو اریزا کے درمیان ٹیلیگراموں کا سلسلہ تمناؤں اور فریبِ وعدوں پر مشتمل نہ رہا بلکہ پہلے سے زیادہ عملی، شدید اور پرشور ہو گیا۔ وہ تاریخیں طے کرتے، طریقۂ کار وضع کرتے، اپنی زندگی کو اس مشترک عزم کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتے کہ جب اور جس طرح بھی ممکن ہو وہ دوبارہ ملتے ہی کسی سے مشورہ کیے بغیر شادی کر لیں گے۔ فرمینا ڈازا کو اپنے اس عہد کا اتنا پاس تھا کہ جب اس کے باپ نے فونسیکا کے قصبے میں زندگی میں پہلی بار اسے رقص میں حاضری کی اجازت دی تو اسے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ اپنے منگیتر کی رضامندی حاصل کیے بغیر رقص کی دعوت قبول کر لے۔ فلورنتینو اریزا اس رات ہوٹل میں لوتاریو تگٹ کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا جب اسے بتایا گیا کہ اس کے لیے ٹیلیگراف پر ایک بےحد اہم پیغام ہے۔

فونسیکا کا ٹیلیگراف آپریٹر لائن پر تھا جو سات دوسرے اسٹیشنوں سے گزر کر اس سے رابطہ قائم کر پایا تھا، تاکہ فرمینا ڈازا رقص میں شرکت کی اجازت لے سکے۔ مگر جب اسے اجازت مل گئی تو وہ اس مثبت جواب سے مطمئن نہ ہوئی اور اس بات کا ثبوت طلب کیا کہ دوسرے سرے پر فلورنتینو اریزا خود موجود ہے۔ فلورنتینو اریزا کو اس مطالبے پر خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی اور اس نے اپنی شناخت کے لیے ایک فقرہ بنایا: "اسے کہو کہ میں تاج دار دیوی کی قسم کھاتا ہوں۔" فرمینا ڈازا اس اسم کو پہچان گئی اور مطمئن ہو کر صبح سات بجے تک رقص کی محفل میں رکی اور اس وقت بھی وہاں سے اس لیے واپس آئی کہ شتابی سے لباس تبدیل کر کے گرجاگھر جا سکے۔ اس وقت تک اس کے صندوق کی تہ میں ان خطوں سے، جنھیں اس کے باپ نے اس سے چھین لیا تھا، کہیں زیادہ ٹیلیگرام جمع ہو چکے تھے، اور وہ ایک شادی شدہ عورت کے سے اطوار سیکھ گئی تھی۔ لورینزو ڈازا نے اس کے طرزِعمل میں اس تغیر کو اس بات کا ثبوت جانا کہ فاصلے اور وقت نے اسے اس کی نوعمری کے خوابوں سے رہا کر دیا ہے، لیکن اس نے کبھی فرمینا ڈازا سے اس کی شادی کے منصوبے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس پُرتکلف احتیاط کی حدود میں جو فرمینا ڈازا نے پھوپھی ایسکولاستیکا کے نکال دیے جانے کے بعد سے عائد کر لی تھی، ان دونوں کے تعلقات خاصے ہموار ہو گئے تھے اور اس نے انھیں ساتھ

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن بزمِ کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

ریشم کی ایک بہت پُرسکون وضع فراہم کر دی تھی کہ کسی کو اس کے اس پر مبنی ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب فلورنتینو اریزا نے اپنے خطوں میں فرمینا دازا کو اس کی خاطر غرقاب خزانے کی بازیابی کے ارادے سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سچ تھا، اور یہ خیال ایک روز اس کے ذہن پر اچانک چھا گیا تھا جب ایک دھوپ بھری سہ پہر میں سمندر نشہ آور گھاس کی مدد سے سطح پر لائی گئی بےشمار مچھلیوں کے باعث المونیم سے ڈھکا ہوا لگ رہا تھا۔ فضا کے تمام پرندے ان کے اس پاس جمع ہو کر شور مچا رہے تھے۔ مچھیروں کو اپنے چپّو ہوا میں لہرا کر انہیں منتشر کرنا پڑا تاکہ انہیں ان پرندوں سے اس ممنوعہ معجزے کے اثمار کی تقسیم پر لڑنا نہ پڑے۔ مچھلیوں کو بےہوش کرنے کے لیے اس بوٹی کا استعمال نوآبادیاتی دور سے قانوناً ممنوع تھا لیکن یہ کریبئن کے مچھیروں کا اس وقت تک معمول رہا جب تک اس کی جگہ بارود نے نہ لے لی۔ فرمینا دازا کے اس طویل سفر پر رہنے کے عرصے میں فلورنتینو اریزا وقت گزاری کے لیے، ساحل پر کھڑا مچھیروں کو بےہوش مچھلیوں سے بھرے جال اپنی کشتیوں میں لادتے دیکھا کرتا۔ اسی دوران کم عمر لڑکوں کی ایک ٹولی وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے پانی میں سکّے پھینکنے کی درخواست کیا کرتی تاکہ وہ غوطہ لگا کر اسے تہہ میں سے نکال لانے کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہی لڑکے اس مظاہرے کے لیے تیر کر ساحل سے کچھ دور کھڑے سمندری جہازوں تک جایا کرتے تھے، اور غوطہ زنی میں ان کی مہارت کے قصے یورپ اور ریاستہائے متحدہ کے کتنے ہی سفرناموں کا مشترک موضوع رہے تھے۔ فلورنتینو اریزا کو ان کے بارے میں ہمیشہ سے علم تھا، اس زمانے سے جب وہ محبت سے آشنا نہیں ہوا تھا، لیکن اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ غرقاب خزانے کو بازیاب کرنے میں بھی ان کی مدد لی جا سکتی ہے۔ یہ خیال اسے اسی سہ پہر کو آیا، اور اس سے اگلے اتوار سے لے کر تقریباً ایک سال بعد فرمینا داز کی واپسی تک اسے جنون کا ایک اور محرک دستیاب ہو گیا۔

یوکلیدیس، جو ان غوطہ خور لڑکوں میں سے ایک تھا، اس سے دس منٹ تک بات چیت کرنے کے بعد زیرِآب مہم کے بارے میں اتنا ہی پُرجوش ہو گیا۔ فلورنتینو اریزا نے اسے مہم کے بارے میں پورے منصوبے سے آگاہ نہ کیا، مگر غوطہ خور اور کشتی ران کے طور پر اس کی صلاحیتوں کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ بیس میٹر کی گہرائی میں سانس لیے بغیر تیر سکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ طوفانی موسم میں کسی آلے کے بغیر صرف اپنی جبلت پر بھروسا کرتے ہوئے کشتی کو کھلے سمندر میں لے جا سکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ جزائر سوتاوینتو کے سب سے بڑے جزیرے کے شمال مغرب میں سولہ بحری میل کے فاصلے پر ایک مخصوص مقام کا پتا لگا سکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ اسی اجرت پر کام کرنے کو تیار ہو گا جو مچھیرے اسے مچھلیاں پکڑنے میں مدد دینے کے عوض دیتے ہیں، تو یوکلیدیس نے کہا "ہاں"، لیکن اتوار کے دن کام کرنے کے وہ پانچ ریال مزید لے گا۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ شارکوں سے مقابلہ کر سکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں" کیونکہ اسے شارکوں کو ڈرا کر بھگانے کی طلسمی ترکیبیں معلوم ہیں۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ کسی

راز کی حفاظت کر سکتا ہے چاہے اسے ہسپانوی احتساب کے عقوبت خانوں میں ڈال دیا جائے تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ درحقیقت وہ کسی بھی بات کے جواب میں "نہ" نہیں کہتا تھا، اور "ہاں" وہ اتنے اعتماد سے کہتا تھا کہ اس پر شبہ کرنا ناممکن تھا۔ پھر یوکلیدیس نے خرچ کا حساب لگایا: کشتی کا کرایہ، کشتی کے چپّوؤں کا کرایہ، مچھلیاں پکڑنے کے سامان کا کرایہ، تاکہ کوئی ان کی مہم کے اصل مقصد پر شک نہ کر سکے۔ کچھ چیزیں اور بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا: کھانا، تازہ پانی کی چھاگل، تیل کا چراغ، چربی کی بتیوں کا ایک دستہ، اور خطرے کی صورت میں مدد مانگنے کے لیے شکاریوں کا نرسنگھا۔

یوکلیدیس کی عمر تقریباً بارہ سال تھی، وہ پھرتیلا، چالاک اور بےپناہ باتونی تھا، اور اس کا جسم اس قدر لچک دار تھا کہ وہ پیپے کے سوراخ میں سے بھی نکل سکتا تھا۔ موسموں نے اس کی جلد کو اتنا سنولا دیا تھا کہ اس کی اصل رنگت کا اندازہ کرنا ناممکن تھا، اور اس کی وجہ سے اس کی بڑی بڑی زرد آنکھیں اور بھی چمک دار لگتی تھیں۔ فلورنتینو اریزا نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اس پیمانے کی مہم کے لیے یوکلیدیس ایک مثالی ساتھی ثابت ہو گا، اور وہ مزید تاخیر کے بغیر اگلے اتوار کو روانہ ہو گئے۔

ان کا سفر سورج نکلنے کے وقت مچھیروں کے ساحل سے شروع ہوا۔ ان کا سامان مکمل اور حوصلہ بلند تھا۔ یوکلیدیس تقریباً برہنہ تھا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔ فلورنتینو اریزا اپنے فراک کوٹ، سیاہ ہیٹ، پیٹنٹ لیدر کے بوٹ اور ایک شاعرانہ بو میں ملبوس تھا اور اس کے ہاتھ میں جزیروں تک کے راستے میں وقت گزارنے کے لیے ایک کتاب تھی۔ پہلے ہی اتوار کو اسے اندازہ ہو گیا کہ یوکلیدیس کشتی رانی میں بھی اتنا ہی طاق ہے جتنا غوطہ خوری میں، اور سمندر کی کیفیات اور اس میں تیرتی ہر شے کے بارے میں اس کا علم حیرت انگیز ہے۔ وہ کسی بھی زنگ آلود کشتی کی تاریخ حیران کن تفصیل سے بیان کر سکتا تھا، ہر لنگر کی عمر کا علم رکھتا تھا، تیرتے ہوئے ملبے کے ہر ٹکڑے کے ماخذ سے واقف تھا، اس زنجیر کی کڑیوں کی تعداد تک جانتا تھا جس سے ہسپانوی بندرگاہ میں داخلے کا راستا بند کرتے تھے۔ اس خوف سے کہ وہ اس مہم کے اصل مقصد سے بھی باخبر نکلے گا، فلورنتینو اریزا نے اس سے حیلہ سازی سے ادھر ادھر کے سوالات کیے۔ اسے پتا چلا کہ یوکلیدیس کو غرقاب جہاز کے بارے میں ذرہ بھر بھی علم نہیں۔

جب سے فلورنتینو اریزا نے شب بسری کے ہوٹل میں پہلی بار خزانے کا قصہ سنا تھا، اس وقت سے وہ جہازوں کے بارے میں ہر ممکن معلومات جمع کرتا رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ سان خوزے سمندر کی تہ میں مونگے کی چٹانوں کے درمیان واحد جہاز نہیں تھا۔ درحقیقت وہ تیرا فرما نامی بیڑے کا ہراول جہاز تھا، جو پناما کی روایتی پورتوبیلو کے میلے سے اس کے خزانے کا ایک حصہ یعنی پیرو اور ویراکروز کی چاندی کے تین سو صندوق، اور کونتادورا کے جزیرے پر جمع کیے اور گنے ہوئے موتیوں سے بھرے سو صندوق لے کر مئی ۱۷۰۸ کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس طویل مہینے میں جب وہ یہاں ٹھہرا، جشن رات دن جاری رہا اور سلطنت ہسپانیہ کو ناداری سے بچانے کے لیے درکار خزانے کا بقیہ جمع کر کر کے جہازوں پر لادا جاتا رہا۔ جو موزو اور سومندوکو کے زمردوں سے بھرے ایک سو سولہ صندوقوں اور سونے کے تین کروڑ سکّوں

پر مشتمل تھا۔

تیرا فرما کے بیڑے میں باربرداری کے چھوٹے بڑے کم از کم بارہ جہاز شامل تھے اور وہ اس بندرگاہ سے ایک قافلے کی شکل میں ایک فرانسیسی بحری دستے کی زیرنگرانی روانہ ہوا، جو اگرچہ اچھی طرح مسلح تھا لیکن چارلس ویجر کے زیرکمان انگلستانی بحری دستے کی توپ کے گولوں کو درست نشانے پر لگنے سے نہ روک سکا جو بندرگاہ میں داخلے کے راستے پر جزائر سوتاوینتو کے قریب منتظر تھا۔ اس لیے سان ہوزے ڈوبنے والا واحد جہاز نہیں تھا، لیکن اس بات کی کوئی معتبر دستاویزی شہادت نہ تھی کہ انگریزی حملے میں کتنے جہاز غرق ہوئے تھے اور کتنے بچ نکلے تھے۔ لیکن جو بات یقینی طور پر کہی جا سکتی تھی وہ یہ تھی کہ پرچم بردار جہاز ڈوبنے والے پہلے جہازوں میں شامل تھا، اور اس کے ساتھ عرشے پر کھڑا ہوا اس کا پورا عملہ اور اس کا کمانڈر بھی ڈوب گیا تھا اور اسی جہاز پر زیادہ تر خزانہ لدا ہوا تھا۔

فلورنتینو اریزا نے اس زمانے کے بحری نقشوں کی مدد سے اس بیڑے کے راستے کا پتا چلا لیا تھا، اور اپنی دانست میں اس مقام کا بھی سراغ لگا لیا تھا جہاں وہ غرق ہوا تھا۔ انھوں نے ساحل پر بوکا چیکا کے دو قلعوں کے درمیانی مقام سے آغاز کیا اور چار گھنٹوں کے سفر کے بعد جزائر کے درمیان کے پرسکون پانیوں میں داخل ہو گئے جہاں وہ مونگے کی چٹانوں کے پہلو میں سوتے ہوئے بڑے جھینگوں کو ہاتھ بڑھا کر تھام سکتے تھے۔ ہوا اتنی سبک اور سمندر اتنا پرسکون اور صاف تھا کہ فلورنتینو اریزا کو لگا کہ وہ خود پانی میں نظر آنے والا اپنا ہی عکس ہے۔ جزائر کے عقبی سمندر کے دوسرے سرے پر وہ مقام تھا جہاں جہاز غرق ہوئے تھے۔

دھوپ کی شدید تمازت میں پرتکلف لباس پہنے ہوئے فلورنتینو اریزا کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے یوکلیدیس سے کہا کہ وہ اس مقام پر بیس میٹر کی گہرائی تک غوطہ لگائے اور تہ میں اسے جو چیز ہاتھ لگے اسے باہر نکال لائے۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ وہ اسے نیلی شارکوں کے درمیان ایک سیاہ فام شارک کی طرح نظر آ رہا تھا جو اس کے اردگرد سے، اسے چھوئے بغیر گزر رہی تھیں۔ پھر اس نے اسے مونگے کے انبار میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا اور عین اس وقت جب اسے خیال ہوا کہ اب اس کے پھیپھڑوں کی ہوا ختم ہو چکی ہو گی، اسے اپنی عقب میں اس کی آواز سنائی دی۔ یوکلیدیس کمر کمر پانی میں بازو اٹھائے کھڑا تھا۔ سو انھوں نے سمندر کی سطح پر چمکتی ہموار روشنی کی تہ، خوفزدہ کیچووں اور سمندری گلاب کی جھاڑیوں کے اوپر اوپر شمال کی جانب اپنا سفر اور زیادہ گہرے مقامات میں اپنی تلاش جاری رکھی، یہاں تک کہ یوکلیدیس اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ محض وقت ضائع کر رہے ہیں۔

"اگر تم مجھے یہی نہیں بتاؤ گے کہ مجھے کیا چیز تلاش کرنی ہے، تو میں اسے کس طرح تلاش کروں گا" اس نے کہا۔

لیکن فلورنتینو اریزا نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ پھر یوکلیدیس نے تجویز پیش کی کہ وہ بھی کپڑے اتار کر اس کے ساتھ غوطہ لگائے، چاہے اس کا مقصد مونگے کی چٹانوں کی گہرائی میں، زمین کے نیچے ایک اور آسمان دریافت کرنا ہی کیوں نہ ہو۔ فلورنتینو اریزا کا ہمیشہ سے خیال تھا کہ خدا نے سمندر اس لیے بنایا ہے کہ آدمی کھڑکی سے اس کا نظارہ کرے، اس لیے اس نے کبھی تیرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد بادل چھا گئے اور ہوا سرد اور نم ہو گئی، اور

اتنی تیزی سے اندھیرا ہو گیا کہ انھیں واپس بندرگاہ تک پہنچنے میں لائٹ ہاؤس کی روشنیوں کی مدد لینی پڑی۔ بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے بہت بڑا سفید فرانسیسی بحری جہاز ان کے بالکل نزدیک سے گزرا۔ اس کی تمام روشنیاں جل رہی تھیں اور وہ اپنے پیچھے نرم گوشت کے اسٹو اور ابلی ہوئی گوبھی کی مہک چھوڑتا جا رہا تھا۔

انھوں نے تین اتوار اسی طرح ضائع کیے، اور وہ تمام اتوار اسی طرح ضائع کرتے رہتے اگر فلورنتینو اریزا نے یوکلیدیس کو اپنے راز میں شریک کرنے کا فیصلہ نہ کر لیا ہوتا، جس نے تلاش کے تمام منصوبوں کو نئے سرے سے ترتیب دیا اور وہ جہازوں کے قدیم راستے پر اس مقام کی طرف روانہ ہوئے جو فلورنتینو اریزا کے طے کردہ مقام سے بیس بحری میل دور مشرق میں واقع تھا۔ دو ماہ سے کم عرصہ گزرا ہو گا کہ برسات کی ایک سہ پہر، یوکلیدیس تہ میں بہت دیر تک ٹھہرا رہا اور کشتی اس اثنا میں بہتے بہتے اتنی دور نکل گئی کہ اسے سطح پر آنے کے بعد آدھ گھنٹے تک تیر کر اس تک پہنچنا پڑا کیوں کہ فلورنتینو اریزا سے اس کے قریب نہیں لا سکتا تھا۔ جب بالآخر وہ کود کر کشتی میں سوار ہوا تو اپنے منھ سے عورتوں کے پہننے کے دو زیور برآمد کیے اور ان کی یوں نمائش کی جیسے وہ اس کی ثابت قدمی کا انعام ہوں۔

اس نے جو تفصیل بیان کی وہ اس قدر مسحورکن تھی کہ فلورنتینو اریزا نے عہد کیا کہ تیرنا اور ہر ممکن گہرائی تک غوطہ لگانا سیکھے گا تاکہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ یوکلیدیس نے بتایا کہ اس مقام پر صرف اٹھارہ میٹر کی گہرائی میں مونگے کی چٹانوں کے درمیان اتنے سارے قدیم بادبانی جہاز پڑے ہیں کہ ان کی گنتی دشوار ہے، اور وہ اتنے بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کا دوسرا سرا نظر نہیں آتا۔ اس نے بتایا کہ سب سے حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ ڈوبے ہوئے جہاز سطح پر تیرنے والے ملبے کی نسبت بہت اچھی حالت میں ہیں۔ اس نے بتایا کہ ان میں سے بعض کے بادبان بھی صحیح سلامت ہیں، اور ڈوبے ہوئے جہاز تہ میں بھی صاف نظر آتے ہیں، جیسے وہ اپنے وقت اور مقام کے ساتھ غرقاب ہوئے ہوں، کیوں کہ ان پر گیارہ بجے دن کی وہی روشنی پڑ رہی ہے جو سینچر ۹ جون کے اس دن پڑ رہی تھی جب وہ غرق ہوئے تھے۔ اپنے تخیل کی قوت سے بےدم ہو کر اس نے کہا کہ ان جہازوں میں سب سے آسانی سے پہچان میں آنے والا جہاز سان ہوزے ہے، کیوں کہ اس کا نام اس کے پچھلے حصے پر سنہری حروف میں لکھا ہوا ہے، مگر یہی جہاز انگریز توپوں کے حملے کے نتیجے میں سب سے زیادہ تباہ شدہ بھی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے جہاز کے اندر ایک آکٹوپس دیکھا ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ ہے اور ٹانگیں توپ کے گولوں سے بنے سوراخوں سے باہر نکلی ہوئی ہیں، وہ کھانے کے کمرے میں قید کی حالت میں اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اس کو رہا کرنے کے لیے جہاز کو توڑنا ضروری ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے جہاز کے اگلے حصے کے ماہی خانے کے اندر جنگی وردی میں ملبوس کمانڈر کی لاش کو کروٹ کے بل تیرتے دیکھا ہے اور یہ کہ اگر وہ اور گہرائی میں جا کر جہاز کے تہ خانے تک نہیں پہنچ سکا جہاں اس کا تمام خزانہ بند ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پھیپھڑوں میں ہوا ختم ہو گئی تھی۔

تب، فرمینا داڑا کے ٹوسیکا سے واپسی سے کچھ عرصہ قبل، اس کے نام ایک خط میں

فلورنتینو اریزا نے پہلی بار خزانے کا تذکرہ کیا۔ وہ اس غرقاب خزانے کے قصے سے واقف تھی، اس لیے کہ اس نے لوریزو دازا سے بہت مرتبہ اس کا ذکر سنا تھا، جس نے جرمن غوطہ خوروں کی ایک کمپنی کو اس خزانے کی بازیابی کے منصوبے میں شریک ہونے پر قائل کرنے میں بہت وقت اور سرمایہ برباد کیا تھا۔ وہ اس منصوبے پر جما رہتا اگر اکیڈمی آف ہسٹری کے کئی اراکین نے اسے قائل نہ کر لیا ہوتا کہ غرقاب جہاز کا قصہ کسی بدمعاش وائسرائے نے سلطنت کے اپنے خزانے کی خوردبُرد کو چھپانے کی غرض سے ایجاد کیا تھا۔ بہرکیف، فرمینا دازا جانتی تھی کہ غرقاب جہاز کسی انسانی کی رسائی سے باہر ہے اور وہ دو سو میٹر، نہ کہ فلورنتینو اریزا کے دعوے کے مطابق بیس میٹر، کی گہرائی میں دفن ہے۔ لیکن وہ فلورنتینو اریزا کے شاعرانہ غلو کی عادی تھی، اس لیے اس نے خزانے کی مہم کو انتہائی کامیاب قرار دے کر اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود، جب اس نے بعد کے خطوں میں اور بھی زیادہ ناقابلِ یقین تفصیلات اتنی ہی سنجیدگی سے لکھی ہوئی پڑھیں جس سنجیدگی سے وہ اپنی محبت کا اعلان کرتا تھا تو اس نے ہلدبراندا سانچیز سے مجبوراً اپنے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ اس کا محبوب شاید پاگل ہو گیا ہے۔ (یا دہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔)

اس دوران یوکلیدیس اپنے سنائے ہوئے قصے کے اتنے سارے ثبوت سمندر سے برآمد کر چکا تھا کہ اب معاملہ مونگے کے درمیان بکھرے ہوئے اکادکا زیورات سے کھیلنے کا نہیں، بلکہ بابلی خزانے سے لدے ہوئے پچاس جہازوں کو سمندر کی تہہ سے نکالنے کے ایک عظیم الشان منصوبے کا تھا۔ تب وہی ہوا جو جلد یا بدیر ہونا تھا: فلورنتینو اریزا نے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی ماں کی مدد طلب کی۔ اس کی ماں نے صرف دھات کے زیوروں میں دانت گڑو کر دیکھا، اور کانچ کے بنے ہوئے ہیروں پر ایک نظر ڈالی اور جان گئی کہ کوئی شخص فلورنتینو اریزا کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یوکلیدیس نے گھٹنوں کے بل جھک کر قسم کھائی اور فلورنتینو اریزا کو یقین دلایا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، لیکن اگلے اتوار کو وہ مچھیروں کے ساحل پر نمودار نہیں ہوا، اور اس کے بعد بھی کہیں نظر نہیں آیا۔

اس مہم سے فلورنتینو اریزا کو جو واحد چیز حاصل ہوئی وہ لائٹ ہاؤس کی مہربان پناہ گاہ تھی۔ وہ ایک رات یوکلیدیس کی کشتی میں سوار ہو کر وہاں گیا تھا کہ انہیں سمندری طوفان نے آ لیا۔ اس کے بعد سے وہ اکثر سہ پہروں کو وہاں جایا کرتا اور لائٹ ہاؤس کے محافظ سے خشکی اور پانی کے ان عجائبات کے بارے میں باتیں کیا کرتا جو محافظ کے علم میں تھے۔ یہ ایک ایسی دوستی کی ابتدا تھی جو دنیا میں بہت سی تبدیلیاں آنے کے باوجود قائم رہی۔ برقی توانائی کے ہم تک پہنچنے سے قبل فلورنتینو اریزا نے لکڑی کے کندوں پر تیل انڈیل کر لائٹ ہاؤس کی آگ روشن کرنے کا ہنر سیکھا۔ اس نے روشنی کا رخ تبدیل کرنا اور آئینوں کی مدد سے اس میں اضافہ کرنا سیکھا، اور کئی موقعوں پر، جب محافظ کو کسی وجہ سے کہیں جانا پڑتا، وہ لائٹ ہاؤس کے مینار میں بیٹھ کر رات بھر سمندر پر پہرا دیا کرتا۔ وہ آوازوں اور افق پر چمکتی روشنیوں کی مدد سے جہازوں کو پہچاننا سیکھ گیا اور اسے احساس ہونے لگا کہ اس طرح ان جہازوں سے کوئی شے لائٹ ہاؤس کے روشنی مینار میں اس

تک پہنچ رہی ہے۔

دن میں، خصوصاً اتوار کے روز، اسے ایک اور مشغلہ میسّر تھا۔ وائسرائے کے محلے میں جہاں پرانے شہر کے معمول لوگ رہا کرتے تھے، ساحل پر مردوں اور عورتوں کی تفریح گاہوں کے درمیان پلاسٹر کی ایک دیوار حائل تھی، اس طرح کہ لائٹ ہاؤس ان دونوں حصوں کے عین درمیان میں واقع تھا۔ لہذا لائٹ ہاؤس کے محافظ نے ایک چھوٹی سی دوربین مخصوص کر دی تھی کہ ایک سنتاوو ادا کر کے کوئی شخص اس کی مدد سے اس ساحل پر نظر ڈال سکتا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ جانے بغیر کہ انہیں دیکھا جا رہا ہے، اعلا طبقے کی خواتین شکنوں بھرے تیراکی کے لباسوں اور چپلوں اور ہیٹوں میں مقدور بھر اپنی نمائش کیا کرتیں، اگرچہ یہ لباس ان کے جسم کا تقریباً اسی قدر حصہ ڈھانپ لیتا تھا جتنا ان کا عام لباس، اور اس کے علاوہ وہ اس کے مقابلے میں کم پُرکشش تھا۔ ان کی مائیں اپنے مخصوص لباس اور پروں والے ہیٹ پہنے جھولنے والی کرسیوں میں بیٹھی دھوپ سینکا کرتیں۔ ان کے ہاتھوں میں نفیس سوتی کپڑے کی وہی چھتریاں ہوتیں جنہیں لے کر وہ عبادت کے لیے گرجاگھر جایا کرتی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھی اپنی بیٹیوں کی نگرانی کرتی رہتیں، کیونکہ انہیں خوف ہوتا کہ دیوار کی دوسری طرف کے مرد انہیں پانی کے اندر ورغلا نہ لیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اس دوربین میں سے کوئی شخص اس سے زیادہ یا اس سے بہتر نظارہ نہ کر سکتا تھا جتنا عام سڑکوں پر ممکن تھا، لیکن ہر اتوار کو بہت سے گاہک اس دوربین سے جھک کر دیوار کے اُس طرف کے ممنوعہ پھل کی لذّت چکھنے آتے جس سے انہیں محروم کر دیا گیا تھا۔

فلورنتینو اریزا بھی وہاں جایا کرتا، مگر لذت اٹھانے سے زیادہ اکتاہٹ دور کرنے کی غرض سے۔ لائٹ ہاؤس کے محافظ سے اس کی دوستی کی وجہ یہ نہیں تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ فرمینا دازا کی جانب سے رد کر دیے جانے کے بعد، جب اس نے اس کا خلا پُر کرنے کی کوشش میں بہت سی مختلف محبتوں کے ہیجان میں خود کو مبتلا رکھا، اس زمانے میں صرف لائٹ ہاؤس میں گزرا ہوا وقت اس کا مسرورترین وقت ہوتا تھا، اور وہیں اسے اپنی بدنصیبیوں سے پناہ ملتی تھی۔ اسے یہ مقام سب سے زیادہ عزیز تھا، اس قدر کہ اس نے کئی سال تک اپنی ماں، اور اس کے بعد اپنے ماموں لیو ہفتم کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسے خریدنے میں اس کی مدد کریں۔ ان دنوں کیریبئین کے لائٹ ہاؤس نجی ملکیت میں ہوا کرتے تھے اور ان کے مالک جہازوں سے بندرگاہ میں داخلے کے لیے ان کے حجم کے مطابق محصول وصول کرتے تھے۔ فلورنتینو اریزا کے خیال میں یہ شاعری سے نفع کمانے کا واحد معزز طریقہ تھا لیکن اس سے نہ اس کی ماں کو اتفاق تھا اور نہ ماموں کو۔ جب تک وہ اپنے وسائل سے اس قابل ہوا کہ لائٹ ہاؤس خرید سکے، اس وقت تک سارے لائٹ ہاؤس ریاست کی ملکیت بن چکے تھے۔

لیکن اس کے یہ سارے خواب رائیگاں نہیں تھے۔ غرقاب جہاز کے قصّے اور لائٹ ہاؤس کی انوکھیوں نے فرمینا دازا کی فرقت کا احساس کم کرنے میں بہت مدد دی، اور اس وقت جب وہ اس کی سب سے کم توقع کر رہا تھا، اسے فرمینا دازا کی واپسی کی خبر ملی۔ درحقیقت ریوہاچا میں طویل قیام کے بعد لوریزو دازا نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ سمندر کے سفر کے لیے

مناسب ترین موسم نہیں تھا، اس لیے کہ دسمبر کی تجارتی ہوائیں چل رہی تھیں، اور وہ تاریخی جہاز جو اس موسم میں سمندر عبور کرنے کا خطرہ مول لینے والا واحد جہاز تھا مسلسل اس امکان کی زد میں تھا کہ تیز مخالف ہوائیں اسے دھکیل کر پھر اسی بندرگاہ میں پہنچا دیں جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اور یہی ہوا۔ فرمینا دازا نے پوری رات ایک کیبن میں، جو نہ صرف اپنی تنگی کی وجہ سے بلکہ اپنی طاعونی حبس اور شدید گرمی کے باعث کسی میخانے کے بیت الخلا سے مشابہ تھا، تختے پر پیٹیوں سے بندھے بندھے سبز الٹیاں کرتے ہوئے گزاری۔ جہاز اتنی بری طرح ہل رہا تھا کہ اسے کئی بار یہ خیال آیا کہ پیٹیاں زور سے کھل جائیں گی۔ عرشے پر لوگوں کے چیخنے چلانے اور گالیاں دینے کی آوازیں کبھی کبھار اس تک پہنچتیں تو ایسا لگتا کہ جہاز طوفان کا شکار ہو گیا ہے۔ برابر والے تختے پر اس کے باپ کے چیتے کی غراہٹ جیسے خراٹے اس کی دہشت کو اور بڑھا رہے تھے۔ تیس سال میں پہلی بار یہ ہوا کہ اس نے پوری رات جاگتے ہوئے گزاری اور ایک لمحے کے لیے بھی فلورنتینو اریزا کا خیال نہ آیا، جب کہ وہ دکان کے پچھلے کمرے میں اپنے جھولے میں لیٹا اس کی واپسی کے ابدی لمحات گن رہا تھا۔ صبح کے وقت ہوائیں اچانک تھم گئیں اور فرمینا دازا کو احساس ہوا کہ شاید نہایت خراب حالت کے باوجود اس کی آنکھ لگ گئی تھی، کیونکہ وہ لنگر کی زنجیروں کے شور سے جاگی۔ تب اس نے پیٹیاں کھولیں اور بندرگاہ کے ہجوم میں فلورنتینو اریزا کو دیکھنے کی امید میں عرشے پر گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے پام کے درختوں کے درمیان کسٹم کے شیڈ پر پڑتی ہوئی سورج کی پہلی کرنیں اور کھاڑی کے گلتے ہوئے تختے نظر آئے۔ جہاز ریوہاچا کی بندرگاہ پر کھڑا تھا جہاں سے گزشتہ رات روانہ ہوا تھا۔

دن کا باقی حصہ ایک واہمے کی سی کیفیت میں گزرا، وہ اسی مکان میں تھی جہاں کل تک مقیم تھی، انہیں رشتہ داروں سے مل رہی تھی جنہوں نے کل اسے الوداع کہا تھا، وہ زندگی کے ایک دن کو دوبارہ بسر کرنے پر حیرت زدہ تھی جسے وہ پہلے گزار چکی تھی۔ یہ تکرار اتنی مکمل تھی کہ فرمینا دازا پچھلی رات کی اذیت کے دوہرائے جانے کے خیال سے لرز اٹھی، کیونکہ صرف اس کی یاد ہی سے دہشت زدہ کرنے کو کافی تھی۔ لیکن اس سے گریز کا واحد طریقہ پہاڑی راستوں پر دو ہفتوں تک خچر کی پیٹھ پر سفر کرنا تھا جس کے لیے حالات اب اور زیادہ خطرناک ہو گئے تھے، کیونکہ کوسا کے اندیشی صوبے میں ایک نئی خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی جو تمام کریبئن علاقوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اور اس طرح رات آٹھ بجے شور مچاتے ہوئے رشتہ داروں کا وہی قافلہ اسے ایک بار پھر اسی بندرگاہ تک رخصت کرنے آیا، وہی الوداعی آنسو بہاتے اور جدا ہوتے وقت کے تحفوں کے اسی انبار سے کیبن کو لاد دیا جو کیبن میں کسی طرح نہ سماتا تھا۔ جب جہاز کی روانگی کا وقت آیا تو خاندان کے مردوں نے ہوا میں بندوقیں فائر کر کے الوداع کہا اور جواب میں عرشے پر کھڑے ہوئے لورینزو دازا نے اپنے ریوالور سے پانچ ہوائی فائر کیے۔ فرمینا دازا کا خوف رفتہ رفتہ زائل ہو گیا، کیونکہ ساری رات موافق ہوا چلتی رہی اور ہوا میں پھولوں کی ایسی خوشبو بسی رہی کہ وہ رات بھر حفاظتی پیٹیوں کے بغیر گہری نیند سوئی۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ فلورنتینو اریزا سے دوبارہ مل رہی ہے جس نے یہ مانوس چہرہ اتار پھینکا ہے کیونکہ وہ صرف ایک نقاب تھا لیکن نقاب کے

نیچے اس کا اصل چہرہ بھی ہوبہو ویسا ہی تھا۔ صبح کو وہ بہت سویرے جاگ اٹھی، اور اس خواب کے معنی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے اپنے باپ کو کپتان کے بار میں برانڈی ملی بھاری کافی پیتے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھ الکحل کے اثر سے مچی ہوئی تھی لیکن اس نے ان کی واپسی کے سفر کے بارے میں ذرا بھی بےیقینی کا اظہار نہ کیا۔

وہ بندرگاہ میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کا جہاز بڑے بازار کے قریب گودی میں لنگرانداز بادبانی جہازوں کی بھول بھلیوں کے درمیان خاموشی سے راستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا اور بازار سے اٹھنے والی بو سمندر میں میلوں دور تک پہنچ رہی تھی۔ صبح کی ہوا متواتر بوندا باندی سے بھری ہوئی تھی جس نے جلد ہی باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر لی۔ تارگھر کی بالکنی پر انتظار میں کھڑے فلورنتینو اریزا نے جہاز کو، جس کے بادبان بارش کی وجہ سے دل شکستہ لگ رہے تھے، لاس انیماس کی خلیج سے گزرتے اور بڑے بازار کی گودی میں لنگرانداز ہوتے دیکھ کر پہچان لیا۔ پچھلی صبح وہ گیارہ بجے تک انتظار میں کھڑا رہا تھا، اور تب اسے تار کے ذریعے مخالف ہواؤں کی خبر ملی تھی جنہوں نے جہاز کی آمد میں تاخیر کر دی تھی۔ مگر اس صبح چار بجے وہ دوبارہ بالکنی میں جا کھڑا ہوا۔ وہ اس لانچ پر نظر جمائے انتظار کرتا رہا جو ان مسافروں کو جہاز سے ساحل تک پہنچا رہی تھی جنہوں نے طوفان کے باوجود جہاز سے اترنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لانچ بیچ راستے میں خشکی میں پھنس گئی اور ان میں سے اکثر کو کیچڑ میں گرتے پڑتے پیدل ساحل تک آنا پڑا۔ جب جہاز کے باقی ماندہ مسافروں کا بارش رکنے کا انتظار بےسود رہا تو آٹھ بجے کمر کمر پانی میں کھڑے ایک سیاہ فام خدمتگار نے عرشے کے جنگلے سے فرمینا دازا کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور تیرا کر ساحل تک پہنچا دیا، لیکن اس وقت تک وہ اتنی شرابور ہو چکی تھی کہ فلورنتینو اریزا اسے پہچان نہ سکا۔

وہ خود بھی اس سے بےخبر نہ تھی کہ اس سفر کے دوران اس میں کس قدر پختگی آ چکی ہے۔ تاوقتیکہ وہ بند مکان میں داخل ہوئی، اور سیاہ فام خادمہ گالا پلاسیڈیا کے ساتھ مل کر جو ان کی واپسی کی خبر سن کر غلاموں کے محلے سے وہاں پہنچ گئی تھی، مکان کو دوبارہ رہنے کے قابل بنانے کے زبردست کام کا بیڑا اٹھایا۔ فرمینا دازا اب باپ کے لاڈپیار سے بگڑی ہوئی اور اس کی سخت گیری سے خوف زدہ اکلوتی بچی نہیں رہی تھی، بلکہ گرد و غبار اور مکڑی کے جالوں سے بھری اس سلطنت کی مالکہ تھی جسے اس کی سابقہ صورت پر بحال کرنا صرف ناقابل تسخیر محبت ہی کی قوت سے ممکن تھا۔ وہ اس سے خوف زدہ نہ ہوئی کیونکہ اسے اپنے اندر ایک سربلند حرارت محسوس ہو رہی تھی جس نے اسے دنیا کو ہلا دینے کے قابل کر دیا تھا۔ واپسی کے بعد پہلی ہی رات کو، جب وہ باورچی خانے کی بڑی میز پر بیٹھی گرم چاکلیٹ اور کیک کھا رہی تھی، اس کے باپ نے اسے گھر چلانے کا اختیار سونپ دیا اور اس نے یہ عمل ایک مذہبی رسم کی سی طمطراق کے ساتھ انجام دیا۔

"میں تمہاری زندگی کی کنجیاں تمہیں سونپ رہا ہوں" اس نے کہا۔

فرمینا دازا نے، جس کی عمر کے سترہ سال پورے ہو چکے تھے، مضبوط ہاتھوں اور صاف شعور کے ساتھ ان کنجیوں کو قبول کیا کہ اس کی حاصل کی ہوئی آزادی کا ایک ایک انچ محبت کے لیے وقف ہے۔ پریشان خوابوں پر مشتمل رات گزارنے کے بعد، اگلے روز اسے اپنی کھڑ

پر موجود ہونے کی ناخوشگواری کا پہلا احساس ہوا جب اس نے بالکنی کی کھڑکی کھولی اور دانس بوئنداپانڈی میں باغِ اناجیل، سربریدہ سورما کے مجسمے، اور پتھرکی اس بنچ پر نظر ڈالی جہاں فلورنتینو اریزا شاعری کی کتاب لیے بیٹھا رہا کرتا تھا۔ وہ اب اس کے ذہن میں دسترس سے باہر محبوب کے طور پر نہیں بلکہ ایک یقینی شوہر کی حیثیت سے آتا تھا جس سے وہ دل و جان سے وابستہ تھی۔ اسے اس وقت کہ بھاری بوجھ اپنے دل پر محسوس ہوا جو اس کی غیرموجودگی میں ضائع ہو گیا تھا، اسے محسوس ہوا کہ زندہ رہنا کس قدر دشوار ہے اور اسے خدا کے حکم کے مطابق اپنے مرد سے محبت کرنے کے لیے محبت کی کتنی زیادہ مقدار کی ضرورت ہو گی۔ باغ میں فلورنتینو اریزا کو نہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس سے پہلے وہ بارش کی پروا کیے بغیر وہاں آیا کرتا تھا۔ اسے اس پر بھی حیرت تھی کہ اسے فلورنتینو اریزا کی طرف سے کوئی اشارہ کوئی پیغام تک نہیں ملا تھا، اور وہ اچانک اس خیال سے لرز گئی کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو۔ لیکن اس نے اس نامبارک خیال کو فوراً ہی جھٹک دیا کیونکہ واپسی کی اطلاع دینے والے ٹیلیگراموں کے جوش وخروش میں ان دونوں کو یہ سوچنا یاد ہی نہیں رہا تھا کہ واپسی کے بعد وہ اپنا رابطہ کس طرح بحال کریں گے۔

درحقیقت فلورنتینو اریزا کو اس وقت تک یقین تھا کہ وہ واپس نہیں آئی ہے، جب تک کہ ریوہاچا کے ٹیلیگراف آپریٹر نے اس بات کی تصدیق نہ کر دی کہ وہ لوگ جمعے کے دن اسی جہاز پر سوار ہو گئے ہیں جس پر وہ پچھلے روز مخالف ہواؤں کے باعث نہیں پہنچ سکے تھے۔ دو دن تک وہ فرمینا دازا کے مکان میں زندگی کے آثار دیکھنے کے انتظار میں رہا اور بالآخر سوموار کو اس نے مکان کی کھڑکیوں میں ایک روشنی کو متحرک دیکھا جو مکان کے مختلف حصوں سے ہوتی ہوئی بالکنی والے کمرے میں جا کر ختم ہو گئی۔ وہ اس خوفناک متلی کا شکار ہو کر بہت سے دور تھا جس نے اس کی محبت کی پہلی راتوں میں ہیجان مچاتی تھی۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ ترانزیتو اریزا کی آنکھ کھلی تو وہ اس بات پر پریشان ہو گئی کہ ان کا بیٹا آدھی رات کو باہر صحن میں چلا گیا تھا اور اب تک واپس اندر نہیں آیا۔ اس نے فلورنتینو اریزا کو گھر میں نہ پایا۔ وہ صبح ہونے تک گھومتا، ساحلوں کی ہوا میں عشقیہ شعر بلند آواز سے پڑھتا اور مسرت سے روتا رہا۔ آٹھ بجے، تھکن سے بےحال، وہ کیفے کی محرابوں کے نیچے بیٹھا تھا، اور یہ سوچ رہا تھا کہ فرمینا دازا کو خوش آمدید کا پیغام کس طرح پہنچائے کہ اچانک دل ہلا دینے والے زلزلے کے جھٹکے سے تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔

یہ وہی تھی، کلیسا کے چوک سے گزرتی ہوئی، گالا پلاسیدیا کو ساتھ لیے جس نے خریداری کی غرض سے خالی ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں، اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسکول کی یونیفارم میں نہیں تھی۔ وہ سفر سے پہلے کے دنوں کی بہ نسبت زیادہ دراز قد، زیادہ نکھری ہوئی اور زیادہ سرگرم دکھائی دی۔ اس کا جسم بلوغت کی محتاط قدر کی وجہ سے زیادہ پاکیزہ ہو گیا تھا۔ اس کی چوٹی اور لمبی ہو گئی تھی لیکن اب اس نے اسے پشت پر لٹکائے رکھنے کی بجائے بل دے کر بائیں کاندھے پر ڈال رکھا تھا اور اس معمولی سی تبدیلی نے اس میں سے کم سنی کے تمام نشانات مٹا دیے تھے۔ فلورنتینو اریزا اپنی جگہ بیٹھا اپنے تصور کی اس دوشیزہ کو دم بخود تکتا رہا یہاں تک کہ وہ دائیں بائیں دیکھے بغیر چوک سے گزر

گئی۔ مگر اسی ناقابلِ مزاحمت قوت نے جس کے اثر سے وہ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا، اسے اس کے پیچھے پیچھے چل دینے پر مجبور کر دیا، جب وہ کلیسا کا موڑ مڑ کر بازار کے فرش کی ناہموار پتھریلی سلوں کے بہرا کر دینے والے شور میں گم ہو رہی تھی۔

وہ اس کو نظر آئے بغیر اس کا پیچھا کرنے لگا اور اس دوشیزہ کی روزمرّہ کی حرکات، تمکنت اور قبل از وقت پختگی کو دیکھتا رہا، جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا اور جسے پہلی بار اس کی فطری صورتِ حال میں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی خوش خرامی سے مسحور ہو گیا جس کی مدد سے وہ ہجوم میں راستا بنا رہی تھی، جبکہ گالا پلاسیدیا قدم قدم پر لوگوں سے ٹکراتی اور اپنی ٹوکریوں میں الجھتی آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے اسے دوڑنا پڑتا تھا۔ فرمینا دازا، اپنے ہی زماں و مکاں میں، سڑک کی بےترتیبی میں کسی سے ٹکرائے بغیر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ پھوپھی ایسکولاستیکا کے ساتھ بارہا بازار آ چکی تھی، لیکن وہ دونوں ہمیشہ چھوٹی موٹی خریداری کیا کرتیں، کیونکہ گھربار کا سارا سامان، نہ صرف فرنیچر اور کھانے پینے کی چیزیں بلکہ زنانہ کپڑے تک خریدنے کا کام لورینزو دازا نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ سو بازار کا یہ پہلا دورہ اس کے لیے ایک مسحورکن مہم کی طرح تھا جسے اس کے لڑکپن کے خوابوں نے بےحد پرکشش بنا دیا تھا۔

اس نے ابدی محبت کا شربت پیش کرنے والے سپیروں، اپنے رِستے ہوئے زخموں کو لیے دہلیزوں میں پڑے گداگروں کی التجاؤں یا سدھا ہوا گھڑیال اس کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کرنے والے نقلی انڈین پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے کسی طےشدہ منصوبے کے بغیر بازار کا ایک لمبا اور تفصیلی چکر لگایا اور راستے میں کسی وجہ کے بغیر، صرف اپنی مشغولیت سے لطف اٹھانے کے لیے جگہ جگہ رکتی گئی۔ وہ ہر اس دروازے میں داخل ہوئی جس کے اندر کوئی چیز فروخت ہو رہی تھی، اور ہر جگہ اسے کوئی نہ کوئی ایسی چیز نظر آتی رہی جس نے اس کی زندہ رہنے کی امنگ میں اضافہ کیا۔ اس نے بڑے بڑے صندوقوں میں رکھے کپڑوں کے تھانوں میں سے اٹھتی مہک کو شوق سے سونگھا، اس نے کڑھے ہوئے ریشمی کپڑے اپنے جسم پر لپیٹے، اس نے طلائی تار نامی دکان میں بالوں میں کنگھا اڑسے، پھولوں کی تصویروں سے مزین پنکھا ہاتھ میں لیے میڈرڈ کی عورت کا بھیس بدل کر، قدآدم آئینے میں خود کو دیکھا، اور اپنی ہنسی پر خود ہی ہنسنے لگی۔ کھانے پینے کی درآمدشدہ چیزوں کی دکان میں اس نے ہیرنگ مچھلی کے اچار کی برنی کا ڈھکنا اٹھایا تو اسے شمال مشرق کی راتیں یاد آ گئیں جب وہ سان حوان دلا سیناگا میں رہنے والی ننھی سی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی کانٹی کا ایک ساسیج پسند کیا جس میں ملیٹھی کا ذائقہ تھا، اور سنیچر کی ناشتے کے لیے دو ساسیج اور اس کے علاوہ مچھلی کے قتلے اور سرخ منقّا کا مرتبان بھی خرید لیا۔ مسالوں کی دکان میں اس نے ساج اور ناربو کے پتّوں کو صرف انہیں سونگھنے کے سادہ لطف کی خاطر اپنی ہتھیلیوں کے درمیان مسلا، اور مٹھی بھر لونگیں، اتنی ہی سونف اور تھوڑی سی خشک ادرک اور جونیپر خریدی، اور آنکھوں میں بےتحاشا ہنسی کے آنسو لیے دکان سے رخصت ہوئی کیونکہ پسی ہوئی تتیا مرچ کی دھانس سے اسے باربار چھینکیں آ رہی تھیں۔ فرانسیسی سامانِ آرائش کی دکان میں روئٹر صابن اور روغن بلسان خریدتے ہوئے اس کے کان کے پیچھے پیرس کا تازہ ترین عطر

ذرا سا لگا دیا گیا اور تمباکونوشی کے بعد سانس کو معطر کرنے والی ٹکیا دی گئی۔

یہ درست ہے کہ وہ خریداری کا کھیل کر رہی تھی، لیکن جو چیزیں اسے واقعی درکار تھیں، وہ بلاجھجکے خریدتی گئی اور اس کا انداز اس قدر پُراعتماد تھا کہ کسی کو یہ شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ پہلی بار خریداری کے لیے نکلی ہے، کیوں کہ اسے احساس تھا کہ اس کی خریداری صرف اپنے لیے نہیں بلکہ فلورنتینو اریزا کے لیے بھی ہے۔ ان دونوں کی عمر کے لیے بارہ گز لنن، شادی کے بستر کی چادروں کے لیے سوتی کپڑا جو صبح ہونے تک ان دونوں کے جسموں کی نمی سے گیلا ہو چکا ہو گا، محبت کے گھر میں ان دونوں کے مشاغل کے لیے ہر عمدہ مربی چیز۔ اس نے بھاؤ تاؤ کیا اور دام کم کرائے۔ اس نے وقار اور تمکنت کے ساتھ جرح کی اور بہترین چیزیں چنیں، اور ان کی قیمت سونے کے سکوں میں ادا کی جنھیں دکان دار نے صرف ان کی کھنک کا لطف لینے کے لیے سنگی کاؤنٹر پر بجا کر سنا۔

فلورنتینو اریزا ایک استعجاب کے عالم میں چوری چھپے اسے تکتا رہا، سانس روکے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا، کئی بار وہ خادمہ کی ٹوکریوں میں الجھ کر لڑکھڑایا، جس نے اس کی معذرتوں کا مسکراہٹ سے جواب دیا، اور اگر فرمینا ڈازا نے اسے نہ دیکھا تو اس لیے نہیں کہ اسے موقع نہیں ملا بلکہ اپنے چلنے کے پرغرور انداز کے باعث اسے نہیں دیکھ پائی۔ اسے وہ اتنی حسین، اتنی ترغیب انگیز، عام لوگوں سے اتنی مختلف لگ رہی تھی کہ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ پتھریلی سڑکوں پر اس کی ایڑیوں کی آواز کسی اور کو کیوں نہیں چونکاتی، اس کے دامن کی لرزش سے اٹھنے والی ہوا ہر کسی کو دیوانہ کیوں نہیں کر دیتی۔ اس کی چوٹی کے لہرانے سے، اس کی باہوں کی حرکت سے اور اس کی ہنسی کے خالص سونے سے ہر کوئی بوکھلا کیوں نہیں جاتا۔ فرمینا ڈازا کے جسم کی ایک حرکت، اس کے مزاج کی ایک جھلک بھی اس کی نظر سے نہیں بچی تھی، لیکن اس نے اس خوف سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہ کی کہ کہیں یہ سحر ٹوٹ نہ جائے۔ لیکن جب وہ منشیوں کے چوک کے بےپناہ شور میں داخل ہوئی تو فلورنتینو اریزا کو خیال آیا کہ وہ موقع جس کے لیے وہ برسوں سے بےتاب رہا ہے کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

فرمینا ڈازا کا اپنے اسکول کی دیگر طالبات کی طرح یہ خیال تھا کہ منشیوں کا چوک ایک ایسی منحوس جگہ ہے جہاں باعزت نوجوان خواتین کے جانے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دراصل ایک چھوٹے سے چوک کے کنارے ایک محراب دار گیلری تھی جہاں سواری اور باربرداری کے لیے گدھاگاڑیاں کرائے پر ملتی تھیں اور جہاں عام خرید‌وفروخت زیادہ پُرشور اور پرہجوم ہو جاتی تھی۔ یہ نام نوآبادیاتی دور کی یادگار تھا جب واسکٹوں اور نقلی کفوں میں ملبوس کم گو منشیوں نے یہاں بیٹھنا شروع کیا، اور بہت قلیل معاوضے پر ہر قسم کی دستاویزات تحریر کرنے کا کام کرنے لگے۔ ان دستاویزات میں استغاثے کی عرضیاں، قانونی شہادتیں، مبارک باد یا تعزیت کے خطوط، معاشقے کے مختلف مرحلوں کے مطابق محبت نامے سبھی کچھ شامل تھا۔ اس بازار کی خراب شہرت کی وجہ، بلاشبہ، یہ لوگ نہیں تھے، بلکہ بعد میں آنے والے وہ دست فروش تھے جو یورپی جہازوں سے اسمگل کیا ہوا ہر قسم کا قابل اعتراض سامان غیرقانونی طور پر فروخت کرتے تھے، جس میں فحش پوسٹ کارڈوں اور طلا

کی مرہموں سے لے کر کتالونیا کے مشہور کنڈوم تک شامل تھے جو یا تو اگوانا کی کلغی سے مزین ہوتے تھے جو موقعے کی ضرورت کے مطابق لہرانے لگتی تھی، یا پھر ان کے سروں پر پھول سلے ہوتے تھے جو استعمال کرنے والے کی خواہش پر اپنی پنکھڑیاں کھول دیتے تھے۔ فرمینا ڈازا جو بازار کے آداب سے قدرے ناآشنا تھی، گیارہ بجے کی دھوپ سے پناہ حاصل کرنے کے لیے، یہ جانے بغیر کہ کہاں جا رہی ہے، اس گلی میں داخل ہو گئی۔

وہ شوروغل کے اس سمندر میں ڈوبتی چلی گئی جو جوتے چمکانے والے چھوکروں اور پرندے فروخت کرنے والوں، سستی کتابیں بیچنے والوں اور جن بھوت کا علاج کرنے والے دیسی معالجوں، اور مٹھائی بیچنے والوں کی صداؤں سے پُر تھا۔ لیکن اس ہنگامے سے بےنیاز وہ ایک کاغذفروش کو دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر جم کر رہ گئی جو جادوئی روشنائیوں کی کرامات کا مظاہرہ کر رہا تھا: خون کا تاثر دیتی ہوئی سرخ روشنائی، موت کی خبر دینے والی ماتمی روشنائی، اندھیرے میں نظر آنے والی چمک دار روشنائی، نظر نہ آنے والی روشنائی جو روشنی کے سامنے لائے جانے پر اجاگر ہو جاتی تھی۔ وہ یہ ساری روشنائیاں خریدنا چاہتی تھی تاکہ فلورنتینو اریزا کو اپنی زندہ دلی سے محظوظ اور حیران کر دے، لیکن کئی روشنائیاں آزمانے کے بعد اس نے سنہری روشنائی کی شیشی کا انتخاب کیا۔ پھر وہ چاکلیٹ فروخت کرنے والی کے پاس پہنچی جو بڑے بڑے مرتبانوں کے پیچھے بیٹھی تھی اور مختلف مرتبانوں کی طرف انگلی سے اشارہ کر کر کے، کیوں کہ وہ اپنی آواز اس بےپناہ شور سے بلند نہ کر سکتی تھی، ہر قسم کی چھ چھ مٹھائیاں خریدیں اور انھیں نہایت وقار کے ساتھ خادمہ کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ وہ شیرے پر بھنبھناتی مکھیوں، متواتر شوروغل اور بےپناہ گرمی میں تیرتے سڑی ہوئی مٹھائیوں کے بخارات سے بالکل بےپروا تھی۔ اس سحر سے وہ اس وقت چونکی جب رنگ دار کپڑا سر پر باندھے ایک خوش طبع فربہ اندام اور پُرکشش سیاہ فام عورت نے قسائی کے چاقو کی نوک پر اٹکی ہوئی اناناس کی ایک مثلث قاش اسے پیش کی۔ اس نے اسے قبول کر کے منہ میں ڈال لیا۔ اس کا ذائقہ چکھا اور اسے کھاتے ہوئے، ہجوم میں ادھر ادھر نظر ڈالنے لگی اور ایک اچانک صدمے سے بےحس وحرکت ہو گئی۔ اس کی پشت پر، اس کے کان کے اس قدر قریب کہ صرف اسے سنائی دے، فلورنتینو اریزا کی آواز آئی:

"تاج دار دیوی کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

وہ پیچھے مڑی اور اپنی آنکھوں سے بالشت بھر کے فاصلے پر ان سرد آنکھوں، اس بےرنگ چہرے اور خوف سے پتھر بنے ہوئے ان ہونٹوں کو اسی طرح دیکھا جیسے اس نے پہلی اتنے ہی قریب سے گرجاگھر میں نصف شب کی عبادت کے ہجوم میں دیکھا تھا، لیکن اس بار اسے محبت کے ہیجان کے بجائے مایوسی کی گہری کھائی کی دہشت محسوس ہوئی۔ ایک ہی لمحے میں اس کی غلطی کی بھیانک وسعت اس پر آشکار ہو گئی، اور اس نے ہیبت زدہ ہو کر خود سے سوال کیا کہ آخر کس طرح ایک لایعنی خیال اتنے طویل عرصے تک اور اتنی شدت سے اس کے دل میں بسا رہا۔ وہ صرف اس قدر سوچ سکی: اوہ میرے خدا! یہ بےچارہ! فلورنتینو اریزا نے مسکرا کر کچھ کہنا چاہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کی لیکن فرمینا ڈازا نے اپنے ہاتھ کی ایک تیز حرکت سے اسے اپنی زندگی سے محو کر دیا۔

"نہیں" وہ اس سے بولی، "بس! بھول جاؤ۔"

اسی سہ پہر کو جب اس کا باپ قیلولہ کر رہا تھا، اس نے گالا پلاسیڈیا کے ہاتھ دو سطروں کا خط فورنتینو اریزا کو بھیجا: "آج جب میں نے تمہیں دیکھا تو احساس ہوا کہ ہمارے درمیان جو کچھ ہے وہ کسی سراب سے زیادہ نہیں۔" خادمہ نے اسے تمام ٹیلیگرام، تمام شعر اور کمیلیا کے خشک پھول لوٹا دیے اور اس سے فرمینا دارا کے تمام خط اور تحفے: پھوپھی ایسکولاسٹیکا کی دینی کتاب، اس کے باغیچے کی سوکھی ہوئی پتیاں، سینٹ پیٹر کلیویر کی عبا کا ٹکڑا، ولیوں کے تمغے اور اسکول یونیفارم کے ربن میں بندھی اس کے پندرھویں سال کی چوٹی واپس کرنے کو کہا۔ اس کے بعد کے دنوں میں، فورنتینو اریزا نے، جو دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا، اسے بےشمار بےتابانہ خطوط لکھے اور خادمہ سے انہیں فرمینا دارا تک لے جانے کی استدعا کی جس نے فرمینا دارا کی ہدایات کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے اس کے دیے ہوئے پرانے تحفوں کے علاوہ کوئی چیز لے جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے اتنی شدومد سے تقاضا کیا کہ فلورنتینو اریزا کو ساری چیزیں واپس دیتے ہی بنی، لیکن اس نے وہ سیاہ چوٹی نہیں لوٹائی اور کہا کہ یہ وہ خود فرمینا دارا کو واپس کرے گا اگر وہ چند لمحوں کے لیے مل سکیں۔ فرمینا دارا نے انکار کر دیا۔ ترانسیتو اریزا نے کسی ایسے فیصلے سے خوفزدہ ہو کر، جو اس کے بیٹے کے لیے مہلک ثابت ہو، اپنی انا کو بالائےطاق رکھا اور فرمینا دارا سے پانچ منٹ کی ایک ملاقات کی درخواست کی، اور فرمینا دارا اپنے گھر کے دروازے میں کھڑے کھڑے اس سے ملی۔ اسے اندر آنے یا بیٹھنے کو نہیں کہا، اور پسیجنے کا شائبہ تک ظاہر نہ ہونے دیا۔ اپنی ماں سے دو دن بحث کرنے کے بعد فلورنتینو اریزا نے اپنے کمرے کی دیوار سے رنگین شیشے کا وہ بکس اتار لیا جس میں اس نے فرمینا دارا کی چوٹی کو کسی مقدس یادگار کی طرح سجا رکھا تھا، اور ترانسیتو اریزا اسے سنہری بیل بوٹوں والے اسی مخملی ڈبے میں رکھ کر فرمینا دارا کو واپس دے آئی۔ فلورنتینو اریزا کو فرمینا دارا سے ملنے یا بات کرنے کا دونوں کی طویل زندگیوں کے دوران بارہا ایک دوسرے کے سامنے آنے کے باوجود، کوئی موقع نہ ملا، تاوقتیکہ اس نے اکیاون برس نو ماہ اور چار دن بعد، اس کی بیوگی کی پہلی رات کو اپنی ابدی وفاداری اور دوامی محبت کا عہد ایک بار پھر دوہرایا۔

انتخاب کا یہ حصہ مارکیز کی ایک تقریر اور ایک مضمون پر مشتمل ہے۔

مارکیز کو ۱۹۸۲ میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔ "لاطینی امریکا کی تنہائی" اس تقریر کا متن ہے جو مارکیز نے ۱۰ دسمبر ۱۹۸۲ کو اسٹاک ہولم میں نوبیل انعام کی تقریب میں کی تھی۔ یہ تقریر مارکیز کے ادبی خیالات کی نہایت خوبی سے وضاحت کرتی ہے۔ انگریزی زبان میں یہ متن برطانیہ کے سہ ماہی ادبی جریدے Granta کے شمارہ ۹ میں شائع ہوا تھا۔

"کولومبیا کا مستقبل" مارکیز کا ایک صحافیانہ مضمون ہے جو نہ صرف اس لیے اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے کہ یہ اپنے اردگرد کے حالات کے بارے میں ایک بڑے ادیب کا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ پاکستان کے پڑھنے والے کولومبیا کے معاشرے کی بہت سی چیزوں کو بہت مانوس پائیں گے۔ یہ مضمون Granta کے شمارہ ۳۱ (بہار ۱۹۹۰) سے لیا گیا ہے۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: اجمل کمال

لاطینی امریکا کی تنہائی

فلورنس کے جہازراں انتونیو پیگافیتا (Antonio Pigafetta) نے، جو دنیا کے گرد پہلے بحری سفر میں ماگیلانیس (Magallanes) کا ساتھی تھا، ہمارے جنوبی امریکا کے اپنے سفر کی روداد تحریر کی جو انتہائی حقیقی تفصیلات پر مبنی ہونے کے باوجود فینٹسی کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے۔ اس میں وہ بتاتا ہے کہ اس نے ایسے سؤر دیکھے جن کی ناف پشتوں پر تھی، ایسے پرندے دیکھے جن کی ٹانگیں غائب تھیں اور جن کی مادائیں نروں کی پیٹھ پر انڈے دیتی تھیں، بعض پرندے پیلیکن سے مشابہ تھے مگر ان کی زبان نہیں تھی اور چونچ کی شکل چمچے کی طرح کی تھی۔ وہ ایک ایسی مخلوق کو دیکھنے کا تذکرہ کرتا ہے جو خچر کے سر اور کان، اونٹ کا دھڑ، ہرن کی ٹانگیں اور گھوڑے کی ہنہناہٹ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح پاٹاگونیا میں پہلی بار کسی مقامی سے سامنا ہونے پر انھوں نے آئینہ اس کے مقابل کر دیا تھا، جس پر وہ مشتعل دیوزاد اپنے عکس کی دہشت کے روبرو ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

پیگافیتا کی مختصر اور مسحورکن کتاب، جس میں اس زمانے میں بھی ہمارے آج کل کے ناولوں کے بیج موجود ہیں، ہماری اس دور کی حقیقت کا سب سے حیرت انگیز بیان ہرگز نہیں ہے۔ انڈیز کے وقائع نگاروں نے ہمارے لیے بےشمار اور ایسے بیانیے چھوڑے ہیں۔ ایلدورادو (Eldorado)، ہماری گریزپا سرزمین، جو بےاندازہ جستجو کا ہدف رہی ہے، بےشمار برسوں تک متعدد نقشوں میں، نقشہ سازوں کے تخیل کے زیراثر مختلف مقامات پر، مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی رہی ہے۔ ابدی شباب کے چشمے کی تلاش میں، دیومالائی الوار نونیز کابیزا دے واکا (Alvar Nunez Cabeza de Vaca) آٹھ برس تک شمالی میکسیکو کی خاک چھانتا پھرا، اور عام

خیالی کی اس مہم کے دوران اس میں شامل افراد ایک دوسرے کو مار مار کر کھاتے رہے، اور روانہ ہونے والے چھ سو میں سے صرف پانچ زندہ لوٹ سکے۔ حل نہ ہو پانے والے لاتعداد معمّوں میں سے ایک، گیارہ ہزار خچروں کا وہ قافلہ بھی ہے جو اتاہوالپا(Atahualpa) کا تاوان لے کر ایک روز کزکو سے یوں روانہ ہوا تھا کہ ہر خچر پر ایک ہزار پونڈ سونا لدا ہوا تھا، اور جو کبھی اپنی منزل پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد کے زمانے میں کارتاجینا دے آندیناز میں فروخت ہونے والی دریا کے خشک ہونے سے نکلی زمین پر پالی گئی مرغیوں کے سنگدانوں میں سے سونے کے ریزے برآمد ہوا کرتے تھے۔ اپنے مؤسّس آباؤاجداد کی اس سنہری ہذیان کا عذاب ہم ماضی قریب تک اٹھاتے رہے ہیں۔ پچھلی ہی صدی میں ایک جرمن مشن، جسے دو سمندروں کے درمیان واقع حاکمانے پناما کی پوری چوڑائی پر ریل کی پٹری بچھانے کے امکانات کا جائزہ لینے کا کام سونپا گیا تھا، اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ منصوبہ قابلِ عمل ہے بشرطیکہ پٹریاں لوہے کی بجائے، جو اس علاقے میں کمیاب تھا، سونے کی بنائی جائیں۔

ہسپانوی تسلط سے ہماری آزادی بھی ہمیں دیوانگی کی رسائی سے باہر نہ لے جا سکی۔ جنرل انتونیو لوپیز دسانتانا(General Antonio Lopez de Santana) نے، جو تین بار میکسیکو کا حکمران رہا، اس جنگ میں جسے "پیسٹریوں کی جنگ" کہا جاتا ہے، اپنی دائیں ٹانگ کھوا بیٹھنے پر اس کی تدفین کی عالیشان رسوم ادا کیں۔ جنرل گابریئل گارسیا مورینو(General Gabriel Garcia Moreno) نے ایکوڈور پر مطلق العنان بادشاہ کے طور پر سولہ سال تک حکمرانی کی تھی؛ فوجی وردی میں ملبوس اور تمغوں سے آراستہ اس کی لاش نے، صدارتی کرسی پر متمکن ہو کر باقاعدہ اپنی آخری رسوم میں شرکت کی۔ جنرل ماکسی میلیانو ایرنانڈیز مارتینز(General Maximiliano Hernandez Martinez) نے، جو ایل سلوادور کا تھیوسوفیکل ڈکٹیٹر تھا، اور جس نے ایک بہیمانہ قتلِ عام میں تیس ہزار کسانوں کو تہِ تیغ کروا دیا تھا اپنی غذا میں زہر کا پتا چلانے کے واسطے ایک پنڈولم ایجاد کیا، اور قرمزی بخار کی ایک وبا کی مدافعت کرنے کی غرض سے گلی کے لیمپوں کو سرخ کاغذ سے ڈھکوا دیا۔ تگوسی گالپا کے مرکزی چوک میں ایستادہ جنرل فرانسسکو مورازان(Francisco Morazan) کا مجسمہ درحقیقت مارشل نے(Martial Ney) کا مجسمہ ہے، جسے پیرس میں استعمال شدہ مجسموں کے ایک گودام سے خریدا گیا تھا۔

گیارہ سال پہلے ہمارے زمانے کے ایک ممتازترین شاعر، چلی کے پابلو نیرودا(Pablo Neruda) نے، اسٹوک ہولم کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر یوروپ کے خوش خیال، اور بعض بداندیش، لوگ لاطینی امریکا سے زوراَوری قوت سے اٹھنے والی عجیب غیرزمینی خوش خبریوں کی زد میں رہے ہیں، لاطینی امریکا، آسیب زدہ مردوں اور تاریخ ساز عورتوں کی بےحدوبےنہایت سرزمین، جن کی بےپایاں استقامت افسانوی دھند میں گم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہمیں ایک لمحے کا آرام بھی نصیب نہیں ہوا۔ ایک مصور، شیدا، پرومیتھیئن صدر اپنے جلتے ہوئے محل میں ایک پوری فوج کی یلغار کا مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوا، اور دو مشتبہ ہوائی

حادثوں نے، جو آج تک وضاحت طلب ہیں، ایک اور وسیع القلب صدر، اور اپنے عوام کا وقار بحال کرنے والے ایک جمہوری سپاہی کی جانیں لیں۔ پابلو نیرودا کی اس دورے سے لے کر اب تک پانچ جنگیں اور سترہ فوجی بغاوتیں ہو چکی ہیں؛ ایک شیطانی ڈکٹیٹر نمودار ہو چکا ہے جو، خدا کے نام پر، ہمارے زمانے کے پہلے نسلی قتلِ عام میں مصروف ہے۔ اسی عرصے میں دو کروڑ لاطینی امریکی بچے ایک برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے موت کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ تعداد اس عرصے میں یوروپ بھر میں پیدا ہونے والے بچوں کی کل تعداد سے زیادہ ہے۔ "غائب ہو جانے والے"، یعنی وہ جو جبر کا شکار بن کر معدوم ہو گئے، تعداد میں تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے (سویڈن کے شہر) اُپسلا کے تمام باشندے اپنا نام ونشان چھوڑے بغیر مفقودالخبر ہو جائیں، اور کوئی ان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ گرفتار کی جانے والی بہت سی حاملہ عورتوں نے ارجنٹینا کی جیلوں میں بچوں کو جنم دیا ہے، لیکن ان بچوں کا پتا نشان کوئی نہیں جانتا، جنہیں چوری چھپے گود لینے والوں کے پاس یا یتیم خانوں میں بھیج دیا گیا۔ کم وبیش دو لاکھ عورتیں اور مرد اس لیے لڑتے ہوئے مارے گئے ہیں کہ وہ اپنی دنیا کو کسی تبدیلی کے بغیر جاری رہتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، اور ایک لاکھ سے زیادہ لوگ وسطی امریکا کے تین چھوٹے اور بدقسمت ملکوں، نکاراگوا، ایل سلوادور اور گواٹے مالا میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اگر یہ واقعات ریاستہائے متحدہ میں پیش آئے ہوتے تو ان سے تناسب رکھنے والی تعداد سولہ لاکھ پُرتشدد اموات پر مشتمل ہوتی۔

مہمان نوازی کی روایات رکھنے والے ملک چلی سے دس لاکھ افراد، جو اس کی کل آبادی کے دسویں حصے کے برابر ہیں، جان بچا کر فرار ہو چکے ہیں۔ یوروگوئے میں، جو پچیس لاکھ باشندوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے جو خود کو پورے براعظم پر سب سے زیادہ مہذّب خیال کرتے ہیں، ہر پانچ میں سے ایک شخص جلاوطنی میں ہے۔ ۱۹۷۹ سے اب تک ایل سلوادور میں ہونے والی خانہ جنگی تقریباً ہر بیس منٹ پر ایک شخص کو پناہ گزیں بنا رہی ہے۔ لاطینی امریکا کے جلاوطنی، اور ترکِ وطن پر مجبور کر دیے جانے والے، لوگوں پر مشتمل ایک ملک بنایا جا سکے تو اس کی آبادی ناروے کی آبادی سے زیادہ ہو گی۔

میں یہ سوچنے کی جسارت کرتا ہوں کہ یہ بہت ناک حقیقت، نہ کہ ادب میں اس کا اظہار، وہ شے ہے جو سویڈش اکیڈمی آف لیٹرز کی توجہ کی مستحق ہوئی ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو کاغذی نہیں بلکہ ہمارے اندر رہتی بستی ہے، اور جو ہر لمحے ہماری بےشمار روزانہ اموات پر منتج ہو رہی ہے، جو ایک سیر نہ ہونے والی خلاقیت کے منبع کو شاداب رکھتی ہے جو درد اور خوشی سے معمور ہے، اور یہ آوارہ گرد اور یادوں کا اسیر کولومبیئن جس کا محض ایک ذرّہ ہے جسے تقدیر نے چُن لیا ہے۔ شاعر اور گداگر، موسیقار اور پیغامبر، جنگ باز اور بدمعاش — اس بےلگام حقیقت کی تمام مخلوقات — ہم سب کو تخیّل کے در پر کم ہی صدا لگانی پڑی ہے کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ تو ایسے پابند اظہار یا ذریعے کی تلاش کا رہا ہے جو ہماری زندگیوں کی حقیقت کو قابلِ یقین بنانے میں ہماری مدد کر سکے۔ یہی، میرے

دوستو، ہماری تنہائی کا عقدہ ہے۔

اور جب اس مسئلے سے نبردآزما ہو کر خود ہم تمام دست ہو جاتے ہیں، تو یہ بات قابل فہم ہے کہ دنیا کے اس حصے کی عقلی صلاحیتیں، جو اپنی تہذیبوں کے انہماک میں سرفراز ہیں، ہماری شرح کرنے کا کوئی موزوں طریقہ نہ پا سکیں۔ یہ محض فطری بات ہو گی کہ وہ ہمیں جانچنے کے لیے بھی وہی پیمانہ اختیار کریں جو وہ خود اپنے لیے استعمال کرتی ہیں، اس بات کو فراموش کر کے کہ زندگی کی غارت گری سب کے لیے یکساں نہیں ہوتی، اور اس بات کو بھی کہ شناخت کی جستجو ہمارے لیے بھی اتنی ہی دشوار اور خون آلود ہے، جتنی خود ان کے لیے رہ چکی ہے۔ اجنبی اصطلاحات میں ہماری شرح کرنا ہمیں اور زیادہ نامعلوم، ہماری آزادی کو اور زیادہ محدود اور ہمیں اور زیادہ تنہا کر دیتا ہے۔ قابل احترام یوروپ زیادہ بالادراک ہوتا اگر وہ ہمیں خود اپنے ماضی میں دیکھنے کی کوشش کرتا، یہ یاد کرتا کہ لندن شہر کو اپنی پہلی فصیل بنانے میں تین سو برس لگے تھے، اور تین سو برس اور اسے اپنا پہلا بشپ میسر آنے میں، اور یہ کہ روم کو بیس صدیوں تک بے یقینی کی تاریکی میں بھٹکنا پڑا تھا، اس سے پیشتر کہ ایک ایٹرسکی بادشاہ اسے تاریخ کے ساحل پر لنگرانداز کر دیتا اور یہ کہ آج کے امن پسند سوئس، جو اپنے ملائم پنیروں اور مضبوط گھڑیوں سے ہماری تواضع کرتے ہیں، سولھویں صدی تک تقدیر کے سپاہیوں کی حیثیت میں یوروپ کو لہولہان کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ نشاۃ الثانیہ کے اوج پر شاہی افواج کے تنخواہ دار بارہ ہزار کرائے کے سپاہیوں نے روم کو تاخت وتاراج کیا اور اس کے آٹھ ہزار باشندوں کو تہ تیغ کیا۔

میں تونیو کروگر (Tonio Kröger) کے تصورات کی تجسیم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، جس کی پاکیزہ شمال اور جذباتی جنوب کو یکجا کرنے کی خواب کو ترپن سال قبل اسی اسٹوک ہوم میں ٹوماس مان (Thomas Mann) کی توصیف حاصل ہوئی تھی۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ یوروپ کے وہ صاحب نظر افراد جو زیادہ منصفانہ اور زیادہ انسانی دنیا کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، ہم پر نظر ڈالنے کے انداز پر نظرثانی کر کے ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ محض ہمارے خوابوں سے یک جہتی ہمارے تنہائی کے احساس کو کم نہیں کر سکتی، تاوقتیکہ اس یک جہتی کا اظہار ان لوگوں کی جائز عملی امداد کے ذریعے نہ ہو جنھیں اس کی سب سے زیادہ طلب ہے، وہ جو اس تصور پر اب بھی یقین رکھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اس دنیا سے منصفانہ حصہ پا کر یہیں زندگی سے لطف اندوز ہونے کے اہل ہوں گے۔

نہ لاطینی امریکہ کی یہ خواہش ہے، اور نہ اس کا کوئی جواز ہے کہ وہ اپنی مرضی سے محروم ایک مہرہ بنا رہے۔ اور یہ محض امیدپرستی نہیں کہ لاطینی امریکہ کی آزادی اور خلاقیت کی جستجو مغرب کی امنگ بن جائے۔ لیکن وہ تمام بحری مہمات، جنھوں نے ایک طرف ہمارے امریکہ کا یوروپ سے فاصلہ کم کر دیا ہے، دوسری طرف ہماری تہذیبی دورافتادگی میں اضافے کی باعث بھی بنی ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ وہ خلاقیت جو ادب کے میدان میں ہمیں اتنی سہولت سے عطا کر دی جاتی ہے، اسی خلاقیت سے سماجی تبدیلی کے لیے ہماری دشوار جدوجہد کو

معاملے میں ہمیں نہایت بےاعتباری کے ساتھ محروم رکھا جاتا ہے؟ یہ کیوں سوچا جاتا ہے کہ یوروپ کے ترقی پسند باشندوں کی اپنے اپنے ملک میں سماجی انصاف کی جستجو، اور لاطینی امریکیوں کی، مختلف حالات میں، مختلف ذرائع سے کی جانے والی کوششوں کی منزل ایک نہیں ہو سکتی؟ نہیں، ہماری تاریخ کا بےپناہ تشدد اور درد قدیم نابرابریوں اور بےشمار تلخیوں کا نتیجہ ہے ہمارے گھر سے تین ہزار فرسنگ دور کی جانے والی کسی سازش کا نہیں۔ لیکن بہت سے یوروپی رہنماؤں اور مفکروں نے یہی مان لیا ہے، کسی بوڑھے کی اس بچپنے کے ساتھ جو اپنی جوانی کی کارگزاریوں کو فراموش کر چکا ہو، گویا دنیا کے دو بڑے مالکوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے والی تقدیر کے سوا کسی اور تقدیر کے ساتھ زندہ رہنا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ، میرے دوستو، ہماری تنہائی کا پیمانہ ہے۔

اس کے باوجود، جبر، لوٹ مار اور ترک شدگی کے مقابل، ہم زندگی سے کلام کرتے ہیں۔ سیلاب اور وبائیں، قحط اور آفتیں، یہاں تک کہ صدیوں تک چلنے والی ابدی جنگ بھی زندگی کو اس فوقیت سے محروم نہیں کر سکی ہے جو اسے موت پر حاصل ہے۔ ایک فوقیت جو روز بروز فروں‌تر اور تیزتر ہوتی جاتی ہے؛ ہر برس اموات سے سات کروڑ زیادہ پیدائشیں ہوتی ہیں، یعنی ہر سال نیویارک کی کل آبادی کے سات گنا کے برابر۔ ان میں زیادہ تر پیدائشیں ان ملکوں میں ہوتی ہیں جن کے پاس سب سے کم وسائل ہیں، جن میں لاطینی امریکہ کے ملک بھی شامل ہیں۔ اس کے برخلاف، خوشحال ترین ملکوں نے تباہی کی اتنی طاقت جمع کر لی ہے جو نہ صرف ان انسانوں کو جو آج تک پیدا ہوئے، بلکہ ان تمام جانداروں کو جنھوں نے اس بدقسمت سیارے پر کبھی سانس لیا نیست و نابود کرنے کو کافی ہے۔

آج ہی کی طرح کے ایک دن، میرے استاد ولیم فاکنر (William Faulkner) نے کہا تھا "میں انسان کے خاتمے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔" میں خود کو اس مقام پر کھڑے ہونے کا مستحق نہ گردانتا، جو اس کا مقام ہے، اگر میں اس بات سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہوتا کہ وہ بےپناہ المیہ جسے تسلیم کرنے سے اس نے بتیس برس قبل انکار کیا تھا، آج، انسانیت کے آغاز سے اب تک پہلی بار محض ایک سادہ سائنسی امکان بن کر رہ گیا ہے۔ اس پرہیبت حقیقت کے مقابل، جسے تمام انسانی زمانوں میں ایک یوٹوپیا کی حیثیت حاصل رہی ہو گی، ہم کہانیوں کے موجد جن کے نزدیک ہر بات قابل یقین ہے، اس بات پر یقین کرنے کے بھی پوری طرح حق دار ہیں کہ ایک بالکل دوسری قسم کے یوٹوپیا کی تخلیق میں خود کو منہمک کر دینے کا وقت ابھی ہاتھ سے نہیں گیا۔ زندگی کا ایک نیا اور ہمہ گیر یوٹوپیا، جہاں کسی کو دوسروں کی موت کے حالات کا تعین کرنے کا اختیار نہیں ہو گا جہاں محبت سچی اور خوشی ممکن ہو گی، اور جہاں سو سال کی تنہائی کی سزا بھگتنے والی نسلوں کو آخرکار اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اس زمین پر ایک اور موقع دیا جائے گا۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ : اجمل کمال

کولمبیا کا مستقبل

اکتوبر ۱۹۸۹ میں اخبارات نے کولمبیا کا ایک انتہائی احتیاط سے چھپایا جانے والا راز فاش کر دیا: یہ کہ ایک سال سے زیادہ عرصے سے حکومت کولمبیا کے معتمد نمائندے ملک کے منشیات کے تاجروں کے معتمد نمائندوں کے ساتھ باضابطہ مذاکرات میں مشغول رہے ہیں۔ جب حکومت نے اس اطلاع کی تردید کی تو منشیات کے تاجروں نے اس کی تصدیق کر دی، اور نتیجتاً حکومت کو ہچکچاتے ہوئے اس کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس بارے میں مزید کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس کے بعد بھی کوئی وضاحت سامنے نہیں آئی ہے، اور انجام کار عبارات کی اس اطلاع سے صرف ایک انکشاف ہوا ہے: منشیات کی اس جنگ کے خدوخال کا انکشاف جو خود کو بےرحم انداز میں دوہراتی رہی ہے، اور جس کے تھمنے کا کوئی امکان نہیں۔

مذاکرات کی پہلی معلوم کوشش مئی ۱۹۸۴ میں پناما میں کی گئی، جب منشیات کے نمایاں ترین تاجروں میں ایک، پابلو ایسکوبار گاویریا، جو مادیئین گروہ کا سرغنہ ہے، صدر بیلیساریو بیتانکور تک ایک تجویز پہنچانے کے لیے ایک واسطے کو استعمال کیا۔ تجویز یہ تھی کہ ایسکوبار اور دوسرے تاجر منشیات کے کاروبار سے دست بردار ہو جائیں گے، اپنے پروسیسنگ پلانٹ تلف کر دیں گے، اپنے بےپناہ سرمائے کو قانونی طور پر مقامی صنعت اور تجارت میں لگائیں گے اور بیرونی قرضوں کا بوجھ برداشت کرنےمیں ریاست کی مدد کریں گے، اگر اس کے عوض ان پر کولمبیا ہی میں مقدمہ چلایا جائے اور انھیں اس مدتوں سے خوابیدہ معاہدے کے تحت ریاستہائے متحدہ کے حوالے نہ کیا جائے جسے ان دنوں میں ازسرنو

بحال کیا جانے والا تھا۔

دلچسپ بات یہ کہ ایسکوبار اور منشیات کے دیگر تاجروں نے معافی کا مطالبہ نہیں کیا، اگرچہ عام معافی کا خیال پیش کیا جا چکا تھا۔ اقتدار سنبھالنے کے دن ہی، صدر بیلیساریو بیتانکور نے مسلح گوریلا تحریکوں کے ارکان کو، جن میں سے بعض کولمبیا کے پہاڑوں میں تیس برس سے زائد عرصے سے روپوش تھے، عام معافی کی پیش کش کی تھی۔ صدر بیتانکور ہمیشہ مذاکرات کی پالیسی پر کاربند رہے تھے، اس لیے انھوں نے منشیات کے تاجروں کی پیش کش کا مثبت جذبے کے ساتھ استقبال کیا۔ اٹارنی جنرل کارلوس خیمینز گومیز، جو پچھلے ایک سال کےدوران ایک باعزت سمجھوتے کی جستجو میں منشیات کے بڑے بیوپاریوں کے ساتھ خفیہ مذاکرات کرتے رہے تھے، ایک بار پھر ان سے ملاقات کے لیے پناما روانہ ہو گئے۔ یہ ثابت نہیں کیا جا سکا ہے کہ اس ملاقات کا اختیار صدر کی جانب سے دیا گیا تھا، لیکن مجھے اس پر یقین ہے۔ بہرحال، بات اس سے آگے نہ بڑھی۔ چار جولائی کے دن، اخبار "ایل تیئمپو" کو ان ملاقاتوں کے بارے میں پتا چلا اور اس نے ان کی مذمت شائع کر دی، جس سے بیدار ہونے والی رائےعامہ نے کسی سمجھوتے کے امکان کا راستا بند کر دیا۔ صدر بیتانکور کو پسپا ہو کر اس سارے معاملے سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کرنا پڑا۔ چھ برس بعد مڑ کر دیکھیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کولمبیا نے ان بہت سے ہولناک واقعات سے بچنے کا موقع کھو دیا، جن کا آج اسے سامنا ہے۔

اب یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ ان مذاکرات کو ریاستہائے متحدہ کی طرف سے سبوتاژ کیا گیا تھا اور اس کے اسباب کا تعلق منشیات کے کاروبار سے زیادہ رونلڈ ریگن کی کمیونسٹ مخالف تخئیلات سے تھا۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے جس شخص کا تقرر کیا گیا وہ کولمبیا میں ریاستہائے متحدہ کا سفیر لوئس تیمبس تھا جو سانتا فے(Santa Fe)گروپ کا رہنما رکن تھا اور ریگن ازم کے متشدد دائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ تیمبس مذاکرات کے ذریعے قائم ہونے والے امن کے خلاف تھا جس پر بیتانکور حکومت نے اپنی ساری امیدیں لگا رکھی تھیں۔ تیمبس کے سر پر اس معاہدے کو بحال کرنے کا خیال بری طرح سوار تھا جس پر کولمبیا کی سابقہ حکومت نے دستخط کیے تھے، اور جس میں کولمبیا کے شہریوں کو ریاستہائے متحدہ کی تحویل میں دینے کی شرمناک شق بھی شامل تھی۔ سفیر تیمبس کی خطرناک ریشہ دوانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ کے لیے منشیات کے تاجروں اور چھاپہماروں میں کوئی فرق نہیں، اور اس نے ایک نئی اصطلاح وضع کی تھی: نارکوگوریلا۔ تحویل مجرمین کے معاہدے کی بدولت امریکی فوجیوں کو کولمبیا بھیجنا ایک آسان اقدام ہوتا، جو درحقیقت چھاپہماروں سے جنگ کر رہے ہوتے۔ بہرکیف، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس معاہدے کی رو سے عملاً کسی بھی کولمبیئن شہری کو ریاستہائے متحدہ کی تحویل میں دینا ممکن ہو جاتا۔

سفیر تیمبس کے بوگوتا پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد، اس سے دوپہر کے کھانے کی دعوت میں ملاقات کرنے پر مجھے یہی تاثر ملا تھا، اور وقت نے اسے درست ثابت کر دیا ہے۔ بعد میں تیمبس کا تبادلہ کوستاریکا میں امریکی سفارت خانے میں کر دیا گیا، اور اس نے نکاراگوا کے

کونترا چھاپہ ماروں سے مشنے کے لیے ایک خفیہ ایرپورٹ کی تعمیر میں الیور نارتھ کی مدد کر کے ایران گیٹ کے واقعات میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ہم کولومبین اب تک سوچتے ہیں کہ منشیات کے تاجروں نے صلح کی پیش کش کیوں کی تھی، اور آیا یہ پیش کش حقیقی تھی۔ میرا خیال ہے یہ حقیقی تھی۔ ان تاجروں نے جو کچھ کہا تھا، اس میں سے اگر خطابت کو علیحدہ کر دیا جائے، تو وہ ایسے اندر ایک بڑا انکشاف رکھتا ہے: "ہم ریاستہائے متحدہ میں قید ہونے پر کولومبیا میں دفن ہونے کو ترجیح دیں گے۔" وہ تحویل مجرمین کے معاہدے سے دہشت زدہ تھے، لیکن اس سے اس بات کی پوری وضاحت نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ تقدیسی تھی؛ پیدائش اور پس منظر کے لحاظ سے منشیات کے تاجر کولومبیا سے باہر کی زندگی کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی علی بابا کے خزانوں جیسی دولت کہیں اور ان کے کسی کام کی نہ تھی اور وہ خود کو کولومبیا ہی میں محفوظ اور اپنی دولت کی بہبودومعاشی کے قابل محسوس کرتے تھے؛ یہی دولت اپنے زندگی بھر کے دوستوں کے درمیان اڑانا، اپنے مضافاتی لب و لہجے میں مذاق کرنا، اور کولوم ۵۵٪ کے عمدہ کھانوں کو اپنے ملک کے برتنوں میں کھانا۔ انہیں سب سے بڑھ کر جس چیز کی آرزو تھی وہ وہی تھی جس سے وہ محروم تھے: کولومبین معاشرے میں ایک مقام۔ بہرحال، جب مذاکرات کی کوشش ناکام ہو گئی تو منشیات کے تاجروں نے بہت سے نفرت انگیز طریقے استعمال کر کے اپنے لیے یہ مقام حاصل کرنے کی کوشش کی، جو بالآخر الٹ کر انہیں پر پڑیں گے۔

جب مذاکرات ناکام ہو گئے تو تاجروں کو وہ وقفہ مل گیا جس میں وہ اپنی سلامتی کو یقینی بنا سکتے تھے۔ اگر کوئی انہیں گرفتار کرنا چاہتا تو کوئی بھی متعلقہ پولیس والا یہ کام کر سکتا تھا، لیکن مجموعی طور پر کولومبیا کا معاشرہ انہیں جس دلچسپی اور تجسّس سے دیکھتا تھا وہ سازباز کی حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ان دنوں میں ہر طرف انہی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ صحافی، سیاست داں، صنعت کار، تاجر یا محض تجسّس کے مارے عام لوگ جوق در جوق اس ضیافت پر ٹوٹے پڑتے تھے جو مادیئین کے نواح میں واقع پابلو ایسکوبار کے ذاتی وسیع سیولیر میں ہمہ وقت جاری رہتی تھی۔ ایسکوبار کا اپنا چڑیاگھر بھی تھا جس میں اس کے مہمانوں کی تفریحِ طبع کے لیے زرافے اور ہپوپوٹیمس افریقا سے منگوا کر رکھے گئے تھے۔ باہر کے بڑے پھاٹک کے سامنے نمائش کے لیے رکھا ہوا وہ ہوائی جہاز جس پر کوکین کی پہلی کھیپ ریاستہائے متحدہ بھیجی گئی تھی، قومی یادگار کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔

منشیات کے تاجروں کے پاس دولت تو تھی، لیکن انہیں اس سے زیادہ کی خواہش تھی؛ انہیں طاقت بھی چاہیے تھی۔ ایسکوبار ایوانِ نمائندگان کی مخصوص نشستوں میں ایک پر منتخب ہوا اور انسانی حقوق کے حمایتیوں کا سرپرست بن گیا۔ کارلوس لیدر نے پُرتمکنت ڈسکو قائم کیے، آرمینیا کے لذت پسند شہر میں جون لینن کا مجسمہ نصب کروایا، ایک سیاسی تحریک چلائی اور انتہائی دائیں بازو کا ایک قوم پرست رسالہ جاری کیا جسے جاری ہونا

(افیون) کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے سبز روشنائی میں چھاپا جاتا تھا۔ وہ کانگریس کے اجلاسوں میں اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ شرکت کرتا، اور پاؤں اوپر رکھے قہقہے لگاتا رہتا۔ مادیئین گروہ کے رکن خورخے لوئس اوچوا، اور کالی (Cali) سے تعلق رکھنے والے گلبرٹو رودریگز اوریہویلا، جو آج کل ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں، دنیا بھر میں ساتھ ساتھ گھومتے اعلا نسل کے گھوڑے خریدا کرتے تھے، اور اپنے قانونی کاروبار کے لیے یورپی پارٹنروں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک بار اسپین میں گرفتار کر کے انہیں کولومبیا کے حوالے کر دیا گیا تھا جہاں وہ رہا کر دیے گئے۔ ان کے حق میں اتنی فضا ہونے کے باوجود ان کے کسی سیاست داں دوست نے انہیں یہ مشورہ دینے کی زحمت نہ کی کہ وہ جن جرائم کے فروغ میں مصروف ہیں وہ ہولناک شکل اختیار کر چکے ہیں اور درحقیقت خطرناک سیاسی غلطیاں بن چکے ہیں۔

ان کی بڑی غلطی ۱۹۸۴ میں وزیرِ انصاف رودریگو لارا بونیلا کا قتل تھا۔ بدقسمتی سے صدر بیتنکور کا اس پر ردعمل ایک اور غلطی تھا۔ کچھ نہ کرنے کے الزامات سے ہراساں ہو کر اور شاید اس جرم پر طیش میں آ کر، انہوں نے پہلی بار تحویل مجرمین کے معاہدے کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی، اگرچہ اس پر انہیں اس وقت بھی پشیمانی تھی، اور شاید ان کے دل میں یہ پچھتاوا آج بھی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معاہدے پر عمل درآمد پر انہیں اس بات نے مجبور کیا تھا کہ ان کے پاس کوئی اور مناسب حد تک مؤثر قانونی ذریعہ نہیں تھا؛ لیکن معاہدے کے اس طور پر استعمال کا مطلب یہ نکلا کہ وہ اب کوئی قانونی اقدام نہ رہا بلکہ انتقامی کارروائی کا ایک ہتھیار بن گیا۔

کارلوس لیدر اب ریاستہائے متحدہ میں ۱۳۵ سال سے زیادہ کی ایک بےحد طویل "عمرقید" کاٹ رہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۹ کے آخر تک کوئی بیس کولومبین، اور کولومبیا میں مقیم تین غیرملکی، امریکا کے حوالے کیے جا چکے تھے۔ منشیات کے تاجروں نے کبھی اس بات کی تردید نہیں کی کہ بالآخر وہی کولومبیا کے اب تک ناقابلِ شمار شہریوں کی ہلاکت کے ذمہ دار ہیں، اگرچہ انہوں نے وزیرِ انصاف لارا بونیلا کے قتل سے ہمیشہ انکار کیا ہے، جس سے ان کے خلاف رائےعامہ کی جنگ شروع ہوئی۔ بائیں بازو کی پارٹی پیٹریاٹک یونین کے کم ازکم آٹھ سو ارکان جن میں پارٹی کے صدارتی امیدوار حائم پاردو لیل بھی شامل ہیں، ان کی بےپناہ قتلِ عام کی مہم کا شکار ہو چکے ہیں۔ اخبار "ایل اسپیکتادور" کے منفرد ایڈیٹر گیئرمو کانو کا قتل میرے لیے ایک ذاتی المیے کی حیثیت رکھتا ہے، اور مجھے آج بھی اسے قبول کرنے میں دشواری ہوتی ہے، اتنا ہی دشوار بعد میں اس اخبار پر کیے جانے والے حملوں کو قبول کرنا ہے جہاں میں نے صحافی کے طور پر اپنی زندگی کی بہترین سال گزارے تھے۔ ججوں اور مجسٹریٹوں کو جن کی ناقابلِ رحم تنخواہیں ان کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات کے لیے بھی بمشکل کافی ہوتی ہیں، ایک دھمکی انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا کہ وہ یا تو منشیات کے بیوپاریوں کے ہاتھ بک جائیں یا ان کے ہاتھوں مارے جائیں۔ انتہائی قابلِ تعریف لیکن المناک بات یہ ہے کہ ان میں چالیس سے زیادہ نے اور ان کے علاوہ بہت سے صحافیوں اور سرکاری ملازموں نے، مرنے کو ترجیح دی۔

جو بات ناقابلِ فہم ہے وہ یہ ہے کہ اس تمام قتل وغارت کے دوران منشیات کے تاجروں نے حکومت سے مذاکرات کی تجویز کبھی ترک نہیں کی۔ ہمیں شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ

اس سلسلے میں کتنی بار کوشش کی گئی۔ انیس سو پچاسی کے اختتام پر میں نے میکسیکو میں پابلو ایسکوبار کے ایک ایلچی سے بات کی، جو پاناما میں کولمبیئن حکومت کو کی گئی پیش کش کا اعادہ کرنے کے لیے بیتاب تھا، لیکن ایک نمایاں ترمیم کے ساتھ: تحویل مجرمین کے معاہدے کی بات چیت کو، جو اب تک کے تمام مذاکرات کا اہم حصہ رہی تھی، اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے جب تک مذاکرات کے نتیجے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو جاتا۔ اس کوشش کا بھی، اور کوششوں کی طرح کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

چند ماہ بعد کولمبیا کی سپریم کورٹ نے تحویلِ مجرمین کے معاہدے کو غیرآئینی قرار دے دیا، لیکن قتل وغارت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ فرض کرنا غیرمعقول بات نہیں ہے کہ اس بربریت کے اسباب رہے ہوں گے، جن کو کبھی عوام کے علم میں نہیں لایا گیا، لیکن کسی نے بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ کس حد تک ہمارے عظیم اور بدقسمت کولمبیا کی سماجی اور سیاسی صورت حال ہے — جس کے پس منظر میں صدیوں سے قائم دیہی جاگیرداری، تیس برس کی بےنتیجہ گوریلا جنگیں، عوام کی خواہشات کی نمائندگی نہ کرنے والی حکومتوں کی طویل تاریخ موجود ہے — منشیات کے بیوپاریوں اور ان تمام چیزوں کی پرورش کی ہے جن کی یہ کاروبار محض ایک علامت ہے۔ انیس سو اناسی میں جب پاناما کے جنرل عمر توریہوس نے کولمبیا کے کریبیئن کے ساحلی خطے میں واقع سینو وادی میں مویشی پالنے کے فارموں کا دورہ کیا، تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کتنے ہی فارموں کے مالکوں نے اپنی حفاظت کے لیے مسلّح شہریوں کو مقرر کر رکھا ہے۔ انھیں یاد آیا کہ ایل سلوادور کی ابتلاؤں کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں بھی سماجی نظم وضبط میں تباہی کے یہی آثار نمودار ہوئے تھے۔ توریہوس کا خیال درست تھا۔ خوشحال فارموں سے چند ہی میل پرے، میرے افسانوی دریائے ماگدالینا کے درمیانی ساحلی خطے میں سماجی ڈھانچا اس بری طرح شکست و ریخت کا شکار تھا کہ وہاں چند برسوں کے مختصر سے عرصے میں ایک متوازی بندوبست قائم ہو گیا، لیکن اس کی باگ ڈور منشیات کے تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔

انیس سو ساٹھ کی دہائی میں کمیونسٹ پارٹی کے گوریلا بازو، "کولمبیا کی انقلابی مسلح افواج" نے مٹھی بھر کسانوں کو ان کے جابر جاگیرداروں کے ہاتھوں سے بچانے کا کام اپنے ذمّے لیا۔ یہ بنیادی خیال جلد ہی پستی کا شکار ہو گیا، اور گوریلوں نے اپنی جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مویشی پالنے والوں سے اغوا، بھتہ خوری اور دھمکیوں کے ذریعے رقم اکٹھی کرنی شروع کر دی۔ جاگیرداروں نے، اس کے جواب کے طور پر، پرائیویٹ افواج قائم کر لیں، جن میں سے بعض کو حکومت نے اس بنیاد پر تسلیم شدہ حیثیت بھی دے دی کہ یہ خودحفاظتی گروپ ہیں۔ شروع میں تمام اقدامات کا مقصد کمیونزم کا جسمانی خاتمہ تھا — چھ سال پہلے ان علاقوں کا دورہ کرنے والے ایک صحافی نے لکھا تھا — مگر اس کے بعد انھوں نے رسّا گیروں لے اور پھر شہری جرائم پیشہ افراد کے خلاف بھی کارروائی شروع کر دی، اور یہاں تک کہ گداگروں اور امردپرستوں کو بھی ہلاک کرنے لگے۔ مویشی پالنے والے جو لوگ قتل ہونے سے

بچ بھی گئے، وہ نہ صرف اپنی زیادہ تر جمع پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھے بلکہ انھی قانون دشمن افراد کے خطرے کا شکار ہو گئے جنھیں سب سے پہلے انھوں نے مسلّح کیا تھا۔

یہی وہ تباہ حال فارموں کے مالک تھے جنھوں نے منشیات کے بیوپاریوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان دونوں کے اشتراک سے وہ شے وجود میں آئی جسے آج "ماگدالینا میدیو" کہا جاتا ہے، جو پچاس ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ایک وسیع سلطنت ہے جو رقبے میں ایل سلوادور سے دگنی ہے، اور جس کا اسلحے کا ذخیرہ اس ملک سے زیادہ ہے جسے جنرل توریہوس نے اپنی جوانی میں دیکھا تھا۔ یہ سب واقعات پچھلے چند برسوں میں، کولمبیا کے صدارتی محل سے تین سو کلومیٹر سے کم فاصلے پر اور مقامی فوجی بیرک سے چند قدم دور پیش آئے ہیں، اور اس کے باوجود اس کا علم پچھلے سال اس وقت ہوا جب وہاں سے فرار ہونے والے ایک شخص نے پوری کہانی بیان کی۔

منشیات کے تاجروں نے رقم، تکنیکی مہارت اور اپنی غیرمتزلزل کاروباری سوجھ بوجھ فراہم کی۔ ان کی جوابی کارروائی متشدّد تھی اور اس کی سائنسی بنیادوں پر منصوبہ بندی کی گئی تھی؛ ان کے بیم فوجی دستوں نے لندن اور تل ابیب میں کرائے کے ان سپاہیوں کی زیرِ نگرانی تربیت حاصل کی تھی جنھیں سونے کے عوض خریدا گیا تھا۔ یہ تربیتی اسکول ہمارے شہروں کے انتہائی افلاس زدہ محلوں سے نوعمر مجرموں کو بھرتی کرتے تھے، اور انھیں کولمبیابھر میں دہشت اور موت پھیلانے کے قابل بنا دیتے تھے۔ کسی احمقانہ جدلیاتی مذاق کی بدولت، "انقلابی افواج" نے جس انقلاب کی منصوبہ بندی کی تھی وہ آیا تو ضرور، لیکن برعکس صورت میں۔ "ماگدالینا میدیو" باقاعدہ ایک الگ دنیا بن گیا، جس میں صرف خودحفاظتی گروپ ہی نہیں بلکہ میئروں کے زیرِ انتظام باضابطہ پولیس کے دستے اور باشندوں کے منتخب کردہ کونسلر بھی ہیں۔ رہائش، علاج اور تعلیم کے میدانوں میں ان کے منصوبے مرکزی حکومت کے لیے ایک براہِ راست چیلنج معلوم ہوتے ہیں۔ اس جماعت کا نشان رائفل پر لگی ہوئی نشانہ لگانے کی دوربین ہے۔

جب تک باقی کولمبیا کو اس مایوس کن صورت حال کا علم ہوتا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ ریاست کی حدوں کے اندر ایک اور ریاست، جو زرخیز میدانوں اور دریائے ماگدالینا کے غروبِ آفتاب پر قناعت کو مزید تیار نہیں تھی، پھیل کر ملک کے ہر قابلِ تصور گوشے میں اپنے اثرات داخل کر رہی تھی۔

ہماری حقیقت کا مشاہدہ کرنے والے ایک شخص نے کہا ہے کہ کولمبیا کا پورا معاشرہ نشے کی لت کا شکار ہے۔ یہ نشہ کوکین کا نہیں — جو کولمبیا کا بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے — بلکہ اس سے کہیں زیادہ مہلک چیز کا ہے، آسانی سے ہاتھ آنے والی دولت کا۔ ہماری تجارت اور صنعت وحرفت، بینکاری کا نظام، ہماری سیاست، صحافت، کھیل، ہمارے تمام علوم وفنون، ریاست اور ہماری تمام سرکاری اور غیرسرکاری تنظیمیں، چند مستثنیات کو چھوڑ کر، غیرقانونی سازشوں کے ایک ایسے جال میں گرفتار ہیں، جس سے رہا ہونا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ پچھلے تین برسوں

میں فوج اور پولیس کے سترہ سو ارکان — ایک ناقابل یقین تعداد — منشیات کے بیوپار سے تعلق رکھنے کی بنا پر مقدمے یا برطرفی کا شکار ہوئے ہیں؛ پچیس ہمہ وقتی سیاست دانوں کے نام منشیات کے کاروبار سے آمدنی حاصل کرنے والوں کی اس فہرست میں شامل ہیں جو ریاستہائے متحدہ میں شائع ہوئی؛ ہماری قومی سلامتی کونسل کے اجلاسوں کے انتہائی خفیہ نکات منشیات کے ایک تاجر کے بریف کیس میں پائے گئے؛ چوٹی کے سرکاری افسروں کی فون پر سازشی گفتگو کو غیرقانونی طور پر ٹیپ کیا گیا؛ گھروں پر چھاپوں کے نتیجے میں بہت سے ایسے ممتاز شہریوں کے ناموں کا انکشاف ہوا ہے جو بےشمار مشتبہ دھندوں میں ملوّث ہیں۔ یہ پوشیدہ اور گرفت میں نہ آنے والا اژدہا سانپ کہیں دکھائی نہیں دیتا، لیکن ہر جگہ موجود ہے؛ ہمارے ملک کی سرحدوں سے دور یہ جس شے کو مس کرتا ہے اس میں دراڑ ڈال کر داخل ہو جاتا ہے اور اسے فاسد کر دیتا ہے۔ غالباً حکومت بھی اس بات سے بےخبر ہے کہ ان غیرقانونی رقوم نے سماجی بندھنوں کو ڈھیلا کر کے ان لوگوں کی کتنی مدد کی ہے۔

انتہائی محتاط اندازوں کے مطابق منشیات کی صنعت کی سرمایہ کاری ایک بلین ڈالر سالانہ ہے۔ یہ رقم درحقیقت اس سے پانچ گنا بھی ہو سکتی ہے۔ اخباروں میں شائع ہونے والے اعدادوشمار کے مطابق کولمبیا کے منشیات کے گروہوں کے تین ممتاز ترین سرغنوں کی ذاتی دولت تین بلین ڈالر فی کس سے زیادہ ہے۔ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اس پیمانے کی قوّت خرید رکھتے ہوئے وہ صرف مادی شے کے حصول سے تسکین پا کر قناعت کر لیں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں اور ارادوں کے اندھیرے کونے کھدروں میں داخل ہونا چاہا ہے، اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

لیکن منشیات کے تاجروں کی اصل ہوس، ان کی فرائڈین ہوس، زمین، زمین، اور زیادہ زمین خریدنے کی رہی ہے۔ کچھ عرصے پہلے انھوں نے ڈیڑھ لاکھ ہیکٹیئر زمین کی خریداری کا جشن منانے کے لیے ایک عظیم الشان پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ پورے کا پورا ملک، اس کے پہاڑوں اور دریاؤں سمیت، اس کے سونے کی زردی اور اس کے سمندروں کی نیلاہٹ سمیت، خرید لینا چاہتے ہیں، تاکہ وہ جہاں رہنا چاہتے ہیں وہاں سے انھیں کوئی نہ ہلا سکے۔ اس دیوانگی کی حقیقت کے مقابل، صدارتی امیدوار لوئس کارلوس گالان کی آواز نے ایک مدھم سی امید دلائی جب اس نے اعلانیہ طور پر ایک بار پھر منشیات کے تاجروں سے ہتھیار ڈالنے کو کہا۔ ہجوم کے بیچوں بیچ، مسلح محافظوں کے حلقے کے اندر، اس کے قتل کے مذہبی رسم کے سے انداز نے بالآخر کولمبیا کی حکومت کو اپنی بھاری تاریخی ذمہ‌داری کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ صدر ورجیلیو بارکو کا ردعمل اگرچہ سست اور غیرمتوقع ہے لیکن اس کا اس سے زیادہ سخت ہونا ممکن نہیں تھا۔

اپنے پیش رو صدر بیتانکور کی طرح، بارکو کا پہلا اقدام بھی تحویلِ مجرمین کے غیرآئینی معاہدے کو بحال کرنے کے لیے ہنگامی حالات کے خصوصی اختیارات کا استعمال تھا۔ لگتا ہے کہ منشیات کے تاجر ایک ایسے شخص کی جانب سے، جو اب تک کوئی اقدام کرنے سے گریز کرتا

رہا تھا، ایسے عزم کے مظاہرے پر حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کے بعد صدر بارکو نے ان تاجروں کے محلات اور جاگیروں پر چھاپے مارنے کا حکم دیا، اور ان کی منشیات لے جانے والی کشتیاں اور راز فاش کرنے والی دستاویزات ضبط کر لیں۔ صدر بارکو کے اقدامات اتنے موثر تھے کہ کوکین کی پیداوار اور فروخت کے اعداد وشمار پر ان کے اثرات ضرور ظاہر ہوں گے۔ لیکن منشیات کے تاجروں کے اصل بدترین دشمن خود ان کے اختیار کردہ حربے ہیں، جو ایک بار پھر پورے ملک کو ان کی مخالفت پر آمادہ کر دیں گے۔

کولمبیا کے رہنے والوں کی غالباً سب سے حیران کن خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر اچھی یا بری بات کے عادی ہو جاتے ہیں۔ خود کو بحال کر لینے کی ان کی صلاحیت مافوق الفطرت کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ کچھ لوگ، جو شاید سب سے زیادہ ہوش مند ہیں، معلوم ہوتا ہے اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ وہ دنیا کے خطرناک ترین ملکوں میں سے ایک میں رہ رہے ہیں۔ لوئس گالان، جس کے قتل نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اس کی تدفین والے اتوار کو خوشی سے بےقابو ہجوم سڑکوں پر نکل کر فٹ بال میں ایکواڈور پر کولمبیا کی فتح کا جشن منا رہا تھا۔

کولمبیا میں تشدد کی صدیوں پرانی روایت میں شہری دہشت گردی ایک نئی چیز ہے۔ بم پھٹنے کی وارداتیں جن میں بےگناہ لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں، اور فون پر موت کی گمنام دھمکیاں جو روزمرہ زندگی کو متواتر ہیجان کا شکار رکھتی ہیں، دکھائی نہ دینے والی دہشت کے خلاف دوستوں اور دشمنوں کے اتحاد ہی کے ذریعے ختم ہو سکتی ہیں۔ جو کچھ پیش آ چکا ہے اس کے خوف کے ساتھ زندہ رہنا شاید پھر بھی ممکن ہے، لیکن جو کچھ پیش آ سکتا ہے اس کی دہشت کے ساتھ کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا؛ بازار میں دھماکے سے پھٹ جانے والی ترکاریاں، پرواز کے دوران ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والا جہاز، پینے کے پانی میں زہر سے پورے پورے خاندان کی ہلاکت۔ نہیں، دہشت گردی سے کبھی کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔

دوسری طرف، صدر ورجیلیو بارکو کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس چیز کو وہ صرف ایک مختصر اور سخت اقدام خیال کر رہے ہیں، درحقیقت ان کی زندگی کی سب سے دشوار اور خطرناک مہم ثابت ہو گی؛ ان کا کئی سروں والا دشمن، اقتدار کی راہداریوں میں تعینات اپنے مشتبہ مخبروں کی مدد سے، خود کو ہمیشہ پہلے سے باخبر اور صورت حال سے نمٹنے کے لیے مسلح اور تیار رکھتا ہے۔ اس کے کان سب کچھ سنتے ہیں اور آنکھیں ہر شے کو دیکھ لیتی ہیں۔ ان کی حکومت کے وسائل دشمن کے مقابلے میں مضحکہ خیز حد تک قلیل ہیں۔

ریاستہائے متحدہ کی جانب سے کولمبیا پر یہ الزام لگانا بہت خوب ہے کہ وہ منشیات کے تاجروں کے خلاف جنگ میں سست روی سے کام لے رہا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہاں کی گلیوں میں بکنے والی منشیات کی مقدار ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے اور وہ اس دھندے میں ملوث اپنے ناقابلِ گرفت شہریوں کی فہرستیں ہمیشہ خفیہ رکھتے ہیں۔ ایک ایسی قوم میں جس نے صرف پچھلے سال دو سو ستّر ٹن کوکین استعمال کی ایسے لوگوں کی خاصی تعداد ہو گی۔ لیکن آخری بات یہ ہے کہ موجودہ ہنگامی صورت حال کے مقابلے کے لیے ریاستہائے متحدہ سے کولمبیا کو جو امداد مل رہی ہے وہ دو بلین ڈالر کی اس رقم کا عشرعشیر بھی نہیں ہے

جو سرکاری اور خفیہ فنڈ سے نکاراگوا کے باغیوں کو آٹھ سال سے ملتی رہی ہے۔ کولومبیا کو ملنے والی اس امداد میں اضافے کی بھی اس وقت تک کوئی توقع نہیں جب تک صدر بارکو ریاستہائے متحدہ کی فوج کو کولومبیا میں داخلے کی اجازت دینے سے انکار پر قائم ہیں، چاہے اس فوج کا واحد مقصد منشیات کے تاجروں کا قلع قمع ہی کیوں نہ ہو۔

یہ تمام حقائق سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کولومبیا میں منشیات کے خلاف جنگ بےحد طویل ور مہنگی ہو گی، اور اس میں کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں۔ اور بدترین بات یہ ہے کہ س میں واپسی کا کوئی راستا نہیں، بجز اس کے کہ کوئی غیرمتوقع اور درخشاں واقعہ پیش آ جائے؛ ایسی مبارک ناممکنات کی طرح جنھوں نے ماضی میں کتنے ہی موقعوں پر لاطینی امریکا کو بچایا ہے۔ اگر اس کا حل مذاکرات نہیں ہیں تو کوئی بھی اور ذریعہ آزمائے جانے کے قابل ہے، بشرطیکہ اس میں مزید جانوں کا زیاں نہ ہو۔ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اس ختم نہ کی جا سکنے والی جنگ کے ختم ہونے سے پہلے ہمارا ملک بالآخر خود ختم ہو جائے؛ یہ وہ واحد حوصلہ افزا پیش گوئی ہے جو میں کر سکتا ہوں، تاکہ میرے اس مضمون کا اختتام تباہی کے شارے پر نہ ہو۔

انتخاب کے اس حصے میں مارکیز کے بارے میں دو مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔

"گابرئیل گارسیا مارکیز" نامی مضمون ولیم رو (William Rowe) کی تحریر ہے جو یونیورسٹی آف لندن کے کنگز کالج میں لاطینی امریکی ادب کے ریڈر ہیں۔ ان کا یہ مضمون جون کنگ (John King) کی مرتب کردہ کتاب *Modern Latin American Fiction: A Survey* میں شامل ہے۔

جو مثل "تنہائی کے سو سال" کے حوالے سے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے، Landmarks of World Literature سیریز میں شائع ہونے والی کتاب *One Hundred Years of Solitude* کا پہلا باب ہے، جو مائیکل وڈ (Michael Wood) کی تصنیف ہے۔ مائیکل وڈ یونیورسٹی آف ایکسیٹر میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ کتاب کا پہلا باب مارکیز کے معروف ترین ناول کو معاصر لاطینی امریکی ادب اور مارکیز کی اس ناول سے پہلے کی تحریروں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس باب میں، جس کی موجودہ انتخاب کے نقطۂ نظر سے کہیں کہیں تلخیص کی گئی ہے، مارکیز کے اس شاہکار ناول پر سیرحاصل بحث نہیں ملتی، لیکن ایسی معلومات یقیناً میسر آتی ہیں جن کی مدد سے عالمی ادب کی اس اہم کتاب کو اور مارکیز کی دیگر تحریروں کو درست تناظر میں دیکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔

ولیم رو

ترجمہ: اجمل کمال

گابرئیل گارسیا مارکیز

برطانیہ میں مارکیز کو عموماً فینٹسی کا ادیب سمجھا جاتا ہے۔ نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے باربار اس کی تحریروں میں پائی جانے والی "فینٹسی پر مبنی" اور "طلسماتی" خصوصیات کی جانب توجہ دلائی ہے، اور اپنے اس عمل سے بڑی حد تک ان موضوعات کو دھندلا دیا ہے جن سے اس کی تحریروں کو بنیادی طور پر سروکار ہے۔ تحیّرانگیز اور اجنبی (Exotic) عناصر پر اس تاکید کی وجوہ ثقافتی ہیں۔ بےدلیل فینٹسی، جیسی کہ سرّیئلی (surrealist) روایت میں پائی جاتی ہے، برطانیہ میں ادبی تدریس کے فائق انداز سے بالخصوص کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ ایک شخص جہاں جاتا ہے زرد تتلیوں کا ایک بادل ہر جگہ اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے؛ پڑھنے والا آخر اس کے ساتھ کیا سلوک کرے؟ کیا اس کے کوئی معنی ہیں، یا یہ محض جذباتی فراریت‌پسندی کا مظاہرہ ہے، کسی ناممکن دنیا (Never Never Land) کی علامت؟ لیکن اسی کتاب میں، جس کا نام "تنہائی کے سو سال" ہے، سوکھے ہوئے بازو والا ایک شراب فروش بھی ہے۔ اس کا بازو اس لیے جل گیا (ہمیں بتایا جاتا ہے) کہ اس نے ایک بار اپنے والدین پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ لاطینی امریکا کے کیتھولک گھرانوں میں بچوں کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ اگر کوئی اپنے والدین پر ہاتھ اٹھائے تو اس کا بازو — حقیقی معنوں میں — جل جاتا ہے۔ مارکیز کا ناول ان اعتقادات کو، پُرمزاح انداز میں، ان کے لغوی معنوں میں قبول کرتا ہے، اور اس طرح ان کے اصل مقصد کو بےنقاب کر دیتا ہے، جو یہ ہے کہ بچوں کو دھوکے میں رکھا جائے تاکہ وہ اپنی حدوں میں رہیں۔

اگر فینٹسی کا کردار فراریت‌پسندی کا نہیں، تو کیا اس کا مقصد اخلاقی سبق دینا ہے، جس طرح ٹولکین کی کتاب *The Lord of the Rings* میں، یا اگر اس سے قبل کی مثال لیں تو چارلس

کنگزلے کی *The Water Babies* میں ہے جو وکٹورین عہد کے فینٹسی کے ادب کا کلاسیک ہے) لیکن مارکیز کے ہاں فینٹسی تمثیل سے آلودہ نہیں۔ تو پھر شاید ایسا ہو کہ لاطینی امریکا کی زندگی ہی میں کوئی باطنی طلسمی خصوصیت موجود ہو؟ لاطینی امریکا کا تصور ایک غیرمعمولی، بیلگام فینٹسی کی آماج گاہ کے طور پر، خاصا مانوس ہے۔ لیکن خود ہماری اپنی قرارپسندی اس میں جو کردار ادا کرتی ہے، ہمیں اس کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے: اجنبی عناصر کی طلب، ثقافتی سیّاحی کا ذوق ــ یا، زیادہ سنجیدہ طور پر، ہماری اپنی معاشرت کی قید سے رہائی کی جستجو۔ اسے تسلیم کیے بغیر ہم یہ محسوس نہیں کر سکیں گے کہ دوسری معاشرتوں میں بھی جبر کے پہلو ہوتے ہیں؛ ہم صرف فینٹسی کی فراوانی ہی دیکھ پائیں گے، وہ حربے نہیں جن کے ذریعے روزمرّہ زندگی پر نظم وضبط عائد کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکیز نے اکثر کہا ہے کہ جو چیزیں یورپی قاری کو حیرت خیز معلوم ہوتی ہیں، کولومبیا کے باشندوں کے لیے معمولی اور روزمرہ کی باتیں ہیں۔

لاطینی امریکہ کی بابت اس اجنبی اور طلسمی تصور کی بنیاد ایک یورپی موقف پر ہے۔ امریکا کی فتح (the Conquest) کے بعد، اس براعظم سے تعلق رکھنے والے انسانوں، اور ماحول کے ان تمام عناصر کو، جو ہر اس شے سے مختلف تھے جو یورپ کے باشندوں کے لیے جانی پہچانی تھی، افسانوی، عجیب یا ہیبت ناک قرار دے دیا گیا ہے، جو مختلف اور ناآشنا چیزوں کو اپنے ذاتی تناظر میں سمیٹ لانے کا ایک طریقہ ہے۔ فینٹسی اور اجنبیت کی ایک سرزمین کے طور پر لاطینی امریکہ کا تصوّر ایک مسخّر کی ہوئی اجنبیت کا تصور ہے۔ جو بڑی حد تک انیسویں صدی میں Celticism کے طریق کار سے مشابہ ہے، جس کے ذریعے برطانیہ نے آئرش آبادی کو خواب دیکھنے والے بےضرر لوگوں کی قوم میں تبدیل کرنے کی کوشش کی، تاکہ اس طرح ان کے ثقافتی اختلافات کو ہموار کر کے انھیں انگریزی معاشرت میں ضم کیا جا سکے۔ ان لوگوں کے لیے جو درحقیقت وہاں رہتے ہیں، یہ جگہیں اجنبیت اور تحیّرخیزی سے یکسر تہی ہیں۔ تو اب سوال یہ ہوا کہ وہ خط کون کھینچتا ہے جو یہ فیصلہ کرے کہ یہاں حقیقت کی عملداری ختم، اور فینٹسی اور طلسم کی قلمرو شروع ہوتی ہے۔ ماکوندو کے باشندوں کے لیے، جو مارکیز کی بہت سی ابتدائی افسانوی تحریروں کا محلِ وقوع ہے، برف، نقلی دانت اور محدّب عدسے بےپناہ حیرت خیز چیزیں ہیں۔ دوسری طرف سائنسی عقلیت کے نقطۂ نظر سے ماکوندو ایک افسانوی اور طلسمی مقام ہے۔ مارکیز کا ناول ایسی کسی بھی سرحد کی لغویت پر ہنستا ہے جو حقیقت اور فینٹسی کے درمیان ایک طےشدہ تقسیم قائم کرنے کا سوانگ رچاتی ہے۔ اس عمل کو الٹ کر کے جس کے ذریعے فینٹسی کی حدود تصور کر کے چیزوں کو بےضرر بنایا جاتا ہے، مارکیز فینٹسی کی مدد سے ان اصول و ضوابط کو للکارتا ہے جو حقیقت کو قائم کرتے اور اسے باضابطہ رکھتے ہیں۔ اس لیے فینٹسی کو بذاتہ ایک خصوصی زمرے کے طور پر اجاگر کرنا گمراہ کن ہے، کیونکہ یہ اپنے سے بہت زیادہ وسیع ایک شے کا محض ایک جزو ہے۔ مارکیز کا سروکار بیک وقت ان ضوابط سے بھی ہے جن کی حدود میں سماجی حقیقت قائم ہوتی اور برقرار رہتی ہے اور ان ضوابط کو مکمل طور پر تبدیل کر دینے کے امکانات سے بھی۔ اگر ہم طلسمی کی تعریف اس شے کے طور پر کریں جو ایک بیحد تنگ سائنسی اندازِ فکر میں نہ سما

سکتی ہو، تب مارکیز کی تحریروں کا طلسمی پہلو عقلیت کی قائم کردہ قیود سے، اور اس کی حدود میں رہنے والی تحریروں سے اس کے انکار کا ایک حصہ ہے۔ جیسا کہ اس نے پلینیو اپولیئو مینڈوزا سے کہا تھا، اسے ادیب بننے کے ارادے کا احساس اس وقت ہوا جب اس نے دریافت کیا کہ کافکا کا قصہ سنانے کا انداز بالکل اس کی نانی کی طرح کا ہے۔

اس کی نانی، جس کے ساتھ وہ آٹھ برس کا ہونے تک رہا، اس کی تحریروں کا ایک بیحد اہم ماخذ ہے۔ ان طویل اور ختم نہ ہونے والی کہانیوں نے جو اس نے بچپن میں اپنی نانی سے سنی تھیں، کولومبیا کے شمالی ساحل کی مالامال زبانی روایتوں کے خزانے اس پر کھول دیے۔ تحریر کی اشرافی اور پدری روایت سے اس زبانی ذخیرے کا تصادم، اس کی تحریروں کا ایک بیحد مسحورکن پہلو ہے۔ نانی اس حقیقت کی مثال ہے جو اس جگہ وقوع پذیر ہوتی ہے جہاں سماجی تانے بانے کی تشکیل قصہ گوئی اور زبانی اظہار سے ہوتی ہے، نہ کہ تحریرکردہ یادداشت سے۔ "تنہائی کے سو سال"، اسی اعتبار سے ــ یورپی ناول کے آمدنامے کے برعکس، جو خیال اور کرداروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاپذیر ہوتا ہے ــ سنی ہوئی کہانیوں کا ایک ذخیرہ ہے۔ تاہم اس کے بیانیے کی بےپناہ توانائی کے باوجود اس کے اختتام تک پہنچنے پر ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ناول، مثال کے طور پر، کہانیوں کے ایک اور ذخیرے، "الف لیلہ و لیلہ"، کے برعکس، ایسا متن نہیں جس کی لذت کو پڑھنے والا ختم نہ ہونے دینا چاہے۔ ایک مسلسل فراوانی کے اندر ایک غناکی، اور ایک مجموعی طور پر دم گھونٹنے والی محدودیت کا احساس قائم رہتا ہے، جو بیانیے کی بےرکاوٹ بہاؤ اور کرداروں کے ناموں اور زندگیوں کی بےتسکین تکرار سے جنم لیتا ہے۔

مارکیز کے بیشتر ناول ایک ایسے مقام سے لکھے گئے ہیں جہاں تمام واقعات پہلے ہی پیش آ چکے ہیں۔ اس کا پہلا ناول "پتوں کا طوفان" ایک تدفین کے لمحے سے شروع ہو کر وقت میں پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے۔ "تنہائی کے سو سال" اپنے اندر خود اپنے لکھے جانے کا ایک آئینہ رکھتا ہے؛ ملکیادیس کا کمرہ وقت کی پائمالی اور موسموں کے اتارچڑھاؤ سے محفوظ ایک مکمل طور پر جامد مقام، جہاں ناول میں پیش آنے والے تمام واقعات کی پیش گوئی کرنے والے مسوّدات محفوظ ہیں۔ "سردار کا زوال" اپنے مرکزی کردار، ڈیڑھ سو سالہ آمر کی موت سے شروع ہوتا ہے، جو اس صدارتی محل میں واقع ہوتی ہے جو اب مکمل طور پر فطرت کے رحم وکرم پر ہے۔ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں سانتیاگو نصر کی یقینی موت کا اشارہ عنوان ہی سے مل جاتا ہے، جو درحقیقت ناول کے آخری چند جملوں میں بیان کی گئی ہے لیکن پہلے جملے ہی سے اس کے یقینی ہونے کا تجربہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ نقشہ مارکیز کے تازہ ترین ناول "وبا کے دنوں میں محبت" (جو ہسپانوی میں ١٩٨٥ میں شائع ہوا) سے پہلے تک قائم رہتا ہے۔

بیانیے کی اس مخصوص قسم کی ساخت کا تعلق ذاتی اور سماجی، تحریری اور زبانی یادداشت کی مرکزی قضیے سے ہے۔ اپنی زندگی میں مارکیز متعدد بار اپنے والدین اپنے بچپن کے

گھر، اور اپنے آبائی خطے سے جدا ہونے کے تجربے سے گزرا۔ آٹھ برس کی عمر کو پہنچنے تک وہ اپنے نانا اور نانی کے ساتھ اراکاتاکا میں رہا۔ جب اس کے نانا کا انتقال ہو گیا تو اسے ماں کے پاس بھیج دیا گیا۔ نوعمری ہی میں اسے کریبیئن کے گرم ساحلی علاقے سے دور، کولومبیا کے سرد آندینی خطے کی ایک اسکول میں بھیج دیا گیا جہاں اسے کریبیئن تہذیب کی بےتکلفی اور فراوانی میسر نہ تھی۔ بعد میں اسے اور بھی دوردراز مقامات پر جانا پڑا: "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" پیرس میں لکھا گیا، اور "تنہائی کے سو سال" میکسیکو میں۔ اکیس برس کی عمر میں اس نے اپنی ماں کے ساتھ واپس اراکاتاکا کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر کا مقصد ناتانانی کے مکان کو فروخت کرنا تھا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس نے اس کی تحریروں کی شکل متعیّن کرنے میں ایک نہایت اہم کردار ادا کیا۔ وہاں پہنچنے پر اس نے ہر شے کو پہلے سے مختلف پایا:

"مکان بالکل وہی تھے لیکن وقت اور افلاس انھیں کھا گئے تھے۔ اور کھڑکیوں میں سے وہی فرنیچر نظر آتا تھا لیکن اس کی عمر میں پندرہ سال کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ ایک گردآلود، گرم قصبہ تھا اور دوپہر کی گرمی بےحد شدید تھی۔ سانس لینے سے گرد اندر جاتی تھی۔"

وقت کے حملے کے شکار ماضی کو بحال کرنے کی کوشش سے مارکیز کو توانائی کا ایک بنیادی منبع حاصل ہوا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے وقت اور مقام سے یکانگت بھی جس کی تقدیر نیستی ہے، اور خود نیستی اور زوال کے اس عمل سے بھی۔

اراکاتاکا واپسی کو اس کی ایک عمدہ ترین کہانی "منگل کے دن کا قیلولہ" کے ماخذ کے طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ ایک عورت اپنی بیٹی کے ہمراہ اپنے بیٹے کی قبر تک کا سفر اختیار کرتی ہے، جو ایک مبیّنہ ڈاکے کے دوران گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ دوپہر کی شدید اور گردآلود گرمی کے علاوہ اسے پادری کے عدم تعاون اور گلیوں میں ابھرے ہوئے تماشائی بھیڑ کی بداندیش نگاہوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قصبے کے بارے میں اس کا باغیانہ رویہ ایک ذاتی یادداشت کا، اور قصبے کے باشندوں کی سماجی فراموشی سے انکار کا عمل ہے۔ کہانی کا اختتام عورت کے شدید گرمی میں باہر نکل جانے پر ہوتا ہے — قبر پر حاضری — جو کہانی کا مرکزی واقعہ ہے — پڑھنے والے کے تخیّل میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ناول میں، بطور ایک حرکی قوت کے یادداشت کا عمل زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ واقعات کا وسیع ذخیرہ کسی فرد یا ادارے (agency) کے پاس محفوظ ہے؟ اور کسی میڈیم میں منقش کیا گیا ہے؟ عام لوگوں کی زبانی یادداشت یادآوری کے حالات کی نسبت سے تبدیل ہوتی رہتی ہے یہ، جامد اور ہمیشہ کے لیے متعیّن ہونے کے بجائے، متواتر نئے سرے سے تشکیل پاتی رہتی ہے اور اس کی شکل، تحریرشدہ الفاظ کے بجائے، سنائی دینے والی آواز سے متعین ہوتی ہے۔ ایک بار تحریری ضابطے میں آ جانے کے بعد یادداشت ایک مختلف شے ہو جاتی ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ اب اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اب وہ اجتماعیت کی ملکیت نہیں رہتی، بلکہ پروہتوں اور نقل نویسوں کے مخصوص عمل سے گزر کر آتی ہے (جن کا نمائندہ "تنہائی کے سو سال" میں ملکیادیس ہے)۔ یادداشت کی نقشی کے زبانی اور تحریری طریقوں کا فرق ناول کے پہلے جملے

میں نمایاں طور پر ظاہر ہے:

"بہت برسوں بعد فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرتے ہوئے، کرنل اوریلیانو بوئندیا دور دراز کی اس سہ پہر کو یاد کرنے والا تھا جب اس کا باپ اسے زندگی میں پہلی بار برف دکھانے لے گیا۔"

ماضی کے ایک سادہ بیان کو ("اس کا باپ اسے زندگی میں پہلی بار برف دکھانے لے گیا") ایک ایسے مستقبل کے درمیان رکھ دیا گیا ہے، جو پیش آ چکا ہے۔ یہ ایک ایسے عمل کے ذریعے کیا گیا ہے جو تحریر کے تعیّن اور اس کی پیچیدہ ساخت ہی کی مدد سے ممکن ہے۔ یہ تناظر تحریرشدہ تاریخ کے احساس پر بھی انحصار کرتا ہے، جو وقت کے دوران میں واقعات کی ایک باضابطہ ترتیب ہے جس کے آخری لمحات کو اس سے پہلے کے لمحات میں تحریرشدہ دیکھا جا سکتا ہے۔ یاد کیے ہوئے ایک ماضی کا ایک ایسے مستقبل کے درمیان واقع ہونا جو ایک لحاظ سے پہلے ہی پیش آ چکا ہے، مجموعی طور پر اس کتاب کی زمانی ساخت کی تشکیل کر دیتا ہے۔

کتاب کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں وہ تمام نکات جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، ایک جگہ جمع ہو کر ایک ڈرامائی ارتکاز حاصل کر لیتے ہیں: بےخوابی کی وبا۔ یہ وبا ماکوندو کے باشندوں پر حملہ آور ہو کر نتیجے کے طور پر فراموشی پیدا کرتی ہے: لوگ چیزوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ اس وبا کا چھوت مقامی انڈین آبادی سے لگا تھا، جو زبانی اظہار پر انحصار کرنے والے لوگ تھے۔ جبکہ اس کا علاج دریافت کرنے والا شخص، ملکیادیس، تحریر کا آدمی ہے۔ لیکن وبا کا علاج ہونے سے پہلے خوزے آرکادیو بوئندیا، جو خاندان کا سردار ہے، اس کے سنگین اثرات کو محدود کرنے کے لیے یادداشت کی مشین ایجاد کرتا ہے:

"اس مصنوعی کل کی بنیاد اس امکان پر تھی کہ انسان صبح اپنی پوری زندگی کے دوران میں حاصل کردہ تمام علم — شروع سے آخر تک — دوہرا سکے۔ اس نے اس کا تصور ایک ایسی گھومتی ہوئی لغت کے طور پر کیا تھا جسے ایک محور سالانگا کر چھڑی کی مدد سے حرکت دی جا سکے — کہ اس طرح محض چند ساعتوں میں وہ تمام خیالات انسان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جائیں جو زندگی گزارنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ وہ تقریباً چودہ ہزار اندراجات کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔"

یہ دراصل تحریر کی مشین ہے۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کہ لوگ چیزوں کے منصب اور استعمال بھول جائیں گے (جس کی پُرمزاح مثال کے طور پر گائے کا ذکر کیا گیا ہے)، یہ مشین نام اور تعریفیں پیدا کرتی ہے۔ لیکن فراموشی کا خاتمہ کر کے یہ تبدیلی کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے: دنیا لغت کی محکوم ہو جاتی ہے، اور چونکہ اس کا مقصد پوری حقیقی دنیا کو لفظوں سے اس طرح بھر دینا ہے کہ کہیں کوئی جگہ خالی نہ رہ جائے، اس کی مدوریت (circularity) تحریری ادب کا استعارہ بن جاتی ہے، جو گویا ایک بند ساخت ہے جو کسی تغیّر کو راہ نہیں دیتا، اور اپنی خودکفالت میں قید ہے: جو اس ناول کی مثال بھی ہے، اس کے جمود کے احساس اور ناقابلِ فرار تقدیر کے کل پرزوں سمیت۔ اس ناول کے لوازمات زیادہ تر زبانی ہیں۔ لیکن وہ تحریری

بینت میں سے گزر کر ٹھوس شکل اختیار کرتی ہیں۔ یہ عمل دوہرا طریقہ اختیار کرتا ہے؛ ایک طرف زبانی سنائی جانے والی کہانیاں ہیں اور دوسری طرف متعیّن تقدیر، جو ملکیادیس کی پیش گوئیوں کی شکل میں محفوظ ہے۔

اس ناقابل فرار تقدیر کا عمل ایڈی پس کے انجام (Oedipal trap) کی طرح ہے؛ محرموں کے درمیان ممنوعہ جنسی تعلق کی خواہش (incestuous desire) بوئندیا خاندان کی جبلّت میں موجود ہے، اور اس خواہش کی تکمیل انتہائی درجے کا جرم ہے، جس کی سزا مکمّل بربادی ہے؛ نہ صرف اس کا ارتکاب کرنے والوں کی، بلکہ ان کی پوری کائنات کی بربادی۔ رشتوں کو نام دینا اور ان کی تعریف متعین کرنا اس جرم کے امتناع کے لیے لازمی ہے؛ ناموں کے بغیر یہ امتناع کارگر نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، وغیرہ، رشتوں کو نام دینے ہی کا عمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بےحوابی کی وبا کا فوری انسداد ضروری ہے؛ یہ ایڈی پس کے انجام کے تمام کل پرزوں کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔ یہاں سوفوکلیز اور فرائڈ کا، مقبول عوامی معاشرت سے خطرناک ٹکراؤ ہوتا ہے۔

ب ہم زبانیت بمقابلہ تحریر کے قصے سے بڑھ کر معاشرتی نظم و ضبط کی عائد کردہ قیود اور سماجی وجود کے بنیادی اصولوں میں تغیر کے امکان، سے مارکیز کے شغف تک آ گئے ہیں۔ نوبیل انعام قبول کرتے وقت کی گئی تقریر میں "تنہائی کے سو سال" کے آخری جملے کو الٹ کر اس نے کہا کہ سو سال کی تنہائی کی سزا پانے والوں کو زمین پر ایک اور موقع دیا جانا چاہیے۔ سیاسی ضرورت کا یہ خیال، جو سوشلزم سے اس کی کمٹ منٹ سے پیدا ہوا ہے، اس کے فکشن کے بنیادی سروکار سے مطابقت نہیں رکھتا؛ ادبی انہماک اور سیاسی عقیدہ کی دوستی اس کی تحریروں کا سب سے بڑا تضاد ہے۔ اس کا سب سے پسندیدہ ادیب سوفوکلیز ہے۔ خصوصاً اس کا Oedipus Rex۔ "تنہائی کے سو سال" میں لبرل پارٹی کی صفوں میں ایک سپاہی کہتا ہے؛ "ہم پادریوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، تاکہ اگر کوئی شخص اپنی ماں سے شادی کرنا چاہے تو کر سکے۔" کسی بنیادی تبدیلی کو جنم دینے میں کولمبیا کی خانہ جنگیوں کی ناکامی، اور ایڈی پس کے انجام کا یقینی ہونا، دونوں ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں؛ تاریخ سے ماورا ایک متعین تقدیر کے عائدکردہ المناک ضوابط کی فتح ہوتی ہے، اور تاریخ کا کام صرف اس تقدیر پر عمل کرنا ہے۔

لاطینی امریکا کے کسی اور ملک سے زیادہ، کولمبیا کی تاریخ خانہ جنگیوں سے رنگین ہے۔ ان میں سے بدترین اور تاریخی طور پر قریب ترین، جسے la violencia کہا جاتا ہے، ۱۹۴۸ سے ۱۹۶۲ تک جاری رہی اور اس میں تین لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ "منحوس وقت" اور "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اسی خانہ جنگی کے زمانے سے متعلق ہیں۔ مارکیز کے دیگر تمام ناول روزمرہ زندگی پر سیاسی تشدد کی متواتر یلغار کی تصویرکشی کرتے ہیں، اور تمام ناول کسی معنی خیز سیاسی تبدیلی لانے میں ناکامی کے شاہد ہیں۔ لیکن مارکیز کی تحریروں میں تاریخ کا پدری اور اٹل تقدیر والا تصور ہی تاریخ کا واحد تصور نہیں۔ یہ تصور "پتوں کا طوفان" اور

"تنہائی کے سو سال" پر چھایا ہوا ہے، جہاں نقطۂ نظر مقامی دیہی اشرافیہ (مثلاً بوئندیا خاندان) کا ہے؛ بیسویں صدی کے اوائل میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کی آمد کی تعبیر ایک مکمل تباہی کے طور پر کی گئی ہے کیوں‌کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی تبدیلیاں اس اشرافیہ کے خاتمے کا اشارہ ہیں۔ دوسری جانب اس کے بعد کے ناولوں میں عوام کی اجتماعی یادداشت کی آواز سنائی دیتی ہے؛ جس میں سرکاری تاریخ کے مسترحی ہی اورتحریف کے واسطے ایک حقارت موجود ہے؛ جیسے کہ "بڑی ماما کا جنازہ" کا راوی کہتا ہے کہ یہی وقت ہے کہ صدردروازے کے قریب کرسی کھسیٹ کر پورا قصہ بیان کر دیا جائے؛ اس سے پیشتر کہ مورّخین آ نکلیں۔ عوامی معاشرت کی اس پُرشخصیک اور مائل بہ تخریب لہر سے خود ایڈی پس کا اسطور بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بچوں کے نام رکھنے کا قاعدہ، جو اس قانون کا آئینہ دار ہے جس کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی پدری استحقاق کو سربلند رکھتا ہے؛ خاندان کی شناخت اس کے لڑکوں سے ہوتی ہے جن کے نام ہمیشہ باپ دادا کے ناموں پر رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ممنوعہ جنسی عمل کا واحد حقیقی اشارہ سؤر کی دُم والے بچے کی پیدائش سے ملتا ہے۔ اس قسم کے ثبوت کی ضرورت یک ایسے معاشرے میں پڑتی ہے جہاں غیریقینی ولدیت کا اصول موجود ہو یعنی جہاں پدری استحقاق کی پابندی ترک ہو جانے کی وجہ سے ماں کی اہمیت مسلّم ہو، اور مرد آتے جاتے رہتے ہوں۔ یہ روئے کسانی معاشروں سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں حسب نسب اور ورثے میں ملنے والے ناموں کی اہمیت نہیں ہوتی، جو بوئندیا خاندان کے لیے نہایت اہم ہیں۔ اس کے باوجود، بوئندیا خاندان کی ممنوعہ جنسی تعلق کی خواہش کے نشانِ تضحیک بننے کے باوجود، یہ خواہش ہی وہ اصل قوت ہے جس کے ذریعے بیانیہ وقت کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا ہے اور بالآخر تمام خالی جگہوں کے پُر ہو جانے کے بعد تباہی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ عوامی اور اشرافی قواعد کی تہیں یوں ایک دوسرے کے اوپر جمانے سے دومرکزی تناظر پیدا ہوتا ہے؛ اور کبھی ایک اور کبھی دوسرا مرکز زیادہ نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ سطح پر اپنی ظاہری سادگی کے باوصف، مارکیز کی تحریر مختلف تہوں کی ایک پیچیدہ بُنت ہے۔

اقتدار کی درجہ بندی کی پابند زبان، اور عوامی معاشرت کی آواز کے درمیان مسلک فاصلہ "سردار کا زوال" میں سب سے زیادہ شدّت سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس متن کو کئی آوازوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے؛ جن میں نمایاں آوازیں عام لوگوں کی ہیں جو بالآخر محل کے اندر داخل ہو کر آمر کے عرصۂ حکمرانی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ مگر یہ عوامی آوازیں، جو کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ اجتماعی ہیں؛ صرف بےنام آمر کے خاتمے کی خواہش کا اظہار نہیں یہ اسے ایک ٹھوس جسمانی وجود بھی عطا کرتی ہیں جس سے وہ دراصل محروم ہے۔ دوسرےلفظوں میں اس کا وجود ایک حد تک، ان کا مرہونِ منت ہے۔ پیرو سے تعلق رکھنے والے نقاد جولیو اورتیگا (Julio Ortega) نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس متن میں عوام کی آواز آمریت کی دیومالا پر تنقید اور اس کی تخریب کرتی ہے۔ لیکن اس بات پر بھی زور دیا جانا چاہیے کہ آمر، ایک مربوط شناخت رکھنے والے وجود کے طور پر، آوازوں کی اسی اجتماعیت کی پیداوار ہے جو اس کو بیان کرتی ہیں۔ ایک جانب آمریت کی ثبت کی، اور اقتدار کی

تسلسل کی خواہش ہے، اور دوسری جانب عوامی آوازوں کا ایک سیل ہے، جو مسلسل تغیر میں ہے، اور جس کی کوئی جامد شناخت نہیں۔ لیکن بیانیہ میں کوئی جوڑ دکھائی نہیں دیتا؛ عوامی آوازوں کی اجتماعیت اور امریت کی جابرانہ وحدانیت کے درمیان تمام رخنے پریشانی کی طور پر نظروں سے اوجھل کر دیے گئے ہیں؛ ریاست اورعوامی معاشرت کے درمیانی فاصلہ دھندلا گیا ہے۔ استبداد کی ذمہ داری، انجام کار، کسی پر عائد نہیں کی جا سکتی؛ یہ بس موجود ہے، موسم کی طرح۔ وہ کون سا عمل ہے جس کے ذریعے لوگ کسی کشش کے زیراثر امریت کی حدود میں داخل ہو کر اپنے ہی استبداد کی سازش میں شریک ہو جاتے ہیں؟ اپنی ماں کے واسطے امر کا شدید ناسٹلجیا اس کی وقت میں ثبات کی آرزو کو صورت پذیر کرتا ہے۔ اسی سے اس کی آواز میں وہ جذباتی کشش پیدا ہوتی ہے جو عوامی آوازوں کو اپنے اندر کھینچ کر دھندلا دیتی ہے۔ خود کو سماجی جبر کے سپرد کر دینے کی پشت پر بھی ابدی پن کی وہی خواہش موجود ہے۔

آیئے اب مارکیز کی تحریروں میں تقدیر کی ناگزیریت پر عمومی غور کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہر طرف سے بند اور ناقابلِ فرار ماحول کئی صورتوں میں پیدا کیا گیا ہے : موسم، خوشبوئیں، ناموں اور واقعات کی تکرار، اور جسمانی اور سماجی فنا کے مرحلے۔ یہاں ان میں سے صرف ایک، شاید سب سے زیادہ اہم، سطح پر اس ناگزیریت کے اظہار کے بارے میں گفتگو کی گنجائش ہے؛ پلاٹ کی ساخت میں پنہاں وقت کے گزران کا بیان۔ ان تمام پلاٹوں میں ایک ہلاکت خیز واقعے پر گزر جانے والے طویل عرصے کا افسوں طاری ہے۔ اکثر مواقع پر وقت ایک التوا (یا التوا کے ایک سلسلے) کی صورت میں گزرتا ہے۔ "تنہائی کے سو سال" میں بوئندیا خاندان کی تاریخ سو برسوں پر پھیلی ہوئی ہے، جن کے دوران محرمانہ جنسی تعلق کی خواہش کی سزا ملتوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کے مرکزی کردار کرنل، نے پچھین سال تک جنگ کی پنشن کا انتظار کیا ہے، جبکہ اس کی روزمرہ زندگی فاقوں سے نبردآزما ہونے میں گزرتی ہے۔ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں سانتیاگو نصر کی موت کا علم آغاز ہی میں ہو جاتا ہے؛ اس موت کے علان اور اس کے حقیقت بننے کے درمیانی وقفے کو ایک ادبی تدبیر کے ذریعے طویل کر دیا گیا ہے جس میں سانتیاگو نصر کی موت کی وجوہ کی ایک عقلی تفتیش کا عمل قصبے کے باشندوں کی المیے کی غیرعقلی خواہش کے پس منظر میں دکھایا جاتا ہے۔ "معصوم ایرندرا" میں ایرندرا نامی کم سن لڑکی، اپنی دادی کے مکان میں غلطی سے آگ لگ جانے کی پاداش میں، ایک لامتناہی عرصے تک عصمت فروشی کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ اس کہانی میں دادی کا کردار مارکیز کے ہاں معاشرے کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے، جو اپنے ارکان سے حسبِ جرم کے قرض کی متواتر وصولی کرتا رہتا ہے۔ "سردار کا زوال" میں جس شے کا التوا ہے وہ امر کی موت ہے، جس کا شدّت سے انتظار کیا جاتا ہے، لیکن جب وہ درحقیقت واقع ہوتی ہے تو تھکن کا احساس غلبہ پا لیتا ہے؛ گویا ایک مختلف سیاسی نظام کی تعمیر کے لیے جو توانائیاں درکار ہیں وہ ماند پڑ گئی ہیں۔

مارکیز کے اکثر بیانیوں میں وقت قربانی اور بتدریج فنا کی قیمت پر خریدا جاتا ہے، جبکہ تبدیلی کے تمام امکانات معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" زیادہ تفصیلی غور کا مستحق ہے، کیونکہ وہ بدلے ہوئے حالات کے امکان کو پیش کرتا ہے، جس کی بنیاد مسلسل بغاوت پر ہے۔ اگرچہ سیاسی جبر نے روزمرہ زندگی کے ہر رخنے میں راہ پا لی ہے، لیکن کرنل اس تحکمانہ دلیل کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیتا ہے جس کے ذریعے امریت، اس دعوے کے ساتھ کہ وہ بےبدل اور فطری ہے، اپنی طاقت کو مستحکم کرتی ہے۔ ہر موڑ پر، بذلہ سنجی مزاج اور سادہ لوحی کے امتزاج کے ساتھ، کرنل اقتدار سے سیاسی اور وجودی مفاہمت کی مکّارانہ زبان کو ناکام کر دیتا ہے۔ یہیں، کامیو کے "پلیگ" کی طرح، یہ پہچاننے کی دعوت دی جاتی ہے کہ اخلاقی بغاوت کا عمل ایسا بھی ہو سکتا ہے جو کسی نظامِ عقائد پر استوار نہ ہو، لیکن پھر بھی، روزمرہ اور عمومی زندگی کے اندر رہتے ہوئے سربلندی حاصل کرے اور مایوسی کے خلاف نبردآزما ہو۔ اس کے باوجود، مارکیز کے ناول میں، معنی کی دیگر سطحیں منظّم طور پر رفتہ رفتہ بغاوت کی بیخ کنی کر دیتی ہیں۔ لڑاکا مرغ کو، جو سیاسی تبدیلی اور مستقبل کی امید کی علامت ہے، کرنل اپنی اور اپنی بیوی کی جسمانی ضروریات کی قربانی کی قیمت پر زندہ رکھتا ہے۔ جیسے کہ اس کی بیوی کہتی ہے؛ "یہ ایک مہنگی خام خیالی ہے؛ مکئی ختم ہونے کے بعد ہم اسے اپنا کلیجہ ہی کھلا کر پال سکیں گے۔" یہ تبصرہ کرنل کی مثالیت پسندی کو تو اجاگر کرتا ہے، لیکن اس مثالیت پسندی کی قیمت کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے، اور اس یونانی اسطور کو متحرک کرتا ہے جس میں پرومیتھیوس کو دیوتاؤں کی آگ چرانے کی یہ سزا ملتی ہے کہ ایک گدھ پیہم اس کا جگر نوچ نوچ کر کھاتا رہے۔ جب ایک بار ہم آگ کو ایک انسانی ایجاد کے طور پر متعین کر لیتے ہیں اور جان جاتے ہیں کہ گدھ خود پرومیتھیوس ہے، تو یہ اسطور انسانی توانائی کو قربانی کے ایک نظام کے سپرد کر دینے کی مثال بن جاتی ہے۔ مرغ اجتماعیت یا سیاسی نظام کا اشارہ بھی ہے جسے افراد کی قربانی دے کر پروان چڑھایا اور باقی رکھا جاتا ہے۔ کرنل، جو ایک رواقی (stoic) ہے کسی شخص کو چھونا پسند نہیں کرتا، اس لیے جس لمحے وہ لڑاکا مرغ کو چھوتا ہے، وہ لمحہ ایک خاص شدّت کا حامل ہے؛

"وہ اور کچھ نہ بولا کیونکہ اس جاندار کی گرم اور گہری ارتعاش نے اس پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ زندہ شے اپنے ہاتھوں میں نہیں لی۔"

اس طرح ہم یہاں ایک اور تصوّر کو کارفرما دیکھتے ہیں، جو درحقیقت مسیحیت سے تعلق رکھتا ہے؛ قربانی کے عمل کے ذریعے دوسروں سے جُڑ جانے کا تصور۔ معنی کی وہ سطح جو انقلابی بغاوت کی شہادت دیتی ہے ناگزیر تقدیر، اور قربانی کے متعین ضابطوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

معنی کی مختلف سطحوں کو ایک ساتھ بُننے میں مارکیز کو غیرمعمولی مہارت حاصل ہے۔ اس کی سرشاری کا ایک بڑا حصہ ایک زبردست بےپایاں توانائی کا احساس ہے، جو قید عائد کرنے اور آزادی عطا کرنے والی قوتوں کے درمیان ایک کش مکش میں مشغول ہے۔ "وبا کے دنوں

میں محبت" کا ایک دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں اس نمونے سے انحراف کیا گیا ہے جو اس سے پہلے مارکیز کی تحریروں پر حاوی رہا ہے۔ پہلی نظر میں اس ناول کے پلاٹ میں بھی اس سے پہلے کے ناولوں کی جانی پہچانی شباہت محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ اس کا مرکزی تار بھی ایک عشق کا التوا ہے جو اکیاون سال نو مہینے اور چار دن کے عرصے پر محیط ہے۔ اس کے باوجود اس میں ایک بہت نازک فرق موجود ہے۔ فرمینا دازا، اس عشق کی ایک فریق، دانائی سے کام لے کر ماضی سے، اور خصوصاً نوسٹلجیا کی ترغیبات سے جو مارکیز کی اس سے پہلے کی افسانوی تحریروں کا غالب جسمی جذبہ رہا ہے دامن چھڑا لیتی ہے:

"ماضی کی یاد سے مستقبل کی تلاش نہیں کی تھی، جس پر یقین کرنے پر وہ مصر تھا۔ اس کے برعکس، وہ اس عقیدے کو تقویت پہنچاتی تھی جس پر فریب در ہمیشہ قائم رہی تھی کہ بیس سال کی عمر کی جذباتیت کو نہایت قابل قدر اور خوب صورت شے تھی لیکن وہ محبت نہیں تھی"

جس شے کو وہ بطورِ خاص رد کر رہی ہے وہ فلورنتینو اریزا کا رچایا ہوا محبت کا تصور ہے، محبت کی خوشبوؤں اور ذائقوں کی قربان گاہ پر خود کو فنا کر لینا (وہ یو دی کلونی پیتا اور گارڈینیا کے پھول کھاتا ہے)۔ اس تصور میں خود کو تباہ کر لینے کا ایک مرض کا مقام ہے جس کا اشارہ استعاراتی طور پر ناول کے عنوان سے بھی ملتا ہے۔ جب بالآخر فلورنتینو اریزا اور فرمینا داز کا ملاپ ہوتا ہے تو محبت اور بیضے کی یکسانیت ایک مختلف معنی اختیار کر لیتی ہے۔ اب جبکہ دونوں کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی ہے، ان کی محبت روایات اور رسمیت کے خلاف اور اس قرطبیت کے خلاف ایک بغاوت ہے جو معاشرہ اپنے مخالفوں پر عائد کر دیتا ہے۔

محبت، مارکیز کے ناولوں میں، عقل کی دسترس سے باہر ایک انتشار کا مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام تر سماجی پابندیوں کا سب سے بڑا ہدف بنتی ہے۔ باربار جب نظم و ضبط کی تعمیر محبت کے ہاتھوں منتشر ہو جاتی ہے، تو اس کے نتیجے میں مسترد جنسی تعلق، یا اکارت خواہشوں -- یا کم از کم نوسٹلجیا کی رسمیات -- کی، تقدیر اور تباہی کی تصویریں غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ مگر فرمینا دازا اور فلورنتینو اریزا اس عمل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ صرف ان دونوں کا عشق نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ مارکیز اپنی بیانیہ توانائی کے سہمے کو لمبائی، قربانی، اور نوسٹلجیا پر مبنی یادداشت کی بند کتاب سے ہٹانے کی کوشش میں ہے۔ فلورنتینو اریزا کا پچاس سال انتظار، کرنل کی رہد، اریندرا کی اذیتیکی لرس، یا امر کو اپنی ماں کو یاد کرنے سے مختلف نتیجہ پیدا کرتا ہے جس میں ان کے عشق کی تکمیل ہوتی ہے وہ ایک بحری جہاز ہے جو ان دونوں کو دریائی ماگدالینا میں اوپر کی جانب لے جا رہا ہے۔ وقت کی گردش کے ایک اور طرح کے عمل کے پہلو پر -- جو قربانی والے عمل سے بہت مختلف ہے -- جہاز مارکیز کی تحریر کی مشین ہے، جو ایک نئے قالب میں آ گئی ہے۔ کارتاخینا کی طرف واپسی کے سفر میں وہ جہاز پر قرطبیت کا پرچم لہرانے کا فیصلہ کرتے ہیں تاکہ مسافر اور اسباب جہاز سے دور رہیں، اور وہ دونوں، کپتان اور اس کی داشتہ کے ساتھ تنہا رہ جاتے ہیں۔ اس گھڑی میں انتظار کے دوران فلورنتینو اریزا بالآخر طے کرتا ہے کہ

دوبارہ اوپر کی جانب سفر پر روانگی ہی واحد حل ہے۔ "اور تمہارا کیا خیال ہے ہم کب تک یہ آمد و رفت جاری رکھ سکتے ہیں؟" کپتان دریافت کرتا ہے۔

"اس سوال کا جواب فلورنتینو اریزا کے پاس ترپن سال سات ماہ اور گیارہ دن رات سے تیار تھا، "زندگی کے خاتمے تک۔"

فلورنتینو اریزا کے جواب میں شامل عرصے کی طوالت کم و بیش مارکیز کی اس وقت کی عمر کے برابر ہے جب وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا۔ لہذا اس سوال میں یہ سوال بھی موجود ہے کہ وہ اور کتنے عرصے تک ایک ادیب کے طور پر ورجینز رہ سکتا ہے۔ سفر کے جاری رکھنے میں ایک رکاوٹ جہاز کے بوائلر کے لیے لکڑی کی کمی ہے (دریا کنارے کے جنگل کٹ چکے ہیں)، اور یہ خوف کہ دریا خشک ہو کر موٹروں کے رستے میں تبدیل ہو جائے گا۔ ایسے پہلے ناول سے لے کر مارکیز اس دنیا کے خاتمے کے بارے میں فکرمند رہتا ہے جس کے بارے میں وہ لکھ رہا ہو۔ یہاں البتہ اسے اعتماد ہے کہ تحریر کی مشین اپنا سفر جاری رکھ سکتی ہے۔ اسے بلاشبہ ایندھن اور وسعت کی ضرورت ہے لیکن اب وہ اپنے استعمال میں آنے والی اشیا کو تباہ نہیں کرتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اشیا -- بیسویں صدی کی سرمایہ داری سے قبل کی روایتی دنیا -- خود مٹتی جا رہی ہیں۔ یہ امر اس سوال کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے کہ مارکیز کی اگلی تحریر کیا ہو گی۔

مائیکل وُڈ

ترجمہ: اجمل کمال

تنہائی کے سو سال

لاطینی امریکی ادب اس براعظم کی فتح (the Conquest) سے پیشتر بھی موجود تھا، اگرچہ وہ لاطینی نہیں تھا اور نہ خود کو امریکی کا نام دیتا تھا۔ لیکن اس کے اسدار میں کوئی ایسی بات ہے کہ وہ باربار بےحد قریبی زمانے کا معلوم ہوتا ہے، گویا اسے ابھی دریافت کیا گیا ہو اور یہ احساس صرف باہر والوں تک محدود نہیں۔ اس کی تاریخ میں ہر طرح کے خلا موجود ہیں — اندھیرے کے اور بہاؤ رک جانے کے وقفے۔ اور چلی کے ادیب خوزے دونوسو (Jose Donoso) کا کہنا ہے کہ معاصر لاطینی امریکی فکشن کا موجودہ عروج جسے Boom کا نام دیا جاتا ہے اور جو وسیع اور قابلِ لحاظ نئی تحریروں کی صورت میں کوئی بیس سال قبل نمودار ہوا، ایسے ادیبوں کی پیداوار ہے جن کے دادا تو تھے لیکن باپ نہیں تھے۔ ان کی ادبی روایت میں ان سے فوراً پہلے کوئی مثال یا کسی متعین راہ کا سراغ نہیں ملتا، لیکن اس کمی نے ایک بار اس کا مکمل ادراک ہو جانے کے بعد ایک بہت قابلِ دید موقعے کی صورت اختیار کر لی۔

اس عروج کے واسطے ہسپانوی زبان میں بھی انگریزی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس سے اس پورے معاملے پر ایک ہلکی سی بدیسی خوشبو چھا جاتی ہے، اور ایک دھماکے کی سی گونج، El Boom۔ لاطینی امریکی فکشن کی یہ فراوانی بےحد گرماگرم بحثوں کا موضوع رہی ہے۔ اسے ذرائع ابلاغ کی ایجاد اور فرانسیسی اور امریکی ناشروں کے ذہن کی پیداوار کے طور پر دیکھا گیا ہے، ایک طرح کے ادبی مافیا کے ارکان کی ایک دوسرے کی تحریروں کو بڑھاوا دینے کی سازش کے طور پر دیکھا گیا ہے اور اسے ایک تابناک نئے جنم، بلکہ پہلے جنم، اس ادب کی آزاد زندگی میں پہلی بار آمد کے طور پر بھی دیکھا گیا ہے۔ "بوم" کی اصطلاح کو بازاری،

نامناسب اور فن کے لیے توہین آمیز خیال کیا گیا ہے؛ اس کے باوجود، اگر ہم اسے زیادہ سنجیدگی سے نہ لیں، تو یہ مجھے اس مظہر کو بیان کرنے کے لیے نہایت موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اس سے نئے ادیبوں کی دریافت کے توانائی سے معمور جوش و خروش کا پتا چلتا ہے اور بڑے کارآمد طور پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ گویا ان ادیبوں نے تخیل کی سرزمین میں تیل کے ذخیرے دریافت کر لیے اور مالامال ہو گئے۔ "بوم" کی اس سرزمین کا سب سے دیرپا نشانِ راہ "تنہائی کے سو سال" ہے۔

لاطینی امریکی ادب کے اس عروج کے ساتھ باربار وابستہ ہونے والے ناموں میں خولیو کورتاثار (Julio Cortazar)، کارلوس فوئنتیس (Carlos Fuentes)، گیئرمو کابریرا انفانتے (Guillermo Cabrera Infante)، گابریئل گارسیا مارکیز اور ماریو برگس یوسا (Mario Vargas Llosa) کے نام شامل ہیں، اگرچہ بہت سے دوسرے ادیبوں کے نام بھی اس تذکرے میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان ناموں کی قومیتیں بھی ایک دلچسپ کہانی سناتی ہیں: ایک ارجنٹینی، ایک میکسیکی، ایک کیوبن، ایک کولومبیئن اور ایک پیرووین۔ پورے براعظم پر محیط ادبی تحریکیں پہلے بھی ہو چکی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اور لاطینی امریکی ادب کی تحریک میں نئی وفاداریوں کا واضح احساس موجود ہے؛ یہ اپنے اپنے ملک سے نہیں، بلکہ لاطینی امریکا سے، ہسپانوی زبان سے، جدید ادب سے، اور فکشن اور دنیا کے درمیان تعلق کے مخصوص نظریات سے وفاداری ہے۔ اگر ہم (خوزے دونوسو کی بات میں) اتنا اضافہ کر سکیں کہ بن باپ کے ان ادیبوں کے ممتاز اور مقبول بدیسی چچا موجود تھے — جوئس، کافکا، ہیمنگ وے، فاکنر — اور انھوں نے لگتا ہے اپنی پوری زندگی سینما دیکھنے میں گزاری ہے تو ایک تصویر سی بننے لگتی ہے۔ ہمیں ان کے مقامی چچوؤں مثلاً بورخیس (Borges)، کارپینتیئر (Carpentier) اور اونیتی (Onetti) کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا ہے، حالانکہ یہ موقف اختیار کرنے کے ہیں، کہ یہ باپ نہیں بلکہ چچا تھے، ادبی تاریخ کے ایک مکمل نظریے کی ضرورت پڑے گی، کہ یہ نئے ذہنوں کے لیے مواقع کی نشان دہی تو کرتے ہیں لیکن حسب نسب کا سلسلہ ان سے قائم نہیں ہوتا۔

یہ "بوم" اتنا بڑا نہیں تھا کہ اسے نشاۃ الثانیہ کا نام دیا جا سکے، اور یہ ایک تحریک بھی نہیں تھا، اگر تحریک سے مراد ایک سوچی سمجھی لائحۂ عمل پر مبنی یک ادبی دبستان ہو۔ لیکن لاطینی امریکہ میں اس کے نمودار ہونے کی معنویت کسی تہذیبی اُبال یا عجیب الخلقت حادثے سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ اپنا شعور رکھنے والی جدّت پسندی کا خود پر اصرار تھا؛ اس سے علاقائیت اور عدم‌رجائیت کا خاتمہ ہوا؛ اور اسے، ایک اور تعریف کی رو سے، بالکل درست طور پر ایک تحریک کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ مخصوص قوّتوں کی ایک مخصوص وقت پر مجتمع ہو جانے کا مظہر تھا۔ یہ مخصوص وقت ۱۹۶۰ کی دہائی کا تھا (اس "بوم" کے دور سے تعلق رکھنے والا آخری ناول شاید دونوسو کا *The Obscene Bird of Night* تھا جو ۱۹۷۰ میں شائع ہوا) اور یہ مخصوص قوتیں بنیادی طور پر ادبی بےصبری اور سیاسی ناامیدی کی قوتیں تھیں۔

بےصبری کا وجود واضح ہے۔ ان ادیبوں پر بدیسی اثرات، محبوب قصوں کے پُرتخیل اور جذباتی عناصر، بورخیس، کارپینتیئر اور اونیتّی کی عجیب و غریب اور ذہن پر چھا جانے والی انگیخت، ان سب نے مل کر قصہ گوئی کی ان تکنیکوں کے لیے سرمایہ فراہم کیا جو آزمائی جانے

کے منظار میں نہیں، طنز اور لعنت کا ایک آمیزہ ایجاد کیا، معروف معنوں میں حقیقت پسندی کے بارے میں فکشن میں اور اس سے باہر کی دنیا دونوں میں، گہرے شکوک پیدا کیے۔ کارپینٹیر نے لاطینی امریکی حقیقت کی عجائبات کا تذکرہ کیا، جو فریضے کے طور پر اختیارکردہ حقیقت پسندی میں لازمی طور پر غیرموجود ہوتے ہیں، اور مقبول عام تنقیدی اصطلاح "جادوئی حقیقت نگاری"، جو اگرچہ ابہام سے بھرپور ہے، لیکن اس کے باوجود ادبی تناظر میں ایک تغیر کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس مقام تک آ کر ہمارا سامنا قابل لحاظ قسمیات اور تاریخی پیچیدگیوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے شاید اتنا کہنا کافی ہو گا کہ "بوم" سے تعلق رکھنے والے ادیبوں پر گویا پہلی بار اور اچانک، یہ انکشاف ہوا کہ دنیا، ایک ساختہ شے اور بدیہی ناممکنات سے بھرپور ہونے کے باوجود، ایک حقیقی وجود رکھتی ہے، اور یہ کہ تخیل تقریباً ہمیشہ درست ثابت ہوتا ہے۔ چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جو چیز آپ کے محض تخیل میں آئی ہے کوئی نہ کوئی شخص پہلے ہی سے سر انجام دے چکا ہے یا یہ کہ آپ کے تخیل نے کسی شخص کی ضرورت کے مطابق ایک موزوں استعارہ وضع کر لیا ہے، اور یہ کہ ان حالات میں فکشن کھیل کا میدان بھی ہے اور جنگ کا میدان بھی۔ یہی وہ مخصوص جگہ ہے جہاں کلچر کے بنیادی جھگڑے چکائے جا سکتے ہیں اور چکائے جاتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایک اعتبار سے یہ مزاح اور کچھ کچھ مضطرب بےصبری حاوی ہو رہی ہے۔ وقتوں کو معدوم کرتے ہوئے اور کئی پشت پیچھے جا کر، ہم ایک غیرمتواتر ہسپانوی امریکی روایت کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ طریقہ پیچھے لوٹ کر اس روایت کے ٹکڑے جوڑنے کا عمل ہے۔ لیکن روایت کی شکل متعین کرنے کا مروجہ طریقہ اور کون سا ہے؟ مثلاً بیروک یوروپ میں زوال کو پہنچ جانے کے بہت بعد تک لاطینی امریکہ میں پھلتا پھولتا رہا اور یہ عجیب حقیقت "بوم" کی تحریروں کے بعض مخصوص نقوش کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتی ہے۔ "بوم" دوسری قسم کے ناول کے پھلنے پھولنے کا موقع ثابت ہوا؛ وہ ناول جو ہر چیز کو بیان کرتا ہے یہاں تک کہ واضح اور خواب میں دیکھی ہوئی چیزوں کو بھی۔ یہ بیروک کا ایک جدید روپ ہے۔

اس تحریک کے ابتدائی خدوخال ہمیں بورخیس کے ہاں نظر آتے ہیں، جہاں حقیقت کی بےلاگ نقل کی بجائے اس کی منقلب شدہ صورت کا رواج ہے۔ یہ بات کہ فکشن کا یہ ادراک اب خاصا مانوس لگتا ہے بلکہ "بوم" کے لیے اس کی حیثیت ایک روزمرہ کے معمول کی سی ہے بورخیس کے اثرات کی ہمہ گیری کی شاہد ہے۔

اوکتاویو پاز (Octavio Paz) کا کہنا ہے کہ تاریخی اعتبار سے لاطینی امریکہ یوروپ کی ایجاد ہے "یوروپی یوٹوپیاؤں کی تاریخ کا ایک باب"، اور یہ بات "غیرحقیقی" ہونے کے ایک آزارکن اور عجیب وغریب احساس کا ماخذ ہو سکتی ہے۔ یہ نہ تو جدید یوروپیوں کا مابعد الطبیعیاتی یا epistemological کرب ہے، نہ شمالی امریکیوں کی، تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی اور جغرافیائی منظر سے پیدا ہونے والی بےزاری ہے، بلکہ یہ تو کسی اداکار کی اس تھکن اور اکتاہٹ کی طرح کا احساس ہے، جو ایک طویل عرصے تک جاری رہنے والے ناٹک سے پیدا ہوا ہے، جس کے بارے میں وہ ایک قدیم اور دلی ہیبت کا شکار ہے یہ احساس ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ

حقیقت ہرگز نہیں ہو سکتی؛ یہ تو کسی اور کا دیکھا ہوا خواب ہے۔ یہ "کوئی اور" مختلف زمانوں میں بلاشبہ مختلف روپ اور vantage-points اختیار کرتا رہا ہے، اور آزادی کے بعد کے لاطینی امریکی اور طرح کے خوابوں میں مقیم ہیں۔ لیکن غیرحقیقی پن کا وہ احساس اب بھی برقرار ہے۔

دوسرے الفاظ میں، غیرحقیقی پن کا احساس مقامی حقیقت کا ایک حصہ ہے، جس کا بہترین بیان بیروک کی مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ اسی ادراک کی پُرجوش اور اکثر حیرت خیز تفہیم کے اظہار کی بےتابی ہی وہ مظہر ہے جسے میں ادبی بےصبری کا نام دیتا ہوں۔

سیاسی ناامیدی کا تخمینہ لگانا البتہ اس سے زیادہ دشوار ہے۔ ایک زمانہ تھا جب "بوم" کو ۱۹۵۹ کے کیوبن انقلاب کا ادبی بازو خیال کیا جاتا تھا، اور یہ ایک ایسا خیال تھا جس میں اگر ایک کچی پکی فہم کے بیج نہ ہوتے تو اسے قطعی مہمل قرار دیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام ادیب بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور کیوبن انقلاب کے ابتدائی دنوں میں اس کے ہمدرد تھے۔ ان میں سے بعض نے — مثلاً گارسیا مارکیز نے، اور ۱۹۸۴ میں وفات پانے تک کورتازار نے — ہمدردی یا ایک ہمدردی سے زیادہ کا رویہ جاری رکھا، اور بعض نے اس سے محتاط فاصلہ اختیار کر لیا یا اس سے خود کو بالکل علیحدہ کر لیا، مثلاً کابریرا انفانتے، جو اب ایک برطانوی شہری کی حیثیت سے لندن میں مقیم ہے۔ لیکن یہ سب در اصل غیر اہم معمولی معاملات ہیں اور درحقیقت اس کچی پکی فہم کا تعلق تمام لاطینی امریکیوں کے لیے کیوبن انقلاب کی ناقابل فرار حیثیت سے ہے، خواہ اس کے بارے میں ان کا رویہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ادب اس انقلاب کا حاشیہ بردار نہیں تھا، لیکن اس کا مسکن کوئی اور دنیا تو نہیں تھی۔

اس انقلاب کی اہمیت نہ صرف ادب کے لیے بلکہ تقریباً ہر چیز کے لیے مسلّم ہے لیکن اس اہمیت کا واضح طور پر تخمینہ لگانا ناممکن ہے۔ میں صرف ایک اندازہ لگانا چاہتا ہوں، جو میرے خیال کے مطابق گارسیا مارکیز کے معاملے میں، اور مارکیز کے بارے میں میرے احساس کے حوالے سے تو خصوصاً برمحل ہے ہی، لیکن دوسرے ادیبوں کے سلسلے میں بھی اس میں کوئی کام کی بات ہو سکتی ہے۔ میں سیاسی ناامیدی کا ذکر کر رہا ہوں، اور کیوبن انقلاب نے اس احساس کو زائل بھی کیا اور اس میں پیچیدگی بھی پیدا کی۔ اس نے اس تصور کو تبدیل کیا کہ لاطینی امریکیوں کے لیے کیا کچھ ممکن ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ جو چیز ناگزیر دکھائی دیتی ہے اسے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے اور عزم کے سہارے، ہر قسم کی خطرناک رکاوٹوں کو عبور کر کے کوئی بھی مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انقلابات اپنے ابتدائی دنوں میں اسی طرح کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس انقلاب کے اثرات ایک چھوٹے سے جزیرے تک محدود رہے اور باقی برصغیر کی حالت پہلے کی طرح رہی بلکہ پہلے سے اور بدتر ہو گئی۔ انقلاب کی قائم کردہ مثال مسلسل تھی لیکن اس کی نوبت کہاں تک پہنچ سکتی تھی؟ ان حالات میں ناامیدی بعید از قیاس نہیں بلکہ تعجب کا معاملہ بن گئی ... تھا، اور بہت سوں نے کیا بھی۔ لیکن یہ ناامیدی کسی شخص کا اعتقاد متزلزل ہونے پر منتظر ملتی تھی، اور اکثراوقات حقائق اسی کی تائید کرتے تھے۔

"بوم" کے زمانے کا زیادہ تر فکشن اسی ناامیدی سے باوقار انداز میں انکار کی جدید لیکن

اس کے پھر بھی مذاقیہ رہنے کی پیداوار ہے۔ یہ ادبی فراوانی، بیانیہ تکنیکوں کا یہ بلند ہمت مظاہرہ ایک زادی کی خوشی کا جشن منانے کے لیے ہے جو اخلاقی بھی ہے سیاسی بھی اور تشکرات بھی؛ لیکن ایک سوگوار حسِ مزاح، الم اور باوقار شکست سے مانوس ذہنی کیفیت لاشیں شمار کرتی ہے، ایذاؤں، بظاہر لافانی حکمرانوں، فرقہ وارانہ جھڑپوں، اور آگے کی طویل راستے کا حساب کرتی ہے۔ گرامشی کے قول "عقل کی قنوطیت، عزم کی رجائیت" کی طرح، اس کیفیت کو ذہن اور دل کی رجائیت، لیکن جسم اور ہڈیوں کی قنوطیت، ایک غیرحقیقی اور مطلق العنانی تاریخ کے ناقابلِ برداشت بوجھ کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

وہ ادیب خود شاید اس تجزیے سے اتفاق نہیں کریں گے اور غالباً ممکنات کے زیادہ مثبت خیال کے حق میں بحث کریں گے، اور میں ان کو درست سمجھنا چاہوں گا۔ لیکن ان کی تصورکردہ دنیا کا استناد ان کے خلاف شہادت دیتا ہے۔ ان کے حق میں جو بہترین بات کہی جا سکتی ہے۔۔ مگر یہ بہت بڑی بات ہے اور ان کی تحریروں کی طاقت کے بنیادی سرچشمے کی نشان دہی کرتی ہے۔۔ وہ یہ ہے کہ وہ ناامیدی کو ایک شدید آزمائش میں ڈالتے ہیں، جو ان سے پہلے کسی نے شعوری اور حقیقت پسندانہ انداز میں کبھی نہیں کیا۔ یہ ادیب ناامیدی کے وجود سے انکار نہیں کرتے، نہ اس سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ یہ تو اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ "تنہائی کے سو سال" میں ناامیدی کو پاش پاش کر دیا گیا ہے، اسے ایک واہمے، تقدیر کے ایک فریبِ نظر کی شکل دے دی گئی ہے۔ لیکن یہ ایک پُرکشش واہمہ ہے، جبکہ پاش پاش کرنے کا عمل رازدارانہ ہے، جو آسانی سے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ترقی پسندوں کو اس کتاب نے، اور اس کے نام نہاد قنوطی اور معدومیت پسند انداز نے ہمیشہ الجھن میں ڈالا ہے۔ یہ انداز تو ذاتی اور تاریخی اسباب کی پیداوار ہے جسے ہر صورت میں موجود ہونا ہی تھا، لیکن جس توانائی سے کتاب میں اس کی مزاحمت کی گئی ہے، حتیٰ کہ وہ مزاح اور تمسخر جس کے ذریعے اسے بیان کیا گیا ہے، بلاشبہ بڑی حد تک ناامیدی کے اس احساس کی پیچیدگی کا مرہونِ منت ہے جو کیوبا کی مثال سے پیدا ہوا۔

لیکن اس نقطۂ نظر میں معاصر لاطینی امریکی ادیبوں کی قومی شناخت کو انداز کر کے ان پر ایک پین امریکن رنگ لاد دینے کا خدشہ موجود ہے۔ لاطینی امریکا کے لوگ متوازی تاریخ اور مشترک امیدیں اور مشترک آسیب رکھتے ہیں، لیکن ان کی، درجہ بدرجہ مختلف، مقامی تاریخیں بھی ہیں۔ "تنہائی کے سو سال" اس اعتبار سے "بوم" کے زمانے کی تحریروں کا مکمل طور پر نمائندہ ہے۔ یہ اختلافات کو حذف کر کے وقت اور سیاست، موسم اور تہذیب کے ایک مشترکہ لاطینی امریکی تجربے تک رسائی پانے کی کوشش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ اس تاثر کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوا ہے، لیکن اختلاف کو نہیں بلکہ صرف ناموں کو حذف کر کے۔ یہ تعمیم یا تجرید سے کام نہیں لیتا، یہ مسلسل کولمبیئن حقیقتوں کو اٹھاتا ہے اور ان پر سے لیبل ہٹا دیتا ہے۔ اس سے ان حقیقتوں کے کولمبیئن ہونے میں کوئی کسر نہیں آتی، مگر اتنا ضرور ہوتا ہے کہ وہ صرف کولمبیئن نہیں رہ جاتیں۔

کولمبیا جمہوریت کی ایک طویل روایت رکھتا ہے لیکن یہ اونچے طبقوں کی جمہوریت ہے، جو درحقیقت امرا کے چند حریف گروہوں کے درمیان مسابقت سے زیادہ کچھ نہیں۔ لبرل اور کنزرویٹو جو پوری انیسویں صدی، اور بیسویں صدی کے بیشتر حصے کی سیاست پر چھائے رہے، قطعی مختلف اصولوں کے علم بردار تھے: اصلاح یا رجعت پسندی، آزادیِ تجارت یا تحفظات، کلیسا اور ریاست کی علیحدگی یا یکجائی۔ لیکن ان دونوں گروہوں کی یکسانیت کو "تنہائی کے سو سال" میں مبالغہ آمیز تمسخر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم یہ دونوں پارٹیاں طبقاتی مفادات کے ایک تنگ دائرے کے اندر رہتے ہوئے بھی دو متضاد تناظروں کی نمائندگی کرتی تھیں، اور انھوں نے مقامی طور پر شدید وفاداریوں اور نفرتوں کو جنم دیا تھا، جنھیں، یہاں تک کہ لوگوں کے مفادات کے برخلاف بھی، سختی سے برقرار رکھا گیا، جس کے اثر سے لوگ خود کو ڈیموکریٹ اور ری پبلکن کی بجائے ("رومیو اینڈ جولیٹ" کے حریف خاندان) کیپولیٹ اور مونٹیگو خیال کرنے لگے۔ ناول میں خانہ دار ڈرافٹ کے کھیل سے متعلق ایک گفتگو میں اس سیاسی کیفیت پر ایک تیز اور پُرمزاح تبصرہ کیا گیا ہے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا پادری کے ساتھ ڈرافٹ کھیلنے پر تیار نہیں، کیونکہ وہ ایسے کسی مقابلے میں حصہ لینے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکتا جس میں حریفوں کے درمیان اصولوں پر اتفاقِ رائے ہو چکا ہو۔ پادری، جس نے ڈرافٹ کے کھیل کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا، کھیل جاری نہیں رکھ پاتا۔ یہ ایک دھیما اور معمولی سا تبصرہ ہے، لیکن اس کی وسعت قابلِ لحاظ ہے۔ اس سے یہ تاثر بھی مل سکتا ہے کہ حوزے آرکادیو بوئندیا، جسے فاترالعقل سمجھا جاتا ہے، ڈرافٹ کے کھیل کو نہیں سمجھ سکتا، کیوں کہ وہ جنگ، یا سیاست، یا جنیوا کنونشن، کو سمجھنے کے قابل نہیں؛ یہ ایک انتشارزدہ اور للکارنے والی تنہائی ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی مل سکتا ہے کہ دنیا کے زیادہ تر تنازعات کا تعلق اصولوں کے سوا ہر چیز سے ہوتا ہے؛ اصولوں پر یا تو اتفاقِ رائے ہو چکا ہوتا ہے، یا پھر وہ قطعی غیرمتعلق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس وقت جب کرنل اوریلیانو بوئندیا پر منکشف ہوتا ہے کہ لبرل اور کنزرویٹو دونوں کی جنگ کا مقصد صرف اقتدار کا حصول ہے، اور وہ اس مقصد کے لیے اصولوں کے بنیادی نکات کو قربان کرنے پر تیار ہیں۔

کولمبیا کی بیشتر تاریخ دیہاتی "تنہائی کے سو سال" میں در آتی ہے: انیسویں صدی میں اصلاحات پر بحثیں، ریلوے کی آمد، ہزار روزہ جنگ، امریکی فروٹ کمپنی، سینما، موٹرکاریں، ہڑتالی کیلے کے مزدوروں کا قتلِ عام، جو مارکیز کی پیدائش کے برس ہوا تھا۔ کولمبیا کی تاریخ سے ناول کے واقعات کی ان مطابقتوں نے کئی نقادوں کو یہ خیال کرنے پر آمادہ کیا ہے کہ مارکیز قطعی مخصوص طور پر ایک کولمبیئن ادیب ہے جو اپنے کرداروں کی تمام تر تاریخ پر حاوی ہے، جبکہ اس کے بہت سے ہم وطن اس سے محروم ہیں۔

لیکن کولمبیا کی جدید تاریخ کی سب سے تعجب خیز حقیقت کا، یعنی تشدد کی اس لہر کا جسے صرف "دی وائلنس" la violencia، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، "تنہائی کے سو سال" میں کہیں ذکر نہیں۔ یہ لہر گوریلوں، غنڈوں، خودمدافعتی گروہوں، پولیس اور فوج کی پیدا کردہ تھی، اور اس میں تقریباً دو لاکھ افراد مارے گئے تھے (جو اس کا کم از کم تخمینہ ہے)۔ انیس سو پچاس میں جب دعویٰ کیا گیا کہ اس کا خاتمہ ہو گیا ہے یا کم و بیش اس پر قابو پا لیا گیا

ہیں، تب بھی ہر ماہ دو سو افراد اس کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ تشدد کی یہ لہر کولمبیا کے لوگوں کے لیے ناقابلِ فرار حقیقت ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر اس سے متاثر ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، بالکل اسی طرح جیسے عموماً لاطینی امریکی باشندوں کے لیے کیوبن انقلاب ایک ناقابلِ گریز حقیقت رکھتا تھا۔ تشدد کی اس لہر نے میکسیکو کی ایک سیلاب کو جنم دیا اور خود مارکیز کی تحریروں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "منحوس وقت" میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ گو کہ وہ اس کا ذکر نہایت ڈھکے چھپے انداز میں کرتا ہے، اور تاریخ کی بربریت کے ہاتھوں بےسکوں محسوس ہوتا ہے۔ میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس کے ہاتھوں، ہم سب کی طرح، مضطرب ہے بلکہ یہ کہ اسے تشویش ہے کہ کہیں اس کا فن اس کی لپیٹ میں نہ آ جائے۔ اس بات کے کئی پہلو ہیں۔ گارسیا مارکیز کا اسلوب تیزرفتار اور سرسری ہے اور اسے خمدار بیانیے میں کمال حاصل ہے۔ اس کی تحریروں میں ولن کے کردار تقریباً ناپید ہیں۔ کوئی صورت حال ایسی نہیں جو پیچیدگی میں انتہا کو پہنچی ہوئی نہ ہو — اس کے بیانیہ اسلوب کی سادگی ایک ظاہری پردہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے چارلی چپلن کا بےڈھنگاپن — اور اس کے پاس ہولناکیوں کے بیان کے لیے مزاح اور صبر کی زبان کے سوا اور کوئی لغت نہیں۔ سب سے بڑھ کر اس کی نظر اس پر مرکوز ہے کہ لوگ اپنے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ، کس طرح رہتے ہیں، اور اپنی دنیا کو کس طرح دیکھتے ہیں؟ اور اگر یہ اردگرد کی دنیا تشدد کی اس لہر کی دنیا ہے تو بلاشبہ اسے بھی اسی سرسری عامیانہ انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ اس قسم کی دنیا میں اسی طرح رہنا ممکن ہے۔ ہولناکی ان تحریروں میں اسی عامیانہ انداز کے باعث در آتی ہے جس سے کرفیو اور لاشوں اور غیرفروخت شدہ نفرتوں کا ذکر کیا گیا ہے، گویا یہ سب کچھ روزمرہ کا معمول ہے۔

یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ "تنہائی کے سو سال" میں تشدد کی یہ لہر ہڑتالی مزدوروں کے قتلِ عام کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جو بجائےخود بےحد پُرتشدد ہے اور بعد کے آنے والے واقعات کا خلاصہ اور ان کی پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ خورخے ایلیئسیر گیتاں (Jorge Eliecer Gaitan) ہی جس کے قتل سے تشدد کی اس لہر کا آغاز ہوا تھا، سیاسی شہرت ۱۹۲۸ کی اس ہڑتال کی تحقیقات ہی کے باعث حاصل کی تھی۔ گویا ان دونوں واقعات میں ایک طرح کا تعلق موجود ہے۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ ناول کے اختتام پر آنے والی وہ آندھی جس میں ماکوندو کا قصبہ نیست ونابود ہو جاتا ہے، درحقیقت تشدد کی اس لہر ہی کا "پردہ پوش استعارہ" ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو آندھی اور نہ قتلِ عام، تشدد کی اس لہر سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ یہ دونوں واقعات ظالمانہ لیکن ابہام سے پاک ہیں، خوفناک لیکن اسرار سے عاری ہیں؛ یہ ہلاکت خیز اور موثر ہیں، جبکہ تشدد کی لہر بےحد منتشر، سیاسی طور پر ابہام کا شکار، اور ایک ٹوٹا اور بکھرا ہوا المیہ ہے؛ یہ کسی تعریف یا تشخیص حدود یا معنویت کو روا نہیں رکھتی۔ اس کا احساس بےقابو ہو جانے والی جھڑپوں کے بےحد وسیع پھیلاؤ کا سا ہے۔ اور میرے خیال میں اس تشدد کی بےمعنویت ہی ہے جو "تنہائی کے سو سال" پر مسلط ہے، یعنی یہ سبق نہیں کہ تاریخ سفاک ہوتی ہے، بلکہ یہ کہ تاریخ بےقابو اور وحشی بھی ہو سکتی ہے، اور یہ کہ محض انتشار بھی ممکن ہے، اور یہ کہ جب یہ ہماری

سمجھ سے باہر ہو تو ہمیں اس کو سمجھنے کی اداکاری نہیں کرنی چاہیے۔

مورّخوں نے بلاشبہ تشدد کی اس لہر کے اسباب کی بابت بےحد دلچسپ قیاس آرائیاں کی ہیں۔ ظاہر ہے یہ اسباب معاشی، سیاسی اور دیگر محرکات کا مرکب تھے، لیکن اگر ہم مورّخ نہیں ہیں تو ان تمام محرکات پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں جیسے شمالی آئرلینڈ کی صورت حال، یا فٹ بال میچوں میں تشدد کے واقعات پر۔ ہم بعض محرکات کو قبول کر لیتے ہیں، بعض کو غیراہم قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، اور بعض اور محرکات کو متعلق قرار دے لیتے ہیں، بغیر یہ جانے کہ ان سب کے مل کر کیا صورت بنے گی۔ لیکن ان سب کو ملا کر بھی صورت حال کی وضاحت نہیں ہو پاتی، اور ایک ناقابلِ فہم مریضانہ کیفیت کا تاثر زائل نہیں ہوتا۔ تشدد کوئی غیرانسانی یا آسیبی شے نہیں ہے، نہ یہ کہیں اور سے بھیجی گئی کوئی وبا ہے، بلکہ یہ خود ہمارا مسخ شدہ چہرہ ہے، لیکن یہ چہرہ عقل کی رسائی سے باہر ہے اور ہماری جانب دیکھ کر دانت نکوستا ہے۔

"تنہائی کے سو سال" کے کردار خود بھی تاریخ کی بہت سی مختلف خواندگیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اگرچہ وہ خود اس نمائندگی کا دعوا نہیں کرتے۔ یہ خواندگیاں عموماً جاہلانہ یا مغالطے پر مبنی ہوتی ہیں، اور اکثر تاریخ سے قطعی طور پر جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن گارسیا مارکیز خود تاریخ کی ان تمام خواندگیوں کی حریف، یا ان سے بالاتر کوئی خواندگی پیش نہیں کرتا۔ اس نے اپنے ناول کی شکل ان توہّمات کی شکل پر ڈھالی ہے جو اس کا حصہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ناول ناامیدی کا اظہار کرتا معلوم ہو سکتا ہے، اور خود مصنف محض تشکیک، صبر اور مزاح کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے، اور دانائی کی سوانگ یا منافقت سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ اظہار خواہ کتنا ہی دھیما معلوم ہوتا ہو، بےحد قابلِ لحاظ ہے، اور بجائےخود ایک آزادی ہے، اور ہمیں اس انتہائی پُرکشش اور بظاہر ناگزیر دیومالا کو بیک وقت جاننے اور اس پر یقین نہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔

مارکیز کی ابتدائی افسانوی تحریریں ان حیرت کر دینے والے اکا دکا مکالمات کے باعث یادگار ہیں، بیانیہ جن کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ "دروازہ نہ کھولنا،" ایک عورت کہتی ہے، "راہداری دشوار خوابوں سے بھری ہوئی ہے۔" "مادام،" ایک ڈاکٹر کسی اور عورت سے کہتا ہے، "آپ کے بچے کو ایک سنگین مرض ہے؛ وہ مرچکا ہے۔" ان میں سے زیادہ تر تحریریں غیرمعمولی، یا بمشکل تصور میں آنے والے حالات سے متعلق ہیں مثلاً کسی ایسے شخص کی موت جو پہلے ہی مر چکا ہے، زندوں کو دیکھتی ہوئی کسی بدروح کی زندگی، آئینے میں ایک ہستی کا جداگانہ وجود، ایک مرد اور عورت کی گفتگو جو صرف خوابوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان تحریروں سے ایک ایسے نوجوان ادیب کا تصور ابھرتا ہے جو ایڈگر ایلن پو کو جدید روپ میں پیش کرنے کی کوشش میں ہو، جسے شعور کی مختلف حالتوں اور نقل مکانی اور عدم وجود کے استعاروں سے دلچسپی ہو۔

"پتّوں کا طوفان" (۱۹۵۵) میں گارسیا مارکیز ماکوندو کی دنیا کو دریافت کرنا شروع

کرتا ہے، ماکوندو، مستقلاً حارہ کی بارشوں کا شکار، کیلے کی باغوں والا قصبہ جو "تنہائی کے سو سال" کا محلِ وقوع ہے اور جو "بڑی ماما کا جنازہ" کی کئی کہانیوں میں، کبھی اسی نام کے ساتھ اور کبھی گمنام، نمودار ہوتا ہے۔ گارسیا مارکیز انکسار کے ساتھ، بالزاک اور فاکنر کی پیروی کرتے ہوئے کرداروں اور واقعات کی جابجا تکرار سے کام لیتا ہے، اس طرح کہ کہانی کے ٹکڑے بھی بہی ایک متن سے دوسرے متن میں چلے جاتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت بھی پیش آتا ہے، مثلاً "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "منحوس وقت" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں، جب یہ مقام ماکوندو نہیں بلکہ اس بےنام ملک کے اسی حصّے میں واقع ایک اور قصبہ ہے، جہاں ریلوےلائن نہیں ہے، اور جہاں تک صرف دریائی کشتی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ کرنل اوریلیانو بوئندیا نے، مثال کے طور پر، خانہ جنگی کے زمانے میں ماکوندو واپس آتے ہوئے اس قصبے کے ایک خستہ حال ہوٹل کی بالکنی میں ایک رات بسر کی تھی۔ کرنل، جس کے نام خط نہیں آتا پہلے ماکوندو ہی میں رہا کرتا تھا۔ لیکن جب کیلے کی تجارت کا جنون (banana fever) شروع ہوا تو وہ وہاں سے کوچ کر گیا۔ مزید برآں، یہ قصبہ ماکوندو کے بعد کے زمانے کا ہے، ور اپنے مرکزی بیانیے کے اعتبار سے حالیہ تاریخ اور تشدد کی لہر کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ ماکوندو ایک اندھی کی زد میں آ کر وقت کے کسی ایسے نقطے پر نیست و نابود ہو گیا جس کی واضح طور پر نشان دہی نہیں کی گئی، لیکن یہ ۱۹۳۰ کی دہائی سے بعد کا نہیں ہو سکتا۔ گارسیا مارکیز کا کہنا ہے کہ ماکوندو کا خاتمہ اس کی پیدائش کے سال ہوا تھا، لیکن اس بات کے درست ہونے کے لیے ہمیں ہڑتال اور قتلِ عام کے واقعات کو ان کے اصل تاریخی سباق و سباق سے بہت پیچھے لے جانا پڑے گا، کیونکہ ان واقعات کے بعد سالہاسال گزرتے اور بچے بڑے ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ بلاشبہ اس طرح کی کوئی تاریخیں ناول میں نہیں دی گئیں، اور ہمیں واقعات کے تاریخ وار سلسلے کے بارے میں زیادہ رد و قدح نہیں کرنی چاہیے جس کے شارے اندرونی طور پر موجود نہیں۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ ماکوندو، دوسرے قصبے کے برعکس، نابود شہر ہے، اور اسے نابود ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔ ماکوندو صرف ایک یاد ہے بلکہ یاد سے بھی کم، یہ افسانے کے اندر ایک افسانہ ہے۔

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" (۱۹۶۱) اور "منحوس وقت" (۱۹۶۲) زبان اور ادب سے متعلق گارسیا مارکیز کے برتاؤ کی حکایات پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے اول الذکر ہزار روزہ جنگ میں بچ جانے والے یک صابر ور باوقار کرنل کے بارے میں ہے، جو اپنی اس پنشن کا بےسود انتظار کر رہا ہے جس کا بہت پہلے وعدہ کیا گیا تھا، اور اس دوران اپنی بیمار بیوی کی مفلسی کے عالم میں دلجوئی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کا بیٹا تشدد کی لہر کے دوران مارا جا چکا ہے، اور خود کرنل اب تک کبھی کبھار ممنوعہ پمفلٹ تقسیم کیا کرتا ہے۔ یہ ایک باکفایت، تیکھی، متاثرکن اور پرمزاح کہانی ہے، جس میں درباری رکھ رکھاؤ والا کرنل گالیاں دینا سیکھتا ہے ور یوں لفظوں کے ایک تشدد پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ اس طرح کی بدتہذیبیوں کے قطعاً خلاف رہا ہے لیکن اب خود کو لفظ "shit" (گو) کہتا ہوا پاتا ہے اس لیے کہ کسی اور لفظ سے وہ اپنا اظہار نہیں کر سکتا۔

"اس ایک لمحے تک پہنچنے میں کرنل کو پچھتّر برس لگے تھے، ایک

یک لمحہ کر کے بسر کیے ہوئے اس کی زندگی کے پچھتر برس۔ جواب دینے کے لمحے میں اس نے اپنےآپ کو مکمل طور پر پاک صاف، واضح اور ناقابلِ تسخیر محسوس کیا۔۔۔"

یہ ایک پوری زندگی پر تبصرہ ہے، اور یہ تبصرہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ لیکن یہ اتنا تیکھا اور مرتکز ہے کہ اسے کھولنے کی کوشش میں اس کے معنی ضائع ہو جائیں گے، اور شاید ہمیں اس کوشش کی ضرورت بھی نہیں۔ نکتہ، میری رائے میں، دراصل یہی ہے کہ لفظ جملوں سے کہیں زیادہ کہہ جاتے ہیں، اور جہاں فتح پانا ناممکن ہو وہاں ایک لفظ فتح کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

"منحوس وقت" اسی قصبے کو ایک سیاسی جنگ بندی کی حالت سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میئر مالدار ہو رہا ہے، اور مزید مالدار ہونے کے لیے اسے امن درکار ہے۔ "ہم ایک شائستہ قصبہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں،" وہ کہتا ہے، اور ایک غریب عورت تیکھا جواب دیتی ہے، "یہ ایک شائستہ قصبہ ہی تھا جب تک تم لوگ نہیں آئے تھے۔" میئر کا ماضی بربریت سے بھرپور ہے، لیکن قصبے کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ اور جب یہ جنگ بندی، انتشار اور خونریزی کی جانب واپسی کے اشارے کے ساتھ ختم ہوتی ہے، تو پوری آبادی "اس بات کی تصدیق ہونے پر اجتماعی فتح کے احساس سے ہمکنار ہوتی ہے جو ہر شخص کے شعور میں موجود تھی: کہ حالات تبدیل نہیں ہوئے۔" یہ احساس، بدترین توقعات سے یہ تلخ ہمکناری ہی وہ شے ہے جس میں کسی انقلاب نے تبدیلی پیدا کی، کم ازکم بعض لوگوں کے لیے۔

وہ کیا شے ہے جو جنگ بندی کو ختم کرتی ہے؟ غالباً ہجویہ دیواری پوسٹروں کی وبا، افواہیں جنھیں نیلی روشنائی میں لتھیڑ کر راتوں‌رات پورے شہر کی دیواروں پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ بدکاریوں اور بدعنوانیوں کی داستانیں۔ لگتا ہے سب لوگ ان سے واقف ہیں، اگرچہ اس بارے میں بات نہیں کرتے۔ یہ کسی کو حیرت زدہ نہیں کرتیں، لیکن بدنامیوں کو مشتہر ضرور کرتی ہیں اور ہر اس شخص کو پریشان کرتی ہیں جس کی ان سے پریشانی ہونے کی توقع ہو۔ ایک شخص ایک حاسد شوہر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے قصبے کی معمر عورتیں کی متواتر معمول سے یادری کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، اور میئر کرفیو نافذ کر دیتا ہے۔ میئر کے کرگے غلطی سے ایک قیدی کو مار ڈالتے ہیں، گولیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں، قصبے کے مرد قصبہ چھوڑ چھوڑ کر جنگل میں گریلوں سے جا ملنے لگتے ہیں۔ اور اس تمام کے باوجود ہجویہ پوسٹر ان کا پاس اپنی یہ معمولی تباہ کن سرگرمی جاری رکھتا ہے، گویا ان تمام حالات سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

شاید اس کا ان حالات سے کوئی تعلق ہے بھی نہیں، اس لیے کہ گارسیا مارکیز خود بھی اسباب کا ایک اور سلسلہ تجویز کرتا ہے۔ قصبے کا دندان‌ساز خفیہ سیاسی پمفلٹ تقسیم کر رہا ہے قیدی جسے مار ڈالا گیا انھی پمفلٹوں کو تقسیم کرنے پر گرفتار ہوا تھا، اور گولیاں چلنی اس لیے شروع ہوئیں کہ حجام کی دکان کے فرش میں سے بندوقیں برآمد ہوئی تھیں۔ سیاست یا افواہ طرازی؟ ممکن ہے مصنف یہاں اپنے موضوع کے بارے میں ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو، اسے یقین نہ ہو کہ اسے کون سا رخ دے، لیکن ہجویہ پوسٹروں اور پمفلٹوں کا قریبی تعلق خاصا

واضح لگتا ہے، اور ان دونوں کی افسانہ طرازی کے فن سے تعلق کو نظرانداز کرنا بھی آسان نہیں۔

یہ تعلق تخیل کی قوت کی طرف اشارہ نہیں کرتا، جیسا کہ ماریو ورگس یوسا "منحوس وقت" کے بارے میں کہتا ہے، بلکہ اس سے فتنہ انگیزی کی قوت کا اشارہ ملتا ہے۔ اگر معاصر ادب ادب عالیہ کے بجائے افواہ طرازی اور پروپیگنڈا سے زیادہ قریب ہو تو؟ باوزن اور محفوظ ہونے کی بجائے بےوزن اور خطرناک ہو تو؟ تب شاید ذمےدارانہ ادب ہمیں اپنے خطروں کو پہچاننے کی تربیت دے سکے۔

وٹگنسٹین (Wittgenstein) نے ایک بار کہا تھا کہ اس کے لیے ایک ایسی فلسفیانہ تحریر کا تصور کرنا ممکن ہے جو تمام کی تمام لطیفوں پر مشتمل ہو۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لطیفے اگر فلسفے پر مبنی نہ بھی ہوں تو اس سے نہایت قریبی تعلق ضرور رکھتے ہیں۔ لطیفہ اس شے کی عین ضد ہے جسے ہم سنجیدگی خیال کرتے ہیں، اور میں انہیں ان کے مقام سے ہٹا کر دیانتدار شہریوں کے رتبے پر فائز کرنےکی خواہش نہیں رکھتا۔ لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ لطیفوں کا سنجیدگی سے ایک نہایت دلچسپ تعلق ہوتا ہے، جو صرف تضاد کا تعلق نہیں ہے۔ یہی نہ کہ وہ بلکے پھلکے، لیڑھےمیڑھے یا احمقانہ انداز سے ان موضوعات کو چھوتے ہیں جن کی ہمارے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ اور یہ کہ معاصر فکشن، خواہ ہم بیکٹ، بورخیس، کلوینو کینو (Queneau)، گراس، رشدی، فلپ روتھ، گارسیا مارکیز یا کتنے ہی دوسرے ادیبوں کی تحریروں کا تصور کریں، تمام کا تمام اس اعتبار سے لطیفوں سے بھرا پڑا ہے۔ تنقید کو ابھی تک اس انداز تحریر کے لیے مناسب زبان میسر نہیں آ سکی اور وہ مسلسل معاصر ادیبوں کو ان سے پیشتر کے ادیبوں کی پیروی، یا ان کا رد کرنے والوں کے طور پر دیکھنے میں مشغول ہے، گویا یہ ادیب صرف ان معیارات پر پورا اتر کر، یا ان کی مخالفت کر کے ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جو ہمارے پاس تھوک کے حساب سے موجود ہیں۔

گارسیا مارکیز کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ وہ ان ادیبوں میں سے ہے جن تک رسائی نہایت آسان ہے، اور میں نے "تنہائی کے سو سال" میں کسی دبی شدہ پوشیدہ معانی کی کوئی جستجو نہیں کی۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس لیے کہ کتاب کے سطحی معانی ہی اس قدر فراواں اور متنوع اور بحث کو مہمیز دینے والے ہیں۔ بلاشبہ مارکیز کا اس قدر رسائی میں ہونا ہی دراصل انتہائی غیرمعمولی خصوصیت ہے، کیوں کہ یہ ایک پیچیدہ وژن کے نہایت سادہ اظہار پر مشتمل ہے، جو سادہ لوحی سے، یا پیچیدگی کو کم یا زائل کرنے سے ایک قطعی مختلف کارنامہ ہے۔ میں اسے قرین قیاس یا مناسب بات نہیں سمجھتا کہ کوئی ادیب ان تمام یا اکثر معانی سے باخبر ہو جو کوئی پڑھنے والا اس کی تحریر میں دریافت کر سکتا ہے، گو کہ "باخبر" بجائےخود ایک بحث طلب اصطلاح ہے۔ عملی طور پر ادیب وہ سب کچھ جانتے ہیں جو تنقید نگار جاننے کا دعوا رکھتے ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ لیکن عموماً وہ اس کا اظہار تنقیدی الفاظ میں، بلکہ کسی بھی قسم کے الفاظ میں، نہیں کرتے، یا پھر وہ اس کا اظہار مصنوعی طور پر رفیع یا متروک الفاظ میں کرتے ہیں، ایک ایسے پیشے کی اصطلاحات میں جو ان کا پیشہ نہیں۔ اس خطے میں بہروں کے درمیان بہت سے مکالمے ہوئے ہیں۔ ہنری جیمز کے

ہیو ویریکر (*Hugh Vereker*) نے امتیازی طور پر مداحوں کو اپنے قالین میں کوئی شبیہ تلاش کرنے کی دعوت دی، یا بلکہ یہ خیال کرنے کی کہ کوئی شبیہ ہے جو، کسی اور کو بھی نہیں، نقاد کو نظر آ سکتی ہے۔ میں نے "تنہائی کے سو سال" کے اڑتے ہوئے قالین میں کوئی شبیہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اس میں فتنہ انگیزی کی نمایاں ترین سمت کو جاننے کی کوشش ضرور کی ہے۔

"امرود کی مہک" کے عنوان سے ذیل کے متن کو مارکیز کے اپنے دوست Plinio Apuleyo Mendoza کے ساتھ اس طویل مکالمے کے اقتباسات سے ترتیب دیا گیا ہے جو ۱۹۸۳ میں *The Fragrance of Guava* کے نام سے شائع ہوا۔ مارکیز کی زندگی، فن اور مختلف موضوعات کے بارے میں اس کے خیالات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اس متن سے قصہ گوئی کے فن پر مارکیز کی بے پناہ قدرت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

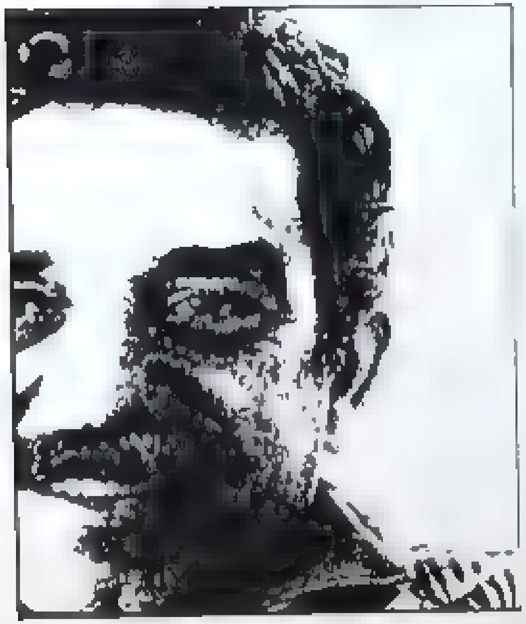

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ احمل کمال

امرود کی مہک

میری سب سے دیرپا اور واضح یاد لوگوں کی نہیں بلکہ اراکاتاکا کے اس مکان کی ہے جہاں میں اپنے نانانانی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہ بارہار لوٹ کر آنے والا ایک خواب ہے جو اب بھی خود کو دوہراتا رہتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنی زندگی کے ہر دن، خواہ یہ حقیقی یا فرضی احساس لے کر بیدار ہوتا ہوں کہ میں نے اس وسیع وعریض قدیم مکان میں ہونے کا خواب دیکھا ہے۔ یہ نہیں کہ میں اس مکان میں لوٹ کر گیا ہوں، بلکہ یہ کہ میں وہیں ہوں؛ خواب میں میری کوئی مخصوص عمر نہیں ہوتی، نہ وہاں موجودگی کا کوئی خاص سبب ہوتا ہے، گویا میں کبھی اس مکان سے رخصت ہی نہیں ہوا۔ اب بھی میرے خوابوں میں رات کی اس پیش آگہی کا احساس برقرار ہے جو میرے پورے بچپن کے زمانے پر طاری رہا تھا۔ یہ سرکش اور بیقابو احساس ہر شام کے آغاز پر شروع ہو جاتا، اور میری نیند کے دوران اس وقت تک مجھے اذیت پہنچاتا رہتا جب تک میں دروازے کی درزوں میں سے صبح کو نمودار ہوتے نہ دیکھ لیتا۔ میں اسے واضح طور پر بیان نہیں کر سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ پیش آگہی کے اس احساس کی جڑیں اس حقیقت میں تھیں کہ رات کے وقت میری نانی کے تمام تصوراتی کردار آئندہ پیش آنے والے واقعات اور پرانی یادیں مجسم ہو جایا کرتی تھیں۔ ان سے میرا رشتہ اسی قسم کا تھا، جو ایک غیرمرئی تار کے ذریعے ہم دونوں کو ماورائےفطرت دنیا سے رابطے میں رکھتا۔ دن کے وقت میری نانی کی طلسمی دنیا مجھے مسحور رکھتی، میں اس میں کھویا رہتا، یہ میری دنیا تھی۔ اب بھی جب میں دنیا کے کسی کونے میں کسی غیرمانوس ہوٹل میں اکیلا سوتا ہوں، تو اکثر اضطراب سے میری آنکھ کھل جاتی ہے، اور میں اندھیرے میں تنہائی کے ہاتھوں دہشت زدہ ہو جاتا

ہوں، اور پھر مجھے سکون پانے اور نیند میں لوٹ جانے میں کئی منٹ لگ جاتے ہیں۔ دوسری جانب میرے نانا تھے، جو میری نانی کی غیریقینی دنیا میں مکمل تحفظ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں میرے تمام اندیشے ہوا ہو جاتے۔ مجھے لگتا کہ میرے قدم مضبوطی سے زمین پر جمے ہوئے ہیں، اور میں دوبارہ حقیقت کی دنیا میں ہوں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں اپنے نانا کی طرح حقیقت پسند، دلیر اور محفوظ بننا چاہتا تھا لیکن اپنی نانی کے علاقے میں جھانکنے کی مستقل ترغیب کی مزاحمت بھی نہ کر پاتا تھا۔

کرنل نکولاس رکاردو مارکیز میخیا — یہ میرے نانا کا پورا نام تھا۔ وہ ایک ایسی ہستی ہیں جس سے میرا تعلق زندگی میں سب سے بہتر رہا ہے اور جس کے ساتھ میری ہم آہنگی مکمل رہی ہے۔ لیکن تقریباً پچاس سال بعد پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجھے خیال آتا ہے کہ انہیں اس کا احساس غالباً کبھی نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا کیوں لیکن یہ خیال، جس سے میں پہلی بار اپنی لڑکپن میں دوچار ہوا، میرے لیے ہمیشہ پریشانی کی وجہ رہا ہے۔ یہ بہت بیتاب کر دینے والا خیال ہے گویا اب اس ہیبت ناک بےیقینی کے عالم میں رہنے پر مجبور ہوں جسے دور ہو جانا چاہیے تھا لیکن جو اب کبھی دور نہیں ہو سکتی کیونکہ میرے نانا کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میری عمر آٹھ سال تھی۔ میں نے انہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھا، کیونکہ اس وقت میں اراکاتاکا سے دور ایک اور قصبے میں تھا؛ مجھے ان کے انتقال کی خبر تک براہ راست نہیں دی گئی، مگر میں جس گھر میں مقیم تھا وہاں کے لوگوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس خبر نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کیا تھا اس کے باوجود، بڑے ہو جانے کے بعد جب بھی میرے ساتھ کوئی واقعہ پیش آتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ خوشگوار واقعہ ہو، تو مجھے یہی خوشی کے مکمل ہونے میں جس واحد شے کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ میرے نانا کی موجودگی ہے۔ اس طرح میری بلوغت کی تمام زندگی کے خوش گوار لمحات بےاطمینانی کے اس جرثومے کے ہاتھوں متاثر ہوتے رہے ہیں، اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

(میری تحریروں میں) وہ واحد کردار جو میرے نانا سے مشابہت رکھتا ہے، "پتّوں کا طوفان" کا بےنام کرنل ہے۔ درحقیقت یہ کردار ان کی اندرونی شخصیت اور ظاہری روپ کی بیحد تفصیل سے بنائی گئی تصویر ہے، مگر بہرحال یہ ایک موضوعی ردعمل ہے کیونکہ کرنل کو ناول میں کبھی بھی تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا، اور پڑھنے والے کے ذہن میں اس کا تصور غالباً میرے تصور سے مختلف ہو گا۔ میرے نانا کی ایک آنکھ ایسے واقعے میں ضائع ہو گئی تھی جسے ناول میں شامل کرنا مجھے ضرورت سے زیادہ ڈرامائی محسوس ہوا؛ وہ اپنے دفتر کی کھڑکی سے ایک خوبصورت سفید گھوڑے کو دیکھ رہے تھے کہ انہیں اچانک اپنی بائیں آنکھ میں کسی چیز کا احساس ہوا؛ انہوں نے اسے اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا اور کسی درد کے بغیر اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ مجھے یہ واقعہ خود یاد نہیں لیکن میں نے اپنے بچپن میں اس کی تکرار اکثر سنی تھی، اور میری نانی آخر میں ہمیشہ کہا کرتی تھیں؛ "ان کے ہاتھ میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔" ان کے اس جسمانی نقص نے کرنل کے کردار میں ایک مختلف شکل اختیار کی ہے وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔ میں نے اپنے ناول میں یہ بات بیان نہیں کی مگر میرے ذہن میں ہمیشہ رہا کہ اس کا لنگڑاپن ایک جنگ میں زخمی ہونے کا نتیجہ ہے۔ نانا نے اس صدی کے

اوائل میں کولمبیا میں ہونے والی ہزار روزہ جنگ میں لبرل پارٹی کی انقلابی فوج کی جانب سے لڑتے ہوئے کرنل کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ میرے ذہن میں ان کی سب سے واضح یاد انھی سے متعلق ہے۔ ان کے انتقال سے کچھ عرصے پہلے ایک ڈاکٹر بستر میں ان کا معائنہ کر رہا تھا (مجھے یاد نہیں کہ اس کا سبب کیا تھا) کہ اس نے میرے نانا کے جسم پر ناف کے پاس ایک پرانے زخم کا نشان دریافت کیا۔ "یہ گولی کا نشان ہے،" نانا نے کہا۔ انھوں نے اکثر مجھ سے خانہ جنگی کے زمانے کی باتیں کی تھیں، اور انھی کی وجہ سے مجھ میں اس تاریخی زمانے سے وہ دلچسپی پیدا ہوئی جو میری تمام کتابوں میں جھلکتی ہے، لیکن انھوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ یہ نشان گولی کے زخم کا ہے۔ جب انھوں نے ڈاکٹر کو اس راز میں شریک کیا تو یہ میرے لیے دیومالائی دلیری کے ایک واقعے کا انکشاف تھا۔

("تنہائی کے سو سال" میں) کرنل اوریلیانو بوئندیا کا کردار میرے ذہن میں نانا کے تصور کے قطعی برعکس ہے۔ نانا بھاری بھرکم تھے، ان کی رنگت سرخی مائل تھی اور ان جیسے کھانے کا شائق میں نے پوری زندگی میں کوئی اور نہیں دیکھا۔ ان کی جنسی اشتہا بھی اسی درجے کی تھی، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کرنل اوریلیانو بوئندیا، اس کے برعکس، اپنے چھریرے جسم کے باعث جنرل رفیل اریبے اریبے سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے اور اسی کی طرح جنرسی پر مائل ہے۔ بے شک، میں نے جنرل اریبے اریبے کو کبھی دیکھا نہیں، لیکن نانی نے مجھے بتایا تھا کہ، میری پیدائش سے پہلے، وہ اراکاتاکا سے گزرا تھا اور اس نے نانا کے دفتر میں، ان کے اور خانہ جنگی کے دیگر پرانے سورماؤں کے ساتھ بیئر کے چند گلاس نوش کیے تھے۔ نانی کے بیان سے بننے والی اس کی تصویر "پتوں کا طوفان" میں ایدیلیدا کی زبانی بیان کی ہوئی فرانسیسی ڈاکٹر کی تفصیل سے مطابقت رکھتی ہے؛ وہ کہتی ہے کہ پہلی بار دیکھنے پر وہ اسے ایک فوجی معلوم ہوا۔ بہت اندر کہیں مجھے علم ہے کہ وہ اسے جنرل اریبے اریبے سمجھی تھی۔

اپنی ماں کے ساتھ میرے تعلق کا سب سے واضح پہلو کم عمری کے زمانے ہی سے اس تعلق کی سنجیدگی رہی ہے۔ یہ شاید میری زندگی کا سب سے سنجیدہ رشتہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ایسی بات نہیں جو ہم ایک دوسرے کو نہ بتا سکیں، اور کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر ہم دونوں گفتگو نہ کر سکیں، لیکن ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ قربت سے زیادہ ایک خاص، تقریباً پیشہ ورانہ رسمی انداز کا برتاؤ کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے، لیکن یہ ہے ایسا ہی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے جب نانا کے انتقال کے بعد اپنے والدین کے ساتھ رہنا شروع کیا تو میں اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اپنے طور پر سوچ سکوں۔ میری ماں کے نزدیک اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ ان کے متعدد بچوں میں (جو سب کے سب مجھ سے چھوٹے تھے) ایک بچے کا اضافہ ہو گیا تھا جس سے وہ والغتاً بات چیت کر سکتی تھیں اور جو گھر کے کام کاج میں ان کی مدد کر سکتا تھا۔ ان کی زندگی دشوار اور پرالم تھی، جس میں کبھی کبھی شدید مفلسی کے دور آتے تھے۔ پھر ہم دونوں کو ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کا طویل عرصے تک موقع نہ ملا کیونکہ چند سال بعد، جب میری عمر بارہ برس ہوئی، میں تعلیم کے لیے پہلے بارنکیلا اور پھر زپاکیرا چلا گیا۔ تب سے لے کر اب تک میری

بے حد مختصر ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں، اس وقت اسکول کی چھٹیوں میں، اور اب جب کبھی میرا کارتاخینا جانا ہو، جو سال میں ایک بار سے زیادہ نہیں ہوتا اور وہ بھی محض چند ہفتوں کے لیے۔ ان اسباب سے ہمارا تعلق ذرا دور دراز کا ہو گیا ہے۔ اس سے ایک ایسا ضبط اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے جو ہمیں سنجیدگی اختیار کرنے پر مائل کرتا ہے۔ تاہم پچھلے بارہ سال سے، جب سے میں اس لائق ہوا ہوں، میں نے ہر اتوار کو ایک مخصوص وقت پر، خواہ میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوں، انھیں ٹیلیفون کرنے کی عادت اختیار کر لی ہے۔ اگر کسی شاذونادر موقعے پر میں ایسا نہ کر پاؤں تو اس کی وجہ صرف تکنیکی مسائل ہوتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ میں کہاوت کے مطابق کوئی اچھا بیٹا ہوں؛ میں ایسا ہی ہوں جیسا کوئی اور؛ یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ میرے خیال میں اتوار کو باقاعدگی سے ٹیلیفون پر یہ گفتگو ہمارے تعلق کی سنجیدگی کا ایک حصہ ہے۔

میرے تمام پڑھنے والوں میں میری ماں واحد ہستی ہیں جنھیں وہ وجدانی اور، بلاشبہ، وہ معلومات میسر ہیں جن کی مدد سے وہ میری کتابوں کے کرداروں کے عقب میں پوشیدہ حقیقی افراد کو پہچان سکیں۔ یہ آسان بات نہیں ہے، کیونکہ میرے تقریباً تمام کردار ایک قسم کا جگ سا پزل ہیں جو کئی حقیقی افراد کی، اور ظاہر ہے کہ میری اپنی، شخصیت کے اجزا سے مل کر بنتے ہیں۔ اس باب میں میری ماں کی مخصوص صلاحیت آثارقدیمہ کے اس ماہر کی سی ہے جو زمین سے برآمد ہونے والی چند ہڈیوں کی مدد سے ماقبل تاریخ کی کسی مخلوق کو دوبارہ تخلیق کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ میری کتابیں پڑھتے ہوئے وہ جبلی طور پر ان تمام اجزا کو جو میرا اضافہ ہوتے ہیں، الگ کر کے اس بنیادی فرد کو پہچان لیتی ہیں جس کے گرد میں نے اپنا کردار تعمیر کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پڑھتے ہوئے ان کے منھ سے اچانک نکلتا ہے، "ارے میرا دینی باپ! دیکھو بیچارے کا کیا حشر ہو گیا!" میں انھیں بتاتا ہوں کہ ان کا خیال درست نہیں ہے، اور اس کردار کا ان کے دینی باپ سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ بات میں محض کہنے کی خاطر کہتا ہوں، ورنہ وہ جانتی ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ جانتی ہیں۔

"ایک پیش گفتہ موت کی روداد" سے پہلے کی کسی کتاب میں کوئی نسوانی کردار میری ماں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ "تنہائی کے سو سال" کی اُرسلا اگواران کے کردار میں ان کی چند ایک خدوخال موجود ہیں، لیکن اس میں میری جان پہچان کی اور بہت سی عورتوں کی بہت سی خصوصیات بھی ہیں۔ درحقیقت ارسلا میرے لیے ایک مثالی عورت کی حیثیت رکھتی ہے، اس اعتبار سے کہ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن پر میرے خیال میں، ایک عورت مشتمل ہوتی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، یعنی جوں جوں میری ماں زیادہ عمررسیدہ ہوتی جا رہی ہیں، اس ہمہ گیر تصور کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں جو میرے ذہن میں ارسلا کی بابت موجود ہے، اور ان کی شخصیت کی نشوونما اسی سمت میں ہو رہی ہے۔

اس طرح "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں ان کا ظہور ایک لحاظ سے ارسلا کے کردار کی تکرار محسوس ہو سکتا ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے جیسی نظر آتی ہیں، یہ کردار اس کی ایک سچی تصویر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کردار کا نام بھی ان کے

نام پر رکھا ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں نے اسے ان کا ثانوی نام 'سانتیاگا' دیا ہے تو انھوں نے تبصرہ کیا، "اوہ میرے خدا! ساری عمر میں اپنے اس بدصورت نام کو چھپانے کی کوشش کرتی رہی ہوں، اور اب یہ ہر زبان میں مستقل ہو کر پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔"

جب میں تینتیس سال کا ہوا تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے والد کی عمر اتنی ہی رہی ہو گی جب میں نے انھیں پہلی بار اپنے نانانانی کے گھر میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کیونکہ اس روز ان کی سالگرہ تھی، اور کسی نے کہا تھا کہ "آج تم یسوع کی عمر کے ہو گئے ہو۔" وہ ایک دبلے پتلے، گہری رنگت والے آدمی تھے بذلہ سنج اور دوستانہ انداز کے مالک۔ وہ سفید رنگ کے ڈرل سوٹ اور تنکوں کے بنے ہیٹ میں ملبوس تھے۔ ایسی سو تیس کی دہائی کے ایک بےعیب مغرور کریبینی شخص کی مثال۔ مزے کی بات یہ کہ اب بھی، جبکہ ان کی عمر اسی سال ہے اور وہ ہر لحاظ سے پوری طرح صحت مند ہیں، میرے ذہن میں ان کا تصور اسی موقعے کا ہے جب میں نے انھیں پہلی بار نانانانی کے گھر میں دیکھا تھا۔ کچھ عرصے پہلے انھوں نے ایک دوست کو بتایا کہ میں غالباً ایک خود کو ایک ایسا چوزہ سمجھتا ہوں جو مرغے کی مدد کے بغیر پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بات انھوں نے خوش دلی سے کہی تھی اور اس میں حسِ مزاح کی جھلک بھی تھی لیکن یہ دراصل مجھے ایک نرم تنبیہ کرنے کے لیے تھا کہ میں ہمیشہ اپنی ماں سے تعلق کے بارے میں باتیں کرتا رہتا ہوں جبکہ ان کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ ان کا خیال درست ہے۔ لیکن اس وجہ یہ ہے کہ میں انھیں نہیں جانتا، یا کم ازکم ان سے اس حد تک واقف نہیں جتنا اپنی ماں سے واقف ہوں۔ یہ کہیں اب جا کر ہوا ہے جب ہم تقریباً ہم عمر ہو چکے ہیں، (یہ بات میں نے کبھی کبھار ان سے کہی بھی ہے) کہ ہم ایک دوسرے کو خاموشی سے سمجھنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے میں اس کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ جب آٹھ برس کی عمر میں میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے کے لیے گیا اس وقت مجھے باپ کا ایک نہایت ٹھوس تصور نانا کی شکل میں مل چکا تھا۔ میرے والد نہ صرف میرے نانا سے بہت مختلف تھے بلکہ وہ ان سے بالکل متضاد تھے۔ ان کی شخصیت، اقتدار کے بارے میں ان کا تصور دنیا کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر، اور اپنی اولاد سے ان کا تعلق، سب کچھ نانا سے انتہائی مختلف تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس اچانک تبدیلی نے اس عمر میں مجھ پر گہرا اثر کیا ہو، کیونکہ لڑکپن کی عمر تک میں والد سے اپنے تعلق کو بہت دشوار پاتا تھا۔ یہ بڑی حد تک میرا اپنا قصور تھا۔ میں کبھی ان سے برتاؤ کا درست طریقہ دریافت نہ کر سکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ انھیں کس طرح خوش کروں اور ان کی سخت گیری کو ہمدردی کا فقدان سمجھتا رہا۔ اس تمام کے باوجود میرا خیال ہے ہمارے تعلقات ٹھیک رہے، اس لیے کہ ہمارے درمیان کبھی کوئی سنگین تنازعہ نہیں ہوا۔

دوسری جانب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ادب سے میرا شغف بڑی حد تک انھی کی وجہ سے ہوا۔ نوجوانی میں وہ نظمیں لکھا کرتے تھے جو ہمیشہ خفیہ نہیں رہتی تھیں اور جب وہ اراکاتاکا میں ٹیلیگراف آپریٹر تھے، وہ بہت عمدہ وائلن بجایا کرتے تھے۔ انھیں ادب سے ہمیشہ محبت رہی ہے اور وہ ایک پرشوق قاری ہیں۔ ان کے گھر پہنچ کر ہمیں یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ کہاں ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی خواب گاہ میں مطالعے

میں مصروف ہوں گے۔ اس تیرہ مکان میں وہ واحد سکون کی جگہ ہے۔ وہاں کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ دسترخوان پر کتنے لوگ موجود ہوں گے کیونکہ بیٹے بیٹیوں، پوتے پوتیوں اور بھتیجے بھتیجیوں کی ایک پوری آبادی ہے جو اپنے اپنے شغل میں مصروف، دن رات گھر میں آتی جاتی رہتی ہے۔ میرے والد کے مطالعے میں ہر وہ چیز شامل ہوتی ہے جو ان کے ہاتھ آ جائے: ادبِ عالیہ، تمام اخبار اور رسالے، اشتہاری اعلانات، ریفریجریٹر کے مینول، کوئی بھی چیز۔ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو ان سے بڑھ کر پڑھنے کا شوقین ہو۔ باقی معاملات یہ ہیں کہ انھوں نے کبھی الکحل کا ایک قطرہ نہیں چکھا، کبھی ایک سگریٹ تک نہیں پیا، لیکن ان کی سولہ جائز اولادیں ہیں، اور ان کے علاوہ خدا جانے کتنی اور۔ اور اب بھی وہ میری جان پہچان کے لوگوں میں سب سے قوی الجثہ اور خوش وضع اسّی سالہ شخص ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ [illegible] رشتے میں کوئی تبدیلی ممکن ہے

مرسیڈیز سے میری ملاقات سوکرے میں ہوئی تھی جو کریبین کے ساحل سے ذرا اندر کی طرف واقع ایک قصبہ ہے۔ وہاں ہمارے گھرانوں نے کئی سال گزارے تھے، اور ہم اپنی چھٹیاں گزارنے وہاں جایا کرتے تھے۔ اس کے والد اور میرے والد بچپن کے دوست تھے۔ ایک روز، جب اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی، طلبا کے ایک رقص کے موقعے پر میں نے اس سے شادی کی درخواست کر ڈالی۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجھے خیال آتا ہے کہ شادی کی یہ درخواست اس تمام کھکھیڑ سے بچنے کی ایک استعاراتی کوشش تھی جو اس زمانے میں کسی لڑکی کو دوست بنانے کے سلسلے میں اٹھانی پڑتی تھی۔ اس نے بھی اس بات کو اسی انداز میں سمجھا ہو گا، کیونکہ ہم ایک دوسرے سے کبھی کبھی، اور محض سرسری طور پر، ملتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اس بات پر شبہ نہیں تھا کہ یہ استعارہ ایک نہ ایک روز حقیقت بن جائے گا۔ اس نے افسانے کے کوئی دس برس بعد حقیقت کی شکل اختیار کی، لیکن ہماری کبھی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی۔ ہم محض دو افراد تھے، جو بغیر کسی عجلت یا ہیجان کے، اس ناگزیر واقعے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ جلد ہی منانے والے ہیں، اور اس عرصے میں ہمارا کبھی کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا نہیں ہوا۔ میرے خیال میں اس کا راز یہ ہے کہ ہم اب بھی چیزوں کو اسی انداز میں دیکھتے ہیں جس انداز میں شادی سے قبل کے زمانے میں دیکھتے تھے۔ شادی، خود زندگی کی طرح، اس قدر ناقابل یقین طور پر دشوار ہے کہ آپ کو ہر روز نئے سرے سے آغاز کرنا پڑتا ہے، اور اپنا ساری عمر کرتے رہنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مسلسل اور اکثر تھکا دینے والی، جنگ ہے، لیکن بالآخر قابل قدر ہے۔ میرے ایک ناول کے ایک کردار نے اسے زیادہ مناسب الفاظ میں بیان کیا ہے: "محبت ایک ایسی چیز ہے جسے سیکھا جاتا ہے۔"

میرے ناولوں کا کوئی کردار مرسیڈیز سے مشابہ نہیں۔ وہ "تنہائی کے سو سال" میں دو بار نمودار ہوتی ہے، اپنے ہی روپ میں، اپنے ہی نام کے ساتھ، مگر اس کی شناخت ایک کیمیادان کی ہے۔ اسی طرح "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں بھی وہ دو بار داخل ہوتی ہے میں اس کا فن سے زیادہ ادبی استعمال اس وجہ سے نہیں کر سکا جو بظاہر خیالی معلوم ہو گی لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے: میں اسے اتنی اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے ذرا اندازہ نہیں

کہ وہ کیسی ہے۔

میرے چند دوست راستے میں بچھڑ چکے ہیں، لیکن ان میں سے جو میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں وہ تمام نشیب و فراز کے بعد بھی میرے رابطے میں ہیں۔ اور یہ اتفاق کی بات نہیں بلکہ تمام زندگی، ہر قسم کے حالات میں، میں نے اپنی دوستیوں کو بڑی احتیاط سے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ میں اپنے بہت سے انٹرویوز میں کہہ چکا ہوں، یہ میری شخصیت کا حصہ ہے۔ میں نے کبھی اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ اپنے اندر، میں اراکاتاکا کے ایک ٹیلیگراف آپریٹر کی سولہ اولادوں میں سے ایک ہوں اور ہمیشہ یہی رہوں گا۔ پندرہ سال پہلے، جب شہرت مجھ پر کسی خواہش یا توقع کے بغیر نازل ہوئی، تب سے میرا دشوارترین کام اپنی نجی زندگی کی حفاظت رہا ہے۔ اگرچہ اب یہ پہلے سے زیادہ محدود اور زیادہ مخدوش ہو گئی ہے لیکن میں نے اس میں اس شے کے لیے مناسب گنجائش رکھی ہے جس کی میں دنیا میں سب سے زیادہ قدر کرتا ہوں: اپنے بچوں اور دوستوں کی محبت میں بےتحاشا سفر کرتا ہوں، اور میرے سفر کرنے کا بنیادی مقصد اپنے پرانے دوستوں سے ملاقات کرنا ہوتا ہے۔ یہ دوست تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں، لیکن صرف ان کی صحبت میں میں اپنے آپ میں رہ سکتا ہوں۔ ہم ہمیشہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں ملتے ہیں جو ترجیحاً چھ یا اس سے بھی بہتر صورت میں چار افراد پر مشتمل ہوں۔ بہترین صورت یہ ہوتی ہے کہ اس نشست کے لیے دوستوں کا انتخاب میں نے خود کیا ہو کیونکہ مجھے اس بات میں خاصی مہارت ہے کہ ان دوستوں کو ایک جگہ اکٹھا کروں جن کے تعلقات آپس میں خوشگوار ہوں، تاکہ گروپ میں کوئی کشیدگی نہ ہو۔ ان نشستوں میں بلاشبہ خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے مگر ہم سب اس کے لیے وقت نکال لیتے ہیں، کیونکہ ایسا کرنا بہت اہم ہے۔ میں دوستی میں صنف کا اعتبار نہیں رکھتا، لیکن میرا احساس ہے کہ میری دوستی مردوں کی بہ نسبت عورتوں سے زیادہ اچھی ہوتی ہے۔

اپنے بچوں سے میرا تعلق غیرمعمولی طور پر اچھا ہے، اور اس کے اسباب بھی وہی ہیں جو دوستوں کے سلسلے میں ہیں۔ اگرچہ میں بعض اوقات تھکن کا شکار، پریشان، مشتعل یا کسی اور الجھن میں گرفتار ہوتا ہوں، لیکن ابتدا ہی سے اپنے بچوں کے لیے میرے پاس ہمیشہ وقت رہا ہے، کہ ان کے ساتھ رہ سکوں، ان سے باتیں کر سکوں۔ جب سے بچے اپنے طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں ہم اپنے گھر کے تمام مسائل بات چیت کر کے اجتماعی طور پر حل کرتے رہے ہیں۔ ہم چاروں سر جوڑ کر ہر چیز کا فیصلہ کرتے ہیں۔ میں ایسا اس لیے نہیں کرتا کہ میں کسی نظام کا پابند ہوں یا اسے کوئی بہت اچھا طریقہ سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ ابتدا ہی میں جب میرے بچوں نے بڑا ہونا شروع کیا تھا میں نے خود میں باپ کے کردار سے شغف کو دریافت کر لیا تھا۔ مجھے اس میں لطف آتا رہا ہے۔ اپنے دو بیٹوں کو بڑا ہونے میں مدد دینا میری زندگی کا سب سے پرشوق تجربہ رہا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا اہم ترین حاصل میری کتابیں نہیں بلکہ میرے بچے ہیں۔ اب ہم میاں‌بیوی کے دوستوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ایسے دوست جنھیں ہم نے خود پالا ہے۔

اگر مجھے کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو تو میں مرسیڈس اور اپنے لڑکوں کو اس میں شریک

کرتا ہوں۔ اگر کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو تو غالباً اپنے دوستوں سے رجوع کر کے ان کا دماغ چاٹوں گا۔ لیکن اگر مسئلہ واقعی بہت ہی بڑا ہو بےحد بڑا تو میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کرتا۔ اس کی وجہ ایک تو میری کم گوئی کی عادت ہے، اور دوسرے یہ میں مرسیڈس یا اپنے لڑکوں یا دوستوں کو ان اضافی فکروں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ سو میں ان سے خود ہی نمٹتا ہوں۔ اس کا نتیجہ بےشک آنتوں کا یہ السر ہے جو میں نے پوشیدہ عاشق کی طرح اس کے ساتھ رہنا سیکھ لیا ہے؛ یہ دشوار ہے، کبھی کبھی تکلیف دہ بھی، لیکن اسے بھولنا ناممکن ہے۔

لکھنا میں نے محض اتفاق سے شروع کیا، شاید ایک دوست پر صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہماری نسل میں بھی ادیب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ پھر میں محض لذت کی خاطر لکھنے کے اس جال میں پھنس گیا، اور اس کے بعد اس انکشاف کے دام میں آ گیا کہ مجھے دنیا میں لکھنے سے زیادہ کسی اور کام سے محبت نہیں۔

لکھنا ایک لذت بھی ہے اور اذیت بھی۔ شروع میں جب میں یہ ہنر سیکھ رہا تھا میں ایک سرشاری کے عالم میں تقریباً غیرذمےداری سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانے میں، رات کے دو تین بجے اخبار کا کام ختم کرنے کے بعد میں اپنی کتاب کے چار، پانچ، حتیٰ کہ دس صفحے بھی آسانی سے لکھ لیا کرتا تھا۔ ایک بار میں نے ایک پوری کہانی ایک ہی نشست میں لکھ لی تھی۔ اب میں دن بھر میں ایک پیراگراف بھی لکھ پاؤں تو خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا عمل بہت تکلیف دہ ہو گیا ہے۔ دراصل ہوتا صرف یہ ہے کہ آپ کے احساسِ ذمےداری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ کے لکھے ہوئے ہر لفظ میں اب زیادہ وزن ہے کہ اب وہ زیادہ لوگوں پر اثرانداز ہو گا۔ (شاید یہ شہرت کا نتیجہ ہے۔) اس کی وجہ سے میں فکرمند رہتا ہوں۔ ایک ایسے براعظم میں جو کامیاب ادیبوں کے لیے ابھی تیار نہیں ہے، ادبی کامیابی سے شغف نہ رکھنے والے آدمی کو جو بدترین چیز پیش آ سکتی ہے وہ یہ کہ اس کی کتابیں دھڑادھڑ فروخت ہونے لگیں۔ ایک عوامی تماشا بننا مجھے ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ مجھے ٹیلیوژن، کانگریسوں، کانفرنسوں اور گول میزوں سے نفرت ہے اور انٹرویوز سے بھی۔ میں کسی کو کامیابی کی دعا نہیں دیتا۔ یہ کسی کوہ پیما کی مثال ہے جو چوٹی تک پہنچنے میں خود کو تقریباً ہلاک کر ڈالتا ہے، اور وہاں پہنچ کر وہ کیا کرتا ہے؟ یہی کہ بےحد احتیاط سے، اور مقدوربھر شکست سے نیچے اترنے لگے یا نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگے۔

خالی صفحہ دم گھٹنے کی دہشت کے بعد میرے لیے سب سے زیادہ دہشت ناک شے ہے۔ لیکن میں نے ہیمنگ وے کی ایک نصیحت پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں زیادہ فکر کرنا ترک کر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ دن بھر کا کام اس وقت ختم کرو جب تمھیں معلوم ہو کہ کل روز کا کام کہاں سے شروع کرنا ہے۔

میں سمجھتا ہوں دوسرے ادیبوں کے لیے کتاب کا جنم ایک خیال یا ایک تصور سے ہوتا

ہے۔ میری ہر تحریر کسی بصری منظر سے جنم لیتی ہے۔ "منگل کے دن کا قیلولہ"، جسے میں اپنی بہترین مختصر کہانی سمجھتا ہوں، ایک ویران شہر میں چلچلاتی دھوپ میں ایک عورت اور ایک نوعمر لڑکی کو، سیاہ لباس میں، سیاہ چھتری لیے، پیدل چلتے ہوئے دیکھنے سے پیدا ہوئی۔ "پتوں کا طوفان" میں یہ بصری منظر ایک بوڑھے آدمی کی تصویر ہے جو اپنے پوتے کو ایک جنازے میں شرکت کے لیے لے جا رہا ہے۔ "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کا نقطہ آغاز بارنکیلا کے بازار میں کسی لانچ کے منتظر ایک شخص کی شبیہ ہے۔ وہ ایک قسم کے خاموش اضطراب میں انتظار کر رہا تھا۔ برسوں بعد پیرس میں میں نے خود کو اسی اضطراب کے عالم میں ایک خط -- غالباً ایک منی آرڈر -- کا انتظار کرتے ہوئے پایا، اور خود کو اس شخص کی یاد سے منسلک محسوس کیا۔

وہ بصری منظر جس سے "تنہائی کے سو سال" کی ابتدا ہوئی، اس میں ایک بوڑھا شخص ایک بچے کو برف دکھانے لے جا رہا تھا جو ایک سرکس میں عجوبے کے طور پر نمائش کے لیے رکھی گئی تھی۔ یہ میرے نانا کرنل مارکیز تھے۔ یہ واقعہ ٹھیک اسی طرح تو پیش نہیں آیا تھا مگر اس کی بنیاد بہرحال واقعے ہی پر ہے۔ نانا ایک روز مجھے اونٹنی دکھانے سرکس لے گئے۔ اگلے روز جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے نمائش میں رکھی ہوئی برف تو دیکھی ہی نہیں تو وہ مجھے بنانا کمپنی کی چھاؤنی میں لے گئے، منجمد سمندری مچھلیوں کا ایک کریٹ کھلوایا اور مجھے اس میں ہاتھ ڈالنے کو کہا۔ "تنہائی کے سو سال" سارے کا سارا اسی ایک منظر سے پیدا ہوا۔

(میں دو یادوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر کتاب کا پہلا جملہ حاصل کر لیتا ہوں۔ پہلے جملے کی بڑی اہمیت ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے پہلا جملہ لکھنے میں باقی پوری کتاب لکھنے سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔) اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ وہ تجربہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے جس میں کتاب کے اسلوب، ساخت، یہاں تک کہ اس کی طوالت تک کو پرکھا جا سکتا ہے۔

ناول کو لکھنے کا عمل اتنا سست رفتار نہیں ہے۔ یہ تو بلکہ خاصا تیز عمل ہے۔ "تنہائی کے سو سال" لکھنے میں مجھے دو سال سے کم عرصہ لگا تھا۔ لیکن ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر لکھنا شروع کرنے سے پہلے، میں نے پندرہ سولہ سال اس کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارے تھے۔ ("سردار کا زوال" کو میرے ذہن میں تیار ہونے میں بھی تقریباً اتنا ہی عرصہ لگا، اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی تیاری کے انتظار میں تیس برس۔)

جب ۱۹۵۱ میں وہ واقعہ پیش آیا (جس پر "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی بنیاد ہے) تو مجھے اس میں ناول کے موضوع کے طور پر نہیں بلکہ اخباری مضمون کے موضوع کی حیثیت سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر ان دنوں کولمبیا میں اخباری مضمون کی صنف بہت مقبول نہیں تھی، اور میں قصباتی صحافی کی حیثیت سے ایک مقامی اخبار میں کام کر رہا تھا جسے یوں بھی اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ میں نے ادبی حوالے سے اس واقعے کے بارے میں سوچنا کئی سال بعد شروع کیا۔ لیکن ہمیشہ میرے ذہن میں یہ خیال رہا کہ میری ماں کے لیے اپنے بیٹے کی لکھی ہوئی ایک کتاب میں اپنے سارے دوستوں اور رشتہ داروں کو دیکھنے کا تصور ہی کتنا تکلیف دہ ہو گا۔ پھر بھی سچ یہ ہے کہ اس وقت تک اس موضوع نے

مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا، یہاں تک کہ برسوں تک ذہن میں اس کی جگالی کرتے رہنے کے بعد میں نے اس کا اہم ترین جزو دریافت کر لیا۔ وہ یہ کہ دونوں قاتل اس جرم کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتے تھے اور انہوں نے پوری کوشش کی تھی کہ کوئی شخص انہیں ایسا کرنے سے روک دے، مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ڈرامے میں یہی ایک منفرد عنصر ہے، باقی سب تو لاطینی امریکہ میں روز کا معمول ہے۔ اس کے بعد تاخیر کا سبب ساخت کا مسئلہ تھا۔ حقیقی زندگی میں یہ کہانی اس وقت اختتام کو پہنچتی ہے جب جرم کے پچیس سال بعد شوہر اپنی ردکردہ بیوی کے پاس لوٹ آتا ہے۔ لیکن مجھ پر یہ بات ہمیشہ سے واضح تھی کہ کتاب کا اختتام جرم کے تفصیلی بیان پر ہو گا۔ اس کا حل یہ نکلا کہ ایک ایسا کردار متعارف کرایا جائے جو دونوں کی زمانی تعمیر میں آزادی سے حرکت کر سکے، سو اسے لکھنے کے لیے میں نے پہلی بار واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا۔ ہوا صرف یہ تھا کہ میں نے، تیس برس بعد، یہ بات دریافت کر لی تھی جسے ہم ناول نگار بھولنے پر آمادہ رہتے ہیں: یہ کہ بہترین ادبی فارمولا صرف سچ ہے۔

(میں یہ کہا کرتا تھا کہ کسی موضوع پر لکھنے میں بہت عجلت یا بہت تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مگر مجھے کسی ایسے موضوع سے کبھی دلچسپی نہیں رہی جو کئی برسوں کی مزاحمت نہ کر سکے۔ اگر وہ اتنا مضبوط ہے کہ "تنہائی کے سو سال" کی طرح پندرہ سال، "سردار کا زوال" کی طرح سترہ سال اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی طرح تیس سال کے عرصے کو سہار جائے تو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ اسے لکھ ڈالوں۔)

سوائے خال خال اشارے درج کرنے کے (میں اپنی تحریروں کے لیے نوٹس کبھی نہیں لیتا۔) مجھے اپنے تجربے سے یہ معلوم ہے کہ جب آپ نوٹس لینے لگیں تو آپ کا وقت نوٹس کے بارے میں سوچنے میں گزر جاتا ہے اور کتاب کے بارے میں سوچنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

(اپنی تحریروں پر نظرثانی کے سلسلے میں) میرا طریق کار خاصا تبدیل ہو چکا ہے۔ جب میں جوان تھا تو لکھتا چلا جاتا، مکمل کرنے کے بعد اس کی نقلیں تیار کرتا، اور نئے سرے سے اس پر کام میں جٹ جاتا۔ اب میں لکھنے کے ساتھ ساتھ سطر بہ سطر اس پر نظرثانی کرتا رہتا ہوں، تاکہ دن کے اختتام پر میرے پاس بدصورت نشانات اور کٹی پھٹی سطروں سے پاک ایک مکمل صفحہ ہو، شائع کیے جانے کے تقریباً تیار۔ (اس عمل کے دوران) مجھے دقت پیش آتی ہے کہ میں کاغذ پھاڑتا رہتا ہوں۔ جب میں ٹائپ کرنا شروع کرتا ہوں -- میں ہمیشہ ٹائپ کرتا ہوں، برقی ٹائپ رائٹر پر -- اور کوئی جملہ غلط ہو جاتا ہے، یا ایسا لگتا ہے کوئی لفظ مجھے پسند نہیں آتا، یا محض ٹائپنگ کی کوئی غلطی ہو جاتی ہے، تو کسی بدعادت یا خبط یا کسی الجھن کے زیر اثر میں وہ صفحہ ضائع کر کے ٹائپ رائٹر میں نیا صفحہ لگا لیتا ہوں۔ میں بارہ صفحے کی ایک مختصر کہانی لکھنے کے عمل میں پانچ سو صفحے تک ضائع کر سکتا ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس پاگل پن کے خیال پر کبھی حاوی نہیں ہو سکا جس کی رو سے ٹائپنگ کی غلطی اور تخلیقی فیصلے کی غلطی مساوی حیثیت رکھتی ہیں۔

(دوسرے بہت سے ادیبوں کے برعکس) میں برقی ٹائپ رائٹر کا اتنا دلدادہ ہو گیا ہوں کہ

اب میں کسی اور شے کی مدد سے نہیں لکھ سکتا۔ میرا عام عقیدہ یہ ہے کہ اگر تمام جنسی سانشیں آدمی کے اردگرد ہوں تو وہ بہتر لکھتا ہے۔ میں اس رومانوی خیال سے اتفاق نہیں رکھتا کہ ادیب کے تخلیقی طور پر زرخیز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ فاقہ کشی کا شکار اور مصیبتوں کا مارا ہو۔ اگر آپ نے اچھا کھانا کھایا ہے اور آپ کے پاس ایک برقی ٹائپ رائٹر ہے تو آپ بہتر طور پر لکھ سکیں گے۔

(میں اپنے انٹرویوز میں اپنی زیرتحریر کتابوں پر اظہارخیال کرنا پسند نہیں کرتا) کیوں کہ وہ میری نجی زندگی کا حصہ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں ان ادیبوں کو قابلِ رحم سمجھتا ہوں جو اپنے انٹرویوز میں اپنی نئی کتاب کی حکایت بیان کر دیتے ہیں۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے کا کام حسبِ خواہ طور پر نہیں چل رہا اور وہ ان مسائل کو جو اخبارات میں زیربحث لا کر تسکین حاصل کر رہے ہیں جنھیں وہ ناول میں حل نہیں کر پا رہے۔ (لیکن میں اپنی زیرتحریر کتاب کے بارے میں اپنے قریبی دوستوں سے ضرور گفتگو کرتا ہوں) بلکہ درحقیقت میں انھیں اس پورے عمل سے گزارتا ہوں۔ میں جو چیز لکھ رہا ہوں اس کے بارے میں ان سے خوب باتیں کرتا ہوں۔ یہ اس بات کو جاننے کا ایک ذریعہ ہے کہ میرے قدم کہاں ٹھوس زمین پر ہیں اور کہاں دلدل پر۔ یہ اندھیرے میں راستا تلاش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ (لیکن اس کے باوجود میں انھیں اپنے لکھے ہوئے صفحات پڑھنے ہرگز نہیں دیتا) کبھی نہیں۔ یہ ایک قسم کا وہم بن چکا ہے۔ درحقیقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ ادیب، غرقاب شدہ جہاز کے ملاح کی طرح سمندر کے بیچوں بیچ بالکل تنہا ہوتا ہے۔ اس پیشے کی تنہائی کسی بھی اور پیشے کی تنہائی سے زیادہ ہے۔ جب آپ لکھ رہے ہوں تو کوئی شخص آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔

(میرے نزدیک لکھنے کے لیے مثالی جگہ) صبح کے وقت ایک ریتیلا جزیرہ اور رات کے وقت ایک بڑا شہر ہے۔ صبح میں مجھے خاموشی درکار ہوتی ہے اور شام کے وقت شراب کے چند جام اور اچھے دوستوں سے گپ شپ۔ عام لوگوں سے مسلسل رابطہ رکھنا اور یہ جاننا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، میرے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ سب ولیم فاکنر کے خیال سے مطابقت رکھتا ہے، جس نے کہا تھا کہ کسی ادیب کے لیے لکھنے کی مثالی جگہ ایک قحبہ خانہ ہے، جہاں صبح کے وقت خاموشی چھائی رہتی ہے اور شام کو جشن برپا رہتا ہے۔

(لکھنے کے ہنر کی طویل تربیت کے دوران جو ہستی سب سے بڑھ کر اور میری اولین مددگار ہوئی وہ میری نانی تھیں) وہ مجھے سہانی ہونے کے قصے ایک مہکائی بغیر یوں سناتی تھیں گویا یہ سب انھوں نے ابھی ابھی خود دیکھا ہو۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ یہ ان کا موثر انداز اور امیجز کی فراوانی تھی جس کے باعث ان کی کہانیاں اتنی قابلِ یقین لگتی تھیں۔ میں نے "تنہائی کے سو سال" میں اپنی نانی ہی کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ (لیکن یہ بات کہ مجھے ادیب بننا ہے، مجھے اپنی نانی سے نہیں بلکہ کافکا سے معلوم ہوئی) جو جرمن زبان میں قصہ گوئی کا وہی انداز رکھتا تھا جو میری نانی کا تھا۔ جب سترہ سال کی عمر میں میں نے "میٹامورفوسس" پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ میں ادیب بن سکتا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ کس طرح گریگر سمسا ایک صبح ایک بڑے سے کیڑے میں منقلب بیدار ہو سکتا ہے، تو میں نے خود سے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسا بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر ایسا ممکن ہے

تو یقیناً مجھے لکھنے کے کام سے دلچسپی ہے۔"

(مجھے اس کہانی میں اتنی شدید کشش اس لیے محسوس ہوئی کہ) اچانک مجھے پتا چلا کہ ادب میں، سیکنڈری اسکول کے نصاب میں شامل، عقلی اور انتہائی درسی مثالوں سے ہٹ کر کس قدر بےشمار امکانات موجود ہیں۔ یہ انکشاف گویا عصمت کی پیٹی توڑ ڈالنے کے مترادف تھا۔ لیکن برسوں کے عمل میں میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنی مرضی سے کچھ بھی ایجاد یا متصور کر لیں، کیوں کہ اس طرح آپ سچ نہ بولنے کے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں، اور جھوٹ ادب میں حقیقی زندگی سے بڑھ کر سنگین نتائج پیدا کرتا ہے۔ ہر بظاہر بےسروپا تخلیق بھی اپنے کچھ اصول رکھتی ہے۔ آپ عقلیت کا برگ انجیر اسی وقت اتار کر پھینک سکتے ہیں جب آپ مکمل انتشار اور لغویت اور فینٹسی کی دلدل میں اتر جانے کے خطرے سے آزاد ہوں۔

(مجھے فینٹسی سے نفرت ہے) کیوں کہ میں تخیل کو حقیقت کی تخلیق کا ذریعہ سمجھتا ہوں، اور یہ کہ تخلیق کا سرچشمہ، آخری تجزیے میں، حقیقت ہی ہے۔ فینٹسی، والٹ ڈزنی کے مدار کی اختراع کے مفہوم میں، جس کی حقیقت پر بنیاد ہی نہ ہو، مجھے سب سے زیادہ ناگوار ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب مجھے بچوں کی کہانیوں کی ایک کتاب لکھنے کا شوق ہوا اور میں نے "گم شدہ وقت کا سمندر" کا مسودہ (ایک دوست کو) بھجوایا تو (اس نے) اپنی مخصوص صاف گوئی سے بتایا کہ یہ کہانی (اسے) پسند نہیں آئی۔ (اس کے) خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فینٹسی کا ذوق نہیں رکھتا تھا۔ اس بات نے مجھے تہ و بالا کر دیا، کیوں کہ بچے بھی فینٹسی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ جس چیز کو پسند کرتے ہیں وہ تخیل ہے۔ اور ان دونوں میں وہی فرق ہے جو انسانی ہونے اور شعبدہ باز کا پُتلا ہونے میں ہے۔

(کافکا کے علاوہ جس دوسرے ادیب نے لکھنے کے ہنر کو سنوارنے اور اس کی باریکیاں سیکھنے میں میری مدد کی) وہ ہیمنگ وے ہے، جسے میں عظیم ناول نگار نہیں سمجھتا، لیکن نہایت عمدہ افسانہ نگار مانتا ہوں۔ اس کی ایک نصیحت یہ تھی کہ افسانے کی بنیاد، آئس برگ کی طرح، اس حصے پر قائم ہونی چاہیے جو نظروں سے اوجھل ہو، یعنی وہ سارا غوروفکر اور مطالعہ اور وہ سارے لوازمات جنھیں اکٹھا کیا گیا لیکن افسانے میں براہ راست استعمال نہیں کیا گیا۔ بےشک ہیمنگ وے آپ کو بہت کچھ سکھا سکتا ہے، یہ تک دیکھنا سکتا ہے کہ بلی کوئی موڑ کیسے مڑتی ہے۔

گراہم گرین نے مجھے سکھایا کہ گرم خطوں کو کس طرح دریافت کیا جاتا ہے، جو کوئی معمولی بات نہیں۔ جس ماحول سے آپ بےتحاشا واقفیت رکھتے ہوں، اس کے شاعرانہ مرکب میں سے اس کی بنیادی عناصر کو علیحدہ کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ یہ سب اتنا مانوس ہوتا ہے کہ آپ کو علم نہیں ہو پاتا کہ کہاں سے آغاز کیا جائے اور پھر بھی آپ کے پاس کہنے کو اتنا کچھ ہوتا ہے کہ انجام کار آپ کچھ بھی سمجھ پانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ منطقہ حارہ کے بارے میں مجھے یہی مسئلہ درپیش تھا۔ میں کرسٹوفر کولمبس، پیگافیٹا اور انڈیز کے دیگر وقائع نگاروں کی تحریریں بےحد دلچسپی سے پڑھ چکا تھا اور ان کے اوریجنل وژن کی داد بھی دے چکا تھا۔ میں نے سالگری اور کونریڈ اور بیسویں صدی کے اوائل کے لاطینی امریکی "منطقہ

حارہ کے ماہرین" کو بھی پڑھ رکھا تھا جو ہر چیز کو جدیدیت کی عینک سے دیکھتے تھے، اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں کو بھی، لیکن مجھے ان کے بیانیے اور اصل حقیقت کے درمیان بیحد وسیع وعریض خلیج حائل دکھائی دیتی تھی۔ ان میں سے بعض، چیزوں کی فہرستیں بنانے کے جال میں گرفتار ہو گئے تھے، اور ستم ظریفی یہ کہ ان کی فہرست جتنی طویل ہوتی، ان کا وژن اسا ہی تنگ محسوس ہوتا۔ بعض دوسرے لکھنے والے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، خطابت کی زیادتی کا شکار ہو گئے تھے۔ گراہم گرین نے اس ادبی مسئلے کو بیحد مختصر اور موثر انداز میں حل کر دیا۔ اس نے چند اِدھر اُدھر کے عناصر چن لیے، جو ایک دوسرے سے ایسے داخلی ربط کے ذریعے وابستہ تھے جو لطیف بھی تھا اور حقیقی بھی۔ اس طریقے کو استعمال کر کے آپ منطقۂ حارہ کی تمام تر پیچیدگی کو ایک گلتے ہوئے امرود کی مہک کے ذریعے بیان کر سکتے ہیں۔

(ایک اور نصیحت جس پر کان دھرنا مجھے یاد ہے) وہ بات ہے جو دومینیکی ادیب خوان بوش (Juan Bosch) نے پچیس سال پہلے کاراکاس میں کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ لکھنے کا سارا ہنر — تکنیک، صاحب کے طریقے، بیحد باریک اور پوشیدہ جوڑ، سب کچھ — نوعمری میں سیکھ لینا پڑتا ہے۔ ہم ادیب لوگ توتوں کی طرح ہیں، بڈھے ہو کر ہم بولنا نہیں سیکھ سکتے۔

(صحافت نے ادب کے پیشے میں میری مدد کی) لیکن زبان کا زیادہ موثر استعمال سکھانے کے ذریعے نہیں، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ صحافت نے مجھے اپنی کہانیوں کو استناد بخشنا سکھایا۔ حسین ریمیدیوس کو بلند ہو کر آسمان میں چلے جانے سے پہلے چادروں — سفید چادروں — میں لپیٹ، یا فادر نکانور رائنا کو زمین سے چھ انچ اوپر اٹھ جانے سے پہلے اس کے ہاتھ میں سیال چاکلیٹ کا — چاکلیٹ کا، کسی اور مشروب کا نہیں — گلاس تھمانا، یہ سب صحافتی ترکیبیں ہیں، اور بیحد مفید۔

(سنیما دیکھنے کا میں ہمیشہ سے ازحد شائق رہا ہوں لیکن سنیما ادیب کو مفید تکنیکیں سکھا سکتا ہے یا نہیں) اس بارے میں میں یقین سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے سنیما کی حیثیت اعانت کی بھی رہی ہے اور رکاوٹ کی بھی۔ اس نے مجھے بصری تصویروں میں سوچنا سکھایا۔ لیکن دوسری طرف اب مجھے "تنہائی کے سو سال" سے پہلے لکھی گئی اپنی تمام کتابوں میں کرداروں اور مناظر کو بصری انداز میں تصور کرنے کا خواہش جنون، بلکہ کیمرے کے زاویوں اور فریموں سے جنون کی حد تک لگاؤ بھی محسوس ہوتا ہے۔ (مثلاً "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا") ایک ایسا ناول ہے جو اسلوب کے اعتبار سے کسی فلم اسکرپٹ سے مشابہ ہے۔ کردار یوں حرکت کرتے ہیں جیسے کیمرا ان کا تعاقب کر رہا ہو۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ ادبی طریقے سنیما کے طریقوں سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔

مکالمے ہسپانوی زبان میں سچ محسوس نہیں ہوتے۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ اس زبان میں بولے جانے والے اور لکھے جانے والے مکالموں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل ہے۔ کوئی ہسپانوی مکالمہ جو اصل زندگی میں اچھا لگتا ہو، ضروری نہیں کہ کسی ناول میں بھی اچھا لگے۔ اس لیے میں اپنی تحریروں میں مکالمات بہت کم استعمال کرتا ہوں۔

(ناول لکھنے کے دوران اس بات کا مجھے بس عمومی سا احساس رہتا ہے کہ کس کردار کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔) لیکن ناول لکھنے کے عمل میں غیرمتوقع واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ کرنل اوریلیانو بوئندیا کے بارے میں مجھے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ وہ خانہ جنگی کا ایک پرانا سورما ہو گا جس کی موت ایک درخت کے نیچے پیشاب کرتے ہوئے واقع ہو گی۔

(جب اس کی موت درحقیقت واقع ہوئی تو یہ میرے لیے ایک بیحد تکلیف دہ مرحلہ تھا۔) میں یہ تو جانتا تھا کہ کسی نہ کسی مرحلے پر اسے موت کے گھاٹ اترنا ہی ہو گا، لیکن مجھ میں اس کی ہمت نہیں تھی۔ کرنل اس وقت تک خاصا معمر ہو چکا تھا اور بیٹھا اپنی طلائی مچھلیاں بناتا رہتا تھا، تب ایک سہ پہر میں نے سوچا، "اب اس کا وقت آ گیا ہے۔" مجھے اس کو ختم کرنا ہی پڑا۔ جب یہ باب مکمل ہوا تو میں لرزتا ہوا مکان کی دوسری منزل پر مرسیدس کے پاس گیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اندازہ کر لیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ "کرنل مر گیا" وہ بولی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور دو گھنٹے تک روتا رہا۔

انسپریشن (inspiration) ایک ایسا لفظ ہے جو رومانویوں کے ہاتھوں بے اعتبار ہو چکا ہے۔ میں اسے کوئی خاص ارفع کیفیت یا جنت کی ہوا کا جھونکا خیال نہیں کرتا، بلکہ ایک ایسا لمحہ سمجھتا ہوں جب ثابت قدمی اور ضبط کے ذریعے آپ اور آپ کا موضوع مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جب آپ کچھ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے اور آپ کے موضوع کے درمیان ایک طرح کا باہمی کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اور اس طرح جوں جوں آپ اپنے موضوع کو مہمیز دیتے جاتے ہیں وہ آپ کو مہمیز دیتا جاتا ہے۔ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب ساری رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، تمام کشمکش غائب ہو جاتی ہے، ایسی باتیں آپ پر کھلنے لگتی ہیں جو کبھی آپ کے وہم وگمان میں بھی نہ آئی تھیں، اور اس لمحے دنیا میں لکھنے سے بہتر کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی۔ میں تو اسی کو انسپریشن کہتا ہوں۔

(کبھی کبھی میں کوئی کتاب لکھنے کے دوران اس ارفع کیفیت سے محروم ہو جاتا ہوں)، اور تب میں اس کے بارے میں ازسرنو، ابتدا سے سوچنا شروع کر دیتا ہوں۔ ایسے لمحے آتے ہیں جب میں پیچ کس اٹھا کر سارے گھر کے تالے اور قبضے مرمت کرنے لگتا ہوں یا دروازوں پر سبز رنگ کرنے لگتا ہوں کیونکہ بعض اوقات ہاتھ سے کام کرنے سے آدمی حقیقت سے خوف کے احساس پر قابو پا لیتا ہے۔

ایسا مسئلہ عموماً ساخت کے معاملے میں پیش آتا ہے اور کبھی کبھار اتنی سنگین نوعیت کا ہوتا ہے کہ مجھے ازسرنو آغاز کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ میں نے میکسیکو میں ۱۹۶۲ میں "سردار کا زوال" کے تین سو صفحات لکھ لینے کے بعد اس پر کام روک دیا تھا اور اس مسودے کی کوئی چیز باقی بچی تو صرف اس کے مرکزی کردار کا نام۔ ایسی سو ارسٹھ میں بارسلونا میں میں نے پھر اس پر دوبارہ کام شروع کیا، اور چھ مہینے اس پر صرف کر کے اسے دوبارہ ادھورا چھوڑ دیا، کیونکہ اس کے مرکزی کردار ایک بہت بوڑھے ڈکٹیٹر، کی شخصیت کے بعض اخلاقی پہلو میری گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔ تقریباً دو سال بعد میں نے افریقہ میں شکار کے موضوع پر ایک کتاب خریدی، کیونکہ مجھے اس پر ہیمنگ وے کے لکھے ہوئے پیش لفظ سے دلچسپی تھی۔ پیش لفظ میں تو کوئی خاص بات نہ نکلی مگر میں نے ہاتھیوں کے بارے

میں ایک باب پڑھنا شروع کر دیا، اور وہاں سے مجھے اپنے ناول کی کلید ہاتھ آ گئی۔ ہاتھیوں کی بعض عادات نے میرے ڈکٹیٹر کی اخلاقیات کی مکمل طور پر وضاحت کر دی۔

(ناول کی ساخت اور مرکزی کردار کی نفسیات کے مسائل سے قطع نظر) ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھ پر ایک گمبھیر حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میں کتاب میں موسم کو مناسب حد تک گرم نہیں بنا پا رہا تھا۔ یہ بات بہت گمبھیر اس لیے تھی کہ یہ واقعات کریبیئن کے ایک شہر میں پیش آئے تھے جہاں کا موسم ناقابل یقین حد تک گرم ہونا چاہیے تھا۔ اس کا واحد حل جو میں سوچ سکا وہ یہ تھا کہ سامان باندھوں اور پورے خاندان کو ساتھ لے کر کریبیئن کی طرف نکل جاؤں۔ میں تقریباً ایک برس تک کچھ کیے بغیر، اس خطے میں گھومتا رہا۔ سفر سے بارسلونا واپس پہنچ کر، جہاں میں یہ کتاب لکھ رہا تھا، میں نے کچھ پودے اگائے کچھ خوشبوؤں کا اضافہ کیا اور بالآخر مطلوبہ حرارہ کے اس شہر کی شدید گرمی پڑھنے والے تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔

(جب میں کوئی ناول مکمل کر لیتا ہوں تو) اس میں ہمیشہ کے لیے دل چسپی کھو بیٹھتا ہوں۔ جیسا کہ ہیمنگ وے کہا کرتا تھا یہ اب ایک مردہ شیر کی طرح ہے۔

(میرے خیال میں ہر ناول حقیقت کی ایک شاعرانہ تقلیب ہے۔) اس سے مراد یہ ہے کہ میرے نزدیک ناول خفیہ کوڈ میں بیان کی گئی حقیقت ہے، دنیا کے بارے میں ایک قسم کی پہیلی۔ ناول میں آپ جس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں وہ اصل زندگی کی حقیقت سے مختلف ہوتی ہے، اگرچہ اس کی جڑیں اسی میں ہوتی ہیں۔ یہی بات خوابوں کے بارے میں بھی درست ہے۔

(میں نے اپنی تحریروں خصوصاً "تنہائی کے سو سال" اور "سردار کا زوال" میں حقیقت کو جس طرح برتا ہے، اسے طلسمی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا ہے۔ میرے یوروپی قارئین غالباً میری کہانیوں کے طلسم سے تو باخبر ہوتے ہیں لیکن اس کے عقب میں چھپی حقیقت کو نہیں دیکھ پاتے۔) اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ ان کی عقلیت پسندی انہیں یہ دیکھنے سے باز رکھتی ہے کہ حقیقت ٹماٹروں اور انڈوں کے بھاؤ تک محدود نہیں۔ لاطینی امریکا کی روزمرہ زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ حقیقت نہایت غیرمعمولی باتوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی یہ بات واضح کرنے کے لیے میں عموماً امریکی مہم جو ایف ڈبلیو اپ ڈیگراف (F. W. Up de Graff) کی مثال پیش کرتا ہوں جس نے پچھلی صدی کے آخر میں امازون کے جنگل میں ایک ناقابل یقین سفر اختیار کیا اور دوسری چیزوں کے علاوہ ابلتے ہوئے پانی کا ایک دریا دیکھا اور ایک ایسا مقام جہاں انسانی آواز کے اثر سے موسلادھار بارش ہونے لگتی تھی۔ ارجنٹینا کے انتہائی جنوب میں واقع کموڈورو ریواڈاویا میں قطب جنوبی سے چلنے والی ہوا ایک پورے سرکس کو اڑا لے گئی اور اگلے روز مچھیروں کے جالوں میں سے شیروں اور زرافوں کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ "بڑی ماما کا جنازہ" میں میں نے ایک کولمبیئن گاؤں میں پوپ کے ایک ناقابل تصور اور ناممکن سفر کی کہانی بیان کی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے پوپ کا استقبال کرنے والے صدر کو گنجا اور موٹا بیان کیا تاکہ اس پر اس وقت کے اصل صدرِمملکت کا شبہ نہ کیا جا سکے جو دبلا اور دراز قامت تھا۔ اس کہانی کے لکھے جانے کے گیارہ برس بعد پوپ نے واقعی کولمبیا کا دورہ کیا،

اور اس کا استقبال کرنے والا صدر کہانی میں بیان کیے گئے صدر کی طرح گنجا اور موٹا تھا۔ جب میں "تنہائی کے سو سال" لکھ چکا تھا، تو بارنکیلا میں ایک لڑکا نمودار ہوا جس کا دعویٰ تھا کہ اس کے سؤر کی دم ہے۔ جو غیرمعمولی باتیں ہمیں روز پیش آتی رہتی ہیں ان پر نظر ڈالنے کے لیے آپ کو صرف اخبار کھولنے کی ضرورت ہے۔ میں ایسے عام لوگوں سے واقف ہوں جنھوں نے "تنہائی کے سو سال" کو بہت غور سے اور بےحد مسرت کے ساتھ پڑھا، لیکن انھیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوا کیونکہ، انجام کار، میں نے کوئی ایسی چیز بیان نہیں کی تھی جو خود ان کی زندگی میں پیش نہ آ چکی ہو۔

(میری کتابوں کا) ایک فقرہ بھی ایسا نہیں جس کی بنیاد حقیقت پر نہ ہو۔ ("تنہائی کے سو سال" میں بعید از قیاس چیزیں پیش آتی ہیں۔ حسین ریمیدیوس بلند ہو کر آسمان میں چلی جاتی ہے۔ زرد تتلیاں موریسیو بابیلونیا کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔) یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔

مثلاً موریسیو بابیلونیا۔ جب میں پانچ سال کا تھا، اراکاتاکا میں ہمارے گھر میں ایک الیکٹریشین میٹر تبدیل کرنے آیا۔ مجھے یہ واقعہ ایسے یاد ہے گویا کل کی بات ہو، کیونکہ اس کی چمڑے کی اس پیٹی نے مجھے مسحور کر لیا تھا جو وہ اونچے کھمبوں پر چڑھتے ہوئے، گرنے سے بچنے کے لیے باندھ لیا کرتا تھا۔ وہ کئی بار آیا۔ ان میں سے ایک بار میں نے اپنی نانی کو دیکھا کہ جھاڑن کی مدد سے ایک تتلی کو بھگانے کی کوشش کر رہی ہیں، "جب بھی یہ آدمی گھر میں آتا ہے یہ زرد تتلی بھی اس کے پیچھے پیچھے آ جاتی ہے۔" یہ موریسیو بابیلونیا کا جنین تھا۔

حسین ریمیدیوس کے بارے میں میرا اصل منصوبہ یہ تھا کہ وہ گھر میں ربیکا اور امارانتا کے ساتھ کڑھائی کرتے کرتے غائب ہو جائے گی۔ مگر یہ تقریباً سینماٹوگرافک ترکیب قابل عمل نہ لگی۔ ریمیدیوس اب بھی نظروں کے سامنے موجود تھی۔ تب مجھے اس کو، جسم اور روح سمیت، بلند کر کے آسمان میں بھیج دینے کا خیال آیا۔ اس کے پیچھے کیا واقعہ تھا؟ ایک عورت جس کی پوتی صبح کی اولین ساعتوں میں گھر سے بھاگ گئی تھی اور جس نے اس واقعے پر پردہ ڈالنے کی غرض سے یہ کہانی مشہور کر دی تھی کہ وہ اوپر آسمان میں چلی گئی ہے۔

(لیکن اسے اڑا کر آسمان میں بھیجنا خاصا دشوار ثابت ہوا۔) وہ زمین سے اٹھ کر ہی نہ دیتی تھی۔ ایک روز اسی مسئلے پر غور کرتا ہوا میں باہر اپنے باغ میں نکل آیا۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ ایک لحیم شحیم بےحد حسین سیاہ فام عورت نے ابھی ابھی کپڑوں کی دھلائی ختم کی تھی اور چادروں کو سوکھنے کے لیے رسی پر پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی، کیونکہ ہوا چادروں کو مسلسل اڑائے جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک لہر ابھری۔ "یہ ہے طریقہ!" میں نے سوچا۔ حسین ریمیدیوس کو اوپر آسمان میں جانے کے لیے چادریں درکار تھیں۔ اس قصے میں حقیقت کا عنصر چادروں نے فراہم کیا۔ جب میں اپنے ٹائپ رائٹر پر لوٹا تو حسین ریمیدیوس کو اوپر اور اوپر جانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اب اسے خدا بھی نہیں روک سکتا تھا۔

میں آپ کو خبردار کر دوں کہ میری پسندیدہ کتابیں لازماً وہی نہیں ہوتیں جنھیں میں بہترین کتابیں سمجھتا ہوں۔ میرے ان کتابوں کو پڑھنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، جن کی وضاحت کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ سوفوکلیز کی *Oedipus Rex*، *Amadis of Gaul*، *Lazarillo de Tormes*، ڈینیئل ڈیفو کا *A Journal of the Plague Year*، پیگافیتا کا *First Voyage around the World* اور ہاں، (ایڈگر رائس) بروز کا *Tarzan of the Apes*۔

(جن ادیبوں کی طرف میں سب سے زیادہ لوٹ لوٹ کر جاتا ہوں) وہ کونریڈ اور سانت ایکزیوپیری (Saint Exupery) ہیں۔ کسی ادیب کی طرف لوٹنے اور اسے دوبارہ پڑھنے کی واحد وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کو پسند ہے۔ ان دونوں ادیبوں میں مجھے جو بات پسند ہے وہ ان کی واحد مشترک خصوصیت ہے: حقیقت تک رسائی کا ایک عجیب وغریب انداز جس کے باعث وہ شاعرانہ معلوم ہونے لگتی ہے، خواہ اس مقام پر وہ بالکل عامیانہ ہی کیوں نہ ہو۔

میں تالستائی کی کوئی کتاب کبھی اپنے ساتھ نہیں رکھتا، مگر اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ "جنگ اور امن" سے اچھا ناول کبھی نہیں لکھا گیا۔

(لیکن کسی نقاد کو میری کتابوں میں ان ادیبوں کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔) میں اس بات کی ہمیشہ سخت کوشش کرتا رہا ہوں کہ کسی اور کی طرح نظر نہ آؤں۔ جو ادیب مجھے پسند ہیں میں نے ان کی نقل کرنے کے بجائے ہمیشہ ان سے دور بھاگنے کی کوشش کی ہے۔

(اس کے باوجود نقادوں کو میری تحریروں پر فاکنر کا سایہ ہمیشہ نظر آتا رہا ہے) اور انھوں نے فاکنر کے اثرات پر اس قدر زور دیا کہ کچھ عرصے کے لیے تو میں بھی قائل ہو گیا تھا۔ لیکن میں اس کا برا نہیں مانتا، کیوںکہ وہ تمام زمانوں کے عظیم ترین ناول نگاروں میں سے ایک ہیں۔ تاہم نقاد جس انداز میں اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ فاکنر کے ساتھ میری مماثلتیں ادبی سے زیادہ جغرافیائی ہیں۔ مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب، اپنے شروع کے ناول لکھ چکنے کے بہت بعد، میں ریاستہائے متحدہ کے جنوبی علاقوں میں سفر کر رہا تھا۔ اس سفر کے دوران میر پیدا ہونے والی تپتی ہوئے گردآلود قصبوں اور شکست خوردہ لوگوں سے ہوا، وہ ان قصبوں اور لوگوں سے گہری مشابہت رکھتے تھے جنھیں میں اپنی کہانیوں میں خلق کرتا ہوں۔ شاید یہ مشابہت اتفاقی نہیں تھی کیوںکہ ارکاٹاکا بیشتر حصہ یک امریکی کمپنی یونائیٹڈ فروٹ نے تعمیر کیا تھا۔

(شاید آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشابہت اس سے آگے جاتی ہے۔ کرنل سارٹورس اور کرنل اوریلیانو بوئندیا کے درمیان اور ماکوندو اور یوکناپٹاوفا کاؤنٹی کے درمیان ایک گہرا رشتہ کم و بیش سلف و خلف کا سا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ تو کیا فاکنر کو تسلیم کرنے سے روگردانی کرنا آباواجداد کو قتل کرنے کے مترادف نہیں؟) شاید ایسا ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کہا کہ میرا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ فاکنر کی نقل کیوںکر کی جائے بلکہ یہ کہ اسے نیست و نابود کس طرح کیا جائے۔ اس کا اثر واقعی مجھے بےحد نقصان پہنچا رہا تھا۔

(ورجینیا وولف کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں اپنی تحریروں پر اس کے

اثرات کا ذکر کرنے والا واحد شخص ہوں، جبکہ دوسروں کو یہ اثرات دکھائی نہیں دیتے۔) آج میں جس قسم کا ادیب ہوں اس سے قطعی مختلف ہوتا، اگر بیس سال کی عمر میں میں نے "مسز ڈالووے" کا یہ جملہ نہ پڑھا ہوتا:

> But there can be no doubt that gr[illegible]

مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ جملہ پڑھتے ہوئے اس زمانے میں جب میں گواہیرا کے علاقے میں انسائیکلوپیڈیا اور طبی کتابیں فروخت کرتا پھرتا تھا، ایک بوسیدہ ہوٹل کے کمرے کی شدید گرمی اور مچھروں کے تھپیڑوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ (اس جملے کا اتنا گہرا اثر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میرے احساسِ زماں کو یکسر منقلب کر دیا۔ میں نے ایک ہی جھماکے میں ماکوندو کی شکست و ریخت کا پورا عمل اور اس کی آخری تقدیر دیکھ لی۔ مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں "سردار کا زوال" کی دھندلی سی ابتدا بھی اسی جملے سے نہ ہوئی ہو جو ایک ایسی کتاب ہے جس کا موضوع اقتدار کا معمہ، اس کی تنہائی اور اس کی کراہت ہے۔

(دیگر اثرات جو میری تحریروں پر پڑے) ان میں سوفوکلیز، رابیو، کافکا، ہسپانوی سنہری دور کی شاعری اور شومان سے لے کر بارٹوک تک، چیمبر موسیقی شامل ہیں۔

گراہم گرین اور ہیمنگ وے دونوں نے مجھے خالص تکنیکی ترکیبیں سکھائیں۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ ان کی محبت تسلیم کی ہے لیکن یہ سطحی اثرات ہیں۔ میرے نزدیک حقیقی اثر وہ اہم اثر ہے اس وقت ہوتا ہے جب کسی ادیب کی تحریر آپ کو اتنی گہرائی تک متاثر کر دے کہ اس کے باعث دنیا اور زندگی کے بارے میں آپ کے چند ایک تصورات تبدیل ہو جائیں۔

ادب سے میری دلچسپی شاعری کے ذریعے شروع ہوئی، خراب شاعری کے ذریعے، مقبول عام شاعری کے ذریعے، اس شاعری کے ذریعے جو کیلنڈروں پر چھپی جاتی ہے یا پوسٹروں کے طور پر فروخت ہوتی ہے۔ مجھے پتا چلا کہ مجھے شاعری اتنی ہی پسند ہے جتنی مجھے کاسٹیلین درسی اسباق کی گرامر سے نفرت ہے، جو مجھے سیکنڈری سکول میں پڑھائی گئی تھی۔ مجھے ہسپانوی رومانویوں ... نونیز دی آرکے اسپرونسیدا ... سے محبت تھی۔ میں نے انھیں زپاکیرا میں پڑھا تھا۔ اب اسے سمندر سے چھ سو میل دور واقع اس غمناک شہر کے طور پر جانتے ہیں جہاں ویلنسیو سکندو فرنانڈا دیل کارپیو کو لینے گیا تھا۔ میری ادبی تعلیم وہیں ایک سیکنڈری اسکول میں شروع ہوئی جہاں میں بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھا۔ ایک طرف میں خراب شاعری پڑھا کرتا تھا تو دوسری طرف مارکسسٹ تحریریں، جو میرا تاریخ کا استاد مجھے خفیہ طور پر دیا کرتا تھا۔ میں اتوار کا دن بوریت دور کرنے کے لیے اسکول کی لائبریری میں گزارتا تھا۔ سو میں نے خراب شاعری سے ابتدا کی، اس سے پیشتر کہ اچھی شاعری کو دریافت کر سکوں، رابیو، والیری اور بلاشبہ نیرودا۔ میں نیرودا کو بیسویں صدی

کا، کسی بھی زبان میں، سب بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ حتیٰ کہ جب وہ مشکل مقام میں پھنس جاتا تھا — مثلاً اس کی سیاسی شاعری، اس کی جنگی شاعری — تب بھی شاعری بذاتِ خود ہمیشہ اول درجے کی رہتی تھی۔ میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، نیرودا ایک قسم کا شاہ میداس تھا، وہ جس چیز کو چھو لیتا تھا شاعری ہی جاتی تھی۔

(ناول سے میری دلچسپی) بہت بعد میں شروع ہوئی جب میں یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے پہلے سال میں تھا۔ اس وقت میری عمر انیس سال کی رہی ہو گی اور میں نے "میٹامورفوسس" پڑھا۔ میں اس کشف کے بارے میں پہلے بات کر چکا ہوں۔ یہی وہ موقع تھا جب مجھے ناول سے پہلی بار دلچسپی پیدا ہوئی، جب میں نے ہر زمانے کے تمام اہم ترین ناولوں کو پڑھنے کا تہیہ کیا، سارے ناول، بائبل سے لے کر، جو ایک ایسی داستانی کتاب ہے جس میں ہر وقت عجیب وغریب واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ میں نے ہر چیز ترک کر دی، اپنی قانون کی ڈگری سمیت، اور خود کو بس تب ناول پڑھنے میں لگا دیا۔ ناول پڑھنے میں، اور ناول لکھنے میں۔

(میرے شاعرانہ پس منظر کا اظہار، سب سے بڑھ کر) میرے خیال میں "سردار کا زوال" میں ہوتا ہے (جس کی تعریف میں نے نثری نظم — اقتدار کی تنہائی کے موضوع پر ایک نظم — کے طور پر کی ہے۔) میں نے اسے نثری نظم ہی کے طور پر لکھا تھا۔ کیا آپ نے محسوس کیا کہ اس میں روبن داریو کی شاعری کے پورے پورے ٹکڑے شامل ہیں؟ "سردار کا زوال" داریو کے چاہنے والوں کی جانب اشاریتی کنایوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ کتاب کا ایک کردار بھی ہے، اور اس کی ایک نظم بڑے اطمینان سے ڈال دی گئی ہے، وہ نثری نظم جو اس طرح ہے:

There was a monogram on your white handkerchief, a red monogram of a name
which was not yours, my Lord

(ناول اور شاعری کے علاوہ) میں بہت سی ایسی کتابیں پڑھتا ہوں جو بطور ادب کے نہیں بلکہ اپنی دستاویزی قدروقیمت کے باعث زیادہ معروف ہیں۔ مثلاً مشہور لوگوں کی یادداشتیں، خواہ وہ جھوٹ ہی سہی ہوں، سوانحی کتابیں اور صحافتیں۔ (میری پسندیدہ کتابوں میں *Or I'll Dress you in Mourning*، ڈومینیک لاپیئر اور لیری کولنز کی لکھی ہوئی ایل کورڈوبیز کی سوانح، *The Day of the Jackal* شامل ہیں اور ہاں *Papillon* جو ایک بیحد ولولہ انگیز کتاب ہے جس میں کسی طرح کی کوئی ادبی خوبی نہیں ہے۔ اسے کسی ایسے اچھے ادیب کے قلم سے دوبارہ لکھا جانا چاہیے جو یہ تاثر دے سکے کہ اسے کسی مبتدی نے لکھا ہے۔

جہاں تک ان غیرادبی اثرات کا تعلق ہے جو میری تحریروں کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوئے) میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ میری نانی ایک توہّم پرست عورت تھیں جن کا تخیل بیحد آب دار تھا اور جو ہر رات بھر کے آس پاس کے قصے سنا سنا کر مجھے دہلاتی رہتی تھیں۔ میرے نانا نے، جب میں آٹھ سال کا تھا، مجھے ان تمام جنگوں کے واقعات سنائے تھے جن میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔

میرے نانا نانی کا تعلق گالیسیا سے تھا، اور انھوں نے مجھے جو مافوق الفطرت قصے سنائے تھے ان میں سے بیشتر گالیسیا ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ مافوق الفطرت سے ہمارے شغف میں ہماری افریقی وراثت کا بھی حصہ ہے۔ کولومبیا کا کریبیئی ساحل

ور برازیل مل کر لاطینی امریکہ کا وہ حصہ ہیں جو افریقا سے قریب ترین ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۷۸ میں میرے انگولا کے سفر نے مجھے میری زندگی کا ایک سب سے مسحورکن تجربہ بخشا۔ یہ میری زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ مجھے وہاں ایک اجنبی، مکمل طور پر نامانوس، دنیا پانے کی توقع تھی، لیکن جس لمحے میں نے افریقہ میں قدم رکھا اور وہاں کی ہوا میں سانس لی، اسی لمحے سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں اپنے بچپن کی دنیا میں واپس پہنچ گیا ہوں۔ ہاں، وہاں میں نے اپنے بچپن کو ازسرنو دریافت کیا، ان سب رسوم ورواج، تمام چہروں کو جنھیں میں بھول چکا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے بچپن کے دیکھے ہوئے ڈراونے خواب بھی دوبارہ نظر آنے لگے۔

لاطینی امریکہ میں ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ ہم ہسپانوی ہیں۔ بیشک یہ جزوی طور پر درست ہے، اس لیے کہ ہماری تہذیبی تشکیل میں ہسپانوی عنصر کی اہمیت مسلّم ہے، لیکن انگولا کے اس سفر میں میں نے دریافت کیا کہ ہم افریقی بھی ہیں، یا بلکہ ہم ایک نسلی آمیزہ ہیں۔ ہمارے کلچر کو بہت سی مختلف نسلوں نے مالامال کیا ہے۔ مجھے اس سے پہلے اس کا شعور نہ تھا۔

کریبین کے خطے میں، جہاں میرا جنم ہوا، کلچر کی ایسی ہیئتیں موجود ہیں جو اپنی اصل میں افریقی ہیں، جو انتی پلانو کے علاقے میں پائی جانے والی تہذیبی ہیئتوں سے بہت مختلف ہیں جہاں مقامی تہذیبیں زیادہ مضبوط ہیں۔ افریقی غلاموں کے فراواں تخیل، کولمبس سے پہلے کے مقامی باشندوں کے تخیل، لیکن کے اندلسی ذوق اور گالیسیا کی مافوق الفطرت روایات نے آمیخت ہو کر حقیقت کو ایک مخصوص طلسمی انداز میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ یہ کریبیئی کے علاقے اور برازیل میں مشترک ہے۔ اس صلاحیت سے ایک مخصوص ادب، ایک مخصوص موسیقی اور مصوری کا ایک مخصوص اسلوب پیدا ہوا (جو کیوبا کے ولفریڈو لام کے اسلوب کی طرح ہے)، جو سب اس خطے کے جمالیاتی اظہار ہیں۔

کریبیئی نے مجھے حقیقت کو ایک مختلف انداز سے دیکھنا اور مافوق الفطرت کو روزمرہ زندگی کے ایک حصے کے طور پر قبول کرنا سکھایا۔ کریبیئی ایک منفرد دنیا ہے جس کے طلسمی ادب کی پہلی تحریر "کرسٹوفر کولمبس کی ڈائری" ہے، ایک کتاب جو نادرروزگار پودوں اور دیومالائی معاشرتوں کے قصے سناتی ہے۔ کریبیئی کی تاریخ طلسم سے بھرپور ہے، ایک طلسم جسے سیاہ فام غلام افریقہ سے لائے، لیکن جسے سویڈش، ولندیزی اور انگریز قزاق بھی لائے جو نیو اورلینز میں اوپیرا ہاؤس قائم کرتے یا عورتوں کے دانتوں کو ہیروں سے بھرنے کو کوئی بڑی بات نہ سمجھتے تھے۔ دنیا میں کہیں بھی آپ کو یہ نسلی آمیزش اور یہ تضادات نہیں ملیں گے جو کریبیئی میں پائے جاتے ہیں۔ میں اس خطے کے تمام جزیروں سے واقف ہوں: ان میں بسنے والے شہد کی رنگت والے ملاٹ باشندے جن کی آنکھیں سبز ہوتی ہیں اور گردنوں میں سنہری رومال پڑے ہوتے ہیں یا دوسرے بدھسٹ جو کپڑے دھوتے اور تعویذ فروخت کرتے ہیں؛ سنہری حائل چہرے والے لبنانی جو اپنی ہاتھی دانت کی دکانوں سے اٹھ کر گلی کے بیچوں بیچ رفع حاجت کرنے لگتے ہیں؛ ایک طرف ان جزیروں میں واقع تپتے ہوئے گردآلود قصبے ہیں جن کے مکانات سمندری طوفانوں میں ڈھے جاتے ہیں اور دوسری طرف دھندلے شیشوں والی

بلندوبالا عمارات اور سات رنگوں کا سمندر۔ اگر میں کریبیئن کے بارے میں بات کرنا شروع کر دوں تو پھر میں رک نہیں سکتا۔ یہ نہ صرف وہ دنیا ہے جس نے مجھے لکھنا سکھایا بلکہ یہ وہ واحد مقام ہے جو مجھے واقعی اپنا گھر محسوس ہوتا ہے۔

عام طور پر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ادیب ایک ہی کتاب لکھتا ہے، اگرچہ یہ واحد کتاب کئی جلدوں میں مختلف عنوانات کے تحت شائع ہوتی ہے۔ یہ بات آپ کو بالزاک، کونریڈ، میلول اور بلاشبہ فاکنر کے ہاں نظر آتی ہے۔ ان کئی کتابوں میں سے بعض اوقات کوئی ایک کتاب بقیہ کتابوں کے مقابلے میں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اور اس ادیب کو ایک واحد اور اصل کتاب کا مصنف سمجھا جانے لگتا ہے۔ سروانٹیس کی کہانیاں کس کو یاد ہیں؟ مثلاً The Graduate Who Thought He was Made of Glass کس کو یاد ہے؟ لیکن اس کے باوجود اسے اتنی ہی مسرت کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے جتنا سروانٹیس کی ساختہ تحریروں کو۔

(اگر یہ سچ ہے کہ ہر ادیب زندگی بھر ایک ہی کتاب لکھتا رہتا ہے تو میری کتاب کون سی ہو گی؟ ماکوندو کی کتاب؟) ایسا نہیں ہے۔ میرے دو ناول "پتوں کا طوفان" اور "تنہائی کے سو سال"، اور چند کہانیاں جو "بڑی ماما کا جنازہ" نامی مجموعے کا حصہ ہیں، ماکوندو میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ میری دیگر تحریروں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "منحوس وقت" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کا محل وقوع کریبیئن کا ایک اور ساحلی قصبہ ہے۔ (ایک ایسا قصبہ جس میں ریل گاڑیاں اور کیلوں کی مہک نہیں ہے) مگر ایک دریا ہے۔ ایک ایسا قصبہ جہاں تک صرف لانچ کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔

(میری کتاب ماکوندو کی نہیں بلکہ) تنہائی کی کتاب ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو "پتوں کا طوفان" کا مرکزی کردار تنہائی میں زندہ رہتا اور مر جاتا ہے۔ تنہائی "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کے مرکزی کردار پر بھی مسلط ہے، کرنل جو کہ ہر صبح کو اپنی بیوی اور اپنے مرغ کے ساتھ، جنگ کی اس پنشن کا انتظار کرتا ہے جو کبھی نہیں آتی۔ "منحوس وقت" میں قصبے کا میئر بھی، جو وہاں کے باشندوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے ایک تنہا کردار ہے۔ وہ اپنے اقتدار سے اقتدار کی تنہائی سے متعارف ہوتا ہے۔ (بالکل اوریلیانو بوئندیا اور "سردار کا زوال" کے ڈکٹیٹر کی طرح۔) "سردار کا زوال" اور بلاشبہ "تنہائی کے سو سال" کا بنیادی خیال تنہائی ہی ہے۔

تنہائی میرے نزدیک ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہر کوئی دوچار ہوتا ہے۔ ہر ایک جدا، جدا ذریعے اور طریقے سے اس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ احساس اتنے بےشمار ادیبوں کی تحریروں میں نمو کرتا نظر آتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض اس کا اظہار غیرشعوری طور پر کرتے ہوں گے۔ میں بھی انھیں میں سے ایک ہوں۔

("پتوں کا طوفان" اپنے اندر "تنہائی کے سو سال" کا بیج رکھتا تھا۔ اس نوجوان شخص کے لیے جس نے وہ پہلا ناول لکھا) مجھے بہت ہمدردی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ اس نے یہ کتاب

عجلت میں لکھی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ آئندہ کچھ نہیں لکھے گا کہ اس کے پاس یہی ایک موقع ہے، تو اس نے اپنی تمام جمع شدہ اکٹھی، خصوصاً وہ ادبی تکنیکیں اور ترکیبیں جو اس نے انگریز اور امریکی ادیبوں سے مستعار لی تھیں جنھیں وہ ان دنوں پڑھا کرتا تھا، اس میں سمو دی تھیں۔

میری عمر اس وقت بائیس برس کی تھی۔ میں کولمبیا میں رہا کرتا تھا، اتفاق گاہکوں کے لیے ایک ہوٹل میں جو درحقیقت قحبہ خانہ تھا۔ رات بھر کے لیے کمرے کا کرایہ ڈیڑھ پیسو ہوا کرتا تھا۔ اخبار سے مجھے فی کالم تین پیسو ملا کرتے تھے، اور کبھی کبھی اداریہ لکھنے کے عوض تین پیسو اور مل جاتے تھے۔ جب کبھی میرے پاس کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے رقم نہ ہوتی تو میں ہوٹل کے ملازم کے پاس "پتوں کا طوفان" کا مسودہ ضمانت کے طور پر رکھوا دیا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے لیے ان کاغذوں کی بہت اہمیت ہے۔ بہت زمانے بعد جب میں "تنہائی کے سو سال" لکھ چکا تھا، مجھے وہی ملازم ان لوگوں کے ہجوم میں ملا جو مجھ سے میری کتاب پر آٹوگراف لینے آئے تھے۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔

جب میں نے "پتوں کا طوفان" لکھا تو میرا عقیدہ تھا کہ ہر اچھے ناول کو حقیقت کی شاعرانہ منتقلی ہونا چاہیے۔ لیکن اگر آپ کو یاد ہو، وہ کتاب جس زمانے میں شائع ہوئی وہ کولمبیا میں بےحد خونریز سیاسی تشدد کا دور تھا، اور میرے جنگجو دوستوں نے مجھے بہت لعنت ملامت کی۔ "تمہارا ناول کسی چیز کی مذمت نہیں کرتا نہ کسی شے کا پردہ چاک کرتا ہے" وہ کہتے۔ اب مجھے یہ خیال نہایت سادہ لوحی اور بھونڈا پن معلوم ہوتا ہے لیکن اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اپنی تحریروں میں ملک کی فوری سیاسی اور سماجی حقیقت کا زیادہ احاطہ کرنا چاہیے۔ اور میں اپنے ابتدائی ادبی خیالات سے بہت دور ہٹ گیا۔ خوش قسمتی سے بعد میں میں دوبارہ انھیں خیالات کی طرف لوٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اس درمیانی عرصے میں مجھے اپنا سر پھاڑ دیے جانے کا شدید خطرہ لاحق رہا۔

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "منحوس وقت" اور "بڑی ماما کا جنازہ" یہ تمام کتابیں کولمبیا میں زندگی کی حقیقت کو منعکس کرتی ہیں اور یہی مسائل خیال ان کی منطقی ساخت کا تعین کرتا ہے۔ مجھے ان کو لکھنے پر کوئی پچھتاوا نہیں لیکن یہ کتابیں پہلے سے سوچے ہوئے ذہن سے متعلق رکھتی ہیں جو حقیقت کا ایک جامد اور محدود وژن پیش کرتا ہے۔ یہ کتابیں خواہ کیسی ہی اچھی یا بری کیوں نہ ہوں یہ وہ کتابیں ہیں جو اپنے آخری صفحے پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اب میں انھیں بہت محدود پاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے بہتر لکھنے کا اہل ہوں۔

(میرے ادبی خیالات میں تبدیلی کا باعث) میرا اپنی تحریروں پر غوروفکر تھا۔ میں ان پر طویل عرصے تک غور کرتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میری وابستگی اپنے ملک کی سماجی اور سیاسی حقیقت سے نہیں بلکہ پوری موجودہ اور آئندہ دنیا کی حقیقت سے ہے، اس کے کسی پہلو کی طرف داری یا تحقیر کیے بغیر۔

جیسا کہ آپ کو بخوبی علم ہے جب میرے ذاتی سیاسی انتخاب کا معاملہ آتا ہے تو میری سیاسی وابستگی واضح ہے۔ میں دنیا کو سوشلسٹ دیکھنا چاہتا ہوں، اور یقین رکھتا ہوں کہ

جلد یا بدیر ایسا ہی ہو گا۔ لیکن اس شے پر مجھے بےشمار اعتراضات ہیں جس کا نام لاطینی امریکا میں "وابستہ ادب" پڑ گیا ہے، یا جسے زیادہ درست طور پر سماجی احتجاج کا ناول کہا جاتا ہے، یعنی اس ادب کا نقطۂ عروج۔ ان اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک دنیا اور زندگی کے بارے میں اس کا محدود تصور سیاسی معنوں میں کسی مقصد کے حصول میں مدد نہیں کرتا۔ شعور کی بیداری کے کسی عمل کو مہمیز کرنے کے بجائے وہ درحقیقت اسے سُست کر دیتا ہے۔ لاطینی امریکا کے باشندے کسی ناول سے اس جبر اور بےانصافی کے انکشاف سے، جن سے وہ بخوبی واقف ہیں، کچھ زیادہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ میرے بہت سے جنگجو دوست جو ادیبوں پر یہ پابندیاں عائد کرتے ہیں کہ انھیں کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں، تخلیقی آزادی پر پابندی عائد کر کے، شاید غیرشعوری طور پر، ایک رجعت پسندانہ موقف اختیار کر رہے ہوتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ محبت کے موضوع پر لکھا ہوا ناول بھی اتنا ہی معتبر ہے جتنا کوئی اور ناول۔ درحقیقت کسی ادیب کا فرض -- آپ چاہیں تو اسے اس کا انقلابی فرض کہہ لیں -- یہ ہے کہ وہ اچھا لکھے۔

(فوری سیاسی حقیقت سے وابستگی سے خود کو آزاد کر کے، حقیقت کے بارے میں وہ رویہ اختیار کرنے کے سلسلے میں جس کا اظہار "تنہائی کے سو سال" کی صورت میں ہوا) میری نانی کی سنائی ہوئی کہانیوں نے پہلے رہنما اشارے فراہم کیے۔ ان کے قصبے کے باشندوں کے اساطیر، روایتیں اور عقائد بےحد فطری انداز میں نانی کی روزمرہ زندگی کا حصہ تھے۔ ان کی شخصیت کو پیشِ ذہن میں رکھ کر میں نے یکایک محسوس کیا کہ میں ہرگز کوئی چیز ایجاد نہیں کر رہا ہوں، بلکہ فقط شگونوں، پیش قیاسیوں، معالجوں اور وہموں کی ایک ایسی دنیا کو گرفت میں لا کر اسے بیان کر رہا ہوں، جو نہایت مستند طور پر ہماری اپنی ہے، لاطینی امریکی ہے۔ مثال کے طور پر کولمبیا کے وہ باشندے جو دعائیں پڑھ کر اپنی گایوں کے کانوں میں گھسے ہوئے کیڑے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لاطینی امریکہ میں ہماری روزمرہ زندگی اس قسم کی چیزوں سے بھری پڑی ہے۔

ان محدودات کی مدد کے بغیر جو عقلیت پسند اور اسٹالنسٹ حقیقت پر، ہماری حقیقت پر، اسے اپنے لیے آسان بنانے کی غرض سے زمانوں سے عائد کرتے آئے ہیں، صرف اسی حصے پر نظر ڈال کر میں "تنہائی کے سو سال" لکھنے میں کامیاب ہو سکا۔

(جہاں تک "تنہائی کے سو سال"، "سردار کا زوال" اور بعد کی کہانیوں میں پائے جانے والے عدم تناسب اور مبالغے کا تعلق ہے) تو یہ عدم تناسب بھی ہماری حقیقت کا حصہ ہے۔ ہماری حقیقت خود عدم تناسب کی ایک مثال ہے۔ اس سے اکثر لکھنے والوں کے لیے سنگین مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، کیونکہ انھیں اس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ اگر آپ کسی دریا کے بارے میں بات کر رہے ہوں تو وہ طویل ترین دریا جس کا کوئی یورپی قاری تصور کر سکتا ہے ڈینیوب ہے جو ۱۷۷۰ میل لمبا ہے۔ کسی قاری کے ذہن میں ایمازون کس طرح سما سکتا ہے جو بعض مقامات پر اس قدر چوڑا ہے کہ اس کے پار دیکھا نہیں جا سکتا؟ لفظ "طوفان" سے یورپی قاری کے ذہن میں ایک تصور ابھرتا ہے اور ہمارے ذہن میں بالکل مختلف تصور۔ یہی معاملہ لفظ "بارش" کا ہے، جو ممکن ہی نہیں کہ منطقۂ حارہ کی موسلادھار برسات

کے مفہوم کی ترسیل کر سکے۔ ابلتے ہوئے دریا، زمین کو لرزا دینے والے طوفان، پورے پورے قصبوں کو بہا لے جانے والے سیلاب اختراعات نہیں بلکہ ہمارے نصف کرے کی فطری دنیا کی وسیع وعریض جہات ہیں۔

("تنہائی کے سو سال" میں جو زبان میں نے استعمال کی وہ میری اس سے پہلے کی تحریروں میں، سوائے "بڑی ماما کا جنازہ" نامی کہانی کے، استعمال نہیں ہوئی تھی۔) شاید یہ تعلّی معلوم ہو لیکن یہ زبان ہمیشہ سے میرے قبضۂ اختیار میں تھی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ مجھے اس سے پہلے اسے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ (میں نہیں سمجھتا کہ زبان کسی ادیب کی شناخت کا ایک لاینفک حصہ ہے) میرا خیال ہے کہ تکنیک اور زبان کے انتخاب کا تعین کتاب کے موضوع سے ہوتا ہے۔ جو زبان میں نے "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "منحوس وقت" اور "بڑی ماما کا جنازہ" میں استعمال کی وہ جچی تلی اور محتاط تھی، اور درستی کے ایک صحافیانہ شغف کا نتیجہ تھی۔ "تنہائی کے سو سال" میں مجھے، اس حقیقت کو بیان کرنے کے واسطے جس کا نام میرے اور آپ کے درمیان دیومالائی یا طلسمی حقیقت طے ہوا ہے، ایک زیادہ فراواں زبان درکار تھی۔ جبکہ "سردار کا زوال" لکھنے کے لیے مجھے ایک اور طرح کی زبان وضع کرنی پڑی اور خود کو اس زبان سے علیحدہ کرنا پڑا جو میں نے "تنہائی کے سو سال" میں استعمال کی تھی۔

اپنی پہلی تحریروں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے وہی شفقت محسوس ہوتی ہے جو ایک باپ اپنے بچوں کے بارے میں محسوس کرتا ہے جو بڑے ہو کر گھر سے چلے گئے ہوں۔ میں ان ابتدائی کتابوں کو بہت دور اور بےمدافعت پاتا ہوں مگر ان میں اور بعد کی کتابوں میں ایک رشتے کا تار موجود ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے بعض وقت یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ تار موجود ہے اور اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

ذہنی نقطۂ نظر سے میری سب سے اہم کتاب "سردار کا زوال" ہے جو شاید مجھے فراموشی سے بچا سکے۔ (مجھے سب سے زیادہ لطف بھی اسی کتاب کو لکھنے میں آیا) کیونکہ یہی وہ کتاب ہے جسے میں ہمیشہ سے لکھنا چاہتا تھا، اور اسی میں میں اپنے ذاتی اعترافات میں دیگر کتابوں کے مقابلے میں سب سے آگے گیا ہوں (جو ظاہر ہے کہ مناسب طور پر چھپا کر بیان کیے گئے ہیں۔) اسے لکھنے میں مجھے سترہ برس لگے اور میں نے پہلے دو مسودوں کو ترک کر کے اسے تیسری بار لکھا۔

"ایک پیش گفتہ موت کی روداد" لکھنے سے پہلے میں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کو اپنی بہترین تحریر خیال کیا کرتا تھا۔ میں نے اسے نو مرتبہ لکھا تھا اور وہ مجھے اپنی تحریروں میں سب سے کم شکست پذیر معلوم ہوتی تھی (لیکن میرے خیال میں "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" اس سے بہتر ہے) اس لحاظ سے کہ میں اس کے ساتھ وہ کرنے میں کامیاب رہا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس سے پہلے کبھی ممکن نہیں ہوا تھا۔ میری دوسری کتابوں میں کہانی ہمیشہ بے قابو ہو جاتی تھی، کردار خود اپنی زندگی حاصل کر لیتے تھے اور جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ مجھے ایک ایسی کتاب ضرور لکھنی چاہیے جس پر میں مکمل قابو رکھ سکوں، اور میرے خیال میں "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں میں

ایسا کر پایا ہوں۔ اس کا موضوع ایک سراغ رساں کی کہانی کی سی چوکس ساخت کا متقاضی تھا۔

(میں اپنی تحریروں میں کبھی "تنہائی کے سو سال" کا ذکر نہیں کرتا جبکہ بہت سے نقادوں کے خیال میں یہ میری بہترین کتاب ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت تلخی محسوس ہوتی ہے) اس نے میری زندگی کو قریب قریب تباہ کر دیا۔ اس کے شائع ہونے کے بعد کوئی چیز ویسی نہ رہی جیسی پہلے تھی۔ کیونکہ شہرت آپ کے احساسِ حقیقت کو زیروزبر کر دیتی ہے، تقریباً اسی حد تک جس حد تک اقتدار، اور اس سے آپ کی نجی زندگی کو مستقل خطرہ لاحق رہتا ہے۔ بدقسمتی سے کوئی شخص اسے باور نہیں کر سکتا جب تک اسے اس سے خود سابقہ نہ پڑے۔

(مجھے محسوس ہوتا ہے کہ "تنہائی کے سو سال" کی کامیابی میری بقیہ تحریروں کے حق میں غیرمنصفانہ ہے۔) "سردار کا زوال" اس سے کہیں زیادہ اہم ادبی کارنامہ ہے۔ لیکن جبکہ یہ اقتدار کی تنہائی کے بارے میں ہے "تنہائی کے سو سال" روزمرہ زندگی کی تنہائی سے متعلق ہے۔ یہ ہر شخص کی داستانِ حیات ہے۔ مزید یہ کہ ایک سادہ، رواں، مستقیم اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ سطحی انداز میں لکھی گئی ہے۔

(جب میں "تنہائی کے سو سال" لکھنے بیٹھا تو) درحقیقت میں ادب میں ان تمام تجربات کے اظہار کا ذریعہ تلاش کرنا چاہتا تھا جو بچپن میں مجھ پر اثرانداز ہوئے تھے۔ (بہت سے نقاد اس کتاب میں بنی نوعِ انسان کی تاریخ کے بارے میں کوئی حکایت یا تمثیل دیکھتے ہیں لیکن) میں صرف اپنے بچپن کی دنیا کی ایک تصویر چھوڑ جانا چاہتا تھا جو، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ایک بیحد وسیع اور غمناک مکان میں بسر ہوا تھا، جہاں میری بہن تھی جو مٹی کھایا کرتی تھی، میری نانی تھیں جو مستقبل کی پیش گوئیاں کیا کرتی تھیں، اور یکساں ناموں والے بےشمار رشتہ دار تھے جو مسرت اور دیوانگی میں کبھی کوئی خاص تفریق نہ کر پاتے تھے۔

(نقادوں کو اس کتاب کے پیچھے اس سے زیادہ پیچیدہ ارادے دکھائی دیتے ہیں) لیکن اگر ان کا وجود ہے تو وہ قطعی غیرارادی رہے ہوں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ ناول نگاروں کے برعکس نقاد کسی کتاب میں وہ شے تلاش کر لیتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں نہ کہ وہ شے جو دراصل اس میں ہوتی ہے۔

(نقادوں کے بارے میں میرے طنزیہ لہجے کی وجہ یہ ہے کہ) ان میں سے بیشتر کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ "تنہائی کے سو سال" جیسا ناول کچھ کچھ ایک مذاق کی طرح ہے قریبی دوستوں کے لیے شرارتی اشاروں سے بھرا ہوا اور یوں خلیفہ کبری کی ایک پہلے سے مقرر حق کی بنیاد پر وہ کتاب کی تشریح کی ذمہ داری لے بیٹھتے ہیں، اور خود کو پرلے درجے کا احمق بن دینے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر مجھے یاد ہے کہ جب ایک نقاد کی نظر اس بات پر پڑی کہ ایک کردار -- گیبریئل -- ریبیلے (Rabelais) کی کلیات پیرس لے جاتا ہے، تو اس نے سوچا کہ اس نے ناول کی ایک اہم کلید پا لی ہے۔ اس دریافت کے بعد اس نے تمام مبالغہ آرائیاں اور "پینٹاگروئل" کی سی فراوانیاں رابلے کے اثرات کے سر منڈھ دیں۔ درحقیقت میں نے یہ کتاب جان بوجھ کر کیلے کے

چھلکے کے طور پر ڈالا تھا، اور بہت سے نقاد اس پر منہ کے بل پھسلے ہیں۔

(لیکن نقادوں کے فرمودات سے قطع نظر، بوئندیا خاندان کی کہانی لاطینی امریکا کی تاریخ کا بیان بھی ہو سکتی ہے۔) لاطینی امریکی تاریخ بھی دیوہیکل بےمصرف مہمات اور عظیم ڈراموں سے مل کر بنی ہے، آغاز سے پیشتر ہی سے نسیاں جن کی تقدیر تھی۔ ہم یادداشت کی گم شدگی کی وبا کا بھی شکار ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب کسی کو یاد نہیں رہا کہ بنانا کمپنی کے مزدوروں کا قتل عام واقعی پیش آیا تھا۔ انہیں کچھ یاد ہے تو بس کرنل اوریلیانو بوئندیا۔

(اور وہ بتیس جنگیں جو کرنل اوریلیانو بوئندیا نے ہاریں، ہماری اپنی سیاسی محرومیوں کا اظہار ہو سکتی ہیں۔ اگر بر سبیلِ تذکرہ، کرنل فتح مند ہو جاتا) تو وہ بہت کچھ "سردار کا زوال" کے مرکزی کردار جیسا ہوتا۔ لکھنے کے دوران میں ایک مقام پر مجھے تحریک ہوئی تھی کہ کرنل کو اقتدار حاصل کرنے دوں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب "تنہائی کے سو سال" کے بجائے "سردار کا زوال" ہوتی۔

"تنہائی کے سو سال" میں کرنل اوریلیانو بوئندیا کا ایک قیدی اس سے کہتا ہے، "مجھے فکر یہ ہے کہ فوج سے تمہاری نفرت کے باعث، اس کے خلاف اس قدر جدوجہد اور اس کے بارے میں اس قدر سوچتے رہنے کے باعث، تم بھی اتنے ہی برے ہو گئے ہو جتنی فوج۔" اور اپنی بات کے اختتام پر وہ کہتا ہے، "اس لحاظ سے تم ہماری تاریخ کے سب سے زیادہ مطلق العنان اور خونریز ڈکٹیٹر ثابت ہو گے۔"

(بوئندیا خاندان کی تنہائی کا منبع) میرے خیال میں ان میں محبت کا فقدان ہے۔ آپ اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں کہ پوری صدی کے دورانیے میں صرف سؤر کی دم والا اوریلیانو خاندان کا واحد فرد ہے جس کی پیدائش محبت کے نتیجے میں ہوئی۔ بوئندیا خاندان کے لوگ محبت کرنے کے اہل نہیں تھے اور یہی ان کی تنہائی اور محرومی کی کلید ہے۔ تنہائی میرے نزدیک یکجہتی کی ضد ہے۔

(یہ لاطینی امریکا کا ایک نہایت مخصوص رواج ہے کہ ہمارے نام باپ یا دادا کے نام پر رکھے جاتے ہیں اور میرے خاندان میں تو یہ رواج لغویت کی اس سطح تک پہنچ چکا ہے کہ خود میرے بھائی کا نام بھی وہی ہے جو میرا۔ لیکن ناول میں اوریلیانو اور خوزے آرکادیو نامی افراد میں امتیاز کرنے کا ایک) نہایت سادہ سراغ ہے۔ خوزے آرکادیو نسل کو آگے بڑھاتے ہیں، جبکہ اوریلیانو لاولد رہتے ہیں۔ استثنا صرف ایک ہے: خوزے آرکادیو سیگندو اور اوریلیانو سیگندو۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہم شکل جڑواں بھائی ہونے کے باعث پیدائش کے وقت دونوں کی خصوصیات الٹ پلٹ ہو گئیں۔

(ناول میں حماقت -- ایجادات، کیمیاگری، جنگ بازی -- مردوں کی باطنی خصوصیت ہے اور عقلِ سلیم عورتوں کی۔) میرے خیال میں دنیا کا جاری و ساری رہنا عورتوں کی بدولت ہے اور وہی ہر شے کو تخریب اور فنا سے محفوظ رکھتی ہیں، جبکہ مرد تاریخ کا پہیا آگے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کون زیادہ پاگل ہے۔

(اس ناول کو لکھنے کے دوران سب سے دشوار لمحہ) اسے شروع کرنے کا تھا۔ مجھے وہ

دن بالکل واضح طور پر یاد ہے جب بے انتہا دشواری سے میں نے اس کہ کا پہلا جملہ مکمل کیا، اور پھر دہشت زدہ ہو کر خود سے سوال کیا کہ آخر اس کے بعد کیا ہو گا۔ درحقیقت اس مقام تک جب جنگل میں قدیم جہاز کو دریافت کیا جاتا ہے مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ کتاب آگے چل پائے گی۔ لیکن اس مقام کے بعد سے اس تمام شے نے ایک جنون کی سی صورت اختیار کر لی جس میں بے پناہ لذت بھی تھی۔

(جس روز میں نے اسے مکمل کیا) مجھے روز صبح نو بجے سے سہ پہر تین بجے تک کام کرتے ہوئے اٹھارہ مہینے ہو چکے تھے۔ میں یقینی طور پر جانتا تھا کہ یہ آخری دن ہے۔ لیکن کتاب اپنے فطری انجام تک ایک غلط وقت پر پہنچی۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔ مرسیدس گھر پر موجود نہ تھی، اور مجھے فون پر کوئی شخص نہ مل سکا جسے میں اس کے بارے میں بتا سکتا۔ مجھے اپنی حددرجہ حواس باختگی یوں یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس باقی ماندہ وقت کا کیا کروں، اور میں اپنے ذہن میں مختلف چیزیں ایجاد کرنے لگا تاکہ خود کو تین بجے سہ پہر تک باقی رکھ سکوں۔

میرے ایک روسی دوست کی ملاقات ایک خاتون، ایک بےحد بوڑھی خاتون، سے ہوئی جو اس پوری کتاب کو، پہلی سے آخری سطر تک ہاتھ سے نقل کر رہی تھی۔ میرے دوست نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب میں کہا، "کیونکہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ پاگل دراصل کون ہے مصنف یا میں، اور یہ جاننے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ میں کتاب کو نئے سرے سے لکھوں۔" میرے لیے اس خاتون سے بہتر قاری کا تصور کرنا محال ہے۔

("تنہائی کے سو سال" کی مقبولیت میرے لیے ایک معمہ ہے) لیکن میں اس کا راز جاننا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں یہ جاننا بہت خطرناک ہو گا کہ جو کتاب میں نے چند بےحد قریبی دوستوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی تھی، کیوں کر ہاتھوں ہاتھ بکنے لگی۔

(میں نے اس ناول کو اٹھارہ برس کی عمر میں لکھنے کی کوشش کی تھی۔) اس وقت میں نے اسے "مکان" کا عنوان دیا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ پوری کہانی بوئندیا خاندان کے مکان میں وقوع پذیر ہو گی۔ لیکن میں اس مقام تک بھی نہ پہنچ پایا کہ کہانی کی ایک مسلسل ساخت وجود میں لا سکتی۔ میں نے اس کے صرف متفرق حصے لکھے، جن میں سے چند ان اخباروں میں شائع ہوئے جن میں میں ان دنوں کام کر رہا تھا۔ (لیکن میں اس ناول پر کام جاری نہ رکھ سکا کیونکہ) اس وقت نہ تو میرے پاس اتنا تجربہ تھا، نہ اتنا ضبط اور نہ اتنی تکنیکی مہارت کہ اس قسم کی کتاب لکھ سکتا۔

(لیکن یہ کہانی میرے ذہن میں پندرہ برس تک گھومتی رہی۔) مجھے اس کو بیان کرنے کے لیے مناسب لہجہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھے سچ سنائی دے۔ ایک روز جب مرسیدس اور میں بچوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے آکاپلکو جا رہے تھے یہ لہجہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ یہ کہانی مجھے اس انداز میں بیان کرنی تھی جس انداز میں میری نانی یہ کہانیاں سنایا کرتی تھیں، اور مجھے اس سہ پہر سے آغاز کرنا تھا جب ننھے بچے کو اس کے نانا پہلی بار برف دکھانے لے گئے تھے۔ خط مستقیم میں بیان کی گئی تاریخ، جس میں غیرمعمولی عنصر نہایت معصومیت کے ساتھ روزمرہ میں گھل جاتا ہے۔

ہم آکاپلکو نہ پہنچ سکے۔ (میں نے گاڑی کا رخ موڑا اور گھر پہنچ کر لکھنا شروع کر دیا۔) مرسیدس کو اس طرح کی دیوانگی کا اکثر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہ ہوتی تو میں یہ کتاب نہ لکھ سکتا۔ اس نے صورت حال کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جو گاڑی میں نے چند ماہ پہلے خریدی تھی، اسے بیچ کر حاصل کردہ رقم مرسیدس کے حوالے کر دی۔ میرا خیال تھا کہ ہم اس رقم کے سہارے چھ ماہ گزار سکتے ہیں، لیکن کتاب مکمل کرنے میں مجھے ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ جب رقم ختم ہو گئی تو اس نے مجھ سے ایک لفظ نہ کہا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ کس طرح کیا لیکن ہمیں قصائی سے گوشت اور نانبائی سے روٹی ادھار ملتی رہی اور مالک مکان نو ماہ تک کرائے کا انتظار کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ مجھے کچھ بتائے بغیر [illegible] چلاتی رہی اور مجھے وقتاً فوقتاً پانچ سو کاغذ بھی لا لا کر دیتی رہی۔ میں ان پانچ سو کاغذوں سے کبھی محروم نہ رہا۔

جب کتاب مکمل ہوئی تو یہ مرسیدس ہی تھی جس نے اسے ڈاک کے ذریعے ایڈیٹوریل سوڈامیریکانا کو بھجوایا۔ (اسے ڈاک خانے لے جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، "اگر اس تمام مصیبت کے بعد یہ ناول بےکار ثابت ہوا تو کیا ہو گا؟" اس نے مسودہ نہیں پڑھا تھا۔ اسے مسودے پڑھنا پسند نہیں۔

مجھے یقین تھا کہ یہ کتاب ناقدوں کو پسند آئے گی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے عوام میں بھی اتنی مقبولیت حاصل ہو گی۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید یہ پانچ ہزار کی تعداد میں بک جائے گی۔ اس سے پہلے میری تمام کتابیں اس وقت تک ایک ہزار سے زیادہ فروخت نہیں ہوئی تھیں۔ میرے مقابلے میں سوڈامیریکانا والے زیادہ پرامید تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کتاب آٹھ ہزار تک بک سکتی ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلا ایڈیشن دو ہفتوں کے اندر اندر صرف بیونس آئرس میں فروخت ہو گیا۔

(میرے والد کنزرویٹو پارٹی کے حامی ہیں۔ میں نے ابتدا ہی میں بائیں بازو کی حمایت کو سیاسی شعار بنا لیا۔ لیکن اس کی وجہ میرا اپنے خاندان کے سیاسی خیالات کے خلاف ردعمل نہیں تھا) کیونکہ اگرچہ میرے والد کنزرویٹو ہیں لیکن میرے نانا کرنل مارکیز لبرل تھے۔ میرے سیاسی خیالات کا منبع وہی تھے اس لیے کہ بچپن میں وہ مجھے پریوں کی کہانیوں کے بجائے پچھلی خانہ جنگی کے ہولناک واقعات سنا کرتے تھے جو آزاد خیال اور کیتھولک مخالف افراد نے کنزرویٹو حکومت کے خلاف برپا کی تھی۔ میرے نانا ہی نے مجھے بنانا کمپنی کے مزدوروں کے اس قتل عام کے بارے میں بتایا تھا جو اراکاتاکا میں میری پیدائش کے سال ہوا تھا۔ اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ خاندان کے اثرات کے باعث میں جمہوری نظام کی حمایت کے بجائے اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوا۔

(میں نے پہلی بار سیاسی مضامین) زیپاکیرا میں اپنے سیکنڈری اسکول میں پڑھے۔ اس میں بہت سے استاد تھے جن کی تربیت انیس سو تیس کی دہائی میں صدر الفانسو لوپیز کی

باتیس بارو کی حکومت کے دور میں ٹیچرز ٹریننگ کالج کے ایک مارکسی استاد کی زیرنگرانی ہوئی تھی۔ الجبرا کا استاد وقفے کے دوران ہمیں جدلیاتی مادیت پر لیکچر دیا کرتا، کیمسٹری کا استاد ہمیں لینن کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیا کرتا اور تاریخ کا استاد ہمیں طبقاتی کش مکش کے بارے میں بتایا کرتا۔ جب میں نے اس بردہ فروشی قیدخانے کو خیرباد کہا تو میرے دو عقائد پختہ ہو چکے تھے۔ ایک تو یہ کہ اچھے ناولوں کو حقیقت کی شاعرانہ منقلب ہونا چاہیے، اور دوسرا یہ کہ انسانیت کا فوری مستقبل سوشلزم میں ہے۔

بیس سال کی عمر میں میں کچھ عرصے کے لیے کمیونسٹ پارٹی کے ایک سیل سے بھی وابستہ رہا لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس عرصے میں میں نے کوئی خاص دلچسپی کا کام کیا ہو۔ میں کوئی پرجوش کارکن نہیں بلکہ ہمدرد تھا۔ اس کے بعد سے کمیونسٹوں کے ساتھ میرے تعلقات میں بہت سے نشیب وفراز آئے ہیں۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے ہیں کیونکہ جب کبھی میں کوئی ایسا موقف اختیار کرتا ہوں جو انہیں پسند نہیں تو ان کے اخبارات مجھ پر سچ مچ پل پڑتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی سرعام ان کی مذمت نہیں کی بدترین وقت میں بھی نہیں۔

(انیس سو ستاون میں میں نے ایک دوست کے ساتھ مشرقی جرمنی کا دورہ کیا) جس نے میرے سیاسی خیالات پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔ میں نے اپنے اس سفر کے تاثرات سے رسالے میں بوگوتا کے ایک رسالے میں قسط وار مضامین کی شکل چھپوائے تھے۔ ان مضامین کو بیس سال بعد چوری چھپے غیرقانونی طور پر دوبارہ چھاپا گیا جس کی وجہ میرے خیال میں کوئی صحافیانہ یا سیاسی دلچسپی نہیں تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ میری ذاتی سیاسی نشوونما میں واقع ہونے والے مفروضہ تضادات کو اجاگر کیا جائے۔ حالانکہ ان تضادات کا کوئی وجود نہ تھا۔ میں نے ان مضامین کے مجموعے کو قانونی حیثیت دے کر اپنی تحریروں کے کلیات میں شامل کیا جس کا عوامی ایڈیشن کولومبیا کی ہر گلی کے نکڑ پر دستیاب ہے۔ میں نے ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا۔ مزید براں پولینڈ کے موجودہ بحران کے اسباب کی وضاحت میرے خیال میں ان مضامین میں تلاش کی جا سکتی ہے جن پر اس زمانے کے عقیدہ پرستوں نے ریاستہائے متحدہ سے معاوضہ لے کر لکھنے جیسے کا الزام عائد کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہی عقیدہ پرست آج، چوبیس برس بعد بورژوا سیاسی اور مالیاتی اداروں کی آرام دہ کرسیوں پر متمکن ہیں، جبکہ تاریخ نے میرے موقف کو درست ثابت کیا ہے۔

ان مضامین کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ عوامی جمہوریتیں جس راہ پر گامزن ہیں اس راہ پر چلتے ہوئے وہ نہ تو مستند طور پر سوشلسٹ ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں، کیونکہ ان کا نظام ہر ملک میں موجود مخصوص حالات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ باہر سے عائد کیا ہوا ایک نظام تھا جسے سوویت یونین نے مقامی عقیدہ پرست، بےتخیل کمیونسٹ پارٹیوں کی مدد سے نافذ کیا تھا جن کا واحد مقصد سوویت یونین کا نظام ایک ایسے معاشرے میں زبردستی قائم کرنا تھا جہاں وہ درست نہیں بیٹھتا۔

(جس زمانے میں میں کیوبن خبررساں ایجنسی پرینسا لاطینا میں کام کرتا تھا پرانی کیوبن کمیونسٹ پارٹی نے بہت سے انقلابی اداروں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا اور میں نے

اور دوسرے دوستوں نے بطور احتجاج استعفا دے دیا۔) میری رائے میں ہمارا فیصلہ درست تھا۔ اگر ہم اپنے خیالات کے باوجود وہ ملازمت جاری رکھتے تو ہم پر انقلاب دشمنی، سامراجی ایجنٹ یا ایسا ہی کوئی اور لیبل لگا کر، جو اس زمانے کے عقیدہ پرست لوگوں پر لگانے کے عادی تھے، نکال باہر کیا جاتا۔ میں نے خود کو پیش منظر سے ہٹا لیا۔ میکسیکو میں ہی کتابیں اور فلم اسکرپٹ لکھنے کے دوران میں قریب سے اور حیرت کے ساتھ کیوبا کے سیاسی عمل کے ارتقا کا مشاہدہ کرتا رہا۔ میری رائے یہ ہے کہ اگرچہ شروع کے سوویتی مدوجزر کے بعد سے کیوبا کے انقلاب نے ایک دشوار اور کبھی کبھی مستقل راہ اختیار کی ہے اس کے باوجود اب بھی اس میں ایک ایسے سماجی نظام کا امکان موجود ہے جو زیادہ جمہوری، زیادہ منصفانہ اور ہماری ضروریات سے زیادہ مطابقت رکھنے والا ہے۔

(بعض لوگ کیوبا کو ایک طفیلی سوویت سیارہ سمجھتے ہیں) لیکن میں یہ نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں ریاستہائے متحدہ کی مخاصمت اور عدم تفہیم کی بدولت، جو فلوریڈا کے ساحل سے نوے میل کے فاصلے پر ایک میدان مدعم حکومت کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا، کیوبا کو بیس سال سے ہنگامی حالات کا سامنا ہے۔ اس میں سوویت یونین کا کوئی قصور نہیں، جس کی مدد کے بغیر — چاہے اس مدد میں اس کے مفادات اور مقاصد کچھ بھی رہے ہوں — آج کیوبا کا وجود باقی نہ ہوتا۔ جب تک ریاستہائے متحدہ کی مخاصمت برقرار ہے کیوبا کی صورت حال کو صرف ان ہنگامی حالات ہی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے جو اسے ایسے فطری تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی مفادات کے دائرے سے باہر ایک مدافعانہ طرزعمل اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

(جب فیدل کاسترو نے ۱۹۶۸ میں چیکوسلوواکیہ میں روسی مداخلت کی حمایت کی تو) میں نے اس پر برسرعام احتجاج کیا اور اگر ایسی صورت حال دوبارہ پیش آئی تو میں دوبارہ یہی موقف اختیار کروں گا۔ میرے اور کاسترو کے موقف میں اختلاف یہ تھا — ہمارا ہر چیز پر متفق رہنا ضروری نہیں ہے — کہ وہ روسی مداخلت کا جواز پیش کرنے لگا تھا جبکہ میں اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف اس نے اپنی تقریر میں عوامی جمہوریتوں کی اندرونی صورت حال کا جو تجزیہ کیا وہ اس تجزیے سے کہیں زیادہ شدید طور پر ناقدانہ تھا جو میں نے اپنے مضامین میں کیا تھا۔ بہرکیف لاطینی امریکہ کا مستقبل ہنگری، پولینڈ یا چیکوسلوواکیہ میں نہیں بلکہ خود لاطینی امریکہ میں صورت پذیر ہو گا۔ اس کے سوا کچھ سوچنا محض یورپزدگی کا خبط ہے۔

میں کسی واحد نظریے یا مسلک پر یقین نہیں رکھتا۔ میری رائے میں بہت سے مسائل موجود ہیں، ایسے ہی مسائل جیسے ملک امریکی ہر علاقوں، بشمول ریاستہائے متحدہ، میں واقع ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اپنا راستہ خود تلاش کرنا ہو گا۔ جہاں کہیں ممکن ہو ہم دوسرے ہر علاقوں کی مغرب پر شعب ترویج کی حاصلات سے استفادہ کر سکتے ہیں لیکن ہمیں میکانیکی انداز میں ان کی نقل نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ ہم اب تک کرتے آ رہے ہیں۔ صرف اسی طرح ہم بالآخر اپنے مخصوص انداز کا سوشلزم وضع کر سکتے ہیں۔ (جہاں تک میرا سوال ہے میں اپنے ملک میں) ایک ایسی حکومت دیکھنا چاہتا ہوں جو غریبوں کو خوشی

دے سکے۔

(انسانی حقوق کے سلسلے میں میری طویل جدوجہد کی کامیابی یا ناکامی کا) تخمینہ لگانا بیحد دشوار ہے۔ اس قسم کا کام کوئی فوری یا واضح نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اس کے نتائج اچانک، غیرمتوقع طور پر ظاہر ہوتے ہیں، اور ان میں اتنے سارے عناصر کارفرما ہوتے ہیں کہ یہ اندازہ لگانا ناممکن ہوتا ہے کہ اس میں کسی شخص کے کسی خاص عمل نے کیا کردار ادا کیا۔ یہ کام مجھ جیسے مشہور ادیب کے لیے، جو کامیابی کا عادی ہے، انکسار کا ایک سبق ہے۔

اس سلسلے میں میرے جس کام نے مجھے سب سے زیادہ ذاتی تسکین بخشی وہ میں نے نکاراگوا میں سندینستا کی فتح سے کچھ پہلے سرانجام دیا تھا۔ توماس بورخیس نے، جو اب وہاں کا وزیرداخلہ ہے، مجھے ایسی کوئی ترکیب سوچنے کو کہا جس سے سوموزا پر دباؤ ڈالا جا سکے کہ وہ کوسٹاریکا کے سفارت خانے میں پناہ گزین بورخیس کی بیوی اور سات سالہ بیٹی کو ملک سے بحفاظت نکل جانے کی اجازت دے دے۔ ڈکٹیٹر یہ اجازت دینے سے انکار کر رہا تھا، کیونکہ یہ کسی چھوٹے موٹے شخص کا نہیں بلکہ سندینستا فرنٹ کے واحد بقیدحیات بانی رکن کا خاندان تھا۔ بورخیس اور میں گھنٹوں اس مسئلے پر غور کرتے رہے، یہاں تک کہ ہمیں ایک کارآمد نکتہ ہاتھ آ گیا۔ بچی ایک بار گردے کی انفیکشن میں مبتلا رہ چکی تھی۔ ہم نے ایک ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ موجودہ صورت حال کا بچی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، اور ڈاکٹر کی طرف سے ہمیں وہ دلیل فراہم کر دی جو ہم تلاش کر رہے تھے۔ اڑتالیس گھنٹوں سے بھی کم وقت میں ماں اور بیٹی میکسیکو پہنچ چکی تھیں، کیونکہ انہیں، سیاسی بنیاد پر نہیں بلکہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بحفاظت نکلنے کی اجازت مل گئی تھی۔

دوسری جانب مجھے سب سے زیادہ حوصلہ شکن معاملہ اس وقت پیش آیا جب ۱۹۷۹ میں میں نے دو انگریز بینکاروں کی رہائی میں مدد دی جنہیں ایل سلواڈور میں گوریلوں نے اغوا کر لیا تھا۔ ان کے نام ایان میسی اور مائیکل چیٹرٹن تھے، اور انہیں اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر قتل کیا جانے والا تھا، کیونکہ دونوں فریقوں میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکا تھا۔ جنرل عمر توریخوس نے، جو کردہ و ناکردہ کی طرف سے مجھے فون کر کے ان دونوں کی جان بچانے میں مدد دینے کی درخواست کی۔ میں نے گوریلوں کو پیغام بھیجا، جو متعدد واسطوں سے ہوتا ہوا بروقت پہنچ گیا۔ میں نے ان سے مذاکرات کو فوری طور پر دوبارہ شروع ہونے کی ہمیں مہلت دینے کی درخواست کی اور وہ رضامند ہو گئے۔ پھر میں نے گراہم گرین سے رابطہ کیا جو انتیب (فرانس) میں مقیم تھا اور اس سے انگریزوں سے رابطہ قائم کرنے کو کہا۔ گوریلوں اور بینک کے درمیان مذاکرات چار ماہ تک جاری رہے۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ میں یا گراہم گرین ان مذاکرات میں کوئی حصہ نہیں لیں گے، لیکن مذاکرات کے دوران کسی تعطل کی صورت میں کوئی بھی فریق مجھ سے رابطہ قائم کرے گا تاکہ مذاکرات بحال کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ بالآخر بینکاروں کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن مجھے یا گراہم گرین کو شکریے کا ایک لفظ تک موصول نہ ہوا۔ بیشک یہ کوئی بہت اہم بات نہیں تھی، لیکن مجھے اس پر تعجب ہوا۔ بہت غور کرنے کے بعد میں ایک وضاحت تک پہنچ گیا، میں نے اور گراہم گرین نے اتنا اچھا بندوبست کیا تھا کہ انگریزوں نے ضرور یہ سوچا ہو گا کہ ہم گوریلوں سے ملے ہوئے

ہیں

کئی سال تک میں نے اپنے دوستوں کو دو زمروں میں منقسم رکھا: وہ جو "تنہائی کے سو سال" سے پیشتر میرے دوست تھے اور وہ جن سے میں اس کے بعد متعارف ہوا۔ اس سے میری مراد یہ تھی کہ اول الذکر مجھے زیادہ قابل اعتماد معلوم ہوتے تھے کیونکہ ہماری دوستی کا سبب میری شہرت نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے محبت کا جذبہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ میری غلطی تھی۔ دوستی کے بےشمار ناقابل تصور اسباب ہو سکتے ہیں اور شہرت [illegible] ایک مستند سبب [illegible] مشہور لوگوں کو [illegible] اور مجھے یہ موقع [illegible] میں ہم ایک ہی [illegible] کے سبب دوست ہو گئے حالانکہ میری ان کی شہرت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے شہرت ایک مثبت چیز ہے، یہ دوستی پیدا کرنے کے ایسے قابل قدر مواقع فراہم کرتی ہے جو اس کے بغیر میسر نہیں آ سکتے۔ اس کے باوجود اور اپنے نئے دوستوں سے اپنے لگاؤ کے باوجود میں تنہائی کے سو سال سے پہلے کے اپنے دوستوں کو ایک الگ گروہ خیال کرتا ہوں ایک قسم کی خفیہ سوسائٹی جسے ایک مشترکہ ناقابل بیان لاشعوری طور پر یکجا کیے ہوئے ہے۔

یہ سچ ہے کہ میں اب لوگوں پر پہلے کی طرح سادہ لوحی سے اعتماد نہیں کر سکتا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ شہرت کی مارک صورت حال مجھے ایسا کرنے سے روکتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی رفتہ رفتہ آپ کو آپ کی معصومیت سے محروم کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے بارہ سال پہلے خط لکھنے ترک کر دیے تھے جب مجھے اتفاق سے معلوم ہوا کہ کسی شخص نے میرے ذاتی خطوط ریاستہائے متحدہ کی ایک یونیورسٹی کو "ارکائیوز" کے ساتھ فروخت کر دیے۔ لیکن یہ صرف میرے دوستوں ہی کے ساتھ نہیں؛ میں کسی کو بھی خط نہیں لکھتا۔ اس انکشاف نے کہ میرے خطوط بھی ایک فروختنی شے بن گئے ہیں مجھے بیحد آزردہ کر دیا اور میں نے اس کے بعد سے کوئی خط نہیں لکھا۔

(لیکن میں اپنے دوستوں کو نون کرتا رہتا ہوں) بلکہ آدمی دنیا کا چکر لگا کر ہوشمندی سے ٹیلیفون کا خرچہ برداشت کر کے ان سے ملاقات کرتا رہتا ہوں۔

(میرے حلقۂ دوستوں میں بعض سربراہان مملکت بھی شامل ہیں لیکن میری سیاست سے دلچسپی اس کا باعث نہیں۔) لطف یہ ہے کہ مجھے زندگی سے ایک بےاعتبار کر دینے والا شغف محسوس ہوتا ہے اور سیاست اس کا ایک پہلو ہے لیکن یہ میرا سب سے محبوب پہلو نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر میں کسی ایسے براعظم میں پیدا ہوا ہوتا جہاں لاطینی امریکہ کے مقابلے میں کم سیاسی مسائل ہوتے تو شاید میں سیاست میں لفظی طور پر دلچسپی نہ لیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں حالات سے مجبور ہو کر سیاسی سرگرمی میں آ گیا ہوں۔ اس

سربراہوں سے میرے ذاتی تعلق شہرت سے — میری اور ان کی شہرت — سے پیدا ہونے والے تعارف کے لامحدود مواقع کی پیداوار ہے۔ لیکن ان میں سے ایک یا دو سے میری دوستی اقتدار یا شہرت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی؛ یہ ذاتی پیک‌سکت کا نتیجہ ہے۔

اقتدار مجھے بےپناہ مسحور کرتا ہے اور میں اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھتا، بلکہ میرے نزدیک یہ میرے بہت سے کرداروں میں بالکل واضح ہے حتیٰ کہ اُرسلا اگواران میں بھی، جہاں نقادوں نے اس کا سب سے کم سراغ لگایا ہے۔ اور "سردار کا زوال" کا تو بنیادی موضوع ہی یہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقتدار انسانی بدبختی اور قوتِ ارادی کی اعلاترین شکل ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسی شے دوسرے ادیبوں کو اتنی شدت سے ہی گرفت میں کیوں کر نہیں لیتی جو ان کی تمام تر زندگی پر اس درجہ اثر انداز ہوتی، بلکہ بعض اوقات اس کا تعین کرتی ہے۔

اس بات کا وافر ثبوت موجود ہے کہ میں کسی بھی سطح پر اقتدار کے مواقع سے متواتر اور باضابطہ طور پر احتراز کرتا رہا ہوں، کیوں کہ مجھ میں نہ تو اس کی طلب موجود ہے نہ وہ پس منظر اور نہ فیصلے کی وہ صلاحیت جو اس کے لیے درکار ہوتی ہے۔ کسی بھی پیشے کے لیے ان تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اور میری یہ تینوں خصوصیات میرا تعین ایک ادیب کے طور پر کرتی ہیں۔ اپنی طلب کو نہ پہچان پانا بھی ایک سنگین سیاسی غلطی ہے۔

فیدل کاسترو سے میری قریبی اور دلی دوستی کا آغاز ادب کے حوالے سے ہوا۔ انیس سو ساٹھ کے دوران، پرینسا لاتینا میں ملازمت کے دنوں میں، میں اسے سرسری طور پر جاننے لگا تھا، لیکن مجھے تب یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ زیادہ چیزیں مشترک ہیں۔ بعد میں جب میں ایک مشہور ادیب اور وہ دنیا کا معروف ترین سیاست دان بن چکا تھا، ہماری کئی بار ملاقات ہوئی مگر تب بھی باہمی احترام اور خیرسگالی کے باوجود میں نے محسوس نہیں کیا کہ اس تعلق میں سیاسی ہم آہنگی سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ چھ برس پہلے ایک روز صبح منہ اندھیرے اس نے مجھ سے اجازت چاہی، کیوں کہ اسے گھر جا کر بہت سا مطالعہ کرنا تھا۔ اس نے کہا کہ اگرچہ یہ کام اسے لازماً کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اسے بےزار کن اور تھکا دینے والا کام لگتا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس لازمی مطالعے کی تھکن دور کرنے کے لیے وہ کوئی ایسی چیز پڑھا کرے جو ذرا ہلکی پھلکی ہو مگر اچھا ادب ہو۔ میں نے مثال کے طور پر چند کتابوں کے نام لیے، اور یہ جان کر حیران ہوا کہ نہ صرف اس نے یہ تمام کتابیں پڑھ رکھی تھیں بلکہ ان پر اس کی بخوبی نگاہ تھی۔ اس رات مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا جس سے چند ہی لوگ واقف ہیں، کہ فیدل کاسترو بےحد پُرجوش پڑھنے والا ہے کہ اسے ہر زمانے کے اچھے ادب سے محبت ہے اور یہ کہ وہ اس کا نہایت سنجیدہ ذوق رکھتا ہے۔ دشوارترین حالات میں بھی، فرصت کے لمحات میں پڑھنے کے لیے اس کے پاس ایک عمدہ کتاب ضرور ہوتی ہے۔ اس شب رخصت ہوتے ہوئے میں نے اسے پڑھنے کے لیے ایک کتاب دی۔ اگلے روز بارہ بجے جب میں اس سے دوبارہ ملا تو وہ اسے پڑھ چکا تھا۔ وہ اس قدر محتاط اور باریک بیں قاری ہے کہ وہ نہایت غیرمتوقع مقامات پر تضادات اور واقعاتی غلطیوں کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ میری کتاب "ایک غرقاب شدہ جہاز کے ملاح کی داستان" پڑھنے کے

بعد وہ صرف یہ بتانے کے لیے میرے ہوٹل آیا کہ میں نے کشتی کی رفتار کا حساب لگانے میں غلطی کی تھی، اور اس کے پہنچنے کا وقت ہرگز وہ نہیں ہو سکتا جو میں نے بیان کیا ہے۔ اس کی بات درست تھی۔ اس لیے "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کو شائع کرانے سے پہلے میں مسودہ اس کے پاس لے گیا، اور اس نے شکاری رائفل کی خصوصیات کے بارے میں ایک غلطی کی نشان دہی کی۔ لگتا ہے اسے ادب کی دنیا سے محبت ہے جہاں اس کا جی لگتا ہے، اور اسے اپنی بےشمار تحریرشدہ تقریروں کے ادبی اسلوب پر محنت کرنے میں لطف آتا ہے۔ ایک موقعے پر اس نے، حسرت کے سے انداز میں، مجھے بتایا: "اپنے اگلے جنم میں میں ایک ادیب بننا چاہتا ہوں۔"

میری (فرانسوا) متراں سے دوستی بھی ادب ہی کے ذریعے شروع ہوئی۔ جب پابلو نیرودا فرانس میں چلی کا سفیر تھا تو اس نے متراں سے میرا تذکرہ کیا تھا۔ اس لیے جب متراں چھ سال پہلے میکسیکو کے دورے پر آیا تو اس نے مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ میں اس کی کتابیں پڑھ چکا تھا، اور اس کی تحریروں میں واضح طور پر جھلکنے والے ذوق اور زبان سے اس کے پیدائشی ادیبوں جیسے شغف کا مداح تھا۔ اس نے بھی میری کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ اس روز دوپہر کے کھانے پر، اور اس سے اگلے روز رات کے کھانے پر ہم نے ادب پر بہت باتیں کیں اگرچہ ہم دونوں کے ادبی پس منظر مختلف تھے اور ہمارے پسندیدہ ادیب بھی یکساں نہ تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں فرانسیسی ادب سے زیادہ اچھی طرح واقف نہیں ہوں جبکہ اس کا علم اس معاملے میں بےحد عمیق، تقریباً پیشہ ورانہ ہے۔ لیکن میری اس سے دوستی، فیدل کاسترو سے دوستی کی طرح نہیں ہے، اس لحاظ سے کہ جب کبھی ہماری ملاقات ہوتی ہے، خصوصاً اس کے فرانس کا صدر بننے کے بعد سے، تو ہم ہمیشہ سیاست پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور ادب کے بارے میں شاذونادر ہی گفتگو ہوتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۱ میں میکسیکو میں صدر فرانسوا متراں نے میکسیکی ادیب کارلوس فوئنتیس کو، گوئٹے‌مالا کے شاعر اور نقاد لوئس کاردوزا ای اراگون کو اور مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ یہ ایک نہایت اہم سیاسی ضیافت تھی اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مادام دانیئل متراں کو اس سے بظاہر بےحد مایوسی ہوئی تھی، کیوں کہ وہ ادب کے بارے میں گفتگو سننے کی توقع کر رہی تھیں۔ دسمبر ۱۹۸۱ میں مجھے پیرس میں لیژوں دونور کا اعزاز عطا کرتے ہوئے متراں نے اپنی مختصر تقریر میں ایک ایسی بات کہی تھی جس سے متاثر ہو کر میری آنکھوں میں تقریباً آنسو آ گئے تھے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی اس سے کم متاثر نہ تھا۔ اس نے کہا تھا، "تم اس دنیا سے تعلق رکھتے ہو جس سے مجھے محبت ہے۔"

پاناما کے حکمراں جنرل عمر توریہوس سے میری دوستی کی ابتدا ایک تنازعے سے ہوئی۔ انیس سو ستتر کے لگ بھگ اپنے ایک انٹرویو میں میں نے کہا تھا کہ وہ صرف ایک مقبولیت پسند لیڈر ہے جو پناما کی قومی خودمختاری کی اپنی مہم کے ذریعے ہی سماجی اصلاحات کے بارے میں اپنی بےعملی کی پردہ پوشی کر رہا ہے جن کی پناما کو شدید ضرورت ہے۔ لندن میں پناما کا کونسل مجھ سے ملنے آیا، اور اس نے مجھے بتایا کہ توریہوس مجھے پناما آنے کی دعوت دینا چاہتا ہے تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں کہ میرا بیان کتنا غیرمنصفانہ تھا۔ مجھے شبہ

ہوا کہ توریہوس محض پروپیگنڈا کا ایک ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لیے میں نے کہا کہ میں اس شرط پر یہ دعوت قبول کروں گا کہ میرے دورے کی تشہیر نہ کی جائے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گیا لیکن میرے وہاں پہنچنے کی تاریخ سے دو دن پہلے خبررساں ایجنسیوں نے یہ خبر جاری کر دی۔ سو میں جہاز میں سوار ہو کر سیدھا کولمبیا چلا آیا۔ توریہوس کو اس بات سے، جس کا ذمہ دار کوئی اور شخص تھا، بہت شرمندگی ہوئی، اور اس نے دوبارہ اپنی دعوت پر اصرار کیا۔ میں نے چند ماہ بعد خفیہ طور پر وہاں کا دورہ کیا، لیکن مجھے نیشنل سکیورٹی کے افراد کی مدد حاصل کرنے کے باوجود توریہوس کو تلاش کرنے میں چوبیس گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ جب وہ بالآخر مجھ سے ملا تو ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ نیشنل سکیورٹی والے مجھے کیوں تلاش نہیں کر پا رہے تھے؟" وہ بولا، "اس لیے کہ میں اپنے گھر پر تھا، اور وہ آخری جگہ ہے جہاں مجھے تلاش کرنے کا لوگوں کو، یہاں تک کہ سکیورٹی والوں کو بھی، خیال آ سکتا ہے۔" اس وقت سے ہماری دوستی ہو گئی، کریبین کے دو باشندوں کی سازباز سے ملتی جلتی دوستی۔ ایک موقعے پر، نہر پناما کے مذاکرات کے دوران بےحد تناؤ اور بےیقینی کے دنوں میں، ہم دونوں نے پندرہ دن فرایوں کے فوجی اڈے میں تنہا، باتیں کرتے اور وسکی پیتے میں گزارے۔ میں اسے چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ مجھے یہ ہیبت ناک احساس تھا کہ اگر وہ تنہا رہ گیا تو اس شدید تناؤ کے سامنے ڈھیر ہو جائے گا اور خود کو گولی مار لے گا۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ میرے اس خوف کی کوئی بنیاد تھی یا نہیں، لیکن مجھے ہمیشہ خیال آیا ہے کہ توریہوس کی شخصیت کا سب سے منفی پہلو اس کی شہادت کی طلب ہے۔

توریہوس کو کتابیں پڑھنے کی بالکل عادت نہ تھی۔ وہ اتنا بےصبر اور بےتاب تھا کہ باضابطہ مطالعہ کر ہی نہ سکتا تھا۔ لیکن اسے تازہ مقبول عام کتابوں کا ہمیشہ علم رہتا۔ وہ میری جان پہچان کے کسی بھی اور شخص سے بڑھ کر ایک تقریباً حیوانی وجدان کا مالک تھا اور اس کی حقیقت کی سمجھ کبھی کبھی ساحری کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ فیدل کاسترو کے برعکس، جو ہر کسی خیال کو آخری شکل دینے کی غرض سے اس کے بارے میں مسلسل باتیں کرنے کا عادی ہے، توریہوس ایسے موقعوں پر خود کو ایک ربانی سکوت میں قید کر لیا کرتا۔ اس کے دوستوں کو بخوبی علم ہوتا کہ وہ جو باتیں کر رہا ہے دراصل ان سے بہت مختلف کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ جن لوگوں سے میں واقف رہا ہوں ان میں وہ سب سے زیادہ شکی آدمی تھا، اور اس کے کسی عمل کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔

(میری اس سے آخری ملاقات) اس کی موت سے تین دن پہلے ہوئی۔ میں ۲۳ جولائی ۱۹۸۱ کو پناما میں اس کے مکان پر اس کے ساتھ تھا، اور اس نے مجھے اپنے ساتھ اندرونِ ملک کے دورے پر چلنے کو کہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ کیوں، مگر اس سے دوستی ہونے کے بعد پہلی بار میں نے انکار کر دیا۔ اگلے روز میں میکسیکو روانہ ہو گیا۔ دو دن بعد ایک دوست نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ توریہوس نے اس جہاز میں خود کو ہلاک کر ڈالا جس میں اس کے اور دوستوں کی طرح ہم نے بھی متعدد بار اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس کی

موت کے ردعمل کے طور پر مجھے اپنی آنتوں میں سے گہرا طیش اٹھتا محسوس ہوا، کیونکہ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ میرا اس سے لگاؤ اس سے زیادہ تھا جتنا میرا خیال تھا، اور یہ کہ میں اس کی موت کا کبھی عادی نہیں ہو سکوں گا۔ ہر گزرنے والا دن میرے اس خیال کو اور پختہ کرتا جاتا ہے۔

گراہم گرین ان ادیبوں میں سے ہے جن کی تحریروں سے میں سب سے بہتر طور پر واقف ہوں۔ میں نے اس کی تحریریں اپنی طالب علمی کے زمانے میں پڑھنی شروع کی تھیں۔ وہ ان ادیبوں میں بھی شامل ہے جنھوں نے گرم منطقۂ حارہ کے بھیدوں کو دریافت کرنے میں میری مدد کی۔ یہ جاننے میں میری مدد کی کہ ادب میں حقیقت فوٹوگرافی کی طرح نہیں بلکہ مرکب ہوتی ہے اور اس مرکب کے بنیادی عناصر کو پا لینے کے فن کے راز میں سے ایک ہے۔ گراہم گرین کو اس میں ملکہ حاصل ہے اور میں نے یہ راز اسی سے سیکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات میری بعض کتابوں، خصوصاً "منحوس وقت" میں بےحد واضح طور پر نظر آ سکتی ہے۔

میں گراہم گرین کے بارے میں جو تصور رکھتا ہوں، کوئی اور ذاتی حس بھی میں اس تصور سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ بےحد کم گو ہے اور آپ کی باتوں میں بھی کوئی خاص دلچسپی لیتا ہوا معلوم نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کے بعد آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ متواتر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ ایک طویل ہوائی سفر کے دوران ایک موقعے پر میں نے اس سے کہا کہ وہ اور ہیمنگ وے دو ایسے ادیب ہیں جن کی تحریروں پر کسی کے ذہنی اثرات کا پتا نہیں چلتا۔ "میری تحریروں پر ہنری جیمز اور کونریڈ کے اثرات واضح ہیں،" اس نے جواب دیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس کی رائے میں کیا وجہ ہے کہ اسے نوبیل انعام کا مستحق نہیں گردانا گیا۔ اس نے صاف جواب دیا، "اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مجھے سنجیدہ ادیب نہیں سمجھتے۔" یہ بڑی عجیب بات ہے لیکن صرف ان دو جوابی فقروں نے مجھے سوچنے کے لیے اتنا کچھ دیا کہ اس سفر کے بارے میں میری یاد پانچ گھنٹوں کی ایک مسلسل گفتگو کی سی ہے۔

گراہم گرین کی توریہوس سے دوستی ان دونوں سے میری دوستی کی طرح ایک قسم کی سازباز پر مبنی ہے۔ گراہم گرین کے ریاستہائے متحدہ میں داخلے پر کئی برس تک اس لیے پابندی عائد رہی کہ اس نے ویزا کی درخواست کے فارم پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ نوجوانی میں چند ماہ تک کمیونسٹ پارٹی کا رکن رہ چکا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا کیونکہ میں کیوبا کی خبررساں ایجنسی کا نیویارک میں نمائندہ رہ چکا تھا۔ توریہوس چاہتا تھا کہ ہم دونوں ۱۹۷۸ میں واشنگٹن میں نہر پناما کے معاہدے پر دستخطوں کی تقریب میں اس کے مہمان ہوں، اور اس نے ہمارے نام پر پناما کے دو سرکاری پاسپورٹ جاری کر دیے۔ میں گراہم گرین کے چہرے پر نہ ٹلنے والی شرارت کو کبھی نہیں بھولوں گا جو اس وقت نمودار ہوا جب ہم واشنگٹن کے اینڈریوز ایئربیس پر اترے جہاں رنگارنگ تقریبات، قومی ترانوں اور توپوں کی سلامیوں والا ایک ایسا خیرمقدم ہمارا منتظر تھا جو سربراہانِ مملکت کے لیے مخصوص ہے۔ اگلے روز دستخط کی تقریب میں ہم اس طویل میز سے چند گز دور ساتھ ساتھ تھے جس کے گرد لاطینی امریکا کے تمام حکمران نشست تھا پیراگوئے کا اسٹروسنر

Stroessner، چلی کے پنوچیت (Pinochet)، ارجنٹینا کے ویڈیلا (Videla) اور بولیویا کے بانزیر Banzer اس لذیذ انسانی چڑیاگھر کا ایک ایسی دہشت کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہوئے جس سے آپ بخوبی واقف ہیں، ہم دونوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ تب اچانک گراہم گرین میری طرف جھکا اور فرانسیسی زبان میں مجھ سے سرگوشی کی: "بانزیر یقیناً ایک بیحد ناخوش آدمی ہے۔" میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گا، سب سے بڑھ کر اس لیے کہ اس نے اس بات کو اس قدر ہمدردی کے ساتھ ادا کیا تھا۔

آپ میری زندگی کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ اس کردار کی اہمیت کا اندازہ نہ کر لیں جو عورتوں نے میری زندگی میں ادا کیا ہے۔ میری پرورش میری نانی اور بہت سی خالاؤں کے ہاتھوں ہوئی جو مجھ پر اپنی توجہ کی بارش کیے رکھتی تھیں، اور ان خادماؤں کے ہاتھوں جنھوں نے مجھے بچپن کے بہت سے خوشی کے لمحات بخشے کیونکہ ان کے تعصبات خاندان کی عورتوں کے مقابلے میں کم تو نہیں لیکن مختلف ضرور تھے۔ جو عورت مجھے اسکول میں پڑھاتی تھی وہ بیحد خوب صورت اور پُروقار تھی، اور مجھے اسکول جانا اسی وجہ سے پسند تھا کہ میں اسے دیکھ سکوں۔ میری ساری زندگی کے دوران ایک نہ ایک عورت میرا ہاتھ تھامے رہی ہے اور وجود کے اس اندھیرے میں جسے مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ اچھی طرح سمجھتی ہیں، میری رہنمائی کرتی رہی ہے۔ وہ اپنا راستہ نسبتاً زیادہ آسانی سے اور راہ نمائی کے کم ذرائع پر انحصار کر کے تلاش کر لیتی ہیں۔ اس معاملے میں میرے احساس نے قریب قریب توہم پرستی کی صورت اختیار کر لی ہے: مجھے لگتا ہے کہ اگر میں کسی عورت کے ساتھ ہوں تو مجھے کوئی بری بات پیش نہیں آ سکتی۔ ان کی بدولت مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ اس تحفظ کے بغیر، میں زندگی میں ان میں سے آدھے قابلِ قدر کام بھی نہ کر سکتا جو میں نے کیے ہیں اور خاص طور پر میں سوچتا ہوں کہ میں لکھ تو ہرگز نہ سکتا۔ اس کا مطلب بلاشبہ یہ بھی ہے کہ میرے تعلقات عورتوں سے مردوں کی بہ نسبت بہتر ہیں۔

"تنہائی کے سو سال" سے پہلے تک میری کتابوں میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کرداروں کی تقسیم قطعی غیرشعوری اور بےساختہ تھی۔ یہ صرف نقادوں، خصوصاً ارسلا وولکیننگ کی بدولت ہوا کہ مجھے اس کا شعوری احساس ہو گیا۔ میں اس پر بہت زیادہ خوش نہیں ہوں، کیونکہ اب میں اس بےساختگی سے ویسے کردار خلق نہیں کرتا جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔ بہرحال، اس روشنی میں اپنی کتابوں پر غور کر کے میں نے انھیں دونوں جنسوں کے تاریخی کردار کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پایا ہے، یعنی یہ کہ عورتیں اپنی گرفت سے سماجی نظم وضبط کو قائم رکھتی ہیں جبکہ مرد، حماقت پر تلے ہوئے دنیا کی خاک چھانتے پھرتے ہیں جس سے تاریخ کا پہیہ آگے سرکتا ہے۔ معلوم کرنا یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ پاگل ہے۔ بہرکیف میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عورتیں تاریخ کے

حسوں سے قطعی بیگانہ ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ نوعِ انسانی کو قائم رکھنے کے اپنے بنیادی کام کے قابل نہ ہوتیں۔

(میرے اس خیال کا ماخذ) غالباً اپنے نانا نانی کے گھر میں سنے ہوئے خانہ جنگیوں کے قصے ہیں۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ یہ جنگیں ہرگز واقع نہ ہوتیں اگر عورتوں میں وہ تخریبی وحشیانہ قوت نہ ہوتی جو انھیں اتنی بےخوفی سے دنیا کا سامنا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ میرے نانا مجھے بتایا کرتے تھے کہ کس طرح مرد بندوق کندھے پر ڈال کر جنگ پر روانہ ہو جاتے تھے یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ واپسی کب ہو گی اور، ظاہر ہے یہ فکر کیے بغیر کہ ان کی غیرموجودگی میں گھر میں کیا ہو گا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اپنی قوت اور تخیل پر انحصار کرنے والی عورتیں پیچھے رہ جاتیں تاکہ نوعِ انسانی کو زندہ رکھ سکیں اور جنگ میں مارے جانے والوں کی جگہ لینے کے لیے نئے مردوں کو جنم دے سکیں۔ وہ یونانی ماؤں کی طرح نہیں تھیں جو اپنے مردوں کو میدانِ جنگ کی جانب روانہ ہوتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ الوداع کہتی تھیں: "اس حالت میں واپس آنا کہ تم نے اپنی ڈھال کو اٹھا رکھا ہو یا ڈھال نے تمھیں اٹھا رکھا ہو۔" یعنی زندہ یا مردہ، لیکن شکست خوردہ نہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ رویہ، جو کریبیئن عورتوں میں عام ہے، کہیں ہماری جارح مردانگی کا اصل سبب تو نہیں۔ یا یہ کہ کہیں یہ جارح مردانگی عام طور پر مادری معاشروں کی پیداوار تو نہیں ہوتی۔

پہلی عورت جس نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار کیا وہ وہی استانی تھی جس نے مجھے پانچ سال کی عمر میں پڑھایا تھا مگر وہ مختلف معاملہ تھا۔ لیکن جس نے مجھے پہلی بار جنسی طور پر بیدار کیا وہ ہمارے گھر میں کام کرنے والی ایک لڑکی تھی۔ ایک رات جب پڑوس کے مکان سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی اس نے، بالکل معصومیت سے، مجھے اپنے ساتھ باغیچے میں رقص کرنے کی دعوت دی۔ میرے اور اس کے جسم کا اتصال۔۔ میری عمر اس وقت چھ برس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔۔ ایک ایسا جذباتی ہیجان تھا جس سے میں آج تک آزاد نہیں ہو سکا ہوں۔ میں نے پھر کبھی اتنی شدت یا اس بےچارگی کے احساس کا تجربہ نہیں کیا۔

یہ جھوٹ نہیں ہو گا اگر میں کہوں کہ مجھے بیدار کرنے والی تازہ ترین عورت وہ تھی جسے میں نے کل رات پیرس کے ایک ریستوراں میں دیکھا تھا۔ یہ میرے ساتھ اتنی بار ہوتا ہے کہ میں نے گننا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے یہ خصوصی جبلت حاصل ہے: جب میں لوگوں سے بھری ہوئی کسی جگہ میں داخل ہوتا ہوں تو ایک قسم کا پراسرار سگنل میری نگاہ کو بالکل درست طور پر اس ہجوم میں موجود سب سے زیادہ مسحورکن عورت کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ لازماً سب سے زیادہ حسین عورت نہیں ہوتی، لیکن ایسی عورت ہوتی ہے جس سے مجھے نہایت وسیع طور پر گہری یگانگت کا احساس ہوتا ہے۔ میں کبھی کچھ کرتا نہیں، صرف یہ جاننا کہ وہ وہاں موجود ہے میری مسرت کے واسطے کافی ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی بےلوث اور خوبصورت چیز ہے کہ کبھی کبھی مرسیڈس تک اس عورت کی نشاندہی کرنے اور اسے دیکھتے رہنے کے مناسب ترین مقام کا انتخاب کرنے میں میری مدد کرتی ہے۔

(میرا دعویٰ ہے کہ میرے وجود میں جارح مردانگی کا ایک ذرّہ تک نہیں۔) لیکن اسے نظری اصطلاحات کی مدد سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اظہار صرف عملی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ صرف ایک مثال کے طور پر، "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" یقیناً اس بنیادی جارح مردانگی کا پردہ بھی چاک کرتی ہے اور اس کی مذمت بھی کرتی ہے جو ہمارے معاشرے میں موجود ہے، جو درحقیقت ایک مادری معاشرہ ہے۔ میرے نزدیک کسی مرد یا عورت میں موجود یہ جارح مردانگی محض دوسرے لوگوں کے حقوق کو غصب کرنے کا نام ہے۔

میرا خیال ہے یہ قول (ہنری) کسنجر کا ہے کہ اقتدار ایک شہوت انگیز شے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مقتدر افراد اکثر ایک خاص قسم کے جنسی جنون میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن میں کہوں گا کہ "سردار کا زوال" میں پیش کردہ میرا خیال اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اقتدار محبت کا متبادل ہے۔ میں اسے اس طرح دیکھتا ہوں کہ محبت کرنے کی اہلیت سے محرومی ان افراد کو اقتدار میں تسکین حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن میں مخبری سازی میں مہارت نہیں رکھتا، جو بہرحال بعدازوقت گھڑے جاتے ہیں۔ میں اس کام کو دوسرے لوگوں کے لیے چھوڑ دینے کو ترجیح دیتا ہوں، جو اس میں زیادہ ماہر ہیں اور جنھیں اس سے لذت حاصل ہوتی ہے۔

"منحوس وقت" میں لیفٹسنٹ کا کردار اقتدار کے اسرار کی کرید کے سلسلے میں — چاہے وہ ایک چھوٹے سے قصبے کے میئر کی معمولی سطح ہی پر کیوں نہ ہو — میری پہلی کوشش تھی اور "سردار کا زوال" کا ڈکٹیٹر سب سے زیادہ پیچیدہ کوشش تھی۔ ان دونوں کرداروں اور کرنل اوریلیانو بوئندیہ کے کردار کے درمیان تعلق واضح ہے۔ کرنل بوئندیہ بڑی آسانی سے ایک سطح پر "منحوس وقت" کا لیفٹسنٹ، اور دوسری سطح پر "سردار کا زوال" کا ڈکٹیٹر ہو سکتا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ان دونوں کی صورت حال میں ویسا ہی طرزعمل اختیار کرتا۔

میرے خیال میں محبت کرنےکی اہلیت سے محرومی سے بڑھ کر کوئی اور انسانی ابتلا نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف اس شخص کے لیے جو اس میں مبتلا ہو بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے جو بدقسمتی سے اس شخص کے مدار میں آ جاتے ہیں۔

(جنسی آزادی کے بارے میں) ہم سب اپنی اپنے تعصبات کے ہاتھوں یرغمال ہیں۔ ایک آزادخیال آدمی کے طور پر میرا عقیدہ ہے کہ نظری طور پر جنسی آزادی کو کسی بھی طرح محدود نہیں کیا جانا چاہیے۔ لیکن عملی طور پر میں اپنے کیتھولک پس منظر اور بورژوا معاشرے کے تعصبات سے فرار اختیار نہیں کر پاتا، اور دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح دوہرے معیارات کا شکار ہو جاتا ہوں۔

(میں نے کبھی کہا تھا کہ تمام مرد نامرد ہوتے ہیں، لیکن ایک نہ ایک عورت ضرور ایسی ہوتی ہے جو ان کا مسئلہ حل کر دیتی ہے۔) میرے خیال میں یہ کسی فرانسیسی کا قول تھا، "نامردوں کا کوئی وجود نہیں، صرف بعض عورتیں بےحس ہوتی ہیں۔" درحقیقت، اگرچہ بہت سے اس کا اعتراف نہیں کرتے، ہر نارمل مرد کو ہر نیا جنسی تجربہ دہشت ناک لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دہشت کا سبب تہذیبی ہے۔ وہ احمق ثابت ہونے سے ڈرتا ہے اور بالآخر احمق ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ اتنی اچھی کارکردگی نہیں دکھا پاتا جتنی اس کی جارح مردانگی اس سے تقاضا کرتی ہے۔ اس مفہوم میں ہم سب نامرد ہیں اور ہمیں احترامِ ذات کو

برقرار رکھتے ہوئے اس صورتحال سے باہر آنا صرف ایک عورت کی ہم دردی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ یہ محبت کو ایک خاص طلسم کا حامل بنا دیتی ہے کیونکہ ہر بار پہلی بار کی مانند ہے، اور ہر مرد کو ہر بار نئے سرے سے، پہلی بار کی طرح، آغاز کرنا پڑتا ہے۔ اسی جذبے اور پراسراریت کی کمی کے باعث پورنوگرافی اس قدر بیزارکن اور ناقابل قبول ہے

ضمیمہ ۱

واقعات کی سن وار ترتیب

متعلقہ تاریخی اور ادبی واقعات

۱۸۹۹

یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کی کولومبیا میں آمد

۱۸۹۹ ـ ۱۹۰۲

کولومبیا کی خانہ جنگیوں کا نصف صدی طویل سلسلہ ہزار روزہ جنگ کی صورت میں اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ نیرلانڈیا کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہیں۔

۱۹۰۹ ـ ۱۹۳۵

وینس ویلا کے ڈکٹیٹر حوان ویسینٹ گومیز کا دور اقتدار۔

۱۹۱۹

کولومبیا ٹروپیکل آئل کمپنی کے ساتھ معاہدے پر دستخط کرتا ہے۔

۱۹۲۴

حوزے یوستاسیو ریویرا کی کتاب *La vorágine* (The Vortex) کی اشاعت۔

۱۹۲۸

شمالی کولومبیا کے قصبے سینٹا مارتا کے نزدیک بنانا کمپنی کے مزدوروں کی بڑی ہڑتال جس کے نتیجے میں ان کا قتل عام ہوتا ہے۔

۱۹۲۹

رومولو گائیگوس کی کتاب *Doña Bárbara* کی اشاعت۔

۱۹۳۶ ـ ۱۹۳۹

ہسپانیہ میں خانہ جنگی۔

۱۹۴۱

یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کی کولومبیا سے روانگی، یا فعالیت میں نمایاں کمی۔

۱۹۴۴

حورخے لوئس بورخیس کی کتاب *Ficciones* کی

مارکیز کی زندگی کے واقعات

۱۹۲۸

شمالی کولومبیا کے گرم خطے کے قصبے اراکاتاکا میں ٦ مارچ کو گابرئیل حوزے گارسیا مارکیز کی پیدائش۔

۱۹۲۸ ـ ۱۹۳٦

مارکیز اپنے نانا کرنل نکولس رکاردو مارکیز میحیا کے گھر میں رہتا ہے۔ بڑے ہونے پر وہ اکثر خواب دیکھتا ہے کہ وہ اس مکان سے کبھی نہیں نکلا۔ اس کا کہنا ہے "تب سے لے کر میرے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔"

۱۹۳٦ ـ ۱۹۴۴

کولومبیا کے ساحلی علاقے میں بارنکیلا اور زیپاکیرا میں پرائمری اور سیکنڈری تعلیم۔ تیرہ برس کی عمر میں مارکیز پہلی بار دارالحکومت بوگوتا پہنچتا ہے۔

۱۹۴۸ ـ ۱۹۵٤

کولومبیا میں مسلح تصادم اور متواتر تشدد کا دور جسے La violencia کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز لبرل رہنما حورخے گیتان کے قتل سے ہوا۔ تشدد کی اس لہر میں مارے جانے والوں کی تعداد دو سے تین لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔

۱۹۴۹

الیجو کارپینٹر کی کتاب *El reino de este mundo* (The Kingdom of this World) کی اشاعت۔

۱۹۵۰

ولیم فاکنر کو ادب کا نوبیل انعام دیا جاتا ہے۔

۱۹۵۳

جنرل گستاوو روہاس پینیلا کولومبیا میں اقتدار پر قبضہ کرتا ہے۔

۱۹۵۳ ـ ۱۹۵۸

وینس ویلا کے ڈکٹیٹر پیریز جیمینیز کا دور اقتدار۔

۱۹۵۵

حوان رولفو کی کتاب *Pedro Páramo* کی اشاعت۔

۱۹۵٤

روہاس پینیلا کا استعفیٰ۔ قومی جبہ انتخابات کا اعلان کرتی ہے جو ۱۹۵۸ میں منعقد ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں مخلوط حکومتوں کا ایک سلسلہ اقتدار میں آتا ہے۔ بیکن بدامنی اور گوریلا کارروائیاں جاری رہتی ہیں۔

۱۹۵۹

الیجو کارپینٹر کی کتاب *Los pasos perdidos* (The Lost Steps) کی اشاعت۔

فیدل کاسترو کی فوجیں ہوانا پر قبضہ کر لیتی ہیں، صدر باتستا کا استعفیٰ اور فرار۔

۱۹٦۱

حوان کارلوس ونیتی کی کتاب *El astillero* (The Shipyard) کی اشاعت۔

کیوبن حکومت کے خلاف امریکی سرپرستی میں Bay of Pigs پر ناکام حملہ۔

۱۹۴٦ ـ ۱۹۴۹

نیشنل یونیورسٹی، بوگوتا اور یونیورسٹی آف کارتاخینا میں قانون کی تعلیم۔ بوگوتا کے اخبار "ایل ایسپکتادور" کے ہفتہ وار ایڈیشن میں مارکیز کی اولین کہانیوں کی اشاعت۔ کارتاخینا کے اخبار "ایل یونیورسل" کے لیے کالم لکھنے کا کام۔

۱۹۵۰ ـ ۱۹۵۵

مارکیز قانون کی تعلیم ترک کر کے ہمہ وقتی صحافت کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے اور بارنکیلا کے اخباروں "ایل ہیرالدو" اور "ایل ناسیونال" اور "ایل ایسپکتادور" کے لیے کام کرتا ہے۔ مزید کہانیاں شائع ہوتی ہیں، اور پہلا ناول "پتوں کا طوفان"۔

۱۹۵٤ ـ ۱۹۵۵

"ایل ایسپکتادور" کے نامہ نگار کی حیثیت سے یوروپ میں۔ روم میں فلم سازی کا ایک کورس مکمل کرتا ہے۔ ڈکٹیٹر روہاس پینیلا کے ہاتھوں "ایل ایسپکتادور" کی اشاعت بند ہو جاتی ہے۔ مارکیز قلاشی اور بیروزگاری کی حالت میں پیرس میں ٹھہر جاتا ہے اور "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" پر کام کرتا ہے (اشاعت ۱۹٦۱)۔ کئی سوشلسٹ ملکوں کا دورہ کرتا ہے اور اپنے تاثرات *90 Days Behind the Iron Curtain* کے عنوان سے تحریر کرتا ہے۔

۱۹۵۸

بارنکیلا میں مرسیدس بارچا سے شادی۔ کاراکاس میں جرائد "مومینتو"، "ایلیت" اور "وینس ویلا گرافیکا" میں ملازمت۔ "بڑی ماما کا جنازہ" میں شامل ہونے والی زیادہ تر کہانیوں کی تکمیل۔ (اشاعت ۱۹٦۲)۔

۱۹۵۹ ـ ۱۹٦۱

"آپریشن وردد" نامی منصوبہ کی نامہ نگاری کے لیے ہوانا میں۔ بوگوتا میں کیوبن خبررساں ایجنسی "پرینسا لاطینا" کا دفتر قائم کرتا ہے۔ اسی خبررساں ایجنسی کے لیے ہوانا اور نیویارک

۱۹۶۲

کیوبا میں روسی میزائلوں کی اڈے پر بین الاقوامی بحران۔

۱۹۶۳

جولیو کورتازار کی کتاب Rayuela (Hopscotch) کی اشاعت۔

۱۹۶۵

ماریو برگس یوسا کی کتاب La casa verde (The Green House) کی اشاعت۔

گیلرمو کابریرا انفانتے کی کتاب Tres tristes tigres (Three Sad Tigers) کی اشاعت

۱۹۶۶

جوزے لیزاما لیما کی کتاب Paradiso کی اشاعت۔

۱۹۶۷

کارلوس فوئنتیس کی کتاب Cambio de piel (Change of Skin) کی اشاعت۔

چے گویرا کی بولیویا میں وفات۔

۱۹۷۰

جوزے ڈونوسو کی کتاب El obsceno pajaro de la noche (The Obscene Bird of Night) کی اشاعت۔

سلوادور آیندے چیلی کا صدر منتخب ہوتا ہے۔

۱۹۷۳

آیندے کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔

۱۹۷۴

آگستو روا باستوس کی کتاب Yo el supremo (The Dictator) کی اشاعت۔

۱۹۷۵

سپین کے ڈکٹیٹر فرانکو کی وفات۔

۱۹۷۹

نکاراگوا میں ۱۹۳۹ سے برسراقتدار سوموزو خاندان کا تختہ الٹ کر سانڈینستا برسراقتدار آجاتے ہیں۔

۱۹۸۱

ماریو برگس یوسا کی کتاب La guerra del fin del mundo (The War of the End of the world) کی اشاعت۔

پناما کے صدر عمر توریہوس کی ایک ہوائی حادثے میں وفات۔

میں کام کرتا ہے۔

۱۹۶۱ ۔ ۱۹۶۷

میکسیکو سٹی میں۔ جرائد کی ادارت، ایک اشتہاری ایجنسی میں ملازمت، اور ناول "منحوس وقت" (اشاعت ۱۹۶۲) پر کولمبیا کا ایک انعام۔ کئی فلموں کے اسکرپٹ پر کام کرتا ہے۔ "تنہائی کے سو سال" کی تحریر اور اشاعت (۱۹۶۷)۔ فوری اور بےپناہ کامیابی۔ اسے "ڈون کیہوتے" کے بعد سے ہسپانوی زبان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب کہا جاتا ہے۔

۱۹۶۷ ۔ ۱۹۷۵

بارسلونا (سپین) میں۔ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے ایک اعزازی ڈگری ملتی ہے۔

"معصوم ایرندیرا" کی اشاعت (۱۹۷۲)۔ بوگوتا کے ایک سیاسی رسالے "الٹرنیٹیوا" قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ رسل ٹریبونل کا نائب صدر مقرر ہوتا ہے۔

"سردار کا زوال" کی اشاعت (۱۹۷۵)۔

۱۹۷۵ ۔ ۱۹۸۱

میکسیکو سٹی اور بوگوتا میں۔ کئی فلموں کے اسکرپٹ پر کام کرتا ہے۔ انگولا اور نکاراگوا کا دورہ کرتا ہے اور تاثرات لکھتا ہے۔ سرگرم سیاسی کام۔ مارکیز کولمبیا کی پارٹی "فرمیر" کا بانی رکن ہے۔ یونیسکو کے لیے مواصلات کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرتا ہے۔ سیاسی قیدیوں کی امداد کے لیے ایک ادارہ "Habeas" قائم کرتا ہے۔ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی اشاعت (۱۹۸۱)۔

۱۹۸۲

نوبیل انعام حاصل کرتا ہے۔

۱۹۸۳ ۔

کولمبیا اور میکسیکو میں قیام۔ "وبائی دنوں میں محبت" کی اشاعت (۱۹۸۵)۔ سیاسی سرگرمیاں جاری ہیں۔

The General in His Labyrinth کی اشاعت (۱۹۸۹)۔

ضمیمہ ۲

کتابیات

گابریئل گارسیا مارکیز کی تصانیف

"پتوں کا طوفان"
La hojarasa
Leaf Storm and other stories
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1972.

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"
El coronel no tiene quien le escriba
No One Writes to the Colonel
tr. J S Bernstein
Harper & Row, 1968.

"بڑی ماما کا جنازہ"
Los funerales de la Mama Grande
Big Mama's Funeral
tr. J S Bernstein
(included in "*No One Writes to the Colonel*")

"منحوس وقت"
La mala hora, 1962
In Evil Hour
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1979.

"تنہائی کے سو سال"
Cien anos de soledad, 1967
One Hundred Years of Solitude
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1970.

"سردار کا زوال"
El otono del patriarca, 1975.
The Autumn of the Patriarch
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1976.

"معصوم ارینڈرا"
La candida Erendira y su abuela desalmada
Innocent Erendira and other stories
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1978.

"ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
Cronica de una muerte anunciada, 1981.
Chronicle of a Death Foretold
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1982.

"غرقاب شدہ جہاز کے ملاح کی داستان"
"ایک"
Relato de un naufrago, 1970.
The Story of a Shipwrecked Sailor

"وبا کے دنوں میں محبت"
El amor en los tiempos del colera, 1985
Love in the Time of Cholera
tr. Edith Grossman
Knopf, 1988.

La aventura de Miguel Littin clandestino en Chile, 1986
Clandestine in Chile
tr. Asa Zatz
Granta Books, 1989.

"جنرل اپنی بھول بھلیوں میں"
El general en su laberinto, 1989.
The General in his Labyrinth, 1990.

دیگر کتابیں

Plinio Apuleyo Mendoza,
El olor de la guayaba, 1982
The Fragrance of Guava
tr. Ann Wright
Verso, 1983.

Michael Wood,
Landmarks of World Literature: 100 Years of Solitude
Cambridge University Press, 1990.

Our growth in Wire Rope & Aluminium Conductor industries is bearing fruits of National prosperity

By the Grace of Allah the seeds sown many years ago have grown into strong trees & are bearing fruits of national progress and prosperity. CWR & CCL are now leaders in the industry. Their overhead Aluminium/Aluminium Alloy Conductors, Wire ropes & wire products are manufactured in accordance with international standards. These high quality products enjoy flourishing market both at home and abroad.

Chaudhri Wire Rope Industries (Pvt.) Ltd.

CCL Chaudhri Cables (Pvt.) Limited

3-C, Zafar Ali Road, Gulberg V, Lahore - Pakistan. Phone: 870265-69 Telex: 44858 CWR PK & 44405 CCL PK

Manufacturers & Exporters of
ALL KINDS OF COTTON INDUSTRIAL
WORK GLOVES, INTERLOCK, DRILL,
DOUBLE PALM, HOT MILL, CHORE,
TERRY, NYLON & JERSEY.
COTTON BAGS,
JOGGING SUITS &
OTHER TEXTILE MADE UPS.

KAYSONS INTERNATIONAL (PRIVATE) LTD.

Aamir Trade Centre, Suite 5, 4th Floor, 233/1-A
Block-2, P.E.C.H.S., Karachi, Pakistan.
Phones: (021) 445222-447302 Fax: (92-21) 436563
Factory: Mohalla Nazar Niaz, Near Sitarawali Masjid
Jhumra Road, Faisalabad, Pakistan.
Phone: (0411) 47309

آج کی کتابیں

تقسیم کار
مکتبہ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

کلاسیک
شاہراہ قائداعظم لاہور

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تا کہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224